علامہ اقبالؒ

اور

فتنۂ قادیانیت

ترتیب و تحقیق

علامہ اقبالؒ
اور
فتنۂ قادیانیت

''ثانیاً ہمیں قادیانیوں کی حکمت عملی اور دُنیائے اسلام سے متعلق اُن کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بانی تحریک نے ملت اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے۔ اور اپنے مقلدین کو ملت اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں ان کا بنیادی اصولوں سے انکار' اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی)، مسلمانوں کی قیامِ نماز سے قطع تعلق' نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دنیائے اسلام کافر ہے' یہ تمام اُمور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے اس سے کہیں دور ہیں' جتنے سکھ' ہندوؤں سے کیونکہ سکھ ہندوؤں سے باہمی شادیاں کرتے ہیں۔ اگر چہ وہ ہندوؤں میں پوجا نہیں کرتے۔'' (سٹیٹسمین کے جواب میں)

❁

''ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا' جب ایک نئی نبوت...... بانیِ اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت...... کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی، جب میں نے تحریک کے ایک رُکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔''
(سن رائز کے جواب میں)

ترتیب وتحقیق
محمد متین خالد

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

حضوری باغ روڈ، ملتان فون: 514122

نام کتاب	....	علامہ اقبالؒ اور فتنہ قادیانیت
مصنف	....	محمد متین خالد
ناشر	....	عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت، ملتان
سن اشاعت	....	2005ء
سرورق	....	ملک جہانزیب نوید
کمپوزنگ	....	سہیل بزیلا
قیمت	....	-/400روپے

عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

حضوری باغ روڈ، ملتان فون:514122

فہرست

''نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر''

عقیدۂ ختمِ نبوت

مضامینِ اقبالؒ

توضیحات

خطوط

اقبال، تحریکِ آزادیٔ کشمیر اور قادیانیت

''اقبال دشمنی'' کے جواب میں

قادیانیت شکن شاعری

علامہ اقبالؒ اور فتنۂ قادیانیت

❀....❀....❀

نابغہ عصر، سفیرِ محبت، غرقابِ عشق رسول ؐ

جناب ڈاکٹر یٰسین رضوی

کے نام

جو فکر اقبالؒ کی روشنی میں اسلام اور پاکستان کی نظریاتی
سرحدوں کے بہترین محافظ کا کردار ادا کر رہے ہیں

؎ تیرے دیوے دی رشنائی جاوے وِچ زمیناں

اقبالؒ اور قادیانیت

کون نہیں جانتا کہ علامہ اقبالؒ ذات ختمی مرتبت ﷺ سے ایسی نسبت رکھتے تھے جس میں ان کی فکر، تخیل اور استعداد تعلق اپنے منتہا کو پہنچ کر صرف ہوگئی تھی۔ یہ نسبت ان کے لیے موجود ہونے کی واحد اساس اور انتہائی غایت تھی۔ محبت کی وہ سطح جو اکثر لوگوں کے اندر تصور اور آرزو کی حیثیت رکھتی ہے، اقبال نے اسے نفسِ انسانی کا مرکزی اور انتہائی تجربہ بنا کر دکھا دیا۔ وہ نہ ہوتے تو خدا جانے کتنے لوگ رسول اکرم ﷺ کی محبت کو اتنی بلندی، گہرائی، شدت اور ہمہ گیری کے ساتھ اپنا حال بنانے سے محروم رہ جاتے۔

دوسری طرف دیکھیں تو ایسی احوال گری، ذہن سازی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ بقول کسے: ''حال، شعور کے وفور کا نام ہے خواہ یہ شعور ایمانی ہو یا جمالیاتی، عقلی ہو یا اخلاقی۔ بڑا حال مجموعی شعور کی حسّی تشکیل سے پیدا ہوتا ہے جس میں شعور کے تمام انواع نقطۂ واحد میں ڈھل جاتے ہیں''...... اقبال کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے شعور کے مضمرات کو احوال میں ڈھال دکھایا۔ ان کے ہاں عشق رسول ﷺ جذبات سے منقطع ہوئے بغیر عقل وعرفان کے لیے بھی کل اثاثہ بن گیا ہے۔ محبت معرفت کا منتہا ہے اور معرفت محبت کا...... علامہ کو پڑھ کر اس قول کی حقیقت کا مشاہدہ بلکہ تجربہ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں عقیدہ، محبت اور معرفت کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اقبال عقیدے کو اس کے جوہر میں جس امر پر استوار سمجھتے ہیں، وہ تعلق بالرسول ﷺ ہے، عشق تناظر میں بھی اور عقلی بنیاد پر بھی...... یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حوالے سے ان کی تحریروں کا ایک بڑا حصہ آپ ﷺ کے مرتبۂ رسالت کی تفہیم وتوضیح پر مشتمل ہے۔ چونکہ رسالت محمدیہ ﷺ کا کوئی بھی تصور آپؐ کو آخری نبی مانے بغیر بے معنی اور لاحاصل ہے، لہٰذا جب فتنۂ قادیانیت کھل کر سامنے آیا تو علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے بعد اس پر سب سے کاری ضرب اس وقت اقبال نے لگائی۔ انہوں نے عقیدۂ ختم نبوت کے تمام ممکنہ اطلاقات ومضمرات اور ان کی ہمہ گیر معنویت کا بیان

کرتے ہوئے اس عقیدے کو اسلام اور مسلمانوں کے لیے عقیدۂ توحید کے برابر ضروری اور اہم قرار دیا۔ اس کے پیچھے ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ جھوٹے مدعی کو کسی بھی درجے کا نبی مان لینے کے بعد رسول اللہ ﷺ کا سب سے زیادہ محبوب ہونا، محفوظ نہیں رہ سکتا، کیونکہ حاضر نبی کا امتی گذرے ہوئے نبی کی محبت کو ترجیح نہیں دے سکتا۔

ردِ قادیانیت میں نقلی دلائل کے ساتھ ساتھ عقلی استدلال کی بھی ضرورت تھی جو اقبال نے پوری کی۔ انہوں نے قادیانیت کے اخلاقی، نفسیاتی اور معاشرتی مضرات کو جس محکمی کے ساتھ واضح اور ثابت کیا ہے وہ آج بھی ہمارے ایمان کی مضبوطی، ترقی اور حفاظت کا سبب بن سکتی ہے۔ جناب محمد متین خالد کی زیرِ نظر کتاب ''علامہ اقبال اور فتنۂ قادیانیت'' میں علامہ اقبال کا پورا موقف خود ان کے الفاظ میں جمع ہوگیا ہے اور اس کے علاوہ اقبال کے تصورِ رسالت پر مختلف حضرات کے لکھے ہوئے بعض عمدہ مقالات یکجا کر دیئے گئے ہیں، جن سے اقبال کا موٴقف سمجھنے میں مزید آسانی ہو جاتی ہے۔ اس تالیف کی افادیت ظاہر ہے۔ دعا ہے کہ یہ زیادہ لوگوں تک پہنچے اور ان کی ایمانی تقویت اور خود موٴلف کی فلاحِ اخروی کا وسیلہ بنے۔

محمد سہیل عمر
ناظم
اقبال اکادمی، پاکستان
لاہور

بانگِ درا

دانائے راز، رومیٔ ہند، حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کی شخصیت ایک کثیر الجہات اور جامع الصفات شخصیت ہے۔ فکری ،نظری اور علمی محاذ پر انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، یہ بات بلاخوفِ اشتباہ کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ علامہ اقبالؒ کوروایتی شاعروں کی طرح کبھی اس پر ناز اور اصرار نہیں رہا کہ وہ ایک بڑے شاعر ہیں۔انہوں نے اپنے لیے ہمیشہ صرف اور صرف اس امر کو مایۂ افتخار و وقار گردانا کہ وہ اسلامیانِ عالم کوادبار وانحطاط کے قعرِ مذلت سے اٹھا کر اقبال وعروج کی سدرہ بوس بلندیوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ انہیں اپنے مداحین سے یہ شکوہ بھی رہا ہے کہ "مرا یاراں غزل خوانے شمردند" وہ اپنی شاعری کو بالِ جبریل کی اڑان دے کر اور بانگِ سرافیل کے قالب میں ڈھال کر عارف و عامی کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔ مسلم شعراء میں علامہ اقبالؒ وہ واحد شخصیت ہیں جنہیں یہ یکتا و یگانہ اعزاز حاصل ہوا کہ اکابرینِ ملت نے انھیں بالاتفاق حکیم الامت قرار دیا۔انہوں نے اپنے شعری ونثری سرمائے کوفکری ونظری سطح پر بیمار ملت کی مسیحائی کے لئے استعمال کیا۔مولانائے رومی کے بعد جنہیں اقبالؒ اپنا مرشدِ معنوی قرار دیتے ہیں، وہ واحد ہستی ہیں کہ وہ الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیلِ جدید کے لئے مجددانہ انداز میں مصافِ افکار ونظریات میں ستیزہ کار ہوئے۔اس مریدِ ہندی نے مرشدِ رومی کے ساتھ جس بے پناہ ارادت وعقیدت کا اظہار کیا اس کی بنیادی وجہ صرف اور صرف عشقِ رسالت مآب ﷺ ہے۔ علامہ کو اس امر کا کامل ادراک واحساس تھا کہ اسلامیانِ عالم کے بیمار و مضمحل وجود کو حیاتِ تازہ بخشنے کا واحد ذریعہ عشقِ رسالت مآب ﷺ ہی کی توانائی اور حرارت ہے۔

ہزاروں سالہ معلوم شدہ انسانی تاریخ کے تمام اوراق پر علامہ کی گہری نگاہ تھی۔ایک وسیع المطالعہ، عمیق النظر اور عبقری مفکر کی حیثیت سے وہ اقوام وملل کے عروج وزوال کے جملہ عوامل و محرکات کا تجزیہ وتحلیل کر چکے تھے۔ وہ واحد قلم بدست مفکر تھے کہ جو اپنی قوم کو تیغ بکف دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلامیانِ عالم مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کریں تاکہ کوئی باطل اور طاغوتی قوت ان سے نبرد آزما ہونے کا تصور ہی نہ کر سکے۔ انہوں نے اُس استعمار ساختہ نبوت کو بیک جنبشِ قلم مسترد کر دیا جو اپنے آقاؤں کے ایماء پر روحِ جہاد کی سرکوبی کے لئے ایک مخصوص

دور میں ''تخلیق'' کی گئی۔ علامہ اقبالؒ نے اس جعلی نبوت کی کارستانیوں سے باخبر ہونے کے بعد لازم جانا کہ وہ اسلامیانِ برصغیر کو اس کی فتنہ سامانیوں سے آگاہ کریں۔ مسیلمہ پنجاب مرزا غلام احمد قادیانی کے دسیسہ کارانہ نظریات اور پرکارانہ تصورات کی گہرائیوں میں چھپے مضمرات سے انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو بروقت متنبہ کیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے ''قادیانیت'' کے نام سے ایک نئے فتنے کو متعارف کروایا۔ علامہ اقبالؒ جو اسلام کے خلاف جنم لینے والے ہر فتنے اور تیار کی جانے والی ہر سازش کے تار و پود اپنی نوکِ قلم سے بکھیرتے رہے، بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس پر خاموش رہتے۔ ختمِ نبوت کے اثبات کے لئے علامہ نے جو دلائل و براہین دیئے، وہ جدید اسلامی علم الکلام میں ایک منفرد اور وقیع حیثیت رکھتے ہیں۔ ردِ قادیانیت علامہ اقبالؒ کا ایک محبوب ترین اور مرغوب ترین موضوع تھا۔ اس موضوع پر انہوں نے مضامین، مکاتیب، اشعار اور خطبات کی شکل میں جو کچھ بھی کہا، وہ قولِ فیصل اور حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ قادیانیت کے حوالے سے علامہ یکے از محرمانِ اسرارِ درونِ خانہ بھی تھے۔

یہ امر میرے لئے باطنی مسرت اور روحانی انبساط کا موجب ہے کہ میں محاذِ ختمِ نبوت پر تیغ و قلم سے سینہ سپر مجاہد برادرم محمد متین خالد کی کتاب ''علامہ اقبالؒ اور فتنۂ قادیانیت'' کے ابتدائیے کے طور پر یہ چند معروضات سپردِ قرطاس کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔ برادرم محمد متین خالد کی تخصیص و اختصاص آئمہ تلبیس کا محاکمہ ہے۔ آئمہ تلبیس کی طویل ترین فہرست میں مرزا غلام احمد قادیانی، اس کا خانوادہ اور پیروکاروں کی فتنہ طرازیوں کی بے حجابی ان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ میں نے اس کتاب کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے۔ ردِ قادیانیت کے حوالے سے علامہ اقبالؒ کی نگارشات اور خدمات کو انہوں نے ایک مربوط گلدستے کی شکل میں یکجا کر دیا ہے۔ یہ کام یقیناً اتنا آساں نہیں تھا۔ اس کے لئے انہیں سینکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کرنا پڑی۔ یہ دقتِ نظری اور دیدہ ریزی کا متقاضی تحقیقی کارنامہ ہے جو محمد متین خالد سے عشقِ رسالت مآب ﷺ اور علامہ اقبالؒ کی ارادت کے بادۂ دو آتشہ کی سرمستی و سرشاری نے کروا دیا۔ میں وجدانی سطح پر محسوس کرتا ہوں کہ ان کے اس شاندار، ثقہ اور مستند کارنامے پر یقیناً حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی روح بھی مسرور و شادماں ہوگی۔ میں انہیں اس خوبصورت کاوش پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔

حافظ شفیق الرحمٰن

کالم نگار

چیف ایڈیٹر

اردو پیپر ڈاٹ کام

علامہ اقبالؒ اور فتنۂ قادیانیت

ترجمانِ حقیقت حضرت علامہ اقبالؒ بیسویں صدی کے شہرۂ آفاق دانشور، عظیم روحانی شاعر، اعلیٰ درجہ کے مفکر اور بلند پایہ فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عہد ساز انسان بھی تھے۔ ایسی زندہ و جاوید ہستیاں صدیوں بعد پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا دل ملتِ اسلامیہ کے ساتھ دھڑکتا تھا۔ وہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے وارث تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے انحطاط اور تنزل کی گھاٹی کی طرف تیزی سے گرتے عالمِ اسلام کے تنِ مضمحل میں ایک نئی روح پھونکی اور اسے انقلاب کی راہ دکھائی۔

علامہ اقبالؒ کے حوالے سے یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ وہ انسانی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اعلیٰ تعلیم یافتہ، راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ جہاں تک قادیانیت کا تعلق ہے تو اس حوالے سے تو وہ محرمِ رازِ درونِ خانہ تھے۔ انہوں نے جب بنظرِ غائر دیکھ لیا کہ مرزائی خود تو مرتد اور کافر ہیں ہی، لیکن عامۃ المسلمین کو بھی مرتد بنانے کے لیے کوشاں ہیں اور ''چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد'' کے مصداق اسلام کا لبادہ اوڑھ کر انہیں گمراہ کر رہے ہیں تو وہ اپنی اسلامی غیرت وحمیت اور عشقِ رسولؐ کے حوالے سے برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے انتہائی زیرکی اور ژرف نگاہی سے اس اہم مسئلے کا جائزہ لیا اور اپنے تاثرات امت مسلمہ کے سامنے واضح انداز میں پیش کر دیئے۔

عاشقِ رسولؐ علامہ اقبالؒ کو اس بات پر کامل ایقان تھا کہ حضرت محمد عربیﷺ کی ذاتِ اقدس پر رسالت و نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا، آپ خاتم النبیین ہیں، آپؐ کے بعد قیامت تک کوئی دوسرا نبی نہیں آئے گا، اگر کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا تو وہ نہ صرف کاذب و مفتری ہے بلکہ وہ واجب القتل ہے۔

قادیانی ہر مشہورِ زمانہ شخصیت کو قادیانی ثابت کرنے میں بڑے حساس اور جلد باز واقع ہوئے ہیں۔ وہ حد درجہ احساسِ کمتری اور کمینگی کا شکار ہیں۔ یہود و نصاریٰ کی ہر ممکن سرپرستی اور امداد کے باوجود انہیں اپنے مذموم مقاصد میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں کی بڑی اور ہردلعزیز شخصیات کو اپنے ہاں مختلف پروگراموں میں مدعو کریں اور اس دوران موقع سے ناجائز فائدہ اٹھا کر قادیانی سربراہوں کے ساتھ مصافحہ یا معانقہ کرتے ہوئے ان کی تصاویر اتار لیں اور پھر آہستہ آہستہ ان تصاویر کو اپنے مختلف جرائد و رسائل میں شائع کر کے ایک منظم پروپیگنڈے کے تحت لوگوں کو آگاہ کیا جائے کہ یہ شخصیات قادیانی ہیں یا کم از کم قادیانیت سے متاثر ہیں۔ اس طرح کا شوشہ انہوں نے بانی پاکستان حضرت قائداعظمؒ، حضرت علامہ اقبالؒ اور محسنِ پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خاں وغیرہ کے بارے میں چھوڑا کہ یہ شخصیات قادیانی ہیں تاکہ ان سے محبت و عقیدت رکھنے والے لوگ مختلف شکوک وشبہات کا شکار ہوکر قادیانیت کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کرلیں اور انہیں بھی مسلمانوں کا ایک فرقہ تصور کرلیں۔ یہ بات قطعی غلط اور حقائق کے منافی ہے کہ مذکورہ شخصیات قادیانیت سے تعلق رکھتی ہیں یا ان کے دل میں قادیانیت کے بارے میں نرم گوشہ ہے۔ آج جھوٹ اور پروپیگنڈے کا بادشاہ گوئبلز زندہ ہوتا تو قادیانی کذب کے سامنے شرمندہ ہوجاتا۔ جہاں تک مذکورہ شخصیات کا تعلق ہے، ان کا قادیانیوں کے بارے میں وہی عقیدہ ہے، جو عام مسلمانوں کا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علامہ اقبالؒ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں جب قادیانیت نے پوری طرح اپنے خبثِ باطن سے پردہ نہیں اٹھایا تھا، اس سے متاثر تھے۔ لیکن جب آنجہانی مرزا قادیانی اور اس کے گماشتوں نے اپنی کتابوں میں کھلم کھلا اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی شروع کر دی تو اقبال نے نہ صرف قادیانیت سے اپنی سخت بیزاری کا اعلان کیا بلکہ اس فتنہ کے محاسبہ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا۔ انھیں اس بات کا مکمل ادراک تھا کہ ملتِ اسلامیہ کو جن فتنوں نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا، ان میں سب سے خطرناک فتنہ قادیانیت کا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے قادیانیوں کی ملتِ اسلامیہ کے خلاف بڑھتی ہوئی سازشوں کو شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے خطبات، مضامین، توضیحات اور خطوط کے ذریعے قادیانیت کی سرکوبی کی اور اس تحریک کے عالم اسلام پر دینی، معاشی اور تمدنی اثرات اور ان کے منفی نتائج سے امتِ مسلمہ کو آگاہ کیا۔ علامہ اقبالؒ کو یہ منفرد اعزاز حاصل ہے

کہ انہوں نے حکومت کو سب سے پہلے یہ مطالبہ پیش کیا کہ قادیانیت کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے کیونکہ یہ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر ملتِ اسلامیہ کی اجتماعیت کو پارہ پارہ کر رہے ہیں اور مسلمانوں کے اندر رہ کر ایک نئی امت تشکیل دے رہے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے پوری زندگی فتنہ قادیانیت کا بھرپور تعاقب کیا جس کی بناء پر قادیانی علامہ اقبالؒ کو اپنا حریف اور دشمن سمجھتے ہیں۔ وہ علامہ اقبالؒ کی زندگی میں تو ان کے درپے آزار تھے ہی، آج بھی وہ زبان وقلم سے مکروہ و مذموم انداز میں ان کی کردار کشی کر رہے ہیں۔ کوئی دن خالی نہیں جاتا جب قادیانی اخبارات و جرائد یا قادیانی ویب سائٹس پر حضرت علامہ اقبالؒ کی کردار کشی، تضحیک اور طنز نہ کی گئی ہو۔ ان کی روحانی شاعری پر رکیک حملے کیے جاتے ہیں۔ فرضی اور افسانوی بہتانِ عظیم باندھے جاتے ہیں۔ یہ اعزاز صرف قادیانی جماعت کو ہی حاصل ہے کہ آنجہانی مرزا قادیانی سے لے کر موجودہ قادیانی خلیفہ مرزا مسرور تک ہر چھوٹا بڑا قادیانی سفید جھوٹ بولنے میں شرم محسوس نہیں کرتا۔ جدید ترین ایجادات اور انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی کوئی شخص یا ادارہ موجود نہیں ہے جو گوئبلز کے پیروکار قادیانیوں کی طرح نہایت مہارت، ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی سے جھوٹ بول سکے۔ جہاں مقام لُد سے مراد لدھیانہ، حضرت عیسیٰؑ سے مراد...... مرزا قادیانی، چادر سے مراد...... بیماری، موت سے مراد...... فتح، مکہ سے مراد...... قادیان، مدینہ سے مراد...... ربوہ ہو، وہاں آپ کیا علمی بات کر سکتے ہیں؟

قادیانی انتہائی مکر و فریب سے کام لیتے ہوئے علامہ اقبالؒ کی نجی زندگی اور شخصیت کی کردار کشی کے لیے خانہ ساز روایتیں گھڑتے رہے اور ان روایتوں کو عام کرنے کے لیے وہ عبدالمجید سالک اور م۔ش ایسے ادیبوں اور دانشوروں کی خدمات اعلیٰ ترین اعزازیوں کے عوض ہائر کرتے رہے۔

زیر نظر کتاب حضرت علامہ اقبالؒ کی بے داغ شخصیت پر قادیانیوں کی طرف سے کیے گئے بے جا اعتراضات اور رکیک حملوں کا دندان شکن جواب ہے۔ علامہ اقبالؒ کے افکار و نظریات کی روشنی میں قادیانیت کی اصلیت تک رسائی میں یہ کتاب نہایت مفید اور کارگر ثابت ہوگی۔ امید ہے فکرِ اقبال کے پرستار میری اس کاوش کو شرفِ قبولیت بخشیں گے اور اسے مزید خوب سے خوب تر بنانے کے لیے اپنی قیمتی آراء سے آگاہ فرمائیں گے۔

محمد متین خالد

شکریہ!!!

- مجلہ ختم نبوت برادرم جناب نعیم آسی مرحوم کا جن کی خوشگوار یادیں اب بھی میری راہنمائی کرتی ہیں، ان کی شہرۂ آفاق کتاب ''اقبال اور قادیانی'' سے میں نے بھرپور استفادہ کیا جس سے زیرنظر کتاب کی اہمیت اور جامعیت میں نہایت اضافہ ہوا ہے۔
- معروف سکالر و دانشور جناب پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر اور محترم عطاء اللہ صدیقی کا جنہوں نے اپنے غیر مطبوعہ گرانقدر مقالوں سے اس کتاب کی علمی رونق بڑھائی۔
- جناب محمد سہیل عمر ناظم اقبال اکادمی، جناب چوہدری مختار احمد کھٹانہ، جناب محمد اختر، جناب چوہدری شبیر احمد، جناب صفدر علی کا جنہوں نے اقبال اکادمی لاہور کی لائبریری میں دورانِ تحقیق مجھے ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ان کے تعاون کے بغیر یہ کتاب تیار نہ کرسکتا تھا۔
- برادر عزیز جناب گل فراز، جناب محمد طاہر عبدالرزاق، جناب حافظ شفیق الرحمٰن، جناب پروفیسر جمیل احمد عدیل، جناب محمد نواز کھرل، جناب سعید اللہ صدیق، جناب ضیاء اللہ کھوکھر (گوجرانوالہ)، جناب رفیع الدین ہاشمی، جناب محمد شاہد حنیف اور جناب شبیر احمد میواتی کی علم دوستی کا جنہوں نے اس کتاب کی تیاری کے سلسلہ میں بے حد علمی معاونت فرمائی۔

یہ فقط آپ کی عنایت ہے
ورنہ میں کیا، میری حقیقت کیا

محمد متین خالد

"نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر"

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اقبالؒ کی اسلام سے والہانہ عقیدت

دنیا کا میدان ابتدا سے جدید ترین دور تک ''اکابر پرستی Hero-worship'' کی جانب رہا ہے۔ ہر بڑی چیز کو دیکھ کر ہذا ربی ہذا اکبر کہنے کی عادت، جس کا ظہور قدیم ترین انسان سے ہوا تھا۔ آج تک اُس سے نہیں چھوٹی ہے۔ جس طرح دو ہزار برس پہلے بودھ کی عظمت کا اعتراف اس مخلوق کے نزدیک بجز اس کے اور کسی صورت سے نہ ہوسکتا تھا کہ اُس کا مجسمہ بنا کر اس کی عبادت کی جائے، اسی طرح آج بیسویں صدی میں دنیا کی سب سے زیادہ سخت منکرِ عبودیت قوم (روس) کا ذہن لینن کی بزرگی کے اعتراف کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں سوچ سکتا کہ اس کی شخصیت کے آگے مراسم عبودیت بجالائیں۔

لیکن مسلمان کا نقطہ نظر اس بات میں عام انسانوں سے مختلف ہے۔ اکابر پرستی کا تصور اس کے ذہن کی افتاد سے کسی طرح میل نہیں کھاتا۔ وہ بڑوں کے ساتھ برتاؤ کرنے کی طرف ایک ہی صورت سوچ سکتا ہے۔ اللہ نے ان کو زندگی کا سیدھا راستہ بتادیا تھا جس پر چل کر وہ بزرگی کے مراتب تک پہنچے۔ لہٰذا ان کی زندگی سے سبق حاصل کرو اور اس کے مطابق عمل کرو۔

اسی نقطہ نظر سے اس مختصر سے مضمون میں اپنی قوم کے نوجوانوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ جس اقبالؒ کی عظمت کا سکہ ان کے دلوں پر بیٹھا ہے اس کی زندگی کیا سبق دیتی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ اقبالؒ نے یہی مغربی تعلیم حاصل کی تھی جو ہمارے نوجوان انگریزی یونیورسٹیوں میں حاصل کرتے ہیں۔ یہی تاریخ، یہی ادب، یہی اقتصادیات، یہی سیاسیات، یہی قانون اور یہی فلسفہ انھوں نے بھی پڑھا تھا اور ان فنون میں بھی وہ مبتدی نہ تھے بلکہ منتہی فارغ التحصیل تھے۔ خصوصاً فلسفہ میں تو ان کو امامت کا مرتبہ حاصل تھا جس کا اعتراف موجودہ دور کے اکابر فلاسفہ تک کر چکے ہیں۔ جس شراب کے دو چار گھونٹ پی کر بہت سے لوگ بہکنے لگتے ہیں، یہ مرحوم اس کے سمندر پیے بیٹھا تھا۔ پھر مغرب اور اس کی تہذیب کو بھی اس نے محض ساحل پر سے نہیں دیکھا تھا جس طرح ہمارے

99 فیصد نوجوان دیکھتے ہیں بلکہ وہ اس دریا میں غوطہ لگا کر تہ تک اُتر چکا تھا اور ان سب مرحلوں سے گزرا تھا جن میں پہنچ کر ہماری قوم کے ہزاروں لوگ اپنے دین و ایمان، اپنے اصول، تہذیب و تمدن اور اپنے قومی اخلاق کے مبادی تک سے برگشتہ ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ اپنی قومی زبان تک بولنے کے قابل نہیں رہتے۔

لیکن اس کے باوجود اس شخص کا حال کیا تھا؟ مغربی تعلیم و تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا' اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اس کی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی نہیں رہا۔ جو کچھ سوچتا تھا، قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا۔ جو کچھ دیکھتا تھا' قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا حقیقت اور قرآن اس کے نزدیک شے واحد تھے' اس شے واحد میں وہ اس طرح فنا ہو گیا تھا کہ اس دور کے علمائے دین میں بھی مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو فنائیت فی القرآن میں اس امامِ فلسفہ اور اس ایم' اے' پی ایچ ڈی بار ایٹ لاء سے لگا کھاتا ہو۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ آخری دور میں اقبالؒ نے تمام کتابوں کو الگ کر دیا تھا اور سوائے قرآن کے اور کوئی کتاب وہ اپنے سامنے نہ رکھتے تھے۔ سالہا سال تک علوم و فنون کے دفتروں میں غرق رہنے کے بعد جس نتیجہ میں پہنچے تھے، وہ یہ تھا کہ اصلی علم قرآن ہے، اور یہ جس کے ہاتھ آ جائے وہ دنیا کی تمام کتابوں سے بے نیاز ہے۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے ان کے پاس فلسفہ کے چند اہم سوالات بھیجے اور ان کا جواب مانگا۔ ان کے قریب رہنے والے لوگ متوقع تھے کہ اب علامہ اپنی لائبریری کی الماری کھلوائیں گے اور بڑی بڑی کتابیں نکلوا کر ان مسائل کا حل تلاش کریں گے مگر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ لائبریری کی الماریاں مقفل کی مقفل رہیں' اور وہ صرف قرآن ہاتھ میں لے کر جواب لکھوانے بیٹھ گئے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی ذاتِ مبارک کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت کا حال اکثر لوگوں کو معلوم ہے مگر یہ شاید کسی کو نہیں معلوم کہ انھوں نے اپنے سارے تفلسف اور اپنی تمام عقلیت کو رسول عربی صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے قدموں میں ایک متاعِ حقیر کی طرح نذر کر کے رکھ دیا تھا۔ حدیث کی جن باتوں پر نئے تعلیم یافتہ نہیں پرانے مولوی تک کان کھڑے کرتے ہیں اور پہلو بدل بدل کر تاویلیں کرنے لگتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر آف فلاسفی ان کے ٹھیٹھ لفظی مفہوم پر ایمان رکھتا تھا اور ایسی کوئی حدیث سُن کر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے دل میں شک کا گزر نہ ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے ان کے سامنے بڑے اچنبھے کے انداز میں اس حدیث کا ذکر کیا جس میں بیان ہوا ہے کہ ''رسول صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم اصحابِ ثلاثہ کے ساتھ کوہِ اُحد پر تشریف رکھتے تھے۔ اتنے میں اُحد لرزنے لگا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ٹھہر جا' تیرے اوپر ایک نبیؐ ایک صدیقؓ اور دو شہیدوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اس پر پہاڑ ساکن ہوگیا۔" اقبالؒ نے حدیث سنتے ہی کہا کہ اس میں اچنبھے کی کونسی بات ہے؟ میں اس کو استعارہ مجاز نہیں بالکل ایک مادی حقیقت سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اس کے لیے کسی تاویل کی حاجت نہیں۔ اگر تم آگاہ ہوتے تو تمھیں معلوم ہوتا کہ ایک نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نیچے آ کر مادے کے بڑے سے بڑے تو دے بھی لرز اٹھتے ہیں۔ مجازی طور پر نہیں واقعی لرز اٹھتے ہیں۔

اسلامی شریعت کے جن احکام کو بہت سے روشن خیال حضرات فرسودہ اور بوسیدہ قوانین سمجھتے ہیں اور جن پر اعتقاد رکھنا ان کے نزدیک ایسی تاریک خیالی ہے کہ مہذب سوسائٹی میں اس کی تائید کرنا ایک تعلیم یافتہ آدمی کے لیے ڈوب مرنے سے زیادہ بدتر ہے۔ اقبالؒ نہ صرف ان کو مانتا اور ان پر عمل کرتا تھا بلکہ برملا ان کی حمایت کرتا تھا' اور اس کو کسی کے سامنے ان کی تائید کرنے میں باک نہ تھا۔ اس کی ایک معمولی مثال سن لیجئے۔ ایک مرتبہ حکومتِ ہند نے ان کو جنوبی افریقہ میں اپنا ایجنٹ بنا کر بھیجنا چاہا اور یہ عہدہ ان کے سامنے باقاعدہ پیش کیا مگر شرط یہ تھی کہ وہ اپنی بیوی کو پردہ نہ کرائیں گے اور سرکاری تقریبات میں لیڈی اقبالؒ کو ساتھ لے کر شریک ہوا کریں گے۔ اقبالؒ نے اس شرط کے ساتھ یہ عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور خود لارڈ ولنگڈن سے کہا کہ میں بے شک ایک گنہگار آدمی ہوں' احکام اسلام کی پابندی میں بہت کوتاہیاں مجھ سے ہوتی ہیں' مگر اتنی ذلت اختیار نہیں کر سکتا کہ محض آپ کا ایک عہدہ حاصل کرنے کے لیے شریعت کے حکم کو توڑ دوں۔

قرآن مجید کی تلاوت سے ان کو خاصا شغف تھا اور صبح کے وقت بڑی خوش الحانی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے مگر آخیر زمانہ میں طبیعت کی رقت کا یہ حال ہوگیا تھا کہ تلاوت کے دوران میں روتے روتے ہچکیاں بندھ جاتی تھیں اور مسلسل پڑھ ہی نہ سکتے تھے۔ نماز بھی بڑے خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے مگر چھپ کر۔ ظاہر میں یہی اعلان تھا کہ نرا گفتار کا غازی ہوں۔

ان کی سادہ زندگی اور فقیرانہ طبیعت کے حالات ان کی وفات ہی کے بعد لوگوں میں شائع ہوئے۔ ورنہ عام خیال یہی تھا کہ جیسے اور "سر صاحبان" ہوتے ہیں، ویسے ہی وہ بھی ہوں گے، اور اسی بنا پر بہت سے لوگوں نے یہاں تک بلا تحقیق لکھ ڈالا تھا کہ ان کی بارگاہِ عالی تک رسائی کہاں ہوتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ شخص حقیقت میں اس سے بھی زیادہ فقیر منش تھا جتنا اس کی وفات کے بعد لوگوں نے اخبارات میں بیان کیا ہے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ سن لیجئے، جس سے اس بیرسٹر کی طبیعت کا آپ اندازہ کر سکیں گے۔ پنجاب کے ایک دولت مند رئیس نے ایک قانونی مشورہ کے لیے اقبالؒ اور سر فضل حسین

مرحوم اور ایک دو اور مشہور قانون دان اصحاب کو اپنے ہاں بلایا اور اپنی شاندار کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا۔ رات کو جس وقت اقبالؒ اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لیے گئے تو ہر طرف عیش و تنعم کے سامان دیکھ کر اور اپنے نیچے نہایت نرم اور قیمتی بستر پا کر معاً ان کے دل میں خیال آیا کہ جس رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جوتیوں کے صدقے میں آج ہم کو یہ مرتبے نصیب ہوئے ہیں انھوں نے بوریئے پر سو سو کر زندگی گزاری تھی۔ یہ خیال آنا تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ اس بستر پر لیٹنا ان کے لیے ناممکن ہو گیا۔ اُٹھے اور برابر غسل خانے میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور مسلسل رونا شروع کر دیا۔ جب ذرا دل کو قرار آیا تو اپنے ملازم کو بلا کر اپنا بستر کھلوایا اور ایک چارپائی اس غسل خانہ میں بچھوائی اور جب تک وہاں مقیم رہے، غسل خانہ ہی میں سوتے رہے۔ یہ وفات سے کئی برس پہلے کا واقعہ ہے، جب باہر کی دنیا ان کو سوٹ بوٹ میں دیکھا کرتی تھی۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ اس سوٹ کے اندر جو شخص چھپا ہوا ہے اس کی اصلی شخصیت کیا ہے؟ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو سیاسی اغراض کے لیے سادگی و فقر کا اشتہار دیتے ہیں اور سوشلسٹ بن کر غریبوں کی ہمدردی کا دم بھرتے ہیں مگر پبلک کی نگاہوں سے ہٹ کر ان کی تمام زندگی رئیسانہ اور عیش پسندانہ ہے۔

محمد تحسین

اقبال اور عشقِ رسول ﷺ

ہر کہ عشقِ مصطفیٰ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

عشق کی تعریف تو بڑے بڑے علماء وفضلاء نے بڑی تشریح کے ساتھ کی ہے مگر سیدھے سادے لفظوں میں عشق سے مراد اپنی ہستی کو معشوق کی ہستی میں ضم کر دینا، محبوب کی اطاعت کو اپنا شعار بنا لینا ہے۔ عاشق کا اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا کھانا پینا غرض یہ کہ تمام افکار واعمال کا محور محبوب کا عشق اور اس کا تصور ہوتا ہے۔ عشق وعرفان میں عاشق کی مرضی معشوق کی مرضی میں مل جاتی ہے۔ اس کی ہر عادت محبوب کی عادت کے تابع ہوتی ہے۔ اسلام میں عشق کا تصور بہت گہرا ہے۔

اسلام میں عشقِ رسول کی اہمیت کسی بھی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں: ان کنتم یحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ. (اے حبیب) (فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرے فرماں بردار ہو جاؤ اللہ تم کو دوست رکھے گا۔) قرآن کریم میں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ ہر مسلمان کا عمل حضور کے عمل کے تابع ہو۔ اس کی ہر عادت حضور کی عادت کے مشابہ ہو۔ وہ انھیں اپنائے۔ حضورؐ کا تصور اور حضورؐ کی یاد اس کا ایمان ہو۔ حضورؐ کی اطاعت ہی عشقِ رسول ہے اور عشق ہی کامل دین وایمان ہے۔ حضور پاکؐ کی ایک حدیث مبارکہ میں بھی ہے کہ تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کے جان و مال اور والدین سے بھی زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں۔ حضورؐ کی حدیث مقدسہ کے بعد حب رسول اور عشق نبی ہی کا ایمان ہونے میں کوئی شائبہ باقی نہیں رہتا۔ عشقِ رسولؐ کے ظاہر کرنے کا طریقہ جو کہ ادب میں ہے وہ یہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعریف وتوصیف محاسنِ جمیلہ کا ذکر مبارک یعنی نعت گوئی جو کہ اردو زبان کے اکثر شعراء کے کلام کا جزوِ اعظم ہے۔

علامہ اقبالؒ کے کلام میں بھی عشقِ رسولؐ کے متعلق بہت بڑا حصہ شامل ہے بلکہ اگر یہ کہا

جائے تو زیادہ موزوں ہوگا کہ اقبال کی شاعری کا خلاصہ جوہر لب لباب ہی عشق رسولؐ اور اطاعت رسول ہے۔ علامہ اقبال کو حضورؐ سے سچی محبت تھی اور حضورؐ کی سچی لگن تھی۔ ان کے رگ و پے میں عشق رسولؐ سرایت کر چکا تھا۔ ان کا تصور' ان کا خیال' ان کا کلام' ان کے حالات' ان کے واقعات اور ان کی عادات و افعال اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ اقبال، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ انھیں حضور سے والہانہ عشق تھا۔ وہ عشقِ رسولؐ کے پیکر تھے۔

ان کے حالات اس بات کے آئینہ دار ہیں۔ فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں کہ اقبال کا دل عشقِ رسولؐ نے گداز کر رکھا تھا۔ زندگی کے آخری زمانے میں تو یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکرِ مبارک آ جاتا تو ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے تھے اور آخری عمر میں یہ کیفیت اس انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ ہچکی بندھ جاتی تھی۔ آواز تھرا جاتی تھی اور وہ کئی کئی منٹ سکوت اختیار کر لیتے تھے تاکہ اپنے جذبات پر قابو پا سکیں اور گفتگو جاری رکھ سکیں۔

جب ڈاکٹر صاحب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس سے واپس آئے تو فقیر سید نجم الدین ان سے ملنے گئے۔ ڈاکٹر صاحب سے اُن کے سفر کے تجربات کے متعلق بات ہونے لگی۔ اثنائے گفتگو میں سیّد نجم الدین نے کہا: ''اقبال تم یورپ ہو آئے۔ مصر و فلسطین کی سیر بھی کی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ واپسی پر روضۂ اطہر کی زیارت سے بھی آنکھیں نورانی کر لیتے۔'' یہ سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کی حالت دگرگوں ہو گئی' یعنی چہرے پر زردی چھا گئی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ چند لمحات تک یہی کیفیت رہی، پھر فرمانے لگے۔

''فقیر میں کس منہ سے روضۂ اطہر پر حاضر ہوتا۔''

علامہ اقبال کی سیرت اور زندگی کا سب سے زیادہ محبوب اور قابلِ قدر وصف جذبۂ عشقِ رسولؐ ہے۔ ذاتِ رسالت مآب کے ساتھ انھیں جو عشق تھا، جو والہانہ عقیدت تھی اس کا اظہار ان کی چشم غمناک سے ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی اقبال کے سامنے حضورؐ کا نام لیتا' ان پر جذبات کی شدت طاری ہو جاتی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بندھ جاتی۔ رسالت مآبؐ کا ذکر آتے ہی اقبال بے قابو ہو جاتے۔ جب کفارِ مدینہ کے وہ جور و ستم سنتے جو انھوں نے محسنِ کائنات پر کیے تھے' جو جو ظلم انھوں نے فخرِ کائنات پر ڈھائے تھے اور جس جس طرح سے انھوں نے خیر البشر کو تنگ کیا تھا، یہ سب کچھ سن کر اقبال بے اختیار رو اٹھتے اور بہت دیر یہ حالت طاری رہتی۔ اقبال نے حضور کی جو مدح سرائی اور نعت گوئی کی ہے اس کا انداز سب سے الگ ہے۔ اقبال کو محسنِ انسانیت اور انسانِ برتر کی تلاش تھی۔ انھیں ان خوبیوں کی حامل ایک ہی ذات نظر آئی اور وہ رسالت مآبؐ کی ذاتِ طاہرہ تھی۔

اقبال نے مغربی تعلیم حاصل کی۔ یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھے۔ وہاں کے بڑے

بڑے علم کدوں میں صہبائے علم کے ایاغ چڑھائے۔ بڑے بڑے فلسفیوں کے خیالات سے استفادہ کیا۔ دنیا کے کونے کونے میں گہر ہائے علم تلاش کیے۔ ان کا شمار بذاتِ خود عظیم فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک عظیم فلسفی شاعر تھے۔ اس زمانے میں فلسفی کا مطلب ہی منکرِ خدا اور منکرِ مذہب لیا جاتا تھا' جسے مذہب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا لیکن اقبال نے بحیثیت ایک فلسفی کے کہا تو یہی کہا:

سُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

عشقِ رسولؐ ان کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ وہ بہت بڑے فلسفی تھے اور فلسفے کا سارا معاملہ عقل کے بل بوتے پر چلتا ہے۔ مگر رسول اللہ کی سیرت کو عقل کی کسوٹی پر جانچنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ ان معاملات میں وہ ایمان بالغیب کے قائل تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جو فرما دیا وہی دین و ایمان ہے اور سر آنکھوں پر۔ ان کی بارگاہ میں چون و چرا کرنے کی گنجائش نہیں۔ سمعنا و اطعنا اطاعت اور فرمانبرداری اور غلامی ہی ایمان بلکہ اسلام کی بنیاد ہے:

بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

یہ عشقِ رسولؐ کس وجہ سے تھا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کو اگر کوئی انسان برتر خیر البشر نبی کامل نظر آیا ہے تو صرف حضور پاک ہی تھے۔

ان کے اور بھی واقعات ایسے ملتے ہیں' جن سے عشقِ رسول کا والہانہ اظہار ہوتا ہے۔ اس طرح ان کے کلام' ان کے غور و فکر کی بنیاد ہی عشقِ ذاتِ رسالت مآب تھی۔ یہ شہرۂ آفاق شاعر اور فلسفی ہر وقت مدینہ کے خواب دیکھتا ہے۔ مدینہ کا ذکر ان کا دین و ایمان ہے اور اس کا بیان اس انداز میں کرتے ہیں:

خاکِ یثرب از دو عالم خوش تر است
اے خنک شہرے کہ آں جا دلبر است

''بلادِ اسلامیہ'' کے عنوان سے علامہ اقبال نے ایک طویل نظم زینتِ قرطاس کی ہے' جس میں دلی' بغداد' قرطبہ اور دوسرے شہروں کا ذکر بڑے درد انگیز لہجے میں کیا۔ ان کی زبوں حالی کا رونا رویا۔ ان کی حالتِ زار پر ماتم کیا۔ مگر جب مدینہ منورہ کا ذکر زبان پر آتا ہے تو ان کی حالت بدل جاتی ہے۔ ان کا اندازِ فکر تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان کے طرزِ گفتار میں ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ مدینہ اطہر کے متعلق فرماتے ہیں:

وہ زمیں ہے تُو مگر اے خواب گاہ مصطفیٰ!
دید ہے کعبہ کو تیری حجِ اکبر سے سوا

خاتم ہستی میں تو تاباں ہے مانند نگیں
اپنی عظمت کی ولادت گاہ ہے تیری زمیں

یثرب کی زمیں کی اس بزرگی اور اس عظمت کی وجہ کیا ہے؟ کیوں اس کی بزرگی اور خوبی کے نغمے گائے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ بیان فرماتے ہیں:

تجھ میں راحت اس شہنشاہِ دو عالم کو ملی
جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی

اور پھر اس شہنشاہ کی عظمت کا بھی ذکر فرماتے ہیں:

نام لیوا جس کے شہنشاہِ دو عالم ہوئے
جانشیں قیصر کے، وارث مسندِ جم کے ہوئے

پھر مدینے کی مرکزیت کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام
ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام
آہ یثرب دیس ہے مسلم کا اور ماویٰ ہے تُو
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تُو

اور پھر کتنی صاف حقیقت نگاری کرتے ہیں:

جب تلک باقی ہے تُو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں، گوہرِ شبنم بھی ہیں

اپنے اصلی مرکز اور اصلی وطن کو جس سے اُن کا روحانی تعلق ہے نہیں بھولے اور اس کی عظمت و بزرگی بھی ان کے دل پر نقش ہے۔ دنیا کی فریب کاریوں، دغابازیوں، تباہیوں، جنگ و جدال سے مایوس ہو کر ان کی نظر امید کی کرن کہیں دیکھتی ہے تو وہ مدینۂ اطہر ہی ہے۔ ان کی نگاہیں سہارا ڈھونڈنے کے لیے بے اختیار مدینہ منورہ کی طرف اٹھتی ہیں۔ اس دور میں جب کہ بڑے بڑے سیاست دان دنیا کی راہنمائی کر رہے تھے، اقبال کو اگر راہنما ملتا ہے اور میر کارواں پسند آتا ہے تو وہ میر حجاز ہی ہے۔ ترانہ ملی میں جس کے ہر شعر سے اسلام سے شیفتگی، شعائرِ اسلام سے عشق و محبت ٹپکتی ہے۔ اس کے آخر میں فرماتے ہیں:

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اقبال مسلمانوں کے دلوں میں عشقِ رسولؐ کا تصور بٹھا دینا چاہتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو

دوبارہ اُن کے اصلی وطن کی طرف لے جانا چاہتے ہیں' جسے فراموش کر کے مسلمان قوم ذلت و خواری کے عمیق گڑھے میں جا گری ہے۔ اقبال مسلمانوں کی یہ حالت دیکھ کر کڑھتے ہیں۔ ان پر مسلمانوں کی یہ غفلت بہت شاق گزرتی ہے۔ وہ کس طرح گوارا کریں کہ ان کے محبوب رسولؐ کی امت خوابِ غفلت میں پڑی سوئے۔ اس دور میں وطن کا تصور بڑا عجیب ہے۔ اپنے وطن کے لیے خواہ کسی کا گلا کیوں نہ گھونٹنا پڑے' جائز ہے، بہتر ہے کیونکہ وطن کے مفاد کا تقاضا ہے۔ انگریز اپنی سلطنت کو وسیع کرے۔ اپنی مصنوعات کی کھپت کے لیے دوسروں کی آزادی سلب کرے اور نو آبادیات کا نظام قائم رکھے' یہ جائز ہے۔ ہندو لیڈر کشمیر کو اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑے رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کا مفاد اس میں ہے۔ اقبال وطن کا یہ تصور دیکھ کر خاموش نہ رہ سکے۔ وہ چلا اٹھے:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے

اس وقت حب اسلام درمیان میں آ جاتا ہے، مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جھنجھوڑ کر جگاتے ہیں اور ابھارتے ہیں:

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دین ہے تُو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

پھر اقبال حبِ رسول کا واسطہ درمیان میں لاتے ہیں اور کہتے ہیں:

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

مسلمان کا اصلی ایمان ہی ارشادِ نبوت کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہے۔ وطن کے نام پر دین اور سیاست کی آویزش کو اقبال نے محسوس کیا اور فوراً اپنے اسلامی خیالات کو نظم کا جامہ پہنا کر مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیا کیونکہ وہ اپنے محبوب رسولؐ کی امت کو غلط راستے پر گامزن دیکھ کر چپ نہ رہ سکے تھے۔

حبِ رسولؐ کی چنگاری اقبال کے سینہ میں سلگ رہی تھی۔ درِ حبیب پر پہنچنے کا خیال انہیں تڑپا رہا تھا کہ اقبال کو خبر ملی کہ بخارا کا ایک مسافر سفرِ حج کے دوران بدوؤں کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔ اقبال کے

دل پر اس واقعہ نے بہت اثر چھوڑا۔ ان کی چشم تصور کے سامنے فوراً وہ نقشہ گھوم گیا اور اس نقشہ کو تصورات کی دنیا سے نکال کر الفاظ کا لبادہ پہنا کر اس طرح پیش کرتے ہیں:

خوف کہتا تھا مدینے کی طرف تنہا نہ چل
شوق کہتا تھا کہ تُو مسلم ہے بیباکانہ چل

اور یہ خوف وتردد شوق کے راستے میں حائل نہ ہو سکا غیرتِ عشق ابھارتی ہے:

بے زیارت سوئے بیت اللہ پھر جاؤں گا کیا؟
عاشقوں کو روزِ محشر منہ نہ دکھلاؤں گا کیا؟

یہ تاثرات کس کے ہو سکتے ہیں؟ صاف ظاہر ہے کہ جس کا ساغر دل عشقِ محبوب سے لبریز ہو۔ وہ عشقِ رسول میں تڑپتا ہو۔ جس کے رگ رگ میں عشق رسول جاگزیں ہو وہی ان خیالات کا اظہار کرے گا۔

اقبال مسلمانوں کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتے کہ مسلمانی کے دعوے کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کے مفکرین سے متاثر اور آقائے نامدار کے ساتھ بے وفائی! وہ مسلمانوں کی یہ حالت دیکھ کر جس طرح کڑھتے ہیں اس کا صحیح اندازہ تو وہ خود ہی کر سکتے ہیں۔ مگر جس دردناک لہجے اور رقت کے ساتھ اس کا بیان کرتے ہیں وہ بھی اس کا عکس پیش کرتا ہے۔ کہتے ہیں:

کل ایک شوریدہ خواب گاہِ نبی پہ رو رو کے کہہ رہا تھا
کہ آج ہندوستان کے مسلم بنائے ملت لٹا رہے ہیں
یہ زائرانِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
بھلا ہمیں ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں

ذاتِ رسالت مآبؐ سے اقبال کا عشق اور محبت جس والہانہ انداز میں ہے وہ چھپائے نہیں چھپتا۔ وہ طرح طرح سے حیلے بہانے کر کے اور مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ سینۂ اقبال میں ملاقاتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بے چین ہے۔ جب بے قراری زیادہ بڑھتی ہے تو اس کے مداوے کے لیے تصور کی دنیا میں رسالت مآب کے حضور پہنچ جاتے ہیں اور پھر وہاں کی کیفیت، وہاں کی حالت، وہاں کا واقعہ، جس مزے کے ساتھ بیان کرتے ہیں اس کے اثر اور سوز و گداز کا کیا کہنا۔ اس کے بیان سے ہی عجیب کیفیت اور سرور کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے مجھ کو
حضورِ آیۂ رحمت میں لے گئے مجھ کو

وہاں حاضری اور طلبی کے بعد کیا ہوا۔ فرماتے ہیں:

کہا حضور نے اے عندلیبِ باغِ حجاز!
کلی کلی ہے تری گرمئی لوا سے گداز
ہمیشہ سر خوشِ جامِ ولا ہے دل تیرا
فتادگی ہے تری غیرتِ سجود و نیاز
اڑا جو پستئ دنیا سے تُو سوئے گردوں
سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعتِ پرواز
نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تُو آیا؟

یہ سوال بہت نازک تھا۔ اس کا کیا جواب دیا جا سکتا تھا۔ بزم رسالت میں سناٹا طاری تھا۔ زبانیں خاموش تھیں۔ یہ سوال اگر بڑے تہجد گزار اور زاہد و عابد سے بھی کیا جائے تو کیا جواب دے۔ وہاں تو بڑے بڑے عاشقوں کی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں۔ بولنے کی تاب نہیں۔ قوت گویائی جواب دے جاتی ہے لیکن اقبال پھر اقبال تھے۔ ان کے ذہن نے فوراً جواب پیدا کر لیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سلطنتِ عثمانیہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ خلافتِ اسلامیہ اپنے آخری سانس پورے کر رہی تھی۔ فرنگی طاقتیں دنیا پر چھا چکی تھیں۔ قتل و غارت و تباہی ایک کھیل سمجھا جاتا تھا۔ سامراجی طاقتیں ایک قیامت کا سماں پیش کیے ہوئے تھیں۔ طرابلس کے مسلمان اطالیہ کی ہوسِ جوع الارض کا شکار ہو رہے تھے اور شوقِ شہادت کی پونجی لے کر میدان میں اتر آئے تھے۔ حق اور سچائی کی خاطر اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ اس وقت اقبال کے تصور میں یہ منظر آ گیا۔ وہ یوں گویا ہوئے:

"حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی"

گویہ مجبوریاں اور معذوریاں اپنی جگہ بجا ہیں۔ مگر بارگاہِ نبوت میں نذرانہ حاضر ہے:

"مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی"

وہ کیا چیز ہے، جس سے جنت بھی محروم ہے۔ مگر اقبال بزمِ رسالت میں پیش کر رہے ہیں؟

"جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں"

کیا اس سے بھی بڑھ کر کوئی نذرانہ ہو سکتا ہے؟ جو اقبال بارگاہِ رسالت میں پیش کر سکتے ہیں۔ اقبال نے شکوہ اور جواب شکوہ کے نام سے ایک عظیم الشان اور طویل نظم لکھی۔ اقبال اس میں مسلمانوں کی تاریخ کے مختلف ادوار کا ذکر کرتے ہیں۔ اللہ سے شکوہ عجیب رنگ میں ہے۔ پھر اس کا جواب بھی خوب ہے۔ حضور کی مثال آخر میں لاتے ہیں اور ان کے نام پر ابھارتے ہیں:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اجالا کر دے

اور جس اسمِ مبارک کی برکت سے یہ سب کچھ کرایا جا رہا ہے اس کا ذکر اقبال خدا کی طرف سے اس طرح کرتے ہیں:

ہو نہ یہ پھول، تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو
بزم توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

اس کی وجہ کیا ہے؟ فرماتے ہیں:

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

یہ عالم رنگ و بو یہ چمن یہ رونقِ گلستان سب حضور کے دم قدم سے ہی ہیں۔ اس کا ذکر اقبال اپنے اشعار میں کر چکے ہیں۔ کتنی محبت اور عشق ظاہر ہے اس سے۔ اس شخص کی عشقِ رسولؐ میں کیا کیفیت ہو گی، جس کا کلام اس حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ ذکرِ رسول پر اقبال کے آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ رقت طاری ہو جاتی تھی۔ فرطِ محبت سے بے خود ہو جاتے تھے۔ اس نظم کے آخر میں ترجمانِ خدا کے طور پر فرماتے ہیں:

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اقبال کی زبان کس قدر حقیقت کی عکاسی کر رہی ہے۔ حُبِ رسول کا کوئی واقعہ ملے اقبال اسے اپنا موضوع بنا لیتے ہیں۔ پھر اس میں وہ جوش اور ولولہ اور والہانہ عقیدت پیش کرتے ہیں کہ قارئین

کے قلب پر نقش ہو جاتی ہے۔

اقبال دنیا کی حالتِ زار دیکھ رہے ہیں۔ یہ تکفیر کا شوق' یہ فرقہ بندی' یہ مطلب پرستی' یہ اپنے مفاد کے لیے مذہب کی اڑتی ہوئی دھجیاں' یہ دین کے نام پر سودے بازی' دیکھ کر وہ عرضِ حال کے لیے جائیں تو کہاں جائیں؟ صرف آستانہ نبوت پر۔ فرماتے ہیں:

کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم
وہ گدا کہ تُو نے عطا کیے ہیں جنھیں دماغِ سکندری

اقبال جب رسالت پناہ کی بارگاہ میں حاضری دیتے ہیں اور گویا ہوتے ہیں تو عجیب حالت ہو جاتی ہے۔ حضورؐ کے حضور ان کی حالت اور ہوتی ہے اور خود رفتگی اور مستی کا عالم طاری ہوتا ہے۔ اقبال روضۂ اطہر پر حاضر ہوتے ہیں:

بہر دہلیز تو از ہندوستاں آوردہ ام
سجدہ ی شوقے کہ خوں گردید در سیمائے من

اس نظم کے آخری شعر میں کہتے ہیں:

با خدا در پردہ گویم آشکار
یا رسول اللہ او پنہان و تو پیدائے من

اقبال کی زندگی میں مختلف تبدیلیاں آتی رہیں۔ تغیرات ظہور پذیر ہوتے رہے۔ مگر عشقِ رسول کو دوام حاصل تھا۔ حب رسولؐ کے بعد ویسے بھی کوئی کسی در پر نہیں جا سکتا۔ سیرۃ النبیؐ کے متعلق اقبال نے مفصل لکھا اور حضور کے اخلاق' حضور کے عفو' حضور کے محاسن جمیلہ کا نقشہ کھینچا اور اپنی شاعری کو اس سے زینت بخشی۔ اقبال کو علامہ اور حکیم الامت ہوتے ہوئے بھی اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کا احساس تھا۔ شروع میں دانشِ افرنگی سے مرعوب بھی ہوئے' وطن کے بت کو ابتدا میں تسلیم بھی کیا مگر جیسے جیسے اسلام سے رغبت' حضور سے محبت اور عشق بڑھتا گیا، واقف اسرار ہوتے گئے، دھبے دھلتے گئے۔ خود التجا کرتے ہیں:

تُو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری

عشق و عقل دنیا پر محیط ہے۔ عقل سے کام بگڑتے ہیں اور عشق سے بنتے ہیں۔ عشق تعمیر میں کارفرما ہے تو تخریب میں عقل۔ عشق سے ہی دنیا کا وجود ہے۔ نظام کائنات عشق کے دم قدم سے قائم ہے۔ اقبال پہچان گئے کہ عشقِ رسول ہی حاصلِ کائنات ہے۔ زندگی کی کامیابی ہی نہیں بلکہ عالم کی

کامیابی کارازاسی میں مضمر ہے۔عقل کے چکر کووہ سمجھتے تھے۔اسے ان لفظوں میں پیش کرتے ہیں:

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ، عقل تمام بولہب

عشق کی حالت اور کیفیت عجیب ہوتی ہے۔جب شاعر کے دل پر کوئی اثر کارفرما ہوتا ہے تو اسے دلاویز طریقے میں پیش کرتا ہے۔وہ اس حالت اور کیفیت کو لفظوں کے آبدار موتیوں کی صورت میں صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتا ہے۔اقبال کا بھی یہی حال ہے۔انھوں نے عشقِ رسول میں بہت کچھ کہا اور جتنا کہا کم کہا۔ان کے کلام کا وافر حصہ اس بات کا آئینہ دار ہے۔مدینے سے وابستگی، رسول خدا سے شیفتگی،اقبال کا سرمایہ کلام ہے:

موت آ جائے جو یثرب کے کسی کوچے میں
میں نہ اٹھوں جو مسیحا بھی کہے قم مجھ کو

ہزار جنت کو کھینچتا تھا ہمیں مدینے سے آج رضواں
ہزار مشکل سے اس کو ٹالا بڑے بہانے بنا بنا کر

لحد میں تیرے شہید سوئے تو، حور جنت کو، اس میں کیا ہے
کہ شور محشر کو بھیجتی ہے خبر نہیں کیا سکھا سکھا کر

شہید عشقِ نبی ہوں میری لحد پہ شمعِ قمر جلے گی
اٹھا کے لائیں گے خود فرشتے چراغ خورشید سے جلا کر

خیال راہِ عدم سے اقبال تیرے در پر ہوا ہے حاضر
بغل میں زادِ عمل نہیں ہے صلہ مری نعت کا عطا کر

❀……❀……❀

صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی

جن کا سرمایۂ ہستی تھا فقط عشقِ رسول ﷺ

ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ جنھیں ایک دنیا حکیم الامت، فیلسوفِ مشرق، دانائے راز، شاعرِ مشرق، مصورِ پاکستان اور علامہ ایسے باوقار اور لازوال القاب و خطابات سے جانتی ہے، اب وہ محض ایک نامور شخصیت نہیں رہے بلکہ مشرق کے لیے ایک معتبر اور مستند حوالہ بن چکے ہیں۔ جتنا کچھ ان پر لکھا جا چکا ہے وہ بھی بہت ہے مگر جبینِ علم وادب میں ابھی ہزار ہا سجدے تڑپ رہے ہیں۔

کوئی مستشرق ہو یا مستغرب، ایشیائی ہو یا یورپی، عربی ہو یا عجمی، بحر ہند کا ہو یا خلیج فارس کا، ملتِ اسلامیہ کا فرزند ہو یا قبیلۂ انسانی کا فرد، بشرطیکہ اسے کسی درجے میں علم وادب سے شغف حاصل ہو، وہ اقبالؒ کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے اور ابھی بہت کچھ جاننے کی آرزو رکھتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال کے بچپنے سے لے کر ان کے کمالِ علم وفن تک بے شمار لٹریچر تیار ہو چکا ہے، حکایات و واقعات اور نفسیات و واردات کا بیان اگرچہ تکراری حدود کو چھو رہا ہے مگر یہ تکرار ہرگز ناگوار نہیں بلکہ قندِ مکرر کا درجہ رکھتی ہے۔

اقبال اگر محض شاعر ہوتے تو ان کی ذات کسی ٹی ہاؤس میں موضوعِ سخن بنتی، زاہدِ خشک ہوتے تو مکتب و خانقاہ میں یاد کیے جاتے، نرے فلسفی ہوتے تو ادق اصطلاحوں کے بوجھ تلے دبے رہتے، روایتی سیاستدان ہوتے تو کب کے طاقچۂ نسیان کی نذر ہو چکے ہوتے، معروف معنوں میں ادیب ہوتے تو مختلف ادبی گروہوں کی ''کھچ تروہ'' میں نیم جان بلکہ بے جان ہو چکے ہوتے، فقط عالم و واعظ ہوتے تو زیادہ سے زیادہ منبر و محراب کی آبرو بڑھاتے اور اگر تنہا مفکر ہوتے تو صرف ''اربابِ فکر'' کے کام آتے ''اصحاب نظر'' کے محبوب نہ بنتے۔

مبدا فیاض ازل سے ہمارے ممدوح کو سرتاجِ بغیر ادائے قلندری سے آشنا کیا تھا اور تاج پہنے بغیر شانِ سکندری سے نوازا تھا۔ کاسۂ دماغ علم سے تو بھرپور تھا ہی دامنِ دل عشق سے بھی معمور رہا۔ کتاب ان کی رفیقِ تنہائی بھی تو صاحبِ کتاب سے بھی ان کی شناسائی تھی۔ قدرت نے انھیں پرکھنے کا

تھا اور قیاس ظن وتخمین کی پیداوار' اور یورپ کا کلچر مادی ہے اور مادیت آلائش کا دوسرا نام ہے' اس لیے مشرق کا یہ فیلسوف ربودگی اور آلودگی دونوں سے پاک رہا۔ علامہ کا مدارِ فکر اور معیار تمدن ہمیشہ اسوۂ حسنہ رہا' اس معاملے میں انھیں نہ ندامت لاحق ہوئی نہ ملامت کی پروا رہی اور نہ ہی معذرت کی ضرورت پیش آئی۔ علم وہ نہیں جو سوزِ دماغ ہے بلکہ وہ جو سوزِ جگر ہے اور عشق وہ نہیں جو بوالہوسوں کا شعار ہے بلکہ جو یزداں شکار ہے' علم سے انھوں نے راستہ معلوم کیا اور عشق سے اسے طے کیا' علم سے سراغ لگایا اور عشق سے منزل کو پایا۔

بیکن نے سچ کہا ہے کہ فلسفے کا تھوڑا علم انسان کو خدا بیزار اور گہرا علم خدا کا پرستار بنا دیتا ہے اور اقبال بلاشبہ فلسفے کے گہرے عالم تھے' وہ اتنی گہرائی میں اُتر کر عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موتی چن کر باہر لائے اور انھیں اپنے دامن میں سجا کر پوری دنیا کو دعوتِ نظارہ دی' اور بڑی بلند آہنگی اور خود اعتمادی سے کہا: اے منطق وکلام کے متوالو! اس کلام کو پڑھو جو اُمی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اترا ہے' شاید تمہارا کام بن جائے۔ اے سقراط اور بقراط کے دیوانو! اُن کی بات سنو' جنھوں نے خود کوئی کتاب نہیں لکھی مگر ان کا وجود ''الکتاب'' ہے' اے افلاطون اور ارسطو کے شیدائیو! ان کی بارگاہ میں پہنچ کر کچھ سیکھو جن کے ہاتھوں نے تختی کو چھوا اور نہ ان کی انگلیوں نے کبھی قلم پکڑا' لیکن لوحِ قلم کے سارے راز ان پر منکشف ہو گئے۔

کون نہیں جانتا اور کون نہیں مانتا کہ اقبال اپنے دور کے بہت بڑے فلسفی تھے اور فلسفی لوگوں کی خشکی ضرب المثل بن چکی ہے' فلسفی لوگ ہر لحظہ کھوئے کھوئے' ہر لمحہ اکھڑے اکھڑے' ہر دقیقہ الجھے الجھے اور ہر ثانیہ بجھے بجھے رہتے ہیں' مگر اقبال سے ان کا فلسفہ گری عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ چھین سکا' انھیں رقتِ قلبی سے محروم نہ کر سکا اور ان کی پاکیزگیِ خیال کو آلودہ نہ کر سکا۔

دیگر علمی مسائل میں تو انھوں نے فلسفے کا خوب استعمال کیا' دقیق اصطلاحیں' باریک نکتے' پُر پیچ جملے' منطقی دلیلیں اور تہ در تہ مثالیں ان کی نثر ونظم میں نظر آتی ہیں مگر جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر آیا تو اقبال زمخشری کا لہجہ بھول کر جامی کی زبان میں بات کرتے نظر آتے ہیں' رازی کی طاقت سے دستبردار ہو کر قدسی کی عقیدت میں ڈھل جاتے ہیں' نہ ایں نہ آں اور نہ چنیں نہ چناں' لغت کو پسِ پشت ڈالتے اور تاویل کو نظر انداز کر دیتے ہیں' فلسفہ الماری میں اور منطق میز کی دراز میں رکھ دیتے ہیں' محفل کا موضوعِ سخن اگر ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے تو اقبال کے نزدیک قیل وقال فضول ہے اور ہر واقعہ اپنے اصل الفاظ میں قابلِ قبول ہے:

به مصطفیٰ برسان خویش را که دین همه اوست
اگر به او نه رسیدی تمام بولہبی است

''روزگار فقیر'' میں فقیر سید وحید الدین مرحوم رقمطراز ہیں کہ ''ایک دن سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر گفتگو ہو رہی تھی' ڈاکٹر صاحب (علامہ اقبال) نے خاص انداز میں ایک واقعہ سنایا' فرمانے لگے' ایک معرکہ میں مسلمان سپہ سالار کا گھوڑا زخمی ہو گیا' زخموں کی یہ حالت تھی کہ گھوڑے کا میدانِ کارزار میں کھڑا رہنا دشوار تھا' وہ بیٹھنا چاہتا تھا' دوسری طرف کفار یلغار کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے' اس عالم میں امیر العسکر (سپہ سالار) نے گھوڑے کو مخاطب کر کے فرمایا:

''اگر تم نے اس نازک وقت میں میرا ساتھ چھوڑ دیا تو اس جہانِ فانی سے رخصت ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تمہاری شکایت کروں گا۔''

یہ واقعہ بیان کر کے ڈاکٹر صاحب زار و قطار رونے لگے اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی' آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ سپہ سالار نے گھوڑے سے جو اندازِ تخاطب اختیار فرمایا' اس کا لطف وہی لے سکتا ہے جو اقبال کی طرح غیر مشروط محبت کا مزاج رکھنے والا ہو۔

اس کتاب میں ایک اور مقام پر درج ہے کہ حضرت علامہ سے کسی نے غازی علم دین شہید کی شہادت کے بارے میں دریافت کیا' آپ نے فرمایا علم الدین کی شہادت برحق ہے کیونکہ راجپال نے بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں دریدہ دہنی سے کام لیا' یہ کہہ کر انتہائی رقت آمیز لہجے میں فرمایا:

''میں تو یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ میرے پاس آ کر کوئی شخص یہ کہے کہ تمھارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دن میلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔''

ہر شخص بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ تاثر پیش کرتے ہوئے اقبال فلسفی نہیں سراپا محبتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نظر آتے ہیں۔ ایک صاحب نے حکیم الامت سے اس بارے میں استفسار کیا کہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب چلتے تھے تو درخت تعظیم سے جھک جاتے' اس کا کیا مفہوم ہے؟ کیونکہ یہ بات ماورائے فطرت معلوم ہوتی ہے۔

علامہ اقبال نے جواب دیا' تمہارا ذہن مختلف راستے پر منتقل ہو گیا ہے' تم الجھ کر رہ گئے ہو قدرت کے مظاہر اور درختوں کے جھکنے میں' بھائی یہ واقعہ تو عمرؓ کا عشق بتاتا ہے کہ ان کی آنکھ یہ دیکھتی تھی' ''اگر تمھیں عمرؓ کی آنکھ نصیب ہو تو تم بھی دیکھ لو گے کہ کائنات ان کے سامنے جھک رہی ہے۔''

عشقِ انسانی ہے فانی زندہ جاوید عشق

اقبال کا یہی وہ سرمایۂ عقیدت تھا جو انھیں یورپ کی فکری دریوزہ گری سے بے نیاز بنائے رہا۔ ان کا یہی جذبۂ عشق تھا جس میں ڈوب کر وہ اپنا سراغ پانے میں کامیاب ہو گئے اور یورپ سے اپنا ایمان سلامت لے کر واپس آئے۔ ان کا یہی وہ زاویۂ نظر تھا جو انھیں ہر کجی اور ٹیڑھ سے محفوظ رکھتا رہا' انھیں وہی دل مطلوب رہا جو مرکزِ عشقِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہو۔ انھیں صرف وہ آنکھ درکار تھی' جس میں حبِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بینائی بن کر رہے' وہ عمر بھر اس تمنا کا پیکر بن کر رہے:

چھین لے مجھ سے نظر اے جلوہ خوش روئے دوست
میں کوئی محفل نہ دیکھوں' اب تیری محفل کے بعد

"علامہؒ کے والد، والدہ، بھائی اور بہنیں سنی عقیدہ کے حنفی مسلمان تھے۔ آج بھی ان کے عزیز و اقارب حنفی عقیدہ ہی کے مسلمان ہیں۔ سوائے بڑے بھتیجے کے کہ جس نے ذاتی مصلحتوں کے تحت قادیانی مسلک اختیار کر لیا تھا۔ عبدالمجید سالک نے اپنی تلبیسی روایت کے مطابق "ذکرِ اقبال" میں علامہؒ کے والد محترم اور برادرِ بزرگ وغیرہ کو قادیانی کہہ کر علامہؒ کی شخصیت پر دانستہ رکیک حملہ کیا ہے۔ شاید مصنف کی موروثی قادیانی رگ کسی کے اشارے پر پھڑک اٹھی۔ قادیانیت کی تائید میں اس تلبیسی روایت پر افسوس صد افسوس۔

سالک کسے بود کہ طلب گارِ حق شود
در حیرتم کہ سالکے ناحق شناس شد

(حیات و پیامِ علامہ اقبالؒ از ڈاکٹر نظیر صوفی)

محمد حنیف شاہد

اقبالؒ اور غازی علم الدین شہیدؒ

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور
مَوت کیا شے ہے؟ فقط عالمِ معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دِیت اہلِ کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر
آہ! اے مردِ مسلماں' تجھے کیا یاد نہیں؟
حرفِ ''لا تدع مع اللّٰہِ الٰھًا اٰخر'' [1]

علامہ اقبالؒ نے مندرجہ بالا اشعار لاہور میں غازی علم الدین اور کراچی میں غازی عبدالقیوم کے واقعات سے متاثر ہو کر قلم بند فرمائے۔ علامہ اقبالؒ کو رسولِ اکرمؐ کی ذاتِ گرامی سے عشق تھا۔ سچا اور والہانہ عشق! اس لیے آپ عاشقانِ رسولؐ کے دل و جان سے مداح اور قدر شناس تھے۔ سرکارِ دو جہاں حضورِ اکرمؐ کی شانِ اقدس میں گستاخانہ کتاب...... ''رنگیلا رسول''......شائع کرنے والے ناشر راج پال کو لاہور کے ایک غیرت مند نوجوان غازی علم الدین نے کیفر کردار تک پہنچایا تو اس مقدمے کی پیروی قائداعظم محمد علی جناح نے فرمائی۔

ہوا یوں کہ 1923ء میں لاہور کے ایک پروفیسر چموپتی کی کتاب شائع ہوئی جس میں حضور اکرمؐ کی ذاتِ اقدس پر ناروا حملے کیے گئے تھے۔ اس کتاب کے چھپتے ہی مسلمانوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ کتاب کے پبلشر راج پال پر فرقہ وار منافرت پھیلانے کے الزام میں مقدمہ چلا۔ ماتحت عدالت نے مقدمہ کی سماعت کے بعد ملزم کو دو سال قید بامشقت اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا سنائی لیکن عدالت عالیہ کے چیف جسٹس سر شادی لال نے (جو اپنے روایتی تعصب کے لیے بہت مشہور تھے) راج پال کو بری کر دیا۔ [2]

اس واقعہ سے مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہوا اور 27 ستمبر 1927ء کو ایک مسلمان خدا بخش

نے راج پال پر وار کیا لیکن وہ خطا گیا۔ 9 اکتوبر 1927ء کو ایک اور نوجوان عبدالعزیز نے دوبارہ راج پال پر حملہ کیا لیکن اس بار بھی قسمت نے اس کا ساتھ دیا اور وہ موت کے منہ میں جانے سے بچ گیا۔[3] اس کے بعد لاہور کے سریاں والا بازار کے علم الدین نے راج پال پر حملہ کیا اور اسے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

غازی علم الدین کو گرفتار کر کے اس پر سیشن عدالت میں مقدمہ چلا جہاں سے اسے سزائے موت کا حکم سنایا گیا۔ سیشن عدالت کے اس فیصلے کے خلاف عدالتِ عالیہ میں اپیل دائر کی گئی جس کی پیروی کے لیے قائداعظم محمد علی جناح کو بمبئی سے لاہور بلوایا گیا۔ اس سلسلے میں قائداعظم نے عدالت عالیہ کو تار دیا کہ 15 جولائی کو مقدمہ کی سماعت کے لیے تاریخ مقرر کی جائے۔[4] چونکہ ایک ہائی کورٹ کا وکیل دوسرے ہائی کورٹ میں پریکٹس نہیں کر سکتا، اس لیے بمبئی ہائی کورٹ کی بار کے ممبر نے جب پنجاب ہائی کورٹ سے علم الدین شہید کے مقدمہ میں پیش ہونے کی اجازت مانگی تو پنجاب ہائی کورٹ کے جج مسٹر جسٹس براڈوے نے اس کی مخالفت کی لیکن چیف جسٹس سر شادی لال نے قائداعظم کو پیش ہونے کی اجازت دے دی۔ روزنامہ ''انقلاب'' نے چیف جسٹس کے اس فیصلہ کو ان کا ہوشمندانہ فعل قرار دیا اور لکھا کہ اگر وہ مسٹر محمد علی جناح کو مقدمے میں پیش ہونے کی اجازت نہ دیتے تو مسلمانوں میں بے حد جوش پھیل جاتا۔[5]

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح کو بمبئی سے لاہور بلوانے کے محرک اور مؤید علامہ اقبالؒ تھے۔ حقیقت میں غازی علم الدین کا واقعہ ایک تاریخ ساز واقعہ ہے جس کے ساتھ برصغیر پاک و ہند کی دو عظیم مسلمان شخصیتیں...... قائداعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبالؒ...... براہِ راست وابستہ ہیں۔ 15 جولائی 1929ء کو جسٹس براڈوے اور جسٹس جانسن کے روبرو مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے مقدمہ کے واقعات کو سامنے رکھ کر انتہائی قابلیت کے ساتھ غازی علم الدین کی بے گناہی ثابت کی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے جس قابلیت سے مقدمہ کی پیروی کی، اس پر روزنامہ ''الجمعیت'' دہلی نے اپنی اشاعت مورخہ 20 جولائی 1929ء کو 'مسٹر جناح کی باطل شکن تقریر' کے زیر عنوان انھیں مندرجہ ذیل الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کیا:

''لاہور ہائی کورٹ سے بھی میاں علم الدین کی اپیل کا فیصلہ صادر ہو گیا اور پھانسی کا جو حکم سیشن عدالت سے ہوا تھا' وہی بحال رہا۔ قائداعظم کی مدلّل اور مؤثر تقریر کو پڑھنے کے بعد اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے دلائل کس قدر وزنی تھے اور انھوں نے ماتحت عدالت کی شہادتوں میں جن نقائص کا ذکر کیا تھا' ان سے مقدمہ کس درجہ کمزور ہو گیا تھا مگر ہائی کورٹ کے ججوں نے خدا معلوم کن وجوہ

کی بنا پر ان دلائل کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اس وقت ہائی کورٹ کا فیصلہ موجود نہیں ہے' اس لیے ہم اس پر مفصل تنقید نہیں کریں گے، جب تک ہمارے سامنے اصل فیصلہ کے دلائل نہ آ جائیں۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ قائداعظم کی تقریر کے بعد پھانسی کی سزا کس طرح بحال رہ سکتی تھی۔"[6]

18 اکتوبر 1929ء کو میاں علم الدین غازی کی رحم کی اپیل مسترد ہو گئی[7] تو انھوں نے وصیت کی کہ انھیں سزائے موت کے بعد لاہور میں دفن کیا جائے۔[8] 30 اکتوبر 1929ء کو صبح سات بجے میاں علم الدین غازی کو میانوالی جیل میں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔ آٹھ بجے لاش اتاری گئی اور نو بجے جیل کے حکام نے شہید کے جسدِ خاکی کو بغیر نمازِ جنازہ کے سپردِ خاک کر دیا۔

30 اکتوبر کی شام کو یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ حکام نے غازی علم الدین شہید" کی نعش کو لاہور لانے کی اجازت نہیں دی۔ یہ سنتے ہی مسلمانوں میں حکومت کے خلاف ایک زبردست ہیجان و اضطراب پیدا ہو گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مظاہرے ہوئے' جلسے منعقد کیے گئے اور جلوسوں کے علاوہ عام ہڑتال کی تحریک ہوئی۔ مولانا سیّد حبیب شاہ' ڈاکٹر سلطان محمد' شیخ حسن دین وکیل اور ملک لال دین قیصر' میاں عبدالعزیز کے مکان پر گئے اور وہاں یہ فیصلہ ہوا کہ گورنر پنجاب کے پاس ایک وفد بھیجا جائے۔ شیخ حسن دین اور میاں عبدالعزیز کے دستخطوں سے اکابرِ لاہور کا ایک جلسہ تین بجے برکت علی محمڈن ہال میں بلایا گیا، جس میں اکابر اور رضا کاروں کے علاوہ اخبارات کے ایڈیٹر بھی موجود تھے۔ علامہ اقبال صدرِ جلسہ قرار پائے۔ چونکہ گورنر پنجاب کے بارے میں کوئی قطعی اطلاع نہ تھی کہ وہ کہاں ہیں، اس لیے جلسے کی رائے کے مطابق علامہ اقبال نے مسٹر سٹو وزیرِ فنانس سے ٹیلی فون پر وقت مقرر کر کے ان سے ملاقات کی جہاں مسٹر ایمرسن' چیف سیکرٹری بھی موجود تھے۔

یہ ملاقات ایک گھنٹے تک جاری رہی جس میں علامہ اقبال نے مسلمانانِ لاہور کے جذبات و خیالات کی ترجمانی کی' قیامِ امن کی ذمہ داری اٹھائی' میت کے لیے راستہ مقرر کرانے پر رضامندی اور ذمہ داری کا اظہار فرمایا مگر آخری جواب یہ ملا کہ گورنر پنجاب کے حکم کے مطابق میت کو میانوالی میں دفن کیا گیا ہے اس لیے اب اس میں ردّوبدل نہیں ہو سکتا۔

اسی دوران میں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تاروں پر سنسر ہے اور جو تار یہاں سے بھیجا جاتا ہے وہ روک لیا جاتا ہے یا دیر سے پہنچایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دن بھر میں جتنے تار دیے گئے تھے' ان کا کوئی جواب نہ آیا۔

چھ بجے کے قریب علامہ اقبال مسٹر سٹو اور مسٹر ایمرسن سے مل کر برکت علی محمڈن ہال میں تشریف لائے' جہاں لوگ بدستور جمع تھے۔ علامہ ممدوح نے ساری کیفیت بیان فرمائی۔ دوبارہ فیصلہ ہوا

کہ گورنر پنجاب کے پاس ایک وفد بھیجا جائے لیکن اب مصیبت یہ پیش آئی کہ گورنر کا پتہ نہ چل سکا۔ جس ذمہ دار افسر سے پوچھا گیا اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ عام خیال یہ تھا کہ دیدہ و دانستہ گورنر کے پتہ سے لاعلمی ظاہر کی جا رہی ہے۔ آخر جلسۂ مشورت ملتوی کر دیا گیا۔ علامہ اقبال اور میاں امیر الدین فون کے ذریعہ سے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آیا گورنر لاہور میں ہے یا نہیں' میاں عبدالعزیز کے ساتھ ان کے مکان پر چلے گئے۔

یکم نومبر 1929ء کو حضرت علامہ اقبال کے مکان پر ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں میاں عبدالعزیز اور دوسرے اکابر شریک ہوئے۔ ملک لال دین قیصر' ڈاکٹر سلطان محمد اور بشیر احمد خاص طور پر کوشاں تھے۔ تین بجے کے قریب ملک لال دین قیصر نے برکت علی محمڈن ہال میں ایک خاص مجلسِ شوریٰ بلا رکھی تھی۔ [9]

2 نومبر 1929ء کو پنجاب پراونشل مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس منعقد ہوا جس میں علامہ اقبال کی تحریک سے ایک قرارداد اس مضمون کی منظور کی گئی کہ علم الدین شہید کی نعش مسلمانوں کو نہ دینا حکومت کی سخت غلطی ہے۔ نیز اس قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ حکومت اب بھی اس غلطی کی اصلاح کر کے مسلمانوں کے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کرے۔ [10]

4 نومبر 1929ء کو مسلمان معززین کا ایک وفد سوا چار بجے گورنمنٹ ہاؤس میں گورنر پنجاب سے ملا۔ ارکانِ وفد میں سترہ میونسپل کمشنر' ڈاکٹر سر محمد اقبال' سر میاں محمد شفیع' چودھری دین محمد، سیّد مراتب علی شاہ، میاں عبدالعزیز بیرسٹر اور دیگر حضرات شامل تھے۔ سر میاں محمد شفیع نے غازی علم الدین کی نعش مسلمانانِ لاہور کے حوالے کیے جانے کے لیے گورنر سے طویل گفتگو کی۔ گورنر نے جواب دیا کہ آپ کے بعض نکات ایسے ہیں کہ ان پر غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا میں ماتحت حکام سے مشورہ کر کے کل پانچ بجے شام مکمل جواب دوں گا۔ سر میاں محمد شفیع کا خیال تھا کہ حکومت ہمارا مطالبہ تسلیم کر لے گی۔ دیگر اراکینِ وفد بھی آپ کے ہم خیال تھے۔ [11]

غازی علم الدین کی نعش کی واپسی کے سلسلے میں اکابرِ لاہور کی مساعی جمیلہ کا ذکر کرتے ہوئے روزنامہ ''انقلاب'' نے لکھا:

''آج مسلم اکابرِ لاہور کا جو وفد غازی علم الدین شہیدؒ کی لاش کے لیے گورنر کی خدمت میں گیا تھا، معلوم ہوا ہے کہ گورنر نے ان کو تسلی بخش جواب دیا ہے۔ مسلم اکابر میں ہر طبقے اور ہر گروہ کے بزرگ موجود تھے۔ مثلاً علامہ اقبال' سر محمد شفیع' آغا سیّد مراتب علی شاہ' ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین' میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لاء وغیرہ تمام اصحاب نے مسلمانوں کے جذبات کی نہایت عمدہ طریق پر ترجمانی

کی۔ حکومت کو امن قائم رکھنے کا پورا پورا یقین دلایا۔ کل شام کو پھر گورنر سے ملاقات ہوگی۔

اگر حکومت نے لاش دے دی جس کی بظاہر قوی امید ہے تو ہمیں بے حد خوشی ہوگی اور مسلمان بھی اس بات کی بے حد قدر کریں گے کہ ان کے مخلصانہ جذبات سے بے پروائی نہیں برتی گئی۔ مسلمانوں کا جوش و خروش ظاہر ہے' لاہور کا ایک ایک فرد قربانی پر آمادہ ہے۔ باہر کے شہروں میں بھی بے حد جوش ہے۔ میانوالی میں غیرت و حمیت آفتاب کی طرح آشکارا ہے۔ کیا ہم امید رکھ سکتے ہیں کہ حکومت تمام حالات پر نظر رکھتے ہوئے صحیح فیصلہ کرے گی۔12

حسب پروگرام 5 نومبر 1929ء کو مقررہ وقت پر مسلمانوں کا ایک وفد جو سر محمد اقبال' سر محمد شفیع اور ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین پر مشتمل تھا' گورنر سے ملا۔ طویل عرصہ تک گفتگو کے بعد وفد سر محمد اقبال کے مکان پر آیا اور آتے ہی ایک کمرہ میں صلاح و مشورہ شروع کر دیا۔ گورنر اور وفد کی گفتگو بالکل خفیہ رکھی گئی۔

گورنر پنجاب سے وفد کی ملاقات پر تبصرہ کرتے ہوئے روزنامہ ''انقلاب'' نے لکھا:

''بعض خاص ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ حکومت نے غازی علم الدین شہیدؒ کی نعش مسلمانانِ لاہور کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کیا ہے لیکن گورنر نے چند ایک شرائط پیش کی ہیں۔ گورنر کی شرائط پر غور و خوض کرنے کے لیے رہنمایانِ اسلام کا ایک پرائیویٹ اجتماع ڈاکٹر سر محمد اقبال کے بنگلے یا محمڈن ہال میں منعقد ہوگا۔ جہاں اگر ضرورت ہوئی تو ان شرائط میں ترمیم یا تنسیخ کی جائے گی۔ وفد کے ارکان شرائط کا بالکل تذکرہ نہیں کرتے' یہاں تک کہ یہ بھی نہیں بتاتے کہ گورنر نے وفد سے کیا کیا کچھ کہا؟ بہر حال مسلمانوں میں مختلف قسم کی افواہیں پھیل رہی ہیں۔ ایک طبقہ تو کہتا ہے کہ علم الدین کی نعش وارثوں کے حوالے کر دی جائے گی جو بادامی باغ سٹیشن سے سرکلر روڈ پر ہوتے ہوئے چوبرجی گراؤنڈ میں نمازِ جنازہ پڑھ کر ''پیر بودیاں والا'' کے مقبرے کے پاس دفن کر دی جائے گی۔

عوام کے ایک طبقے کا خیال ہے کہ یہ بات مصدقہ طور پر معلوم ہو چکی ہے کہ نعش سنٹرل جیل لاہور میں لائی جا چکی ہے یا کل پہنچ جائے گی۔ جنازہ اس صورت میں بھی یونیورسٹی گراؤنڈ میں پڑھایا جائے گا۔

مسلم رہنما کل آپس میں مشورہ کر کے چھ بجے شام پھر گورنر سے ملاقات کریں گے اور امید ہے کہ کل یا پرسوں صبح جملہ معاملات طے ہو جائیں گے۔ فساد کے متعلق مسلم رہنما......ڈاکٹر سر محمد اقبال' سر محمد شفیع' ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین' میاں عبدالعزیز بیرسٹر' مولوی غلام محی الدین قصوری و دیگر معزز مسلمان رہنما حکومت کو ضمانت دیں گے کہ مسلم ہجوم کو بے قابو نہیں ہونے دیا جائے گا۔''13

مسلمان رہنماؤں نے جس جوش وخروش اور حمیتِ اسلامی کا مظاہرہ کیا اور میاں علم الدین شہید کی نعش واپس لینے کے سلسلے میں جو شان دار خدمات انجام دیں' مسلم زعما کی مساعی جمیلہ کے بعد گورنر پنجاب نے ان کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔ روزنامہ ''انقلاب'' علامہ اقبال' سر محمد شفیع اور دیگر اکابر کی شان دار خدمات اور کامیابی پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے رقم طراز ہے:

''معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ گورنر پنجاب نے علامہ اقبال' سر محمد شفیع اور دیگر مسلم اکابرین کے مطالبہ کی معقولیت اور مسلمانوں کی پُر زور ترجمانی سے متاثر ہو کر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ علم الدین شہید کی نعش مسلمانانِ لاہور کے حوالے کر دی جائے۔ چنانچہ اس کے متعلق عنقریب ایک اعلان شائع ہونے والا ہے۔ شہید کی نعش لاہور لانے میں غالباً تین چار دن اور لگ جائیں گے کیونکہ حکومت نے اُسے میانوالی سے لاہور پہنچانے کا انتظام اپنے ذمہ لیا ہے۔ اس کے بعد یہ نعش مسلم اکابر کے حوالے کر دی جائے گی، تاکہ وہ حسب قرارداد نمازِ جنازہ ادا کر کے اُسے سپردِ خاک کر دیں۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ اب نہایت سکون سے شہید کی نعش کے آنے تک انتظار کریں۔

مسلمانانِ لاہور نے اپنے اس مطالبہ میں جس کامل اتحاد کا ثبوت دیا ہے اور گورنر پنجاب نے اس مطالبہ کو تسلیم کر کے جس مدبرانہ دوراندیشی کا اظہار کیا ہے اس کا جا بجا چرچا ہو رہا ہے۔ اس کامیابی کا سہرا اکابرِ لاہور' مولانا ظفر علی خان اور کارکنانِ علم الدین کمیٹی اور سرفروش مجاہدین کے سر ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ ان تمام حضرات کے تعاون سے شہید کی نعش کی تدفین بوجہ احسن انجام پائے گی اور کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہ ہوگا۔''[14]

غازی علم الدین شہیدؒ کی نعش کی واپسی کے سلسلے میں مسلم اکابر کی مساعی بارآور ثابت ہوئیں اور حکومت پنجاب نے اس مطالبے کو تسلیم کر لیا۔ چنانچہ شہید کی نعش کو لاہور میں دفن کرنے کی اجازت دیتے ہوئے 7 نومبر 1929ء کو مسٹر ایچ' ڈبلیو ایمرسن' چیف سیکرٹری حکومت پنجاب نے مندرجہ ذیل اعلان شائع کیا:

''میاں علم الدین کی میت کو لاہور میں دفن کرنے کے لیے مسلمانوں کا جو وفد حکومتِ پنجاب کی خدمت میں پیش ہوا' اس کے متعلق حکومت نے جو فیصلہ کیا ہے' وہ عوام کی اطلاع کے لیے شائع کیا جاتا ہے۔ ابتدا ہی سے حکومت پنجاب کی یہ خواہش رہی ہے کہ فرقہ وار امن میں خلل پڑنے کے ذرائع سے اجتناب کرے اور محض اسی مقصد کے حصول کے لیے 13 اکتوبر کو میانوالی میں دفن کرنے کے انتظامات کیے گئے تھے۔ گزشتہ چند روز کے دوران میں مسلمان رہنماؤں کے مشورے سے اس مسئلہ پر مزید غور کیا گیا تاکہ یہ معلوم کیا جائے کہ آیا ایسے انتظامات کرنا ممکن ہے جن سے مسلمانوں کی آرزوئیں

پوری ہو جائیں اور ساتھ ہی امن عامہ میں کسی قسم کا شدید خطرہ پیدا نہ ہو۔

5 نومبر کو لاہور کے سرکردہ مسلمانوں کا ایک وفد زیر قیادت سر محمد شفیع گورنر کے پاس حاضر ہوا۔ علامہ سر محمد اقبال‘ ایم ایل سی‘ بلدیہ لاہور کے مسلم ارکان‘ پراونشل مسلم لیگ کے نمائندے اور مقامی جماعتوں کے عہدے دار اس وفد میں شامل تھے۔ وفد مذکور نے گورنر سے کہا کہ ہماری قوم کی جائز اور مخلصانہ آرزو ہے کہ میاں علم الدین کی میت کو ان کی وصیت کے مطابق لاہور میں دفن کیا جائے اور ہم اس بات کا یقین دلانے کے لیے تیار ہیں اور اپنی قوم کی طرف سے پوری ذمہ داری اٹھاتے ہیں کہ اگر ہماری درخواست منظور کر لی گئی تو کسی قسم کا نقصِ امن نہیں ہوگا نیز ہم مسلمانان لاہور کی طرف سے ایسی شرائط منظور کرنے کے لیے تیار ہیں‘ ان شرائط کی تعمیل دیانت داری سے کی جائے گی۔ اہلِ وفد نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ظاہر کیا کہ اگر ہماری درخواست کو منظور کرنا غیر ممکن خیال کیا گیا تو جذبات کی شدت کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ ایسی حالت رونما ہو جائے گی جس سے امنِ عامہ کو شدید خطرہ ہے۔ انھوں نے درخواست کی کہ کوئی تسلی بخش حل حاصل کرنے کے لیے حکومت اس مسئلہ پر مزید غور کرے۔

ہز ایکسی لینسی نے اہل وفد سے کہا کہ اگر مسلم قوم کی طرف سے اس بات کا یقین دلایا جائے اور حکومت مطمئن ہو جائے کہ خطرے کا اندیشہ نہیں رہے گا اور قوم کے رہنما غیر مشروط طور پر ایسی شرائط کو جو حکومت تجویز کرے منظور کریں اور ان کی کامل تعمیل کی ذمہ داری اٹھائیں تو اس مسئلہ پر دوبارہ غور کیا جا سکتا ہے۔ اس مفاہمت پر ہز ایکسی لینسی مزید غور کرنے پر رضامند ہو گئے اور مسلم قوم کے نمائندوں کے ساتھ بحث و مباحثہ اور مزید غور کرنے کے بعد حکومت پنجاب نے مصرحہ ذیل فیصلہ کیا ہے۔

ماہِ نومبر کے دوران میں اور اس قدر جلدی جس قدر ضروری انتظامات مکمل ہو سکیں‘ حکومت پنجاب میاں علم الدین کی میت کو لاہور میں دفن کرنے کے لیے‘ دینے کو تیار ہے بشرطیکہ مندرجہ ذیل شرائط کی تعمیل کی جائے جو مسلم رہنماؤں نے مسلمانانِ لاہور کی طرف سے منظور کی ہیں۔

حکومتِ پنجاب میانی کے قبرستان کے پاس میت کو ایسے وقت حوالہ کر دے گی جو حکومت کی طرف سے مقرر کیا جائے گا۔ شہر لاہور یا کسی دوسرے مقام سے اس مقام تک کہ جہاں میت حوالہ کی جائے گی، کوئی جلوس لے جانے کی اجازت نہ ہوگی۔ سوائے اس جلوس کے جو مقامِ مذکور سے قبرستان تک جائے گا۔

لاہور میں تجہیز و تکفین کی رسوم ادا کرنے سے پیشتر یا اس کے بعد لاہور‘ میانوالی یا کسی دوسرے مقام پر نہ تو مظاہرے کیے جائیں گے اور نہ جلوس نکالے جائیں گے۔

مقامِ حوالگی سے جنازہ اسی راستے لے جانا ہوگا جو حکومت نے تجویز کیا ہے۔ مسلمان

رہنماؤں نے اس بات کا یقین دلایا ہے کہ حکومتِ پنجاب کے فیصلے کی تاریخ سے اس معاملے سے متعلق عام جلسے اور مظاہرے بند کر دیے جائیں گے۔ نیز انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ مسلم اخبارات وغیرہ میں ہر قسم کے جوش وخروش یا پروپیگنڈے کو بند کر دیا جائے گا۔

انھوں نے عہد کیا ہے کہ ابتدائی انتظامات کرنے اور جنازے کے روز امن قائم کرنے میں وہ مقامی حکام کو مدد دیں گے۔ انھوں نے اس بات پر بالخصوص رضامندی کا اظہار کیا ہے کہ عزاداروں کو اپنے اپنے گھروں کو منتشر کرنے میں ہر قسم کی امداد بہم پہنچائیں گے۔

اس سلسلہ میں قوم کے نمائندوں کی ایک مجلس قائم کی گئی جو کمشنر لاہور کے ساتھ براہِ راست تعلق رکھے گی اور انھیں مقامی حکام کو ضروری انتظامات کی تکمیل وغیرہ میں مدد دے گی۔ اس کمیٹی اور بلدیہ کے وارڈوں کے مسلمان ارکان کا اہم فرض یہ ہو گا کہ محلہ داروں کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ جنازے سے قبل اور بعد اپنے اپنے محلّہ کے امن کے ذمہ دار ہوں گے۔ حکومت اپنی طرف سے ناگوار حادثات کے انسداد کے لیے تمام ممکن احتیاطیں عمل میں لائے گی۔

حکومت پنجاب کو امید ہے کہ مسلمانانِ لاہور من حیث القوم اور انفرادی طور پر اس عہد کا احترام کریں گے جو ان کے رہنماؤں نے ان کی طرف سے کیا ہے اور اسے یقین ہے کہ مسلمان اور دیگر اقوام کسی قسم کے مظاہرے یا پروپیگنڈے یا کسی ایسے فعل سے جس سے امن اور یک جہتی کی فضا مکدر ہونے کا احتمال ہو، اجتناب رکھیں گے۔ حکومت کو اس بات کا بھروسہ ہے کہ رسومِ جنازہ کی تکمیل سے حادثات کا وہ سلسلہ جو زمانہ ماضی میں فرقہ وار بدگمانی اور اختلافات کا موجب رہا ہے، مستقل طور پر بند ہو جائے گا۔"[15]

حکومتِ پنجاب کے مذکورہ بالا فیصلے کے مطابق لاہور کے دو مسلمان میونسپل کمشنر اور ایک مسلمان مجسٹریٹ غازی علم الدین شہیدؒ کی میت لانے کے لیے میانوالی گئے۔ وہ ایک سپیشل ٹرین میں شہید کی نعش لاہور لائے اور سنٹرل جیل لاہور کے حکام کے حوالے کر دی۔ انھوں نے پونے سات بجے پونچھ ہاؤس کے سامنے وہ تابوت جس میں حرمتِ اسلام کا فدا کار بند تھا، مسلمان معززین کے حوالے کیا اور رسید لے لی۔ معززین میں علامہ سر محمد اقبال، سر محمد شفیع اور چند ایک میونسپل کمشنر تھے۔ وہاں سے میت سات بجے کے قریب جنازہ گاہ چوبرجی کے میدان میں لائی گئی جہاں عام مسلمانوں کے علاوہ مسلمان اکابر موجود تھے۔ قریباً چار لاکھ فرزندانِ توحید نے نماز جنازہ ادا کی اور 14 نومبر 1929ء بروز جمعرات بارہ بجے کے قریب شمعِ رسالتؐ کے پروانے کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔[16]

غازی علم الدین شہیدؒ کی میت کی واپسی، نماز جنازہ اور تدفین کے سلسلے میں مسلم اکابرین کی

مساعی پر انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے روزنامہ انقلاب ''ارمغانِ تشکر و سپاس'' کے عنوان سے لکھتا ہے:

''سر محمد شفیع' ڈاکٹر سر محمد اقبال' مولانا ظفر علی خان' ملک لال دین قیصر' غلام مصطفےٰ حیرت' حکیم احمد حسن' جنھوں نے ہجوم کو قابو میں رکھنے کی انتہائی کوشش کی' کی خدمات قابلِ استحسان ہیں۔ 17

علم الدین شہید کی میت کو لاہور لانے کے لیے جن بھائیوں اور بزرگوں نے جدو جہد فرمائی' ان کا دلی شکریہ۔ حضرت علامہ اقبال' سر محمد شفیع' جملہ مسلم ارکان بلدیہ لاہور اور جملہ مسلم اکابر کا دلی شکریہ، جو ساری تحریک میں عام مسلمانوں کی خواہشات کے مطابق پوری کوشش فرماتے رہے اور جنھوں نے امن کی ضمانت دے کر شہید کی آخری وصیت پوری کی یعنی اسے لاہور میں دفن کیا۔'' 18

شہیدِ اعظم میاں علم الدین کی تجہیز و تکفین کے بعد 17 نومبر 1929ء کو علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے چھ دیگر ممتاز رہنماؤں کے ہمراہ جن میں سر محمد شفیع' ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین' میاں عبدالعزیز بیرسٹر' میاں امیر الدین' سیّد محسن شاہ' ملک محمد حسین اور مولوی غلام محی الدین شامل تھے۔ مسلمانانِ لاہور کی طرف سے گورنر اور حکومتِ پنجاب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ایسوسی ایٹڈ پریس کے ذریعے مندرجہ ذیل بیان جاری کیا:

''چونکہ میاں علم الدین شہید کی میت حکام نے ہمارے حوالہ کر دی اور شہید موصوف کی وصیت کے مطابق پُر امن اور بغیر کسی ناگوار واقعہ کے میانی صاحب میں سپرد خاک کردی گئی۔ ہم مسلم قوم کی طرف سے ہز ایکسی لینسی سر جافرے ڈی مونٹ مورنسی کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے ازراہِ عنایت ہمارے وفد کی اس درخواست کو منظور کر لیا کہ میت لاہور میں دفن کرنے کے لیے ہمارے حوالہ کر دی جائے۔ حکومت پنجاب کی طرف سے دور اندیشانہ تدبیر کا یہ فعل نہ صرف اہلِ وفد بلکہ تمام مسلم قوم کے لیے عمیق اطمینان کا موجب ہوا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ جنازہ کے موقع پر مسلمانوں کے عظیم الشان اجتماع نے جس بردباری کا ثبوت دیا ہے' تمام جماعتوں اور فرقوں کے باشندگانِ لاہور اس کی تعریف کرتے ہیں۔'' 19

اکابرِ لاہور کو خراجِ تحسین پیش کرتے اور حکومت پنجاب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے روزنامہ ''انقلاب'' 20 نومبر 1929ء کی اشاعت میں ''ہدیہ تشکر و سپاس'' کے عنوان سے لکھتا ہے۔

''شہید علم الدین کی میت کے معاملے میں ہر چھوٹے بڑے مسلمان نے پوری سرگری اور تن دہی سے حصہ لیا اور اس لیے ہر مسلمان تشکر و سپاس خصوصی کا مستحق ہے لیکن بعض مسلمان اکابر اور بعض مسلمان خاص طور پر شکریے کے مستحق ہیں جن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔ علامہ اقبال' سر محمد شفیع،

میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لاء' مولانا غلام محی الدین قصوری' ایڈووکیٹ' ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین' تمام اسلامی اخباروں کے ایڈیٹر' ملک لال دین قیصر' بشیر احمد رفیق' غلام مصطفےٰ حیرت' حکیم احمد حسن امرتسری' امیر بخش پہلوان۔

ان اشخاص کے بالخاصہ ذکر سے یہ نہ سمجھا جائے کہ باقی اصحاب نے سرگرمی اور جوشِ عمل کا کم ثبوت دیا' حاشا وکلا، ایک ایک بزرگ' ایک ایک میونسپل کمشنر' ایک ایک نوجوان رضا کار اور ایک ایک مسلمان یکساں طور پر شکریے کا مستحق ہے۔"[20]

❁......❁......❁

حواشی

1. فقیر سید وحید الدین' روزگار فقیر (جلد دوم) مطبوعہ لائن آرٹ پریس کراچی 1960ء۔
2. اقرا (قائداعظم نمبر) جون 1976ء (جلد 2 نمبر 1) مجلہ ایم اے او کالج' لاہور' ص 164۔
3. روزگار فقیر جلد اوّل' ص 10۔
4. روزنامہ پیسہ اخبار (لاہور)' 24 جولائی 1929ء' بحوالہ اقرا۔
5. روزنامہ انقلاب' 2 اگست 1929ء' بحوالہ اقرا (قائداعظم نمبر)
6. روزنامہ الجمعیت' 20 جولائی 1929ء' ص 4۔
7. روزنامہ انقلاب' 19 اکتوبر 1929ء' ص 3۔
8. ایضاً۔ 29 اکتوبر 1929ء' ص 4۔
9. روزنامہ انقلاب' 2 نومبر 1929ء' ص 7۔
10. روزنامہ انقلاب' 5 نومبر 1929ء' ص 4۔
11. ایضاً' 7 نومبر 1929ء' ص 4۔
12. روزنامہ انقلاب' 7 نومبر 1929ء ص 4۔
13. ایضاً' 8 نومبر 1929ء' ص 5۔
14. روزنامہ انقلاب' 9 نومبر 1929ء' ص 4۔

15۔ ایضاً' 10 نومبر 1929ء' ص 7۔

16۔ ایضاً' 16 نومبر 1929ء' ص 1۔

17۔ ایضاً' 16 نومبر 1929ء' ص 4۔

18۔ ایضاً' 17 نومبر 1929ء' ص 3۔

19۔ ایضاً' 20 نومبر 1929ء' ص 4۔

20۔ حضرت علامہ اقبالؒ کا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے لامحدود اور غیر مشروط عشق ومحبت اور قلبی لگاؤ اظہر من الشمس ہے۔ یہ تخلیقی جذبہ ان کی پوری زندگی پر محیط ہے۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا چلا گیا۔ اس جذبہ کی بدولت علامہ اقبالؒ حکیم الامت کہلائے۔ حضور نبی کریمؐ سے بے پایاں عقیدت واحترام کی بناء پر علامہ اقبال عاشقان رسولؐ سے بھی بے حد محبت کرتے تھے۔ جب غازی علم الدین شہیدؒ نے گستاخ رسول راجپال کو قتل کیا تو علامہ اقبال بے حد خوش اور مطمئن ہوئے۔

علامہ اقبالؒ کو جب غازی علم الدینؒ کے بارے میں بتایا گیا کہ ایک اکیس سالہ ان پڑھ اور مزدور پیشہ نوجوان نے گستاخ رسول راجپال کو بڑی جرأت اور پھرتی سے قتل بلکہ واصل جہنم کر دیا ہے تو حضرت علامہؒ نے گلوگیر لہجے میں فرمایا:

''اسیں گلاں ای کردے رہ گئے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا۔''

(ہم باتیں ہی بناتے رہے اور بڑھئی کا بیٹا بازی لے گیا)

حضرت علامہؒ نے غالباً اسی موقع کے لیے کہا ہے:

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

''سیاست'' اخبار کے مدیر و مالک مولانا سید حبیب شاہؒ ایک جید عالم، مقبول رہنما اور حضور رسالت مآبؐ کے عاشق صادق تھے۔ حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے آپ سے پوچھا کہ وہ خوش نصیب کون ہے؟ جسے شہید کی نماز جنازہ پڑھانے کا شرف حاصل ہوگا۔ مولانا سید حبیب شاہ صاحب نے فرمایا یہ تو شہید کے والد بزرگوار میاں طالع مند کا حق ہے۔ جانے اُن کی نگاہ کس مہ جبین کی طرف اٹھتی ہے۔ میاں طالع مند پاس ہی کھڑے تھے۔ انھوں نے کہا اگر یہ حق مجھے حاصل ہے تو میں اسے ڈاکٹر محمد اقبال کو تفویض کرتا ہوں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب اور سید حبیب شاہ نے باہمی مشورے سے سن رسیدہ عالم دین مولانا سید محمد دیدار علی الوری کا انتخاب کیا۔ فدا کار رسالت کو سپردِ خاک کرنے کے بعد اقبال نے عرض کیا ''غازی علم الدین شہیدؒ! جب دربار رسالت میں پہنچنا تو آقا ومولا کی بارگاہ میں میرا اسلام پیش کرنا اور اسلامی ممالک خصوصاً برصغیر کی سیاسی آزادی کے لیے دعا کرنا۔''

اس واقعہ پر ہندو مسلم کشیدگی بلکہ خونریزیوں کے دروازے کھلے تو بظاہر یہ نمونہ شکست تھا۔ مگر درحقیقت فتح مبین۔ اس کی کڑیاں مربوط رکھنے کے لیے حضرت علامہ کی وہ تقریر جو انھوں نے ایسے ہی ایک موقع پر شاہی مسجد میں

ارشاد فرمائی، بڑی اہم ہے۔آپ نے آزمائش کے اس دور کے دو نتائج کو مبارک قرار دیا۔"1- خانہ خدا میں مل بیٹھنے کا موقع۔2- مسلمانوں کے وہ فرقے جو آپس میں دست و گریباں رہتے تھے، اس ابتلاء کے دوران میں ایک ہو گئے۔" تحفظ ناموس رسالتؐ کے موضوع پر ان دنوں ایک اور جگہ فرمایا "جو مسلمان عملاً توحید پر جمع نہ ہوئے وہ نبوت پر متفق ہو گئے۔" اور اس طرح وہ اتحاد پیدا ہو گیا، جس کی ضرورت عرصے سے محسوس ہو رہی تھی۔ غازی علم الدین شہیدؒ کی میت کا حصول ایک ایسی ایمان افروز جدوجہد تھی جس نے پوری قوم کا زاویہ نگاہ بدل دیا۔اس سے متاثر ہو کر علامہ مرحوم نے سوچا کہ "علم الدین شہید کمیٹی کے پرچم تلے جو کارکن اور اخبار نویس اکٹھے ہوئے ہیں، ان کی قوتوں کو اس طرح بروئے کار لایا جائے کہ وہ ملکی سیاست میں مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ میں مددگار ہو سکیں۔ بالخصوص مسلمانانِ پنجاب کے حقوق کی حفاظت کے لیے۔ چنانچہ انہی کے مشورے سے کارکنوں کا ایک اجتماع منعقد ہوا اور چھپن فیصد کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا، جس کا نصب العین یہ تھا کہ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی چھپن فیصد ہے، اس لیے انھیں تمام جمہوری اداروں میں چھپن فیصد نیابت دلائی جائے۔اس تحریک نے فوراً رنگ لے لیا، ہر طرف چھپن فیصد کا غلغلہ ہوا۔

راجپال ایجی ٹیشن اور غازی علم الدین کی شہادت سے یہ ثابت ہو گیا کہ ہندو مسلم کسی ایک ملک میں امن و امان سے نہیں رہ سکتے۔حصولِ نعش کی تحریک سے سیاست کا پانسہ بالکل الٹ گیا۔ ذی اثر اربابِ سیاست کا اندازِ فکر اسی دوران بدلا اور بہت سے مسلم اکابرین کانگریس اور دیگر جماعتوں کو خیرباد کہہ کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ ڈاکٹر اقبال کو دوقومی نظریے کا شدت سے احساس اسی وجہ سے ہوا۔اس واقعہ سے جنم لینے والا علیحدگی کا جذبہ ہی ان کے 1935ء کے خطبہ الٰہ آباد کی روح ہے۔

مغربی پاکستان کے سابق گورنر نواب آف کالاباغ ملک محمد امیر خان مرحوم کے والد نواب عطا محمد ملک ہر روز صبح کے وقت غازی علم الدین کے لیے فروٹ کی ایک ٹوکری بھیجا کرتے۔انھیں غازی ممدوح سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ میانوالی جیل میں غازی صاحب سے ملاقات کرنے کے لیے اکثر حاضر ہوا کرتے۔ایک موقع پر نواب عطا محمدؐ صاحب نے میاں طالع مند سے کہا "اگر آپ اجازت دیں تو میں علم الدین کو جیل سے اغوا کروا دیتا ہوں۔" جب یہ بات برادر غازی کے ذریعے حضرت علامہ اقبال تک پہنچی تو آپ نے فرمایا "ہم ایسا کبھی نہ کریں گے۔اگر غازی علم الدین کو اغوا کر لیا گیا تو غیر مسلم ہمیں بزدلی کا طعنہ دیں گے۔ وہ سمجھیں گے مسلمان حرمتِ رسولؐ پر مر مٹنے کی بجائے زندگی کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ مطلب یہ اخذ ہوگا کہ علم الدین اپنے اس فعل پر پچھتانے لگا تھا اور یہ ایک ایسا داغ ہے جو کبھی دھل نہ سکے گا۔"

اس کے برعکس غازی علم الدین شہیدؒ کے عظیم کارنامے پر قادیانیوں کا دل آزار اور سنگدلانہ رویہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔قادیانی جماعت کے بانی آنجہانی مرزا قادیانی کے بڑے بیٹے اور قادیانی جماعت کے دوسرے خلیفہ مرزا بشیر الدین نے گستاخ رسول راجپال کے قتل پر غازی علم الدین شہیدؒ کے سنہرے کارنامے پر شدید تنقید کرتے ہوئے کہا:

"اسی طرح اس قوم کا جس کے جوشیلے آدمی قتل کرتے ہیں، خواہ انبیاء کی توہین کی وجہ سے ہی وہ ایسا کریں، فرض ہے کہ پورے زور کے ساتھ ایسے لوگوں کو دبائے اور ان سے اظہار برات کرے۔انبیاء کی عزت کی حفاظت قانون شکنی کے ذریعہ نہیں ہو سکتی، وہ نبی بھی کیسا نبی ہے جس کی عزت کو بچانے کے لیے خون سے ہاتھ رنگنے پڑیں۔ جس کے بچانے کے لیے اپنا دین تباہ کرنا پڑے۔ یہ سمجھنا کہ محمد رسول اللہ کی عزت کے لیے قتل کرنا جائز ہے، سخت نادانی ہے......

وہ لوگ (غازی علم الدین شہید، ناقل) جو قانون کو ہاتھ میں لیتے ہیں، وہ بھی مجرم ہیں اور اپنی قوم کے دشمن ہیں اور جوان کی پیٹھ ٹھونکتا ہے، وہ بھی قوم کا دشمن ہے۔ میرے نزدیک تو اگر یہی شخص (راج پال کا) قاتل ہے جو گرفتار ہوا ہے تو اس کا سب سے بڑا خیر خواہ وہی ہو سکتا ہے جو اس کے پاس جائے اور اسے سمجھائے کہ دنیاوی سزا تو تمہیں اب ملے گی ہی، لیکن قبل اس کے کہ وہ ملے تمہیں چاہیے، خدا سے صلح کر لو۔ اس کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ اسے بتایا جائے کہ تم سے غلطی ہوئی ہے۔" (خطبہ جمعہ بشیر الدین احمد خلیفہ قادیان مندرجہ اخبار الفضل قادیان جلد 16 نمبر 82 ص 7-8 مورخہ 19 اپریل 1929ء)

"روزگار فقیر" کے مؤلف سید وحید الدین غازی عبدالقیوم شہیدؒ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ 1933ء کے اوائل کا ذکر ہے، جب سندھ صوبہ بمبئی میں شامل تھا، ان دنوں آریہ سماج حیدر آباد (سندھ) کے سیکرٹری نتھو رام نے "ہسٹری آف اسلام" کے نام کی ایک کتاب شائع کی، جس میں آقائے دو جہاں، سرکار دو عالمؐ کی شان اقدس میں سخت دریدہ دہنی کا مظاہرہ کیا گیا، مسلمانوں میں اس کتاب کی اشاعت کے سبب بڑا اضطراب پیدا ہوا، جس سے متاثر ہو کر انگریزی حکومت نے کتاب کو ضبط کیا اور نتھو رام پر عدالت میں مقدمہ چلایا گیا، جہاں اس پر معمولی سا جرمانہ ہوا اور ایک سال قید کی سزا سنائی گئی۔ عدل و انصاف کی اس نرمی نے نتھو رام کا حوصلہ بڑھا دیا اور اس نے وی ایم فیرس جوڈیشل کمشنر کے یہاں ماتحت عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دی۔ کمشنر کی عدالت نے اس گندہ دہن، شاتم رسول کی ضمانت منظور کر لی۔ اس سے مسلمانوں کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ بہت مضطرب اور فکرمند تھے کہ توہین رسولؐ کے اس فتنے کا سدباب آخر کس طرح کیا جائے۔ ہزارے کا رہنے والا عبدالقیوم نام کا ایک نوجوان تھا جو کراچی میں وکٹوریہ گاڑی چلاتا تھا۔ جونا مارکیٹ کی کسی مسجد میں اس نے اس واقعہ کی تفصیل سنی اور یہ معلوم کر کے کہ ایک ہندو نے حضور سرور کائناتؐ کی توہین کی ہے، اس کے غم و اضطراب اور اندوہ و ملال کی کوئی حد نہ رہی۔ ستمبر 1934ء کا واقعہ ہے کہ مقدمہ اہانت رسولؐ کے ملزم نتھو رام کی اپیل کراچی کی عدالت میں سنی جا رہی تھی، عدالت دو انگریز ججوں کے بنچ پر مشتمل تھی۔ عدالت کا کمرہ وکیلوں اور شہریوں سے بھرا ہوا تھا۔ غازی عبدالقیوم نہایت اطمینان کے ساتھ دوسرے تماشائیوں کے ساتھ وکلاء کی قطار کے پیچھے نتھو رام کی برابر والی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا کہ عین مقدمے کی سماعت کے دوران وہ اپنا تیز دھار چاقو لے کر نتھو رام پر ٹوٹ پڑا اور اس کی گردن پر دو بھرپور وار کیے۔ نتھو رام چاقو کے زخم کھا کر زور سے چیخا اور زمین پر لڑکھڑا کر گر پڑا۔ غازی عبدالقیوم نے پولیس کی گرفت سے بچنے اور فرار ہونے کی ذرہ برابر کوشش نہیں کی۔ اس نے نہایت ہنسی خوشی کے ساتھ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ انگریز جج نے ڈائس سے اتر کر اس سے پوچھا:

تم نے اس شخص کو کیوں قتل کیا؟

غازی عبدالقیوم نے عدالت میں آویزاں جارج پنجم کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ تصویر تمہارے بادشاہ کی ہے۔ کیا تم اپنے بادشاہ کی توہین کرنے والے کو موت کے گھاٹ نہیں اتار دو گے؟ اس ہندو نے میرے آقا اور شہنشاہ کی شان میں گستاخی کی ہے جسے میری غیرت برداشت نہیں کر سکی۔

غازی عبدالقیوم پر مقدمہ چلا۔ اس نے اقبال جرم کیا۔ آخر کار سیشن جج نے اسے سزائے موت کا حکم سنایا۔

غازی عبدالقیوم نے فیصلہ سن کر کہا:

''جج صاحب! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مجھے موت کی سزا دی۔ یہ ایک جان کس گنتی میں ہے، اگر میرے پاس ایک لاکھ جانیں بھی ہوتیں تو ناموس رسولؐ پر نچھاور کر دیتا۔'' اس فیصلے کے خلاف ہائیکورٹ میں اپیل دائر کر دی گئی۔

غازی عبدالقیوم کے پیروکار سید محمد اسلم نے اقدام قتل کے لیے اشتعال کے مفہوم کی اہمیت پر جو قانونی نکتہ پیش کیا تھا، اگر وہ تسلیم کر لیا جاتا، تو ناموسِ رسالتؐ پر حملہ کرنے کی مذموم تحریک ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی اور آئندہ کوئی اس جسارت کا تصور بھی نہ کر سکتا۔ لیکن عدالت عالیہ نے یہ اپیل خارج کر دی۔ غازی عبدالقیوم کے لیے سزائے موت بحال رہی۔ پُر جوش اور مضطرب مسلمانوں کے لیے یہ وقت بڑی آزمائش کا تھا۔ بالآخر فروری 1936ء میں کراچی کے مسلمانوں نے ایک وفد حکیم الامت علامہ اقبال کی خدمت میں لاہور بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ یہ وفد جس میں مولوی ثناء اللہ ،عبدالخالق اور حاجی عبدالعزیز شامل تھے، لاہور پہنچا اور میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہو کر اس مقدمے کی روداد تفصیل کے ساتھ سنائی۔ اس کے بعد عرض کیا کہ آپ وائسرائے سے ملاقات کریں۔ اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لائیں اور انھیں اس پر آمادہ کریں کہ غازی عبدالقیوم کی سزائے موت عمر قید میں بدل دی جائے۔ وفد نے اصرار کے ساتھ کہا کہ آپ نے سعی و توجہ فرمائی، تو پوری توقع ہے کہ غازی عبدالقیوم کی جانب سے رحم کی اپیل حکومت ہند ضرور منظور کر لے گی۔''

علامہ اقبالؒ وفد کی یہ گفتگو سن کر دس بارہ منٹ تک بالکل خاموش رہے اور گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ وفد کے ارکان منتظر اور مضطرب تھے کہ دیکھیے علامہ کیا فرماتے ہیں۔ توقع یہی تھی کہ جواب اثبات میں ملے گا کہ ایک عاشقِ رسولؐ کا معاملہ دوسرے عاشق رسولؐ کے سامنے پیش ہے۔ اس سکوت کو پھر علامہ اقبالؒ ہی کی آواز نے توڑا۔ انھوں نے فرمایا: ''کیا عبدالقیوم کمزور پڑ گیا ہے؟'' ارکانِ وفد نے کہا: ''نہیں اس نے تو ہر عدالت میں اپنے اقدام کا اقبال اور اعتراف کیا ہے۔ اس نے نہ تو بیان تبدیل کیا اور نہ لاگ لپیٹ اور ایچ پیچ کی کوئی بات کہی۔ وہ تو کھلے خزانے کہتا ہے کہ میں نے شہادت خریدی ہے۔ مجھے پھانسی کے پھندے سے بچانے کی کوشش مت کرو۔''

وفد کی اس گفتگو کو سن کر علامہ کا چہرہ تمتما گیا۔ انھوں نے برہمی کے لہجے میں فرمایا: ''جب وہ کہہ رہا ہے کہ میں نے شہادت خریدی ہے، تو میں اس کے اجر و ثواب کی راہ میں کیسے حائل ہو سکتا ہوں؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں ایسے مسلمان کے لیے وائسرائے کی خوشامد کروں، جو زندہ رہا تو غازی ہے اور مر گیا تو شہید ہے۔''

علامہ کے لہجے میں اس قدر تیزی تھی کہ وفد کے ارکان اس سلسلے میں پھر کچھ اور کہنے کی جرأت نہ کر سکے اور وفد بخوشی کراچی واپس ہو گیا۔ (محمد ابراہیم شاہ)

❀……❀……❀

عقیدۂ ختمِ نبوّت

علامہ محمد اقبالؒ

فلسفۂ ختم نبوت

(1)

اس سے پہلے کہ ہم اپنی بحث میں آگے بڑھیں، ضروری ہے کہ اسلام کے ایک نہایت ہی اہم اور بنیادی تصور...... میرا مطلب ہے عقیدۂ ختم نبوت (مَاکَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ.[1] (33:40۔مترجم) کی ثقافتی قدر و قیمت پورے طور پر ذہن نشین کر لی جائے۔

ایک اعتبار سے نبوت کی تعریف یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ یہ شعور ولایت کی وہ شکل ہے جس میں وارداتِ اتحاد اپنے حدود سے تجاوز کر جائیں اور ان قوتوں کی پھر سے رہنمائی یا ازسرِ نو تشکیل کے وسائل ڈھونڈتی ہیں جو حیاتِ اجتماعیہ کی صورت گر ہیں۔ گویا انبیاء کی ذات میں زندگی کا متناہی مرکز (انسانی خودی۔مترجم) اپنے لامتناہی اعماق میں ڈوب جاتا ہے (اپنے مبدا۔ وجود سے اتصال کی بدولت۔مترجم) تو اس لیے کہ پھر ایک تازہ قوت اور زور سے ابھر سکے۔ وہ ماضی (یعنی انسان جس راستے پر چل رہا تھا۔مترجم) کو مٹاتا اور پھر زندگی کی نئی نئی راہیں اس پر منکشف کر دیتا ہے (تاکہ ایک نئی ہیئت اجتماعیہ کی تعمیر ہو سکے۔مترجم) لیکن اپنی ہستی اور وجود کی اساس سے انسان کا یہ تعلق کچھ اسی کے لیے مخصوص نہیں۔ قرآن مجید نے لفظ وحی کا استعمال جن معنوں میں کیا ہے، ان سے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ وحی خاصۂ حیات ہے اور ایسا ہی عام جیسے زندگی۔ یہ دوسری بات ہے کہ جوں جوں اس کا گزر مختلف مراحل سے ہوتا ہے یا یوں کہیے کہ جیسے جیسے وہ ارتقاء اور نشو و نما حاصل کرتی ہے، ویسے ہی اس کی ماہیت اور نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ یہ کسی پودے کا زمین کی پہنائیوں میں آزادانہ سر نکالنا، یہ کسی حیوان میں ایک نئے ماحول کے مطابق کسی نئے عضو کا نشو و نما، یہ انسان کا خود اپنی ذات اور وجود میں زندگی کی گہرائیوں سے نور اور روشنی حاصل کرنا، یہ سب وحی کی مختلف شکلیں ہیں، جو اس لیے بدلتی چلی گئیں کہ اس

کا تعلق جس فرد سے تھا یا جس نوع میں اس کا شمار ہوتا تھا اس کی مخصوص ضروریات کچھ اور تھیں۔ اب بنی نوع انسان کے عالمِ صغر سنی میں ایسا بھی ہوا کہ اس کی نفسی توانائی کا نشوونما (جس کا اظہار غور و فکر، ارادہ و اختیار، ادراک و تعقل، حکم، تصدیق یعنی اعمالِ ذہنی میں ہوتا ہے۔ مترجم) شعور کی وہ صورت اختیار کر لے جسے ہم نے شعورِ نبوت سے تعبیر کیا ہے اور جس کے معنی یہ ہیں کہ اس شعور کی موجودگی میں نہ تو افراد کو خود کسی چیز پر حکم لگانا پڑے گا، نہ ان کے سامنے یہ سوال ہوگا کہ ان کی پسند کیا ہو اور ناپسندیدگی کیا؟ انھیں یہ بھی سوچنے کی ضرورت نہیں ہوگی کہ وہ اپنے لیے کیا راہِ عمل اختیار کریں؟ یہ سب باتیں گویا پہلے ہی سے طے شدہ ہوں گی، یہ نہیں کہ انھیں اس بارے میں خود اپنے فکر اور انتخاب سے کام لینا پڑے (معروف و منکر، امر اور نہی، کی تعیین میں لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ج:) [2] شعورِ نبوت کو گویا کفایتِ فکر اور انتخاب سے تعبیر کرنا چاہیے (کیونکہ اس طرح ہمیں فرداً فرداً ان امور کا فیصلہ نہیں کرنا پڑتا۔ صرف ایک فرد کا حکم اور انتخاب ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہوتا ہے۔ مترجم) لیکن جہاں عقل نے آنکھ کھولی (تا کہ ذہنِ انسانی کو خود اپنی بصیرت، فہم اور تدبر سے کام لینے کا موقع ملے، یہ امر بھی منجملہ ان مقاصد کے ہے جو نبوت کے پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ مترجم) اور قوتِ تنقید بیدار ہوئی تو پھر زندگی کا مفاد اسی میں ہے کہ ارتقائے انسانی کے اوّلین مراحل میں ہماری نفسی توانائی کا اظہار جن ماورائے عقل طریقوں سے ہوا تھا ان کا ظہور اور نشوونما رُک جائے۔ انسان جذبات کا بندہ ہے اور جبلتوں سے مغلوب رہتا ہے (جن کو اگر ٹھیک راستے پر نہ ڈالا جائے تو ایک دوسرے سے رقابت اور فسادِ اخلاق کو تحریک ہوتی ہے جس کا انجام ہے ہلاکت۔ مترجم) وہ اپنے ماحول کی تسخیر کر سکتا ہے تو عقلِ استقرائی کی بدولت (جس میں وہ اصولِ علم کی بناء پر عالمِ خارجی کا مطالعہ کرتا ہے۔ مترجم) لیکن عقلِ استقرائی اس کے اپنے حاصل کرنے کی چیز ہے۔ (تجربے اور امتحان، مشاہدے اور تحقیق و تجسس کی حدود سے۔ مترجم) جسے ایک دفعہ حاصل کر لیا جائے تو پھر مصلحت اسی میں ہے کہ حصولِ علم کے اور جتنے بھی طریق ہیں ان پر ہر پہلو سے بندشیں عائد کر دی جائیں تا کہ مستحکم کیا جائے تو صرف عقلِ استقرائی کو (عالمِ فطرت کی تسخیر اور زندگی کو واقعیت کی نظر سے دیکھنے کی خاطر۔ مترجم) اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیائے قدیم نے بڑے بڑے عظیم نظاماتِ فلسفہ پیدا کیے۔ (تعلیماتِ نبوت سے باہر محض حکیمانہ غور و فکر کی بدولت۔ مثلاً ارضِ یونان یا قدیم ہندوستان میں۔ مترجم) مگر یہ اس وقت جب انسان اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل سے گزر رہا اور اس پر ایمان اور اشارے کا غلبہ تھا۔ (یعنی وہ اپنی عقل اور سمجھ کی بجائے وہی کچھ کرنے لگتا تھا جو دوسرے کرتے تھے۔ مترجم) لہٰذا ماضی کے یہ فلسفیانہ نظامات مجرد فکر کی بناء پر مرتب ہوئے، لیکن مجرد فکر کی بناء پر ہم زیادہ سے زیادہ کچھ کر سکتے ہیں تو یہ

کہ مذہبی عقائد اور مذہبی روایات میں تھوڑا بہت ربط و ترتیب پیدا کر دیں۔ رہا یہ امر کہ عملی زندگی میں ہمیں جن احوال سے فی الواقع گزر کرنا پڑتا ہے، ان پر قابو حاصل کیا جائے تو کیسے؟ اس کا فیصلہ فکر مجرد کی بناء پر نہیں کیا جا سکتا۔ (اور یہی فی الحقیقت مسئلہ ہے زندگی کا خواہ اس میں کوئی بھی راستہ اختیار کیا جائے۔ مترجم) اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبر اسلام کی ذاتِ گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے (جس کا ظہور آپ کی تعلیمات کی بدولت ہوا۔ مترجم) بہ اعتبار اپنے سرچشمہ وحی کے آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے (جس کی آپ نے رہنمائی کی۔ مترجم) لیکن بہ اعتبار اس کی روح کے دنیائے جدید سے۔ یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم و حکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رُخ کے عین مطابق تھے (یعنی جن کی زندگی کو رہنمائی کے لیے ضرورت تھی۔ مترجم) لہٰذا اسلام کا ظہور جیسا کہ آگے چل کر خاطر خواہ طریق پر ثابت کر دیا جائے گا۔ استقرائی عقل کا ظہور ہے۔

اسلام میں نبوت چونکہ اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی، لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعورِ ذات کی تکمیل ہو گی تو یونہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔ (جیسا کہ تعلیماتِ قرآنی کا مقصود بھی ہے۔ مترجم) یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کو جائز نہیں رکھا یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا یا عالم فطرت اور عالم تاریخ کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس لیے کہ ان سب کے اندر یہی نکتہ مضمر ہے (کہ انسان اپنے وسائل سے کام لے، اس کے قوائے فکر و عمل بیدار ہوں اور وہ اپنے اعمال و افعال کا آپ جواب دہ ٹھہرے۔ مترجم) کیونکہ یہ سب تصور خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں لیکن یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حیاتِ انسانی اب وارداتِ باطن سے، جو باعتبارِ نوعیت (ان معنوں میں کہ اس کا تعلق ادراک بالحواس سے نہیں۔ مترجم) انبیاء کے احوال و واردات سے مختلف نہیں، ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکی ہے۔ قرآن مجید نے آفاق و انفس 3 دونوں کو علم کا ذریعہ ٹھہرایا ہے، اور اس کا ارشاد ہے کہ آیاتِ الٰہی کا ظہور محسوسات و مدرکات (محسوسات، یعنی ہماری وارداتِ شعور، ہمارے داخلی احوال اور تجربات اور مدرکات، یعنی ہمارے وہ مشاہدات جن کا تعلق عالم فطرت کے مطالعہ سے ہے۔ مترجم) میں، خواہ ان کا تعلق خارج کی دنیا سے ہو یا داخل کی، ہر کہیں ہو رہا ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے اس کے ہر پہلو کی قدر و قیمت کا کماحقہٗ اندازہ کریں اور دیکھیں کہ اس سے حصول علم میں کہاں تک مدد مل سکتی ہے (لہٰذا اس کی تنقید لازم ٹھہری۔ مترجم) حاصل کلام یہ کہ تصورِ خاتمیت سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ زندگی میں اب صرف عقل ہی کا عمل دخل ہے، جذبات کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں۔ یہ بات نہ کبھی ہو سکتی ہے، نہ ہونی

چاہیے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وارداتِ باطن کی کوئی بھی شکل ہو ہمیں بہر حال حق پہنچتا ہے کہ عقل اور فکر سے کام لیتے ہوئے اس پر آزادی کے ساتھ تنقید کریں۔ اس لیے کہ اگر ہم نے ختم نبوت کو مان لیا تو گویا عقیدۃً یہ بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق نہیں پہنچتا کہ اس کے علم کا تعلق چونکہ کسی مافوق الفطرت سرچشمے سے ہے لہٰذا ہمیں اس کی اطاعت لازم آتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو خاتمیت کا تصور ایک طرح کی نفسیاتی قوت ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی باطنی واردات اور احوال کی دنیا میں بھی علم کے نئے نئے راستے کھل جائے۔ (اور ہم ان کا مطالعہ عقل و فکر اور تعلیمات نبوت کی روشنی میں کریں۔ مترجم) بعینہٖ جس طرح اسلامی کلمہ (لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ مترجم) کے جزو اوّل نے انسان کے اندر یہ نظر پیدا کی کہ عالم خارج کے متعلق اپنے محسوسات و مدرکات (بالفاظ دیگر مظاہر فطرت یا قوائے طبیعیہ۔ مترجم) کا مطالعہ نگاہِ تنقید سے کرے اور قوائے فطرت کو الوہیت کا رنگ دینے سے باز رہے۔ (یعنی ان کو دیوی دیوتا تصور نہ کرے۔ مترجم) جیسا کہ قدیم تہذیبوں کا دستور تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ صوفیانہ واردات کو خواہ ان کی حیثیت کیسی بھی غیر معمولی اور غیر طبعی کیوں نہ ہو ایسا ہی فطری اور طبعی سمجھیں جیسے اپنی دوسری واردات اور اس لیے ان کا مطالعہ بھی تنقید و تحقیق کی نگاہوں سے کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرزِ عمل بھی یہی تھا۔[4]

(2)

یقین کیجیے یورپ سے بڑھ کر آج انسان کے اخلاقی ارتقاء میں بڑی رکاوٹ اور کوئی نہیں۔ برعکس اس کے مسلمانوں کے نزدیک ان بنیادی تصورات کی اساس چونکہ وحی و تنزیل پر ہے، جس کا صدور ہی زندگی کی انتہائی گہرائیوں سے ہوتا ہے، لہٰذا وہ اپنی ظاہری خارجیت (بمقابلہ ہماری ذات کے۔ مترجم) کو ایک اندرونی حقیقت میں بدل دیتی ہے۔ (کیونکہ اس سے درحقیقت ہماری فطرت ہی کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْن.[1] مترجم) ہمارے لیے تو زندگی کی روحانی اساس ایمان و یقین کا معاملہ ہے جس کی خاطر ایک غیر تعلیم یافتہ مسلمان بھی برضا و رغبت اپنی جان دے دے گا۔ پھر اسلام کے اس بنیادی تصور کے پیش نظر کہ وحی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہے، لہٰذا اب کوئی ایسی وحی نہیں کہ ہم اس کے مکلف ٹھہریں۔ ہماری جگہ دنیا کی ان قوموں میں ہونی چاہیے جو روحانی اعتبار سے سب سے زیادہ استخلاص حاصل کر چکی ہیں۔ (ہماری جگہ سب سے زیادہ استخلاص یا نجات یافتہ قوموں میں ہونی چاہیے۔ یعنی بحلتِ موجودہ۔ لیکن ہم خود سب سے زیادہ استخلاص یافتہ قوم ہیں، یعنی روحانی اعتبار سے جو آزادی اور حریت ہمیں حاصل ہے اور کسی قوم کو حاصل نہیں اور یہی نی

الحقیقت حضرت علامہؒ کا مطلب بھی ہے۔مترجم) شروع شروع کے مسلمانوں کو جنھوں نے ایشیائے قبل اسلام کی روحانی غلامی سے نجات حاصل کی تھی اسلام کے اس بنیادی تصور (خاتمیت۔مترجم) کی ٹھیک ٹھیک حقیقت سمجھنے سے قاصر رہے لیکن ہمیں چاہیے آج اپنے اس موقف کو سمجھیں (کہ بابِ نبوت ہر نوع اور ہر جہت سے مسدود ہے۔مترجم) اور اپنی حیاتِ اجتماعیہ کی از سرِ نو تشکیل اسلام کے بنیادی اصولوں کی رہنمائی میں کریں، تا آنکہ اس کی وہ غرض وغایت جو ابھی تک صرف جزواً ہمارے سامنے آئی ہے، یعنی اس روحانی جمہوریت کا نشو ونما جو اس کا مقصود ومنتہا ہے، تکمیل کو پہنچ سکے۔"

(3)

راجہ صاحب° کا مضمون میں نے نہیں دیکھا۔دیکھا تو تھا پڑھا نہیں۔آپ اپنے مضمون میں اپنے خیالات کا اظہار کیجئے۔ان کے خیالات کی تردید ضروری نہیں۔

نبوت کے دو اجزاء ہیں:

1- خاص حالات واردات، جن کے اعتبار سے نبوت روحانیت کا ایک مقام خاص تصور کی جاتی ہے۔(مقام تصوف اسلام میں ایک اصطلاح ہے۔)

2- Socio-political Institution قائم کرنے کا عمل یا اس کا قیام۔اس Institution کا قیام گو ایک نئی اخلاقی فضا کی تخلیق ہے، جس میں پرورش پا کر فرد اپنے کمالات تک پہنچتا ہے، اور جو فرد اس نظام کا ممبر نہ ہو یا اس کا انکار کرے وہ ان کمالات سے محروم ہو جاتا ہے۔اس محرومی کو مذہبی اصطلاح میں کفر کہتے ہیں۔گویا اس دوسرے جزو کے اعتبار سے نبی کا منکر کافر ہے۔

دونوں اجزاء موجود ہوں تو نبوت ہے۔صرف پہلا جزو موجود ہو تو تصوفِ اسلام میں اس کو نبوت نہیں کہتے۔اس کا نام ولایت ہے۔

ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزاء نبوت کے موجود ہیں یعنی یہ کہ [1] مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے اور واجب القتل۔مسیلمہ کذاب کو اسی بناء پر قتل کیا گیا حالانکہ طبری [2] لکھتا ہے وہ رسالتمآب کی نبوت کا مصدق تھا، اور اس کی اذان میں حضور رسالتمآب کی نبوت کی تصدیق تھی۔[3]

لیڈنگ سٹرنگز [4] Leading Strings سے مراد لیڈنگ سٹرنگز آف ریلیجن نہیں بلکہ لیڈنگ سٹرنگز آف فیوچر پرافٹس آف اسلام ہے۔یا یوں کہیے کہ ایک کامل الہام ووحی کی غلامی قبول کر

لینے کے بعد کسی اور الہام اور وحی کی غلامی حرام ہے۔ بڑا اچھا سودا ہے کہ ایک کی غلامی سے باقی سب غلامیوں سے نجات ہو جائے اور لطف یہ کہ نبی آخر الزماںؐ کی غلامی، غلامی نہیں بلکہ آزادی ہے کیونکہ اس کی نبوت کے احکام دینِ فطرت ہیں۔ یعنی فطرتِ صحیحہ ان کو خود بخود قبول کرتی ہے۔ فطرتِ صحیحہ کا انھیں خود بخود قبول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ احکام زندگی کی گہرائیوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس واسطے عین دینِ فطرت ہیں۔ ایسے احکام نہیں جن کو ایک مطلق العنان حکومت نے ہم پر عائد کر دیا ہے اور جن پر ہم محض خوف سے عمل کرنے پر مجبور ہیں۔ اسلام کو دینِ فطرت کے طور پر Realise [5] کرنے کا نام تصوف ہے اور ایک اخلاص مند مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ اس کیفیت کو اپنے اندر پیدا کرے۔ اس کیفیت کو میں نے لفظ Emancipation [6] سے تعبیر کیا ہے۔

محمد اقبال[7]

(4)

(1) عقل اور وحی کا مقابلہ یہ فرض کر کے کہ دونوں علوم کے مواخذ ہیں درست نہیں ہے۔ علوم کے مواخذ انسان کے حواسِ اندرونی و بیرونی ہیں۔ عقل ان حواس ظاہری و معنوی کے انکشافات کی تنقید کرتی ہے اور یہی تنقید اس کا حقیقی Function[1] ہے اور بس۔ مثلاً آفتاب مشرق سے طلوع کرتا ہے اور مغرب کی طرف حرکت کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ حواسِ ظاہری کا انکشاف ہے۔ عقل کی تنقید کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حواس کا انکشاف درست نہ تھا۔

(2) وحی کا Function [1] حقائق کا انکشاف ہے یا یوں کہیے کہ وحی تھوڑے وقت میں ایسے حقائق کا انکشاف کر دیتی ہے جن کو مشاہدہ برسوں میں بھی نہیں کر سکتا۔ گویا وحی حصولِ علم میں جو Time[2] کا عنصر ہے اس کو خارج کرنے کی ایک ترکیب ہے۔ انسان کی ترقی کے ابتدائی مراحل میں اس ذریعہ علم کی بے انتہا ضرورت تھی کیونکہ ان مراحل میں انسان کو ان مقامات کے لیے تیار کیا جا رہا تھا جن پر پہنچ کر وہ قوائے عقلیہ کی تنقید سے خود اپنی محنت سے علم حاصل کرے۔ محمد عربیؐ کی پیدائش انسانی ارتقاء کے اس مرحلے پر ہوئی جبکہ انسان کو استقرائی علم سے روشناس کرانا مقصود تھا۔ میرے عقیدہ کی رو سے بعد وحی محمدی کے الہام کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ سلسلہ تو الہام کا جاری ہے، مگر الہام بعد وحی محمدی حجت نہیں، سوائے اس کے کہ ہر شخص کے لیے جس کو الہام ہوا ہو۔ بالفاظ دیگر بعد وحی محمدی الہام ایک پرائیویٹ Fact[3] ہے۔ اس کا کوئی سوشل [4] مفہوم یا وقعت نہیں ہے۔

میں نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ نبوت کی دوسری حیثیت ایک Socio Political Institution

[5] کی ہے۔اس کے یہ معنی ہیں کہ بعد وحی محمدی کسی کا الہام یا وحی ایسے **Institution** [6] کی بناء قرار نہیں پا سکتا۔تمام صوفیہ اسلام کا یہی مذہب ہے۔محی الدین ابن عربی [7] تو الہام پانے والے کو نبی کہتے ہی نہیں،اس کا نام ولی رکھتے ہیں۔یہ ٹھیک ہے کہ اسلام سے پہلے بنی نوع انسان میں شعورِ ذات کی تکمیل نہ ہوئی تھی۔اسلام نے انسان کی توجہ علوم استقرائی کی طرف مبذول کی تا کہ انسانی فطرت فی کل الوجود کامل ہو اور اپنی ذاتی محنت سے حاصل کردہ علم کے ذریعہ سے انسان میں اعتماد علی النفس پیدا ہو۔ غرضیکہ بعد وحی محمدی میرے عقیدہ کی رو سے الہام کی حیثیت محض ثانوی ہے۔جس شخص کو ہوتا ہے اس کے لیے حجت ہو تو ہو، اوروں کے لیے نہیں ہے۔اگر آج کوئی شخص کہے کہ میں نے بالمشافہ حضور رسالتمابؐ سے مل کر دریافت کیا ہے کہ فلاں ارشاد جو محدثین آپ کی طرف منسوب کرتے ہیں، آپ کا ہے یا نہیں؟ اور مجھے حضورؐ نے کہا ہے کہ نہیں، تو ایسا مکاشفہ اس شخص کے لیے حجت ہوگا، تمام عالم اسلام کے لیے نہیں۔اگر اس قسم کے مکاشفات کو تمام عالم اسلام کے لیے حجت قرار دیا جائے تو عام تنقیدی تاریخ کا خاتمہ ہو جاتا ہے یا بالفاظ دیگر روایت و درایت استقرائی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

محمد اقبال [8]

مسئلہ ختم نبوت پر حضرت علامہ اقبالؒ کی ایک تاریخی تحریر کا عکس

Lahore

Dated ______ 193

Dr. Sir Mohd. Iqbal Kt.
M.A. Ph.D. LL.D.
Barrister-at-Law

Lahore

Dated ______________ 193

حواشی

(ترجمہ اور حواشی محترم نعیم آسی مرحوم کے قلم سے ہیں)

(1)

- یہ مضمون تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ سے اخذ کیا گیا ہے، جو حضرت علامہؒ کے ان مایہ ناز انگریزی خطبات کا اردو ترجمہ ہے، جو انھوں نے مدراس مسلم ایسوسی ایشن کی دعوت پر 29-1928ء میں مدراس، حیدر آباد اور علی گڑھ میں ارشاد فرمائے۔ یہ خطبات فلسفیانہ رنگ میں اپنے موضوع پر ایک اچھوتی تخلیق ہیں۔

1. (حضرت) محمدؐ تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں (الاحزاب آیت 40)
2. ہم نے بھیجے ہیں اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اُتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ (سورۃ الحدید، آیت 25)
3. حضرت علامہ نے انگریزی میں آفاق و انفس کا مرادف Self and world لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو:
The Reconstruction of Religious Thought in Islam. Page 120. By Sir Muhammad Iqbal, II Edition 1934.
4. تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص 190 مترجمہ سیّد نذیر نیازی۔ شائع کردہ بزم اقبال، لاہور۔

(2)

- یہ اقتباس بھی تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ سے لیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب مذکور کا ص 276۔

1. اگر تم جانو تو یہی تمھارے لیے بہتر ہے۔ سورۃ الصف آیت 11۔

(3)

- نمبر 3، 4 کے ذیل میں دی گئی تحریریں 1935ء میں حضرت علامہؒ نے سیّد نذیر نیازی، تب ایڈیٹر طلوع اسلام، (دہلی) کے نام لکھیں۔ ان کا شانِ نزول خود انھی کی زبانی سنیے:

"......(ان) کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ 35ء میں انجمن احمدیہ اشاعت اسلام، لاہور کے انگریزی ہفت روزہ لائٹ، نے بلاوجہ حضرت علامہؒ کے انگریزی خطبات بالخصوص پانچویں خطبے پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ یہ جو حضرت علامہؒ کہتے ہیں کہ بابِ نبوت مسدود ہے یہ دراصل مغرب سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے۔ حضرت علامہؒ نے کہیں عقل استقرائی کا ذکر کر دیا تھا۔ مدیر لائٹ اس کا صحیح مفہوم تو سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے فرمایا یہ دیکھئے اقبال عقل کو نبوت پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ مغرب زدگی نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ مضمون شائع ہوا تو راجہ حسن اختر صاحب نے انگریزی زبان ہی میں مدیر لائٹ کے نام ایک خط لکھا، جس میں ان کے غلط خیال کی تردید بڑے معقول طریقے سے کی گئی تھی۔ اتفاق

سے لاہور میں راجہ صاحب سے لائٹ کے اس مضمون کا ذکر آ گیا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ پرچہ چونکہ ایک انجمن کا ہے، جس کی ایک مخصوص دعوت ہے لہٰذا مجھے اس کا ترجمہ اردو میں شائع کر دینا چاہیے۔ حضرت علامہؒ نے بھی اس خیال سے اتفاق فرمایا۔ پھر جب ضمناً بعض دوسرے مسائل کی وضاحت ضروری نظر آئی اور میں نے حضرت علامہ سے اس بارے میں مشورہ کیا تو انھوں نے از راہِ عنایت (یہ) دو تحریریں مرحمت فرمائیں، (مکتوباتِ اقبال ص300، مرتبہ سیّد نذیر نیازی، یہ طویل اقتباس صرف اس لیے درج کیا گیا ہے تا کہ آپ ان تحریروں کے پس منظر سے پوری طرح آگاہ ہو سکیں۔

1. خط کشیدہ الفاظ میں دی گئی یہ عبارت وہی ہے جسے بشیر احمد صاحب ڈار نے اپنی کتاب انوار اقبال میں حذف کر دیا ہے جبکہ علامہ مرحوم کی تحریر کے عکسی متن میں یہ موجود ہے اور صاف پڑھی جاتی ہے۔
2. ابی جعفر محمد بن جریر الطبری، تیسری صدی ہجری کے مایہ ناز مسلمان مورخ، محدث اور مفسر۔
3. علامہ طبری کے الفاظ یہ ہیں: كَانَ يُؤَذِّنُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَيَشْهَدُ فِي الْاَذَانِ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَكَانَ الَّذِيْ يُؤَذِّنُ لَهٗ عَبْدُ اللّٰهِ ابْنُ النَّوَاحَةِ وَكَانَ الَّذِيْ يُقِيْمُ لَهٗ حُجَيْرُ ابْنُ عُمَيْرٍ وَيَشْهَدُ لَهٗ وَكَانَ مُسَيْلَمَةَ اِذَا دَنَا حُجَيْرٌ مِنَ الشَّهَادَةِ قَالَ صَرِّحْ حُجَيْرٌ فَيَزِيْدُ فِيْ صَوْتٍ وَيُبَالِغُ التَّصْدِيْقَ نَفْسَهٗ (تاریخ طبری، ج3 ص244) کہ نبی کریمؐ کے لیے اذان دیتا تھا کہ...... محمد اللہ کے رسول ہیں۔ (مسیلمہ کے لیے) اذان عبداللہ بن النواحہ دیتا اور اقامت حجیر بن عمیر کہتا اور جب حجیر شہادت کے قریب پہنچتا تو مسیلمہ کہتا اے حجیر خوب زور سے کہو (یعنی شہادت کو بلند آواز سے کہو تا کہ لوگوں کو اچھی طرح سنائی دے) پس حجیر آواز کو بلند کرتا۔ اس طرح مسیلمہ اپنی تصدیق میں مبالغہ کرتا۔
4. یہ اشارہ ہے حضرت علامہ کے پانچویں لیکچر کے اس جملہ کی طرف جس میں کہا گیا ہے کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا: **Life cannot for ever be kept in leading strings.**

   The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Page 120. By Sir Muhammad Iabql.
5. ثابت۔ 6. نجات۔
7. انوار اقبال ص45 مرتبہ بشیر احمد ڈار شائع کردہ، اقبال اکادمی، کراچی۔

(4)

1. منشاء غرض و غایت۔ 2. وقت۔
3. کسی ایک ذات سے تعلق رکھنے والی حقیقت۔
4. معاشرتی و سماجی۔ 5. سماجی و سیاسی مکتب فکر۔ 6. مکتب فکر۔
7. شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ اسلامی اندلس کے ایک مشہور صوفی بزرگ جو چھٹی صدی ہجری میں پیدا ہوئے۔
8. انوار اقبال ص47 مرتبہ بشیر احمد ڈار۔

❁......❁......❁

سید نذیر نیازی

علامہ اقبالؒ اور ختم نبوت

آج سے چند ماہ پہلے جب علامہ اقبال مدظلہ نے احرار اور قادیان کی باہمی آویزش کے متعلق اپنا مشہور بیان شائع کیا[1] تو اس میں ختم نبوت کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا تھا کہ ندرتِ تخیل کے اعتبار سے اس عقیدے کی حیثیت بنی نوع انسان کے افکار اور تہذیب و ثقافت کی تاریخ میں اپنی نظیر آپ ہے۔ اس پر قادیان کے علاوہ بعض مسلم اور غیر مسلم حلقوں میں جو ردوکد ہوتی رہی، اس سے قارئین ''طلوعِ اسلام[2]'' بے خبر نہیں ہوں گے۔ لیکن تعجب خیز امر یہ ہے کہ علامہ ممدوح نے جو سوال اٹھایا تھا اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ کیے بغیر جریدہ ''لائٹ[3]'' نے بھی اس موضوع پر رائے زنی کرنا شروع کر دی۔ جہاں تک ختم نبوت کا تعلق ہے، مدیر ''لائٹ'' ڈاکٹر صاحب کے ارشادات سے حرف بحرف متفق تھے لیکن کبھی نہ معلوم اختلالِ ذہنی کی بنا پر انھوں نے سمجھ لیا کہ ختم نبوت سے مقصد یہ ہے کہ انسان دینی قیود سے آزاد ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس غلط اور بے بنیاد تعبیر کو کوئی صحیح الفہم انسان ایک لمحے کے لیے بھی قبول نہیں کرے گا۔ جریدہ ''ٹروتھ''[4] نے ایڈیٹر صاحب کو اس غلط بیانی پر متنبہ بھی کیا تھا۔ پھر راجا حسن اختر صاحب نے اپنے ایک مراسلے میں، جس کو ہم دوسری جگہ شائع کر رہے ہیں، ''لائٹ'' کے شبہات کی تردید کرتے ہوئے اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ''تشکیلِ جدید'' کے پانچویں خطبے میں یہ بحث کسی قدر زیادہ تفصیل کے ساتھ موجود ہے، جس کے مطالعے کے بعد کسی غلط فہمی کا احتمال نہیں رہے گا لیکن ایڈیٹر ''لائٹ'' غالباً فلسفہ سے ناواقف ہیں اس لیے کہ ان افسوس ناک غلط فہمیوں کے اعتراف کی بجائے جن کی بغیر کسی احساسِ ذمہ داری کے انھوں نے بڑے جوش و خروش سے اشاعت کی ہے، وہ بدستور اپنی رائے پر قائم رہے اور تشکیلِ جدید کی عبارات میں کچھ اس قسم کی معنوی تحریفیں کی ہیں، جن کو دیکھ کر تعجب بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے شبہات خلوص اور دیانت داری پر مبنی ہیں لیکن جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے انھیں ''شاعر کی ذات سے عقیدت اور نیازمندی کا دعویٰ ہے۔'' اور اس امر کا اعتراف بھی کہ ''نوجوانانِ اسلام کی خوابیدہ روحیں اقبال ہی کی شاعری سے بیدار ہوئیں۔'' لہٰذا

سوچنے کی بات تھی کہ ان کا ذہن جس غلط نتیجے پر پہنچا ہے اس کی ذمہ داری خود انہی کے عجز فہم پر عائد ہوتی ہے، یا راجا صاحب کی تصریحات پر۔ یہ اس لیے کہ شاعر کا پیغام تمسک بالکتاب، اتباع رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور پابندیِ دین کے سوا اور کچھ نہیں۔ بہر کیف ایڈیٹر "لائٹ" کی ساری مشکل "تشکیلِ جدید" کی یہ عبارت ہے:

> "اسلام کا ظہور...... استقرائی علم کا ظہور ہے...... اسلام نے نبوت کی تکمیل سے خود نبوت کو ختم کر دیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ قیود کا پابند نہیں رکھا جا سکتا۔ شعورِ ذات کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ انسان کو اس کی ذاتی قوتوں پر چھوڑ دیا جائے۔"[5]

ان سطور سے ہمارے فاضل صحافی نے یہ عجیب و غریب نتیجہ اخذ کیا ہے کہ "اقبال نے عقلِ انسانی کو وحی پر ترجیح دی ہے۔ ان کے نزدیک ذات یا "انا" تمام عظمتوں کا دارومدار ہے...... یہ نطشے کا اثر ہے...... مغربیت کی جھلک...... اگر ختم نبوت سے مطلب سلسلہ وحی کا انقطاع اور عقل کا ظہور ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اب ہماری نجات قرآن سے وابستہ نہیں...... اس لیے کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک شعورِ نبوت ایک قسم کی کفایتِ فکر ہے، جس کا تعلق انسان کے عہد طفولیت سے تھا...... وغیرہ وغیرہ......"

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ ایڈیٹر صاحب "لائٹ" اگر وحی و عقل کے باہمی فرق اور تاریخِ انسانی کے مختلف ادوار تمدن سے ناواقف ہیں لہٰذا "تشکیلِ جدید" کی عبارتوں کا مطلب نہیں سمجھے تو خیر یہ ان کی معذوری تھی۔ لیکن انھوں نے راجا صاحب کی فہمائش کے باوجود بعض ضروری عبارات کو نظر انداز کر دیا اور اس طرح تحقیق و تنقید کی دنیا میں ایک شدید ناانصافی کے مرتکب ہوئے۔ تشکیلِ جدید کی پوری عبارت یہ ہے:

> "اسلام کا ظہور جیسا کہ ہم آگے چل کر ظاہر کریں گے، استقرائی علم کا ظہور ہے۔ اسلام نے نبوت کی تکمیل سے خود نبوت کو ختم کر دیا۔ اس میں یہ نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ قیود کا پابند نہیں رکھا جا سکتا۔ شعور ذات کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ انسان کو اس کی ذاتی قوتوں پر چھوڑ دیا جائے...... اسلام نے دینی پیشوائی اور بادشاہت کو بھی تسلیم نہیں کیا۔ علیٰ ہٰذا قرآن مجید نے انسان کے محسوسات و مدرکات اور غور و فکر پر بار بار زور دیا ہے اور کہا ہے کہ تاریخ اور فطرت دونوں علم کے ذرائع ہیں۔ یہ سب اس خیال کے مختلف پہلو ہیں جو

انقطاعِ نبوت کی تہ میں کام کرتا ہے لیکن یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ باطنی واردات، الہام وکشف (مدیر) کو جو باعتبار کیفیت شعور نبوت سے مختلف نہیں اب زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ قرآن مجید نے انفس اور آفاق دونوں کو علم کا ماخذ ٹھہرایا ہے۔ آیاتِ الٰہیہ کا ظہور (داخلی) محسوسات اور (خارجی) مدرکات دونوں میں ہوتا ہے اور انسان کا فرض ہے کہ اپنی واردات کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتا رہے اور اس طرح معلوم کرے کہ ان میں کہاں تک حصول علم کی صلاحیت موجود ہے۔ لہٰذا ختم نبوت کا یہ مطلب نہیں کہ اب زندگی پر عقل کی حکمرانی مقدر ہو چکی ہے، اس میں جذبات کو دخل نہیں ہوگا۔ ایسا ہونا نہ ممکن ہے نہ مقصود۔ عقیدہ ختم نبوت کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے باطنی واردات کے متعلق ایک آزاد اور ناقدانہ طرزِ عمل کرنے میں مدد ملتی ہے کیونکہ اس سے یہ ماننا لازم آتا ہے کہ اب نوع انسانی کی تاریخ میں کوئی شخص اس بات کا دعویٰ نہیں کرے گا کہ وہ کسی مافوق الفطرت اختیار کی بنا پر ہمیں اپنی اطاعت کے لیے مجبور کر سکتا ہے۔ پس ختم نبوت کا مقصد یہ ہے کہ ہماری داخلی واردات کی دنیا میں بھی نئے نئے مظاہر علم کا انکشاف ہو۔"

کیا ایڈیٹر صاحب "لائٹ" انکار کر سکتے ہیں کہ یہ انسان کے شعور ذات کی تکمیل میں ایک ضروری مرحلہ تھا جس کی اہمیت کا شاید وہ اپنے مخصوص عقائد کی وجہ سے ٹھیک اندازہ نہیں کر سکے۔

بہر کیف ختم نبوت کا مسئلہ اس قدر اہم ہے اور اس کے متعلق علامہ اقبال نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اگر ان کی مزید تشریح کر دی جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ یوں بھی ایک علمی اور دینی بحث کی حیثیت سے اس بارے میں کسی مزید غلط فہمی کی گنجائش باقی نہیں رہنی چاہیے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ "تشکیل جدید" کی جس عبارت سے ایڈیٹر "لائٹ" نے ٹھوکریں کھائی ہیں ان کا موضوع عقلی اعتبار سے ختم نبوت کی تائید کرنا ہے۔ یعنی یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بعثتِ انبیاء کا سلسلہ بند ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے امور ذیل کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

اوّل یہ کہ عقل اور وحی دونوں کو علم کا ماخذ ٹھہرا کر ان کا باہم مقابلہ کرنا صحیح نہیں۔ اس لیے کہ علم کا ذریعہ انسان کے داخلی اور خارجی حواس ہیں۔ عقل انکشافاتِ حواس کی تنقید کرتی ہے۔ خواہ علوم فطرت کی دنیا میں ہمیں اپنے خارجی حواس کی بدولت جو علم حاصل ہوتا ہے۔ عقل نے اس کی صحت وعدم صحت کا جائزہ لیتے ہوئے مختلف نظریوں اور اصول وکلیات کی بنا رکھی اور انسان کو اس کے بعض مغالطوں پر مطلع

کیا۔ مثلاً طلوع وغروب آفتاب یا سکونِ زمین...... اسی طرح تکمیلِ وحی کے بعد عقل کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہر مدعیٔ الہام وکشف کی نفسیاتی حالت کی تنقید کرے تا کہ اس امر کا پتہ چل سکے کہ جو شخص الہام و کشف کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کی شخصیت کیا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ سنت اسلامیہ میں اس تنقید کا مدار قرآن وسنت پر ہوگا۔

دوسرے یہ کہ وحی بیشک حصولِ علم کا ایک ذریعہ ہے لیکن اس میں اور علم بالحواس میں فرق یہ ہے کہ جہاں علم بالحواس محنت اور انتظار کا پابند ہے اور اس کے لیے قیدِ زمانی شرط، وہاں وحی میں علم کا یہ زمانی عنصر غائب ہو جاتا ہے۔ گویا یہ ایک لمحے یا ''طرفتہ العین'' میں ان حقائق کا انکشاف ہے جن کو ہم اپنے حواس کی مدد سے ہزار ہا سال کی مدت میں بھی معلوم نہیں کر سکتے۔ باعتبار کیفیت اگر ہم علم بالوحی کا تصور کرنا چاہیں تو اس کے لیے الہام وکشف یا آرٹ اور فلسفہ وحکمت کی دنیا میں ''القا'' کی مثال پیش کی جا سکتی ہے لیکن جس طرح بلحاظ قدر وقیمت الہام وکشف کا درجہ ''القا'' سے بلند ہے، اسی طرح کشف و الہام کو وحی سے کوئی نسبت نہیں کیونکہ کشف والہام کی کیفیت انفرادی ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کے لیے حجت نہیں۔ برعکس اس کے وحی ایک اٹل اور ناقابل انکار حقیقت ہے اور اس سے جن حقائق کا انکشاف ہوتا ہے ان کی پابندی ہر شخص پر فرض ہے۔ لہٰذا اصطلاحاً وحی کا لفظ اسی وقت استعمال کیا جاتا ہے جب خود اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو ہم کلامی کے لیے منتخب کرے اور اس طرح اس سے انسان کی ہدایت ورہنمائی کا مقصد پورا ہوتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کی حیثیت ہمیشہ اجتماعی ہوتی ہے اور اس کا وجود ہمارے لیے حجت۔ ضروری نہیں کہ ہم عقلاً اس کی تمام مصلحتوں کو سمجھ سکیں۔

تیسرے یہ کہ اسلام سے پہلے جو ادوارِ تمدن گزرے ہیں۔ ان میں باوجود اختلافات کے ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ کہ ان سب کی بناء استخراج پر تھی۔ جو استقرا کے برعکس تحقیقِ حق اور تسخیر فطرت کا ایک سہل مگر ناقص طریق ہے اس لیے کہ یہ وہ منہاجِ علم ہے جو تجربہ اور مشاہدہ اور محنت وانتظار کی سعی وجہد سے آزاد ہے۔ اسی لیے وحی الٰہی کی ضرورت تھی کہ بار بار انسان کو اس کی غلطیوں پر متنبہ کرے۔ لہٰذا اس کے رشد وہدایت کے لیے ہر جگہ اور ہر زمانے میں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوتے رہے۔ جن کی تبعیت وپیروی فرض تھی۔ یہ گویا تاریخ انسانی کا عہدِ طفولیت ہے جس میں انسان اپنی ترقی کے ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا۔ وحی الٰہی نے بتدریج اس کی تربیت کی۔ اگر یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تو ناممکن تھا کہ انسان کے اندر اعتماد علی النفس پیدا ہوتا اور وہ اپنے شعورِ ذات کی من کل الوجوہ تکمیل کر سکتا کیونکہ اس کے لیے کوئی نظام حیات آخری اور قطعی نہیں تھا۔ تکمیل وحی کی ضرورت خود اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اس سے قبل انسانیت کی تکمیل نہیں ہوئی تھی لیکن اس سے ان برگزیدہ اور مقدس افراد کی

عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا، جو منصب نبوت سے سرفراز ہوئے۔ اس لیے کہ یہاں بحث نوع انسانی سے ہے۔ اس کے تدریجی ارتقاء سے کہ حکمت الٰہیہ کس طرح اس کو اس مرحلے پر لے آئی جب اسے علم استقرائی سے روشناس کرانا مقصود تھا۔ (علم استقرائی کے بغیر یہ ممکن نہیں کہ انسان اپنے ماحول پر غالب آسکے) اور رسالتِ محمدیہ کے ذریعے زندگی کی آخری اور دوامی اساس اس پر منکشف کی۔ اس امر کو قرآن پاک نے کس خوبی سے تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت سے تعبیر کیا ہے اور حقیقت میں یہ نبی آخرالزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہم انسانوں پر اتنا بڑا احسان ہے جس کا حق قیامت تک بھی ادا نہیں ہوسکتا۔ البتہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس آخری ہدایت کے ہوتے ہوئے بھی انسان چھوٹی چھوٹی اور وقتی ہدایتوں کا محتاج ہے یا یہ کہ وحی محمدی کے باوجود قانونِ حیات کی تکمیل ابھی باقی ہے۔ یعنی وہ لوگ جو ضرورتِ نبوت کے قائل ہیں تشریعی ہو یا غیر تشریعی اور وہ لوگ جو مغربی خیالات کے زیر اثر نظام شریعت کو اپنے لیے حجت نہیں سمجھتے، وہ دانستہ یا نادانستہ نبوت محمدیہ کے منکر ہیں۔ اس لیے کہ وہ انسان کو پھر اس دور کی طرف لے جانا چاہتے ہیں جہاں سے اسلام ان کو آگے لے آیا تھا۔ بالفاظ دیگر وہ تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کا مطلب نہیں سمجھتے اور انھیں تعلیماتِ قرآنی میں کوئی بصیرت حاصل نہیں۔

چوتھے یہ کہ اختتام وحی یا انقطاع نبوت سے یہ استدلال کرنا غلط ہے کہ اب عقل کو (نعوذ باللہ) وحی پر ترجیح حاصل ہے۔ لہٰذا اس سے مقصود تبعیتِ وحی کو ختم کر دینا ہے۔ یہ کہنا کہ آئندہ کے لیے نزولِ وحی کو روک دیا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ کہاں مرتب ہوتا ہے کہ اب وحی کی پیروی ضروری نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں تنہا یا باہم اس درجہ مختلف ہیں کہ ان کو دنیا کی کوئی منطق ایک نہیں ٹھہرا سکتی۔ اس لیے ہمیں اپنی زندگی کے متعلق جو بصیرت حاصل ہوئی ہے اس کا سرچشمہ بھی وحی ہے۔ یہ وحی الٰہی ہے جس کی بدولت انسان نے اپنے موجودہ دور ارتقاء میں قدم رکھا۔ لہٰذا ان میں سے ایک کا انکار گویا دوسرے کا انکار ہوگا۔ یہ کیونکر ثابت ہوا کہ نبوت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے لیے جو راہ مقرر کی ہے اس کا اختیار کرنا احکام نبوت کو رد کرتا ہے اس سے تو خود بخود احکام نبوت کا اتباع لازم آتا ہے۔ اگر اسلام نے انسان کو علوم استقرائی سے روشناس کرایا اور اس کو بار بار عقل وفکر اور مشاہدے کی دعوت دی تو عقل وفکر اور مشاہدے کے ساتھ استقرائی علوم کا وجود کس دلیل کے ماتحت اسلام کا منافی ہے؟ اس سے اگر کوئی نتیجہ مرتب ہوسکتا ہے تو صرف یہ کہ اگر شعورِ ذات کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ انسان کو اس کی ذاتی قوتوں پر چھوڑ دیا جائے تو یہ اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک کہ انسان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی اختیار نہ کرے۔ لہٰذا نبوتِ محمدیہ کی ختمیت ہی اس کی ابدیت پر دلالت کرتی ہے بلکہ اگر ہم چاہیں بھی تو احکام نبوت سے آزاد نہیں ہوسکتے کیونکہ یہ احکام زندگی کی گہرائیوں سے پیدا ہوئے ہیں جن

کو فطرتِ صحیحہ خود بخود قبول کرتی ہے۔ ان کا اتباع گویا تقاضائے فطرت کا اتباع ہے اسی لیے اسلام کو دینِ فطرت کہا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے خود ہمارے فائدے کے لیے پسند کیا۔ یہ مقصود نہیں تھا کہ وہ ہمارے لیے تکلیف کا باعث ہو۔ **ماجعل علیکم فی الدین من حرج** (7)۔

پانچویں یہ کہ نبوت کے دو پہلو ہیں۔ ایک وہ مخصوص حالات و واردات جن کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلامی تصوف میں نبوت کو روحانیت کا ایک مقام خاص (مقام بھی تصوف کی ایک اصطلاح ہے۔) تصور کیا جاتا ہے' اور دوسرا سنتِ نبوی جس سے ایک جدید اجتماعی اور سیاسی فضا کی تخلیق ہوتی ہے اور انبیاء و مرسلین جماعتِ انسانی کے سامنے اخلاق و اعمال کا ایک نیا تخیل پیش کرتے ہیں جس کے اقرار سے انسان کمالاتِ زندگی تک پہنچتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اس جدید نظام میں شریک نہیں ہوتا وہ کمالات ذات سے محروم رہتا ہے۔ اس محرومی کو مذہبی اصطلاح میں لفظ کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا ریاست کی تصدیق محض صاحب رسالت کے مرتبہ و مقام کا اعتراف نہیں بلکہ یہ عبارت ہے اس کی سنت کے اتباع اور جس اخلاقی فضا کی تخلیق اس کے وجود سے ہوئی تھی' اس میں پرورش حاصل کرنے سے۔ اگر کوئی شخص اس پابندی سے گریز کرتا ہے تو وہ بلا شک و شبہ کافر ہے۔ لہٰذا نبوت کا اطلاق اسی وقت ہو سکتا ہے جب کسی شخص میں دونوں اجزا موجود ہوں، بالفاظ دیگر ختم نبوت کے یہ معنی ہوں گے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اب کوئی شخص اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ ان اجزاء کا حامل ہے یعنی ایک طرف اسے روحانیت کا وہ مقام حاصل ہے جو انبیاء کے لیے مخصوص تھا اور دوسری جانب اس کی ذات ملت کے لیے حجت کہ اگر ہم اس کی جماعت میں داخل نہیں ہوتے تو گویا کفر کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جو شخص اس قسم کا دعویٰ کرتا ہے وہ کاذب ہے اور شریعت اسلامی کی رو سے واجب القتل جیسا کہ مسیلمہ کذاب کی مثال سے صاف ظاہر ہے کہ اسے باوجود رسالت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کے قتل کر دیا گیا۔ البتہ ختم نبوت کا یہ مطلب نہیں کہ مکالمہ الٰہیہ' کشف والہام کا سلسلہ منقطع ہو گیا کیونکہ ہر سچے اور اخلاص مند مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلام کو بطور دین فطرت کے اپنی ذات پر منکشف کرے۔ یہ گویا اس کے پیش کردہ حقائق سے اتحاد و اتصال کی کوشش ہے' جس کو اصطلاحاً لفظ ''تصوف'' سے تعبیر کیا گیا ہے مگر اس طرح انسان کو جو مقام حاصل ہوتا ہے اس کو ولایت سے موسوم کیا گیا ہے کیونکہ نبی آخر الزمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد الہام کو کشف کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ وہ کسی شخص کے ذاتی واردات اور مشاہدات تو ضرور ہیں لیکن ان کی جماعتی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ امت کو اس کی تنقید و تحقیق' علیٰ ہذا تنقیص کا حق حاصل ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ صاحب الہام ان کو اپنے لیے حجت سمجھے مگر یہ کہنا کہ وہ تمام عالم اسلام کے لیے بھی حجت ہو سکتے ہیں' غلط ہو گا کیونکہ اس طرح

استقرار تنقید اور روایت و درایت غرضیکہ تاریخ اور علم و حکمت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہی فتنہ تھا جس سے امت کو محفوظ رکھنے کے لیے ختم نبوت کی ضرورت پیش آئی تا کہ وحی محمدی کو قیامت تک حجت ٹھہرایا جا سکے گویا ختم نبوت سے مقصد مطلقاً باب نبوت بند کر دینا ہے۔ یعنی یہ کہ اب انسان کی تاریخ میں کسی جدید اخلاقی اور اجتماعی فضا کی تخلیق نہیں ہوگی۔ اس کو جس چیز کی ضرورت تھی مل گئی۔ انسان اس بات کا محتاج نہیں کہ وہ اپنی ہدایت و رہنمائی کے لیے نئے نئے انبیاء کی آمد کا منتظر رہے اس کی تکمیل ذات اور اعتماد علی النفس کے تمام مراحل پورے ہو چکے ہیں۔ خدا کا بھیجا ہوا قانون اور اس کا عملی نمونہ یعنی سنتِ نبوی اس کے سامنے ہیں۔ یہ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی سعی و کوشش سے اس راہ پر چلے اور اس طرح فیوض و برکات الٰہیہ کا مستحق ہو لیکن یہ امر کہ ملتِ اسلامیہ کے لیے جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کسی دوسرے انسان کا اتباع اور پیروی ضروری ہے صحیح نہیں۔ اس کا مطلب ہوگا کہ نبوت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باوجود ابھی انسان کو مزید ہدایت اور رہنمائیوں کی ضرورت ہے حالانکہ کتاب و سنت کے ہوتے ہوئے ایمان و یقین کی تکمیل ہو چکی ہے اور اب انسان اپنی نجات کے لیے کسی دوسرے انسان کا محتاج و منتظر نہیں۔ تاریخ انسانی کے ایک دور میں البتہ اس کی ضرورت تھی لیکن ظہور اسلام کے ساتھ اس دور کا، جس کے نفسیاتی خصائص میں انتظار اور بے اعتمادی شامل ہیں' لہٰذا اس کے لیے ''مجوسی ثقافت'' کی اصطلاح وضع کی گئی، خاتمہ ہو گیا کیونکہ تکمیلِ دین کے بعد اس امر کی ضرورت نہیں رہی تھی کہ انسان کو اور وحیوں اور ہدایتوں کا منتظر رکھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اب اسلام میں تشریعی اور غیر تشریعی نبوت' ظل و بروزِ بعثت ''مجددین و ناموریں'' اور ظہور ائمہ کے جو تصورات قائم ہیں وہ سب مجوسی انداز خیال کا نتیجہ ہیں اور ختم نبوت میں حارج ہوتے ہیں۔ اسلام کو ان سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ جن احادیث و روایات کو ان کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے' ان کے باوجود تمام ائمہ و صوفیا اور سلف صالحین نے اس قسم کے کسی عقیدے کو صحیح تسلیم نہیں کیا۔ گویا مجوسی ثقافت کے حامی ان کی جو تاویل کرتے ہیں غلط ہے۔ شرعی لحاظ سے دیکھا جائے تو قرآن و سنت سے ان کی کوئی سند نہیں ملتی اور عقلی اعتبار سے وہ اعتمادِ ذات اور تکمیلِ شعور کی اس دولت کو چھین لیتے ہیں' جو بنی نوع انسان پر اسلام کا ایک زبردست اور ناقابلِ انکار احسان ہے۔

❁……❁……❁

حواشی

1. مضمون کا عنوان ہے "Qadianism & Orthodox Muslims" یہ مضمون لطیف احمد..... کی مرتبہ کتاب Speeches, Statements and Writings of Iqbal (لاہور 1977ء) میں شامل ہے۔
2. مصنف کا رسالہ "طلوعِ اسلام" جو اُن دنوں دہلی سے شائع ہوتا تھا۔
3. "Light" انگریزی ہفت روزہ جو قادیانیوں کا ترجمان تھا۔
4. Truth انگریزی ہفت روزہ جو قادیانیوں کی لاہوری جماعت کا ترجمان تھا۔
5. "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" ص 193۔
6. اس پیراگراف میں اقبال کے جن خیالات کو پیش کیا گیا وہ تشکیلِ جدید میں صفحہ 94,93 پر ملتے ہیں۔
7. سورۃ: الحج، آیت: 78 ترجمہ: اور دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں۔

محترمہ ارشد خانم

اقبالؒ کا تصورِ ختم نبوت

''خاتم'' ہر شے کے انجام وآخر کو کہتے ہیں۔ ''ختام'' لاکھ یا موم کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو بند کر کے مُہر لگا دی جاتی ہے اور ''خاتم'' وہ شے ہے جس سے اس لاکھ پر مُہر لگائی جاتی ہے۔ پھر اس مُہر کے بعد اس کے اندر کی چیز باہر نہیں آ سکتی اور باہر کی کوئی چیز مُہر شدہ چیز کے اندر نہیں جا سکتی۔

عربی زبان میں ''ختم'' کے معانی کسی چیز کو ڈھانک دینا یا چھپا دینا کے ہیں مثلاً ''**ختم اللّٰہ علی قلوبھم**'' اللہ نے ان کے دلوں پر مُہر لگا دی ہے۔ ختم نبوت سے مراد یہ ہے کہ بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے ازل سے جو نبیوں کا ایک سلسلہ چلا آتا تھا' اس پر مُہر لگا دی گئی ہے۔ اب سلسلۂ انبیاء کی اس لڑی میں اور کسی نئے نبی کے نام کا موتی شامل نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس میں سے کسی پرانے نبی کو کم کیا جا سکے گا۔

''خاتم النّبیین'' وہ مقدس ہستی ہوگی جو نبیوں کے اس سلسلے پر مُہر لگانے والی ہوگی۔ یعنی ان کا وجودِ مبارک نبیوں کے اس سلسلہ پر مُہر لگا دے گا۔ یہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے جن کی بعثت کے بعد تعلیماتِ الٰہیہ ہر طرح سے مکمل ہو گئی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے مزید وحی اور الہامات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ نہ تو اب کوئی نیا نبی آئے گا' اور نہ ہی کوئی الہامی کتاب نازل کی جائے گی۔ اس لیے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے حوالہ سے دین کی تکمیل ہو چکی ہے۔ ارشادِ ربانی ہوتا ہے:

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناo (مائدہ:3)

ترجمہ: اب ہم تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر چکے اور ہم نے تم پر احسان پورا کر دیا اور تمھارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔

ختمِ نبوت' قرآنی تعلیمات کی روشنی میں

دنیا میں انبیاء ورسل کی بعثت کی جو غرض رب کریم نے بیان فرمائی تھی وہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ میں اپنے کمال کو پہنچ کر پوری ہوگئی ہے۔ قرآن نے تکمیل انسانیت کے تمام پہلوؤں کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا ہے' اس لیے کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں رہی۔ ختم نبوت کا وہ چشمہ جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ سے جاری ہوا تا قیامت بنی نوع انسان کو سیراب کرتا رہے گا۔ خود قرآن گواہی دیتا ہے:

ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللّٰہ و خاتم النبیینo (احزاب: 40)

ترجمہ: نہیں ہیں محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ' لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔

اور یہ کہ: **وما ارسلنک الا رحمة للعلمین. (انبیاء : 107)**

ترجمہ: اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم نے آپ کو تمام جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

قرآن سے پہلے جتنی بھی الہامی کتب نازل ہوئیں ان میں کہیں بھی کسی پیغمبر یا نبی کے لیے اس قسم کے الفاظ استعمال نہیں کیے گئے تھے۔ گویا ہر دین کی تعلیمات' تشنۂ تکمیل تھیں۔ اسی لیے ہر دور کی مذہبی والہامی کتب میں ایک نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے کی بشارت موجود تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے یہ بشارت پوری ہوگئی۔ اب قرآن کا دستور تا قیامت قائم رہے گا۔

ختمِ نبوت' احادیث کے آئینے میں

جس طرح تمام کائنات کا خالق و مالک ایک اللہ ہے' اسی طرح اس نظام کو متحد و منظم رکھنے والا قانون بھی ایک ہے۔ قانون الٰہی کے اوامر ونواہی بیان کرنے والا قرآن بھی ایک ہے۔ قرآن کی تعلیمات سے روشناس کرانے والا نبی آخر الزمان بھی ایک ہی ہے اور وہ مجسم جامع القرآن ہے۔ وہ اپنے اقوال واحادیث میں بھی یکتا و بے مثل ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اس بات پر مُہر تصدیق ثبت کردی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

یاَیھا الناس ان ربکم واحدا و اباکم واحد و دینکم واحد و نبیکم واحد لانبی بعدیo

ترجمہ: اے لوگو! یادرکھو تمہارا خدا ایک ہے' تمہارا باپ ایک ہے' تمہارا دین ایک ہے۔
تمہارا نبی ایک ہے اور میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا:

انا آخر الانبیاء و مسجدی آخر المساجد الانبیاءo

ترجمہ: میں آخری نبی ہوں اور میری مسجد آخری مسجد ہے۔ **(مسلم جلد 1' ص 446)**

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں ''خاتم الانبیاء'' ہوں اور میری مسجد مساجدِ انبیاء کی خاتم ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر تقریباً ایک لاکھ چوالیس ہزار لوگوں کے سامنے فرمایا تھا۔

''اے لوگو! خبردار رہنا میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا کیونکہ میں آخری نبی ہوں اور تمھارے بعد کوئی امت نہ ہوگی کیونکہ تم آخری امت ہو اور تم کو قیامت کے دن میری نسبت یہی سوال ہوگا اور کسی کی نسبت نہیں پوچھا جائے گا۔''[1]

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انگشتِ شہادت اور بیچ کی انگلی کو ملا کر فرمایا کہ میں اور قیامت دونوں اس طرح سے ملے ہوئے بھیجے گئے ہیں' جس طرح یہ دونوں انگلیاں ملی ہوئی ہیں۔ علمائے حدیث اس بات پر متفق ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور قیامت کے درمیان کوئی نیا نبی نہیں آئے گا۔[2]

بخاری اور مسلم نے غزوۂ تبوک کے باب میں حدیث روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاد کے موقع پر حضرت علیؓ کو ساتھ نہیں لیا بلکہ گھر پر چھوڑ دیا۔ حضرت علیؓ نے (بطور نیاز مندانہ شکایت) عرض کیا! ''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے عورتوں اور بچوں کے ساتھ چھوڑ دیا؟'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (ان کی تسلی کے لیے) فرمایا ''کیا تم اس پر راضی نہیں کہ تم میرے ساتھ ایسے ہو جاؤ جیسے ہارون موسیٰ کے ساتھ' (یعنی جس طرح حضرت موسیٰؑ کوہِ طور پر جاتے وقت ہارون کو بنی اسرائیل میں اپنا نائب بنا کر چھوڑ گئے تھے' (اسی طرح سے تم اس وقت میرے نائب ہو) لیکن میرے بعد نبوت نہیں۔ اس لیے اگرچہ تمہارا مرتبہ ہارون کا سا ہے مگر تم کو نبوت حاصل نہیں۔ مسلم کی ایک روایت کے الفاظ یہ بھی ہیں' **الا انک لست نبیا** '' ترجمہ: مگر تم نبی نہیں ہو۔

ایک موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے لیکن میرے بعد نبوت نہیں ہے۔

علامہ اقبالؒ نے 3 مئی **1935**ء کو مرزائی امت کی حقیقت کے بارے میں ایک بیان جاری

کیا، جس میں فرمایا:

''مسلمان ایسی تمام تحریکوں کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہیں جنھیں وہ اپنی اساسی وحدت کے لیے خطرناک سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہے لیکن اپنی بنیاد کسی نئی نبوت پر رکھتی ہے اور ان تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیتی ہے جو اس کے مبینہ الہامات پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ مسلمان اس جماعت کو اسلام کی وحدت کے لیے ایک خطرہ تصور کرتے ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیے کیونکہ وحدتِ اسلامی کا تحفظ ''ختم نبوت'' کے عقیدہ ہی سے ممکن ہے۔''[3]

اقبال نے ختم نبوت کے مسئلہ کی وضاحت کیوں ضروری سمجھی؟ دراصل اقبال کے زمانہ میں پنجاب کے قصبہ ''قادیان'' میں مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے آپ کو بتدریج مبلغ اسلام، مناظرِ اسلام، محدث، ملہم، مجدد، امام مہدی، مسیحِ موعود اور بالآخر کامل نبی قرار دیا۔ اقبالؒ اس کے دعویٰ نبوت سے شدید بے زاری کے عالم میں یہ بیان دیتے ہیں کہ:

''میرے نزدیک بہائیت، قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے لیکن مؤخر الذکر اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے مگر باطنی طور پر اسلام کی روح اور مقاصد کے لیے انتہائی مہلک ہے۔''[4]

اقبال کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ''ختم نبوت'' پر ایمان دراصل مسلم اور غیر مسلم کے درمیان حد فاصل ہے۔ اقبال نے اپنی تحریر و تقریر، بیانات و خطبات میں ایک مخصوص اسلامی تہذیبی قدر و قیمت کی وضاحت کی ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ:

''ہندوستان میں کوئی سا مذہبی سٹے باز اپنی اغراض کی خاطر کوئی بھی دعویٰ کر سکتا ہے اور ایک نئی جماعت کھڑی کر سکتا ہے اور یہ لبرل حکومت کسی خاص جماعت کے استحکام و یک جہتی کی ذرہ بھر پرواہ نہیں کرتی۔ بشرطیکہ سٹے باز حکومت کو اپنی اطاعت و وفاداری کے علاوہ اس امر کا یقین دلا دے کہ اس کے پیرو حکومت کی اطاعت کے فرائض اور سرکاری محصول باقاعدہ ادا کرتے رہیں گے۔''[5]

اقبال کہتے ہیں کہ ''**الیوم اکملت لکم**'' سے مراد تکمیل شریعت ہے۔ اسی طرح ''**لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی**'' سے مراد شریعت قرآنی کی اصولی ہدایت کو جھٹلا کر

ملتِ اسلامیہ کو نظم و استحکام بخشا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ملتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی کے لیے دیر کر رہی ہے۔

اقبال کو احساس تھا کہ "مقامِ نبوت" انسانیت کی آخری معراج اور ارتقائے انسانی کی اعلیٰ ترین منزل ہے۔ سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے تشریف لانے کے بعد دنیا کے لیے کسی نبی کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی لیکن جب قادیانیوں نے جعلی نبی پیش کیا تو اقبالؒ نے کھل کر مخالفت کی اور فرمایا:

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے اس بیان سے بعض حلقوں میں غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں اور یہ تاثر لیا گیا ہے کہ میں نے حکومت کو یہ لطیف مشورہ دیا ہے کہ وہ قادیانی تحریک کا بزور انسداد کرے۔ میرا یہ مدعا ہرگز نہیں تھا۔ میں نے اس امر کی وضاحت کر دی تھی کہ مذہب میں عدم مداخلت کی پالیسی ہی ایک ایسا طریقہ ہے جسے ہندوستان کے موجودہ حکمران اختیار کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی پالیسی ممکن ہی نہیں۔ البتہ مجھے اعتراف ہے کہ میرے نزدیک یہ پالیسی مذہبی جماعتوں کے مفادات کے منافی ہے لیکن اس سے بچنے کی اور کوئی راہ نہیں...... میرے نزدیک حکومت کے لیے بہترین راستہ یہی ہے کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت قرار دے دے اور یہ ان کی اپنی پالیسی کے بھی عین مطابق ہوگا۔"[6]

اگرچہ اقبال کو موجودہ زمانہ "روحانیت" سے بالکل تہی دست نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ کسی نئے مسیحا یا نبی کی آمد کے خواہش مند نظر نہیں آتے بلکہ بڑی سختی سے ان لوگوں کا محاسبہ کرتے ہیں جو نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد کسی نئے نبی کی آمد کی توقع کرتے ہیں، وہ برملا کہتے ہیں کہ:

"میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راستے ہیں یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں یا پھر ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصل کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ قبول کر لیں۔ ان کی عیارانہ تاویلیں محض اس لیے ہیں کہ وہ اپنے واضح سیاسی فوائد کے لیے اسلام کے حلقہ میں رہنا چاہتے ہیں۔"[7]

اقبال مزید کہتے ہیں کہ ہمیں قادیانیوں کی حکمت عملی اور عالم اسلام کے بارے میں ان کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بانی تحریک احمدیہ نے ملت اسلامیہ کو "سڑے ہوئے دودھ" اور اپنے مقلدین کو "تازہ دودھ" سے تشبیہ دی ہے اور اپنے مقلدین کو مسلمانوں سے میل جول رکھنے سے

اجتناب کا حکم دیا ہے۔ مزید برآں ان کا بنیادی اصولوں سے انکار مثلاً اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی) مسلمانوں کا بائیکاٹ، مسلمانوں کی نماز جنازہ نہ پڑھنا وغیرہ اور سب سے بڑھ کر ان کا یہ اعلان کہ دنیائے اسلام کافر ہے، تو یہ تمام امور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام سے وہ ان سے کہیں زیادہ دور ہیں جتنے سکھ ہندوؤں سے۔ سکھ ہندوؤں میں شادیاں کرتے ہیں لیکن ہندوؤں کے مندروں میں پوجا کے لیے نہیں جاتے۔

اس امر کو سمجھنے کے لیے کسی خاص غور وفکر یا ذہانت کی ضرورت نہیں کہ قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی پر کاربند رہنے کے باوجود سیاسی طور پر مسلمانوں میں رہنے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟ علاوہ سرکاری ملازمتوں کے فوائد کے جو انھیں حلقہ اسلام میں رہنے سے حاصل ہیں، یہ بات واضح ہے کہ ان کی موجودہ آبادی جو حالیہ مردم شماری کے مطابق صرف 56 ہزار ہے، اس کے مطابق انھیں کسی اسمبلی میں ایک نشست بھی نہیں مل سکتی اور اس لیے وہ سیاسی اقلیت بھی قرار نہیں دیے جا سکتے، یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ قادیانیوں نے اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت کا مطالبہ نہیں کیا تو وہ جانتے ہیں کہ اس طرح انھیں مجالسِ قانون ساز میں کوئی نمائندگی نہیں مل سکتی۔ نئے آئین میں ایسی اقلیتوں کے تحفظ کی خاطر علیحدہ شقیں رکھی گئی ہیں۔ میرے خیال میں قادیانی حکومت سے علیحدگی کا مطالبہ کرنے میں کبھی پہل نہیں کریں گے لیکن ملت اسلامیہ اس مطالبہ میں قطعاً حق بجانب ہے کہ ان سے قادیانیوں کو الگ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے اس مطالبہ کو تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ وہ اس نئے مذہب کی حفاظت کر رہی ہے اور ان کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے۔ اس لیے کہ ان کی موجودہ قلیل تعداد، صوبے میں چوتھی جماعت کے طور پر ابھی مقننہ میں پنجابی مسلمانوں کی برائے نام اکثریت کو نقصان نہیں پہنچا سکتی ہے۔ جب حکومت نے 1919ء میں سکھوں کی طرف سے علیحدگی کے رسمی مطالبہ کا انتظار نہیں کیا تھا تو پھر قادیانیوں کی طرف سے ایسے مطالبہ کا کیوں انتظار کر رہی ہے۔''

ایک قادیانی ہفت روزہ ''سن رائیز (Sunrise)'' نے علامہ اقبال پر تناقض کا الزام لگایا تو علامہ نے فرمایا:

> ''میں ذاتی طور پر اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا جب ایک نئی نبوت ــ متعلق، بانی اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ اس کے بعد میرے شکوک وشبہات ''بے زاری سے بغاوت'' کی حد تک پہنچ گئے، جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔'' درخت جڑ

سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔" اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ سوچنے والے انسان ہی کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے کو بدل سکے۔ بقول ایمرسن:

"صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔"[8]

اقبال نے اپنے مشہور خطبات میں بڑے فلسفیانہ انداز میں "ختم نبوت" کا اثبات کیا ہے۔ اقبال کے خیال میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قدیم وجدید دنیا کے درمیان رابطہ قائم کرنے والے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وحی کا سرچشمہ قدیم ہے اور وحی کی روح کے لحاظ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دورِ جدید سے متعلق ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی میں حیات نے اپنے دھارے کے مطابق علم کے مزید سرچشمے دریافت کر کے نبوت کی ایسی تکمیل کر دی ہے کہ اب اس کے ختم کر دینے کی ضرورت کا تعین ہو گیا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ:

> "ختم نبوت کے عقیدہ کا یہ مدعا نہیں کہ زندگی کی انتہا بس یہ ہو کہ عقل جذبات کی قائم مقام ہو جائے۔ یہ چیز نہ تو ممکن ہے اور نہ مستحسن۔ اس نظریہ کی دانشورانہ اہمیت بس اتنی ہے کہ اس سے باطنی ارادت کے بارے میں آزاد تنقیدی رویہ اختیار کرنے کا موقع ملتا ہے، کیونکہ اس یقین سے یہ لازم آتا ہے کہ تاریخ انسانی میں فوق الفطرت سرچشمہ کا منصب ختم ہو چکا ہے۔ یہ یقین ایک نفسیاتی قوت ہے جو ایسے منصب کی پیدائش کو روکتا ہے۔ اس خیال سے انسان کے داخلی تجربات میں علم کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ کلمۂ اسلام کا پہلا نصف "لا الٰہ" انسان کے بیرونی تجربات میں تنقیدی مشاہدہ کی روح پیدا کرتا ہے اور فطرت کی تمام قوتوں سے الوہیت کے وہ لباس اتارتا ہے جو قدیم تمدنوں نے انھیں پہنا رکھے ہیں۔ باطنی واردات یا صوفیانہ تجربہ خواہ وہ کتنا ہی غیر فطری اور غیر معمولی ہو مسلمانوں کے لیے قطعاً ایک فطری تجربہ ہے جو دوسرے انسانی تجربوں کی طرح تنقید کی زد میں آتا ہے۔"[9]

اقبال کا عقیدہ ہے کہ صوفیاء یا ان جیسی صفات کے لوگ ظاہر ہوتے رہیں گے لیکن امتِ مسلمہ پر ان کی تقلید فرض نہیں ہو گی۔ مرزا غلام احمد قادیانی اس زمرہ میں شامل ہیں یا نہیں؟ یہ الگ سوال ہے۔ جب تک عالم انسانیت کی روحانی صلاحیتیں متحمل ہوتی رہیں گی، ایسے لوگ انسانی زندگی کے اعلیٰ نصب العین اور بہتر اقدار کی طرف رہنمائی کے لیے تمام قوموں اور ملکوں میں پیدا ہوتے رہیں

گے۔اس کے خلاف قیاس کرنا انسانی تجربہ کو جھٹلانا ہوگا۔فرق صرف یہ ہے کہ جدید انسان ہر باطنی واردات پر تنقیدی نظر ڈالنے کا مجاز ہے۔دوسری باتوں کے علاوہ ''ختم نبوت'' کا مطلب یہ ہے کہ روحانی زندگی میں جس کے انکار کی سزا جہنم ہے، ذاتی سند پر ختم ہو چکی ہے۔''10

مرزا غلام احمد اور ان کی پیروی کرنے والوں کا عقیدہ ہے کہ پورے عالم اسلام میں سے جس نے بھی مرزا غلام احمد کو نبی نہیں مانا وہ کافر ہے۔اس حوالے سے اقبال لکھتے ہیں کہ:

''قادیانی تحریک پوری دنیائے اسلام کے کافر ہونے کا اعلان کر چکی ہے اور مسلمانوں سے مجلسی مقاطعہ کرتی ہے۔''11

جو شخص بھی مسلمان ہے، ہرگز یہ کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نیا نبی آئے گا۔اس لیے کہ اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ برکاتِ نبوت کبھی کمال کو نہ پہنچتے اور نوعِ انسانی اس کے اعلیٰ مدارج طے نہ کر سکتی،اس لیے اقبال نے فرمایا کہ:

''اسلام میں ختم نبوت کا مفہوم بالکل سادہ ہے یعنی کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کہ جنھوں نے اپنے پیروؤں کو ایک قابلِ عمل قانون دے کر آزاد کر دیا جو انسانی ضمیر کی گہرائیوں سے ظہور پذیر ہو رہا ہے۔اس کا تقاضہ ہے کہ کسی دوسری انسانی ہستی کے آگے روحانی اعتبار سے سرِ تسلیم خم نہ کیا جائے۔دینیات کے نقطۂ نگاہ سے اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ جس عمرانی و سیاسی نظام کو اسلام کہا جاتا ہے وہ کامل و مکمل اور ابدی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی ایسا الہام ممکن ہی نہیں، جس سے انکار مستلزم کفر ہو۔جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرے وہ اسلام سے غداری کا مرتکب ہوگا۔چونکہ قادیانیوں کا عقیدہ ہے کہ بانی احمدیت ایسے الہام کا حامل تھا،لہٰذا وہ پوری دنیائے اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔خود بانی تحریک کا استدلال (جو صرف قرونِ وسطیٰ کے کلامی کے لیے زیبا سمجھا جا سکتا ہے) یہ ہے کہ اگر اسلام کے مقدس پیغمبر کی روحانیت دوسرے نبی کی تخلیق نہ کرے تو اس روحانیت کو ناکام سمجھا جائے گا۔وہ اپنی نبوت کو اسلام کے مقدس پیغمبر کی نبوت پرور روحانی قوت کی شہادت قرار دیتا ہے لیکن اگر آپ یہ سوال کریں کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روحانیت ایک سے زیادہ پیغمبروں کی تربیت بھی فرما سکتی ہے تو اس کا جواب نفی میں دیا جاتا ہے۔اس کا مطلب صاف الفاظ میں یہ ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (معاذ اللہ) آخری نبی نہ تھے آخری نبی میں (مرزا غلام احمد) ہوں۔''12

بانیِ احمدیت نے تاریخِ انسانیت میں عموماً اور تاریخ ایشیا میں خصوصاً ختم نبوت کے اسلامی فکر کی ثقافتی و تہذیبی قدر و قیمت نہ سمجھی اور یہ تصور قائم کر لیا کہ ''ختمِ نبوت'' ان معنی میں کہ.....رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی پیرو درجۂ نبوت تک نہیں پہنچ سکتا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت میں ناتمامی کا نشان ہے۔ میں اس کی نفسیات کا مطالعہ کرتا ہوں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اپنے ادعائے نبوت کی خاطر وہ اسلام کے مقدس پیغمبر کی اس خصوصیت سے فائدہ اٹھاتا ہے' جسے وہ تخلیقی روحانیت قرار دیتا ہے' لیکن ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ''خاتمیت'' سے انکار کر دیتا ہے کیونکہ اس روحانیت کی تخلیقی صلاحیت صرف ایک نبی یعنی بانی تحریکِ احمدیت تک محدود رکھتا ہے۔ اس طرح یہ نیا نبی چپ چاپ اس بزرگ ہستی کی خاتمیت پر متصرف ہو جاتا ہے جسے وہ اپنا روحانی مورث قرار دیتا ہے۔

مرزا غلام احمد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کبھی آخری نبی مانتے ہیں اور کبھی ان کی خاتمیت سے انکار کر کے اپنی نبوت کا اعلان کر دیتے ہیں۔ یہ انداز محض عامۃ المسلمین کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسانے کے لیے' دیدہ و دانستہ اختیار کیا گیا ہے تاکہ علمائے اسلام کی گرفت سے بچا جا سکے اور کم تعلیم یافتہ مسلمانوں کو احمدیت کی طرف مائل کیا جا سکے۔

اقبال نے واضح طور پر لکھا ہے کہ میرے عقیدہ کی رُو سے بعدِ وحی محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الہام کا سلسلہ جاری ہے' لیکن اس کی حیثیت ایک پرائیوٹ **Fact** سے زیادہ نہیں۔ اقبالؒ انتہائی واضح الفاظ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام' اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزائے نبوت موجود ہیں یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص ''کاذب'' ہے اور واجب القتل ہے۔ مسیلمہ کذاب کو اسی بناء پر قتل کیا گیا۔'' (باقیاتِ انوار اقبال' ص 45)

اقبال کے یہ اشعار ان کے ایمان و عقیدہ کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں:

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد   بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را   او رسل را ختم و ما اقوام را

(رموزِ بے خودی)

اور یہ کہ:

لا نبی بعدی ز احسانِ خدا است   پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰ است

(رموزِ بے خودی)

اقبال یہ بھی کہتے ہیں:

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی　　جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے
(ضربِ کلیم)

اور یہ بھی کہا ہے کہ:

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے　　غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز
وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش　　جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام
(ضربِ کلیم)

ختم نبوت اور وحدتِ امت مسلمہ

بعثتِ محمدی کا تصور

عقیدۂ ختم نبوت دین اسلام کی اساس ہے۔ یہ ایک ایسا عقیدہ ہے' جو پوری امت مسلمہ کے اتحاد' یک جہتی' وحدت' استحکام اور سالمیت کا آئینہ دار ہے۔ تمام دنیا کے اہل ادیان' جن میں عیسائی' یہودی اور مسلمان سبھی شامل ہیں' ان کا عقیدہ اور عمل یہی ہے کہ کسی بھی شخص کو کسی خاص امت میں شامل قرار دیے جانے یا اس سے خارج کیے جانے کی بنیاد عقیدۂ نبوت ہے۔ ایک شخص اگر حضرت موسیٰ کو اللہ کا نبی تسلیم کرتا ہے اور عیسیٰ علیہ السلام کو تسلیم نہیں کرتا' وہ یہودی کہلائے گا۔ دنیا کا کوئی مذہب اور ملک اس کو عیسائی نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص موسیٰ علیہ السلام کی بجائے عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو تسلیم کرتا ہے تو وہ عیسائی کہلائے گا' یہودی نہیں۔ ابتدائے آفرینش سے دنیا کا نظام مذہب و سیاست اسی کے مطابق چل رہا ہے۔ اسی کے مطابق ملتِ اسلامیہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ''خاتم النبیین'' اور سلسلۂ نبوت کی آخری کڑی تسلیم کرتی ہے۔ اسی لیے ہر مدعی نبوت کو (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے بعد) مسلمانوں نے ''امت محمدیہ'' سے خارج کر دیا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں تو بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تحفظ کی خاطر 1988ء میں ''تعزیراتِ پاکستان'' میں C-295 کا اضافہ کر دیا گیا ہے' جس کی رُو سے توہینِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرتکب کی سزا ''سزائے موت'' ہے۔

کائنات میں کسی نبی برحق کی آمد کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ نبی کا مقام سیاسی قائد' قومی رہنما' مصلح اور ریفارمر سے یکسر مختلف ہے۔ خدا کا فرستادہ رسول اور خدائی احکامات' کسی کی پسند و ناپسند سے بدلے نہیں جا سکتے۔ ہر دور میں لوگوں کی رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی و رسول مبعوث ہوتے رہے ہیں اور جو اپنے فرائضِ دینی کی تکمیل کرتے رہے ہیں۔ پھر جب انسانیت سن بلوغ کو پہنچ

گئی تو حکمت الٰہی نے ''ختم نبوت'' کا اشارہ دے دیا۔ اس طرح انسانیت اس تنگ دائرے سے نکل آئی جس میں وہ متعدد تاریخی اسباب کی بناء پر صدیوں سے رہ رہی تھی۔ اب وہ علم وتمدن' باہمی تعارف' عالمی وحدت اور تسخیر کائنات کے مرحلہ میں داخل ہو رہی تھی۔ اس طرح وہ امید پیدا ہوگئی جس سے جغرافیائی تقسیم اور سیاسی اختلافات ختم کر کے ''ملتِ واحدہ'' قائم کی جا سکے اور قوم و وطن کی بجائے لوگ انسانیت، عالم گیر ہدایت اور مشترک علم وفن کے مفہوم سے آشنا ہوئے کیونکہ ان کی زندگی کی بنیاد اس وحی پر رکھی گئی تھی جو خدا کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔

قبل ازیں' بنی نوع انسان کو مذہبی دعویداروں کے ہاتھوں (جو الہامات اور کشف وکرامات کے نام سے خدا کا فرستادہ ہونے کا دعویٰ کرتے تھے) بڑے انتشار اور اذیت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ایسے میں کسی نبی برحق کی آمد دنیا کا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں لکھا ہے کہ ''اسلام کا ظہور استقرائی فکر (Inductive Intellect) کا ظہور ہے۔ اس میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور اس تکمیل سے اس نے خود اپنی ''خاتمیت'' کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ کے لیے عہدِ طفولیت کی حالت میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اسلام نے مذہبی پیشوائیت اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ قرآن مجید غور وفکر اور تجربات ومشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے اور یہ تاریخ اور فطرت' دونوں کو علم انسانی کے ذرائع ٹھہراتا ہے۔ یہ سب اسی مقصد کے مختلف گوشے ہیں جو ختم نبوت کی تہہ میں پوشیدہ ہیں۔ پھر عقیدۂ ختم نبوت کی ایک بڑی اہمیت یہ بھی ہے کہ...... اب نوع انسانی کی تاریخ میں کوئی شخص اس امر کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی مافوق الفطرت اختیار (Supernatural Authority) کی بناء پر دوسروں کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتا ہے۔ ختمِ نبوت کا عقیدہ ایک ایسی نفسیاتی قوت ہے جو اس قسم کے دعوائے اقتدار کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ...... ''اس عقیدہ کی حامل قوم کو دنیا میں سب سے زیادہ ''آزاد قوم'' ہونا چاہیے۔ ختمِ نبوت سے انکار کا اصل سبب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر بے اعتمادی اور ایمان بالرسالت کی کمزوری ہے۔ مقام نبوت سے بے خبری' دین میں فلسفیانہ طرز فکر' یہود کی وسوسہ اندازی' ہندوستانی ماحول اور ان کے پراپیگنڈے سے متاثر دین سے ناواقفیت...... یہ وہ اسباب ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے دلوں میں اس عقیدے کے بارے میں شک وشبہ پیدا کر دیا تھا: حالانکہ کتاب وسنت کے کلی طور پر محفوظ اور موجود ہونے کی صورت میں کسی نئے نبی کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ قرآن کریم سینوں اور سفینوں میں اس طرح محفوظ چلا آتا ہے کہ اسے دیکھ کر ہر شخص بلا تامل یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اللہ کا یہ کلام تا قیامت محفوظ اور ہر قسم کی تحریف سے پاک رہے گا۔ رشد وہدایت کے یہ دو سرچشمے

گئی تو حکمت الٰہی نے ''ختم نبوت'' کا اشارہ دے دیا۔ اس طرح انسانیت اس تنگ دائرے سے نکل آئی جس میں وہ متعدد تاریخی اسباب کی بناء پر صدیوں سے رہ رہی تھی۔ اب وہ علم وتمدن' باہمی تعارف' عالمی وحدت اور تسخیر کائنات کے مرحلہ میں داخل ہو رہی تھی۔ اس طرح وہ امید پیدا ہوگئی جس سے جغرافیائی تقسیم اور سیاسی اختلافات ختم کر کے ''ملتِ واحدہ'' قائم کی جا سکے اور قوم و وطن کی بجائے لوگ انسانیت، عالم گیر ہدایت اور مشترک علم وفن کے مفہوم سے آشنا ہوئے کیونکہ ان کی زندگی کی بنیاد اس وحی پر رکھی گئی تھی جو خدا کے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی تھی۔

قبل ازیں' بنی نوع انسان کو مذہبی دعویداروں کے ہاتھوں (جو الہامات اور کشف وکرامات کے نام سے خدا کا فرستادہ ہونے کا دعویٰ کرتے تھے) بڑے انتشار اور اذیت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ایسے میں کسی نبی برحق کی آمد دنیا کا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں لکھا ہے کہ ''اسلام کا ظہور استقرائی فکر (Inductive Intellect) کا ظہور ہے۔ اس میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور اس تکمیل سے اس نے خود اپنی ''خاتمیت'' کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ کے لیے عہدِ طفولیت کی حالت میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اسلام نے مذہبی پیشوائیت اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ قرآن مجید غور وفکر اور تجربات ومشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے اور یہ تاریخ اور فطرت' دونوں کو علم انسانی کے ذرائع ٹھہراتا ہے۔ یہ سب اسی مقصد کے مختلف گوشے ہیں جو ختم نبوت کی تہہ میں پوشیدہ ہیں۔ پھر عقیدۂ ختم نبوت کی ایک بڑی اہمیت یہ بھی ہے کہ...... اب نوع انسانی کی تاریخ میں کوئی شخص اس امر کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی مافوق الفطرت اختیار (Supernatural Authority) کی بناء پر دوسروں کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتا ہے۔ ختمِ نبوت کا عقیدہ ایک ایسی نفسیاتی قوت ہے جو اس قسم کے دعوائے اقتدار کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ...... ''اس عقیدہ کی حامل قوم کو دنیا میں سب سے زیادہ ''آزاد قوم'' ہونا چاہیے۔ ختمِ نبوت سے انکار کا اصل سبب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر بے اعتمادی اور ایمان بالرسالت کی کمزوری ہے۔ مقامِ نبوت سے بے خبری' دین میں فلسفیانہ طرز فکر' یہود کی وسوسہ اندازی' ہندوستانی ماحول اور ان کے پراپیگنڈے سے متاثر دین سے ناواقفیت ...... یہ وہ اسباب ہیں جنھوں نے مسلمانوں کے دلوں میں اس عقیدے کے بارے میں شک وشبہ پیدا کر دیا تھا حالانکہ کتاب وسنت کے کلی طور پر محفوظ اور موجود ہونے کی صورت میں کسی نئے نبی کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ قرآن کریم سینوں اور سفینوں میں اس طرح محفوظ چلا آتا ہے کہ اسے دیکھ کر ہر شخص بلا تامل یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اللہ کا یہ کلام تاقیامت محفوظ اور ہر قسم کی تحریف سے پاک رہے گا۔ رشد وہدایت کے یہ دو سرچشمے

(کتاب وسنت) سارے عالم کو سیراب کرنے کے لیے موجود ہیں تو پھر کسی نئے نبی کی بعثت کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔" 13

انسان مدنی الطبع ہے۔ کوئی قوم کسی دوسری قوم سے علیحدگی کا تصور نہیں کر سکتی۔ تمدن کی ترقی نے اس رفتار کو اور بھی تیز کر دیا ہے۔ رسل ورسائل اور نقل وحمل کی ترقی سے کرۂ ارض سمٹ کر رہ گیا ہے۔ نوع انسانی کا طبعی رجحان بھی ختم نبوت سے خاص مناسبت رکھتا ہے۔ یہی حکمت ربی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ایسے وقت میں ہوئی جب یہ رجحان قوی سے قوی تر ہو چکا تھا اور روز افزوں ترقی کر رہا تھا۔ اس طرح دنیا کے مختلف علاقوں کی ثقافت نے باہم ایک دوسرے کو متاثر کیا۔ ان حالات میں "خاتم النبیین" بین الاقوامی مزاج کی حامل شخصیت سب اقوام کو ایک مرکز پر مجتمع کر سکتی تھی۔ اگر سلسلۂ نبوت جاری رہتا تو ہر نبی اس کی جامعیت پر اثر انداز ہوتا اور اجتماعیت پارہ پارہ ہو جاتی۔

ہر نبی نے اپنے بعد میں آنے والے نبی کے بارے میں پیشین گوئی کی ہے۔ اس معاملہ میں قرآن کا سکوت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اب باب نبوت بند ہو گیا ہے اور قیامت تک کوئی نیا نبی نہیں آئے گا۔ مزید یہ کہ قرآن نے اس سلسلہ میں سکوت ہی اختیار نہیں کیا بلکہ قرآن وحدیث نے واضح الفاظ میں اس معاملہ کی تصریح بھی کر دی ہے کہ صرف نبوت ہی ختم نہیں ہو گئی بلکہ دین بھی مکمل ہو گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: **الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتیo (المائدہ:3)**

حاصلِ تحقیق

مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے حالاتِ زندگی میں خود لکھا ہے کہ "میری پیدائش سے پہلے میرے والد صاحب نے بڑے بڑے مصائب دیکھے تھے...... لیکن میری پیدائش کے دنوں میں ان کی تنگی کا زمانہ فراخی کی طرف بدل گیا تھا۔" **(14)**

"تنگی کا زمانہ فراخی میں کیسے بدل گیا تھا؟" حالات گواہ ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے والد انگریز حکمرانوں کے مقربِ خاص تھے اور وہ انگریزوں کے وفادار ہونے پر فخر کرتے تھے۔ اسی پس منظر کی بناء پر مرزا قادیانی نے بھی سوچی سمجھی سکیم کے تحت سیالکوٹ کی ملازمت کو خیرباد کہہ کر آبائی گاؤں "قادیان" کا رُخ کیا۔ کچھ عرصہ کھیتی باڑی کی، طب وحکمت کا شغل بھی اختیار کیا لیکن بے قراری بڑھتی گئی۔ بالآخر گوہرِ مقصود کی تلاش میں لاہور کا رُخ کیا۔

قیام لاہور کے دوران مرزا قادیانی کی شخصیت کے وہ جوہر کھل کر سامنے آئے جنھوں نے مرزا صاحب کو گوشہ گم نامی سے نکال کر عزت وشہرت کے تخت پر لا بٹھایا۔ انھوں نے "مبلغ اسلام" کا

روپ دھار کر دوسرے مذاہب بالخصوص مسیحیت' ہندومت اور بدھ مت کا پرچار کرنے والوں کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی اور بہ بانگ دہل للکارنے لگے۔

مقصد کیا تھا؟ صاف ظاہر ہے، اسلام کی آڑ لے کر مستقبل میں شہرت حاصل کرنا اور روپیہ بٹورنا۔ چنانچہ قیام لاہور کے دوران ایک طرف تو وہ آریہ سماج اور بدھ مت کے پیروکاروں کو مناظروں کے لیے للکارتے لیکن ماسوا ایک دو موقع کے' ان مناظروں سے پہلو تہی کر جاتے۔ حصولِ شہرت کے بعد مخلص دوستوں کے مشورے پر تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہو گئے۔ نتیجتاً براہینِ احمدیہ کی چار جلدیں 1884ء میں چھپ کر منظر عام پر آ گئیں۔ ''براہینِ احمدیہ'' کی اشاعت سے قبل ہی سوچی سمجھی سکیم کے تحت مرزا غلام احمد نے بذریعہ ''اشتہار'' پورے ہندوستان میں اپنے آپ کو متعارف کروا دیا تھا۔ ساتھ ساتھ اس اشتہار بازی کو دولت کے حصول کا ذریعہ بھی بنا لیا تھا۔ اس طرح نام بھی کمایا اور دام بھی......

مرزا غلام احمد نے یہیں پر بس نہ کیا بلکہ ''ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں'' کے مصداق وہ خوب تر کی جستجو میں ایک قدم اور آگے بڑھ گئے۔ ''براہین احمدیہ'' کی تصنیف نے انھیں ایک ''مصنف'' کی حیثیت سے متعارف کروایا تھا لیکن مرزا صاحب نے مصنف سے آگے بڑھ کر ملہم' محدث اور مجدد ہونے کے دعوے کر دیے۔ اس حد تک تو نیم تعلیم یافتہ' سادہ لوح مسلمان اور عامۃ الناس نے انھیں قبول کر لیا۔ چونکہ لوگوں کے سامنے حضرت مجدد الف ثانی کی مثال تھی، اس لیے اس مذہبی پس ماندگی کے دور میں ''ڈوبتے کو تنکے کا سہارا'' کے مترادف عامۃ المسلمین' مرزا صاحب سے متاثر ہونے لگے۔ سیاسی زبوں حالی کے اس دور میں لوگ روحانیت کی آغوش میں پناہ لینے کے لیے مرزا غلام احمد کی ذات کو غنیمت سمجھنے لگے۔ مرزا غلام احمد نے ان حالات سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور مزید آگے بڑھتے ہوئے ''مثیلِ مسیح'' یا ''مسیحِ موعود'' ہونے کا دعویٰ کر بیٹھے۔

مرزا قادیانی کی اس ''جرأتِ رندانہ'' نے لوگوں کو چونکا دیا۔ خود ان کی محفل میں سرگوشیاں اور چہ می گوئیاں شروع ہوئیں تو مرزا صاحب ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے محض ''مامور من اللہ'' اور ''محدث اللہ'' پر قانع ہو گئے لیکن یہ دو آتشہ جس کا نشہ مرزا قادیانی کو چڑھ چکا تھا' اترنے والا نہ تھا۔ جلد ہی بالآخر اپنے حتمی اور قطعی فیصلہ پر عمل کرتے ہوئے مرزا قادیانی نے ظلی و بروزی نبی اور امتی نبی کی راہ سے گزرتے ہوئے ''تشریعی نبی'' ہونے کا دعویٰ کر دیا۔

یہ زمانہ برصغیر پاک و ہند کے باشندوں کے لیے نہایت اذیت کا زمانہ تھا۔ سیاسی' سماجی' معاشی اور ذہنی پس ماندگی نے لوگوں کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے عاری کر دیا تھا۔ ان حالات میں مرزا غلام احمد کی ذات میں انھیں وہ ''نجات دہندہ'' نظر آیا جو اُن کے دکھ کا مداوا کر سکے۔ ان کے مسائل

کو حل کر کے ان کی بہتری کا راستہ ڈھونڈ نکالے۔ مرزا قادیانی نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ''روحانیت'' کا مجرب نسخہ ہی ان کم پڑھے لکھے ذہنوں کے لیے کارگر ہو سکتا ہے۔ ابتداء میں برصغیر کے پڑھے لکھے اور مذہبی حلقوں میں مرزا قادیانی کو خاصی پذیرائی ملتی رہی لیکن جلد ہی اقبال جیسے مردم شناس اور چند مذہبی برگزیدہ ہستیوں نے اس ''بہروپیے'' کا اصل روپ پہچان لیا اور کھل کر مخالفت شروع کر دی۔ اقبال نے **1935**ء میں کھل کر اس تحریک کے خلاف بیان دیے اور کھلم کھلا کہا کہ:

''اے کہ بعد از تو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک''

اقبال کی اس سلسلے میں پنڈت نہرو کے ساتھ بھی خط و کتابت رہی۔ اقبالؒ نے مختلف موقعوں پر اپنی تقاریر میں بھی ختم نبوت کی اہمیت کو اُجاگر کیا اور اپنے اہم اور طویل خطبات میں بھی کھل کر اس موضوع پر بحث کی۔ اقبالؒ اعتراف کرتے ہیں کہ...... ''بانی تحریک (احمدیت) کا ولولہ اور جذبہ دیکھ کر میں بھی انھیں ابتداء میں دین اسلام کا شیدائی سمجھتا رہا ہوں لیکن جلد ہی یہ تحریک کھل کر سامنے آ گئی۔ جب یہ تحریک کھل کر سامنے آئی تو پتا چلا کہ یہ تو وہ منافق ہے جو کافر سے زیادہ خطرناک ہے۔ اسی وجہ سے میں اس تحریک سے بے زار ہو گیا۔ ایک انسان ہونے کے ناطے خیالات میں تبدیلی آتی ہی رہتی ہے۔ ''صرف پتھر ہی اپنے آپ کو نہیں بدلا کرتے۔''

اس تبدیلی کی بنیادی وجہ اقبال کا عشق رسول ہے۔ وہ قرآن اور حدیث کے بیان کے عین مطابق محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی آخر الزمان مانتے ہیں۔ اقبالؒ کا عشق رسول تو اتنا شدید اور زور آور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجودِ مبارکہ کے سامنے انھیں کائنات کی ہر چیز ہیچ نظر آتی ہے بلکہ بسا اوقات عشقِ رسولؐ عشقِ خدا پر بھی حاوی نظر آتا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ اقبال کا دل بنی نوع انسان کی محبت سے لبریز ہے۔ وہ انسانیت کو شرفِ انسانیت کی معراج پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے انھیں بالعموم عالم انسان اور بالخصوص عالم اسلام کا شاعر کہا جاتا ہے۔ اقبال کی اسلام سے گہری محبت و انسیت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسلام بنی نوع انسان کی بھلائی چاہتا ہے۔ نبوت اور پھر ختم نبوت کے دور رس نتائج کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ عقیدۂ ختم نبوت ہی میں امت کی وحدت اور یک جہتی پنہاں ہے۔ مسلمان خواہ دنیا کے کسی گوشے میں آباد ہوں ان کے دل ایک روحانی تعلق کی بناء پر ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں کیونکہ ان کا خدا ان کا رسول ان کا قرآن ان کا قبلہ ایک ہے۔ تاریخ انسانی گواہ ہے کہ وہ جب تک وحدت کی اس لڑی میں پروئے رہے اور احکام خداوندی ''واعتصموا بحبل اللہ جمعیاً ولا تفرقوا'' پر عمل کرتے رہے۔ دنیا کے لیے یہ قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنی رہی ہے۔ انھی مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف

مدعی نبوت پیدا ہوتے رہے لیکن ان کی نبوت چندروزہ ثابت ہوئی اور انھوں نے اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کھائی۔

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کو سیاسی و مذہبی کشمکش میں مبتلا دیکھ کر انگریزوں کی مدد سے مرزا قادیانی نے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا لیکن انگریزوں کا یہ ''خود کاشتہ پودا'' وہ تناور درخت نہ بن سکا جس کا سایہ آنے والی نسلوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتا۔ مرزا قادیانی نے اپنے دور میں سستی شہرت بھی حاصل کرلی اور خوب مالی منفعت بھی حاصل کی لیکن انگریز سے وفاداری' اسرائیل کی نمائندگی اور اسلام سے منافقت نے مرزا قادیانی کو وقتِ مرگ ہی ذلت آمیز انجام سے دوچار کر دیا جس سے یہ پول کھل گیا کہ مرزا قادیانی سچ مچ کے نبی نہ تھے۔ نہ تو وہ مبلغِ اسلام تھے نہ ہی مناظر' نہ مجدد' نہ محدث اور نہ ہی مہدی و عیسیٰ تھے۔ انھوں نے جو کچھ بھی کیا محض اس لیے کیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ مالی منفعت حاصل کی جائے تاکہ عیش و عشرت کی زندگی گزاری جا سکے۔ اس مقصد کے لیے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انھوں نے مختلف دعوے کیے اور عامۃ المسلمین کی ایک بڑی تعداد کو اپنے دامِ تزویر میں پھنسالیا۔ جو شخص یہ لکھتا ہے کہ:

> ''تمام نبیوں کے نام میری طرف منسوب کیے ہیں۔ میں آدم ہوں' میں شیث ہوں' میں نوح ہوں' میں ابراہیم ہوں' میں اسحاق ہوں' میں اسماعیل ہوں' میں یعقوب ہوں' میں یوسف ہوں' میں موسیٰ ہوں' میں داؤد ہوں' میں عیسیٰ ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام کا مظہر اتم ہوں۔ یعنی ظلی طور پر محمد اور احمد ہوں۔''15

ایسا شخص فاتر العقل مراقی تو ہوسکتا ہے لیکن کسی صورت میں بھی نبی' مجدد' محدث اور مبلغ اسلام نہیں ہوسکتا۔
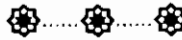
حواشی

1. مسندِ احمد، جلد دوم، ص 391۔
2. رواۃ البخاری، ص 399۔
3. اقبال۔ قادیانی اور جمہور مسلمان، بحوالہ اقبال اور قادیانیت، ص 9، لاہور: چٹان پرنٹنگ پریس، اپریل 1974ء۔
4. اقبال۔ قادیانی اور جمہور مسلمان، بحوالہ اقبال اور قادیانیت، ص 10۔
5. اقبال۔ قادیانی اور جمہور مسلمان، بحوالہ اقبال اور قادیانیت، ص 12۔
6. اقبال۔ قادیانی اور جمہور مسلمان، بحوالہ اقبال اور قادیانیت، ص 14-15۔
7. مکتوب اقبال، روزنامہ سٹیٹس مین، دہلی، بحوالہ اقبال اور قادیانیت، ص 16۔
8. شورش کاشمیری، آغا۔ اقبال اور قادیانیت، ص 19-20۔
9. اقبال۔ تشکیل نو، ص 120-121، بحوالہ اقبال اور قادیانیت، ص 20۔
10. اقبال۔ تشکیل نو، ص 21، بحوالہ اقبال اور قادیانیت، ص 21۔
11. اقبال۔ اسلام اور احمدیت، بحوالہ اقبال اور قادیانیت، ص 29۔
12. اقبال۔ اسلام اور احمدیت، بحوالہ اقبال اور قادیانیت، ص 35-36۔
13. ڈار، بشیر احمد۔ باقیاتِ انوارِ اقبال، ص 45، بحوالہ اقبال اور قادیانیت، ص 78۔
14. غلام احمد مرزا۔ کتاب البریہ، خلاصہ حاشیہ، ص 146، قادیان: ضلع گرداسپور، دسمبر 1932ء۔
15. غلام احمد مرزا۔ حقیقت الوحی، حاشیہ، ص 72، قادیان: دفتر بک ڈپو تالیف واشاعت، ستمبر 1922ء۔

❀……❀……❀

علامہ محمد اقبالؒ

اسلام اور احمدیت°

''ماڈرن ریویو کلکتہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کے تین مضامین شائع ہونے کے بعد مجھے اکثر مسلمانوں نے' جو مختلف مذہبی و سیاسی مسلک رکھتے ہیں' متعدد خطوط لکھے ہیں۔ ان میں سے بعض کی خواہش ہے کہ میں احمدیوں کے بارے میں مسلمانانِ ہند کے طرزِ عمل کی مزید توضیح کروں اور اس طرزِ عمل کو حق بجانب ثابت کروں۔ بعض یہ دریافت کرتے ہیں کہ میں احمدیت میں کس مسئلہ کو تنقیح طلب سمجھتا ہوں۔ اس بیان میں مَیں ان مطالبات کو پورا کرنا چاہتا ہوں' جن کو میں بالکل جائز تصور کرتا ہوں اور اس کے بعد ان سوالات کا جواب دینا چاہتا ہوں جو پنڈت جواہر لال نہرو نے اٹھائے ہیں۔ بہر حال مجھے اندیشہ ہے کہ اس بیان کا ایک حصہ پنڈت جی کے لیے دلچسپ نہ ہوگا۔ لہٰذا ان کا وقت بچانے کے لیے میرا یہ مشورہ ہے کہ وہ ایسے حصوں کو نظر انداز کر دیں۔

یہ بیان کرنا میرے لیے ضروری نہیں کہ پنڈت جی کو مشرق کے' بلکہ ساری دنیا کے ایک عظیم الشان مسئلے سے جو دلچسپی ہے' میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ میری رائے میں یہ پہلے ہندوستانی قوم پرست قائد ہیں' جنھوں نے دنیائے اسلام کی موجودہ روحانی بے چینی کو سمجھنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس بے چینی کے مختلف پہلوؤں اور ممکن ردِ عمل کے مدنظر ہندوستان کے ذی فکر سیاسی قائدین کو چاہیے کہ اس وقت قلبِ اسلام میں جو چیز ہیجان پیدا کر رہی ہے' اس کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

بہر حال میں اس واقعہ کو پنڈت جی اور قارئین سے پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتا کہ پنڈت جی کے مضامین نے میرے ذہن میں احساسات کا ایک دردناک ہیجان پیدا کر دیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ پنڈت جی ایک ایسے انسان ہیں جو مختلف تہذیبوں سے وسیع ہمدردی رکھتے ہیں' میرا ذہن اس خیال کی طرف مائل ہے کہ جن سوالات کو وہ سمجھنے کی خواہش رکھتے ہیں' وہ بالکل خلوص پر مبنی ہے۔ تاہم جس طریقے سے انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ایسی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جس کو پنڈت جی سے منسوب کرنا میرے لیے دشوار ہے۔ میں اس خیال کی طرف مائل ہوں کہ میں نے قادیانیت کے متعلق

جو بیان دیا تھا (جس میں ایک مذہبی نظریہ کی محض جدید اصول کے مطابق تشریح کی گئی تھی) اس سے پنڈت جی اور قادیانی دونوں پریشان ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف وجوہ کی بناء پر دونوں اپنے دل میں مسلمانانِ ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہندوستانی قوم پرست جن کی سیاسی تصوریت نے حقائق کو کچل ڈالا ہے، اس بات کو گوارا نہیں کرتے کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں احساس خودمختاری پیدا ہو۔ میری رائے میں ان کا یہ خیال غلط ہے کہ ہندوستانی قومیت کے لیے ملک کی مختلف تہذیبوں کو مٹا دینا چاہیے حالانکہ ان تہذیبوں کے باہمی عمل واثر سے ہندوستان ایک ترقی پذیر اور پائدار تہذیب کو نمو دے سکتا ہے۔ ان طریقوں سے جو تہذیب نمو پائے گی اس کا نتیجہ بجز باہمی تشدد اور تلخی کے اور کیا ہوگا؟ یہ بات بھی بدیہی ہے کہ قادیانی بھی مسلمانانِ ہند کی سیاسی بیداری سے گھبرائے ہوئے ہیں کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کے سیاسی نفوذ کی ترقی سے ان کا یہ مقصد یقیناً فوت ہو جائے گا کہ پیغمبر عرب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت سے ہندوستانی پیغمبر کی ایک نئی امت تیار کریں۔ حیرت کی بات ہے کہ میری یہ کوشش کہ مسلمانانِ ہند کو اس امر سے متنبہ کروں کہ ہندوستان کی تاریخ میں جس دور سے وہ گزر رہے ہیں، اس میں ان کا اندرونی استحکام کس قدر ضروری ہے اور ان انتشار انگیز قوتوں سے محترز رہنا کس قدر ناگزیر ہے، جو اسلامی تحریکات کے بھیس میں پیش ہوتی ہیں، پنڈت جی کو یہ موقع دیتی ہے کہ ایسی تحریکوں سے ہمدردی کریں۔

بہرکیف میں پنڈت جی کے محرکات کی تحلیل کے ناگوار فرض کو جاری رکھنا نہیں چاہتا۔ جو لوگ قادیانیت کے متعلق عام مسلمانوں کے طرزِ عمل کی توضیح چاہتے ہیں، ان کے استفادہ کے لیے میں ڈیورنٹ [1] کی کتاب 'افسانہ فلسفہ' [2] کا اقتباس پیش کرتا ہوں، جس سے قارئین کو واضح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ قادیانیت میں امرِ تنقیح طلب کیا ہے۔ ڈیورنٹ نے فلسفی اعظم اسپائنوزا [3] کے جماعت بدر کیے جانے سے متعلق یہودی نقطہ نظر کو اختصار کے ساتھ چند جملوں میں بیان کیا ہے۔ قارئین یہ خیال نہ کریں کہ اس اقتباس کے پیش کرنے سے میرا مطلب اسپائنوزا اور بانی احمدیت میں کسی قسم کا موازنہ کرنا ہے۔ عقل وسیرت کے لحاظ سے ان دونوں کے مابین بُعدِ عظیم ہے۔ 'خدامست'' اسپائنوزا نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ کسی جدید تنظیم کا مرکز ہے اور جو یہودی اس پر ایمان نہ لائے، وہ یہودیت سے خارج ہے۔ اسپائنوزا کے جماعت بدر کیے جانے کے متعلق ڈیورنٹ کی عبارت یہودیوں کے طرزِ عمل پر اس قدر منطبق نہیں ہوتی جس قدر کہ قادیانیت کے متعلق مسلمانوں کے طرزِ عمل پر ہوتی ہے۔ یہ عبارت حسبِ ذیل ہے:

''علاوہ بریں اکابر یہود کا خیال تھا کہ امسٹرڈم [4] میں ان کی جو چھوٹی سی جماعت

تھی ان کو انتشار سے بچانے کا واحد ذریعہ مذہبی وحدت ہے اور یہودیوں کی جماعت کو جو دنیا میں بکھری ہوئی ہے' برقرار رکھنے اور ان میں اتفاق پیدا کرنے کا آخری ذریعہ بھی یہی ہے۔ اگر ان کی اپنی کوئی سلطنت' کوئی ملکی قانون اور دنیاوی قوت و طاقت کے ادارے ہوتے جن کے ذریعہ وہ اندرونی استحکام اور بیرونی استحکام حاصل کر سکتے تو وہ زیادہ روادار ہوتے۔ لیکن ان کا مذہب ان کے لیے ایمان بھی تھا اور حب الوطنی بھی۔ ان کا معبد ان کی عبادت کا اور مذہبی رسوم کے علاوہ ان کی سماجی اور سیاسی زندگی کا بھی مرکز تھا۔ ان حالات کے ماتحت انھوں نے الحاد کو غداری اور رواداری کو خودکشی تصور کیا۔"

امسٹرڈم میں یہودیوں کی حیثیت ایک اقلیت کی تھی۔ اس لحاظ سے وہ اسپائنوزا کو ایسی انتشار انگیز ہستی سمجھنے میں حق بجانب تھے جس سے ان کی جماعت بکھر جانے کا اندیشہ تھا۔ اس طرح مسلمانانِ ہند یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ تحریکِ قادیانیت جو تمام دنیائے اسلام کو کافر قرار دیتی ہے اور اس سے معاشرتی مقاطعہ کرتی ہے' مسلمانان ہند کی حیاتِ ملی کے لیے اسپائنوزا کی اس مابعدالطبیعات سے زیادہ خطرناک ہے جو یہود کی حیاتِ ملی کے لیے تھی۔ میرا خیال ہے کہ مسلمانانِ ہند ان حالات کی مخصوص نوعیت کو جبلی طور پر محسوس کرتے ہیں جن میں کہ وہ ہندوستان میں گھرے ہوئے ہیں اور دوسرے ممالک کے مقابلہ میں انتشار انگیز قوتوں کا قدرتی طور پر زیادہ احساس رکھتے ہیں۔ ایک اوسط مسلمان کا یہ جبلی ادراک میری رائے میں بالکل صحیح ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس احساس کی بنیاد مسلمانانِ ہند کے ضمیر کی گہرائیوں میں ہے۔ اس قسم کے معاملات میں جو لوگ رواداری کا نام لیتے ہیں' وہ لفظ رواداری کے استعمال میں بے حد غیر محتاط ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ اس لفظ کو بالکل نہیں سمجھتے۔ گبن[5] کہتا ہے کہ ایک رواداری فلسفی کی ہوتی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح ہیں۔ ایک رواداری مورخ کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر غلط ہیں۔ ایک رواداری مدبر کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر مفید ہیں۔ ایک رواداری ایسے شخص کی ہے جو ہر قسم کے فکر و عمل کے طریقوں کو روا رکھتا ہے' کیونکہ وہ ہر قسم کے فکر و عمل سے بے تعلق ہوتا ہے۔ ایک رواداری کمزور آدمی کی ہے جو محض کمزوری کی وجہ سے ہر قسم کی ذلت کو جو اس کی محبوب اشیاء یا اشخاص پر کی جاتی ہے' برداشت کر لیتا ہے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اس قسم کی رواداری اخلاقی قدر سے معرا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اس سے اُس شخص کے روحانی افلاس کا اظہار ہوتا ہے' جو ایسی رواداری کا مرتکب ہوتا ہے۔ حقیقی رواداری عقلی اور روحانی وسعت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ رواداری ایسے شخص کی ہوتی ہے جو روحانی حیثیت سے

قوی ہوتا ہے اور اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے' دوسرے مذاہب کو روا رکھتا ہے اور ان کی قدر کر سکتا ہے۔ ایک سچا مسلمان ہی اس قسم کی رواداری کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خود اس کا مذہب ائتلافی ہے' اس وجہ سے وہ بآسانی دوسرے مذاہب سے ہمدردی رکھ سکتا ہے اور ان کی قدر کر سکتا ہے۔ ہندوستان کے شاعر اعظم امیر خسرو نے ایک بت پرست کے قصہ میں اس قسم کی رواداری کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا۔ ہے۔ اس کی بتوں سے بے اندازہ محبت کے تذکرہ کے بعد شاعر اپنے مسلمان قارئین کو یوں مخاطب کرتا ہے۔

اے کہ زبت طعنہ بہ ہندی بری
ہم زوے آموز پرستش گری ○○

خدا کا سچا پرستار ہی عبادت و پرستش کی قدر و قیمت کو محسوس کر سکتا ہے' خواہ اس پرستش کا تعلق ایسے ارباب سے ہو جن پر وہ اعتقاد نہیں رکھتا۔ رواداری کی تلقین کرنے والے اس شخص پر عدم رواداری کا الزام لگانے میں غلطی کرتے ہیں جو اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتا ہے۔ اس طرزِ عمل کو وہ غلطی سے اخلاقی کمتری خیال کرتے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ (اس) طرزِ عمل میں حیاتیاتی قدر و قیمت مضمر ہے۔ جب کسی جماعت کے افراد جبلی طور پر یا کسی عقلی دلیل کی بناء پر یہ محسوس کرتے ہوں کہ اس جماعت کی اجتماعی زندگی خطرہ میں ہے، جس کے یہ رُکن ہیں تو ان کے مدافعانہ طرزِ عمل کو حیاتیاتی معیار پر جانچنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں ہر فکر و عمل کی تحقیق اس لحاظ سے کرنی چاہیے کہ اس میں حیات افروزی کس قدر ہے؟ یہاں سوال یہ نہیں ہے کہ ایسے شخص کے متعلق جو مُلحد قرار دیا گیا ہو' کسی فرد یا جماعت کا رویہ اخلاقاً صائب ہے یا غیر صائب؟ سوال یہ ہے کہ یہ حیات افروز ہے یا حیات کُش؟ پنڈت جواہر لال نہرو خیال کرتے ہیں کہ جو جماعت مذہبی اصولوں پر قائم ہوئی ہے وہ محکمہ احتساب[6] کے قیام کو مستلزم ہے۔ تاریخِ مسیحیت کے متعلق یہ بات صحیح ہو سکتی ہے لیکن تاریخِ اسلام پنڈت جی کی منطق کے خلاف یہ ثابت کرتی ہے کہ حیاتِ اسلامی کے گزشتہ تیرہ سو سال میں اسلامی ممالک محکمۂ احتساب سے بالکل ناآشنا رہے ہیں۔ قرآن واضح طور پر ایسے ادارے کی ممانعت کرتا ہے ''دوسروں کی کمزوریوں کی تلاش نہ کرو اور بھائیوں کی چغلی نہ کھاؤ۔''[7] پنڈت جی کو تاریخ اسلام کے مطالعہ سے معلوم ہو جائے گا کہ یہودی اور عیسائی اپنے وطن کے مذہبی تشدد سے تنگ آ کر اسلامی ممالک میں پناہ لیتے تھے۔ جن دو قضایا پر اسلام کی تعقلی عمارت قائم ہے' وہ اس قدر سادہ ہیں کہ ان میں ایسا الحاد ناممکن ہے، جس سے مُلحد دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ جب کوئی شخص ایسے مُلحدانہ نظریات کو رواج دیتا ہے جن سے نظامِ اجتماعی خطرہ میں پڑ جاتا ہو تو ایک آزادانہ اسلامی ریاست یقیناً اس کا انسداد کرے گی۔ لیکن ایسی صورت

میں ریاست کا فعل سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہوگا' نہ کہ خالص مذہبی اصولوں پر۔ میں اس بات کو اچھی طرح محسوس کرتا ہوں کہ پنڈت جی ایسا شخص' جس کی پیدائش اور تربیت ایک ایسی جماعت میں ہوئی ہو جس کی سرحدیں متعین نہیں ہیں اور جس میں اندرونی استحکام بھی مفقود ہے' اس امر کا بمشکل اندازہ کر سکتا ہے کہ ایک مذہبی جماعت ایسے محکمۂ احتساب کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے' جو حکومت کی جانب سے عوام کے عقائد کی تحقیقات کے لیے قائم کیا جاتا ہے۔ یہ بات کارڈنل نیومن[8] کی اس عبارت سے بالکل واضح ہو جاتی ہے' جو پنڈت جی پیش کر کے حیرت کرتے ہیں کہ میں کارڈنل کے اصولوں کو کس حد تک اسلام پر قابلِ اطلاق سمجھتا ہوں؟ میں ان سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلام کی اندرونی ہیئتِ ترکیبی اور کیتھولک مسیحیت میں اختلافِ عظیم ہے۔ کیتھولک مسیحیت کی پیچیدگی اس کی فوق العقلی نوعیت اور حکمی عقائد کی کثرت نے' جیسا کہ تاریخِ مسیحیت سے ظاہر ہوتا ہے' مُلحدانہ تاویلات کے لیے راستہ کھول دیا ہے۔ اسلام کا سیدھا سادھا مذہب دو قضایا پر مبنی ہے۔ خدا ایک ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سلسلۂ انبیاء کے آخری نبی ہیں جو وقتاً فوقتاً ہر ملک اور ہر زمانے میں اس غرض سے مبعوث ہوئے تھے کہ نوعِ انسان کی رہنمائی صحیح طرزِ زندگی کی طرف کریں۔ جیسا کہ بعض عیسائی مصنفین خیال کرتے ہیں کہ کسی حکمی عقیدے کی تعریف اسی طرح کی جانی چاہیے کہ وہ ایک فوق العقلی قضیہ ہے اور اس کو مذہبی استحکام کی خاطر اور اس کا مابعد الطبیعی مفہوم سمجھے بغیر مان لینا چاہیے تو اس لحاظ سے اسلام کے ان دو سادہ قضایا کو حکمی عقیدے سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان دونوں کی تائید نوعِ انسان کے تجربہ سے ہوتی ہے اور ان کی عقلی توجیہ بخوبی کی جا سکتی ہے۔ ایسے الحاد کا سوال جہاں یہ فیصلہ کرنا پڑے کہ آیا اس کا مرتکب دائرہ مذہب میں ہے یا اس سے خارج ہے؟ ایسی مذہبی جماعت میں' جو ایسے سادہ قضایا پر مبنی ہو' اس صورت میں پیدا ہوتا ہے جبکہ مُلحد ان قضایا میں سے کسی ایک یا دونوں سے انکار کر دے۔ تاریخِ اسلام میں ایسا واقعہ شاذ ہی وقوع پذیر ہوا ہے اور ہونا بھی یہی چاہیے کیونکہ جب اس قسم کی کوئی بغاوت پیدا ہوتی ہے تو ایک اوسط مسلمان کا احساس قدرتی طور پر شدید ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ایران کا احساس بہائیوں کے خلاف اس قدر تھا اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کا احساس قادیانیوں کے خلاف اس قدر شدید ہے۔

یہ سچ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی فرقے فقہ اور دینیات کے فروعی مسائل میں اختلاف کی وجہ سے اکثر و بیشتر' ایک دوسرے میں الحاد کا الزام لگاتے رہے ہیں۔ 'دینیات' کے فروعی مسائل کے اختلاف میں اور نیز الحاد کی ایسی انتہائی صورتوں میں جہاں مُلحد کو جماعت سے خارج کیا جاتا ہے۔ لفظ کفر کے غیر محتاط استعمال کو آج کل کے تعلیم یافتہ مسلمان' جو مسلمانوں کے دینیاتی مناقشات کی تاریخ

سے بالکل ناواقف ہیں ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی و سیاسی انتشار کی علامت تصور کرتے ہیں۔ یہ ایک بالکل غلط تصور ہے۔ اسلامی دینیات کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فروعی مسائل کے اختلاف میں ایک دوسرے پر الحاد کا الزام لگانا باعث انتشار ہونے کی بجائے دینیاتی تفکر کو متحد کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔ پروفیسر ہر گراونج[9] کہتے ہیں کہ ''جب ہم فقہ اسلامی کے نشوونما کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک طرف تو ہر زمانے کے علماء خفیف سے اشتعال کے باعث ایک دوسرے کی مذمت یہاں تک کرتے ہیں کہ ایک دوسرے پر کفر کا الزام عائد ہو جاتا ہے اور دوسری طرف یہی لوگ زیادہ سے زیادہ اتحادِ عمل کے ساتھ اپنے پیشروؤں کے اختلاف رفع کرتے ہیں' اسلامی دینیات کا متعلم جانتا ہے کہ مسلم فقہا اس قسم کے الحاد کو اصطلاحی زبان میں کفر زیر کفر سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی ایسا کفر جس میں مرتکب جماعت سے خارج نہیں ہوتا۔ بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ملاؤں کے ذریعے جن کا عقلی تعطل دینیاتی تفکر کے ہر اختلاف کو قطعی سمجھتا ہے اور اختلاف میں اتحاد کو دیکھ نہیں سکتا۔ خفیف سا الحاد فتنہ عظیم کا باعث ہو جاتا ہے۔ اس فتنہ کا انسداد اس طرح ہو سکتا ہے کہ مدارسِ دینیات کے طلباء کے سامنے اسلام کی ائتلافی روح کا واضح ترین تصور پیش کریں اور ان کو یہ بتلائیں کہ منطقی تضاد کے دینیاتی تفکر میں اصول، حرکت کا کام کرتا ہے۔ یہ سوال کہ الحادِ کبیرہ کس کو کہتے ہیں؟ اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ کسی مفکر یا مصلح کی تعلیم مذہبِ اسلام کی سرحدوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے قادیانیت کی تعلیم میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہاں یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ تحریکِ احمدیت دو جماعتوں میں منقسم ہے' جو قادیانی اور لاہوری جماعتوں کے نام سے موسوم ہیں۔ اوّل الذکر جماعت بانی احمدیت کو نبی تسلیم کرتی ہے' آخر الذکر نے اعتقاداً یا مصلحتاً قادیانیت کی شدت کو کم کر کے پیش کرنا مناسب سمجھا۔ بہر حال یہ سوال کہ آیا بانی احمدیت ایک نبی تھا اور اس کی تعلیم سے انکار کرنا 'الحادِ کبیرہ' کو مستلزم ہے؟ ان دونوں جماعت میں متنازعہ فیہ ہے۔ احمدیوں کے ان گھریلو مناقشات کے محاسن کو جانچنا میرے پیش نظر مقصد کے لیے غیر ضروری ہے۔ میرا یقین ہے' جس کے وجوہ میں آگے چل کر بیان کردوں گا' کہ ایسے نبی کا تصور جس کے انکار کرنے سے منکر خارج (از) اسلام ہو جاتا ہے' احمدیت کا ایک لازمی عنصر ہے اور لاہوری جماعت کے امام کے مقابلہ میں قادیانیوں کے موجودہ پیشوا تحریک احمدیت کی روح سے بالکل قریب ہیں۔

ختم نبوت کے تصور کی تہذیبی قدر و قیمت کی توضیح میں نے کسی اور جگہ کر دی ہے۔[10] اس کے معنی بالکل سلیس ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جنھوں نے اپنے پیروؤں کو ایسا قانون عطا کر کے جو ضمیرِ انسان کی گہرائیوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے' آزادی کا راستہ دکھا دیا ہے۔ کسی اور انسانی ہستی کے آگے روحانی حیثیت سے سرِ نیاز خم نہ کیا جائے۔ دینیاتی نقطہ نظر سے اس نظریہ کو یوں بیان کر سکتے ہیں

کہ وہ اجتماعی اور سیاسی تنظیم جسے اسلام کہتے ہیں، مکمل اور ابدی ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں ہے، جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے، وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔ قادیانیوں کا اعتقاد ہے کہ تحریکِ احمدیت کا بانی ایسے الہام کا حامل تھا لہٰذا وہ تمام عالم اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔ خود بانیٔ احمدیت کا استدلال جو قرونِ وسطیٰ کے متکلمین کے لیے زیبا ہو سکتا ہے، یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا نبی نہ پیدا ہو سکے تو پیغمبر اسلام کی روحانیت نامکمل رہ جائے گی۔ وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں کہ پیغمبرِ اسلام کی روحانیت میں پیغمبر خیز قوت تھی، خود اپنی نبوت کو پیش کرتا ہے لیکن آپ اس سے پھر دریافت کریں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روحانیت ایک سے زیادہ نبی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ یہ خیال اس بات کے برابر ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی نہیں، میں آخری نبی ہوں۔ اس امر کے سمجھنے کی بجائے کہ ختم نبوت کا اسلامی تصور نوعِ انسان کی تاریخ میں بالعموم اور ایشیا کی تاریخ میں بالخصوص کیا تہذیبی قدر رکھتا ہے، بانیٔ احمدیت کا خیال ہے کہ ختم نبوت کا تصور ان معنوں میں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی پیرو نبوت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا، خود محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کو نامکمل پیش کرتا ہے۔ جب میں بانیٔ احمدیت کی نفسیات کا مطالعہ ان کے دعویٰ نبوت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیغمبرِ اسلام کی تخلیقی قوت کو صرف ایک نبی یعنی تحریک احمدیت کے بانی کی پیدائش تک محدود کر کے پیغمبرِ اسلام کے آخری نبی ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے روحانی مورث کی ختم نبوت پر متصرف ہو جاتا ہے۔

اس کا دعویٰ ہے کہ میں پیغمبر اسلام کا ''بروز'' ہوں۔ اس سے وہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام کا بروز ہونے کی حیثیت سے اس کا خاتم النبیین ہونا دراصل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا ہے۔ پس یہ نقطۂ نظر پیغمبر اسلام کی ختم نبوت کو مسترد نہیں کرتا۔ اپنی ختم نبوت کو پیغمبر اسلام کی ختم نبوت کے مماثل قرار دے کر بانیٔ احمدیت نے ختم نبوت کے تصور کے زمانی مفہوم کو نظر انداز کر دیا ہے۔ بہر حال یہ ایک بدیہی بات ہے کہ بروز کا لفظ مکمل مشابہت کے مفہوم میں بھی اس کی مدد نہیں کرتا کیونکہ بروز ہمیشہ اس شئے سے الگ ہوتا ہے جس کا یہ بروز ہوتا ہے۔ صرف اوتار کے معنوں میں بروز اور اس شئے میں عینیت پائی جاتی ہے۔ پس اگر ہم بروز سے، روحانی صفات کی مشابہت مراد لیں تو یہ دلیل بے اثر رہتی ہے۔ اگر اس کے برعکس اس لفظ کے آریائی مفہوم میں اصل شئے کا اوتار مراد لیں تو یہ دلیل بظاہر قابلِ قبول ہوتی ہے۔ لیکن اس خیال کا [illegible]جد مجوسی بھیس میں نظر آتا ہے۔

ھسبانیہ کے [illegible] صوفی محی الدین ابن العربی کی سند پر یہ مزید دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ایک

مسلمان ولی کے لیے اپنے روحانی ارتقاء کے دوران میں اس قسم کا تجربہ حاصل کرنا ممکن ہے جو شعورِ نبوت سے مختص ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ شیخ محی الدین ابن العربی کا یہ خیال نفسیاتی نقطہ نظر سے درست نہیں لیکن اگر اس کو صحیح فرض کرلیا جائے تو تب بھی قادیانی استدلال شیخ کے موقف کی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ شیخ ایسے تجربہ کو ذاتی کمال تصور کرتے ہیں، جس کی بناء پر کوئی ولی یہ اعلان نہیں کرسکتا کہ جو شخص اس پر (یعنی ولی پر) اعتقاد نہیں رکھتا، دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ کے نقطۂ نظر سے ایک ہی زمانہ اور ملک میں ایک سے زیادہ اولیاء موجود ہوسکتے ہیں۔ غور طلب امر یہ ہے کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے ایک ولی کا مشعورِ نبوت تک پہنچنا اگرچہ ممکن ہے، تاہم اس کا تجربہ اجتماعی اور سیاسی اہمیت نہیں رکھتا اور نہ اس کو کسی نئی تنظیم کا مرکز بناتا ہے اور یہ استحقاق عطا کرتا ہے کہ وہ اس نئی تنظیم کو پیروانِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ایمان یا کفر کا معیار قرار دے۔

اس صوفیانہ نفسیات سے قطع نظر کر کے فتوحات کی متعلقہ عبارتوں کو پڑھنے کے بعد میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہسپانیہ کا یہ عظیم الشان صوفی...... محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ختم نبوت پر اسی طرح مستحکم ایمان رکھتا ہے، جس طرح کہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان رکھ سکتا ہے۔ اگر شیخ کو اپنے صوفیانہ کشف میں یہ نظر آجاتا کہ ایک روز مشرق میں چند ہندوستانی جنھیں تصوف کا شوق ہے، شیخ کی صوفیانہ نفسیات کی آڑ میں پیغمبرِ اسلام کی ختم نبوت سے انکار کردیں گے تو یقیناً علمائے ہند سے پہلے مسلمانانِ عالم کو ایسے غدارانِ اسلام سے متنبہ کردیتے۔

اب احمدیت کی رُوح پر غور کرنا ہے۔ اس کے ماخذ اور اس امر کی بحث کہ قبلِ اسلام مجوسی تصورات نے اسلامی تصوف کے ذریعہ بانی احمدیت کے ذہن کو کس طرح متاثر کیا؟ مذہبِ متقابلہ کی نظر سے بیحد دلچسپ ہوگی لیکن میرے لیے اس بحث کو اٹھانا ممکن نہیں۔ یہ کہہ دینا کافی ہے کہ احمدیت کی اصل حقیقت قرونِ وسطیٰ کے تصوف اور دینیات کے نقاب میں پوشیدہ ہے۔ علمائے ہند نے اس کو محض ایک دینیاتی تحریک تصور کیا اور دینیاتی حربوں سے اس کا مقابلہ کرنے نکل آئے۔ بہرحال میرا خیال ہے کہ اس تحریک کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ طریقہ موزوں نہیں تھا۔ اس وجہ سے علماء کو کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ بانی احمدیت کے الہامات کی اگر دقیق النظری سے تحلیل کی جائے تو یہ ایک ایسا موثر طریقہ ہوگا جس کے ذریعہ سے ہم اس کی شخصیت اور اندرونی زندگی کا تجزیہ کرسکیں گے۔ اس سلسلہ میں مَیں اس امر کو واضح کردینا چاہتا ہوں کہ مولوی منظور الٰہی نے بانیِ احمدیت کے الہامات کا جو مجموعہ شائع کیا ہے، اس میں نفسیاتی تحقیق کے لیے متنوع اور مختلف مواد موجود ہے۔ میری رائے میں یہ کتاب بانیِ احمدیت کی سیرت اور شخصیت کی کنجی ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ کسی دن نفسیاتِ جدید کا کوئی متعلم اس کا سنجیدگی سے

مطالعہ کرے گا۔ اگر وہ قرآن کو اپنا معیار قرار دے (اور چند وجوہ سے اس کو ایسا کرنا ہی پڑے گا' جن کی تشریح یہاں نہیں کی جا سکتی) اور اپنے مطالعہ کو بانیِ احمدیت اور اس کے ہم عصر غیر مسلم صوفیاء جیسے رام کرشنا بنگالی کے تجربوں تک پھیلائے تو اس کو اس تجربہ کی اصل ماہیت کے متعلق بڑی حیرت ہوگی' جس کی بناء پر بانیِ احمدیت نبوت کا دعویدار ہے۔

عام آدمی کے نقطہ نظر سے ایک اور موثر اور مفید طریقہ یہ ہے کہ 1799ء سے ہندوستان میں اسلامی دینیات کی جو تاریخ رہی ہے' اس کی روشنی میں احمدیت کے اصل مظروف کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ دنیائے اسلام کی تاریخ میں 1799ء بے حد اہم ہے۔ اس سال ٹیپو کو شکست ہوئی۔ اس کی شکست کے ساتھ مسلمانوں کو ہندوستان میں سیاسی نفوذ حاصل کرنے کی جو امید تھی اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اسی سال جنگِ نوارینو' وقوع پذیر ہوئی' جس میں ترکی کا بیڑہ تباہ ہو گیا۔ [11] جو لوگ سرنگا پٹم گئے ہیں' ان کو ٹیپو کے مقبرے پر یہ تاریخِ وفات کندہ نظر آئی ہوگی۔

ہندوستان اور روم کی عظمت ختم ہوگئی۔

ان الفاظ کے مصنف نے پیش گوئی کی تھی' پس 1799ء میں ایشیا میں اسلام کا انحطاط انتہا کو پہنچ گیا تھا لیکن جس طرح ژینا میں جرمنی کی شکست کے بعد جدید جرمن قوم کا نشوونما ہوا' کہا جا سکتا ہے کہ اسی طرح 1799ء میں اسلام کی سیاسی شکست کے بعد جدید اسلام اور اس کے مسائل معرضِ ظہور میں آئے۔ اس امر پر میں آگے چل کر بحث کروں گا۔ فی الحال میں قارئین کی توجہ چند مسائل کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں' جو ٹیپو کی شکست اور ایشیا میں مغربی شہنشاہیت کی آمد کے بعد اسلامی ہند میں پیدا ہوگئے ہیں۔

کیا اسلام میں خلافت کا تصور ایک مذہبی ادارے کو مستلزم ہے؟ مسلمانانِ ہند اور وہ مسلمان جو ترکی سلطنت سے باہر ہیں' ترکی خلافت سے کیا تعلق رکھتے ہیں؟ ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟ اسلام میں نظریۂ جہاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ قرآن کی آیت: خدا' رسول اور تم میں سے اولی الامر کی اطاعت کرو [12] میں الفاظ 'تم میں سے' کا کیا مفہوم ہے؟ احادیث سے آمدِ مہدی کی جو پیشین گوئی کی جاتی ہے' اس کی نوعیت کیا ہے؟ اور اسی قبیل کے دوسرے سوالات جو بعد میں پیدا ہوئے ان کا تعلق بداہتہً صرف مسلمانانِ ہند سے تھا۔ اس کے علاوہ مغربی شہنشاہیت کو بھی جو اس وقت اسلامی دنیا میں سرعت کے ساتھ تسلط حاصل کر رہی تھی، ان سوالات سے گہری دلچسپی تھی۔ ان سوالات سے جو مناقشات پیدا ہوئے وہ اسلامی ہند کی تاریخ کا ایک باب ہیں۔ یہ حکایت دراز ہے اور ایک طاقتور قلم کی منتظر۔ مسلمان اربابِ سیاست جن کی آنکھیں واقعات پر جمی ہوئی تھیں' علماء کے ایک طبقہ کو اس بات پر

آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ وہ دینیاتی استدلال کا ایک ایسا طریقہ اختیار کریں جو صورتِ حال کے مناسب ہو۔ لیکن محض منطق سے ایسے عقائد پر فتح پانا آسان نہ تھا جو صدیوں سے مسلمانانِ ہند کے قلوب پر حکمران تھے۔ ایسے حالات میں منطق یا تو سیاسی مصلحت کی بناء پر آگے بڑھ سکتی ہے یا قرآن و حدیث کی نئی تفسیر کے ذریعہ۔ ہر دو صورتوں میں استدلال عوام کو متاثر کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ مسلمان عوام کو جن میں مذہبی جذبہ بہت شدید ہے صرف ایک ہی چیز قطعی طور پر متاثر کر سکتی ہے اور وہ ربانی سند ہے۔ راسخ عقائد کو موثر طریقہ پر مٹانے اور متذکرہ صدر سوالات میں جو دینیاتی نظریات مضمر ہیں ان کی نئی تفسیر کرنے کے لیے جو سیاسی اعتبار سے موزوں ہو ایک الہامی بنیاد ضروری سمجھی گئی۔ اس الہامی بنیاد کو احمدیت نے فراہم کیا۔ خود احمدیوں کا دعویٰ ہے کہ برطانوی شہنشاہیت کی یہ سب سے بڑی خدمت ہے جو انھوں نے انجام دی ہے۔ پیغمبرانہ الہام کو ایسے دینیاتی خیالات کی بنیاد قرار دینا جو سیاسی اہمیت رکھتے ہیں گویا اس بات کا اعلان کرنا ہے کہ جو لوگ مدعی نبوت کے خیالات کو قبول نہیں کرتے اوّل درجہ کے کافر ہیں اور ان کا ٹھکانہ نارِ جہنم ہے۔ جہاں تک میں نے اس تحریک کے منشاء کو سمجھا ہے احمدیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ مسیح علیہ السلام کی موت ایک عام فانی انسان کی موت تھی اور رجعت مسیح علیہ السلام گویا ایسے شخص کی آمد ہے جو روحانی حیثیت سے اس کا مشابہ ہے۔ اس خیال سے اس تحریک پر ایک طرح کا عقلی رنگ چڑھ جاتا ہے لیکن یہ ابتدائی مدارج ہیں۔ اس تصورِ نبوت کو جو ایسی تحریک کے اغراض کو پورا کرتا ہے جن کو جدید سیاسی قوتیں وجود میں لائی ہیں۔ ایسے ممالک میں جو ابھی تمدن کی ابتدائی منازل میں ہیں منطق سے زیادہ سند کا اثر ہوتا ہے۔ اگر کافی جہالت اور زود اعتقادی موجود ہو اور کوئی شخص اس قدر بے باک ہو کہ حاملِ الہام ہونے کا دعویٰ کرے جس سے انکار کرنے والا ہمیشہ کے لیے گرفتارِ لعنت ہو جاتا ہے تو ایک محکوم اسلامی ملک میں ایک سیاسی دینیات کو وجود میں لانا اور ایک ایسی جماعت کو تشکیل دینا آسان ہو جاتا ہے جس کا مسلک سیاسی محکومیت ہو۔ پنجاب میں مبہم دینیاتی عقائد کا فرسودہ جال اس سادہ لوح دہقان کو آسانی سے مسخر کر لیتا ہے جو صدیوں سے ظلم و ستم کا شکار رہا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو مشورہ دیتے ہیں کہ تمام مذاہب کے راسخ العقیدہ لوگ متحد ہو جائیں اور اس چیز کی مزاحمت کریں جس کو وہ ہندوستانی قومیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ طنز آمیز مشورہ اس بات کو فرض کر لیتا ہے کہ احمدیت ایک اصلاحی تحریک ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ جہاں تک ہندوستان میں اسلام کا تعلق ہے احمدیت میں اہم ترین مذہبی اور سیاسی امور تنقیح طلب مضمر ہیں جیسا کہ میں نے اوپر تشریح کی ہے۔ مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ خالص مذہبی امور سے قطع نظر سیاسی امور کی بناء پر بھی پنڈت جواہر لال نہرو کے شایانِ شان نہیں کہ وہ

مسلمانانِ ہند پر رجعت پسند اور قدامت پسند ہونے کا الزام لگائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ احمدیت کی اصل نوعیت کو سمجھ لیتے تو مسلمانانِ ہند کے اس رویہ کی ضرور تعریف و تحسین کرتے جو ایک ایسی مذہبی تحریک کے متعلق اختیار کیا گیا ہے جو ہندوستان کے تمام آفات و مصائب کے لیے الہامی سند پیش کرتی ہے۔

پس قارئین کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ اسلام کے رخساروں پر اس وقت احمدیت کی جو زردی نظر آ رہی ہے، وہ مسلمانانِ ہند کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں کوئی ناگہانی واقعہ نہیں ہے۔ وہ خیالات جو بالآخر اس تحریک میں رونما ہوئے ہیں، بانی احمدیت کی ولادت سے پہلے دینیاتی مباحث میں نمایاں رہ چکے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ بانی احمدیت اور اس کے رفقاء نے سوچ سمجھ کر اپنا پروگرام تیار کیا ہے۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ بانی احمدیت نے ایک آواز سنی لیکن اس امر کا تصفیہ کہ یہ آواز اس خدا کی طرف سے تھی جس کے ہاتھ میں زندگی اور طاقت ہے، یا لوگوں کے روحانی افلاس سے پیدا ہوئی۔ اس تحریک کی نوعیت پر منحصر ہونا چاہیے جو اس آواز کی آفریدہ ہے اور ان افکار و جذبات پر بھی جو اس آواز نے اپنے سننے والوں میں پیدا کیے ہیں۔ قارئین یہ نہ سمجھیں کہ میں استعارات استعمال کر رہا ہوں۔ اقوام کی تاریخِ حیات بتلاتی ہے کہ جب کسی قوم کی زندگی میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے تو انحطاط ہی الہام کا ماخذ بن جاتا ہے اور اس قوم کے شعراء، فلاسفہ، اولیاء، مدبرین اس سے متاثر ہو جاتے ہیں اور مبلغین کی ایک ایسی جماعت وجود میں آ جاتی ہے، جس کا مقصد واحد یہ ہوتا ہے کہ منطق کی سحر آفرین قوتوں سے اس قوم کی زندگی کے ہر اس پہلو کی تعریف و تحسین کرے جو نہایت ذلیل و قبیح ہوتا ہے۔ یہ مبلغین غیر شعوری طور پر مایوسی کو امید کے درخشاں لباس میں چھپا دیتے ہیں، کردار کے روایتی اقتدار کی بیخ کنی کرتے ہیں اور اس طرح ان لوگوں کی روحانی قوت کو مٹا دیتے ہیں جو ان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی قوتِ ارادی پر ذرا غور کرو جنھیں الہام کی بنیاد پر یہ تلقین کی جاتی ہے کہ اپنے سیاسی ماحول کو اٹل سمجھو۔ پس میرے خیال میں وہ تمام ایکٹر جنھوں نے احمدیت کے ڈرامہ میں حصہ لیا ہے، زوال اور انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح کٹ پتلی بنے ہوئے تھے۔ ایران میں بھی اسی قسم کا ایک ڈرامہ کھیلا گیا تھا لیکن اس میں نہ وہ سیاسی اور مذہبی امور پیدا ہوئے اور نہ ہو سکتے تھے جو احمدیت نے اسلام کے لیے ہندوستان میں پیدا کیے ہیں۔ روس نے بابی مذہب کو روا رکھا اور بابیوں کو اجازت دی کہ وہ اپنا پہلا تبلیغی مرکز عشق آباد میں قائم کریں۔ انگلستان نے بھی احمدیوں کے ساتھ رواداری برتی اور ان کو اپنا پہلا تبلیغی مرکز ووکنگ میں قائم کرنے کی اجازت دی۔ ہمارے لیے اس امر کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آیا روس اور انگلستان نے ایسی رواداری کا اظہار شہنشاہی مصلحتوں کی بناء پر کیا یا وسعتِ نظر کی وجہ سے۔ اس قدر تو بالکل واضح ہے کہ اس رواداری نے اسلام کے لیے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ اسلام کی اس ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے

جیسا کہ میں نے اس کو سمجھا ہے، مجھے یقینِ کامل ہے کہ اسلام ان دشواریوں سے جو اس کے لیے پیدا کی گئی ہیں زیادہ پاک وصاف ہو کر نکلے گا۔ زمانہ بدل رہا ہے۔ ہندوستان کے حالات ایک نیا رُخ اختیار کر چکے ہیں۔ جمہوریت کی نئی روح جو ہندوستان میں پھیل رہی ہے، وہ یقیناً احمدیوں کی آنکھیں کھول دے گی۔ انھیں یقین ہو جائے گا کہ ان کی دینیاتی ایجادات بالکل بے سود ہیں۔

اسلام قرونِ وسطیٰ کے اس تصوف کی تجدید کو بھی روا نہ رکھے گا، جس نے اپنے پیرودں کے صحیح رجحانات کو کچل کر ایک مبہم تفکر کی طرف ان کا رُخ موڑ دیا۔ اس تصوف نے گزشتہ چند صدیوں میں مسلمانوں کے بہترین دماغوں کو اپنے اندر جذب کر کے اور سلطنت کو معمولی آدمیوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا۔ جدید اسلام اس تجربہ کو دُہرا نہیں سکتا اور نہ وہ پنجاب کے اس تجربے کے اعادے کو روا رکھ سکتا ہے، جس نے مسلمانوں کو نصف صدی تک ایسے دینیاتی مسائل میں الجھائے رکھا جن کا زندگی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اسلام جدید تفکر اور تجربے کی روشنی میں قدم رکھ چکا ہے اور کوئی ولی یا پیغمبر اس کو قرونِ وسطیٰ کے تصوف کی تاریکی کی طرف واپس نہیں لے جا سکتا۔

اب میں پنڈت جواہر لال کے سوالات کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ پنڈت جی کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسلام یا انیسویں صدی کے اسلام کی مذہبی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں۔ انھوں نے شاید میری تحریرات کا مطالعہ بھی نہیں کیا ہے جن میں ان کے سوالات پر بحث کی گئی ہے۔ میرے لیے یہاں ان تمام خیالات کا اعادہ کرنا ممکن نہیں جن کو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ انیسویں صدی کے مسلمانوں کی مذہبی تاریخ کو پیش کرنا بھی یہاں ممکن نہیں، جس کے بغیر دنیائے اسلام کی موجودہ صورتِ حال کو پوری طرح سمجھنا دشوار ہے۔ ترکی اور جدید اسلام کے متعلق سینکڑوں کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں۔ میں اس لٹریچر کے بیشتر حصہ کا مطالعہ کر چکا ہوں اور غالباً پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس کا مطالعہ کر چکے ہوں گے۔ بہر حال میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ ان میں سے ایک مصنف نے بھی ان نتائج یا ان اسباب کی اصل ماہیت کو نہیں سمجھا جو ان نتائج کا باعث ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کے تفکر کے خصوصی رجحانات کو جو انیسویں صدی کے ایشیا میں پائے جاتے ہیں، اجمالی طور پر بیان کر دینا ضروری ہے۔

میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ 1799ء میں اسلام کا سیاسی زوال اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ بہر حال اسلام کی اندرونی قوت کا اس واقعہ سے بڑھ کر کیا ثبوت مل سکتا ہے کہ اس نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ دنیا میں اس کا کیا موقف ہے؟ انیسویں صدی میں سر سیّد احمد خان ہندوستان میں، سیّد جمال الدین افغانی افغانستان میں اور مفتی عالم جان روس میں پیدا ہوئے۔ یہ حضرات غالباً محمد بن عبدالوہاب سے متاثر ہوئے تھے، جن کی ولادت 1700ء میں بمقام نجد ہوئی تھی۔ اور جو اس نام نہاد وہابی تحریک کے بانی

تھے جس کو صحیح طور پر جدید اسلام میں زندگی کی پہلی تڑپ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ سرسیّد احمد خان کا اثر بحیثیت مجموعی ہندوستان ہی تک محدود رہا۔ غالباً یہ عصرِ جدید کے پہلے مسلمان تھے جنھوں نے آنے والے دور کی جھلک دیکھی تھی اور یہ محسوس کیا تھا کہ ایجابی علوم اس دور کی خصوصیت ہے۔ انھوں نے نیز روس میں مفتی عالم جان نے مسلمانوں کی پستی کا علاج جدید تعلیم کو قرار دیا۔ مگر سرسیّد احمد خان کی حقیقی عظمت اس واقعہ پر مبنی ہے کہ یہ پہلے ہندوستانی مسلمان ہیں جنھوں نے اسلام کو جدید رنگ میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی اور اس کے لیے سرگرم عمل ہو گئے۔ ہم ان کے مذہبی خیالات سے اختلافات کر سکتے ہیں لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی حساس روح نے سب سے پہلے عصر جدید کے خلاف ردعمل کیا۔

مسلمانانِ ہند کی انتہائی قدامت پرستی جو زندگی کے حقائق سے دور ہو گئی تھی، سرسیّد احمد خاں کے مذہبی نقطہ نظر کے حقیقی مفہوم کو نہ سمجھ سکی۔ ہندوستان کے شمال مغربی حصہ میں جو ابھی تہذیب کی ابتدائی منزل میں ہے اور جہاں دیگر اقطاعِ ہند کے مقابلہ میں پیر پرستی زیادہ مسلط ہے، سرسیّد کی تحریک کے خلاف احمدیت کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک میں سامی اور آریائی تصوف کی عجیب و غریب آمیزش تھی اور اس میں کسی فرد کا روحانی احیاء قدیم اسلامی تصوف کے اصولوں کے مطابق نہیں ہو سکتا تھا بلکہ مسیحِ موعود کی آمد کو پیش کر کے عوام کی کیفیت کو تشفی انتظار دی جاتی تھی۔ اس مسیحِ موعود کا فرض یہ نہیں تھا کہ فرد کو موجودہ پستی سے نجات دلائے بلکہ اس کا کام یہ تعلیم دینا ہے کہ لوگ اپنی روح کو غلامانہ طور پر پستی اور انحطاط کے سپرد کر دیں۔ اس ردعمل ہی کے اندر ایک نازک تضاد مضمر ہے۔ یہ تحریک اسلام کے ضوابط کو برقرار رکھتی ہے لیکن اس قوتِ ارادی کو فنا کر دیتی ہے جس کو اسلام مضبوط کرنا چاہتا ہے۔

مولانا سیّد جمال الدین افغانی کی شخصیت کچھ اور ہی تھی۔ قدرت کے طریقے بھی عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ مذہبی فکر و عمل کے لحاظ سے ہمارے زمانہ کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ مسلمان افغانستان میں پیدا ہوتا ہے۔ جمال الدین افغانی دنیائے اسلام کی تمام زبانوں سے واقف تھے۔ ان کی فصاحت و بلاغت میں سحر آفرینی ودیعت تھی۔ ان کی بے چین روح ایک اسلامی ملک سے دوسرے اسلامی ملک کا سفر کرتی رہی اور اس نے ایران، مصر اور ترکی کے ممتاز ترین [illegible] کو متاثر کیا۔ ہمارے زمانے کے بعض جلیل القدر علماء جیسے مفتی محمد عبدہ، اور نئی پود کے بعض افراد جو آگے چل کر سیاسی قائد بن گئے، جیسے مصر کے زاغلول پاشا وغیرہ انہی کے شاگردوں میں سے تھے۔ انھوں نے لکھا کم اور کہا بہت اور اس طریقہ سے ان تمام لوگوں کو جنھیں ان کا قرب حاصل ہوا، چھوٹے چھوٹے جمال الدین بنا دیا۔ انھوں نے کبھی نبی یا مجدد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ پھر بھی ہمارے زمانے کے کسی شخص نے روح اسلام

میں اس قدر تڑپ پیدا نہیں کی جس قدر کہ انھوں نے کی تھی۔ ان کی روح اب بھی دنیائے اسلام میں سرگرم عمل ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اس کی انتہا کہاں ہوگی؟

بہر حال اب یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ان جلیل القدر ہستیوں کی غایت کیا تھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انھوں نے دنیائے اسلام میں تین مخصوص قوتوں کو حکمران پایا اور ان قوتوں کے خلاف بغاوت پیدا کرنے کے لیے اپنی پوری طاقت کو مرتکز کر دیا۔

1-ملائیت

علماء ہمیشہ اسلام کے لیے ایک قوتِ عظیم کا سرچشمہ رہے ہیں لیکن صدیوں کے مرور کے بعد خاص کر زوالِ بغداد کے زمانے سے وہ بے حد قدامت پرست بن گئے اور آزادی اجتہاد (یعنی قانونی امور میں آزاد رائے قائم کرنا) کی مخالفت کرنے لگے۔ وہابی تحریک جو انیسویں صدی کے مصلحین اسلام کے لیے حوصلہ افروز تھی درحقیقت ایک بغاوت تھی علماء کے اس جمود کے خلاف، پس انیسویں صدی کے مصلحین اسلام کا پہلا مقصد یہ تھا کہ عقائد کی جدید تفسیر کی جائے اور بڑھتے ہوئے تجربے کی روشنی میں قانون کی جدید تعبیر کرنے کی آزادی حاصل کی جائے۔

2-تصوف

مسلمانوں پر ایک ایسا تصوف مسلط تھا، جس نے حقائق سے آنکھیں بند کر لی تھیں، جس نے عوام کی قوتِ عمل کو ضعیف کر دیا تھا اور ان کو ہر قسم کے توہم میں مبتلا کر رکھا تھا۔ تصوف اپنے اس اعلیٰ مرتبہ سے جہاں وہ روحانی تعلیم کی ایک قوت رکھتا تھا، نیچے گر کر عوام کی جہالت اور زود اعتقادی سے فائدہ اٹھانے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ اسی نے بتدریج اور غیر محسوس طریقہ پر مسلمانوں کی قوت ارادی کو کمزور اور اس قدر نرم کر دیا تھا کہ مسلمان اسلامی قانون کی سختی سے بچنے کی کوشش کرنے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے مصلحین نے اس قسم کے تصوف کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور مسلمانوں کو عصر جدید کی روشنی کی طرف دعوت دی۔ یہ نہیں کہ یہ مصلحین مادہ پرست تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اسلام کی اس روح سے آشنا ہو جائیں جو مادہ سے گریز کرنے کی بجائے اس کی تسخیر کی کوشش کرتی ہے۔

3-ملوکیت

مسلمان سلاطین کی نظر اپنے خاندان کے مفاد پر جمی رہتی تھی اور اپنے اس مفاد کی حفاظت کے لیے وہ اپنے ملک کو بیچنے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔ سیّد جمال الدین افغانی کا مقصدِ خاص یہ تھا کہ مسلمانوں کو دنیائے اسلام کے ان حالات کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے۔

مسلمانوں کے فکر و تاثر کی دنیا میں ان مصلحین نے جو انقلاب پیدا کیا ہے' اس کا تفصیلی بیان یہاں ممکن نہیں۔ بہر حال ایک چیز بہت واضح ہے۔ ان مصلحین نے زاغلول پاشا' مصطفےٰ کمال اور رضا شاہ ایسی ہستیوں کی آمد کے لیے راستہ تیار کر دیا۔ ان مصلحین نے تعبیر و تفسیر' توجیہ و توضیح کی' لیکن جو افراد ان کے بعد آئے اگر چہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ تھے تاہم اپنے صحیح رجحانات پر اعتماد کر کے جرأت کے ساتھ میدان عمل میں کود پڑے اور زندگی کی نئی ضروریات کا جو تقاضا تھا اس کو جبر و قوت سے پورا کیا۔ ایسے لوگوں سے غلطیاں بھی ہوا کرتی ہیں لیکن تاریخِ اقوام بتلاتی ہے کہ ان کی غلطیاں بھی بعض اوقات مفید نتائج پیدا کرتی ہیں۔ ان کے اندر منطق نہیں بلکہ زندگی ہیجان برپا کر دیتی ہے اور اپنے مسائل کو حل کرنے کے لیے مضطرب اور بے چین رکھتی ہے۔ یہاں یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ سر سیّد احمد خان' سیّد جمال الدین افغانی اور ان کے سینکڑوں شاگرد جو اسلامی ممالک میں تھے' مغرب زدہ مسلمان نہیں تھے بلکہ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے قدیم مکتب کے ملاؤں کے آگے زانوئے ادب تہ کیا تھا اور اس عقلی و روحانی فضا میں سانس لیا تھا' جس کو وہ از سرِ نو تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ جدید خیالات کا اثر ضرور پڑا ہے لیکن جس تاریخ کا اجمالی طور پر اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ ترکی میں جو انقلاب ظہور پذیر ہوا اور جو جلد یا بدیر دوسرے اسلامی ممالک (میں) بھی ظہور پذیر ہونے والا ہے' بالکل اندرونی قوتوں کا آفریدہ تھا۔ جدید دنیائے اسلام کو جو شخص سطحی نظر سے دیکھتا ہے' وہی شخص یہ خیال کر سکتا ہے کہ دنیائے اسلام کا موجودہ انقلاب محض بیرونی قوتوں کا رہینِ منت ہے۔

کیا ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی ممالک خاص کر ترکی نے اسلام کو ترک کر دیا ہے؟ پنڈت جواہر لال نہرو خیال کرتے ہیں کہ ترکی اب اسلامی ملک نہیں رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو محسوس نہیں کرتے کہ یہ سوال کہ آیا کوئی شخص یا جماعت اسلام سے خارج ہو گئی' مسلمانوں کے نقطہ نظر سے ایک خالص فقہی سوال ہے اور اس کا فیصلہ اسلام کی ہیئتِ ترکیبی کے لحاظ سے کرنا پڑے گا۔ جب تک کوئی شخص اسلام کے دو بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتا ہے یعنی توحید اور ختم نبوت' تو اس کو ایک راسخ العقیدہ ملا بھی اسلام کے دائرہ سے خارج نہیں کر سکتا۔ خواہ فقہ اور آیاتِ قرآنی کی تاویلات میں وہ کتنی ہی غلطیاں کرے۔ غالبًا پنڈت جواہر لال نہرو کے ذہن میں وہ مفروضہ یا حقیقی اصلاحات ہیں' جو اتاترک نے رائج کی ہیں۔ اب ہم تھوڑی دیر کے لیے ان کا جائزہ لیں گے۔ کیا ترکی میں ایک عام مادی نقطہ نظر کا نشو و نما اسلام کے منافی ہے؟ مسلمانوں میں ترکِ دنیا کا بہت رواج رہ چکا ہے۔ مسلمانوں کے لیے اب وقت آ گیا ہے کہ وہ حقائق کی طرف متوجہ ہوں۔ مادیت' مذہب کے خلاف ایک بڑا حربہ ہے لیکن ملا اور صوفی کے پیشوں کے استیصال کے لیے ایک مؤثر حربہ ہے جو عمداً لوگوں کو اس غرض سے گرفتارِ

حیرت کر دیتے ہیں کہ ان کی جہالت اور زود اعتقادی سے فائدہ اٹھائیں۔ اسلام کی روح مادہ کے قرب سے نہیں ڈرتی۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ تمہارا دین میں جو حصہ ہے اس کو نہ بھولو ایک غیر مسلم کے لیے اس کا سمجھنا دشوار ہے۔ گزشتہ چند صدیوں میں دنیائے اسلام کی جو تاریخ رہی ہے' اس کے لحاظ سے مادی نقطہ نظر کی ترقی مستحق ذات کی ایک صورت ہے۔ کیا لباس کی تبدیلی یا لاطینی رسم الخط کا رواج اسلام کے منافی ہے؟ اسلام کا بحیثیت ایک مذہب کے کوئی وطن نہیں اور بحیثیت ایک معاشرت کے اس کی نہ کوئی مخصوص زبان ہے اور نہ کوئی مخصوص لباس' قرآن کا ترکی زبان میں پڑھا جانا تاریخ اسلام میں کوئی نئی بات نہیں۔ اس کی چند مثالیں موجود ہیں۔ ذاتی طور پر میں اس کو فکر و نظر کی ایک سنگین غلطی سمجھتا ہوں کیونکہ عربی زبان و ادب کا متعلم اچھی طرح جانتا ہے کہ غیر یورپی زبانوں میں اگر کسی زبان کا مستقبل ہے' تو وہ عربی ہے۔ بہرحال اب یہ اطلاعیں آ رہی ہیں کہ ترکوں نے ملکی زبان میں قرآن پڑھنا ترک کر دیا ہے۔ تو کیا کثرتِ ازدواج کی ممانعت یا علماء پر لائسنس حاصل کرنے کی قید منافیِ اسلام ہے؟ فقہ اسلام کی رُو سے ایک اسلامی ریاست کا امیر مجاز ہے کہ شرعی اجازتوں کو منسوخ کر دے [13] بشرطیکہ اس کو یقین ہو جائے کہ یہ اجازتیں معاشرتی فساد پیدا کرنے کی طرف مائل ہیں۔ رہا علماء کا لائسنس حاصل کرنا' آج مجھے اختیار ہوتا تو یقیناً میں اسے اسلامی ہند میں نافذ کر دیتا۔ ایک اوسط مسلمان کی سادہ لوحی زیادہ تر افسانہ تراش ملا کی ایجادات کا نتیجہ ہے۔ قوم کی مذہبی زندگی سے ملاؤں کو الگ کر کے اتاترک نے وہ کام کیا جس سے ابن تیمیہ یا شاہ ولی اللہ کا دل مسرت سے لبریز ہو جاتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث مشکوٰۃ میں درج ہے جس کی رُو سے وعظ کرنے کا حق صرف اسلامی ریاست کے امیر یا اس کے مقرر کردہ شخص یا اشخاص کو حاصل ہے۔ خبر نہیں اتاترک اس حدیث سے واقف ہیں یا نہیں؟ تاہم یہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ اس کے اسلامی ضمیر کی روشنی نے اس اہم ترین معاملہ میں اس کے میدانِ عمل کو کس طرح منور کر دیا ہے۔ سوئز قانون [14] اور اس کے قواعدِ وراثت کو اختیار کر لینا ضرور ایک سنگین غلطی ہے' جو جوشِ اصلاح کی وجہ سے سرزد ہوئی ہے اور ایک ایسی قوم میں جو سُرعت کے ساتھ آگے بڑھنا چاہتی ہے ایک حد تک قابلِ معافی ہے۔ پیشوایانِ مذہب کے پنجۂ استبداد سے نجات حاصل کرنے کی مسرت ایک قوم کو بعض اوقات ایسی راہِ عمل کی طرف کھینچ لے جاتی ہے' جس کا اس قوم کو کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ ترکی اور نیز تمام دنیائے اسلام کو اسلامی قانونِ وراثت کے ان معاشی پہلوؤں کو ابھی منکشف کرنا ہے جن کو وان کریمر [15]' فقہ اسلام کی بے حد اچھی شاخ' سے تعبیر کرتا ہے۔ کیا تنسیخِ خلافت یا مذہب و سلطنت کی علیحدگی منافیِ اسلام ہے؟ اسلام اپنی روح کے لحاظ سے شہنشاہیت نہیں ہے۔ اس خلافت کی تنسیخ جو بنو امیہ کے زمانے سے عملاً ایک سلطنت بن گئی تھی' اسلام کی رُوح اتاترک کے ذریعہ کارفرما رہی

ہے۔مسئلہ خلافت میں ترکوں کے اجتہاد کو سمجھنے کے لیے ہمیں ابن خلدون کی رہنمائی حاصل کرنا پڑے گی' جو اسلام کا ایک جلیل القدر فلسفی' مورخ اور تاریخ جدید کا ابولآبا گزرا ہے۔میں اپنی کتاب ''اسلامی تفکر کی تشکیل جدید'' کا اقتباس پیش کرتا ہوں۔

ابن خلدون اپنے مشہور ''مقدمہ تاریخ'' میں عالمگیر اسلامی خلافت سے متعلق تین متمائز نقاط نظر پیش کرتا ہے۔(1) عالمگیر خلافت ایک مذہبی ادارہ ہے' اسی لیے اس کا قیام ناگزیر ہے۔(2) اس کا تعلق محض اقتضائے وقت سے ہے۔(3) ایسے ادارے کی ضرورت ہی نہیں۔آخر الذکر خیال کو خارجیوں نے اختیار کیا تھا جو اسلام کے ابتدائی جمہورین تھے۔ترکی پہلے خیال کے مقابلہ میں دوسرے خیال کی طرف مائل ہے' یعنی معتزلہ کے اس خیال کی طرف کہ عالمگیر خلافت محض اقتضائے وقت سے تعلق رکھتی ہے۔ترکوں کا استدلال یہ ہے کہ ہم کو اپنے سیاسی تفکر میں اپنے ماضی کے سیاسی تجربے سے مدد لینی چاہیے جو بلاشک وشبہ اس واقعہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ عالمگیر خلافت کا تفکر و تخیل عملی صورت اختیار کرنے سے قاصر رہا۔یہ تخیل اس وقت قابل عمل تھا جب کہ اسلامی ریاست برقرار تھی۔اس ریاست کے انتشار کے بعد کئی آزاد سلطنتیں وجود میں آ گئی ہیں۔اب یہ تخیل بے اثر ہو گیا ہے اور اسلام کی تنظیم جدید میں ایک زندگی بخش عنصر کی حیثیت سے کارگر نہیں ہو سکتا۔

مذہب وسلطنت کی علیحدگی کا تصور بھی اسلام کے لیے غیر مانوس نہیں ہے۔امام کی ''غیبت کبریٰ'' 16 کا نظریہ ایک مفہوم میں ایک عرصہ پہلے شیعی ایران میں اس علیحدگی کو رُو بہ عمل لا چکا ہے۔ ریاست کے مذہبی وسیاسی وظائف کی تقسیم کے اسلامی تصور کو کلیسا اور سلطنت کے مغربی تصور سے مخلوط نہ کرنا چاہیے۔اوّل الذکر تو محض وظائف کی ایک قسم ہے جیسا کہ اسلامی ریاست میں شیخ الاسلام اور وزراء کے عہدوں کے تدریجی قیام سے واضح ہو جاتا ہے لیکن آخر الذکر رُوح اور مادہ کی مابعد الطبعی ثنویت پر مبنی ہے۔مسیحیت کا آغاز ایک نظام رُہبانیت سے ہوتا ہے جسے دنیوی امور سے کوئی تعلق نہیں تھا۔اسلام ابتداء ہی سے ایک نظامِ معاشری رہا ہے' جس کے قوانین بالطبع معاشری ہیں۔اگرچہ ان کا ماخذ الہامی ہے۔مابعد الطبعی ثنویت نے جس پر مذہب وسلطنت کی علیحدگی کا مغربی تصور مبنی ہے' مغربی اقوام میں تلخ ثمرات پیدا کیے۔کئی سال ہوئے امریکہ میں ایک کتاب لکھی گئی تھی جس کا عنوان تھا ''اگر مسیح شکاگو آئیں'' 17 اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک امریکی مصنف کہتا ہے:

> ''مسٹر سٹیڈ'' 18 کی کتاب سے ہمیں جو سبق حاصل کرنا ہے' یہ ہے کہ اس وقت نوعِ انسان جن برائیوں میں مبتلا ہے' وہ ایسی برائیاں ہیں جن کا ازالہ صرف مذہبی تاثرات ہی کر سکتے ہیں۔ان برائیوں کا ازالہ ایک بڑی حد تک ریاست

کے سپرد کر دیا گیا تھا لیکن خود ریاست فساد انگیز سیاسی مشینوں میں دب گئی ہے۔
یہ مشین ان برائیوں کا ازالہ کرنے کے لیے نہ صرف تیار نہیں بلکہ وہ اس قابل نہیں ہے۔ پس کروڑہا انسانوں کو تباہی اور خود ریاست کو انحطاط سے بچانے کے لیے بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ شہریوں میں اپنے اجتماعی فرائض کا مذہبی احساس پیدا کیا جائے۔

مسلمانوں کے سیاسی تجربے کی تاریخ میں مذہب و سلطنت کی علیحدگی محض وظائف کی علیحدگی ہے نہ کہ عقائد کی۔ اسلامی ممالک میں مذہب و سلطنت کی علیحدگی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ مسلمانوں کی قانون سازی عوام کے ضمیر سے بے تعلق ہو جائے' جو صدیوں سے اسلامی روحانیت کے تحت پرورش و نمو پاتا رہا ہے۔ تجربہ خود بتلا دے گا کہ یہ تخیل جدید ترکی میں کس طرح عملی صورت اختیار کرتا ہے۔ ہم صرف یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ یہ ان برائیوں کا باعث نہ ہوگا جو یورپ اور امریکہ میں پیدا ہوگئی ہیں۔

متذکرۃ الصدر اصلاحات پر میں نے جو اجمالی بحث کی ہے اس میں سیرا رُوئے سخن پنڈت جواہر لال نہرو سے زیادہ مسلمانوں کی طرف تھا۔ پنڈت نہرو نے جس اصلاح کا خاص طور پر ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ ترکوں اور ایرانیوں نے نسلی اور قومی نصب العین اختیار کرلیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ایسا نصب العین اختیار کرنے کی معنی یہ ہیں کہ ترکوں اور ایرانیوں نے اسلام کو ترک کر دیا ہے۔ تاریخ کا متعلم اچھی طرح جانتا ہے کہ اسلام کا ظہور ایسے زمانے میں ہوا جب کہ وحدتِ انسانی کے قدیم اصول جیسے خونی رشتہ اور ملوکیت ناکام ثابت ہورہے تھے۔ پس اسلام نے وحدتِ انسانی کا اصول گوشت اور پوست میں نہیں بلکہ رُوحِ انسانی میں دریافت کیا۔ نوعِ انسان کو اسلام کا اجتماعی پیغام یہ ہے کہ ''نسل کے قیود سے آزاد ہو جاؤ یا باہمی لڑائیوں سے ہلاک ہو جاؤ'' یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ اسلام فطرت کی نسل سازی کو ٹیڑھی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے مخصوص اداروں کے ذریعہ ایسا نقطہ نظر پیدا کر دیتا ہے جو فطرت کی نسل ساز قوتوں کی مزاحمت کرتا ہے۔ انسانی برادری قائم کرنے کے سلسلہ میں اسلام نے جو اہم ترین کارنامے ایک ہزار سال میں انجام دیئے وہ مسیحیت اور بدھ مت نے دو ہزار سال میں بھی انجام نہیں دیے۔ یہ بات ایک معجزے سے کم نہیں کہ ایک ہندی مسلمان نسل اور زبان کے اختلاف کے باوجود مراکش پہنچ کر اجنبیت محسوس نہیں کرتا۔ تاہم یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسلام نسل کا سرے سے مخالف ہے۔ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے معاشرتی اصلاح کو زیادہ تر اس امر پر مبنی رکھا کہ بتدریج نسلی عصبیت کو مٹایا جائے اور ایسا راستہ اختیار کیا جائے جہاں تصادم کا کم سے کم امکان ہو۔ قرآن کا ارشاد ہے'

ہم نے تم کو قبائل میں اس لیے پیدا کیا کہ تم پہچانے جا سکو لیکن تم میں سے وہی شخص خدا کی نظر میں بہترین ہے جس کی زندگی پاک ہے۔ 19؎ اگر اس امر کو مدنظر رکھا جائے کہ مسئلہ نسل کس قدر زبردست ہے اور نوع انسان سے نسلی امتیازات مٹانے کے لیے کس قدر وقت درکار ہے؟ تو مسئلہ نسل کے متعلق صرف اسلام ہی کا نقطہ نظر (یعنی خود ایک نسل ساز عنصر بنے بغیر نسلی امتیازات پر فتح پانا) معقول اور قابلِ عمل نظر آئے گا۔ سر آرتھر کیتھ 20؎ کی چھوٹی سی کتاب ''مسئلہ نسل'' میں ایک دلچسپ عبارت ہے جس کا اقتباس یہاں پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

> ''اب انسان میں اس قسم کا شعور پیدا ہو رہا ہے کہ فطرت کا ابتدائی مقصد یعنی نسل سازی جدید معاشی دنیا کی ضروریات کے منافی ہے اور وہ اپنے دل سے پوچھتا ہے کہ مجھ کو کیا کرنا چاہیے؟ کیا نسل سازی کو ختم کر کے جس پر فطرت اب تک عمل پیرا تھی دائمی امن حاصل کیا جائے یا فطرت کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنی قدیم راہِ عمل اختیار کرے، جس کا لازمی نتیجہ جنگ ہے؟ انسان کو کوئی ایک راہِ عمل اختیار کرنا پڑے گی۔ کوئی درمیانی راستہ ممکن نہیں۔''

لہٰذا اب یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر اتاترک اتحادِ تورانیت سے متاثر ہے تو وہ روحِ اسلام کے خلاف اس قدر نہیں جا رہا جس قدر کہ روحِ عصر کے خلاف۔ اگر وہ نسلوں کے وجود کو ضروری سمجھتا ہے تو اس کو عصر جدید کی رُوح شکست دے دے گی کیونکہ عصرِ جدید کی رُوح بالکل رُوحِ اسلام کے مطابق ہے۔ بہر حال ذاتی طور پر میں خیال کرتا ہوں کہ اتاترک اتحادِ تورانیت سے متاثر نہیں ہے۔ میرا یقین ہے کہ اس کا اتحادِ تورانیت ایک سیاسی جواب ہے اتحادِ سلاف یا اتحاد المانویت یا اتحادِ اینگلو سیکن کا۔

اگر مندرجہ بالا عبارت کا مفہوم اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو قومی نصب العین سے متعلق اسلام کے نقطہ نظر کو سمجھنے میں دشواری نہ ہوگی۔ اگر قومیت کے معنی حب الوطنی اور ناموسِ وطن کے لیے جان تک قربان کرنے کے ہیں تو ایسی قومیت مسلمانوں کے ایمان کا ایک جزو ہے۔ اس قومیت کا اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا ہے جب کہ وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے اور اتحادِ انسانی کا بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔ ترکی، ایران، مصر اور دیگر اسلامی ممالک میں قومیت کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ ان ممالک میں مسلمانوں کی زبردست اکثریت ہے اور یہاں کی اقلیتیں جیسے یہودی، عیسائی اور زرتشتی اسلامی قانون کی رُو سے یا تو اہل کتاب ہیں یا اہل کتاب سے مشابہ ہیں، جن سے معاشی اور ازدواجی تعلقات قائم کرنا اسلامی قانون کے لحاظ سے بالکل جائز ہے۔ قومیت کا مسئلہ

مسلمانوں کے لیے صرف ان ممالک میں پیدا ہوتا ہے جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور جہاں قومیت کا یہ تقاضا ہو کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دیں۔ جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے کیونکہ یہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہے۔ جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں (وہاں)...... مسلمانوں کی یہ کوشش کہ ایک تہذیبی وحدت کی حیثیت سے خودمختاری حاصل کی جائے حق بجانب ہوگی۔ دونوں صورتیں اسلام کے بالکل مطابق ہیں۔

سطورِ بالا میں دنیائے اسلام کی صحیح صورتِ حال کو اجمالی طور پر پیش کر دیا گیا ہے' اگر اس کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو یہ امر واضح ہو جائے گا کہ وحدتِ اسلامی کے بنیادی اصولوں کو کوئی بیرونی یا اندرونی قوت متزلزل نہیں کر سکتی۔ وحدتِ اسلامی' جیسا کہ میں نے پہلے توضیح کی ہے، مشتمل ہے اسلام کے دو بنیادی عقائد پر جن میں پانچ مشہور ارکانِ شریعت کا اضافہ کر لینا چاہیے۔ وحدتِ اسلامی کے یہ اساسی عناصر ہیں جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے سے اب تک قائم ہیں۔ گو حال میں بہائیوں نے ایران اور قادیانیوں نے ہندوستان میں ان عناصر میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وحدت دنیائے اسلام میں یکساں روحانی فضا پیدا کرنے کی ضامن ہے' یہی وحدت اسلامی ریاستوں میں سیاسی اتحاد قائم کرنے میں سہولت پیدا کرتی ہے' خواہ یہ اتحاد عالمگیر ریاست (مثالی) کی صورت اختیار کرے یا اسلامی ریاستوں کی جمعیت کی ایک صورت یا متعدد آزاد ریاستوں کی صورت جن کے معاہدات اور میثاقات خالص معاشی و سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہوں گے۔ اس طرح اس سیدھے سادھے مذہب کی تعقلی ہیئت ترکیبی رفتارِ زمانہ سے ایک تعلق رکھتی ہے۔ اس تعلق کی گہرائی قرآن کی چند آیتوں کی روشنی میں سمجھ میں آ سکتی ہے' جن کی تشریح پیشِ نظر مقصد سے ہٹے بغیر یہاں ممکن نہیں۔ سیاسی نقطہ نظر سے وحدتِ اسلامی صرف اس وقت متزلزل ہو جاتی ہے جب کہ اسلامی ریاستیں ایک دوسرے سے جنگ کرتی ہیں اور مذہبی نقطہ نظر سے اس وقت متزلزل ہو جاتی ہے جب کہ مسلمان بنیادی عقائد یا ارکانِ شریعت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ اس ابدی وحدت کی خاطر اسلام اپنے دائرے میں کسی باغی جماعت کو روا نہیں رکھتا۔ اسلام کے دائرے سے باہر ایسی جماعت کے ساتھ دوسرے مذاہب کے پیروؤں کی طرح رواداری برتی جا سکتی ہے۔ میرے خیال میں اس وقت اسلام ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے۔ وہ سیاسی وحدت کی ایک صورت سے کسی دوسری صورت کی طرف جو ابھی متعین نہیں ہوئی ہے اقدام کر رہا ہے۔ دنیائے جدید میں حالات اس سرعت کے ساتھ بدل رہے ہیں کہ مستقبل کے متعلق پیشین گوئی تقریباً ناممکن ہے۔ اگر دنیائے اسلام سیاسی وحدت حاصل کرے (اگر ایسا ممکن ہو) تو غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کا رویہ کیا ہوگا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب صرف تاریخ ہی دے

سکتی ہے۔ میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جغرافیائی حیثیت سے یورپ اور ایشیا کے درمیان واقع ہونے کے لحاظ سے اور زندگی کے مشرقی و مغربی نصب العین کے ایک امتزاج کی حیثیت سے اسلام کو مشرق و مغرب کے مابین ایک طرح کا نقطہ اتصال بننا چاہیے لیکن اگر یورپ کی نادانیاں اسلام کو ناقابلِ مفاہمت بنا دیں تو کیا ہوگا؟ یورپ کے روزمرہ کے حالات جو صورت اختیار کر رہے ہیں ان کا اقتضاء یہ ہے کہ یورپ اپنے طرزِ عمل کو کلیتہً بدل دے جو اس نے اسلام کے متعلق اختیار کیا ہے۔ ہم صرف یہ توقع کر سکتے ہیں کہ سیاسی بصیرت پر معاشی لوٹ اور شہنشاہی ہوس کا پردہ نہیں پڑے گا۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے میں یقین کامل کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند کسی ایسی سیاسی تصوریت کا شکار نہیں بنیں گے جو ان کی تہذیبی وحدت کا خاتمہ کر دے گی۔ اگر ان کی تہذیبی وحدت محفوظ ہو جائے تو ہم اعتماد کر سکتے ہیں کہ وہ مذہب اور حب الوطنی میں ہم آہنگی پیدا کر لیں گے۔

ہز ہائینس آغا خاں کے متعلق میں دو ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ میرے لیے اس امر کا معلوم کرنا دشوار ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے آغا خاں پر کیوں حملے کیے؟ شاید وہ خیال کرتے ہیں کہ قادیانی اور اسماعیلی ایک ہی زُمرے میں شامل ہیں۔ وہ اس بات سے بداہتہً بے خبر ہیں کہ اسماعیلیوں کی دینیاتی تاویلات کتنی ہی غلط ہوں پھر بھی وہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اسماعیلی تسلسلِ امامت کے قائل ہیں لیکن ان کے نزدیک امام حاملِ وحی نہیں ہوتا ہے۔ وہ محض قانون کا مفسر ہوتا ہے۔ کل ہی کی بات ہے کہ ہز ہائینس آغا خاں نے اپنے پیروؤں کو حسب ذیل الفاظ سے مخاطب کیا تھا۔ (دیکھو اسٹار' الہ آباد' 12 مارچ 1934ء)

> "گواہ رہو کہ اللہ ایک ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کے رسول ہیں' قرآن اللہ کی کتاب ہے' کعبہ سب کا قبلہ ہے۔ تم مسلمان ہو اور مسلمانوں کے ساتھ زندگی بسر کرو' مسلمانوں سے السلام علیکم کہہ کر ملو' اپنے بچوں کے اسلامی نام رکھو' مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں باجماعت نماز پڑھو' پابندی سے روزے رکھو۔ اسلامی قانونِ نکاح کے مطابق اپنی شادیاں کرو۔ تمام مسلمانوں سے اپنے بھائیوں کی طرح برتاؤ کرو۔"

اب پنڈت جواہر لال نہرو کو اس امر کا تصفیہ کرنا چاہیے کہ آیا آغا خاں اسلامی وحدت کی نمائندگی کر رہے ہیں (مرتب) یا نہیں؟ 21

❁......❁......❁

حواشی

(از قلم محترم نعیم آسی مرحوم)

حضرت علامہؒ کے بیان ''قادیانی اور جمہور مسلمان'' کا شائع ہونا تھا کہ ایوانِ قادیانیت میں ایک زلزلہ برپا ہو گیا' گویا کسی نے بم پھینک دیا ہو۔ وہ سب لوگ جو اپنے مفاد کی خاطر قادیانیوں سے ہمدردی رکھتے تھے لنگر لنگوٹ کس کر حضرت علامہؒ کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کے باوجود نہایت ناگوار لب ولہجہ میں 'ماڈرن ریویو' کلکتہ میں تین مضمون گھسیٹ ڈالے' ان کا مفاد کیا تھا؟ اور تب قادیانی جماعت نے لاہور ریلوے سٹیشن پر ان کا 'پُر جوش' استقبال کیوں کیا؟ یہ بات اپنی جگہ ہے مگر حضرت علامہؒ کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ پنڈت جی کے جواب میں خاموشی اختیار کر لیتے۔ انھوں نے اپنی شدید علالت کے باوجود مندرجہ بالا طویل بیان جاری کیا' جو (تخمیناً) 19 جنوری 1936ء کو طبع ہوا، حالانکہ انھیں آرام کی ضرورت تھی اور اطباء نے دماغی محنت سے احتراز کی ہدایت کر رکھی تھی؛ (مکتوباتِ اقبال' ص 14-313 مرتبہ سیّد نذیر نیازی) علامہ مرحوم کو اس بیان اور اس کی اشاعت سے اس قدر دلچسپی تھی کہ احباب کو خط لکھ لکھ کر دریافت فرماتے رہے کہ ان تک پہنچا یا نہیں؟ (ایضاً ص 317) یورپ تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے اپنے اس مضمون کا ایک الگ ایڈیشن شائع کیا۔ (ایضاً)

Durant۔ 2 Story of Philosophy۔

3 Spinoza۔ 4 Amsterdam۔ 5 Gibbon۔

اے ہندیوں کی بت پرستی پہ طعن کرنے والے تو ان سے پرستش کا طریقہ سیکھ۔

قرونِ وسطیٰ میں Inquisition کے نام سے ایک محکمہ قائم ہوا تھا' جو لوگوں کے عقائدِ مذہبی کی تحقیق و تفتیش کرتا تھا۔ برونو وغیرہ ایسے علمائے سائنس کو اس محکمہ نے نذرِ آتش کیا۔ (حرفِ اقبال)

وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا. (سورۂ الحجرات' آیت:12)

Cardinal Newman۔ 9 Hurgroung۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اس کتاب کا باب اوّل' جزو 1،3 اور 4۔

جنگِ نوارینو 1799ء میں نہیں' 1827ء میں وقوع پذیر ہوئی تھی۔ حضرت علامہؒ نے سیّد نذیر نیازی کے نام اپنے ایک خط میں اس کی تصحیح بھی فرما دی تھی اور سیّد صاحب موصوف کو ہدایت کی تھی کہ وہ ان کے مضمون Islam and Ahmadism کا اردو ترجمہ کرتے ہوئے اس غلطی کو درست کر دیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو' مکتوباتِ اقبالؒ ص 322۔

12. اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ. (سورۃ النساء آیت:59)

13. یہاں حضرت علامہؒ کو سہو ہو گیا ہے۔ اجازت تنسیخ کی نہیں' التواء کی ہے۔ اس کا اندازہ سیّد سلیمان ندویؒ کے نام ان کے ایک خط سے بھی ہوتا ہے' جس میں حضرت علامہؒ سیّد موصوف کو ان کے ایک خط کی عبارت یاد دلاتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ایک خط میں آپ نے یہ لکھا ہے کہ اسلامی ریاست کے امیر کو اختیار ہے کہ جب اسے معلوم ہو کہ بعض شرعی اجازتوں میں فساد کا امکان ہے تو ان اجازتوں کو منسوخ کر دے عارضی طور پر یا مستقل طور پر' بلکہ بعض فرائض کو بھی منسوخ کر سکتا ہے۔ اس وقت آپ کا خط میرے سامنے نہیں ہے۔ حافظے سے لکھ رہا ہوں' کیا یہ بات صحیح ہے؟...... اسی خط کے حاشیہ میں سیّد سلیمان ندویؒ کے یہ الفاظ درج ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے حافظہ نے غلطی کی ہے۔ ملتوی کی جگہ منسوخ لکھ گئے ہیں' ملاحظہ ہو "مکاتیب اقبال" ج 1 ص 182 مرتبہ شیخ عطاء اللہ' ایم۔اے۔

14. مراد ہے سوئٹزرلینڈ کا ضابطۂ قانون۔ 15. Von Kremer۔

16. یہ اشارہ ہے اس عقیدے کی طرف کہ امام مہدی امام آخر الزماں ہیں۔ ایک ہزار برس سے زیادہ مدت ہوئی کہ وہ سامرا کے ایک غار میں رُوپوش ہو گئے۔ وہ زندہ ہیں گو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ مکتوباتِ اقبالؒ ص 317 مرتبہ سیّد نذیر نیازی۔

17. If Christ Came to Chicago 18. Mr Stead,۔

19. یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ ذَكَرٍ وَّ اُنۡثٰى وَجَعَلۡنٰكُمۡ شُعُوۡبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوۡا ؕ اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰٮكُمۡ ؕ (سورۃ الحجرات: آیت:13)

20. Sir Arther Keith۔

21. "حرف اقبالؒ" ص 129 تا 161 مرتبہ لطیف احمد شروانی' ایم۔اے۔

❁......❁......❁

علامہ محمد اقبالؒ

قادیانی اور جمہور مسلمان°

قادیانیوں اور جمہور مسلمانوں کی نزاع نے نہایت اہم سوال پیدا کیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے حال ہی میں اس کی اہمیت کو محسوس کرنا شروع کیا۔ میرا ارادہ تھا کہ انگریز قوم کو ایک کھلی چٹھی کے ذریعہ اس مسئلہ کے معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں سے آگاہ کروں۔ لیکن افسوس کہ صحت نے ساتھ نہ دیا۔ البتہ ایک ایسے معاملہ کے متعلق جو تمام ہندی مسلمانوں کی پوری قومی زندگی سے وابستہ ہے' میں نہایت مسرت سے کچھ عرض کروں گا۔ لیکن میں آغاز ہی میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی مذہبی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا اور نہ ہی میں قادیانی تحریک کے بانی[1] کا نفسیاتی تجزیہ کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی چیز عام مسلمانوں کے لیے کچھ دلچسپی نہیں رکھتی اور دوسری کے لیے ہندوستان میں ابھی وقت نہیں آیا۔

ہندوستان کی سرزمین پر بے شمار مذاہب بستے ہیں۔ اسلام دینی حیثیت سے ان تمام مذاہب کی نسبت زیادہ گہرا ہے کیونکہ ان مذاہب کی بناء کچھ حد تک مذہبی ہے اور ایک حد تک نسلی' اسلام نسلی تخیل کی سراسر نفی کرتا ہے اور اپنی بنیاد محض مذہبی تخیل پر رکھتا ہے اور چونکہ اس کی بنیاد صرف دینی ہے اس لیے وہ سراپا روحانیت ہے اور خونی رشتوں سے کہیں زیادہ لطیف بھی ہے۔ اسی لیے مسلمان اُن تحریکوں کے معاملہ میں زیادہ حساس ہے جو اس کی وحدت کے لیے خطرناک ہیں۔ چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بناء نئی نبوت پر رکھے اور بزعمِ خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے' مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لیے خطرہ تصور کرے گا اور یہ اس لیے کہ اسلامی وحدت ختمِ نبوت سے ہی استوار ہوتی ہے۔

انسانیت کی تمدنی تاریخ میں غالباً ختمِ نبوت کا تخیل سب سے انوکھا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ مغربی اور وسط ایشیا کے موبدانہ تمدن کی تاریخ کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ موبدانہ تمدن میں زرتشتی' یہودی' نصرانی اور صابی تمام مذاہب شامل ہیں۔ ان تمام مذاہب میں نبوت کے اجزاء کا تخیل نہایت لازم تھا' چنانچہ ان پر مستقل انتظار کی کیفیت رہتی تھی۔ غالباً یہ حالتِ انتظار نفسیاتی حظ کا باعث تھی۔

عہد جدید کا انسان روحانی طور پر موبد سے بہت زیادہ آزاد منش ہے۔ موبدانہ رویہ کا نتیجہ یہ تھا کہ پرانی جماعتیں ختم ہوتیں اور ان کی جگہ مذہبی عیار نئی جماعتیں لا کھڑی کرتے۔ اسلام کی جدید دنیا میں جاہل اور جوشیلے مُلّا نے پریس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے قبل اسلامی نظریات کو بیسویں صدی میں رائج کرنا چاہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اسلام جو تمام جماعتوں کو ایک رسی میں پرونے کا دعویٰ رکھتا ہے ایسی تحریک کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھ سکتا جو اس کی موجودہ وحدت کے لیے خطرہ ہو اور مستقبل میں انسانی سوسائٹی کے لیے مزید افتراق کا باعث بنے۔

اس سے قبل اسلامی موبدیت نے حال ہی میں جن دو صورتوں میں جنم لیا ہے میرے نزدیک ان میں بہائیت' قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے لیکن موخر الذکر اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے۔ لیکن باطنی طور پر اسلام کی روح اور مقاصد کے لیے مہلک ہے۔ اس کا حاسد خدا کا تصور کہ جس کے پاس دشمنوں کے لیے لاتعداد زلزلے اور بیماریاں ہوں' اس کا نبی کے متعلق نجومی کا تخیل اور اس کا روحِ مسیح کے تسلسل کا عقیدہ وغیرہ' یہ تمام چیزیں اپنے اندر یہودیت کے اتنے عناصر رکھتی ہیں گویا یہ تحریک ہی یہودیت کی طرف رجوع ہے۔ روحِ مسیح کا تسلسل یہودی باطنیت کا جزو ہے۔ یولی مسیح بال شیم (Beal Shem) کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر بوبر (Buber) کہتا ہے کہ مسیح کی رُوح پیغمبروں اور صالح آدمیوں کے واسطے سے زمین پر اُتری' اسلامی ایران میں موبدانہ اثر کے ماتحت مُلحدانہ تحریکیں اٹھیں اور انھوں نے بروز' حلول اور ظل وغیرہ اصطلاحات وضع کیں تاکہ تناسخ کے اس تصور کو چھپا سکیں۔ ان اصطلاحات کا وضع کرنا اس لیے لازم تھا کہ وہ مسلم قلوب کو ناگوار نہ گزریں' حتیٰ کہ مسیحِ موعود کی اصطلاح بھی اسلامی نہیں' بلکہ اجنبی ہے اور اس کا آغاز بھی اسی موبدانہ تصور میں ملتا ہے۔ یہ اصطلاح ہمیں اسلام کے دورِ اوّل کی تاریخ اور مذہبی ادب میں نہیں ملتی۔ اس حیرت انگیز واقعہ کو پروفیسر ونسنک (Wensinck) نے اپنی کتاب موسومہ ''احادیث میں ربط'' میں نمایاں کیا ہے۔ یہ کتاب احادیث کے گیارہ مجموعوں اور اسلام کے تین اوّلین تاریخی شواہد پر حاوی ہے اور یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ اسلاف نے اس اصطلاح کو کیوں استعمال نہیں کیا؟ یہ اصطلاح انھیں غالباً اس لیے ناگوار تھی کہ اِس سے تاریخی عمل کا غلط نظریہ قائم ہوتا تھا۔ خاکی ذہن وقت کو مدور حرکت تصور کرتا تھا۔ صحیح تاریخی عمل کو بحیثیت ایک تخلیقی حرکت کے ظاہر کرنے کی سعادت عظیم مسلمان مفکر اور مورخ یعنی ابن خلدون کے حصہ میں تھی۔

ہندی مسلمانوں نے قادیانی تحریک کے خلاف جس شدت احساس کا ثبوت دیا ہے، وہ جدید اجتماعیات کے طالب علم پر واضح ہے۔ عام مسلمان جسے پچھلے دن 'سول اینڈ ملٹری گزٹ' میں ایک

صاحب نے ''مُلا زدہ'' کا خطاب دیا تھا' اس تحریک کے مقابلہ میں حفظِ نفس کا ثبوت دے رہا ہے، اگرچہ اسے ختم نبوت کے عقیدہ کی پوری سمجھ نہیں۔ نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ختم نبوت کے تمدنی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا اور مغربیت کی ہوا نے انھیں حفظِ نفس کے جذبہ سے بھی عاری کر دیا ہے۔ بعض ایسے ہی نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کو رواداری کا مشورہ دیا ہے۔ اگر سر ہربرٹ ایمرسن [3] مسلمانوں کو رواداری کا مشورہ دیں تو میں انھیں معذور سمجھتا ہوں کیونکہ موجودہ زمانے کے فرنگی کے لیے جس نے بالکل مختلف تمدن میں پرورش پائی ہو' اس کے لیے اتنی گہری نظر پیدا کرنی دشوار ہے کہ وہ ایک مختلف تمدن رکھنے والی جماعت کے اہم مسائل کو سمجھ سکے۔

ہندوستان میں حالات بہت غیر معمولی ہیں۔ اس ملک کی بے شمار مذہبی جماعتوں کی بقاء اپنے استحکام کے ساتھ وابستہ ہے کیونکہ جو مغربی قوم یہاں حکمران ہے' اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ مذہب کے معاملہ میں عدم مداخلت سے کام لے۔ اس پالیسی نے ہندوستان ایسے ملک پر بدقسمتی سے بہت بُرا اثر ڈالا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ مبالغہ نہ ہوگا کہ مسلم جماعت کا استحکام اس سے کہیں کم ہے جتنا حضرت مسیحؑ کے زمانہ میں یہودی جماعت کا رومن کے ماتحت تھا۔ ہندوستان میں کوئی مذہبی سٹے باز اپنی اغراض کی خاطر ایک نئی جماعت کھڑی کر سکتا ہے اور یہ لبرل حکومت اصل جماعت کی وحدت کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتی بشرطیکہ یہ مدعی اسے اپنی اطاعت اور وفاداری کا یقین دلا دے اور اس کے پیرو حکومت کے محصول ادا کرتے رہیں۔ اسلام کے حق میں اس پالیسی کا مطلب ہمارے شاعرِ عظیم اکبر نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا' جب اس نے اپنے مزاحیہ انداز میں کہا۔

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ

انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

میں قدامت پسند ہندوؤں کے اس مطالبہ کے لیے پوری ہمدردی رکھتا ہوں جو انھوں نے نئے دستور میں مذہبی مصلحین کے خلاف پیش کیا ہے۔ [4] یقیناً یہ مطالبہ مسلمانوں کی طرف سے پہلے پیش ہونا چاہیے تھا' جو ہندوؤں کے برعکس اپنے اجتماعی نظام میں نسلی تخیل کو دخل نہیں دیتے۔

حکومت کو موجودہ صورتِ حال پر غور کرنا چاہیے اور اس معاملہ میں جو قومی وحدت کے لیے اشد اہم ہے' عام مسلمانوں کی ذہنیت کا اندازہ لگانا چاہیے۔ اگر کسی قوم کی وحدت خطرے میں ہو تو اس کے لیے اس کے سوا چارۂ کار نہیں رہتا کہ وہ معاندانہ قوتوں کے خلاف مدافعت کرے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدافعت کا کیا طریقہ ہے؟ اور وہ طریقہ یہی ہے کہ اصل جماعت جس شخص کو تَلَعُّبْ بِالدِّیْن کرتے پائے اس کے دعاوی کو تحریر و تقریر کے ذریعہ جھٹلایا جائے۔ پھر کیا یہ مناسب ہے کہ

اصل جماعت کو رواداری کی تلقین کی جائے حالانکہ اس کی وحدت خطرہ میں ہو اور باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو اگرچہ وہ تبلیغ اور دُشنام سے لبریز ہو۔[5]

اگر کوئی گروہ، جو اصل جماعت کے نقطہ نظر سے باغی ہے، حکومت کے لیے مفید ہے تو حکومت اس کی خدمات کا صلہ دینے کی پوری طرح مجاز ہے۔ دوسری جماعتوں کو اس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی لیکن یہ توقع رکھنی بیکار ہے کہ خود جماعت ایسی قوتوں کو نظر انداز کر دے جو اس کے اجتماعی وجود کے لیے خطرہ ہیں۔ اس مقام پر یہ دُہرانے کی غالباً ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کے بیشمار فرقوں کے مذہبی تنازعوں کا ان بنیادی مسائل پر کچھ اثر نہیں پڑتا جن مسائل پر سب فرقے متفق ہیں۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے پر الحاد کے فتوے ہی دیتے ہوں۔

ایک اور چیز بھی حکومت کی خاص توجہ کی محتاج ہے۔ ہندوستان میں مذہبی مدعیوں کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ مذہب سے بالعموم بیزار ہونے لگتے ہیں اور بالآخر مذہب کے اہم عنصر کو اپنی زندگی سے علیحدہ کر دیتے ہیں۔ ہندوستانی دماغ ایسی صورت میں مذہب کی جگہ کوئی اور بدل پیدا کرے گا، جس کی شکل روس کی دُہری مادیت سے ملتی جلتی ہوگی لیکن پنجابی مسلمانوں کی پریشانی کا باعث محض مذہبی سوال نہیں ہے، کچھ جھگڑے سیاسی بھی ہیں، جن کی طرف سر ہربرٹ ایمرسن نے انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے۔ یہ اگرچہ خالص سیاسی جھگڑے ہیں لیکن ان کی اہمیت بھی مذہبی سوال سے کسی طرح کم نہیں۔ جہاں مجھے حکومت کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ اسے پنجابی مسلمانوں کی وحدت کا احساس ہے، وہاں میں حکومت کو احتسابِ خویش کا مشورہ بھی دوں گا۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ شہری اور دیہاتی مسلمان کی تمیز کے لیے کون ذمہ دار ہے؟ جس کی بدولت مسلمان جماعت دو گروہوں میں تقسیم ہوگئی ہے اور دیہاتی حصہ خود بہت سے گروہوں میں بٹ گیا ہے، جو ہر دم آپس میں برسرِ پیکار رہتے ہیں؟

سر ہربرٹ ایمرسن پنجابی مسلمانوں کی صحیح قیادت کی عدم موجودگی کا گلہ کرتے ہیں۔ اے کاش! وہ سمجھ سکتے کہ حکومت کی اس شہری دیہاتی تمیز نے، جسے وہ خود غرض سیاسی حیلہ بازوں کے ذریعہ برقرار رکھتی ہے، جماعت کو ناقابل بنا دیا ہے کہ وہ صحیح رہنما پیدا کر سکے۔ میرے خیال میں اس حربہ کا استعمال ہی اس غرض سے کیا گیا ہے تا کہ کوئی صحیح رہنما پیدا نہ ہو سکے۔ سر ہربرٹ ایمرسن صحیح رہنما کی عدم موجودگی کا رونا روتے ہیں اور میں اس نظام کا رونا روتا ہوں، جس نے ایسے رہنما کی پیدائش کو ناممکن بنا دیا ہے۔[6]

ضمیمہ ٥٥

مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے بیان سے بعض حلقوں میں غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں اور یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ میں نے حکومت کو یہ دقیق مشورہ دیا ہے کہ وہ قادیانی تحریک کا بہ جبر انسداد کر دے۔ میرا یہ مدعا ہرگز نہ تھا۔ میں نے اس امر کی وضاحت کر دی تھی کہ مذہب میں عدم مداخلت کی پالیسی ہی ایک ایسا طریقہ ہے جسے ہندوستان کی موجودہ حکمران قوم اختیار کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی پالیسی ممکن ہی نہیں۔ البتہ مجھے یہ احساس ضرور ہے کہ یہ پالیسی مذہبی جماعتوں کے فوائد کے خلاف ہے، اگرچہ اس سے بچنے کی راہ کوئی نہیں۔ جنھیں خطرہ محسوس ہو انھیں خود اپنی حفاظت کرنی پڑے گی۔

میری رائے میں حکومت کے لیے بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کر لے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان ان سے ویسی رواداری سے کام لے گا' جیسے وہ باقی مذاہب کے معاملہ میں اختیار کرتا ہے۔[7]
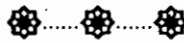
حواشی

(از قلم محترم نعیم آسی مرحوم)

٥ حضرت علامہ نے یہ بیان مئی 1935ء میں جاری کیا۔ آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے استعفاء کے بعد یہ بیان حضرت علامہ کی طرف سے قادیانیت کے خلاف کھلا ہوا اعلانِ جنگ تھا۔ یہی وہ بیان ہے جس نے ایوانِ قادیانیت کے در و بام کو ہلا کر رکھ دیا اور قادیانی جتھے پر پورے پنجاب میں بے بھاؤ کی پڑنے لگیں۔ اس بیان کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اس دور کے تقریباً تمام قابلِ ذکر انگریزی' اردو اخبارات نے اسے شائع کیا اور اکثر و بیشتر نے اس پر آرٹیکل لکھے (مکتوباتِ اقبال' ص 313 مرتبہ سیّد نذیر نیازی) خود حضرت علامہؒ اپنے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں (یہ بیان) قریباً تمام انگریزی اخباروں میں شائع ہوا۔ ایسٹرن ٹائمز' لاہور' ٹریبون' (لاہور) سٹیٹسمین (دہلی) سٹار آف انڈیا' کلکتہ علاوہ اس کے اردو اخباروں میں اس کا ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔ (مکتوباتِ اقبال' ص 272 مرتبہ سید نذیر نیازی شائع کردہ اقبال اکادمی' کراچی۔

1. مرزا غلام احمد قادیانی (1908---1839-40ء) سن پیدائش مرزا غلام احمد کی 30/16×20 سائز کی خود نوشت سوانح حیات کے ص 12 سے اخذ کیا گیا ہے۔
2. ایسا صرف اس لیے ہے کہ شکر چڑھا زہر (Sugar Coated Pills) مسلمان آسانی کے ساتھ نگل سکیں۔ یہ بالکل وہی تکنیک ہے جو بقول حضرت علامہ موبدانہ اثر کی بدولت ایران میں پیدا ہونے والی مُلحدانہ تحریکوں نے اختیار کی۔ انھوں نے بھی یہودیوں کے عقیدۂ تناسخ کو مشرف باسلام کرنے کے لیے اس کو بروز، حلول اور ظل وغیرہ کا نام دیا اور ان اصطلاحات کا وضع کرنا اس لیے لازم تھا کہ وہ مسلم قلوب کو ناگوار نہ گزریں۔
3. تب گورنر پنجاب۔
4. ہندوؤں کو بھی اپنی وحدت کی بقاء کے تحفظ کا مسئلہ درپیش تھا۔
5. قرائن سے معلوم ہوتا ہے اس مقام پر حضرت علامہ ان پابندیوں کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں جو اس وقت کی انگریزی حکومت نے قادیانیوں کی مخالفت کرنے پر مولانا ظفر علی خان، ان کے اخبار 'زمیندار' اور جماعتِ احرار پر عائد کر دی تھیں۔
6. 'حرفِ اقبال' ص 19-113 مرتبہ لطیف احمد شروانی' ایم۔اے۔

00 جب حضرت علامہؒ کا بیان ''قادیانی اور جمہور مسلمان'' اخبارات میں شائع ہوا تو بعض لوگ اس سے یہ سمجھے کہ شاید حضرت علامہ نے حکومت کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ قادیانی جماعت کو بہ جبر ختم کر دے' اس پر علامہ مرحوم نے مذکورہ وضاحت فرمائی۔

7. 'حرفِ اقبال' ص 119 'مرتبہ لطیف احمد شروانی' ایم۔اے۔

علامہ محمد اقبالؒ

سٹیٹسمین کے جواب میں ٥

میرے بیان مطبوعہ 14 مئی پر آپ نے تنقیدی اداریہ لکھا' اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔ جو سوال آپ نے اپنے مضمون میں اٹھایا ہے' وہ فی الواقعہ بہت اہم ہے اور مجھے مسرت ہے کہ آپ نے اس سوال کی اہمیت کو محسوس کیا ہے۔ میں نے اپنے بیان میں اسے نظر انداز کر دیا تھا کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ قادیانیوں کی تفریق کی پالیسی کے پیش نظر جو انھوں نے مذہبی اور معاشرتی معاملات میں ایک نئی نبوت کا اعلان کر کے اختیار کی ہے' خود حکومت کا فرض ہے کہ وہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی اقدام اٹھائے اور اس کا انتظار نہ کرے کہ مسلمان کب مطالبہ کرتے ہیں اور مجھے اس احساس میں حکومت کے سکھوں کے متعلق رویہ سے اور بھی تقویت ملی۔ سکھ 1919ء تک آئینی طور پر علیحدہ سیاسی جماعت تصور نہیں کیے جاتے تھے لیکن اس کے بعد علیحدہ جماعت تسلیم کر لیے گئے' حالانکہ انھوں نے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا بلکہ لاہور ہائی کورٹ نے فیصلہ کیا تھا کہ سکھ ہندو ہیں۔

اب چونکہ آپ نے یہ سوال پیدا کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں اس مسئلہ کے متعلق' جو برطانوی اور مسلم دونوں زاویہ نگاہ سے نہایت اہم ہے' چند معروضات پیش کروں۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں واضح کروں کہ حکومت جب کسی جماعت کے مذہبی اختلافات کو تسلیم کرتی ہے تو میں اسے کس حد تک گوارا کر سکتا ہوں۔ سو عرض ہے کہ:

اوّلاً اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں یعنی وحدتِ الوہیت پر ایمان' انبیاء پر ایمان اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم رسالت پر ایمان۔ دراصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے' جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے کہ فرد یا گروہ ملتِ اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں؟ مثلاً برہمو خدا پر یقین رکھتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں، لیکن انھیں ملتِ اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ قادیانیوں کی طرح وہ انبیاء کے ذریعہ وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت کو نہیں مانتے۔[1] جہاں تک

مجھے معلوم ہے کوئی اسلامی فرقہ اس حد فاصل کو عبور کرنے کی جسارت نہیں کر سکا۔ ایران میں بہائیوں نے ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلایا لیکن ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ الگ جماعت ہیں اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین کے خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کا مرہونِ منت ہے۔ میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں، یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں اور ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلا دیں یا پھر ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ قبول کر لیں۔ ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام میں ہو تاکہ انھیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔

ثانیاً ہمیں قادیانیوں کی حکمت عملی اور دُنیائے اسلام سے متعلق اُن کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بانی تحریک نے ملت اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے۔ اور اپنے مقلدین کو ملت اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں ان کا بنیادی اصولوں سے انکار، اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی)۔ مسلمانوں کی قیامِ نماز سے قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دنیائے اسلام کافر ہے، یہ تمام اُمور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے اس سے کہیں دور ہیں، جتنے سکھ ہندوؤں سے کیونکہ سکھ ہندوؤں سے باہمی شادیاں کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ ہندوؤں میں پوجا نہیں کرتے۔

ثالثاً اس امر کو سمجھنے کے لیے کسی خاص ذہانت یا غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں، پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل رہنے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟ علاوہ سرکاری ملازمتوں کے فوائد کے ان کی موجودہ آبادی جو 56000 (چھپن ہزار) ہے، انھیں کسی اسمبلی میں ایک نشست بھی نہیں دلا سکتی اور اس لیے انھیں سیاسی اقلیت کی حیثیت بھی نہیں مل سکتی۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ قادیانیوں نے اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت کا مطالبہ نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مجالسِ قانون ساز میں ان کی نمائندگی نہیں ہو سکتی۔ نئے دستور میں ایسی اقلیتوں کے تحفظ کا علیحدہ لحاظ رکھا گیا ہے لیکن میرے خیال میں قادیانی حکومت سے کبھی علیحدگی کا مطالبہ کرنے میں پہل نہیں کریں گے۔ ملتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے کیونکہ وہ ابھی اس قابل نہیں کہ چوتھی جماعت کی

حیثیت سے مسلمانوں کی برائے نام اکثریت کو ضرب پہنچا سکے۔

حکومت نے 1919ء میں سکھوں کی طرف سے علیحدگی کے مطالبہ کا انتظار نہ کیا' اب وہ قادیانیوں سے ایسے مطالبہ کے لیے کیوں انتظار کر رہی ہے؟2
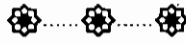
حواشی

(از قلم محترم نعیم آسی مرحوم)

o اخبار 'سٹیٹسمین' (دہلی) نے اپنی 14 مئی 1935ء کی اشاعت میں حضرت علامہ کا بیان 'قادیانی اور جمہور مسلمان' شائع کیا اور ساتھ ہی اس پر ایک تنقیدی اداریہ بھی لکھا۔ مذکورہ مضمون دراصل اسی اداریہ کا جواب ہے' جو 10 جون 1935ء کو اخبار مذکور میں طبع ہوا۔

1 قادیانی یہ استدلال کرتے ہیں کہ ہم تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم الانبیاء مانتے ہیں۔ ہم 'منکر' اور 'دائرہ اسلام سے خارج' کیسے ہوئے؟ مگر واقعہ یہ ہے کہ جب کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم الانبیاء مان کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی اور نئے نبی کی نبوت کو تسلیم کر لیا تو اس کا خاتم الانبیاء کا اقرار باطل ہو گیا۔ گویا دائرہ اسلام سے نکلنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار ضروری نہیں۔ کسی نئے نبی کا اقرار بھی آدمی کو اسلام کے دائرے سے باہر نکال دیتا ہے۔

2 'حرفِ اقبال' ص 126 تا 129 مرتبہ لطیف احمد شروانی' ایم۔اے۔
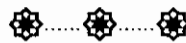
توضیحات

علامہ محمد اقبالؒ

''لائٹ'' کے جواب میں[1]

''لائٹ'' نے اپنے الزام کی بنیاد میرے اس شعر پر رکھی ہے۔

ہم کلامی ہے غیریت کی دلیل
خامشی پر مٹا ہوا ہوں میں

یہ سلیس اردو ہے، جس کا مطلب محض یہ ہے کہ انسان کی روحانی زندگی میں ہم کلامی سے آگے بھی ایک منزل ہے لیکن شعر کو وحی کے دینی معانی سے کچھ تعلق نہیں۔ اس سلسلہ میں ''لائٹ'' کی توجہ اپنی کتاب ''تشکیلِ نو'' کی طرف مبذول کراؤں گا، جہاں صفحہ 21 پر میں نے لکھا ہے کہ:

''احساس اور تخیل کے فطری رشتہ سے وحی کے متعلق اس اختلاف پر روشنی پڑتی ہے، جس نے مسلم مفکرین کو کافی پریشان کیا تھا۔ غیر واضح احساس اپنے ملجا کو تخیل کے اندر پاتا ہے اور خود تخیل لباسِ مجاز میں آنے کی سعی کرتا ہے۔ یہ محض استعارہ نہیں ہے کہ تخیل اور لفظ دونوں بیک وقت بطنِ احساس سے پیدا ہوتے ہیں، اگر چہ ادراک انھیں وجود میں لاکر خود اپنے لیے یہ دشواری پیدا کرتا ہے کہ انھیں ایک دوسرے سے مختلف قرار دے اور ایک معنی میں لفظ بھی الہام ہوتا ہے۔''[2]

(2)

''مدیر[3] ''لائٹ'' نے ایک ایسی حدیث کا حوالہ دیا ہے جو تاریخی عمل کی نہایت حسابی تصویر پیش کرتی ہے۔ میں اگر چہ انسان کے روحانی امکانات اور روحانی آدمیوں کی پیدائش کا قائل ہوں، تاہم مجھے یقین نہیں کہ اس تاریخی عمل کا حساب ویسے ہی لگایا جا سکتا ہے جیسے ''لائٹ'' کا خیال ہے۔ ہم آسانی اعتراف کر سکتے ہیں کہ تاریخی عمل کا شعور ہماری ذہنی سطح سے بہت بلند ہے۔ میں منفی رنگ میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس طرح مقرر اور حسابی نہیں ہے جیسے ''لائٹ'' نے سمجھا ہے۔ میں ابن خلدون کی رائے سے بہت حد تک متفق ہوں، جہاں وہ تاریخی عمل کو ایک آزاد تخلیقی تحریک تصور کرتا ہے، نہ کہ ایسا عمل جو پہلے

سے متعین کیا جا چکا ہو۔ موجودہ دور میں برگساں نے اسی نظریہ کو زیادہ صحت اور عمدہ مثالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ "لائٹ" نے جس حدیث کا حوالہ دیا ہے وہ غالباً جلال الدین سیوطی نے مشہور کی تھی اور اسے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ بخاری و مسلم میں اس حدیث کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ اس میں چند بزرگوں کے تاریخی عمل کے نظریہ کی جھلک ہو تو ہو، لیکن افراد کے ایسے رؤیا کوئی دلیل نہیں بن سکتے۔ تمام محدثین نے اسی اصول کی پیروی کی ہے۔"[4]

سن رائز کے جواب میں[5]

"مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس نہ وہ تقریر اصل انگریزی میں محفوظ ہے اور نہ اس کا اردو ترجمہ جو مولانا ظفر علی خاں نے کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ تقریر میں نے 1911ء یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے رُبع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ اس تقریر سے بہت پہلے مولوی چراغ مرحوم نے، جو مسلمانوں میں کافی سربرآوردہ تھے اور انگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے، بانیِ تحریک کے ساتھ تعاون کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کتاب موسومہ 'براہین احمدیہ' میں انھوں نے بیش قیمت مدد بہم پہنچائی لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہئیں۔ تحریک کے دو گروہوں کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانیِ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے، معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی۔ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا، جب ایک نئی نبوت ...... بانیِ اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت ...... کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی، جب میں نے تحریک کے ایک رُکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔"[6]

(2)

"اس سوال [7] کا جواب "تشکیلِ نو" کے حوالہ سے بہتر دیا جا سکے گا، جہاں صفحہ 121-120 پر

میں نے لکھا ہے:

''ختم نبوت سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ زندگی کی انتہا بس یہ ہو کہ عقل' جذبات کی قائم مقام ہو جائے۔ یہ چیز نہ ممکن ہے نہ مستحسن۔ اس عقیدہ کی عقلی افادیت اتنی ہے کہ اس سے باطنی واردات کو آزاد تنقیدی رنگ ملتا ہے کیونکہ اس یقین سے یہ لازم آتا ہے کہ انسانی تاریخ میں فوق الفطرت سرچشمہ کا منصب ختم ہو چکا۔ یہ یقین ایک نفسیاتی قوت ہے' جو ایسے منصب کی پیدائش کو روکتا ہے اور اس خیال سے انسان کے اندرونی تجربات میں علم کی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے۔ جیسے 'لا الٰہ' فطرت کی تمام قوتوں سے الوہیت کا لباس اتارتا ہے اور انسان کے بیرونی تجربات میں تنقیدی مشاہدہ کی رُوح پیدا کرتا ہے۔ باطنی واردات خواہ وہ کتنی غیر فطری اور غیر معمولی ہو' مسلمان کے لیے بالکل فطری تجربہ ہے جو دوسرے تجربات کی طرح تنقید کی زَد میں آتا ہے اور یہ چیز رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رویہ سے اور بھی روشن ہو جاتی ہے جو انھوں نے ابن صیاد [8] کی نفسیاتی واردات کے لیے اختیار فرمایا۔ اسلام میں تصوف کا مقصد انہی باطنی واردات کو منظم کرنے کا ہے۔ اگرچہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ابن خلدون ہی ایک ایسا شخص گزرا ہے' جس نے اسے اصولی طریقے پر جانچا۔

پہلے فقرہ سے صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ نفسیاتی معانی میں اولیاء یا ان جیسی صفات کے لوگ ہمیشہ ظاہر ہوتے رہیں گے۔ یہ ایک الگ سوال ہے کہ مرزا صاحب بھی اس زُمرہ میں شامل ہیں یا نہیں؟ جب تک عالم انسانیت کی روحانی اہلیتیں برداشت کر سکتی ہیں' ایسے لوگ تمام قوموں اور ملکوں میں پیدا ہوں گے تاکہ وہ انسانی زندگی کی بہتر اقدار کا پتہ دے سکیں۔ اس کے خلاف قیاس کرنا تو انسانی تجربہ کو جھٹلانا ہو گا۔ فرق محض اس قدر ہے کہ اب ہر شخص کو حق پہنچتا ہے کہ وہ ان باطنی واردات پر تنقیدی نظر ڈال سکے۔ اور باتوں کے علاوہ ختم نبوت کا مطلب یہ ہے کہ روحانی زندگی میں جس کے انکار کی سزا جہنم ہے' ذاتی سند ختم ہو چکی ہے۔'' [9]

مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نام [10]

''مولانا حسین احمد یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریۂ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں انکارِ خاتمیت کا۔ نظریۂ وطنیت کے حامی بالفاظ دیگر یہ کہتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کے لیے ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی حیثیت کے علاوہ جس

کو قانونِ الٰہی ابدالا باد تک متعین و متشکل کر چکا ہے کوئی اور حیثیت بھی اختیار کرے' جس طرح قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوتِ محمدیہ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار کی راہ کھولنا ہے۔ بظاہر نظریۂ وطنیت سیاسی نظریہ ہے اور قادیانی انکارِ خاتمیت الٰہیات کا ایک مسئلہ ہے لیکن ان دونوں میں ایک گہرا معنوی تعلق ہے' جس کی توضیح اس وقت ہو سکے گی جب کوئی دقیق النظر مسلمان مورخ ہندی مسلمانوں اور بالخصوص ان کے بعض بظاہر مستعد فرقوں کے دینی افکار کی تاریخ مرتب کرے گا۔''[11]

دین شا کے جواب میں[12]

''مجھے اس کے متعلق کچھ عرض نہیں کرنا ہے' سوائے اس کے کہ مجھے ان کے مرکزی خیال سے پورا اتفاق ہے۔ یعنی اسلام کی ظاہری اور باطنی تاریخ میں ایرانی عنصر کو بہت زیادہ دخل حاصل ہے۔ یہ ایرانی اثر اس قدر غالب رہا ہے کہ سپنگلر Spengler نے اسلام پر موبدانہ رنگ دیکھ کر اسلام کو ہی ایک موبد مذہب سمجھ لیا تھا۔ میں نے اپنی کتاب ''تشکیلِ نو'' میں کوشش کی ہے کہ اسلام پر سے اس موبدانہ خول کو دُور کر دوں اور مجھے امید ہے کہ اسی سلسلے میں میں اپنی کتاب ''قرآنی تعلیم کا مقدمہ'' میں مزید کام کر سکوں گا۔ موبدانہ تخیل اور مذہبی تجربہ مسلمانوں کی دینیات' فلسفہ' اور تصوف کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ بہت سا مواد ایسا موجود ہے' جس سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ تصوف کے چند سکولوں نے جو اسلامی سمجھے جاتے ہیں' اس موبدانہ حالات و واردات کو ہی زندہ کیا ہے۔ میں موبد تمدن کو انسانی تمدن کے بے شمار مظاہرات میں سے ایک مظاہر سمجھتا ہوں۔ میں نے اس لفظ کو برے معنی میں استعمال نہیں کیا تھا۔ اس کے پاس بھی حکومت کا تصور تھا' فلسفیانہ مباحث تھے' حقائق بھی تھے اور غلطیاں بھی۔ لیکن جب تمدن پر زوال آتا ہے تو اس کے فلسفیانہ مباحث' تصورات اور دینی واردات کی اشکال میں انجماد اور سکون آ جاتا ہے۔ جب اسلام کا ظہور ہوا تو موبد تمدن پر یہی حالت طاری تھی اور تمدنی تاریخ کو جس طرح میں سمجھتا ہوں' اسلام نے اس تمدن کے خلاف احتجاج کیا۔ خود قرآن کے اندر شہادت موجود ہے کہ اسلام نہ محض ذہنی بلکہ مذہبی واردات کے لیے بھی نئی راہ پیدا کرنی چاہتا تھا لیکن ہماری مغانہ وراثت نے اسلام کی زندگی کو کچل ڈالا اور اس کی اصل رُوح اور مقاصد کو ابھرنے کا موقع نہ دیا۔''[13]

❁ ❁ ❁

حواشی

(از قلم محترم نعیم آسی مرحوم)

1. حضرت علامہؒ کے بیان ''قادیانی اور جمہور مسلمان'' پر تنقید کرتے ہوئے ایک قادیانی ہفتگی ''لائٹ'' Light لاہور نے لکھا کہ ''اور بہت سے بڑے مفکروں کی مانند ڈاکٹر اقبال بھی الہام پر یقین نہیں رکھتے' اس اتہام کے متعلق جب ایک پریس کے نمائندہ نے حضرت علامہؒ سے سوال کیا تو آپ نے مذکورہ وضاحت فرمائی۔ (حرف اقبال ص120)
2. ''حرف اقبالؒ ''ص120 مرتبہ لطیف احمد شروانی' ایم۔اے۔
3. جب حضرت علامہؒ سے اس حدیث کے متعلق استفسار کیا گیا جس کا ''لائٹ'' نے حوالہ دیا تھا اور جس میں ہر صدی کے آغاز میں ایک مجدد کے آنے کی خبر دئی گئی ہے تو آپ نے مندرجہ بالا جواب ارشاد فرمایا۔
4. ''حرف اقبال''ص 121 مرتبہ لطیف احمد شروانی' ایم۔اے۔
5. جب حضرت علامہؒ کی توجہ ایک دوسرے قادیانی ہفت نامے ''سن رائز'' Sun Rise لاہور کے ایک خط کی طرف مبذول کرائی گئی جس میں علامہ مرحوم کی ایک 11-1910ء کی تقریر کا حوالہ دے کر ان پر ''تناقضِ خوذ'' (Inconsistency) کا الزام لگایا گیا تھا' تو آپ نے مذکورہ توضیح وتصریح فرمائی۔ (حرف اقبالؒ ص122)
6. حرف اقبالؒ ص122 مرتبہ لطیف احمد شروانی' ایم۔اے۔
7. سوال یہ تھا: الہام اور مصلحین کے آنے کے امکانات کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟
8. حرف اقبالؒ میں ابن سید ترجمہ کیا گیا ہے' جو صحیح نہیں۔
9. حرف اقبالؒ ص123 مرتبہ لطیف احمد شروانی' ایم۔اے۔
10. حضرت علامہؒ کی زندگی کے آخری دنوں میں ان کے اور مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کے مابین اسلام اور وطنیت کے موضوع پر ایک غلط فہمی کے باعث زبردست بحث چھڑ گئی تھی' جس کا اختتام حضرت علامہؒ کے اس خط پر ہوا جو انھوں نے ایڈیٹر' احسان لاہور کو لکھا۔ یہ خط اس بحث سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس بحث کے دوران حضرت علامہؒ کا ایک طویل جوابی مضمون روزنامہ ''احسان'' لاہور میں شائع ہوا۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے نام اقتباس اسی مضمون سے ماخوذ ہے۔

11. حرفِ اقبال ص 40-239 مرتبہ لطیف احمد شروانی' ایم۔اے۔
12. جب ایک پارسی مسٹر دین شا کے ایک خط کے متعلق جو "سٹیٹسمین" دہلی میں شائع ہوا' حضرت علامہؒ سے پوچھا گیا تو آپ نے مذکورہ جواب دیا۔
13. حرفِ اقبالؒ ص 124 مرتبہ لطیف احمد شروانی' ایم۔اے۔

خطوط

پنڈت جواہر لال نہرو کے نام خط

21 جون 1936ء

ڈیئر پنڈت جواہر لال!

کل آپ کا مرسلہ خط ملا' جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ میں نے جب آپ کے تحریر کردہ مضامین کا جواب لکھا تو میرا گمان تھا کہ آپ کو احمدیوں کے سیاسی رویہ کا علم نہیں۔ میرے ان جوابات کے لکھنے کی بنیادی وجہ فی الحقیقت اس بات کو ظاہر کرنا اور خاص طور سے آپ پر یہ واضح کرنا تھا کہ مسلمانوں کے اندر جذباتِ وفاداری کیسے پیدا ہوئے اور یہ کہ احمدیت نے ان کے لیے الہامی بنیاد کس طرح فراہم کی؟ ان مضامین کی اشاعت کے بعد میرے لیے یہ انکشاف انتہائی حیران کن تھا کہ خود مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ بھی ان تاریخی وجوہات سے ناواقف ہے' جنھوں نے احمدی تعلیمات کو تشکیل کیا۔ علاوہ ازیں پنجاب اور دوسرے علاقوں میں بسنے والے آپ کے ساتھی بھی آپ کے ان مضامین کے باعث بے چینی محسوس کرتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں آپ کی ہمدردیاں احمدیہ تحریک کے ساتھ تھیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ آپ کے ان مضامین سے احمدی از حد خوشی محسوس کرتے تھے (اور) احمدی پریس خاص طور پر آپ کے خلاف اس غلط فہمی کو پھیلانے کا موجب تھا۔ بہر حال مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میری آپ کے متعلق رائے غلط تھی۔ میں بذاتِ خود مذہبی معاملات میں نہیں الجھتا مگر احمدیوں سے خود اُنہی کے میدان میں مقابلہ کرنے کی خاطر مجھے اس بحث میں حصہ لینا پڑا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان مضامین کو لکھتے وقت ہندوستان اور اسلام کی بہتری میرے پیش نظر تھی اور میں اپنے ذہن میں اس امر کے متعلق کوئی شبہ نہیں پاتا کہ احمدی اسلام اور ہندوستان کے غدار ہیں۔[1]

مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں نے لاہور میں آپ سے ملنے کا موقع گنوا دیا۔[2] میں ان دنوں اتنا بیمار تھا کہ اپنے کمرہ سے باہر نہ نکل سکتا تھا۔ میں اپنی بیماری کے باعث تقریباً ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہوں۔ آئندہ آپ جب لاہور آئیں تو مجھے اپنی آمد سے ضرور مطلع کریں۔ کیا آپ کو میرا شہری آزادی کے متعلق خط مل گیا ہے؟ چونکہ آپ نے اپنے خط میں اس کے ملنے کی اطلاع نہیں دی اس

لیے مجھے خدشہ ہے کہ وہ خط آپ تک پہنچ نہیں پایا۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال

حواشی

(تمام حواشی محترم نعیم آسی مرحوم کے قلم سے ہیں)

o یہ تاریخی خط جیسا کہ اس کی تاریخ سے ظاہر ہے، 21 جون 1936ء کو پنڈت جواہر لال نہرو کے نام لکھا گیا۔ اس خط میں حضرت علامہؒ نے ''اسلام اور احمدیت'' کے عنوان سے پنڈت جی کے جواب میں لکھے گئے اپنے ایک مضمون کے مقاصدِ تحریر کو واضح کیا ہے۔ اصل خط حضرت علامہؒ نے انگریزی زبان میں لکھا تھا۔

1 حضرت علامہؒ کا اصل خط چونکہ انگریزی میں ہے اس لیے ہم اس مقام پر ان کی انگریزی عبارت بھی نقل کیے دیتے ہیں تا کہ قارئین حضرت علامہؒ کے مافی الضمیر کا صحیح صحیح اندازہ کر سکیں۔

I have no doubt in my mind that the Ahmadis are traitors both to Islam and to India (Thoughts and Reflections of Iqbal, Page 306. By Syed Abdul Vahid)

2 حضرت علامہؒ ان دنوں سخت بیمار تھے اور اسی سبب سے پنڈت جی سے ملاقات نہ کر سکے تھے، جو ان دنوں اتفاق سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ یہ وہی موقع ہے جب قادیانیوں نے لاہور ریلوے سٹیشن پر پنڈت جواہر لال نہرو کا شاندار استقبال کیا اور ''جواہر لال زندہ باد'' ''محبوبِ قوم خوش آمدید'' کے نعرے لگائے۔ (بحوالہ الفضل، قادیان مورخہ 31 مئی 1936ء)
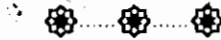
مولانا سیّد سلیمان ندویؒ کے نام خطوط

°(1)

لاہور

20اپریل1922ء

مخدومی السلام علیکم!

ایک عرصہ سے آپ کو خط لکھنے کا قصد کر رہا تھا۔ دو باتیں دریافت طلب ہیں۔

1- متکلمین میں سے بعض نے علم مناظر و مرایا کے رُو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدا تعالیٰ کی رویت ممکن ہے۔ یہ بحث کہاں ملے گی؟ میں اس مضمون کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

2- مرزا غالب کے اس شعر کا مفہوم آپ کے نزدیک کیا ہے۔

ہر کُجا ہنگامۂ عالم بود
رحمتہ للعالمینے ہم بود

حال کے ہیئت دان کہتے ہیں کہ بعض سیاروں میں انسان یا انسانوں سے اعلیٰ تر مخلوق کی آبادی ممکن ہے۔ اگر ایسا ہو تو رحمتہ للعالمین کا ظہور وہاں بھی ضروری ہے۔[1] اس صورت میں کم از کم محمدیت کے لیے تناسخ یا بروز لازم آتا ہے۔ شیخِ اشراق تناسخ کے ایک شکل میں قائل تھے' ان کے اس عقیدہ کی وجہ یہی تو نہ تھی؟[2] میں نقرس کی وجہ سے دو ماہ کے قریب صاحبِ فراش رہا۔ اب کچھ افاقہ ہوا ہے۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔[3]

والسلام

مخلص

محمد اقبال

❀……❀……❀

حواشی

0 حضرت علامہؒ کے ان خطوط کا پس منظر 'سخنہائے گفتنی' میں صفحہ نمبر 21 پر گزر چکا ہے۔

1 اس معنی کا ایک اثر بھی تفسیروں میں مروی ہے جو اثر ابن عباسؓ کے نام سے ہے۔ اس اثر کی تاویل وتشریح میں مولانا محمد قاسم صاحب کا رسالہ ''تحذیر الناس فی اثر ابن عباسؓ'' اور مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کا ایک مضمون ہے جو اس بحث میں دیکھنے کے قابل ہے۔ (ندوی)

2 یہ وجہ نہیں۔ شیخِ اشراق ایرانی فلسفہ سے متاثر تھے اور وہاں سے یہ خیال ان تک پہنچا تھا' دیکھئے شرح کلمۃ الاشراق' مقالہ خامسہ۔

3 مکاتیبِ اقبال' ج 1 ص 116 مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم۔اے۔

(2)

لاہور

6 ستمبر 1934ء

مخدومی مولانا' السلام علیکم!

یہ خط اعظم گڑھ کے پتہ پر لکھتا ہوں۔ معلوم نہیں کہ آپ ابھی علی گڑھ ہی میں ہیں یا وہاں سے واپس آ گئے۔ راغب اصفہانی نے ''مفردات'' میں لفظ نبی کی تشریح میں لکھا ہے کہ لفظ نبی کے دو معنی ہیں۔ خبر دینے والا اور بلند مقام پر کھڑا ہونے والا۔ اوّل الذکر نبی ہمزہ کے ساتھ اور دوسرا بغیر ہمزہ کے' اس ضمن میں راغب نے ایک حدیث بھی نقل کی ہے۔ یعنی حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نبی بغیر ہمزہ کے ہوں۔ یہ حدیث صحاحِ ستہ میں ہے یا نہیں؟ [1]

قرآن شریف میں جن انبیاء کا ذکر ہے ان میں سے کون سے نبی باہمزہ ہیں اور کون سے بغیر ہمزہ؟ یا سب بغیر ہمزہ ہیں؟ [2]

.... یہ سوال بڑا اہم ہے کیونکہ اگر قرآنی انبیاء یا حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی بغیر ہمزہ ہیں تو لفظ نبی کا انگریزی ترجمہ **Prophet** جس کے معنی خبر دینے والا کے ہیں کیونکر درست ہو سکتا ہے؟ امید کہ آپ کا مزاج بخیر وعافیت ہوگا..........! [3]

والسلام

مخلص

محمد اقبال

حواشی

1۔ یہ حدیث صحاح میں نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس لیے نبی کہنے سے منع فرمایا کہ لغت کی رو سے منصب ارنبوت کے لیے نبیٔ لفظ ہے نبیء نہیں۔ (ندوی)

2۔ یقیناً سب کے سب نبی بلا ہمزہ کے ہیں۔ (ندوی)

3۔ مکاتیب اقبال ص 186 شیخ عطاء اللہ' ایم۔اے۔

(3)
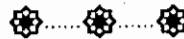
بھوپال شیش محل
یکم اگست 1935ء

مخدوم مکرم جناب مولانا!

السلام علیکم!

آپ کا والا نامہ مجھے ابھی ملا ہے' جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ چند امور اور بھی دریافت طلب ہیں' ان کے جواب سے بھی ممنون فرمائیے۔[1]

1- تکملہ مجمع البحار' صفحہ 85 میں حضرت عائشہؓ کا ایک قول نقل کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین کہو' لیکن یہ نہ کہو کہ ان کے بعد کوئی اور نبی نہیں ہوگا۔[2]

مُہربانی کر کے کتاب دیکھ کر یہ فرمائیے کہ آیا اس قول کے اسناد درج ہیں اور اگر ہیں تو آپ کے نزدیک ان اسناد کی حقیقت کیا ہے؟

ایسا ہی قول ''درمنثور'' جلد پنجم صفحہ 204 میں ہے' اس کی تصدیق کی بھی ضرورت ہے۔[3] میں نے یہاں بھوپال میں یہ کتب تلاش کیں، افسوس اب تک نہیں ملیں۔

2- ''حجج الکرامہ'' صفحہ 427-431 حضرت مسیح علیہ السلام کے دوبارہ آنے کے متعلق ارشاد ہے۔ مَنْ قَالَ بِسَبَبِ نَبُوَّتِہٖ کَفَرَ حَقًّا اس قول کی آپ کے نزدیک کیا حقیقت ہے؟[4]

3- لَوْعَاشَ اِبْرٰھِیْمُ لَکَانَ نَبِیًّا اس حدیث کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ نووی اسے معتبر نہیں جانتا۔ ملا علی قاری کے نزدیک معتبر ہے۔ کیا اس کے اسناد درست ہیں؟[5]

4- بخاری کی حدیث وَاِمَامُکُمْ مِنْکُمْ میں واو حالیہ ہے کیا؟[6] اگر حالیہ ہو تو اس حدیث کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ مسیحؑ کے دوبارہ آنے سے مسلمانوں کو کوئی تعلق نہیں کیونکہ جس وقت وہ آئیں گے مسلمانوں کا امام خود مسلمانوں میں سے ہوگا۔

5- ختم نبوت کے متعلق اور بھی اگر کوئی بات آپ کے ذہن میں ہو تو اس سے آگاہ فرمائیے۔

زیادہ کیا عرض کروں، امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

والسلام

مخلص

محمد اقبال[7]

حواشی

1. اس وقت وہ (علامہ مرحوم) ردِّ قادیانی پر اپنا مضمون تیار کر رہے تھے۔ (ندوی)
2. جی ہاں! اس کتاب میں یہ روایت ہے، جو مصنف ابن ابی شیبہ سے لی گئی ہے لیکن اس کی سند مذکور نہیں جو روایت کی صحت وسنف کا پتہ لگایا جائے اور اگر صحیح ہو بھی تو یہ حضرت عائشہؓ کی محض رائے ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بار بار خود فرمایا ہے لا نبی بعدی میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ حضرت عائشہؓ نے اپنے خیال میں اس لیے ایسا کہنے سے منع کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کا انکار اس سے لوگ نہ سمجھنے لگیں۔ بہر حال یہ ان کا خیال ہے جس کا صحیح ہونا ضروری نہیں، خصوصاً ایسی صورت میں جب خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قول کے خلاف ہو۔ (ندوی)
3. جی ہاں وہی روایت، بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ اس کتاب میں بھی ہے اور اس کی نسبت پہلے لکھ چکا ہوں۔ (ندوی)
4. حجج الکرامہ فی آثار القیامہ، نواب صدیق حسن خاں کی کتاب ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آمد ثانی بصفت نبوت ہوگی یا بلا صفت نبوت۔ اس باب میں علماء کا اختلاف ہے۔ نواب صاحب کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ بصفت نبوت ہوگی اس لیے وہ لکھتے ہیں کہ جو لوگ ان کی آمد ثانی میں ان کی صفت نبوت کا انکار کرتے ہیں وہ مرتکب کلمہ کفر ہیں۔ بہر حال یہ رائے ہے۔ (ندوی)
5. یہ ابن ماجہ کی روایت ہے۔ اس روایت کو بعض محققین نے موضوعات میں شمار کیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فرضا ہے واقعہ نہیں کیونکہ لو فرض اور عدم وقوع کے لیے آتا ہے، اسی سے معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ اس لیے ابراہیم بن محمد کو بچپن ہی میں اٹھا لیا گیا۔ چنانچہ دوسری روایتوں میں یہی مذکور ہے۔ چنانچہ خود ابن ماجہ میں اور بخاری میں ہے۔ وَلَوْ قَضٰی اَنْ یَّکُوْنَ بَعْدَ

مُحَمَّدَ نَبِیٌّ لَعَاشَ اِبْنُہٗ وَلٰکِنْ لاَ نَبِیَّ بَعْدَہٗ (ابن ماجہ' جنائز' بخاری' انبیاء) یعنی یہ کہ اگر فیصلہ الٰہی یہ ہوتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہو تو آپ کے صاحبزادہ زندہ رہتے لیکن یہ فیصلہ الٰہی ہو چکا تھا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ ملا علی قاری نے اس کو موضوعات میں لیا ہے' اس کو معتبر نہیں کہا ہے' ضعیف کہا ہے۔ اس میں ابو شیبہ ابراہیم راوی ضعیف ہے' بلکہ وہ متروک الحدیث' منکر الحدیث' باطل گو اور دروغ گو تک کہا گیا ہے۔ اس کے بعد بشرط صحت ملا نے اس کی تاویل کی ہے۔ بہر حال اس حدیث کا وہی مطلب ہے جو اس حدیث کا ہے۔ لَوْ کَانَ بَعْدِیْ نَبِیًّا لَکَانَ عُمَرُ (مسند احمد' ترمذی) یعنی یہ کہ اگر میرے بعد نبی ہونا ممکن ہوتا تو عمر بن خطاب نبی ہوتے لیکن چونکہ ممکن نہیں اس لیے نہ وہ اور نہ کوئی اور نبی ہوسکتا ہے۔ (ندویؔ)

صحیح یہی ہے کہ واو حالیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ عیسائیوں پر حجت ہوں گے اور مسلمانوں کی تائید فرمائیں گے۔ مسلمانوں کا امام الگ ہوگا۔ حضرت عیسیٰؑ نہ ہوں گے۔ (ندویؔ)

مکاتیب اقبالؒ ج1 ص 191 تا 194 مرتبہ شیخ عطاء اللہ' ایم۔ اے۔

(4)

بھوپال
23اگست 1933ء°

مخدوم مکرم جناب مولانا!

السلام علیکم
ایک عریضہ لکھ چکا ہوں' امید کہ پہنچ کر ملاحظۂ عالی سے گزرا ہوگا۔ ایک بات دریافت طلب رہ گئی تھی جو اَب عرض کرتا ہوں۔

کیا علمائے اسلام میں کوئی ایسے بزرگ بھی گزرے ہیں جو حیات و نزولِ مسیح ابن مریم کے منکر ہوں؟ یا اگر حیات کے قائل ہوں تو نزول کے منکر ہوں؟ معتزلہ کا عام طور پر اس مسئلہ میں کیا مذہب ہے؟ [1] امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ میں 28 اگست کی شام کو رخصت ہو جاؤں گا۔ علاج کا کورس اس روز صبح ختم ہو جائے گا۔ اس خط کا جواب لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیے۔

والسلام
مخلص
محمد اقبال[2]

حواشی

(محترم نعیم آسی مرحوم کے قلم سے)

o کتاب میں سنہ یونہی درج ہے۔ مگر خطوط کی سن وار ترتیب کو دیکھتے ہوئے یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا صحیح سن 35 ہے جسے کاتب نے غلطی سے 33ء کر دیا۔

1 مجھے جہاں تک علم ہے نزولِ مسیحؑ کا انکار کسی نے نہیں کیا۔ معتزلہ کی کتابیں نہیں ملتیں جو حال معلوم ہو۔ البتہ ابن حزم وفاتِ مسیحؑ کے قائل تھے ساتھ ہی نزول کے بھی۔ (ندوی)

2 مکاتیب اقبالؒ ج1 ص196 مرتبہ شیخ عطاء اللہ ایم۔اے۔

❀.....❀.....❀

(5)

لاہور

7 اگست 1936ء

مخدومی السلام علیکم!

والا نامہ ابھی ملا ہے۔ آپ کی صحت کی خبر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ خدا تعالیٰ آپ کو دیر تک زندہ و سلامت رکھے۔ میری صحت کی حالت بہ نسبت سابق بہتر ہے۔ گو آواز میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ انشاء اللہ موسم سرما میں وہ انگریزی کتاب لکھنا شروع کروں گا' جس کا وعدہ میں نے اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے کر رکھا ہے۔ اس میں آپ کے مشورہ کی ضرورت ہے۔ بدور البازغہ بھی اسی مطلب کے لیے منگوائی ہے۔ اس کتاب میں زیادہ تر قوانینِ اسلام پر بحث ہوگی کہ اس وقت اسی کی ضرورت ہے۔[1] اس کے متعلق جو جو کتب آپ کے ذہن میں ہیں مہربانی کر کے ان کے ناموں سے مجھے آگاہ فرمایئے اور یہ بھی فرمایئے کہ کہاں کہاں سے دستیاب ہوں گی؟

الحمد للہ کہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں۔[2] مگر حال کے روشن خیال علماء کو ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ اگر آپ کی صحت اجازت دے تو آپ بھی اس پر ایک جامع و نافع بیان شائع فرمایئے۔[3] میں بھی تیسرا بیان انشاء اللہ جلد لکھوں گا اس کا موضوع ہوگا ''بروز''۔ لفظ بروز کے متعلق اگر کوئی نکتہ آپ کے ذہن میں ہو یا کہیں صوفیہ کی کتابوں میں اس پر بحث ہو تو اس کا پتہ دیجئے۔[4] نہایت شکر گزار ہوں گا۔[5]

والسلام

مخلص

محمد اقبال[6]

❀......❀......❀

حواشی

(ازقلم محترم نعیم آسی مرحوم)

1. افسوس حضرت علامہؒ کی زندگی نے وفا نہ کی اور یہ کتاب عدم سے وجود میں نہ آسکی۔
2. مولانا ابوالکلام آزادؒ کے یہ بیانات تلاشِ بسیار کے باوجود مجھے کہیں نہیں مل سکے ہیں۔ اگر کسی صاحب کے پاس موجود ہوں تو وہ مطلع فرمائیں۔ مرتب ان کا شکرگزار ہوگا۔
3. اس سے اس امر کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت علامہؒ کو فتنہ قادیانیت کے استیصال سے کس قدر گہری دلچسپی تھی۔
4. علامہ ندویؒ نے جواب میں لکھا' لفظ بروز کے معنی نوظہور کے ہیں مگر اس کے اصطلاحی معنی ملاحدۂ عجم کی پیداوار ہیں۔ ملاحظہ ہو' مکاتیب اقبال' ج 1 حاشیہ ص 199۔
5. حضرت علامہؒ اپنی بیماری کے سبب' اپنے اس ارادے کو بھی عملی جامہ نہ پہنا سکے تھے۔ بہرحال اس سے یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کے پیش نظر قادیانی فتنے کے سبھی چہرے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ایک ایک کر کے ان تمام سے نقاب اُلٹ دی جائے۔
6. مکاتیبِ اقبال' ج 1 ص 200-199 مرتبہ شیخ عطاء اللہ' ایم۔ اے۔

پروفیسر سیّد محمد الیاس برنیؒ
(ناظم دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی)

کے نام

°(1)

لاہور

6 جون 1936ء

مخدومی جناب پروفیسر صاحب!

آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے۔ کتاب ''قادیانی مذہب'' اس سے بہت پہلے موصول ہوگئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب بے شمار لوگوں کے لیے چراغِ ہدایت کا کام دے گی اور جو لوگ قادیانی مذہب پر مزید لکھنا چاہتے ہیں ان کے لیے تو یہ ضخیم کتاب ایک نعمتِ غیر مترقبہ ہے' جس سے ان کی محنت و زحمت بہت کم ہوگئی ہے۔ میں آپ کی خدمت میں مفصل خط لکھتا مگر دو سال سے بیمار ہوں اور بہت کم خط و کتابت کرتا ہوں۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

حضور نظام [1] کا خط میری نظر سے گزرا تھا لیکن میں نے سنا ہے کہ جو روپیہ ان کی گورنمنٹ کی طرف سے پنجاب میں آتا ہے وہ یا تو پارٹی پالیٹکس پر صَرف ہوتا ہے یا ان اخباروں پر جو قادیانیوں کی حمایت کرتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ بات کہاں تک درست ہے؟ میں نے یہ بات آپ کو بصیغہ راز لکھ دی ہے۔

والسلام

مخلص/محمد اقبال [2]

حواشی

o جن دنوں حضرت علامہؒ قادیانیت کی بیخ کنی میں مصروف تھے، انہی دنوں میں پروفیسر الیاس برنی مرحوم نے قادیانی مذہب کے نام سے قادیانی معتقدات کا ایسا پوسٹ مارٹم کیا کہ وہ بالکل ننگا ہو کر سامنے آ گئے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ مرحوم نے حضرت علامہؒ کی خدمت میں بھی بھیجا اور شاید اس پر حضرت علامہؒ کی رائے چاہی۔ جواب میں آپ نے مذکورہ خط لکھا۔

1 نظام حیدر آباد دکن۔

2 مکاتیب اقبال، ج 1 ص 411 مرتبہ شیخ عطاء اللہ، ایم۔ اے۔

(2)

جاوید منزل
27 مئی 1937ء

جناب پروفیسر صاحب!

السلام علیکم!

آپ کی کتاب ''قادیانی مذہب'' کی نئی ایڈیشن جو آپ نے بکمالِ عنایت ارسال فرمائی ہے' مجھے مل گئی ہے' جس کے لیے بے انتہا شکر گزار ہوں۔ میں نے سیّد نذیر نیازی ایڈیٹر ''طلوعِ اسلام'' سے سنا ہے کہ یہ کتاب بہت مقبول ہو رہی ہے۔ آپ کی محنت قابلِ داد ہے کہ اس سے عامۃ المسلمین کو بے انتہا فائدہ پہنچا ہے اور آئندہ پہنچتا رہے گا۔ اب ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے جو کہ آپ کے ذاتی افکار کا نتیجہ ہو۔ آپ کے قلم سے مسلمان ایسی توقع رکھنے کا حق رکھتے ہیں۔ قادیانی تحریک یا یوں کہیے کہ بانی تحریک کا دعویٰ مسئلہ بروز پر مبنی ہے۔ مسئلہ مذکور کی تحقیق تاریخی لحاظ سے ازبس ضروری ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ مسئلہ عجمی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اصل اس کی آرین ہے۔ نبوت کا سامی تخیل اس سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے۔

میری رائے ناقص میں اس مسئلہ کی تاریخی تحقیق قادیانیت کا خاتمہ کرنے کے لیے کافی ہوگی۔

والسلام

محمد اقبال[1]

حاشیہ

1. مکاتیب اقبال' ج 1 ص 20-419 مرتبہ شیخ' عطاء اللہ' ایم۔ اے۔

اقبالؒ، تحریکِ آزادیِ کشمیر اور قادیانیت

علامہ محمد اقبالؒ

کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفاء○

''کشمیر کمیٹی'' میں میری صدارت محض عارضی تھی۔ یاد رہے کہ کمیٹی کی تشکیل کشمیر میں غیر متوقع واقعات کے اچانک رونما ہونے پر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہوئی تھی اور اس وقت یہ خیال تھا کہ اس قسم کی کمیٹی کی ضرورت بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ اس لیے کمیٹی کا کوئی نظام مرتب نہیں کیا تھا اور صدر کو آمرانہ اختیارات دے دیے گئے تھے۔

یہ خیال کہ کشمیر کمیٹی کی ایک مستقل ادارہ کی حیثیت سے ضرورت نہ ہو گی' ریاست میں پیدا ہونے والے واقعات نے غلط ثابت کر دیا۔ بہت سے ممبران نے اس لیے یہ سوچا کہ کمیٹی کا ایک باقاعدہ نظام ہونا چاہیے اور عہدیداروں کا نیا انتخاب ہونا چاہیے۔ کمیٹی کے ارکان اور اس کے طریقِ کار کے متعلق کچھ لوگوں کے اختلاف نے جس کے اسباب کا یہاں ذکر کرنا مناسب نہ ہو گا اس خیال کی مزید تائید کی۔ چنانچہ کمیٹی کا ایک اجلاس طلب کیا گیا جس میں کمیٹی کے صدر[1] نے اپنا استعفاء پیش کیا اور وہ منظور ہو گیا۔

پچھلے ہفتہ کے آخری دنوں میں کمیٹی کا ایک اور جلسہ ہوا۔ اس میں ممبران کے سامنے نظام کا مسودہ پیش کیا گیا' جس کی غرض و غایت یہ تھی کہ کمیٹی کی حیثیت ایک نمائندہ جماعت کی سی ہو لیکن کچھ ممبران نے اس سے اختلاف ظاہر کیا۔ بعد کے بحث و مباحثہ اور گفتگو سے مجھے یہ پتہ لگا کہ یہ لوگ دراصل کمیٹی کو دو ایسے حصوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں جن میں اتحاد صرف برائے نام ہی ہو گا۔ چنانچہ میں نے اپنا استعفاء پیش کرنے سے پہلے ممبران کو اپنی اس رائے سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا۔

بدقسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقے کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ احمدی وکلاء میں سے ایک صاحب نے' جو میرپور کے مقدمات کی پیروی کر رہے ہیں' حال ہی میں اپنے ایک بیان میں واضح طور پر اس خیال کا اظہار کر دیا۔ انھوں نے صاف طور پر کہا کہ وہ کسی کشمیر کمیٹی کو نہیں مانتے اور جو کچھ انھوں نے یا ان کے ساتھیوں نے

اس ضمن میں کیا وہ ان کے امیر کے حکم کی تعمیل تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ان کے اس بیان سے اندازہ لگایا کہ تمام احمدی حضرات کا یہی خیال ہوگا اور اس طرح میرے نزدیک کشمیر کمیٹی کا مستقبل مشکوک ہوگیا۔

میں کسی صاحب پر انگشت نمائی نہیں کرنا چاہتا' ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ سے کام لے اور جو راستہ پسند ہو اسے اختیار کرے۔ حقیقت میں مجھے ایسے شخص سے ہمدردی ہے جو کسی روحانی سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی مقبرہ کا مجاور یا کسی زندہ نام نہاد پیر کا مرید بن جائے۔

جہاں تک مجھے علم ہے کشمیر کمیٹی کی عام پالیسی کے متعلق ممبران میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ پالیسی سے اختلاف کی بناء پر کسی نئی پارٹی کی تشکیل پر اعتراض کرنے کا کسی کو حق نہیں پہنچتا لیکن جہاں تک میں نے حالات کا جائزہ لیا ہے کشمیر کمیٹی کے چند ارکان کو جو اختلافات ہیں وہ بالکل بے تکے ہیں۔

ان حالات کے پیش نظر مجھے اس امر کا یقین ہے کہ کمیٹی میں اب ہم آہنگی کے ساتھ کام نہیں ہوسکتا اور ہم سب کا مفاد اسی میں ہے کہ موجودہ کشمیر کمیٹی کو ختم کردیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانانِ کشمیر کی رہنمائی اور مدد کے لیے برطانوی ہند میں ایک کشمیر کمیٹی ضرور ہونی چاہیے۔ اس لیے اگر برطانوی ہند کے مسلمان اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو وہ مجاز ہیں کہ ایک کھلے عام اجلاس میں ایک نئی کشمیر کمیٹی کی تشکیل کرلیں۔ موجودہ حالات کے پیش نظر مجھے صرف یہی ایک راستہ دکھائی دیتا ہے۔

میں نے اپنے ان احساسات کو آپ کے سامنے کھلے الفاظ میں پیش کردیا ہے، جنھوں نے مجھے استعفاء دینے پر مجبور کیا۔ مجھے امید ہے کہ میری یہ صاف گوئی کسی شخص کو ناگوار نہ گزرے گی کیونکہ میرا مقصد نہ کسی کی برائی کرنا ہے اور نہ کسی پر انگلی اٹھانا۔[2]

❁……❁……❁

حواشی

o یہ بیان 20 جون 1933ء کے اخبارات میں شائع ہوا' تب حضرت علامہؒ کشمیر کمیٹی کے عارضی صدر تھے۔ (حرف اقبالؔ ص 201 مرتبہ لطیف احمد شروانی)

1 میرزا بشیر الدین محمود' خلیفہ ثانی' میرزا غلام احمد قادیانی۔

2 حرف اقبال ص 201 تا 204 مرتبہ لطیف احمد شروانی' ایم۔اے۔
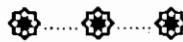
علامہ محمد اقبالؒ

تحریکِ کشمیر کی صدارت کی پیشکش کا استرداد ٭

آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا صدر ہوتے ہوئے میں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ میں کمیٹی کے ممبران کو اس پر رائے زنی کا موقع دیے بغیر اس خط کا جواب دے دوں جس میں مجھے صدارت پیش کی گئی تھی۔ میں نے ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کو بھی اس امر سے مطلع کر دیا تھا۔ میرے خط سے اخبارات کے بعض اہلِ قلم اصحاب نے جو اغلباً قادیانی ہیں، یہ غلط مطلب اخذ کیا ہے کہ اصولی طور پر مجھے پیش کردہ صدارت کے قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ لہٰذا میں جلد از جلد یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے صرف صدارت کے قبول کرنے ہی سے اصولی اختلاف نہیں بلکہ میں تو ایسی پیشکش کے متعلق سوچنا ہی غلط سمجھتا ہوں اور میرے اس رویہ کی وجوہات وہی ہیں جن کی بناء پر میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی نئی تشکیل ہونی چاہیے۔

یہ پیشکش جو مجھے کی گئی ہے یقیناً ایک فریب ہے اور اس کا مقصد لوگوں کو اس امر کے متعلق یقین دلانا ہے کہ سابقہ کشمیر کمیٹی حقیقت میں ختم نہیں ہوئی بلکہ نئی کمیٹی کے پہلو بہ پہلو ایک جماعت کی حیثیت سے موجود ہے اور یہ کہ وہ لوگ جنھیں نئی کمیٹی سے نکال دیا گیا ہے، وہ اب اس شخص کی رہنمائی میں کام کرنے کے لیے تیار ہیں جو کمیٹی کی نئی تشکیل کا سب سے بڑا محرک تھا۔ لیکن ان کی یہ چال کہ وہ اسباب جن کی بناء پر میں نے کشمیر کمیٹی کی از سرِ نو تشکیل کرائی اب ختم ہو گئے ہیں، نہ تو مجھے قائل کر سکتی ہے اور نہ مسلم عوام کو۔

قادیانی ہیڈ کوارٹرز سے ابھی اس مقصد کا کوئی واضح بیان شائع نہیں ہوا کہ قادیانیوں کے کسی مسلم ادارہ میں شریک ہونے کی صورت میں ان کی اطاعت دوطرفہ نہ ہو گی بلکہ واقعات سے تو یہ امر بالکل واضح ہو گیا ہے کہ وہ ادارہ جس کو قادیانی اخبارات تحریکِ کشمیر کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جس میں بقول قادیانی اخبار ''الفضل'' مسلمانوں کو صرف رسمی طور پر شرکت کی اجازت دی گئی تھی، اغراض و مقاصد کے لحاظ سے آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے بالکل مختلف ہے۔ قادیانی جماعت کے امیر کی جانب سے

کئی چٹھیاں جو انھوں نے اپنے کشمیری بھائیوں کے نام لکھی ہیں (غیر قادیانی کشمیری ہونے کی وجہ سے انھیں مسلمان کی بجائے بھائی کہا گیا ہے) اس قادیانی تحریک کشمیر کے چند پوشیدہ اغراض کا انکشاف کرتی ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حالات کے پیش نظر ایک مسلمان کس طرح ایک ایسی تحریک میں شامل ہو سکتا ہے جس کا اصل مقصد غیر فرقہ واری کی ہلکی سی آڑ میں کسی مخصوص جماعت کا پروپیگنڈا کرنا ہے۔[1]

حواشی

o یہ بیان 2 اکتوبر 1933ء کو دیا گیا۔ (حرفِ اقبال ص 204 مرتبہ لطیف احمد شروانی ایم۔اے)

1 حرفِ اقبال ص 204 مرتبہ لطیف احمد شروانی ایم۔اے۔

زمیندار

آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی تجدید و تشکیل

لاہور 3 جولائی آج رات کے نو بجے باغ بیرون دہلی دروازہ میں مسلمانانِ لاہور کا ایک عظیم الشان جلسہ زیر صدارت میاں عبدالعزیز صاحب صدر بلدیہ لاہور منعقد ہوا۔ حاضرین کی تعداد ابتدا میں پانچ ہزار کے قریب اور اختتام کے وقت آٹھ ہزار سے متجاوز تھی۔ مولانا ظفر علی خاں اور علامہ سر محمد اقبال کی تشریف آوری پر حاضرینِ جلسہ نے اللہ اکبر کے پُر جوش نعرے بلند کیے۔ مولوی محمد یعقوب نے قرآن حکیم کے ایک رکوع کی تلاوت کی اور مولوی احمد یار خاں نے علامہ اقبال کی ایک نظم گا کر سنائی۔ صاحب صدر کی درخواست پر علامہ اقبال نے کشمیر کمیٹی کے متعلق تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

علامہ اقبال کی تقریر

''علامہ اقبال نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہونے کے اسباب و علل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میں اس سلسلہ میں ایک بیان اخبارات میں شائع کرا چکا ہوں اور بعض اخبارات نے میرے اس بیان پر تنقید کی ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود کی طرف سے بھی میرے اس بیان کا جواب دیا گیا ہے۔ جواب الجواب کے لیے میں اخبار کے صفحات کے بجائے اس جلسہ کو ترجیح دیتا ہوں جو میرے مشورہ کے مطابق مسلمانانِ لاہور نے منعقد کیا ہے۔

علامہ اقبال نے کہا کہ مسلمانوں میں ابھی سیاسی زندگی کا آغاز ہے اس لیے ضروری ہے جمہور اسلام ہر معاملہ پر اچھی طرح غور کریں اور ان کے سامنے تمام مسائل پر پوری روشنی ڈالی جائے۔ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ذاتی اختلافات مٹا کر ایک ہو جائیں اور سیاساتِ حاضرہ کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے لیے مفید راہ تلاش کریں۔

آپ نے کہا کہ پچیس تیس سال ہوئے جب لاہور میں آل انڈیا کشمیر کانفرنس کی بنیاد رکھی گئی تھی اور اس کانفرنس میں صرف اہل خطہ حضرات اور کشمیری قومیت رکھنے والے شامل ہو سکتے تھے۔ میں

نے اس وقت بھی اس امر سے اختلاف کا اظہار کیا تھا اور میری رائے تھی کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی بنائی جائے جس میں ہندوستان کے وہ تمام افراد شامل ہوسکیں جو اہلِ کشمیر سے ہمدردی رکھتے ہوں۔ چنانچہ میں اس کانفرنس میں شامل نہیں ہوا۔ اس کانفرنس نے کشمیر کے مسلمان لڑکوں کو تعلیم سے بہرہ ور کرنے کی کوشش کی لیکن مشکل یہ پیش آئی کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ریاست میں ملازمتیں نہ ملیں۔ چنانچہ وہاں اضطراب پیدا ہوا اور زبردست تحریک شروع ہوگئی۔ اس تحریک کے جاری کرنے کا الزام میرے اور سر محمد شفیع مرحوم کے سر تھوپا گیا۔ ان دنوں میں شملہ میں تھا۔ وہاں پر ایک آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ چونکہ عام طور پر خیال یہ تھا کہ اس کمیٹی کی ضرورت چندروز کے لیے عارضی طور پر ہوگی' اس لیے اس کا کوئی آئین یا ضابطہ نہ بنایا گیا اور اس کے صدر مرزا بشیر الدین محمود مقرر ہوئے۔ کشمیر کے اندرونی حالات کے تغیر کے طول پکڑ جانے کے باعث اس کمیٹی کے کام کو جاری رکھنا ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی تین چار سال تک یہ حالات درست نہ ہوسکیں گے اور کشمیر کمیٹی کو زندہ رکھنے کی ضرورت باقی رہے گی۔

قادیانیوں کی ضرورت

شملہ میں قائم ہونے والی عارضی کمیٹی کے صدر مرزا بشیر الدین محمود تھے جن سے کمیٹی کے بعض ارکان کو اختلاف پیدا ہوا اور تجویز کی گئی کہ نئے انتخاب عمل میں لائے جائیں۔ مرزا صاحب نے استعفیٰ دے دیا اور کمیٹی نے عارضی طور پر مجھے صدر اور ملک برکت علی کو سیکرٹری مقرر کر دیا تھا کہ کمیٹی کے ضوابط مرتب کر کے عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں لایا جائے۔ اس کے بعد محمڈن ہال میں ایک جلسہ ہوا جس میں کمیٹی کے ضوابط کا آئین پیش کیا گیا۔

اس موقع پر علامہ سر اقبال نے اس جلسہ کی داستان سنائی اور حاضرین کو بتایا کہ اس جلسہ میں قادیانی ممبروں نے اس قسم کی ترمیمیں پیش کرنی شروع کر دیں جن کا مقصد میں یہ سمجھا کہ یہ لوگ کمیٹی کے اندر قادیانی حلقہ کی ایک اور کمیٹی بنانا چاہتے ہیں' جس سے کام خوش اسلوبی سے نہیں ہو سکے گا۔ چنانچہ میں نے جلسہ کا رنگ دیکھ کر اپنی رائے ظاہر کر دی اور زبانی طور پر استعفیٰ پیش کر دیا۔ دو دن کے بعد میں نے اخبارات کو بیان دیا اور عامۃ المسلمین سے اپیل کی کہ وہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی تشکیل کے لیے عام جلسہ منعقد کریں۔

علامہ اقبال نے فرمایا کہ مجھے سیاسی انجمنوں میں قادیانیوں کی شمولیت پر مذہبی حیثیت سے کوئی اعتراض نہیں اگرچہ میں ان کے عقائد کو غلط سمجھتا ہوں لیکن کشمیر کمیٹی کے واقعات نے یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ قادیانی کسی غیر قادیانی انجمن میں پوری وفاداری کے ساتھ کام نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ہر جگہ

اس ذہن کے ساتھ جاتے ہیں کہ ان پر اپنے امام کی اطاعت، جسے وہ نبوت کے سلسلہ سے تعبیر کرتے ہیں، ہر شے پر مقدم ہے۔ مرزا صاحب کی طرف سے میرے اس اعتراض پر جو جواب شائع ہوا ہے، اس میں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا گیا، صرف یہ کہا گیا ہے کہ بعض دوسری اسلامی انجمنوں میں بعض قادیانی کام کر رہے ہیں لیکن میرا جواب یہ ہے کہ ان انجمنوں میں ابھی تک ایسا واقعہ پیش نہیں آیا، جس سے قادیانیوں کی وفاداری کا امتحان ہو سکتا۔ علامہ سر محمد اقبال نے مرزا بشیر الدین محمود کے اس بیان کی تکذیب کی کہ مسلم کانفرنس میں ان کے برابر کسی نے چندہ نہیں دیا، جس کی تعداد تین ہزار روپیہ تھی۔ علامہ موصوف نے فرمایا کہ (میں) آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت میں اعلان کر سکتا ہوں کہ بعض مخیر" مسلمانوں نے بیک وقت آٹھ آٹھ ہزار روپیہ کی رقمیں مسلم کانفرنس کو دی ہیں۔ قادیانیوں کا دعویٰ غلط ہے۔

کمیٹی کی تشکیل کا مسئلہ

علامہ اقبال نے کہا کہ اب یہ معاملہ محمڈن ہال سے نکل کر آپ کے سامنے آ گیا ہے اور سوال یہ ہے کہ آیا کشمیر کمیٹی کی ہیئتِ ترکیبی وہی رہے جو پہلے تھی یا اسے بدل دیا جائے (آوازیں: کشمیر کمیٹی کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اگر ہے تو وہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہیں)

علامہ اقبال نے اپنی تقریر کے آخری حصہ میں مولانا غلام بھیک نیرنگ کی تجویز سے حاضرین کو آگاہ کیا کہ کشمیر کمیٹی کی جگہ ایک آل انڈیا مسلم سٹیٹ ڈیفنس کمیٹی بنائی جائے جو تمام ریاستوں میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا کام اپنے ذمہ لے۔

صاحب صدر کا تبصرہ

ازاں بعد صاحب صدر نے حاضرین سے کہا کہ علامہ سر اقبال نے تمام حالات آپ کے سامنے پیش کر دیے ہیں۔ ان کا یہ مقصد نہیں کہ کسی کو اس کے مذہبی عقائد کی بنا پر کمیٹی سے نکالا جائے بلکہ ان کا مقصد یہ ہے کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی بنیاد صحیح اصول پر قائم کی جائے تا کہ کمیٹی کشمیر کے مسلمانوں کے لیے مفید ثابت ہو (ایک آواز۔ مگر کمیٹی میں مرزائی نہ رکھے جائیں کیونکہ انھوں نے اسے تبلیغ کا میدان بنالیا ہے)

ملک برکت علی کی تقریر

ملک برکت علی نے اس مختصر مگر پُر زور تقریر کے بعد حسب ذیل قرارداد پیش کی۔

''اہلِ لاہور کا یہ عظیم الشان جلسہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی اس تجویز کو صمیم قلب سے

تسلیم کرتا ہے کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کو ایسے طریق پر تشکیل دیا جائے جس میں مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر خیال کے لوگوں کی آراء کی پورے طور پر نمائندگی ہو تا کہ نہایت موثر طریق سے مسلمانان کشمیر کے جائز حقوق کے حصول کے لیے ایجی ٹیشن اور پروپیگنڈا ہو سکے تا کہ وہ اپنے ملک کی خدمت میں ذمہ دار طور پر شریک ہوں۔ یہ عظیم الشان اجتماع ڈاکٹر سر محمد اقبال پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے انھیں اس بات کا پورا حق دیتا ہے کہ وہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی بنیادی انجمن کے ارکان نامزد کریں اور یہ مجلس کمیٹی کا آئین تیار کرے اور جیسا مناسب ہو، کمیٹی کے نام تبدیل کرے، عہدیداروں کا انتخاب عمل میں لائے اور دیگر امور کا تصفیہ کرے جو کمیٹی کے کاروبار کے لیے ضروری ہوں اور یہ مسلمانانِ ہند کی اس بہترین آرگنائزیشن کے شایان شان ہو۔''

حاجی شمس الدین نے اس قرارداد کی تائید کی اور قرارداد منظور ہوگئی۔ صرف دو قادیانیوں نے اختلاف کا اظہار کیا۔

نئی کمیٹی کی تشکیل

ازاں بعد صاحب صدر نے علامہ اقبال سے درخواست کی کہ وہ نئی آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے ارکان کے نام نامزد کریں۔ حضرت علامہ نے اٹھ کر کہا کہ بعض حضرات نے مجھے نئی کمیٹی کے لیے اسماء کی ایک فہرست دی ہے۔ میں وہ فہرست اس جلسہ کے سامنے پیش کرتا ہوں، جلسہ بااختیار ہے کہ جسے چاہے ممبر رہنے دے اور جسے چاہے نکال دے۔ ملک برکت علی نے نام پڑھ کر سنائے اور حاضرین منظور کے نعرے بلند کرتے رہے۔ کوئی ڈیڑھ سو کے قریب نام پڑھ کر سنائے گئے۔ حاضرین نے قادیانیوں اور لاہوری مرزائیوں کے علاوہ مولانا سیّد حبیب آف سیاست اور مولانا غلام رسول مُہر، مولانا عبدالمجید سالک، مولانا اسمٰعیل غزنوی وغیرہ کے نام مسترد کر دیے اور ان کی جگہ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری، مولوی مظہر علی اظہر، مولانا داؤد غزنوی، غازی عبدالرحمٰن اور مولانا حبیب الرحمٰن کے نام شامل کیے گئے۔

مولانا ظفر علی خاں کی تقریر

ازاں بعد حضرت مولانا ظفر علی خاں نے دوسری قرارداد پیش کی جو شیخ محمد عبداللہ اور دیگر اسیرانِ سیاسی کی رہائی اور مقدمات کی واپسی کے مطالبہ پر مشتمل تھی۔ حضرت مولانا نے اپنے مخصوص اور دلفریب انداز میں فرمایا کہ ''آج میری طبیعت خوشی سے باغ باغ ہے۔ آج میں اپنی سالہا سال کی

جدوجہد کے آثار اس جلسہ کی شکل میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ اس وقت کونے کی اینٹ کون ہے۔ مرزا بشیر محمود کا وہ مقولہ سنا ہوگا کہ ہم کونے کی اینٹ ہیں، جس پر یہ اینٹ گرے گی، وہ سر پاش پاش ہو جائے گا اور جو کھوپڑی اس اینٹ سے ٹکرائے گی وہ ٹوٹ جائے گی۔ آج یہ مقولہ اس اجتماع کے حق میں تبدیل ہو گیا اور آپ حضرات نے ثابت کر دیا کہ کونے کی اینٹ کون ہے۔

حضرت مولانا ظفر علی خاں نے فرمایا کہ میرے کشمیر سے دیرینہ تعلقات ہیں۔ میرے والد محترم اپنی عمر کا ایک حصہ کشمیر میں بسر کر چکے ہیں اور میں بھی اُن کے ساتھ کشمیر کے چپے چپے پر پھر چکا ہوں۔ آج میں آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے تقریر کر رہا ہوں کیونکہ آپ نے مجھے اس کمیٹی کا رکن بنایا ہے اور اب یہ کمیٹی آپ کی تشکیل کردہ جماعت بن گئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم ان واقعات کو فراموش نہیں کر سکتے کہ کشمیر میں ایک پتلا دبلا ڈوگرہ ایک موٹے تازے مسلمان کو بید سے مارتا تھا اور مسلمان اس کے سامنے بچے کی طرح بلبلا کر روتا تھا۔ میں نے یہ نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے لیکن اب مظالم سے تنگ آ کر وہاں کے مسلمانوں نے ایجی ٹیشن کی اور ہمتِ مردانہ کے ساتھ ہر قسم کی سختیاں برداشت کرنے کا عزم الجزم کر لیا ہے وہ اپنے حقوق اور جائز مطالبات کے لیے سربکف میدان میں نکل آئے ہیں۔ آپ نے مسلمانانِ کشمیر کے اندرونی اختلافات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان اختلافات کی وجہ یہی قادیانی تبلیغ ہے۔ بعض مسلمانوں نے غلطی کی کہ اس کام میں قادیانیوں کو ساتھ ملایا۔ انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ آج ہم علامہ اقبال کو پھر اپنے درمیان دیکھ رہے ہیں۔ اب ہمیں چاہیے کہ حکومتِ کشمیر سے اپیل کریں کہ وہ کھونٹا جس کے بل بوتے پر یہ فسادات رونما ہوئے تھے، اکھاڑ دیا گیا ہے۔ یعنی قادیانیوں کی مفسد جماعت کو کمیٹی سے باہر نکال دیا گیا ہے اور اب یہ خالص مسلمانوں کی جماعت بن گئی ہے لہٰذا حکومتِ کشمیر کو چاہیے کہ اس کے مشوروں پر عمل پیرا ہو کر اپنے ہاں امن قائم کرے۔

کشمیر کمیٹی کو قادیانیوں کے ہاتھ میں دینے کے نتائج آپ نے دیکھ لیے۔ اہلِ کشمیر اور ان کے لیڈر مجبور تھے کہ قادیانیوں کو اپنے ہاں رسوخ بڑھانے دیں۔ شیخ محمد عبداللہ مجبور تھا کہ قادیان سے تعلق رکھے۔ اب وہ لوگ مسلمانوں سے رشتے استوار کریں گے اور شیخ عبداللہ کو قادیانی تصفیہ کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

دوسری قرارداد

مولانا ظفر علی خاں نے حسب ذیل قرارداد پیش کی جس کی تائید مولوی محمد الدین فوق نے کی

اور قرارداد منظور ہوگئی۔

"مسلمانان لاہور کا یہ عظیم الشان جلسہ کشمیر کے افسوس ناک حالات حاضرہ کو بہ نگاہِ اضطراب دیکھتا ہے جس کی بنا پر بلا امتیاز کشمیر کے لیڈروں اور ان کے رفقاء کو اس بنا پر گرفتار کر لیا گیا ہے کہ اس طریق عمل سے مختلف اسلامی طبقوں میں صلح و آشتی پیدا ہوگی۔ اس جلسہ کی پختہ رائے یہ ہے کہ موجود قابلِ افسوس حالات کو رو براہ لانے کے لیے شیخ محمد عبداللہ اور ان کے رفقاء کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا جائے اور ریاست بھر میں جس قدر مقدمات گزشتہ فسادات کشمیر کے زیر سماعت ہیں ان کو واپس لے لیا جائے۔"

تیسری قرارداد

(تیسری قرارداد کرسی صدارت کی طرف سے پیش کی گئی اور منظور ہوئی اس قرارداد میں کہا گیا کہ مسلمانانِ ہند کشمیری مسلمانوں کی ہر ممکن مدد کریں اور اپنے اندرونی اختلافات مٹا کر متحد ہو جائیں۔ (ملخص از جعفر)

آخر میں مولانا ظفر علی خاں نے نئی کشمیر کمیٹی کی مالی امداد کے لیے اپیل کی اور بہ نفس نفیس مبلغ سو روپیہ دینے کا اعلان فرمایا اور مولانا محمد بخش مسلم نے عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلوس کا اعلان کیا۔ جلسہ رات کے بارہ بجے برخاست ہوا اور دعا مانگی گئی۔

(زمیندار 10 جولائی 1931ء ص 14)

حافظ عبید الرحمٰن

مسئلہ کشمیر اور قادیانی سازشیں

مہاراجہ پرتاب سنگھ بے اولاد تھا۔ اس نے اپنی جانشینی کے لیے اپنی برادری کا ایک لڑکا متبنیٰ بنا رکھا تھا۔ راجہ امر سنگھ کو یہ بات گوارا نہ ہوئی کیونکہ وہ اپنے بیٹے ہری سنگھ کو ریاست کا حکمران بنانا چاہتا تھا۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے اس نے ریاست جموں کشمیر میں سازشوں کا جال بچھا دیا۔ اس ساز باز میں اسے قادیانی مقتداؤں سے بڑی مدد ملی۔ آخر کار مہاراجہ ہری سنگھ 1925ء میں گدی نشین ہو گیا۔ ہری سنگھ انتہائی بدکردار، بداخلاق، آوارہ اور بدمعاش شخص تھا۔ یہ اپنے لہو ولعب اور عیش ونشاط کی مستیوں میں ایسا غرق ہوا کہ ریاست کے چھوٹے بڑے ڈوگرہ ہندو ملازمین کو اپنی من مانی کارروائیاں کرنے کی کھلی چھٹی مل گئی۔ مسلمانوں کی آبادی ایک صدی سے زیادہ سکھوں اور ڈوگروں کی غلامی میں ہر طرح کے ظلم وستم کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ اب ان کے مصائب میں کئی گنا مزید اضافہ ہو گیا۔ مہاراجہ ہری سنگھ کا زیادہ وقت کلکتہ، بمبئی، لندن اور پیرس کے عشرت خانوں میں گزرتا تھا۔ میدان صاف پا کر ریاست کے ہندو اہلکاروں کی چیرہ دستیاں اس قدر بڑھ گئیں کہ اب وہ مسلمان رعایا کے مال و دولت اور عزت و ناموس کے علاوہ ان کے دین اور ایمان پر بھی ہاتھ ڈالنے لگے۔ 1931ء میں پہلے ریاسی میں ایک مسجد شہید کر دی گئی۔ پھر کوٹلی میں مسلمانوں کو جمعہ کی نماز ادا کرنے سے روک دیا گیا۔ جموں میں ایک ہندو کانسٹیبل نے جان بوجھ کر قرآن کی سخت بے حرمتی کی۔ ان واقعات نے ریاست بھر کے مسلمانوں میں شدید غم وغصہ کی آگ بھڑکا دی۔ جگہ جگہ جلسے جلوس شروع ہو گئے۔ خاص طور پر سری نگر میں عبدالقدیر نامی ایک شعلہ بیان مقرر نے بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کر کے مہاراجہ کی حکومت کی دھجیاں اڑا دیں۔ اسے گرفتار کر کے جیل میں مقدمہ چلایا گیا۔[1]

13 جولائی 1931ء کو مسلمانوں کے ایک جم غفیر نے جیل کا محاصرہ کر کے مطالبہ کیا کہ انھیں عبدالقدیر کے زیر سماعت مقدمہ کی کارروائی سننے کی اجازت دی جائے۔ اجازت دینے سے انکار کر کے مجمع کو منتشر کرنے کے لیے پولیس نے گولی چلا دی۔ 27 افراد ہلاک اور بے شمار زخمی ہوئے۔ تین روز

بعد پھر سری نگر میں فائرنگ ہوئی جس میں مسلمانوں کا دوبارہ خون بہا۔ آزادی کے نام پر کشمیر کی سرزمین پر خون کی یہ پہلی قربانی تھی۔[2] چنانچہ اسی جدوجہد نے تحریکِ آزادی کشمیر کی صورت اختیار کرلی۔

دبا سکو تو صدا دبا دو بجھا سکو تو دیا بجھا دو
صدا دبے گی تو حشر ہو گا دیا بجھے گا تو سحر ہو گی

جب ہری سنگھ کو اپنے پاؤں تلے سے اقتدار کی زمین سرکتے محسوس ہوئی تو یہ شیطانی صفت' عیار' مکار' مہاراجہ اپنے سیاسی باوا فرنگی کے درِ اختیار پر پیشانی گھسانے لگا۔ اس طرح انگریزی دربار میں دو کافروں کی عقلیں اکٹھی ہو گئیں اور اس مسئلے کا حل سوچنے لگیں۔ حضرت سیّد احمد شہیدؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کا جہاد کے لیے ہندوستان کے شمال مغربی علاقے کی سرحدات کو منتخب کرنا اور والی خراساں کو اس معرکہ میں شمولیت کی دعوت دینا بہت دُور رس منصوبوں کا حامل پروگرام تھا' جسے انگریز جیسی شاطر قوت کبھی نظر انداز نہیں کر سکتی تھی' پھر شیخ الہندؒ کا اپنی تحریکِ انقلاب کا مرکز اس علاقہ کو بنانا یہ بھی نہایت اہم مسئلہ تھا جسے انگریز معمولی واقعہ قرار نہیں دے سکتا تھا۔ چنانچہ انگریز نے یہ ضروری سمجھا کہ کشمیر کے علاقے میں ایسی گہری سیاسی تبدیلیاں عمل میں لانی چاہئیں' جس کے بعد کشمیر میں اور اس کے اطراف میں کسی جمعیت کو موقع نہ مل سکے۔ چنانچہ جہاد کو ختم کرنے کے لیے انگریز دوبارہ اپنے خود کاشتہ پودے کی طرف متوجہ ہوا تو قادیانی خلیفہ دوم مرزا بشیر الدین محمود کو ہاتھ باندھے تیار پایا۔[3] مرزا بشیر الدین محمود قادیانی تحریک کے تمام افراد سے زیادہ سیاسی بصیرت رکھتا تھا۔ اس نے اوائلِ خلافت میں کئی بار کشمیر کا دورہ کیا۔ وہاں کے حالات کا بچشم خود جائزہ لیا اور قادیانی تحریک کے لیے راہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کشمیر کے ناپختہ ذہن اور نئی ابھرنے والی قیادت کو اپنے ساتھ ملا کر اسے اس طرح استعمال کیا جائے کہ وہ قادیانی مقاصد کی تکمیل میں ممد و معاون ہو اور ان کے لیے کارآمد ہو سکے۔ اس کے ساتھ عام مسلمانوں میں بھی قادیانیت کا سلسلہ تبلیغ شروع کیا جائے۔ چنانچہ مرزا بشیر الدین کشمیر پر نگاہ جمائے مناسب موقع کے انتظار میں تھا کہ ادھر انگریز نے مہاراجہ ہری سنگھ سے بات چیت ختم کر کے منکرِ جہاد جناب مرزا بشیر الدین لعین کی طرف کشمیر میں سے جہاد اور شروع ہونے والی تحریک کو ختم کرنے کے لیے وحی بھیجی۔ وحی پاتے ہی بشیر الدین نے اپنی تمام مشینری کو متحرک کر دیا اور اپنوں کا لبادہ اوڑھ کر مکروہ عزائم کو بغل میں دبائے ہوئے میدانِ عمل میں کود پڑا۔ 1931ء میں قادیانیوں نے کشمیر میں گوناگوں سازشیں کیں۔ کشمیر پر تو ان کی قدیم نظر تھی ہی اور اسے قادیانی سٹیٹ بنانے کی زبردست خواہش ان کے دلوں میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ مرزا بشیر الدین محمود نے برطانوی مفادات کے تحفظ کے لیے کشمیر کے طول و عرض میں قادیانی فتنوں کا جال بچھا دیا۔ کشمیری مسلمانوں کی سادہ فطرت کہ وہ

قادیانیوں کی مذہبی چالوں کا شکار ہوتے چلے گئے۔

یہ قادیانی امت کا نہایت ہی خطرناک وار ہوتا ہے جب وہ کسی مسلمان کو اپنی مذہبی چالوں میں الجھا کر اس کا متاعِ ایمان لوٹتے ہیں۔ جب تک ایک مسلمان قادیانیوں کے مذہبی عقائد سے مکمل طور پر آگاہ نہ ہو' قادیانی اس کے ایمان پر ڈاکا ڈالتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھا لکھا طبقہ بھی جو قادیانی عقائد سے آگاہی نہیں رکھتا' وہ قادیانیوں کی مذہبی چالوں میں ایسا الجھتا ہے کہ وہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت پر کم اور مرزا قادیانی کی امت باطلہ پر زیادہ اعتماد کر بیٹھتا ہے اور لاعلمی میں ایسی بات کر بیٹھتا ہے جو اسے اپنے حقیقی مذہب سے بہت دور ضلالت وگمراہی کے ان عمیق گڑھوں میں پھینک دیتی ہے' جہاں سے نکلنا اس کے لیے نہ صرف مشکل بلکہ بعض اوقات ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔

کشمیر کمیٹی کا قیام

مرزا بشیر الدین محمود نے قادیانی امت کو برطانوی خواہشوں کے محور و مرکز پر مستحکم کیا اور اسے سیاسی تحریک بنا دیا' جو برطانوی استعمار کی خدمت گزار اور اپنے اقتدار کی طلب گزار ہو گئی۔ قادیانی فتنہ نے اپنے سو برس میں مسلمانوں کے کسی ابتلاء' کسی تحریک' کسی افتاد اور کسی مصیبت میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ وہ ہمیشہ مسلمانوں سے الگ تھلگ اور انگریزوں کی مرضی کے تابع رہے۔ انگریزوں میں یہودی اقوام کی اکثریت ہے اور یہودی مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن ہے جس پر قرآن گواہ ہے.........

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ. (المائدہ: آیت 82)

ترجمہ: ''تو سب لوگوں میں زیادہ دشمنی مسلمانوں سے' یہود میں پائے گا۔''

لہٰذا مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن انگریز کا فرمانبردار فتنہ مسلمانوں کے لیے کب دوست ہو سکتا ہے؟ لیکن ریاست کشمیر کے مسلمانوں کی ہمدردی کے نام پر انھوں نے کشمیر کمیٹی کا کھڑاک رچایا' جس کی ڈونڈی گلی گلی' کوچہ کوچہ' قریہ قریہ پیٹتے رہے کہ ہم نے کشمیر کی آزادی کے لیے بڑی جدوجہد کی ہے۔

بادۂ عصیاں سے دامن تر بہ تر ہے شیخ کا
اس پہ دعویٰ ہے کہ اصلاحِ دو عالم ہم سے ہے

کشمیر میں ڈوگرہ حکومت کے مظالم نے مسلمانانِ کشمیر کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی وہ انتہائی کسمپرسی کے عالم میں انتہائی صبر کے ساتھ حیاتِ مستعار کے دن گزار رہے تھے لیکن جب قرآن کی بےحرمتی اور مسجد کی شہادت کے واقعات رونما ہوئے تو ریاست کشمیر میں مسلمانوں کے دلوں میں غم وغصہ کی

لہر دوڑ گئی اور مسلمان سراپا احتجاج بن گئے۔ ریاست جلسوں اور جلوسوں سے گونج اٹھی۔ زبردست ہڑتالیں ہوئیں، بیسیوں مسلمان جامِ شہادت نوش کر گئے۔ سینکڑوں زخمی ہوئے اور ہزاروں پسِ دیوار زنداں چلے گئے۔ سفاک ڈوگرہ فوج نے سینکڑوں مسلمانوں کے گھروں کو نذرِ آتش کر دیا اور تمام بڑے بڑے لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ چنانچہ ایسے نازک حالات میں 25 جولائی 1931ء کو شملہ میں نواب سر ذوالفقار کی فیئر ویو نام کی دو منزلہ کوٹھی میں کشمیر کی سیاسی صورتِ حال پر غور وخوض کے لیے ایک میٹنگ ہوئی جس میں علامہ اقبال نے بھی شرکت کی۔ بدقسمتی سے صدارت مرزا بشیر الدین نے کر ڈالی اور آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے صدر بھی وہی بن بیٹھے۔ اس اجلاس میں کمیٹی کے منتخب ہونے والے سیکرٹری جنرل بھی قادیانی جماعت کے مبلغ اور کارکن عبدالرحیم ورد تھے۔ آغاز میں اس کمیٹی میں تیرہ اصحاب نے شرکت کی۔[4]

کشمیر کمیٹی قادیانی جماعت کی گھناؤنی چال

مرزائیوں نے کشمیر کو 1921ء سے اپنی سیاسی و مذہبی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا مرکز بنا رکھا تھا۔ آج کوئی سا موقع ہو، قادیانی کشمیر میں مسلمانوں کی ہمدردی کی محبت کے نام پر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جبکہ مرزائی مسلمانوں کے دیگر قومی وملکی مسائل میں مسلمانوں کی حمایت تک نہیں کرتے بلکہ مسلمان دشمن قوتوں کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں۔ ذہنوں میں سوال اٹھتا ہے کہ وہ گروہ جنھوں نے جھوٹی نبوت کا ڈھونگ رچا کر ملتِ اسلامیہ کے سامنے اپنا ایک خود ساختہ نبی کھڑا کیا اور انگریز کے اقتدار کو طول دینے کے لیے ملتِ اسلامیہ کی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی ناپاک جسارت کی، وہ طائفہ جس نے خلافتِ عثمانیہ کی تباہی پر جشنِ چراغاں کیا تھا، وہ جماعت جس کے سربراہ اور کشمیر کمیٹی کے صدر مرزا بشیر الدین نے شاتم الرسول راجپال کے قتل پر مسلمانوں کے زخمی سینے پر مرچیں چھڑکتے ہوئے کہا تھا:

> ''وہ نبی بھی کیسا نبی ہے جس کی عزت کو بچانے کے لیے خون سے ہاتھ رنگنے پڑیں۔''
>
> (خطبہ جمعہ مرزا بشیر الدین محمود خلیفہ قادیان مندرجہ اخبار الفضل قادیان جلد 16 نمبر 82 صفحہ 8-7 مورخہ 19 اپریل 1929ء)

وہ جتھہ جس کے بنیادی عقیدے کے مطابق تمام مسلمانانِ عالم کافر، کتے، خنزیر، حرام زادے اور کنجریوں کی اولاد ہیں، وہ جماعت کشمیر کے مسلمانوں کی محبت میں کیوں تڑپنے لگی؟ وہ جماعت کیوں کشمیری مسلمانوں کے مقدمات کے پیروی کے لیے اپنے وکلاء کشمیر بھیجنے لگی؟ اس جماعت کو کشمیری

مسلمانوں کی ہمدردی کا خیال کیسے آ گیا؟ یہ محبت یہ ہمدردی سب کچھ کشمیر کو قادیانی ریاست بنانے کی خواہش کروا رہی تھی۔ 25 جولائی کو کشمیر کمیٹی کا قیام عمل میں آیا اور اس کے ٹھیک سترہ دن بعد 12 جون 1931ء کے اخبار ''الفضل'' قادیان نے لکھا:

''حضرت امام جماعت احمدیہ ایدہ اللہ تعالیٰ العزیز جو پہلے ہی مناسب موقع کے انتظار میں تھے، یکا یک میدانِ عمل میں آ گئے۔''

قادیانیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ کشمیری مسلمانوں کو ان کی مظلومانہ بے کسی کی زندگی سے نجات دلانے کے لیے کشمیر کمیٹی کی صورت میں آگے بڑھے تھے، یہ بھی کشمیر سے غداری کا ایک انداز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قادیانی اپنی انگریز دوستی کی بنا پر اس بات کے خواہش مند تھے کہ جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی سے گلاب سنگھ نے کشمیر خرید لیا تھا۔ ہم (مرزائی) کشمیر میں ہمدردی کا روپ دھار کر داخل ہوں گے۔ انگریز ہماری وفاداری کے عوض کچھ ترامیم کرے گا اور پھر وہ وقت بھی آ جائے گا کہ ہماری اس محنت کے صلہ میں کشمیری ہمیں (مرزائیوں کو) محبت اور شفقت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور یوں پورے کشمیر میں ایک ہمہ گیری پیدا کر کے انگریز سامراج سے اپنے مخصوص عزائم کی تکمیل کے لیے سودا بازی کر کے گلاب سنگھ کو زیادہ رقم دے کر کشمیر کو خرید لیں گے، جس طرح پنجاب میں ربوہ خریدا گیا۔[5]

کشمیر کمیٹی کا قیام اور تحریک آزادئ کشمیر میں قادیانیوں کی شمولیت کا ایک پس منظر یہ بھی تھا کہ اس زمانے میں ایشیا' انگلستان اور روس کی باہمی جنگ وجدل کا میدان بنا ہوا تھا۔ انیسویں صدی کے اوائل سے روس نے توسیع پسندی کی جس پالیسی پر عمل کرنا شروع کیا تھا اس نے برطانوی اقتدار کے لیے خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی کہ اب روس، افغانستان اور کشمیر کے راستے ہندوستان میں داخل ہو جائے گا۔ اس کا تذکرہ جوزف بل کی کتاب (Danger of Kashmir) میں موجود ہے۔ برطانوی حکومت نے اپنی حکومت کے استحکام کے لیے ضروری سمجھا کہ وہ شمال مغربی ہند کے اُن تمام علاقوں کو براہ راست اپنے کنٹرول میں لے لے جہاں اشتراکی سرگرمیاں جاری تھیں' اور جہاں سے روس کے لیے مداخلت کے راستے موجود تھے اور ان سرحدی علاقوں میں ایسی وفادار جماعتوں کو پالا جائے جو ایک طرف آزادی کی تحریک کو سبوتاژ کر سکیں اور دوسری طرف برطانوی حکومت کے لیے مخبری کے فرائض انجام دیں۔ ان علاقوں کو براہ راست اپنے کنٹرول میں لینے کی راہ میں معاہدۂ امرتسر رکاوٹ تھا، جس کے تحت مہاراجہ کی رضامندی ضروری تھی لیکن مہاراجہ اپنی ریاست کے ایک انچ حصے سے بھی دستبردار ہونے کو تیار نہ تھا۔ چنانچہ اس کی نگاہ قادیانی جماعت پر پڑی جو اس کی اپنی خود کاشتہ تھی اور جس کی وفاداریوں کو انگریز بارہا آزما چکا تھا۔ چنانچہ قادیانی جماعت جس نے پہلے کسی بھی تحریک میں حصہ نہ لیا تھا

جو انگریز کی وفادار ترین جماعت تھی، اس کا اس تحریک میں حصہ لینا اس بات کی پختہ علامت تھی کہ وہ اپنے آقا فرنگی کے اشاروں پر ناچ رہی ہے۔ انھیں کشمیر کے مفادات اور مسلمانوں پر ہونے والے مظالم سے کوئی دلچسپی نہیں' حالانکہ اس سے پہلے عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا' ہندوستان کے مسلمان تڑپ اٹھے' تحریک خلافت کا آغاز ہوا' اس موقع پر قادیانی نہ صرف اس تحریک سے علیحدہ رہے بلکہ جب ترکی کو شکست ہوئی اور بغداد برطانوی قبضہ میں چلا گیا تو قادیان میں جشنِ فتح منایا گیا۔ 27 نومبر کو انجمن احمدیہ برائے امداد جنگ کے زیر اہتمام حسب ہدایت مرزا بشیر الدین محمود گورنمنٹ برطانیہ کی شاندار اور قابل یادگار فتح کا جشن منایا گیا۔ نماز مغرب کے بعد اندرون قصبہ میں روشنی اور چراغاں کیا گیا۔ خاندانِ مسیح موعود کے مکانات پر بھی چراغ روشن کیے گئے۔[6] جن قادیانیوں کا یہ کردار اور جن کی انگریز سے وفاداریاں اس عروج کو پہنچی ہوئی تھیں اور جنھوں نے مسلمانوں کی ہر تحریک کی مخالفت کی تھی انھوں نے آزادی کشمیر کی تحریک میں محض برطانوی مفادات کے حصول کے لیے شرکت کی۔ کشمیر کمیٹی کے قائم ہوتے ہی مرزا بشیر الدین نے ہر عام و خاص کو یہ تاثر دیا کہ ان کی صدارت میں اس کمیٹی کو قائم کر کے ہندوستان بھر کے سرکردہ مسلمان اکابرین نے ان کے والد مرزا غلام احمد قادیانی کے مسلک پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اس شر انگیز پروپیگنڈے کے جلو میں قادیانیوں نے انتہائی عجلت کے ساتھ اپنے مبلغین کو جموں کشمیر کے طول و عرض میں پھیلانا شروع کر دیا تاکہ وہ ریاست کشمیر کے سادہ لوح عوام کو ورغلا کر انھیں اپنے خود ساختہ نبی کا پیروکار بنانا شروع کر دیں۔ یہ مہم کافی کامیاب رہی۔ کشمیر کے کئی دوسرے مقامات کے علاوہ شوپیاں میں مسلمانوں کی خاصی تعداد قادیانی بن گئی۔ پونچھ شہر میں بھی مسلمانوں کی اکثریت نے قادیانی مذہب اختیار کر لیا۔[7] تحریکِ آزادی کے مبلغین کی امداد کے لیے قادیانیوں نے اکثر رقوم شیخ محمد عبداللہ کی معرفت دیں۔[8] شیخ صاحب اپنے دور میں گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے رہے۔ وہ کبھی ڈوگرہ حکومت کے مرہون منت رہے اور کبھی قادیانی انھیں انگلیوں پر نچاتے رہے۔ یہی وجہ تھی جس کی بنا پر پنجاب میں شیخ عبداللہ کے قادیانی ہونے کے چرچے ہونے لگے۔ آزادیٔ کشمیر کے نام پر سب سے پہلی قربانی جو 27 افراد نے دی تھی ان مجاہدین میں ایک مجاہد ایسا بھی تھا جس نے اپنے آخری سانسوں میں شیخ عبداللہ کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ شیخ صاحب! ہم نے اپنا کام کر دیا۔ آپ اپنا فرضِ ادا کریں۔[9] لیکن تاریخ شاہد ہے شیخ صاحب نے کشمیر کی آزادی میں کیا کردار ادا کیا۔ بہر حال جب قادیانیوں کی سرگرمیوں کا رئیس الاحرار' امیرِ شریعت عطاء اللہ شاہ بخاری کو علم ہوا تو وہ فوراً پونچھ شہر پہنچے اور اپنی خطیبانہ آتش بیانی سے قادیانیت کے ڈھول کا پول کھولا کہ پورا شہر جس کی آبادی مرزائی بن چکی تھی۔ ساری کی ساری تائب ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گئی۔[10]

علامہ اقبال اور کشمیر کمیٹی

کشمیر کمیٹی اب تک دستور کی تدوین کے بغیر کام کر رہی تھی جب یہ کمیٹی قائم ہوئی تو خیال یہ تھا کہ یہ ایک عارضی کمیٹی ہوگی' اس لیے اس کا دستور مدون نہ کیا گیا اور صدر کو غیر معمولی اختیار دیے گئے تھے۔ لاہور میں جب آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا دوسرا اجلاس منعقد ہوا تو اس میں مجلسِ احرار کے بعض راہنماؤں نے بھی شرکت کی۔ اس اجلاس میں جب یہ مطالبہ کیا گیا کہ کمیٹی کا کوئی باقاعدہ دستور مرتب کیا جائے تو قادیانی جماعت نے اس کی پُر زور مخالفت کی۔ کمیٹی کے آئین کے مطالبے سے قادیانی سمجھ گئے کہ اس سے انھیں اور ان کے امام کو بے دخل کرنا مقصود ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود نے جب کام بنتا نہ دیکھا تو بطور احتجاج استعفیٰ دے دیا اور علامہ اقبال کمیٹی کے نئے صدر منتخب ہو گئے۔ قادیانی ہی کشمیر کمیٹی کے روح رواں تھے۔ وہ کشمیر کمیٹی سے زیادہ اپنے امام کے مطیع تھے۔ اس لیے مرزا بشیر الدین کے استعفیٰ کے بعد انھوں نے کمیٹی میں دل چسپی لینا ترک کر دی اور عملاً بائیکاٹ کر دیا۔ قادیانی وکلاء جو ریاست کشمیر میں مسلمانوں کے مقدمات لڑ رہے تھے ان مقدمات کو ادھورا چھوڑ کر واپس آ گئے، جن میں سر ظفر اللہ (قادیانی) بھی شامل تھے۔ اس کے بعد قادیانیوں نے کشمیر کمیٹی کے راستے میں روڑے اٹکانے شروع کر دیے۔[11] ان حالات سے مجبور ہو کر علامہ اقبال نے بھی کشمیر کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا اور کمیٹی توڑ دی۔ علامہ اقبال نے کشمیر کمیٹی سے اپنی صدارت کے استعفیٰ پر لکھا۔ ''بدقسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل ہو گئے ہیں جو اپنے مذہبی فرقہ کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا گناہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ قادیانی وکلاء میں سے ایک صاحب نے جو میر پور کے مقدمات کی پیروی کر رہے تھے' حال ہی میں اپنے ایک بیان میں واضح طور پر اس خیال کا اظہار کر دیا' انھوں نے صاف طور پر کہا کہ وہ کسی کشمیر کمیٹی کو نہیں مانتے اور جو کچھ انھوں نے یا ان کے ساتھیوں نے اس ضمن میں کیا وہ ان کے امیر کے حکم کی تعمیل تھی۔''[12]
کشمیر کمیٹی کے خاتمہ کے بعد بھی عیار قادیانی جماعت نے اپنی عیاری اور مکاری کو برقرار رکھنا چاہا۔ انھوں نے تحریکِ کشمیر کے نام سے الگ ادارہ قائم کر لیا اور اس کی صدارت کا عہدہ علامہ اقبال کو دینا چاہا۔ علامہ اقبال اب قادیانی امت کے سخت مخالف بن چکے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ تحریک کشمیر کے نام پر قادیانی اپنے عقائد کی نشر و اشاعت کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے اس آفر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ان واقعات کے بعد علامہ اقبال نے قادیانی تحریک کی سختی سے مخالفت کی۔ اسے ایک گمراہ کن فتنہ قرار دیا اور مسلمانوں کو اس سے باخبر رہنے کا فرمایا۔ پھر پنڈت نہرو کے سوالات کے جواب میں قادیانی تحریک کی مذہبی اور سیاسی غرض و غایت اور اس کے گھناؤنے کردار پر مقالات تصنیف کیے۔ اپنے

ان بیانات اور طرزِ عمل سے علامہ اقبال نے قادیانی فتنہ پر ایسی ضربِ کاری لگائی کہ قادیانی سازشوں کا مقصد کھل کر لوگوں کے سامنے آ گیا۔

کھلتے نہیں اس قلزمِ خاموش کے اسرار
جب تک تُو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے

اس کے بعد 1936ء میں قادیانیوں نے کانگریس سے حالات استوار کرنے شروع کر دیے اور 1940ء میں قراردادِ پاکستان کے بعد اپنی سازشیں تیز کر دیں۔

کشمیر کمیٹی میں مرزا بشیر الدین محمود کی صدارت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ قادیانی کارکن آسانی سے خفیہ راز انگریز تک پہنچاتے رہے کیونکہ جب علامہ اقبال اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے کشمیر کمیٹی کو یہ لکھا کہ آئندہ کمیٹی کا صدر غیر قادیانی ہوا کرے گا تو اس سے قادیانیوں کے ایوانوں میں ہلچل مچ گئی۔ علامہ اختر فتح پوری فرماتے ہیں کہ مرزا بشیر الدین کے خاندان کے ایک انتہائی قریبی عزیز نے میرے پاس بیان کیا کہ:

> ''حضور (مرزا بشیر الدین محمود) تمام کارگزاری کی رپورٹ باقاعدہ طور پر انگریزی حکومت کو بھجوایا کرتے تھے۔ ایک رات پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے دو آدمی علامہ اقبالؒ کے مکان ئے۔ انھوں نے علی بخش سے پوچھا۔ علامہ صاحب کہاں ہیں؟ ہم ان سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ علی بخش نے کہا وہ سو رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ انھیں فوراً جگا دیں۔ ہمیں ان سے ایک ضروری کام ہے اور اسی وقت ہم نے واپس بھی جانا ہے۔ علامہ قریب ہی سوئے ہوئے تھے۔ ان کی آواز سن کر بیدار ہو گئے تو انھوں نے علامہ اقبال کے سامنے وہ تمام ریکارڈ رکھ دیا جو مرزا بشیر الدین نے گورنمنٹ کو بھیجا تھا۔ نیز انھوں نے کہا کہ اگر ہمارے متعلق یہ پتہ چل جائے کہ ہم یہ فائلیں اٹھا کر یہاں آئے ہیں تو ہماری سزا موت کے سوا کچھ نہیں۔ مگر ہمیں اس بات پر حیرت ہے کہ آپ نے ایک ایسے آدمی کو کشمیر کمیٹی کا صدر بنایا ہوا ہے جو گورنمنٹ جاسوس ہے۔''[13]

حواشی

1. شہاب نامہ ص359۔
2. شہاب نامہ ص359۔
3. مسئلہ کشمیر اور مرزائی۔
4. اقبال اور کشمیر۔
5. کشمیر اور مرزائی ص8۔
6. قادیانی آزادیٔ کشمیر کے دشمن ص8۔
7. شہاب نامہ ص370۔
8. کچھ پریشان یادیں کچھ پریشان تذکرے ص130۔
9. روزنامہ جنگ 11 جولائی 1992ء۔
10. شہاب نامہ ص370۔
11. ممتاز احمد: مسئلہ کشمیر ص18۔
12. اقبال اور سیاست ملی ص303۔
13. قادیانی تحریک کا سیاسی پس منظر ص30-31۔

”اقبال دشمنی“ کے جواب میں

خالد نظیر صوفی

خاندانِ اقبالؒ میں قادیانیوں کی واحد نقب اور اس کا ردِ عمل

یہاں میرے پیشِ نظر یہ بحث بالکل نہیں کہ قادیانیت کن عوامل کے تحت معرضِ وجود میں آئی یا لائی گئی اور اس کا اصل منتہائے نظر کیا تھا...... یا اس کے پس منظر اور پیش منظر میں کون کون اپنے اپنے فوائد کے لیے مصروفِ عمل رہا...... اس پر اب تلک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی اسی شدومد کے ساتھ لکھا جاتا رہے گا۔ مجھے تو یہاں صرف اور صرف اس سے سروکار ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے کب "منکرِ ختمِ نبوت" ہونے کا اعلان کیا اور اپنے اس باطل دعویٰ نبوت سے قبل وہ کس حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے رہے۔

اس حقیقت سے سبھی آگاہ ہیں کہ مرزا قادیانی نے اپنے قیامِ سیالکوٹ میں، جو اُن کے اپنے بیان کے مطابق تقریباً سات برس[1] پر محیط رہا، مناظروں کا بازار خوب گرم رکھا۔ اہالیانِ سیالکوٹ کو جو اُن دنوں آریہ سماجی تحریکوں اور مسیحی پادریوں کی یلغار سے بے حد پریشان تھے اور کسی طور ان سے مقابلہ نہیں کر پا رہے تھے، بے حد متاثر کر لیا اور ایک طرح سے اس وقت ایک دینی سکالر کی حیثیت حاصل کر لی۔ چنانچہ اس دور کے ماحول کے مطابق سیالکوٹ اور خاص طور پر کشمیری محلہ جس کے کوچہ حسام الدین میں مرزا صاحب کا قیام رہا، کا شاید ہی کوئی گھرانا ایسا بچا ہو جو مرزا قادیانی کی اسلام دوستی سے متاثر نہ ہوا۔ اس وقت تک مرزا صاحب زیادہ سے زیادہ ایک پرہیز گار انسان کی حد تک مذہب میں دخیل تھے اور ممکن ہے کہ وہ ان موافق حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی قسم کے پیری مریدی کے عمل میں بھی ملوث رہے ہوں اور سادہ لوح مسلمانوں سے بیعت تک لیتے رہے ہوں۔ چنانچہ اس وقت کے آثار آج تک یہاں موجود ہیں اور بے شمار نا کردہ گناہ اس الزام سے خود کو بری الذمہ قرار نہیں دلوا سکے کہ وہ مرزا قادیانی کے پیروکار ہیں یا کبھی تھے۔

یہاں اصل حقیقت کو فراموش کر کے مرزا قادیانی کے ساتھ کسی بھی قسم کے تعلق کو مرزائیت یا قادیانیت پر منتج کر دیا جاتا ہے حالانکہ جو افراد مرزا صاحب کے دعویٰ نبوت سے قبل ان کے کسی طور

دوست یا ساتھی رہے، وہ کسی طرح بھی اس زمرے میں نہیں آتے کہ انھیں منکرینِ ختم نبوت کی صف میں شامل کیا جائے۔ ہاں جنھوں نے دعویٰ نبوت کے بعد بھی ان سے تعلقِ خاطر منقطع نہیں کیا یا جنھوں نے ان کے اس دعویٰ باطل کے بعد ان کی بیعت کی، وہ یقیناً اس زمرے میں آئیں گے۔ اور ان کو ہی ماضی قریب میں غیر مسلم قرار دیا جا چکا ہے اور وہ اب ایک علیحدہ اقلیت کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

اب یہاں ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ''خاندانِ اقبال'' کے کن افراد نے مرزا قادیانی کے ساتھ ان کے دعویٰ نبوت کے بعد تعلق رکھا۔ مرزا صاحب کے 1864ء سے 1868ء تک کے قیام سیالکوٹ [2] میں یقیناً ان کا تعلق خاندانِ اقبال کے ساتھ تھا کیونکہ ایک تو وہ اسی علاقے میں رہائش پذیر رہے، دوسرے والدِ اقبال شیخ نور محمد صاحب چونکہ اہلِ تصوف میں ان دنوں ایک مقامِ خاص کے حامل تھے اور سلسلہ قادریہ میں سائیں عبداللہ قادریؒ سے بیعت [3] تھے، اس لیے ظاہر ہے کہ سیالکوٹ کے مذہبی حلقوں میں جانی پہچانی شخصیت تھے۔ جب مرزا غلام احمد نے اپنے قیامِ سیالکوٹ کے دوران دفاعِ اسلام کا کام شروع کیا اور مناظروں کا بازار خوب گرم کر دیا تو یہاں کے مذہبی حلقوں میں ان کا خوب چرچا ہوا اور وہ ہر مسلمان کی آنکھ کا تارا بنے۔ سیالکوٹ کے بیشتر گھرانے ان دنوں اس جہاد میں برابر کے شریک تھے اور ان کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ہوئے تھے۔

مرزا صاحب کی زندگی کے تین ادوار نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔ اوّل وہ امتِ مسلمہ کے ایک سرگرم مبلغ کی حیثیت میں اپنا کام شروع کرتے ہیں۔ ان دنوں وہ زیادہ سے زیادہ کشف کا دعویٰ کرتے تھے۔ 1892ء میں انھوں نے ''مسیحِ موعود'' ہونے کا دعویٰ کیا اور پھر 1901ء میں وہ مستقل نبوت کا اعلان فرماتے ہیں جس پر وہ اپنی وفات یعنی 1908ء تک قائم رہے۔ اگر مرزا صاحب کے اس دور کے بیانات و ''الہامات'' کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کے عقلی معیار پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ عجیب و غریب تضادات کا شکار رہے۔ کبھی وہ مشرق کی ہانکتے ہیں تو کبھی مغرب کی۔ ان کو شاید خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ دراصل کیا کہنا یا کیا بننا چاہ رہے ہیں۔ یا پھر وہ بڑے چالاک واقع ہوئے تھے کہ لوگوں کو عجیب گو مگو کا شکار بنا کر اپنا مطلب نکالنا چاہتے تھے اور اس میں شاید وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہے۔ درحقیقت وہ ایک گم کردہ راہ مرید کے مترادف تھے جو تصوف کی بھول بھلیوں میں اس مقام تک جا پہنچتا ہے جہاں اگر صحیح رہنمائی میسر نہ آئے تو گمراہ ہو جانا لازم ٹھہرتا ہے...... یہ وہ مقام ہے جہاں ہر طالب راہِ سلوک اپنے آپ کو ہر چیز، ہر ہستی کا مثیل سمجھنے لگتا ہے اور ''انا الحق'' تک کا دعویٰ کر دیتا ہے...... جو اس مقام پر پھنس گیا، اس کی دنیا بھی گئی اور آخرت بھی۔ یقیناً مرزا قادیانی بھی اس مقام پر پھنس کر رہ گئے تھے کیونکہ وہ اپنی ولایت اور الہامات کا دعویٰ تو پہلے ہی فرما رہے تھے۔ اگر وہ اس مقام کو درست طریق

سے عبور کر جاتے تو یقیناً ایک ولی کامل ہوتے مگر جب وہ اس پر ہی پھنس گئے تو پھر وہ ''سب کچھ'' تھے۔ اسی لیے کبھی وہ دعویٰ نبوت کرتے ہیں اور کبھی رسالت' کبھی وہ اِدھر بھاگتے ہیں اور کبھی اُدھر۔ کیونکہ ان کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ آخر ہیں کیا؟ یہاں تک کہ وہ ہندوؤں کے اوتار کرشن اور حضرت عیسیٰ کی ماں مریم تک بننے کو تیار ہیں۔ ان کے اس مقامِ گمراہی سے سب سے زیادہ فائدہ ان کے خلیفہ اوّل حکیم نور الدین نے اٹھایا اور ان کو کبھی بھی اس گمراہی سے نکلنے کا موقع نہ دیا۔

آمدم برسر مطلب دیکھنا یہ ہے کہ مرزا قادیانی کے دعویٰ نبوت یعنی 1901ء کے بعد خاندان اقبال میں سے کون ان کے ساتھ منسلک رہا یا اس کے بعد ان پر ''اظہار ایمان'' کیا یا ''بیعت'' وغیرہ کا مرتکب ہوا۔ والدِ اقبال شیخ نور محمد مرحوم کے متعلق خود مرزا غلام احمد کے صاحبزادے مرزا بشیر احمد نے اپنی کتاب ''سیرت المہدی جلد 3'' کے صفحہ 249 پر تحریر کیا ہے کہ انھوں نے 1893ء سے قبل ہی جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی یعنی مرزا صاحب کے دعویٰ نبوت سے بہت پہلے وہ ان سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے جو تعلق بھی تھا' وہ صرف اور صرف تصوف کی وجہ سے تھا۔ یعنی مطلب صاف ہے کہ خاندانِ اقبال کے جن افراد نے مرزا صاحب کا شاید ایک مبلغ اسلام کی حیثیت میں ساتھ دیا' ان کے دعویٰ نبوت سے بہت پہلے ہی ان سے وہ تعلق بھی ختم کر چکے تھے۔ اس لیے کسی قسم کی بہتان تراشی درست نہیں۔ چنانچہ خاندانِ اقبال کے تمام افراد اس سے بری الذمہ ثابت ہو جاتے ہیں کہ وہ کبھی بھی منکرینِ ختم نبوت کے گروہ میں شامل رہے۔ البتہ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ خاندان کے صرف ایک فرد کو 1931ء[4] میں جماعت قادیانی کا ممبر بننے اور آخر دم تک اس سے منسلک رہنے اور غیر مسلم قرار دیے جانے کی ''سعادت'' نصیب ہوئی۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ خاندانِ اقبال میں جو واحد نقب قادیانیوں نے لگائی' وہ صرف شیخ اعجاز احمد صاحب کے ذریعے ممکن ہو سکی۔ افرادِ خاندان میں سے کسی نے نہ تو ان سے قبل اور نہ ہی ان کے بعد مرزا قادیانی کی نبوت کا ساتھ دیا اور نہ کبھی انشاءاللہ دیں گے۔ اسی پر بس نہیں کہ خاندان میں سے کوئی ان کا ساتھی نہیں بنا بلکہ ان کے اپنے اہل وعیال نے بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ممانی چاند مرحومہ (بیگم شیخ اعجاز احمد صاحب) تو قادیانی جماعت کے انتہائی درجہ کے مخالفین میں شامل تھیں اور کبھی کبھی غصے میں آ کر ان کے اندرونِ خانہ حالات وواقعات پر بڑی سیر حاصل روشنی ڈالا کرتی تھیں۔ انھیں بڑے عجیب وغریب حقائق کا علم تھا اور وہ اکثر اوقات بڑے ذومعنی انکشافات اس سلسلے میں فرمایا کرتی تھیں۔ شاید کچھ اور وجوہات بھی رہی ہوں مگر سب سے اہم وجہ بیگم اعجاز صاحب تھیں جو سدِ راہ بنیں اور کسی بچے کو باپ کی پیروی نہیں کرنے دی۔ ان کا رویہ اس سلسلے میں اس قدر سخت اور واضح تھا کہ انھوں نے تمام بچوں کی شادیاں بھی غیر قادیانیوں میں

ہی کروائیں۔

یہاں اس حقیقت سے شاید مفر نہیں کہ متذکرہ بالا نقب جو خاندانِ اقبال میں لگائی گئی' غلبہ مادیت کی بنا پر بصیرت سے محرومی اور خواہشِ منصب و جاہ کی وجہ سے ہوش و حواس سے تہی دستی کے بعد ہی ممکن ہوئی۔ ع

از چنیں مرداں چہ امید بہی؟

خاندان کے بزرگوں کا ردِ عمل

والدِ گرامی جناب نظیر احمد صوفی مرحوم و مغفور اس کے راوی ہیں کہ میرے بڑے ماموں شیخ اعجاز احمد صاحب نے جب 1931ء میں جماعتِ قادیانی میں باضابطہ شمولیت اختیار کی تو ایک اخبار کے صفحہ اوّل پر بڑے نمایاں طور پر یہ خبر شائع کی گئی اور سب سے اوپر بڑے جلی حروف میں حکیم الامت شاعرِ مشرق کا نام نامی پورے القابات کے ساتھ لکھا گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ حضرت علامہؒ نے ہی بیعت کر لی ہے مگر نیچے دوسری سطر میں بہت خفی قلم سے شیخ اعجاز احمد کے بیعت کرنے کی خبر تھی۔ اس کی وجہ سے کافی غلط فہمی پیدا ہوئی اور ہر طرف اس کے متعلق چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔

والدِ مرحوم بیان کرتے ہیں کہ..... ''اس واقعہ کے چندروز بعد کی بات ہے' میں بھی اس وقت وہیں بازار میں موجود تھا۔ ابا جان (شیخ عطا محمد مرحوم) اقبال منزل کے بازار کی جانب والی میڑھیوں کے سامنے کھڑے تھے' جب کسی نے ایک اخبار ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس اخبار میں ایک تو متذکرہ بالا خبر چھپی ہوئی تھی اور دوسرے مرزا بشیر الدین محمود کا ایک بیان تھا جس میں انھوں نے خاص طور پر علامہ صاحب کو مشورہ دیا ہوا تھا کہ انھیں اپنے قابل بھتیجے کی ''پاکیزہ جوانی'' سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ وغیرہ۔ اخبار شیخ صاحب کے ہاتھ میں دے کر وہ شخص خاص طور پر ان دونوں خبروں کے بارے میں ان کے خیالات معلوم کرنے کا خواہش مند ہوا۔ وہ یقیناً جماعتِ قادیانی کا فرستادہ تھا اور شیخ صاحب کو جان بوجھ کر زچ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔'' میرے والد گرامی بتاتے ہیں کہ..... ''بڑے شیخ صاحب اس پر بڑے سیخ پا ہوئے اور انھوں نے سب سے پہلے تو اس تماش بین کی خبر لی اور حسبِ عادت اس پر خوب برسے۔ پھر مرزا غلام احمد' مرزا بشیر الدین محمود' اپنے خلفِ اکبر اور جماعت قادیانی کی ''شان'' میں خوب خوب زہر افشانی فرمائی اور اپنے بڑے صاحبزادے شیخ اعجاز احمد کو ''ناخلف'' تک کہہ ڈالا۔ اس وقت ان کا چہرہ شدتِ جذبات اور غم کے زیرِ اثر بالکل زرد پڑ گیا تھا اور وہ غصے میں بری طرح کانپ رہے تھے کہ تشویش پیدا ہوگئی کہ کہیں کوئی تکلیف لاحق نہ ہو جائے۔ چنانچہ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر انھیں اقبال

منزل میں اوپر لے جایا گیا مگر ان کا غصہ کسی طور فرو نہ ہو سکا۔"

اسی ضمن میں، میں اپنی والدہ محترمہ وسیمہ مبارک کے بیان کردہ چند واقعات بھی یہاں درج کرنا چاہوں گا۔ یہ تمام واقعات میرے علم میں بہت پہلے سے تھے مگر "اقبال درونِ خانہ" (حصہ اوّل) میں اس لیے شامل نہ کیے گئے کہ ان کا ذکر خاندانِ اقبال کے لیے یقیناً کوئی ایسا باعثِ فخر نہیں تھا۔ شاید یہ تمام واقعات اور حقائق کبھی بھی منظرِ عام پر نہ لائے جاتے اگر شیخ اعجاز احمد صاحب اپنے بزرگوں کو خواہ مخواہ قادیانی ثابت کرنے پر مُصر نہ ہوتے۔

میری والدہ بتاتی ہیں کہ...... "جس روز اعجاز بھائی جان کی قادیانی بیعت کی خبر اخبار میں شائع ہوئی اور کسی نے شرارتاً ابا جان کو بازار میں وہ اخبار تھما کر طنز کیا، تو یوں سمجھیے کہ اقبال منزل پر قیامت گزر گئی...... ابا جان کو جب بڑی مشکل سے بازار میں سے اوپر لایا گیا تو وہ سیدھے اندر زنان خانے میں تشریف لے آئے اور تختوں والی نشست گاہ میں آ کر اس قدر بلند آواز میں گرجے برسے کہ پوری اقبال منزل متزلزل ہو اٹھی۔ ہم سب تو اندر کمروں میں دبکے ہوئے رہے۔ ابا جی کے پاس ماموں غلام نبی صاحب اور پھوپھی کریم بی بی صاحبہ تھیں۔ ابا جی کا غصہ اس روز ساتویں آسمان کی خبر لا رہا تھا اور بار بار ان کا روئے سخن بیچاری بھابھی جی (والدہ صاحبہ) کی طرف ہو ہو جاتا تھا اور وہ بھائی جان اعجاز کا سارا غصہ ان پر ہی نکال دینا چاہتے تھے۔ ماموں غلام نبی صاحب اور پھوپھی کریم بی بی صاحبہ ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے مگر یہ کسی طور ممکن نہ ہو سکا...... جس بات کا انھیں سب سے زیادہ رنج تھا وہ مرزا بشیر الدین کا وہ بیان تھا جس میں چچا جان (علامہ صاحب) کو اپنے پاکباز بھتیجے سے سبق حاصل کرنے اور اس کی پیروی میں اپنی عاقبت سنوارنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔"

والدہ مزید بتاتی ہیں کہ...... "میں نے ابا جان کا غصہ بہت دیکھا تھا مگر اس روز ان کی حالت بے حد عجیب ہو رہی تھی اور وہ کسی طرح سنبھل ہی نہیں رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ بھائی جان اعجاز کو اس کی سزا کس طرح دیں۔ اخبار کی وہ کاپی جس میں یہ خبر چھپی ہوئی تھی، ان کے ہاتھ میں تھی اور وہ اسے پٹخ پٹخ کر سارا غصہ اسی پر نکال رہے تھے اور بار بار اس میں چھپی ہوئی متذکرہ خبریں ماموں جان اور پھوپھی جان کو دکھاتے تھے اور پھر گرجنا اور برسنا شروع کر دیتے تھے۔ اس روز ان کا سارا غصہ اعجاز بھائی کے لیے تھا اور ساتھ میں مرزا غلام احمد، مرزا بشیر، ظفر اللہ خان، چوہدری بشیر، بٹ صاحب اور اعجاز بھائی کے کئی اور دوستوں کے نام لے لے کر انھیں کوستے تھے، جن کے متعلق انھیں پورا یقین تھا کہ اعجاز بھائی کو ورغلانے میں انہی کا ہاتھ ہے۔ ساتھ ساتھ وہ چچا جان (علامہ صاحب) کا ذکر بھی بار بار کر رہے تھے کہ "اعجاز ناہنجار کی اس حرکت سے اسے (علامہ صاحب کو) کس قدر تکلیف اور کوفت ہوگی۔ خدا خدا

کر کے اباجی کا غصہ قدرے کم ہوا تو وہ حسب عادت خط لکھنے بیٹھ گئے ......ان کی یہ عادت بہت پرانی تھی کہ کوئی معاملہ ہوتا، فوراً خط لکھ کر سپردِ ڈاک کر دیتے اور اپنے خیالات اور مشوروں کا اظہار پوری سچائی کے ساتھ اپنے خطوط میں کر دیا کرتے تھے' خواہ بعد میں اس کے لیے پریشان اور پشیمان ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔ میں نے اباجی کی یہ عادت کئی دفعہ دیکھی ہے کہ جس وقت غصے میں ہوتے تو ایک دم اپنا فیصلہ صادر کر دیتے اور خوب گرجتے برستے مگر بعد میں جب غلطی کا احساس ہوتا تو اپنے سے چھوٹوں سے بھی معافی مانگنے میں عار نہ سمجھتے۔ کئی دفعہ ان کی زندگی میں اور اب اُن کی وفات کے بعد بھی ان کی اس قسم کی تحریریں جو خطوط کی شکل میں لوگوں کے پاس ہیں' ان کے خلاف استعمال ہوتی رہی ہیں بلکہ اب تک ہو رہی ہیں مگر وہ اپنی اس فطرتِ ثانیہ سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے...... چنانچہ اپنی اسی عادت کے زیر اثر انھوں نے اپنا غصہ اس روز بھی خطوط کے ذریعے نکالا اور اعجاز بھائی صاحب کے ساتھ ساتھ دس بارہ دوسرے افراد کو بھی کارڈ تحریر کر کے سپردِ ڈاک کر دیے۔ میرے خیال میں اعجاز بھائی کے ان دوستوں' جن کے متعلق انھیں یقین تھا کہ انھوں نے ہی بھائی صاحب کو گمراہ کیا ہے' کو انھوں نے ضرور خطوط روانہ کیے ہوں گے۔ جن میں خاص طور پر ظفر اللہ خان' ڈاکٹر بشیر احمد' بٹ صاحب وغیرہ شامل تھے۔ ان کے علاوہ مرزا بشیر الدین محمود کو بھی لازماً ایک خط گیا ہوگا۔ چچا جان (علامہ صاحب) کو تو وہ تقریباً ہر روز خط لکھتے تھے اس لیے اس واقعہ کی تفصیل بلاشبہ انھیں بھی روانہ کی ہو گی......ان خطوط میں کیا کچھ لکھا گیا' اس کی تفصیل سوائے اباجی کے شاید ہی کوئی دوسرا جان سکا ہو کیونکہ کس کی اتنی جرأت تھی کہ ان سے اس سلسلے میں دریافت کر سکتا یا ان کے خطوط یا کسی دوسرے کاغذ کو ہاتھ بھی لگا سکتا۔ ہمیں تو صرف اس قدر معلوم ہوا کہ اباجی نے سب کو بڑے سخت خطوط لکھے ہیں اور اب باقی کارروائی جوابات آنے کے بعد ہو گی۔"

میری والدہ خلد آشیانی اپنی پھوپھی زینب بی بی صاحبہ کے حوالے سے بتایا کرتی تھیں کہ......

"اعجاز احمد کے قادیانی مذہب اختیار کر لینے سے دونوں بھائی صاحبان (شیخ عطا محمد اور علامہ اقبال) کو ناقابلِ برداشت صدمہ ہوا تھا۔ خاص طور پر اقبال بھائی صاحب نے تو اس کو دل پر لگا لیا اور اکثر و بیشتر اس پر غم و غصے کا اظہار فرمایا کرتے۔ میرے خیال میں ان کی بیماری میں بھی اس کی وجہ سے خاصا اضافہ ہوا کیونکہ ان دنوں وہ پہلے ہی کافی علیل رہنے لگے تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ سردار بھابھی کی وفات کے علاوہ اعجاز احمد کا یہ فعل ان کے لیے سب سے زیادہ تکلیف کا باعث بنا تھا۔ میرے سامنے انھوں نے کئی بار اس پر دکھ اور رنج کا اظہار کیا اور بڑے بھائی صاحب کو بھی اس سلسلے میں کئی ایک خطوط لکھے اور بالمشافہ بھی تبادلہ خیالات کرتے ہوئے دیکھا جس میں وہ بار بار نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور خداوند تعالٰی کے حضور اس سلسلے میں باز پرس کا ذکر کرتے رہے۔ انھوں نے بڑے بھائی صاحب سے یہاں

تک کہا کہ...... ''اس سلسلے میں ہم دونوں ہی جواب دہ ہوں گے کہ یقیناً ہم سے ہی اعجاز کی تربیت میں کوئی کوتاہی ہوئی ہے کہ اس نے یہ انتہائی قدم اٹھایا ہے اور نہ صرف اپنے لیے بلکہ ہم سب کے لیے' روزِ حساب باعثِ ندامت ثابت ہوگا......''

والدہ محترمہ مزید بتاتی ہیں کہ...... ''پھوپھی زینب اپنا ایک چشم دید واقعہ یوں بیان کرتی تھیں کہ...... ''ایک روز میں نے دونوں بھائی صاحبان کو دیکھا کہ اقبال منزل میں بڑے بھائی صاحب کے کمرے میں بیٹھے زار و قطار روتے چلے جارہے ہیں۔ میں سمجھی کہ شاید بے جی اور میاں جی کو یاد کر رہے ہیں مگر جب قریب جا کر بیٹھی تو پتہ چلا کہ اعجاز احمد کا قادیانی ہو جانا زیر بحث تھا۔ اقبال بھائی صاحب ہمیشہ کے بڑے رقیق القلب تھے اور آخری عمر میں تو اس میں بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔ خاص طور پر رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام نامی ہی کسی کی زبان پر آ جاتا تو ان کی حالت غیر ہونے لگتی۔ اعجاز کے مرتد ہو جانے کا ذکر کرتے ہوئے بھی ان کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ بڑے بھائی صاحب کو بھی اس روز میں نے اس سلسلے میں ان کے ساتھ مل کر زار و قطار روتے ہوئے دیکھا۔ وہ بڑے سخت مزاج تھے مگر بڑھاپے نے بالکل بے بس کر دیا تھا اور وہ اعجاز احمد سے اس سلسلے میں باز پرس کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ میرا دل بھی اس صورتِ حال پر بھر آیا اور میں بھی ان کے ساتھ مل کر رونے لگی کہ اولاد انسان کو کس طرح بے بس کر دیتی ہے۔ میرے دونوں بھائی' جن میں سے ایک وہ (شیخ عطا محمد) جس کے رعب اور دبدبے کا یہ عالم ہوا کرتا تھا کہ انسان تو انسان در و دیوار تک کانپتے تھے' کسی کی کیا مجال تھی کہ ان کے حکم سے سرتابی کا خیال بھی دل میں لا سکے اور دوسرے وہ (علامہ اقبال) جن کو سارا زمانہ پوجتا تھا اور جو عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندہ مثال تھے۔ دونوں کو اپنے ہی خون نے بے دست و پا کر دیا تھا اور ان کے پاس سوائے دل و جگر جلانے کے اور کچھ حل اس مسئلہ کا نہیں تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ میرے دونوں بھائی اسی جانکاہ حادثہ کی نذر ہوئے اور بہت قلیل عرصے میں یکے بعد دیگرے اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ درحقیقت بارگاہِ خداوندی اور حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں باز پرس کا خوف ہی ان دونوں کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ اعجاز احمد نے دنیاوی فوائد کے حصول کے لیے اپنے باپ اور چچا دونوں کو روزِ محشر بڑی مشکل اور پُر از ندامت صورتِ حال میں گرفتار کر دیا۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ انسان اپنے بچوں کو کتنی محنت سے پالتا ہے پوستا ہے' پڑھاتا ہے لکھاتا ہے تاکہ اس کے بڑھاپے کا سہارا بنیں مگر ہم لوگوں کا سارا زور صرف اور صرف دنیا کے لیے ہی ہوتا ہے۔ بہت کم عاقبت کا خیال رکھتے ہیں اور ایسی اولاد کی تمنا کرتے ہیں جو روزِ محشر باعثِ ندامت ثابت نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سب کو اپنی پناہ میں رکھے۔''

علاوہ ازیں میرے والدِ گرامی کے بیان کے مطابق...... ''جب ابا جان (شیخ عطا محمد) کا آخری وقت قریب تھا تو ان کے تینوں صاحبزادگان میں سے کوئی بھی سیالکوٹ میں موجود نہیں تھا چنانچہ مجھے اپنے خسرِ محترم کا مرض الموت میں ہر طرح خیال رکھنا پڑا اور ان کی تیمارداری کا شرف حاصل ہوا۔ ان دنوں میں کئی بار ابا جی (شیخ عطا محمد) نے مجھ سے یہ ذکر کیا کہ ان کا قادیانی جماعت سے بالکل کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ ان دنوں بھائی اعجاز صاحب کا جو بھی خط آتا تھا' اس میں وہ اپنے والد کو بیعتِ قادیان کی ترغیب دیتے تھے کہ آپ حضرت صاحب کو خط لکھ دیں۔ ہر خط پڑھ کر ابا جی غصے میں لال پیلے ہو جاتے تھے اور مرزا قادیان' اس کے خلفاء اور ساتھ میں اعجاز صاحب کو بے نقط سناتے تھے اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے تھے۔''

والدِ گرامی مزید بتاتے ہیں کہ ''انھی دنوں جب اعجاز بھائی کا ایک خط آیا تو...... ابا جی (شیخ عطا محمد مرحوم) نے بڑے دکھ کے ساتھ مجھے بتایا کہ...... ''پہلے تو مجھے رغبت ہی دیا کرتا تھا مگر آج تو اس نابکار نے انتہا ہی کر دی ہے اور لکھا ہے کہ ''میں (اعجاز احمد) نے آپ کی جانب سے جماعت کو آگاہ کر دیا ہے کہ آپ پوری طرح بیعت کے لیے آمادہ ہیں اور بہت جلد اس سلسلے میں خط روانہ کر دیں گے۔'' اس روز ابا جی کی حالت دیدنی تھی۔ بیماری کی وجہ سے وہ پہلے ہی بڑے لاچار ہو رہے تھے۔ اوپر سے یہ اندوہناک اطلاع...... مجھے یہ سب بتاتے ہوئے وہ چیخ چیخ کر رونے لگے۔ گھر کے تمام افراد ان کے گرد جمع ہو گئے۔ بھابی جی (بیگم شیخ عطا محمد) نے مجھ سے پوچھا...... ''نظیر احمد کیا ہوا؟'' میرے جواب دینے سے پہلے ہی ابا جی چیخ اٹھے...... ''یہ اعجاز کیوں میرے پیچھے پڑا ہوا ہے؟ یہ کیوں میری عاقبت برباد کرنے پر تُلا ہوا ہے؟'' بھابی جی حیران و پریشان کھڑی میری جانب سوالیہ انداز میں دیکھ رہی تھیں' چنانچہ میں نے انھیں اعجاز بھائی کے خط کے متعلق بتایا تو وہ مزید پریشان ہو گئیں مگر سوائے بے بسی کے ان کے بس میں بھی کچھ نہیں تھا۔ سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد ابا جی نے اس روز دل کھول کر میرے سامنے رکھ دیا اور تفصیلاً بتایا کہ...... ''مرزا غلام احمد قادیانی نے جب تک نبوت کا دعویٰ نہیں کیا' وہ اچھا کام کر رہا تھا اور یہاں بھی اس کے ساتھ تھے کیونکہ وہ ہندوؤں اور عیسائیوں سے اسلام کے حق میں بڑی اچھی طرح جم کر لڑ رہا تھا اور ہم سب اس کو مبلغ اسلام سمجھا اور کہا کرتے تھے مگر جب اس نے ختم نبوت کا انکار کیا تو تقریباً سب نے اس سے قطع تعلق کر لیا کیونکہ کوئی سچا مسلمان ختم نبوت کا منکر نہیں ہو سکتا۔ میاں جی نے تو بہت پہلے ان کو خط بھی لکھ دیا کہ ہمارا آپ سے کوئی واسطہ نہیں۔ مگر اس اعجاز نے دنیاوی فائدے کی خاطر چوہدری ظفر اللہ' ڈاکٹر بشیر اور اپنے اسی قسم کے قادیانی دوستوں کے بہکاوے میں آ کر بیعت کر لی اور ہم سب کے لیے باعثِ ندامت بنا۔ اس کا چچا (علامہ صاحب) بھی اس کی اسی

حرکت کی وجہ سے بے حد غمگین اور سوگوار اس دنیا سے رخصت ہوا اور اس نے مجھ سے شکایت بھی کی کہ اعجاز نے خاندان کی ناک کٹوادی۔ وہ بیچارہ تو میدانِ حشر میں رسوائی کے ڈر سے بے حد پریشان تھا اور اب یہ نابنجار میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں آخر کیوں اور کس طرح اس کی بات مان لوں' میں تو پہلے ہی روزِ حساب پرسشِ احوال سے لرزاں ہوں۔" اس کے بعد حسبِ عادت انھوں نے دو خطوط لکھ کر حوالہ ڈاک کر دیے۔ ایک اعجاز بھائی کو اور دوسرا قادیانی جماعت کو جس میں صاف صاف لکھ دیا کہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں' اس لیے مجھ سے کوئی امید وابستہ نہ کی جائے۔"

میاں جی شیخ نور محمد مرحوم و مغفور کے جس خط کا ذکر نانا جان قبلہ شیخ عطا محمد مرحوم نے کیا اس کی تفصیل یہاں بیان کر دینا مناسب ہوگا۔ اس کا ذکر کئی ایک کتابوں میں پہلے آ چکا ہے مگر ایک بار پھر اسے تذکرہ کر لینے سے کئی ایک شکوک کا ازالہ ہو سکے گا۔ میاں جی کے خط کا متن شاید کسی کے علم میں نہیں مگر اس تذکرہ مرزا بشیر احمد نے اپنی کتاب "سیرت المہدی" میں اس طرح کیا ہے:

> "ڈاکٹر سر محمد اقبال جو سیالکوٹ کے رہنے والے تھے' ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ شیخ نور محمد صاحب نے غالباً 1891ء یا 1892ء میں مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم اور سیّد حامد شاہ صاحب مرحوم کی تحریک پر حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام (مرزا غلام احمد قادیانی) کی بیعت کی تھی۔ اُن دنوں سر محمد اقبال سکول میں پڑھتے تھے اور اپنے باپ کی بیعت کے بعد وہ بھی اپنے آپ کو احمدیت میں شمار کرتے تھے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے معتقد تھے چونکہ سر اقبال کو بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا' اس لیے ان دنوں میں انھوں نے سعد اللہ لدھیانوی کے خلاف حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام کی تائید میں ایک نظم بھی لکھی تھی مگر اس کے چند سال بعد جب سر اقبال کالج میں پہنچے تو ان کے خیالات میں تبدیلی آ گئی اور انھوں نے اپنے باپ کو سمجھا بجھا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔ چنانچہ شیخ نور محمد صاحب نے حضرت مسیحِ موعود علیہ السلام کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں یہ تحریر کیا کہ...... آپ میرا نام اس جماعت سے الگ رکھیں۔ اس پر حضرت صاحب کا جواب میر حامد شاہ صاحب مرحوم کے نام لکھا گیا جس میں لکھا کہ شیخ نور محمد کو کہہ دیں کہ وہ جماعت سے ہی الگ نہیں بلکہ اسلام سے بھی الگ ہیں...... ڈاکٹر سر محمد اقبال اپنی زندگی کے آخری ایام میں (احمدیت کے) شدید طور پر مخالف رہے اور ملک کے نو تعلیم یافتہ طبقہ میں احمدیت کے خلاف جو

زہر پھیلا ہوا ہے اس کی بڑی وجہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا مخالفانہ پراپیگنڈہ تھا۔"[5]

حضرت علامہ اقبالؒ نے 1893ء میں میٹرک پاس کیا اور کالج میں داخل ہوئے۔ چنانچہ میاں جی نے متذکرہ بالا خط زیادہ سے زیادہ 1895ء میں لکھا ہوگا۔ جب کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے 1901ء میں دعویٰ نبوت کیا۔ یعنی مرزا صاحب کے انکار ختم نبوت سے بہت پہلے خاندان اقبال ان سے لاتعلق ہو چکا تھا۔ شیخ اعجاز احمد صاحب کی پیدائش 1899ء کی ہے یعنی ان کی پیدائش سے کافی عرصہ قبل یہ تعلق ختم ہو چکا تھا اس لیے ان کا یہ فرمانا کہ...... "بے جی نے ابا جان سے حضرت صاحب کو دعا کے لیے خط لکھوایا۔"[6] حقیقت کے بالکل خلاف ہے اور ان کی لاعلمی کا مظہر ہے یا وہ جان بوجھ کر اپنی ولادت کو "حضرت صاحب" کی دعا کا نتیجہ ظاہر کر کے تاریخی حیثیت حاصل کرنا چاہ رہے ہیں۔ علاوہ ازیں شاید وقت کا حساب بھی ان سے صحیح نہیں ہو سکا کہ میاں جی کی قادیانی جماعت سے علیحدگی کو تسلیم کر لینے کے باوجود 1902ء[7] تک یہ تعلق قائم ہونے کا بھی دعویٰ کر رہے ہیں، جب کہ یہ رابطہ 1895ء تک منقطع ہو چکا تھا۔

پیشتر اس کے کہ اس سلسلے میں کچھ مزید حقائق بیان کیے جائیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جناب شیخ اعجاز احمد کی تضاد بیانی کا تھوڑا اور ذکر کر لیا جائے۔ موصوف اپنی کتاب "مظلوم اقبال" میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

> "1929ء کے غالباً دو ایک سال بعد کی بات ہوگی کہ میں نے بیعت کر لی...... میرے بیعت کر لینے کے بعد شاید دوسرے سال ابا جان نے میرے ہاتھ اپنی بیعت کا خط جماعت احمدیہ کے امام کے نام بھیجا تھا اور حضور نے بیعت منظور کر لی تھی۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ دو ایک سال بعد میرے ہمراہ قادیان گئے اور میرے مواجہہ میں دستی بیعت بھی کی۔ اس کی خبر روزنامہ الفضل کی 10 اپریل 1934ء کی اشاعت میں درج ہے۔"[8]

ایک دوسری جگہ رقمطراز ہوتے ہیں:

> "ابا جان جماعت احمدیہ میں ابتدائی شامل ہونے والوں میں سے تھے۔ وہ ان 313 دوستوں میں سے ہیں جن کے نام بانی سلسلہ نے اپنی کتاب ضمیمہ انجام آتھم میں درج کیے ہیں۔ اس فہرست میں ان کا نام نمبر 224 پر ہے۔"[9]

پھر اسی جگہ تھوڑا آگے چل کر 1929ء میں لکھے گئے ایک خط کے حوالے سے بھی یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش فرمائی کہ 1929ء[10] تک شیخ عطا محمد صاحب قادیانیت پر قائم تھے۔ ان کے یہ

متضاد بیانات عجب صورتِ حال پیدا کرنے کا موجب بنتے ہیں کہ پہلے تو بڑے شیخ صاحب کو سابقون میں شامل فرماتے ہیں' پھر 1929ء تک کی سند پیش کرتے ہیں۔ حیرت کی بات کہ انھیں اپنی بیعت کی تاریخ بھی یاد نہیں' ان کے بیان کے مطابق انھوں نے غالباً 1931ء میں قادیانی بیعت کی۔ دوسرے سال یعنی 1932ء میں اپنے والد صاحب کا نامۂ بیعت اپنے امام صاحب کو پیش کیا۔ پھر دو ایک برس بعد یعنی 1934ء میں ان کے والد گرامی نے ان کے مواجہہ میں دستی بیعت بھی کی اور اس کے متعلق خبر بھی قادیانی روزنامہ ''الفضل'' کی 10 اپریل 1934ء کی اشاعت میں درج ہوئی۔ یعنی 1931ء سے 1934ء تک تمام امور تکمیل پا گئے اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ اس سلسلے میں اگر شیخ اعجاز صاحب کے قریبی دوست اور مشہور قادیانی چوہدری سر ظفر اللہ خان صاحب کا بیان دیکھا جائے تو سارا معاملہ ہی گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

''شیخ اعجاز احمد صاحب نے غالباً 1936ء میں حضور کی بیعت کی تھی۔''[11]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب 1931ء میں اعجاز صاحب نے بیعت کی' تو شیخ عطا محمد مرحوم نے بڑے شدید ردعمل کا اظہار فرمایا جس کا تفصیلی ذکر گزشتہ صفحات میں کیا جا چکا ہے اور ان کی اس حرکت پر دونوں بھائی (شیخ عطا محمد اور علامہ اقبال) بے دست و پا گریہ کناں ہوئے۔ اگر شیخ عطا محمد مرحوم خود قادیانی جماعت کے ممبر تھے اور ان کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے تو پھر اتنے شدید ردعمل کا اظہار چہ معنی دارد؟ صرف شیخ اعجاز احمد صاحب کے کہہ دینے سے یہ نہیں مانا جا سکتا کہ خاندان کے تمام بزرگ غلط بیانی سے کام لے رہے تھے۔ آخر کیوں؟ اگر شیخ عطا محمد صاحب قادیانی عقائد رکھتے تھے تو انھیں کسی سے چھپانے کی چنداں ضرورت نہیں تھی اور اگر ایسا تھا تو حضرت علامہؒ کو ان سے اعجاز صاحب کی شکایت کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

اسی طرح غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اعجاز صاحب نے شیخ عطا محمد مرحوم کے جنازے کے متعلق بھی ''مظلوم اقبال'' میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جب ان (اعجاز صاحب) سے اجازت مانگی گئی تو انھوں نے بخوشی اجازت ہی نہیں دی بلکہ غیر قادیانیوں کو پہلے جنازہ پڑھنے کی دعوت بھی دے دی۔ انھوں نے بڑی خوبصورتی اور چالاکی سے اس بات کو اپنے حق میں کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ درحقیقت جب شیخ عطا محمد مرحوم کا انتقال ہوا تو شیخ اعجاز صاحب نے ان کا جنازہ علیحدہ پڑھنے کی کوشش ضرور فرمائی مگر بری طرح ناکام رہے۔ اس سلسلے میں میرے والد محترم بتایا کرتے تھے کہ...... ''جب اباجی (شیخ عطا محمد صاحب) کا جنازہ مولانا سکندر خاں مرحوم نے پڑھوا دیا تو اعجاز بھائی صاحب اس میں شامل نہیں ہوئے...... بعد میں اپنے قادیانی ساتھیوں کے ساتھ الگ نماز جنازہ پڑھنے کی جب کوشش کی تو صرف

ایک آدمی ان کے ساتھ کھڑا ہوا' جب اعجاز صاحب نے دیکھا کہ کوئی دوسرا ان کے ساتھ شمولیت کے لیے آگے نہیں آ رہا' کیونکہ باقی سب حاضرین تو پہلے ہی نماز جنازہ ادا کر چکے تھے' تو ان کا چہرہ بالکل فق ہو گیا...... چنانچہ ان کے ایک دوست سے شاید ان کی وہ حالت دیکھی نہ گئی اور حالانکہ وہ صاحب پہلے ایک دفعہ سب کے ساتھ نماز جنازہ ادا کر چکے تھے' دوبارہ ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور اس طرح کل تین افراد نے دوبارہ نمازِ جنازہ ادا کی۔

علاوہ ازیں جب 1959ء 12میں شیخ عطا محمد مرحوم کی بیگم صاحبہ محترم مہتاب بی بی صاحبہ خلد آشیانی یعنی شیخ اعجاز احمد صاحب کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا تو اعجاز صاحب نے تمام مسلمانوں کے ساتھ ان کی نماز جنازہ ادا کی' کیونکہ اپنے والد محترم کے جنازے پر ان کو بڑا تلخ تجربہ ہوا تھا اور وہ یقیناً اس کا اعادہ نہیں چاہتے تھے۔ یہ راقم الحروف کے سامنے کی بات ہے کہ اعجاز ماموں نے راستے میں ہی اپنے چند جماعتی احباب سے جو جنازہ کے ساتھ موجود تھے' کہہ دیا تھا کہ...... ''میں اپنی ماں کا جنازہ کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا اس لیے اگر آپ کو سب کے ساتھ نماز جنازہ پڑھنا گوارا ہو تو ساتھ چلیں ورنہ یہیں سے واپس ہو جائیں کیونکہ میں سب کے ساتھ نمازِ جنازہ ادا کروں گا۔'' چنانچہ ان کے قادیانی دوست و احباب وہیں سے پلٹ گئے اور اعجاز ماموں نے سب مسلمانوں کے ساتھ انہی مولانا سکندر خان مرحوم جنھوں نے شیخ عطا محمد مرحوم کی نماز جنازہ پڑھائی تھی اور جو اقبال منزل کے بالمقابل جہانگیری مسجد کے پیش امام اور حنفی العقیدہ مسلمان تھے' کی اقتدا میں نمازِ جنازہ ادا کی۔

اسی طرح مجھے یہاں ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے کہ کس طرح اعجاز ماموں نے اپنے خسر محترم کی نمازِ جنازہ میں شرکت فرمائی تھی۔ یہ راقم الحروف کے سامنے کا واقعہ ہے۔ میں ان دنوں اپنے کاروبار کے سلسلے میں لاہور میں مقیم تھا۔ ایک روز اطلاع ملی کہ اعجاز ماموں کے خسر وفات پا گئے ہیں۔ چنانچہ خالہ عنایت کے ہمراہ وہاں جانے کا اتفاق ہوا کیونکہ ماموں اعجاز صاحب بھی کراچی سے تشریف لا رہے تھے۔ وہ بزرگوار ان دنوں اپنے صاحبزادے کے پاس گلبرگ کالونی کے بی بلاک میں مقیم تھے۔ ہمارے پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد اعجاز ماموں بھی کراچی سے تشریف لے آئے اور جنازہ گلبرگ کے قبرستان میں لے جایا گیا۔ جب سب لوگ نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے لیے کھڑے ہوئے تو اعجاز ماموں الگ تھلگ ایک طرف کھڑے رہے۔ اب جن لوگوں کو ان کے عقائد کے بارے میں علم نہیں تھا' وہ بار بار ان کو اشارے کر رہے ہیں کہ آیئے نمازِ جنازہ میں شریک ہو جایئے مگر وہ لاتعلق منہ دوسری طرف موڑے کھڑے ہیں اور کبھی ادھر اور کبھی اُدھر دیکھ رہے ہیں۔ ان کے سسرالی عزیزوں کو تو یقیناً معلوم ہو گا مگر انھیں بھی شاید اس کا یقین نہیں ہو رہا تھا کہ ایک اچھا بھلا سمجھدار انسان جو خاص طور پر کراچی سے لاہور

پہنچا ہے تاکہ اپنے خسر کے جنازے میں شرکت کر سکے' وہ نمازِ جنازہ میں شریک ہونے سے گریزاں ہے۔ اوّل تو انھیں اس طرح کراچی سے آنا ہی نہیں چاہیے تھا یا پھر گھر پر ہی ٹھہر جاتے مگر وہ تو اپنی لاتعلقی کا برسرعام اعلان کرنے ہی کے لیے شاید اتنی دور سے آئے تھے...... آخر جب کوئی راستہ نظر نہ آیا تو مجبوراً مجھے ہی یہ ناخوشگوار فرض ادا کرنا پڑا اور میں نے نماز جنازہ میں ان کے شریک نہ ہونے کی وجہ لوگوں کے گوش گزار کر دی۔ سب لوگوں کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے کیونکہ شاید ان سب کے لیے وہ پہلا تجربہ تھا کہ قادیانی حضرات کس طرح اپنے عقائد پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ چنانچہ نمازِ جنازہ اعجاز ماموں کے بغیر ادا کی گئی اور انھوں نے اپنے خسرِ محترم کے لیے دعائے مغفرت نہیں کی نہ سب کے ساتھ اور نہ ہی علیحدہ' کیونکہ ان کے خسر قادیانی عقائد نہیں رکھتے تھے' اس لیے ان کے حساب میں ''کافروں'' میں شامل تھے۔ میرے خیال میں قادیانی عقائد رکھنے والے جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں تاکہ دوسروں کو یہ احساس دلا سکیں کہ وہ ایک علیحدہ حیثیت کے مالک اور ایک الگ مذہب کے پیروکار ہیں۔ مگر اب جب انھیں ایک علیحدہ حیثیت مستقل طور پر مل گئی ہے اور انھیں ایک غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا ہے تو ان کو برا محسوس ہوا ہے اور اب وہ مسلمانوں میں ہی شامل رہنے پر مُصر ہیں۔ اصل میں یہ چاہتے ہیں کہ تمام مسلمانوں کو یہ کافر بھی قرار دیتے رہیں اور ان میں شامل بھی رہیں۔ یا پھر ان کا خیال یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کو ''کافر'' قرار دے کر ''اقلیت'' بنا دیا جائے اور ان کی جماعت کو ''اصل مسلمان'' تسلیم کر لیا جائے۔ اگر وہ ایسا سوچتے ہیں تو ان کی کم عقلی پر ماتم کرنے کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا ہے۔

آمدم برسرِ مطلب' جن دنوں مرزا غلام احمد قادیانی یہاں سیالکوٹ میں ملازمت کر رہے تھے اور کوچہ حسام الدین میں ان کا قیام تھا تو کافی لوگ ان کی اس تحریک میں شامل تھے جو وہ دفاعِ اسلام کے طور پر کر رہے تھے۔ اگر اس دور پر طائرانہ نظر دوڑائی جائے تو سیالکوٹ کے کافی گھرانوں میں ان کے ساتھی مل جائیں گے۔ خاص طور پر محلہ کشمیریاں میں تو ان کا اثر زیادہ ہی نمایاں رہا۔ عام لوگوں کے علاوہ سیّد زادوں تک ان کے پیروکاروں میں شامل تھے۔ دراصل مرزا صاحب نے اپنے کام کا آغاز گزشتہ صدی کے وسط میں آریہ سماجیوں کی مخالفت اور مناظروں سے کیا۔ پھر انھوں نے اپنا رخ عیسائی پادریوں کی طرف پھیرا اور خوب خوب مناظرے اُن سے کیے۔ چنانچہ عام طور پر مسلمان ابتداء میں انھیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان دنوں سیالکوٹ میں عیسائی مشنریوں کا بہت زور تھا۔ شہر کا سب سے اچھا سکول عیسائی مشنری ہی چلا رہے تھے اور اپنا زہریلا پراپیگنڈہ ہر طرف پھیلا رہے تھے۔ فوج کی چھاؤنی ہونے کی وجہ سے کئی ایک گرجا گھر بھی یہاں تعمیر ہو چکے تھے اور مسلمانوں میں بڑی بے چینی پائی جاتی تھی۔ چنانچہ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں کو مرزا غلام احمد کی صورت

میں ایک بڑا اچھا مقرر مل گیا تھا۔ چنانچہ اس دور کے دینی ماحول میں سب لوگ روزانہ شام کو جمع ہوتے اور دینی امور پر سیر حاصل بحث و تمحیص ہوتی اور مرزا صاحب کو ان کے مناظروں پر داد دی جاتی اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل ترتیب دیا جاتا۔ اُن دنوں سیالکوٹ کے باسی انھیں ایک شعلہ بیان مقرر کے طور پر جانتے اور مانتے تھے۔ پھر کچھ عرصہ بعد مرزا صاحب نے صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو محدث اور مجدد کہلوانا شروع کر دیا اور اپنے عجیب و غریب کشف بیان فرمانے لگے اور کسی حد تک پیری مریدی کا در پردہ سلسلہ بھی قائم کر لیا۔ اُس دور میں یہ بڑا عام سا رواج تھا کہ ہر شخص کسی نہ کسی پیر صاحب کی بیعت ضرور کر لیتا تھا۔ خاص طور پر کشمیری خاندان تو پیری مریدی کے بے حد قائل تھے اور ان کے پیر صاحبان تو کشمیر سے بھی آیا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد تک کشمیر سے یہ پیر صاحبان تشریف لایا کرتے تھے اور مختلف گھرانوں میں قیام کیا کرتے تھے اور ان کی بڑی آؤ بھگت ہوا کرتی تھی۔ اس ماحول میں مرزا صاحب کی پیری مریدی چلنے کے امکانات خاصے روشن تھے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کا سیالکوٹ میں قیام زیادہ سے زیادہ 1870ء تک رہا۔ قادیان واپس جا کر وہ مختلف مقدمات میں مشغول رہے۔ کتابیں لکھتے اور چھپواتے رہے۔ 1886ء سے انھوں نے عجیب و غریب الہامات شائع فرمانے شروع کیے اور لوگوں کو حیران و پریشان کر دیا۔ 1891ء میں ''المسیح الموعودٗ'' اور ''المہدی المسعودٗ'' ہونے کے دعوے داغ دیے۔ اس کی وجہ سے یہاں سیالکوٹ میں لوگ ان سے متنفر ہونا شروع ہو گئے۔ چونکہ مرزا غلام احمد قادیانی کے خاندان کا رابطہ انگریز حکمرانوں سے بڑا پرانا تھا' اس لیے انھوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مرزا مسلمانوں پر خاصے اثر انداز ہو سکتے ہیں ان کو مسلمان اور اسلام کے خلاف استعمال کرنے کا منصوبہ بنایا اور مرزا صاحب نے اپنی خاندانی روایات کے عین مطابق فوراً صاد کہہ دیا اور سرکارِ انگلشیہ کا خود کاشتہ پودا بننا منظور کر لیا اور اسی منصوبہ کے زیر اثر 1901ء میں انکارِ ختم نبوت کرتے ہوئے دعویٰ نبوت کر دیا اور جہاد کے خلاف محاذ قائم کر لیا۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے جیسے ہی 1901ء میں دعویٰ نبوت کیا' ہر طرف ایک شور اٹھا اور صحیح العقیدہ مسلمانوں نے فوراً قطع تعلق کر لیا اور کسی صورت اُن کی سازش میں شریک نہیں ہوئے۔ جہاں تک خاندانِ اقبال کا تعلق ہے' میاں جی (شیخ نور محمد مرحوم) بہت پہلے لاتعلقی کا اظہار کر چکے تھے جس کا ثبوت ان کی (قادیانی جماعت) کی کتابوں میں موجود ہے اور گزشتہ صفحات میں اس کا تفصیلی ذکر ہو چکا ہے۔ انگریز حکومت کے ساتھ مل کر اس جماعت نے لوگوں کو مختلف لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی اور بہت سے کمزور ایمان والے جلبِ منفعت کے لیے ان کے چکر میں آ گئے۔ اکثر نے خوب دُنیا کمائی اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ انہی میں شیخ اعجاز احمد صاحب بھی شامل تھے۔ دنیا میں انھوں نے خوب

ترقی کی اور عزیز ظفر اللہ خان، جو ان کے بڑے قریبی دوست تھے، نے انھیں خوب خوب فائدہ پہنچایا۔

مندرجہ بالا تمام حقائق اس پر دلالت کرتے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے انکارِ ختم نبوت کے بعد خاندانِ اقبال میں سے صرف شیخ اعجاز احمد صاحب نے ان کی بیعت کی اور 1931ء میں ان کی بیعت کے وقت شیخ عطا محمد مرحوم نے جس طرح غم و غصے کا اظہار فرمایا اور چھوٹے بھائی (علامہ صاحب) کے ساتھ مل کر جس طرح اس سانحہ پر ماتم کناں ہوئے اور مرض الموت میں جس طرح جماعتِ قادیانی کو اپنے "صاحبزادے" شیخ اعجاز احمد کی طرف سے لکھے گئے خط کے سلسلے میں وضاحتی خط ارسال کیا اور پھر اپنے جنازے کے متعلق میرے والدِ گرامی جناب نظیر احمد صوفی مرحوم کو آخری وصیت فرمائی...... یہ تمام حقائق یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ شیخ عطا محمد صاحب کبھی بھی منکرینِ ختم نبوت کے گروہ میں شامل نہیں رہے کیونکہ اگر وہ مرزا قادیانی کے متعلق ذرا سا بھی نرم گوشہ رکھتے تو کبھی بھی اس طرح کا ردِعمل ظاہر نہ فرماتے کیونکہ انھیں کس کا ڈر تھا کہ وہ اپنا یہ فعل پوشیدہ رکھتے۔ اگر وہ مرزا قادیان کے ساتھ کوئی تعلق رکھنا چاہتے تو کوئی ان کو منع کرنے والا نہیں تھا کیونکہ وہ اس وقت خاندان میں سب سے بڑے تھے۔ چنانچہ یہ کہنا پڑے گا کہ شیخ اعجاز صاحب نے جان بوجھ کر ان پر بہتان لگایا ہے تاکہ خاندان کا کم از کم ایک فرد تو ان کے ساتھ شامل ہو اور ان پر خاندانِ اقبال کا "اکلوتا قادیانی" ہونے کا جو لیبل چسپاں ہو گیا ہے، وہ کسی طور ختم ہو سکے اور وہ دعویٰ کر سکیں کہ انھوں نے اپنے والد کی پیروی میں یہ قدم اٹھایا۔ مگر حقیقت کو تبدیل کرنا کبھی کسی کے بس میں نہیں رہا اور سچائی ہمیشہ ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ اب اگر کسی طرف سے کوئی اس قسم کے "خانہ ساز" ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کی گئی تو انھیں جھٹلانا اتنا مشکل نہیں ہو گا۔

اس لیے اب یہ بھی بغیر کسی شک وشبہ کے ثابت اور تسلیم شدہ ہے کہ خاندانِ اقبال میں سے صرف اور صرف ایک فرد منکرینِ ختم نبوت کے گروہ میں شامل ہوا اور اس نے بھی 1931ء میں اس میں شمولیت اختیار کی۔ اس سے پہلے کوئی اس گروہ میں شامل نہیں تھا اور نہ ہی خاندانِ اقبال کا کوئی دوسرا فرد اس کے بعد اس گروہ میں شامل ہوا۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں جو تھوڑا بہت تعلق مرزا غلام احمد قادیانی کے ساتھ تھا وہ بھی صرف ان کے مبلغِ اسلام ہونے کے ناطے سے تھا اور ان سے کوئی تعلق کسی اور حوالے سے کسی دور میں نہیں رکھا گیا۔ اگر حضرت علامہ نے اس وقت ان کی حمایت میں چند اشعار لکھے تو وہ صرف اس لیے کہ اس وقت مرزا صاحب کی حیثیت اسلام کے ایک پُرزور مبلغ کی تھی، نہ کہ اسلام کے خلاف دعویٰ نبوت کر کے خود کو ایک نئے فتنہ ارتداد کا بانی ثابت کرنا اور منکرین ختم نبوت کا ایک ایسا گروہ تشکیل دینا جس نے آگے چل کر ایک انتہائی متنازع فیہ شکل اختیار کرنی تھی اور جس نے کھلم کھلا فرنگیوں کی حمایت کرتے ہوئے اسلام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچانا تھا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے دل

میں چھپے اس چور کو اس وقت کوئی بھی نہ پہچان سکا کہ دلوں کے بھید صرف اللہ تعالیٰ کو ہی معلوم ہیں۔اس لیے سادہ لوح لوگ جن کے دلوں میں اسلام کی سربلندی کی تڑپ تھی' مرزا قادیانی کے اس ہم رنگِ زمین جال کی اصلیت کو نہ جان سکے اور اندھی عقیدت کا شکار ہوتے چلے گئے۔ان کی آنکھیں تو اس وقت کھلیں جب ''ختم نبوت'' جو ہر سچے مسلمان کے ایمان کی بنیاد ہے' کا انکار کیا گیا۔انکارِ ختم نبوت کا یہ اعلان فدایانِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے تازیانے کا حکم ثابت ہوا اور انھوں نے ایک لحہ ضائع کیے بغیر مرزا قادیانی کے ساتھ ہر قسم کا تعلق ختم کر دیا۔خاندانِ اقبال تو اس سے بہت پہلے اس گروہ سے کنارہ کش ہو چکا تھا جس کی تائید خود مرزا بشیر احمد ''سیرت المہدیٰ'' میں فرما چکے ہیں۔اس کے بعد کسی قسم کے شک کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ خاندانِ اقبال کا کوئی دوسرا فرد اس گروہ میں شامل نہیں رہا اور انھوں نے ہمیشہ دنیا پر دین کو ترجیح دی ۔

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک
مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا!

(بالِ جبریل)

آخری حسرت

''مظلوم اقبال'' میں ''آخری ملاقات'' کے عنوان کے تحت جناب شیخ اعجاز احمد صاحب نے اپنے عظیم چچا جان سے آخری ملاقات کا بڑا عجیب وغریب احوال بیان فرمایا ہے......ذرا ان کے الفاظ ملاحظہ کریں:

> ''میں نے عرض کیا' میری رخصت آج ختم ہو رہی ہے لہٰذا میں رات کی گاڑی سے دہلی جا رہا ہوں......انھوں نے گاؤ تکیہ سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔میں نے مصافحہ کیا تو نحیف آواز میں ''خدا حافظ'' کے الفاظ سنائی دیے۔یہ سب باتیں ان کے معمول کے بالکل خلاف تھیں......ان کے ہاں قیام کے بعد جب کبھی رخصت ہونے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تو پنجابی میں صرف اتنا فرماتے......''اچھا چلیاں اے'' (اچھا جا رہے ہو) وہ نہ تو کبھی مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے نہ ہی خدا حافظ کہتے......رخصت کا یہ خلافِ معمول انداز مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔''[13]

اگر آپ کے پاس ایک دردمند دل اور اس میں ہلکی سی تڑپ موجود ہے تو تھوڑا سا یکسو ہونے

سے حضرت علامہ کے اِس غیر معمولی طرزِ عمل کا جواز کسی حد تک سمجھ میں آ جاتا ہے۔ شیخ اعجاز احمد صاحب نے بھی طرزِ عمل میں غیر معمولی بات محسوس ضرور کی مگر اس پیغام تک رسائی نصیب نہ ہوئی جو ان کو عم محترم دینا چاہ رہے تھے۔ یقیناً وہ اس پیغام کی گہرائی تک نہیں پہنچ پائے کہ آخر کیوں یہ عظیم شخصیت جو ذہنی اور جسمانی طور پر ہمیشہ اس قدر قوی رہی' جس نے اپنی پوری زندگی کفر والحاد کی قوتوں کے خلاف باقاعدہ جہاد کیا اور جو اپنی قوم اور ملت کے لیے باطل کے سامنے ہمیشہ سینہ سپر رہی' جس نے اپنا سب کچھ ملک و قوم کی بھلائی کے لیے ہمیشہ داؤ پر لگائے رکھا اور جس نے کبھی بھی اپنے بڑے سے بڑے فائدے کو سوادِ اعظم پر فوقیت نہیں دی وہ آخر آج اس قدر کمزور کیوں پڑ گئی...... اس کی گرفت اتنی بے جان کیوں ہو رہی ہے اور آج اس نے مجھے یہ شرف کیوں بخشا ہے کہ وقتِ رخصت مردہ سا ہی سہی' مگر ہاتھ ملایا اور خدا حافظ کہا......

کاش! اعجاز صاحب اپنے عم محترم کی اس وقت کی دلی کیفیت جان سکتے اور ان کی آخری وقت کی وہ خواہش جو انھوں نے اپنے اس بھتیجے سے کی تھی جو خود کو ان کا بڑا مزاج آشنا سمجھا کرتا تھا اور جس سے انھوں نے اور ان کے برادرِ بزرگ نے بڑی امیدیں وابستہ کی تھیں۔ مگر نہیں' شیخ اعجاز احمد صاحب کی قسمت میں وہ اعزاز شاید نہیں تھا' جو حضرت علامہؒ نے اس وقت انھیں حاصل کر لینے کا اشارہ دیا۔

تھوڑا سا اس غیر معمولی طرزِ عمل کی گہرائی میں جانے کی کوشش کیجیے۔ ذرا ایک حساس دل سے اس صورتِ حال کا موازنہ نہ کریں کہ کس طرح ایک کمزور بلکہ مردہ سا ہاتھ اعجاز صاحب کے ہاتھ میں دے کر حضرت علامہؒ ان سے کیا کہنا چاہ رہے تھے...... یقیناً اس وقت تک حضرت علامہؒ کو اپنے وقت آخرت کے بالکل قریب ہونے کا پورا پورا ادراک ہو چکا تھا اور انھیں یہ بھی احساس تھا کہ اعجاز کے ساتھ یہ ان کی آخری ملاقات ہے...... انھوں نے کسی دوسرے سے کیوں اس طرح مصافحہ نہیں کیا اور نہ ہی خدا حافظ کہا؟ حالانکہ دمِ واپسیں تک لوگ ان کے قریب موجود تھے۔

کیا اس وقت اپنے غیر معمولی طرزِ عمل سے حضرت علامہؒ نے یہ احساس دلانے کی کوشش نہیں کی کہ اچھا اب میرا دم واپسیں ہے' شاید دوبارہ ملاقات ممکن نہ ہو...... خدا حافظ میرے بیٹے! میرے حال پر رحم کھاؤ اور مجھے اس ندامت سے بچالو جس کے قابل میں خود کو نہیں پا رہا...... میرا دل اس وقت کے خوف سے بیٹھا جا رہا ہے' جب مجھ سے تمھارے بارے میں باز پرس ہوگی' وہاں میں کیا جواب دوں گا...... یہ سوچ سوچ کر میرا دماغ ماؤف ہو چکا ہے اور میرے ہاتھوں پیروں سے ابھی سے ہی جان نکل رہی ہے۔ خدا جانے وہاں میرے ساتھ کیا معاملہ پیش آتا ہے اور یہ سب کچھ تمہاری اور صرف تمہاری وجہ سے ہوگا' صرف تم ہی مجھے اس گرداب سے نکال سکتے ہو کہ تم نے جو داغ میرے ہی نہیں بلکہ پورے

خاندان کے نصیب پر لگایا ہے' خدارا اسے ختم کر دو کیونکہ یہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو رہا ہے کہ روزِ محشر میں کس منہ کے ساتھ اس عظیم ہستی کا سامنا کروں گا کہ جس کے ساتھ تم نے' میرے اپنے خون نے' بے وفائی کی......؟

میرے بیٹے! میں نے ساری زندگی جس کی عظمت کے گن گائے اور جس کی محبت میرا سب سے عزیز سرمایۂ حیات ہے اور جس کی شفاعت پر میں تکیہ کیے بیٹھا ہوں اور میدانِ حشر میں ''واردِ امیدِ شفاعت زمحمد اقبال'' مگر تم نے یہ کیا کر دیا' اسی کے سامنے میری رسوائی کا سامنا کر دیا...... میں اب کس طرح وہاں شفاعت کے لیے دست سوال دراز کر سکوں گا...... میری نگاہ تو یہاں نہیں اٹھ رہی' وہاں کیا بنے گا......؟

مگر حضرت علامہؒ نے جو پُرحسرت نگاہیں اعجاز صاحب پر ڈالی تھیں اور بے جان سا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے کر خدا کی پناہ کے لیے سوالی بنے تھے' اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا اور اعجاز صاحب بغیر کوئی خاص اثر قبول کیے وہاں سے رخصت ہو گئے...... اور صرف چند گھنٹوں بعد یعنی **21 اپریل 1938ء صبح** صادق کے وقت اس عظیم شخصیت نے اپنی جان' جان آفریں کے سپرد کر دی اور اس عظیم روح کو اپنی اس آخری حسرت کو شرمندۂ تعبیر دیکھنا نصیب نہ ہو سکا کہ وہ اپنے خون کو منکرینِ ختم نبوت کے گروہ سے الگ دیکھ کر سرخرو اور سربلند اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کی جانب کوچ کرتی...... کاش!

مثنوی ''رموزِ بے خودی'' میں شاعرِ مشرق نے اپنے بچپن کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اپنے والدِ بزرگوار کی زبانی جو نصیحت بیان فرمائی ہے' اس کا ایک حصہ مندرجہ بالا صورتِ حال پر بھی بڑی اچھی طرح منطبق ہوتا ہے۔ حضرت علامہؒ فرماتے ہیں۔

اے صراطت مشکل از بے مرکبی
من چہ گویم چوں مرا پرسد نبیؐ
''حق جوانے مسلمے با تو سپرد
کو نصیبے از دبستانم نبرد
از تو ایں یک کارِ آساں ہم نشد
یعنی آں انبارِ گل آدم نشد''
در ملامت نرم گفتار آں کریم
من رہینِ خجلت و امید و بیم
اندکے اندیش و یاد آر اے پسر

اجتماع امت خیر البشرؐ
باز ایں ریشِ سفید من نگر
لرزۂ بیم و امیدِ من نگر
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن
پیش مولا بندہ را رسوا مکن

حضرت علامہؒ نے جس دردناک انداز میں اپنے والدِ گرامی کی طرف سے یہ کہا ہے کہ جب روزِ محشر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھ سے باز پرس فرمائیں گے کہ...... ''ہم نے ایک مسلمان تمھارے سپرد کیا تھا کہ اسے صحیح طور پر انسان بناؤ مگر یہ آسان کام بھی تم سے مکمل نہ ہوسکا اور مٹی کے اس ڈھیر کو تم انسان نہ بنا سکے؟'' میرے خیال میں اب یہی صورتِ حال علامہؒ کے ساتھ بھی پیش آنے والی ہے اور ان سے بھی اسی قسم کے سوالات شیخ اعجاز صاحب کے بارے میں پوچھے جائیں گے اور یقیناً وہ اسی وجہ سے لرزاں اور ترساں تھے اور وقت آخر زبانِ حال سے یہی استدعا کررہے تھے کہ میرے بیٹے! مجھے اس سے بچالے اور میرے ان سفید بالوں پر ترس کھاؤ اور مجھے میرے مولا کے حضور رسوا نہ کرو...... کیونکہ ع

جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے!

حواشی

1. ''رئیسِ قادیان'' از ابوالقاسم مولانا رفیق دلاوری۔ صفحہ 50۔
2. ''عقیدہ ختم نبوت اور فتنہ قادیانیت'' از صادق علی زاہد۔ صفحہ 40۔
3. ''حیات و پیامِ علامہ اقبال'' از ڈاکٹر نظیر صوفی۔ صفحہ 50۔
4. 1931ء یہاں اندازاً لکھا گیا کیونکہ شاید شیخ اعجاز صاحب کو خود بھی درست تاریخ کا علم نہیں کیونکہ اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' کے صفحہ 188 پر لکھتے ہیں کہ ''1929ء کے غالباً دو ایک سال بعد کی بات ہو گی کہ میں نے بیعت کر لی۔'' البتہ یہاں یہ بات خاص طور پر ذکر کر دینے کی ہے کہ اعجاز صاحب کو اپنے دادا جان شیخ نور محمد مرحوم کی حیات میں اس کی جرأت نہ ہو سکی چنانچہ 17 اگست 1930ء کو ان کی وفات کے بعد ہی اپنے ''ارتداد'' کا اعلان فرمایا۔
5. سیرت المہدی جلد: 3 از مرزا بشیر احمد ایم۔اے۔ صفحہ 249 طبع اوّل اپریل 1939ء (اقبال اور قادیانی از نعیم آسی۔ صفحہ 58)
6. مظلوم اقبال از اعجاز احمد۔ صفحہ 186۔
7. ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد۔ صفحہ 186۔
8. ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد صفحہ 188۔

9۔10. ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد ص 187۔

11. ماہنامہ ''انصار اللہ'' ربوہ۔ چوہدری ظفر اللہ خاں نمبر۔ نومبر دسمبر 1985ء صفحہ 19۔
12. بروز جمعہ 13 فروری 1959ء بمطابق 4 شعبان 1378ھ۔ سیالکوٹ۔
13. ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد صاحب صفحہ: 165۔ (یہ 20 اپریل 1938ء کا ذکر ہے)

خالد نظیر صوفی

مصنفِ ''مظلوم اقبال'' کی گل افشانیوں کے جواب میں

(1)

مصنف ''مظلوم اقبال'' نے کتاب کے آخر میں ایک علیحدہ باب ''شکوۂ جور و جفا'' کے عنوان کے تحت شامل کیا ہے جس میں حضرت علامہؒ پر اپنوں اور بیگانوں کی جانب سے روا رکھے گئے مظالم کی تاریخ بیان فرمائی ہے اور بڑی ''صاف گوئی'' سے کام لیتے ہوئے اس فہرست میں اپنی طرف سے بھی ایک ''ناکردہ ظلم'' کو اس میں یوں شامل کیا ہے:

> ''راقم الحروف کے لیے ابھی تک یہ احساسِ ندامت سوہانِ روح ہے کہ اس کے لیے انھیں شادی لال ایسے شخص سے ''مومیائی'' مانگنا پڑی۔ راقم الحروف کو بھی علامہ پر ظلم کرنے والوں کی فہرست میں شامل سمجھنا چاہیے۔''[1]

مقام حیرت ہے کہ نادانستہ ظلم تو یاد رہ گیا مگر دانستہ جو ظلم عظیم سرزد ہوا' اسے فراموش کر دیا۔ مصنفِ ''مظلوم اقبال'' کو یقیناً اس کا احساس رہا ہو گا کہ 1931ء میں ان کے منکرینِ ختم نبوت کے گروہ میں شامل ہو جانے کے بعد حضرت علامہؒ کو کس قدر دکھ اور تکلیف ہوئی ہو گی۔ اس کے متعلق حقائق گزشتہ صفحات میں بیان کیے جا چکے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا کسی طور بے جا نہ ہو گا کہ سب سے بڑا ظلم تو خود انھوں نے ہی اپنے عم محترم پر روا رکھا۔ اس میں یقیناً کچھ مبالغہ آرائی نہیں کہ یہ سب کچھ دانستہ کیا گیا کیونکہ یہ کسی طور ممکن نہیں کہ جب مصنفِ ''مظلوم اقبال'' نے منکرینِ ختم نبوت کے گروہ میں شمولیت اختیار کی تو انھیں یہ ادراک نہیں تھا کہ حضرت علامہؒ اس سلسلے میں کیا خیالات رکھتے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت انجام دیا گیا اور لازماً یہ اپنے عظیم چچا کے خلاف اس گھناؤنی سازش میں برابر کے شریک تھے۔ یہ بات کسی صورت قابلِ قبول نہیں ہو سکتی کہ یہ سب کچھ لاعلمی میں ہوا یا انھوں نے قادیانیت سے متاثر ہو کر یہ انتہائی قدم اٹھایا' بلکہ یہ ایک بین الاقوامی سازش کا حصہ تھا جس میں ان کو محض

استعمال نہیں کیا گیا بلکہ انھوں نے خود اپنے آپ کو رضا کارانہ طور پر پیش کیا۔ دنیاوی منفعت کے لیے انھوں نے اپنے دین کا سودا کیا اور جب ایک انسان اپنا ایمان ہی بیچ ڈالے تو پھر بزرگوں اور عزیزوں کی کیا حیثیت؟ چنانچہ حضرت علامہؒ پر سب سے بڑا ظلم تو خود مصنف ''مظلوم اقبال'' نے کیا اور آج دوسروں کے مظالم کی فہرست ترتیب فرما رہے ہیں یعنی دوسروں کی آنکھوں کے تنکے چن رہے ہیں مگر اپنی آنکھ کے شہتیر کی خبر نہیں......؟

اس عظیم ظلم کے علاوہ جو مصنف ''مظلوم اقبال'' نے حضرت علامہؒ کی حیات میں ہی ان پر مسلط فرمایا' اب اپنی متذکرہ کتاب میں بھی کئی ایک مزید مظالم کا اضافہ فرمایا ہے جن کے ردعمل میں یہ تحریر قلم بند کی جا رہی ہے۔ یہاں عمل اور ردعمل کی تاریخ بیان کرنا منتہائے نظر نہیں البتہ اس حقیقت سے بھی مفر نہیں کہ ردعمل صرف اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب کسی عملِ بد سے واسطہ پڑتا ہے۔ اعمالِ صالح کبھی کسی ردعمل کو دعوت نہیں دیتے مگر کوئی ظلم روا رکھا جائے' ردعملِ فوراً ظاہر ہوگا کیونکہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنا انسانی فطرت کا جزدلاینفک ہے۔

مصنفِ ''مظلوم اقبال'' نے سب سے پہلے اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' میں اپنے عم محترم کو ''کانوں کے کچے'' تک ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے اور یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ حضرت علامہؒ ہر کس و ناکس کی بات کا یقین بلا تحقیق کر لیا کرتے تھے اور پھر ایسی باتوں کو بلا سوچے سمجھے آگے پھیلا دیا کرتے تھے اور اس سلسلے میں چند بے سروپا باتوں کا تذکرہ فرما کر یہ تاثر پیدا کرنے کی سعیٔ لاحاصل فرمائی ہے کہ علامہ صاحب افواہ سازی میں مصروف رہتے تھے اور ان کے احباب ان کو غلط سلط جو بتاتے تھے' وہ آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کرتے چلے جاتے تھے۔ 2

سب جانتے ہیں کہ قرآنِ حکیم کی تلاوت علامہ صاحب کا روز کا معمول تھا اور وہ ہمیشہ قرآنِ پاک کی تلاوت اس طرح کرتے تھے جیسے ان پر ہی اس کا نزول ہو رہا ہو' اس لیے یہ گمان کرنا کہ وہ عظیم شخصیت جو قرآن مجید فرقانِ حمید کی تلاوت اس قدر سمجھ کر فرماتی تھی' اس میں درج ان احکامات سے بالکل بے بہرہ رہی جو بڑی وضاحت کے ساتھ اس میں بیان ہوئے ہیں۔ سورۃ الحجرات کی آیت نمبر 6 سے کون واقف نہیں جس میں افواہوں اور بلا تحقیق باتوں پر یقین کرنے کی صاف الفاظ میں ممانعت فرمائی گئی ہے:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

> (ترجمہ) ''اے ایمان والو! اگر لے آئے تمھارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر تو اس کی خوب تحقیق کر لیا کرو' ایسا نہ ہو کہ تم ضرر پہنچاؤ کسی گروہ کو لاعلمی میں پھر تم اپنے

کیے پر نادم ہو۔" (سورۃ الحجرات آیت نمبر 6)

مندرجہ بالا واضح حکم کی موجودگی میں ایک ایسی شخصیت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ اپنی پوری زندگی اس حکم کے خلاف عمل پیرا رہی اور کبھی بھی اس سلسلے میں تحقیق نہ فرمائی کہ آیا جو بات بیان کی گئی ہے اور جسے میں دوسروں کو بتانے جا رہا ہوں' درست بھی ہے یا نہیں' میرے خیال میں اس عظیم شخصیت پر بہتانِ عظیم کے مترادف ہے۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت علامہؒ کی پوری حیاتِ مستعار بس تحقیق کے لیے ہی وقف رہی۔ ان کا تو ہر سانس اور ہر ہر قدم نئی سے نئی تحقیق پر مبنی ہے...... ان کا تو شاید پورا علم ہی اس لفظ پر مرکوز رہا کہ انھوں نے ہر بات کی مکمل تحقیق فرمائی اور اپنے وقت کے عظیم محققین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ جس شخص کا اوڑھنا بچھونا ہی تحقیق رہا ہو' کیا وہ کوئی بھی بات خواہ اس کا راوی کوئی بھی رہا ہو' بلا تحقیق قبول کر سکتا ہے؟

مصنفِ "مظلوم اقبال" نے یہاں تک لکھا ہے کہ 1935ء تک چچا جان کا رویہ قادیانی جماعت کے ساتھ بڑا دوستانہ تھا اور وہ اسے اسلام کی ایک جماعت تصور فرماتے تھے مگر پھر ایک دم ان کے خیالات تبدیل ہو گئے' جب مجلسِ احرار نے ان کے کان بھرے اور علامہ صاحب چونکہ کانوں کے بڑے کچے تھے اور بلا سوچے سمجھے اور بلا تحقیق ہر کس و ناکس کا یقین کر لیا کرتے تھے' اس لیے خواہ مخواہ قادیانی جماعت کے خلاف ہو گئے۔ اس کے علاوہ چونکہ علامہ صاحب ان ہی دنوں ایک ذاتی محرومی کا شکار بھی ہوئے' اس لیے بھی انھیں قادیانی جماعت پر غصہ تھا۔ "مظلوم اقبال" کے اقتباسات اس سلسلے میں ملاحظہ ہوں:

> "اِن دنوں تعصب کا دور دورہ ہے لیکن ایک زمانہ آئے گا جب تعصب کی گھٹا چھٹ جائے گی اور محقق حضرات ضرور اس بات کی چھان بین کریں گے کہ احمدی جماعت تو بقول علامہ اقبالؒ اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ تھی' 1935ء میں ایکا ایکی کیوں علامہ کی رائے میں دائرہ اسلام سے یکسر خارج ہو گئی۔ ایسی تحقیق کے نتیجے میں انھیں معلوم ہو گا کہ احمدیت کے متعلق علامہ کی رائے میں تبدیلی جس کے لیے شاید قلبِ ماہیت کا لفظ زیادہ موزوں ہو' کی وجہ کانگریسی احرار سازش کے تحت' احرار کا دباؤ اور ان کی ریشہ دوانیاں تھیں۔ سازشیوں کی خوش قسمتی سے انہی دنوں ایک ذاتی معاملہ میں علامہ کا احساسِ محرومی بھی شامل ہو گیا جس کی وجہ سے احمدیت کے خلاف ان کے بیانات میں وہ شدت اور تلخی در آئی جو عام طور پر ان کے شیوہ کے مطابق نہ تھی۔"[3]

''احساسِ محرومی'' کی تفصیل یوں بیان کی گئی:

''سلسلہ احمدیہ کے خلاف 1935ء کے بیانات میں اتنی شدت اور تلخی شاید نہ ہوتی اگر ایک ذاتی سلسلہ میں ان کا احساسِ محرومی کارفرمانہ ہوتا اور اس مرتبہ تو ان کے احساسِ ناکامی کے شدید ہونے کی وجہ بھی تھی کیونکہ دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا والا معاملہ ہوا تھا۔ 1932ء میں سرفضل حسین' وائسرائے ہند کونسل کے رکن' چار ماہ کی رخصت پر گئے۔ ان کی جگہ علامہ کے تقرر کا ذکر اخبارات میں آیا لیکن وزیر ہند نے چوہدری ظفر اللہ خان کو مقرر کر دیا۔ سرفضل حسین کی تقرری کی میعاد اپریل 1935ء میں ختم ہونے والی تھی' ان کی جگہ کون لے گا...... اس ضمن میں علامہ اقبال کا نام بھی لیا جا رہا تھا' لیکن چونکہ چوہدری ظفر اللہ خان عارضی طور پر چار ماہ کام کر چکے تھے' اس لیے ان کا نام بھی مستقل تقرری کے سلسلے میں لیا جا رہا تھا...... ممکن ہے احراریوں اور ''زمیندار'' کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر لارڈ ولنگڈن نے وزیر ہند سے علامہ کے تقرر کی سفارش کی ہو اور انھیں اپنی سفارش کے منظور ہو جانے کا یقین بھی رہا ہو لیکن شاید وزیر ہند نے اتفاق نہ کیا ہو۔ آخر کار اکتوبر 1934ء میں چوہدری ظفر اللہ خان کے تقرر کا اعلان ہو گیا اور مئی 1935ء میں انھوں نے چارج بھی لے لیا۔ پھر کیا تھا' احراریوں اور علامہ کے حاشیہ نشینوں کو علامہ کو بھڑکانے کا اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ چوہدری ظفر اللہ خان کا تقرر وزیر ہند نے کیا۔ اس میں جماعتِ احمدیہ کا کوئی ہاتھ نہ تھا لیکن نزلہ عضوِ ضعیف پر گرا۔''[4]

مندرجہ بالا اقتباسات کے علاوہ بھی مصنفِ ''مظلوم اقبال'' نے متعدد مقامات پر حضرت علامہؒ پر کئی ایک بڑے عامیانہ قسم کے الزامات اور اعتراضات بھی کیے ہیں اور محسن کشی کے بڑے بھرپور انداز میں مرتکب ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں خاندان کے بزرگوں خاص طور پر اپنے دادا شیخ نور محمد مرحوم و مغفور اور اپنے والد محترم شیخ عطا محمد مرحوم کو قادیانی مذہب کو ماننے والے تک ثابت کرنے کی پُرزور کوشش فرمائی ہے...... میں ان الزامات کا علیحدہ علیحدہ ذکر اور ان پر مزید بحث کی ضرورت اس لیے محسوس نہیں کر رہا کیونکہ کتاب زیرِ نظر کے گزشتہ صفحات میں ان کے شافی جوابات عرض کیے جا چکے ہیں۔ البتہ انہی کے متعلق ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی ''زندہ رود'' میں بڑی مدلل بحث فرمائی ہے۔ اس لیے یہاں ''زندہ رود'' سے چند اقتباسات دینا دلچسپی کا باعث ہوگا:

''زندہ رود'' میں ڈاکٹر جاوید اقبال مصنفِ ''مظلوم اقبال'' کی طرف سے اس الزام کا جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ حضرت علامہؒ نے کبھی قادیانی بیعت نہیں کی تھی:

''اقبال کی زندگی میں ان کے احمدی نقادوں نے ان کے متعلق یہ باتیں نہ کہی تھیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد کی سوچ بچار کا نتیجہ ہے۔ بہرحال اس بات میں کوئی صداقت نہیں کہ اقبال نے اپنی زندگی کے کسی مرحلے پر مرزا غلام احمد کی بیعت کی یا احمدیت کے ساتھ ان کا گہرا تعلق رہا۔ اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ان کے والد شیخ نور محمد' احمدی تھے۔''[5]

اسی طرح ڈاکٹر جاوید اقبال' وصیت نامہ میں شیخ اعجاز احمد کے تقرر کے متعلق یوں اظہارِ خیال فرماتے ہیں:

''اقبال نے وصیت نامہ میں ان کا نام برادرزادہ ہونے کی حیثیت سے اور ان کی صالحیت کی بنا پر اپنے نابالغ بچوں کے اولیاء کی فہرست میں شامل کیا تھا۔ یہ وصیت نامہ انھوں نے احمدیت کے خلاف اپنا پہلا بیان دینے کے پانچ ماہ بعد لکھا لیکن تقریباً دو سال بعد وہ شیخ اعجاز احمد کی جگہ سر راس مسعود کو گارڈین نامزد کرنا چاہتے تھے' جیسا کہ ان کے خط مورخہ 10 جون 1937ء بنام سر راس مسعود سے ظاہر ہے۔ دیگر اولیاء کا ذکر کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں:

''نمبر 3 شیخ اعجاز احمد میرا بھتیجا ہے۔ نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہو سکتا ہے یا نہیں؟''[6]

آگے چل کر جاوید اقبال صاحب' شیخ اعجاز احمد کی صالحیت کے متعلق لکھتے ہیں:

''شیخ اعجاز احمد کی صالحیت کی ایک مثال یہ ہے کہ انھوں نے آج تک کسی پر اپنا عقیدہ ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی لہٰذا ان کی اولاد' جو دو بیٹوں اور تین بیٹیوں پر مشتمل ہے' میں سے کوئی بھی ان کے عقیدے یا مسلک کا حامی نہیں' بلکہ ختم نبوت کے مسئلہ پر ان سب کا موقف وہی ہے جو عام مسلمانوں کا موقف ہے۔''[7]

قصہ مختصر یہ کہ جاوید ماموں نے بڑی تفصیل سے اعجاز ماموں کے اس نوٹ[8] کا جواب ''زندہ رود'' میں دیا ہے لیکن امید نہیں کہ ان کی پوری طرح تسلی اس سلسلے میں ہوئی ہو کیونکہ 1994ء میں اپنی وفات سے قبل انھوں نے ''زندہ رود'' کو پوری تفصیل سے پڑھا ضرور ہے' جس کا برملا اظہار انھوں نے

''مظلوم اقبال'' میں ایک علیحدہ باب ''زندہ رود...... علامہ اقبال کے سوانح حیات'' کے عنوان کے تحت کیا ہے مگر اس کے بعد اپنی متذکرہ کتاب ''مظلوم اقبال'' میں ان تمام بہتانوں اور الزامات کا اعادہ بھی فرمایا ہے یعنی وہ میں نہ مانوں کے مصداق اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے اور انھوں نے کسی بات کا کوئی اثر قبول نہیں کیا یعنی وہ بضد ہیں کہ جو وہ فرما رہے ہیں، وہی صحیح ہے۔ ان کا اس طرح غلط بیانیوں اور الزام تراشیوں سے کام لینا اور کھلم کھلا افترا پردازیوں اور سراسر جھوٹ کا سہارا لینا قابلِ صد مذمت ہے۔

سب سے پہلے ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اوّل) میں قبلہ نانا جان (شیخ عطا محمد مرحوم) کے متعلق اس مفروضے کا جواب دیا گیا تھا کہ وہ کبھی قادیانیت سے وابستہ رہے اور ان کے حنفی العقیدہ مسلمان ہونے کے متعلق ثبوت کے طور پر ان کے جنازے کے متعلق یوں حقیقت بیان کی گئی تھی:

> ''یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ علامہ صاحب کے والدِ گرامی اور بڑے بھائی کبھی بھی ختمِ نبوت کے منکرین میں شامل نہیں رہے۔ وہ ہمیشہ ختم نبوت کے ماننے والے اور پکے حنفی المذہب مسلمان تھے۔ شیخ عطا محمد صاحب کا جنازہ ان کی وصیت کے مطابق' جو انھوں نے میرے والد گرامی کو کی تھی' اقبال منز ل (سیالکوٹ) کے بالمقابل واقع مسجد کے امام مولوی سکندر خان صاحب نے' جو حنفی المذہب تھے' پڑھایا تھا۔ اس کے علاوہ بیگم شیخ عطا محمد صاحب کا جنازہ بھی مولوی صاحب مذکور نے ہی پڑھایا تھا۔''[9]

''زندہ رود'' میں مندرجہ بالا حقائق کی مزید تائید ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے ان الفاظ میں فرمائی:

> ''شیخ عطا محمد' اقبال کی وفات کے تقریباً دو سال بعد 22 دسمبر 1940ء کو سیالکوٹ میں فوت ہوئے اور انھیں امام صاحب کے معروف قبرستان میں دفنایا گیا۔ ان کے جنازے میں راقم بھی شریک تھا۔ نماز جنازہ شہر کے ایک سنی امام مولوی سکندر خان نے پڑھائی۔ البتہ شیخ اعجاز احمد اور ان کے چند احمدی احباب نے غالباً شیخ عطا محمد کے گزشتہ یا مفروضہ عقیدے کے پیش نظر علیحدہ نماز جنازہ پڑھی۔ شیخ عطا محمد کی اولاد میں صرف شیخ اعجاز احمد احمدی عقیدہ رکھتے ہیں۔''[10]

مگر ''مظلوم اقبال'' میں شیخ اعجاز احمد صاحب نے جاوید اقبال صاحب کے متذکرہ بیان کو یہ کہہ کر مسترد فرما دیا کہ ''جاوید کا اُس وقت لڑکپن تھا' اس لیے انھیں یاد نہیں رہا۔'' تفصیل ملاحظہ ہو:

> ''اس سلسلے میں ''زندہ رود'' میں یہ بھی لکھا ہے کہ ابا جان (شیخ عطا محمد) کی نمازِ

جنازہ شہر کے ایک سنی امام مولوی سکندر خان نے پڑھائی' جس میں مصنف (جاوید اقبال) بھی شامل تھے۔ اگرچہ یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ میں (شیخ اعجاز احمد) نے اور احمدی احباب نے بقولِ مصنف (جاوید اقبال) غالباً شیخ عطا محمد کے گزشتہ یا مفروضہ عقیدے کے پیشِ نظر علیحدہ نمازِ جنازہ پڑھی۔ یہ درست ہے کہ ابا جان کے جنازہ کے ساتھ ہماری برادری کے کئی اشخاص اور ابا جان کے کئی ذاتی دوست تھے۔ جاوید کا اس وقت لڑکپن تھا اس لیے انھوں نے یہ بات نوٹ نہ کی ہو یا انھیں یاد نہ رہی ہو کہ میرے چھوٹے بھائی امتیاز مرحوم نے مجھے کہا کہ یہ لوگ ابا جان کا جنازہ پڑھنا چاہتے ہیں لیکن اپنے امام کے پیچھے۔ کیا اس میں آپ کو کوئی اعتراض ہے؟ میرے نزدیک یہ کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی اور میں نے بہ خوشی اجازت دی بلکہ کہا کہ وہ لوگ پہلے جنازہ پڑھ لیں بعد میں ہم پڑھ لیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔''[11]

یہاں سب سے پہلے اعجاز صاحب کا یہ بیان قابل غور ہے کہ ''جاوید کا اس وقت لڑکپن تھا اس لیے انھوں نے یہ بات نوٹ نہ کی ہو یا انھیں یاد نہ رہی ہو۔'' ڈاکٹر جاوید اقبال 5 اکتوبر 1924ء کو پیدا ہوئے اور دسمبر 1940ء میں ان کی عمر سولہ برس سے زیادہ ہو چکی تھی اور میٹرک پاس کر کے کالج میں پڑھ رہے تھے۔ یعنی اتنے بچے بھی نہیں تھے کہ اپنے سامنے ہونے والے واقعات کو فراموش کر دیں۔ حالانکہ شیخ اعجاز صاحب کا ہی اصرار ہے کہ ان کے عمِ محترم یعنی حضرت علامہؒ کی پہلی شادی سولہ برس سے بھی کم عمر میں ہو چکی تھی۔ ''مظلوم اقبال'' میں آپ فرماتے ہیں:

''ان کی (علامہ اقبالؒ) پہلی شادی 1893ء میں ہوئی جب ان کی عمر ابھی پورے سولہ برس بھی نہ تھی۔ انھوں نے دسویں جماعت کا امتحان دیا ہوا تھا۔''[12]

حیران کن بات ہے کہ سولہ برس سے بھی کم عمر میں باپ (علامہ اقبالؒ) کی تو شادی خانہ آبادی بھی ہو چکی تھی مگر سولہ برس سے زیادہ عمر میں انہی کا بیٹا (جاوید اقبال) بقول شیخ اعجاز احمد صاحب ابھی ''بچہ'' تھا اس لیے اس کی گواہی قابل قبول نہیں...... ایں چہ بوالعجبی است؟

ویسے دیکھا جائے تو شیخ اعجاز احمد صاحب نے یہ قاعدہ کلیہ ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے ہی مستعار لیا ہے کہ ہمیشہ عمر میں جو بڑے ہوتے ہیں' وہی درست اور سچ فرماتے ہیں اور کم عمر ہمیشہ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر جاوید ماموں کو یہاں یاد دہانی کروا دوں کہ انھوں نے میرے والد گرامی ڈاکٹر نظیر احمد صوفی مرحوم و مغفور کے بیانات[13] اسی بنا پر مسترد فرمائے تھے کہ وہ چونکہ شیخ اعجاز احمد

صاحب اور شیخ مختار صاحب سے کم عمر ہیں اس لیے ان کی بیان کردہ روایات [14] قابل قبول نہیں۔ اب جب کہ جاوید صاحب کو اس کا ذاتی تجربہ ہو چکا ہے کہ شیخ اعجاز صاحب نے بھی کم عمری ہی کی بنیاد پر ان کی روایات مسترد فرما دی ہیں تو یقیناً اب ان کے لیے درست فیصلہ فرمانا زیادہ آسان ہو جائے گا کہ کیا واقعی کم عمر ہمیشہ غلط بیانی ہی کیا کرتے ہیں؟

دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ شیخ اعجاز صاحب نے ''ان لوگوں'' کو پہلے نماز جنازہ پڑھنے کی اجازت مرحمت فرماتے ہوئے خود بعد میں ادائیگی کا کیا خوب جواز پیدا فرمایا ہے۔ جھوٹ کی بھی کوئی حد ہوتی ہو گی مگر جن کی بنیاد ہی جھوٹ پر ہو' ان کے لیے اس قسم کے چھوٹے موٹے جھوٹ سچ کی کیا حیثیت...... یعنی تمام بزرگ اور دوسرے لوگ جن میں شیخ عطا محمد صاحب کے برادر نسبتی یعنی ان کی چھوٹی ہمشیرہ زینب بی بی کے خاوند شیخ غلام رسول صاحب' شیخ عطا محمد صاحب کے برادر نسبتی یعنی ان کی بیگم کے بھائی بابو غلام نبی صاحب' بابو غلام نبی صاحب کے صاحبزادے عبدالغنی راٹھور صاحب' شیخ عطا محمد صاحب کے چھوٹے داماد ڈاکٹر نظیر احمد صوفی (جن کو شیخ صاحب نے آخری وصیت فرمائی تھی کہ ان کا جنازہ حنفی العقیدہ طریق پر پڑھایا جائے) اور ڈاکٹر جاوید اقبال شامل تھے۔ اس کے علاوہ خاندان کے دوسرے بزرگ اور افراد' ہمسائے' محلّہ دار' دوست احباب اور شہر کے دوسرے اکابرین سب ہمیشہ غلط بیانی سے کام لیتے رہے اور صرف ایک فرد یعنی شیخ اعجاز احمد صاحب سچ کہہ رہے ہیں کیونکہ جس طرح بھی ہوا' انھوں نے اپنے مرحوم باپ کے خلاف سازش تیار کی اور انھیں 313 [15] کی فہرست میں شامل فرما دیا۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ جس شخصیت کو اتنا بلند مقام حاصل تھا کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کے 313 [16] دوستوں کی فہرست میں 224 ویں [17] نمبر پر تھے' کو بہشتی مقبرہ (قادیان) میں دفن ہونے کے لیے کوئی خصوصی جگہ عطا نہیں کی گئی...... حالانکہ اصولاً بانی سلسلہ قادیانی کو اپنی زندگی میں ہی اپنے اتنے قریبی ساتھی کے لیے یہ اہتمام کر دینا چاہیے تھا۔ دوسرے جب شیخ اعجاز احمد صاحب نے مسلمانوں سے علیحدہ اپنے والد مرحوم کی نماز جنازہ ادا کر دی تو اس کے بعد بھی وہاں پر موجود مسلمانوں میں سے کسی نے شیخ عطا محمد صاحب کے سنی مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیے جانے پر کیوں اعتراض نہ کیا؟ اس زمانے میں تو اس بات پر اتنا سخت ردعمل ہوا کرتا تھا کہ اگر غلطی سے کوئی قادیانی کسی طرح مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دیا جاتا تو بعد میں اس کی قبر کو اکھاڑ دیتے تھے۔ مگر یہاں تو معاملہ بالکل ہی برعکس تھا کہ شیخ عطا محمد نے اپنی زندگی میں ہی اپنے لیے پختہ قبر تعمیر کروا رکھی تھی اور سنی مسلمانوں نے پورے احترام سے ان کی نمازِ جنازہ ادا کرنے کے بعد ان کو پہلے سے تعمیر شدہ قبر میں دفن بھی کیا اور آج تک وہ وہیں موجود ہیں۔ کبھی کسی کو ان کے خلاف کوئی ایسا انتہائی اقدام کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس سے کیا

حقیقت سامنے آتی ہے، یہی کہ وہ بفضلِ تعالیٰ حنفی العقیدہ مسلمان تھے اور ان کا منکرینِ ختم نبوت کے گروہ سے مطلقاً کوئی تعلق نہیں تھا۔ میرے خیال میں اگر شیخ اعجاز صاحب کا بس چلتا تو وہ کسی نہ کسی طرح اپنے والد صاحب کو قادیان کے بہشتی مقبرہ میں دفن کرنے سے کبھی باز نہ رہتے مگر یہ تو جبھی ممکن ہوتا کہ ان کی جماعت بھی اس سے متفق ہوتی اور اس اتفاق کے لیے بے حد ضروری تھا کہ شیخ عطا محمد مرحوم کا تعلق قادیانی جماعت سے ثابت ہو۔ میرے والد گرامی کا بیان ہے کہ شیخ عطا محمد صاحب کے جنازے کے لیے شیخ اعجاز احمد صاحب نے اپنی جماعت کی سیالکوٹ شاخ کے ممبران کو اطلاع 18 بھی بھجوائی کہ فلاں وقت جنازے میں شمولیت فرمائیں، مگر سوائے چند ایک ان (شیخ اعجاز) کے قریبی دوستوں کے کوئی نہ آیا اور جب شیخ اعجاز صاحب علیحدہ نمازِ جنازہ کے لیے کھڑے ہوئے تو کوئی بھی ان کے ساتھ موجود نہیں تھا کیونکہ وہ لوگ بھی شاید راستے ہی سے غائب ہوگئے تھے یا انھوں نے بھی مسلمانوں کے ساتھ ہی جنازہ پڑھ لیا تھا۔ امام کے پیچھے جب شیخ اعجاز صاحب اکیلے کھڑے ہوئے تو ان کے ایک دوست جو پہلے جنازہ پڑھ چکے تھے، جلدی سے آگے بڑھ کر ان کے ساتھ شامل ہوگئے تاکہ جماعت مکمل ہو جائے۔ یہاں یہ حقیقت بھی مدنظر رہے کہ شیخ عطا محمد نے دوبار اپنے لیے قبرستان امام صاحب میں پختہ قبر تعمیر کروائی...... پہلی دفعہ جب اپنی والدہ ماجدہ کی قبر پختہ کروائی تو اس کے ساتھ دو مزید قبریں تعمیر کروائیں۔ ایک اپنے والد شیخ نور محمد صاحب کے لیے اور دوسری اپنے لیے۔ حضرت علامہؒ کی بڑی صاحبزادی معراج خالہ نے اپنی وفات کے وقت اپنے تایا جان سے یہ آخری خواہش ظاہر کی کہ انھیں دادی اماں اور دادا ابو کے پہلو میں اس جگہ آسودۂ خاک کیا جائے جو جگہ آپ نے اپنے لیے مخصوص کی ہوئی ہے۔ چنانچہ ان کی آخری خواہش کے احترام میں ایسا ہی کیا گیا اور شیخ عطا محمد صاحب نے اپنے والدین کے ساتھ اپنی بھتیجی۔ 19 کو دفن کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے اور اپنی زوجہ محترمہ کے لیے دوبارہ پختہ قبریں تعمیر کروائیں اور خود 1940ء میں وہاں دفن ہوئے اور 1958ء میں بھابھی جی کو اس مخصوص جگہ دفن کیا گیا۔ کہیں سے کوئی اعتراض نہیں ہوا کیونکہ سب لوگ جانتے تھے کہ شیخ عطا محمد اور ان کی زوجہ محترمہ دونوں پکے حنفی العقیدہ مسلمان تھے۔

اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ شیخ عطا محمد مرحوم ''سابقون'' 20 میں سے تھے اور 313 دوستوں میں ان کا نمبر 224 تھا تو کیا انھیں خود ہی قادیان کے بہشتی مقبرے میں دفن ہونے کے انتظامات نہیں کرنا چاہیے تھے۔ آخر وہ کیوں بار بار اپنے لیے یہاں سیالکوٹ میں اور وہ بھی کٹر سنی مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہونے کا اہتمام فرما رہے تھے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انھیں کسی طور اپنا تعلق قادیانی جماعت سے ثابت ہونا قبول نہیں تھا؟ اور ان کو یہ خدشہ لاحق تھا کہ اگر انھوں نے

اس کی پیش بندی نہ کی تو ان کی وفات کے بعد جب وہ بے بس ہو جائیں گے تو ان کے صاحبزادے شیخ اعجاز کے ذریعہ قادیانی جماعت اپنی سی کوشش ضرور کرے گی تا کہ حضرت علامہؒ کو پریشان کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں گزشتہ صفحات میں یہ ذکر تفصیلاً ہو چکا ہے کہ کس طرح شیخ اعجاز صاحب نے اپنے والد مرحوم کو آخری وقت میں قادیانی مذہب قبول کر لینے پر مجبور کیا تھا اور کس طرح شیخ عطا محمد صاحب نے ثابت قدمی دکھائی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی زندگی میں یہ بالکل درست اقدام کیا کیونکہ قادیانی بیٹے کے ذریعہ قادیانی جماعت کے شر سے محفوظ رہنے کا اس سے بہتر کوئی اور راستہ یقیناً نہیں تھا۔ اب شیخ اعجاز یا قادیانی جماعت جو ان کے جی میں آئے کہتی رہے' ان کی کوئی بات کسی طور قابل قبول نہیں کیونکہ شیخ نور محمد مرحوم و مغفور اور شیخ عطا محمد مرحوم و مغفور اپنے عمل سے یہ ثابت کر گئے ہیں کہ وہ پکے حنفی العقیدہ مسلمان تھے اور ان کا قادیانی جماعت یا سلسلۂ احمدیت سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ کبھی بھی منکرین ختم نبوت کے گروہ میں شامل نہیں رہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے کہ مصنفِ ''مظلوم اقبال'' کو یقیناً اپنی جماعت کی طرف سے یہ حکم ملا ہو گا کہ ایک ایسی کتاب ترتیب دیں جو خاندانِ اقبال یعنی اپنے ہی خاندان اور اپنے ہی بزرگوں کا مقام (image) اس قدر برباد کر دے کہ پھر کوئی راہ ان کے لیے باقی نہ رہے کہ کوئی اس جال سے باہر نکال سکے...... چنانچہ انھوں نے اس حکم حاکم پر لبیک کہنا عین ''سعادتِ دارین'' جانتے ہوئے اس کو عملی شکل دے ڈالی' حالانکہ اس سے پیشتر ان کا کسی قسم کی کوئی کتاب وغیرہ لکھنے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔ میرے پاس ان کی تحریر موجود ہے جس میں انھوں نے مجھے' جب میں نے 'اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اوّل) کے سلسلے میں کچھ مواد فراہم کرنے کے لیے لکھا تو انھوں نے صاف صاف جواب دیا کہ......

''میرے پاس اب کچھ باقی نہیں ہے۔ جو کچھ میرے پاس تھا' میں فقیر وحید الدین کو دے چکا ہوں اور انھوں نے ''روزگارِ فقیر'' میں شامل کر دیا ہے۔'' یہ اواخر 1967ء کی بات ہے۔ گو انھوں نے اس وقت غلط بیانی سے ہی کام لیا کیونکہ ان کے پاس کم از کم 103 خطوط تو ضرور موجود تھے جو اب ''مظلوم اقبال'' میں شامل ہیں۔ اعجاز ماموں کے متذکرہ بالا خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:

کراچی 23 نومبر 1967ء

عزیزم خالد!

بعد دعا واضح ہو تمہارا 15 نومبر کا لکھا خط ملا۔ چچا جان کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کتابوں میں اور اخبارات اور رسالوں میں۔ بعض کتابیں اور مضامین تو بڑے فاضلانہ اور معلوماتی ہیں بعض رطب و یابس سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کے متعلق اگر کسی نے کچھ مزید لکھنا ہو بالخصوص گھریلو

زندگی کے متعلق تو اسی صورت میں لکھنا چاہیے جب کوئی نئی بات کہنے کو ہو۔ ورنہ پہلے سے بیان کردہ باتوں کو دوسرے پیرایہ میں دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے جو کچھ چچا جان کے متعلق یا اپنے خاندان کے متعلق معلوم تھا' وہ میں نے فقیر وحید الدین صاحب کو لکھ کر دے دیا تھا۔ ان کی کتاب روزگارِ فقیر کے دونوں حصوں میں وہ معلومات درج ہیں اور کوئی نئی بات مجھے یاد نہیں۔ تم اس کتاب کے دونوں حصے پڑھ لو اور بھی جو کچھ ان کے متعلق لکھا گیا ہے اس کو دیکھ لو' اس کے بعد جو کتاب تم ترتیب دے رہے ہو' اس کو دیکھ لو کہ اس میں گھریلو زندگی کے متعلق کوئی نئی بات بیان کی گئی ہے۔ اگر نئی باتیں ہیں تو ضرور کتاب کو شائع کرو۔ مسودہ پہلے مجھے بھیجو گے تو میں پڑھ کر رائے دے سکوں گا۔

یہاں سب طرح خیریت ہے۔ اپنے والد اور والدہ کو سب کی طرف سے سلام کہہ دینا۔

خیر طلب

اعجاز احمد

علاوہ ازیں جب 1967ء میں ہی ''علامہ اقبال اور ان کی پہلی بیوی'' اشاعت پذیر ہوئی تو میں نے انھیں لکھا کہ اس کا جواب لکھا جانا چاہیے مگر ان کا جواب آیا کہ ''نہیں یہ مناسب نہ ہوگا...... ہمیں خاموشی اختیار کرنی چاہیے......'' مگر اب ایک دم انھیں عمر کے آخری حصے میں کتاب لکھنے اور پھر خود ہی اسے شائع فرمانے کا خیال کیوں آیا اور وہ بھی اس طرح کہ جس میں انھوں نے ''مخصوص'' سمتوں میں کام کیا۔

حضرت علامہؒ اپنے برادرِ بزرگ جناب عطا محمد مرحوم و مغفور کا ہمیشہ بے حد احترام فرماتے تھے اور اکثر و بیشتر اس کا اظہار بھی فرمایا کرتے تھے کہ ان کے بڑے بھائی صاحب نے ان کے لیے بہت قربانیاں دی ہیں۔ ''بانگ درا'' کی ایک مشہور نظم ''التجائے مسافر'' میں جس محبت اور عزت سے ان کا ذکر فرمایا ہے' پڑھ کر رشک آتا ہے:

وہ میرا یوسفِ ثانی' وہ شمع محفل عشق
ہوئی ہے جس کی اخوت قرار جاں مجھ کو
جلا کے جس کی محبت نے دفتر منؔ و تو
ہوائے عیش میں پالا' کیا جواں مجھ کو
ریاضِ دہر میں مانندِ گل رہے خنداں
کہ ہے عزیز تر از جاں وہ جانِ جاں مجھ کو

چنانچہ یورپ سے مراجعت کے بعد انھوں نے اپنے بڑے بھائی کی مقدور بھر خدمت کی۔ بڑے بھائی کے بچوں کی تعلیم میں ہر طرح مدد کی اور خاص طور پر شیخ اعجاز احمد جو شیخ عطا محمد مرحوم کے سب سے بڑے فرزند تھے کی ہر طرح رہنمائی فرمائی اور انھیں ہر اونچ نیچ سمجھا کر قانون کی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کیا' جو آئندہ زندگی میں قدم قدم پر ان کے کام آئی۔ وہ ''مظلوم اقبال'' میں یوں اعتراف کرتے ہیں۔

''یہاں مجھے ان کی اصابتِ رائے کا بھی اعتراف کرنا چاہیے۔ قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے جو فوائد انھوں نے بیان فرمائے' وہ سب صحیح ثابت ہوئے۔ میرے کیریئر کے ہر مرحلہ پر قانون کی ڈگری جو میں نے لاء کالج میں داخل ہو کر حاصل کر لی، بڑے کام آئی۔''[21]

اس طرح شیخ اعجاز احمد صاحب کی درست سمت میں رہنمائی کے بعد پھر ان کے لیے اپنی فطرت کے خلاف سفارش تک کی اور انھیں ملازمت دلوائی جس کی وجہ سے بعد میں بہت بڑا نقصان بھی برداشت کیا۔ اس کے بعد حضرت علامہؒ نے اپنی وصیت میں ان کو اپنے نابالغ بچوں کا سرپرست مقرر فرمایا' لیکن ان کے لیے اتنا کچھ کرنے کے باوجود جب 1931ء میں اعجاز صاحب دنیاوی منفعت کی خاطر اپنے اس عظیم چچا کو جو قدم قدم پر ان کے ممد و معاون ثابت ہوئے' چھوڑ کر منکرینِ ختم نبوت کے گروہ میں شامل ہو گئے تو حضرت علامہؒ کو دلی دکھ اور رنج ہوا۔ درحقیقت قادیانی جماعت ایک طویل عرصہ سے حضرت علامہؒ کو نیچا دکھانے کے لیے کوشاں تھی کہ ان کے خاندان کے کسی فرد کو اپنے ساتھ شامل کر لیں۔ چنانچہ سر ظفر اللہ خان کے ذریعے شیخ اعجاز احمد صاحب کو شکار کیا گیا۔ ان کے اس عمل نے علامہ صاحب کو ان سے بے حد بددل کر دیا اور وہ شیخ اعجاز سے بہت مایوس ہو گئے۔ چنانچہ اس سلسلے میں اپنے عزیز دوست سر راس مسعود کو خط میں لکھا کہ وہ اعجاز کے قادیانی ہو جانے سے بڑے پریشان ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنی وصیت میں اس کی جگہ سر راس مسعود کو نامزد کر دیں۔

حال ہی میں آنٹی ڈورس (مسز ڈورس احمد) نے بھی اپنی کتاب "Iqbal As I Knew Him" میں اس سلسلے میں بڑی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے کہ حضرت علامہؒ شیخ اعجاز احمد کے قادیانی ہو جانے کی وجہ سے اپنے بچوں کے سرپرست کی حیثیت سے اپنی وصیت میں شامل کر لینے پر پریشان تھے اور ان کی جگہ کسی دوسرے کو نامزد کرنا چاہتے تھے۔ ان کی کتاب سے اقتباس ملاحظہ ہو:

(ترجمہ) ''شیخ اعجاز احمد' شیخ عطا محمد کے بڑے صاحبزادے تھے اور بڑے تعلیم یافتہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا ان کے بارے میں بہت اچھا نظریہ تھا۔ اس لیے انھوں نے

انھیں اپنے نابالغ بچوں کا سرپرست مقرر کیا اور اپنے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد پر انھیں ترجیح دی۔ لیکن اپنی زندگی کے آخری ایام میں انھوں نے مجھے کئی بار کہا کہ میری خواہش ہے کہ کوئی اور فرد شیخ اعجاز احمد کی جگہ بچوں کا گارڈین (سرپرست) مقرر ہوتا کیونکہ وہ (شیخ اعجاز احمد) قادیانی ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب (علامہ صاحب) نے اپنی اس رائے کا کئی بار مجھ سے اظہار کیا۔''[22]

مندرجہ بالا اظہارِ حقیقت کے بعد یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ شیخ اعجاز کے قادیانی جماعت میں شامل ہو جانے سے علامہ صاحب کس قدر رنجیدہ تھے۔ اس طرح شیخ صاحب نے دنیا تو بہت کمائی مگر وہ ''محسن کشی'' کے مرتکب بھی ہوئے اور محسن بھی کون وہ عم محترم جس نے قدم قدم پر رہنمائی اور دستگیری کا حق ادا کر دیا۔ اپنی زندگی میں جو کامیابیاں انھیں حاصل ہوئیں اور جس جس طرح انھوں نے فوائد حاصل کیے، ان کی بنیاد اسی عظیم چچا نے تو رکھی تھی ورنہ وہ خود تو صرف ایم۔ اے [23] کر کے زیادہ سے زیادہ کسی کالج کے پروفیسر کے طور پر ریٹائر ہونا چاہتے تھے مگر حضرت علامہؒ نے انھیں قانون کی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کیا اور ہر قدم پر ان کے لیے اپنی فطرت کے خلاف سفارشوں اور رعایتوں کے پُل باندھے، تب کہیں وہ (شیخ اعجاز) اس قابل ہوئے کہ اس عظیم ہستی پر بے بنیاد بہتان تراشیں اور ان کی تکذیب کے مرتکب ہوں۔

چوں قلم در دستِ غدارے بود
لا جرم منصور بر دارے بود
(اقبالؒ)

بڑا مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت علامہؒ کے کسی دوست نے انھیں بتایا کہ فلاں فلاں شخص آپ کو ہر محفل میں برا بھلا کہتا ہے اور آپ کے ہر کام میں کیڑے نکالتا ہے۔ حضرت علامہؒ بڑے حیران ہوئے اور فرمایا...... ''یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے۔ میں نے تو کبھی اس سے کوئی فیض نہیں کیا؟'' یعنی یہ اس جہان کی ریت ہے کہ آپ جس سے فیض کریں گے، وہی آپ کے خلاف ہو جائے گا...... کہتے ہیں کہ فیض اور بے فیضی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جہاں ''فیض'' ہوگا ''بے فیضی'' کا وہاں ہونا لازم ہے۔ یہاں مجھے حضرت علیؓ کا ایک مشہور قول یاد آ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ:

''جس پر احسان کرو اس سے محتاط رہو''

حضرت علامہؒ سے یہیں احتیاط نہیں ہوئی اور انھوں نے جس جس کے ساتھ احسان کیا، اسی نے احسان فراموشی دکھائی۔ جس کے ساتھ فیض کیا بدلے میں ''بے فیضی'' ملی۔ ویسے ایک لحاظ سے اچھا ہی

ہوا کہ اس جہانِ فانی سے رخصت سے پہلے ہی یہ ان کا قرض اتار گئے ورنہ بعد میں کون اس چکر میں پڑتا۔

مرا کُشتی و تکبیرے نہ گفتی
عجب سنگیں دلے' اللہ اکبر!

(2)

''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اوّل) **1971**ء میں بزم اقبال لاہور کی جانب سے اشاعت پذیر ہوئی۔ اس میں حضرت علامہؒ کی گھریلو زندگی کے نادر واقعات کے علاوہ ان کی بالکل درست تاریخِ ولادت جو سیالکوٹ میونسپل ریکارڈ سے دستیاب ہوئی' بھی شامل تھی۔ اشاعت سے قبل مسودہ بزم اقبال لاہور کے اراکینِ مجلس نے ملاحظہ فرمایا جن میں ڈاکٹر جاوید اقبال' جسٹس ایس اے رحمٰن' سید عابد علی عابد' سیّد نذیر نیازی وغیرہم شامل تھے۔ علاوہ ازیں سب سے پہلے سیّد امتیاز علی تاج جو ان دنوں بزم اقبال اور مجلس ترقیِ ادب کے معتمد اعزازی ہوا کرتے تھے' اس کو اشاعت کے لیے بصد شکریہ قبول کر چکے تھے۔ اس تمام کارروائی کے بعد مسودہ جناب مولانا غلام رسول مہر کو بھجوا دیا گیا جنھوں نے ایک مفصل اور مدلل پیش لفظ اس پر تحریر کیا۔ ان تمام حضرات میں سے کسی نے بھی مندرجات پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ میری تحقیق کردہ تاریخ ولادت کو بے حد سراہا گیا..... اس کا برملا اظہار مولانا مہر نے پیش لفظ میں بھی کیا۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''مرحوم کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد ان کی تاریخ پیدائش کے متعلق ایک مجمل سی تحریر شیخ عطا محمد مرحوم نے روزنامہ ''انقلاب'' میں چھپوا دی' یعنی **1873**ء یہی تاریخ عموماً مستند سمجھی جاتی رہی۔ پھر کہا گیا کہ **1876**ء صحیح تاریخ ولادت ہے۔ پیش نظر کتاب میں پوری چھان بین کے بعد طے کر دیا گیا ہے کہ صحیح تاریخ ولادت **29** دسمبر **1873** عیسوی تھی (**28** ذیقعدہ **1290** ہجری' اور دن غالباً دوشنبہ)۔ اس مسئلے کے لیے بھی کتاب کا ایک مستقل باب وقف ہے جس میں ہر اعتبار سے محکم دلائل پیش کر دیے گئے ہیں۔ یقین ہے کہ اس مسئلے پر مزید بحث یا گفتگو کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔''[24]

مولانا مہر کا فاضلانہ پیش لفظ پورا پڑھنے کے قابل ہے اور 'اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اوّل) میں شامل ہر بات کی تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر ان کا یہ فرمانا:

''میں کہہ نہیں سکتا کہ اقبال مرحوم و مغفور کے سوانح میں اب تک کتنی کتابیں

مرتب ہو چکی ہیں۔ اغلب ہے' ان کا خاصا بڑا حصہ میری نظر سے نہ گزرا ہو' لیکن جس وضع اور انداز کی کتاب کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں' ویسی تو شاید یہی کتاب مرتب ہوئی ہے جس کا مقدمہ لکھنے کا شرف مجھے حاصل ہو رہا ہے۔ اس کے ہر صفحے پر مرحوم و مغفور ابتداً سے آخری دور تک کاملاً بے ساختہ انداز میں چلتے پھرتے معلوم ہوتے ہیں۔ کتاب کی بیشتر حکایات و روایات خود علامہ مرحوم کے اہل خاندان کی زبان سے بیان کی گئی ہیں' جس سے زیادہ مستند شہادت کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ ان روایات میں بھی بڑا حصہ مرحوم کی برادر زادی کا ہے' جن کی زندگی بچپن سے شادی تک علامہ مرحوم اور ان کی بیگم یعنی والدۂ مرحومہ عزیزی جاوید اقبال کے ظل عاطفت میں گزری۔ جس حد تک مجھے علم ہے' اقبال مرحوم کا برتاؤ اپنے بھائی کے بچوں کے ساتھ ویسا ہی تھا کہ جیسا کسی باپ کا برتاؤ اولاد کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ مرحوم کے نزدیک اپنے بچوں اور بھائی کے بچوں میں اصلاً امتیاز کی گنجائش ہی نہ تھی۔ برادر زادے علامہ مرحوم ہی کے زیر نگرانی تعلیم و تربیت پا کر ملازم ہوئے۔ اس برتاؤ کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بھائی ہی نے علامہ مرحوم کی تعلیم خصوصاً ولایت کی تعلیم کے گراں قدر مصارف انتہائی خوش دلی سے برداشت کیے تھے' لیکن جس برادر زادی کی بیشتر روایات سے یہ کتاب مزین ہے' اسے مرحومہ بیگم اقبال نے بچپن ہی میں منہ بولی بیٹی بنا لیا تھا اور برابر اپنے ساتھ رکھا۔ کیا کہا جا سکتا ہے کہ ان گراں بہا معلومات کو محفوظ رکھنا ممدوحہ کا کتنا عظیم القدر کارنامہ ہے' جسے علامہ مرحوم کے کروڑوں نیاز مندوں کی گردن پر ایک دائمی احسان کی حیثیت حاصل رہے گی۔ پھر ممدوحہ کے صاحبزادے عزیزی خالد نظیر صوفی کا ہم سب کو سپاس گزار ہونا چاہیے جن کی سعی و کاوش سے یہ گنجینہ بے بہا مرتب ہو کر منظر عام پر آ رہا ہے۔'' 25ے

مگر میرے سب سے بڑے ماموں جناب شیخ اعجاز احمد صاحب کو میری یہ جسارت بالکل پسند نہ آئی کہ فقیر سید وحید الدین کی کتاب ''روزگارِ فقیر'' کے ذریعے انھوں نے جو تاریخ پیدائش تحقیق کروائی تھی' اس کے خلاف کوئی بات جائے۔ چنانچہ انھوں نے بہت شور و غوغا مچایا اور بزم اقبال والوں کو خوب رگیدا کہ آپ نے اس قسم کی کتاب شائع ہی کیوں کی۔ ان دنوں بے چارے پروفیسر عثمان بزم کے معتمد اعزازی تھے جو شاید یہ دباؤ برداشت نہ کر سکے اور شیخ اعجاز صاحب کے ہمنوا بن کر ایک بار پھر

تاریخ ولادت اقبال کی تلاش میں اٹھ کھڑے ہوئے اور بزم اقبال کے زیر سایہ کمیٹیاں اور ذیلی کمیٹیاں تشکیل دے دی گئیں۔ اس سلسلے میں شیخ اعجاز صاحب سے ان کی طویل خط و کتابت رہی اور اعجاز صاحب نے بزم کے اجلاس میں شرکت فرما کر بڑے پر مغز اور زوردار مقالے بھی پڑھے، جن میں انھوں نے تاریخِ ولادتِ اقبال پر اظہارِ خیال کے ساتھ ساتھ مجھ ناچیز اور میری کتاب ''اقبال درونِ خانہ'' پر بھی نظر کرم فرمائی اور اپنے جلے دل کے پھپھولے خوب خوب پھوڑے۔ ان کی انھی تحریروں میں سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> (ترجمہ) ''میں جیسا کہ آپ کی قائم کردہ ذیلی کمیٹی جو علامہ اقبال کی درست تاریخِ ولادت مقرر کرنے کے لیے قائم کی گئی ہے' کے سلسلے میں ''اقبال درونِ خانہ'' میں تاریخِ پیدائش کے متعلق درج حقائق تک اپنے آپ کو محدود رکھنا چاہتا ہوں اور کسی دوسرے موضوع کے متعلق کچھ کہنا پسند نہیں کرتا۔ البتہ ریکارڈ کی درستگی کے لیے میں اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ اس میں شامل اکثر باتیں بالکل جھوٹ کا پلندہ ہیں۔ کچھ شاید آدھی سچی ہوسکتی ہیں اور کچھ تو بالکل ''الف لیلوی کہانیوں'' کے زمرے میں آئیں گی۔ اگر میرے چچا جان کو کسی طرح اس کتاب کے مندرجات کے متعلق جنت الفردوس میں علم ہو جائے تو وہ بے چارے پکار اٹھیں گے ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ۔'' مجھے تعجب ہے کہ بزمِ اقبال جیسے ادارے نے کس طرح اس قسم کی ''کہانیوں کی کتاب'' کو اپنی طرف سے شائع کرنا پسند کیا۔''[26]

جنابِ شیخ اعجاز احمد صاحب نے اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا ہے اور ہر طرف شور مچا کر لوگوں کو جھنجھوڑتے رہے ہیں کہ خدارا کچھ کرلیں ورنہ غضب ہو جائے گا۔ مگر مقام حیرت ہے کہ اتنا کچھ زہر اگلنے کے باوجود شیخ صاحب نے ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اوّل) میں درج کئی ایک واقعات معمولی ردوبدل کے ساتھ اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' میں شامل فرما لیے ہیں۔ گو ان میں کرداروں کے نام عمداً تبدیل کر دیے گئے ہیں مگر ان کی نشان دہی کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ دراصل شیخ صاحب قبلہ کو ہمیشہ ہی سے یہ اصرار رہا ہے کہ حضرت علامہؒ کے متعلق جو کچھ وہ بیان فرمائیں' وہی صدفی صد درست تسلیم کیا جانا چاہیے کیونکہ وہ علامہ صاحب کے ''چہیتے'' بھتیجے رہ چکے ہیں۔ کوئی دوسرا خواہ وہ علامہؒ سے کتنا قریب ہی کیوں نہ رہا ہو' جن میں میری والدہ مرحومہ جو علامہؒ کی بھتیجی اور شیخ اعجاز احمد صاحب کی حقیقی ہمشیرہ ہیں' کچھ بیان کریں تو وہ بالکل جھوٹ کا پلندہ اور ''الف لیلوی کہانیوں'' کے زمرے میں آئے گا۔ یہ دوہرا معیار شاید

ان کا اپنا ایجاد کردہ ہے۔ علاوہ ازیں اگر کوئی بات ''میرے والدِ محترم'' بیان کرتے ہیں تو وہ شیخ صاحب کو اس لیے پسند نہیں آتی کہ وہ ان کے ''دُور کے رشتہ دار'' تھے۔ میرے والد مرحوم چونکہ علامہ صاحب کی بڑی ہمشیرہ محترمہ طالع بی بی خلد آشیانی کے پوتے ہونے کا شرف بھی رکھتے ہیں' اس لیے وہ شیخ اعجاز صاحب کے دور کے رشتہ دار ٹھہرے مگر جو رشتہ بعد میں قائم ہوا...... یعنی حقیقی بہنوئی کا...... وہ ان کو قبول نہیں حالانکہ میرے والدین کے نکاح نامہ پر انہی شیخ اعجاز احمد صاحب نے دلہن کے وکیل کی حیثیت میں دستخط ثبت فرمائے' اس کا اصل میرے پاس محفوظ ہے۔ اس قبیل کے لوگوں کی کسی بات کا اعتبار کرنا بڑا مشکل ہو جایا کرتا ہے' جو اپنی مطلب پرستی میں اپنے ماں باپ کو بھی پہچاننے سے انکاری ہو جائیں۔

نیشِ عقرب نہ از پئے کین است
مقتضائے طبیعتش این است

علاوہ ازیں ''مظلوم اقبال'' میں وہ تمام واقعات جو اس سے پیشتر مصنفِ ''مظلوم اقبال'' کی روایت کے ساتھ ''روزگارِ فقیر'' میں شائع ہو چکے تھے' شامل کیے گئے ہیں اور بعض تو بالکل دوہرانے کے زمرے میں آتے ہیں حالانکہ میں نے جب ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اوّل) کے سلسلے میں ان سے کچھ اعانت چاہی تو مجھے جواب میں تحریر فرمایا کہ اگر تمھارے پاس نئے واقعات ہوں تو ضرور کتاب شائع کرو' ادھر ادھر سے شائع شدہ واقعات جمع کر کے ایک نئی کتاب کو شکل دینا چاہتے ہو تو یہ مناسب نہ ہوگا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میں نے ان کی صائب رائے پر عمل کرتے ہوئے پوری پوری کوشش کی کہ ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اوّل) میں بالکل غیر مطبوعہ واقعات جمع کروں اور اسی لیے اس کی ضخامت کافی کم رہی...... حالانکہ کئی ایک کرم فرماؤں نے جن میں ''ادبی دنیا'' کے جناب محمد عبداللہ قریشی اور جناب نذیر نیازی شامل تھے' مشورہ دیا کہ اس میں کچھ حوالے ادھر ادھر سے بھی شامل کر لیں اور ضخامت کم از کم تین چار سو صفحات تک لے جائیں' مگر میں نے محض اس بنا پر انکار کر دیا کیونکہ میرا ارادہ صرف اور صرف نئے واقعات قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے بزمِ اقبال کی طرف سے اشاعت کے لیے منتخب کیے جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس میں غیر ضروری مواد شامل نہیں تھا اور یہ بالکل نئے انداز میں حیاتِ اقبال کے اندرونِ خانہ پہلو پر سیر حاصل روشنی ڈال رہی تھی۔ مجھے بے حد افسوس ہے کہ ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اوّل) جسے مصنفِ ''مظلوم اقبال'' نے ''کہانیوں کی کتاب'' اور ''جھوٹ کا پلندہ'' قرار دیا تو حکومت پاکستان کے ادارے بزمِ اقبال کی جانب سے نہ صرف شائع ہوئی 27 بلکہ اس کا دوسرا ایڈیشن 28 بھی چھپ چکا ہے' مگر ان کی اپنی کتاب یعنی ''مظلوم اقبال'' جس کے متعلق شاید انھیں ''حقائق'' سے مزین ہونے کا زعم رہا ہوگا' کو کسی پرائیویٹ ادارے نے بھی شائع

کرنے کی حامی نہیں بھری۔ چنانچہ انھیں خود اسے شائع فرمانا پڑا اور شاید ''مفت'' ہی تقسیم بھی کرنا پڑا کیونکہ کوئی قیمت اس پر درج نہیں۔ امید ہے اس طرح مصنفِ ''مظلوم اقبال'' پر ''مقبول'' اور ''غیر مقبول'' تحریروں کا فرق ضرور واضح ہو گیا ہوگا۔ بے چاروں کو یہی تو اعتراض تھا کہ آخر بزمِ اقبال لاہور جیسے ادارے نے کیوں ایک ایسی ''کہانیوں کی کتاب'' شائع کی۔

بانٹ دینے کی کوئی چیز نہیں فضل و کمال
ورنہ حاسد تیری خاطر سے میں یہ بھی کر لوں

(مولانا شبلی نعمانی)

مصنفِ ''مظلوم اقبال'' کا یہ فرمانا کہ اگر ان کے چچا جان یعنی حضرت علامہؒ کو کہیں جنت الفردوس میں اس کتاب یعنی ''درونِ خانہ'' (حصہ اوّل) کے مندرجات کا علم ہو جائے تو وہ بے چارے پکار اٹھیں گے کہ...... ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ۔'' حیرت ہے کہ مصنفِ ''مظلوم اقبال'' کو ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اوّل) کے مندرجات کی وجہ سے اپنے ''مظلوم'' چچا جان کا اس قدر خیال رہا اور وہ ان کے غم میں اس قدر دوبلے ہوتے رہے مگر خود انھوں نے کیا کیا؟ ''مظلوم اقبال'' میں انھوں نے جس جس طرح اپنے عمِ محترم پر ''ظلم'' روا رکھے اور جس جس طرح انھیں ''بدنام'' کرنے کی کوششِ ناتمام فرمائی' ان سب کو دیکھ کر یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ اگر ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اوّل) کے مندرجات کو جان کر وہ اپنے دوستوں سے پناہ کے طلبگار ہوں گے تو یقیناً ''مظلوم اقبال'' میں ان پر لگائے گئے بے بنیاد الزامات جن میں سرفہرست ''منکرینِ ختم نبوت کا ساتھ دینے' ان کو اچھا سمجھنے اور ان سے مشاورت طلب کرنے والے''29ؔ تک ثابت کرنے کی سعیٔ لاحاصل فرمائی ہے۔ مصنفِ ''مظلوم اقبال'' کا بس نہیں چلا اور اس کا انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے۔30ؔ ورنہ وہ علامہ صاحب کو بھی اپنے ''ناکردہ گناہ'' والدِ مرحوم (شیخ عطا محمد مرحوم) کی طرح مرزا غلام احمد قادیانی کے خصوصی دوستوں اور ''سابقون'' میں شامل کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے۔ اس کے علاوہ ''مظلوم اقبال'' میں حضرت علامہؒ کو ''کان کے کچے''31ؔ ''حاسد''32ؔ ''سر ظفر اللہ خان کی وجہ سے احساسِ محرومی و ناکامی کا شکار''33ؔ وغیرہ وغیرہ ثابت کرنا چاہا ہے تو یہ سب کچھ معلوم ہونے کے بعد روحِ اقبال کا ردِعمل کیا رہا ہوگا اور وہ کس کس طرح نہ تڑپی ہوگی۔ اس کا اندازہ شاید مصنفِ ''مظلوم اقبال'' کو نہیں ہوا یا وہ جانتے بوجھتے اس حقیقت سے چشم پوشی فرما رہے ہیں مگر انشاء اللہ وہ وقت زیادہ دور نہیں جب ان کو اس سب کا حساب دینا پڑے گا جس کی ابتدا تو یقیناً ہو چکی ہے۔

اس حقیقت سے سبھی آگاہ ہیں کہ راقم الحروف نے ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اوّل) میں

اس قسم کے بہتان اور الزام لگانے کی جسارت نہیں کی بلکہ ایسا سوچنا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔ میں نے تو اپنے عظیم نانا جان (علامہؒ) کی عظمت اور بزرگی کے قدم قدم پر گن گائے ہیں اور ان کی پیاری شخصیت کو مزید نکھارنے کی سعی ہی کی ہے اور حیاتِ اقبال کے ان پوشیدہ گوشوں کو منظر عام پر لایا ہوں جو حضرت علامہؒ کی مہربان شخصیت کو مزید دلنواز بنا دیتے ہیں۔ یہ سعادت بھی الحمدللہ میرے حصے ہی میں آئی کہ سب سے پہلے ''اقبال درونِ خانہ'' میں ''بے داغ ہے مانندِ سحر اس کی جوانی'' کے تحت ان پر لگائے گئے بے بنیاد الزامات کو ان کے دامن سے چھڑانے کی بھرپور کوشش کی اور اس میں پوری طرح کامیاب رہا۔[34] مجھے امید واثق ہے کہ میری اس کامیاب کوشش کی وجہ سے یقیناً روحِ اقبال' جنت الفردوس میں شاداں اور فرحاں ہو گی کہ آخر خاندان میں سے کسی کو اس کی توفیق بھی ہوئی۔

''مظلوم اقبال'' کے مصنف نے حضرت علامہؒ کی تاریخِ ولادت پر بحث فرماتے ہوئے یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ میں نے یہ ثابت کرتے ہوئے کہ ملازمت کے حصول کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت علامہؒ کے والدین نے ان کی تاریخِ پیدائش غلط لکھوائی تا کہ حصولِ تعلیم کے بعد عمر کم رہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ مصنفِ ''اقبال درونِ خانہ'' نے اس طرح علامہ کے والدین اور خود علامہ کی بڑی اچھی تعریف کی ہے۔[35] اگر میں نے ایسا لکھا تو یقیناً اس لیے کہ عام طور پر ایسا ہو جاتا ہے اور لوگ اس طرح کرتے رہے ہیں بلکہ اب بھی کرتے ہیں۔ میرے اپنے ساتھ یہی معاملہ ہے کہ میری اصل تاریخ پیدائش 28 جون 1939ء ہے مگر جب میٹرک کا امتحان دیا اور سکول ریکارڈ سے تاریخ پیدائش حاصل کی تو وہاں 25 دسمبر 1939ء درج پائی۔ چونکہ اس وقت ممکن نہیں تھا' اس لیے سکول ریکارڈ کے حساب سے چلنا پڑا اور اب یہی تاریخ پیدائش استعمال کرنی پڑتی ہے۔ مگر یہ کسی کو معلوم نہیں کہ کس ضرورت کے تحت سکول میں داخلے کے وقت چھ ماہ کی کمی عمر میں کی گئی۔ اب اس میں میرے والدین کی نیت پر تو کوئی شک نہیں کیا جا سکتا' کیونکہ کبھی کبھی یہ کام غیر ارادی طور پر بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ میری اس چھوٹی سی بات کو تو مصنفِ ''مظلوم اقبال'' نے بہت محسوس فرمایا' مگر خود کیا کیا یعنی ''خود را فضیحت و دیگراں را نصیحت'' والا معاملہ ہے کہ خود تو اپنے بزرگوں کے ایمان پر حملہ آور ہونے میں گریز نہیں کیا اور انھیں منکرینِ ختم نبوت کے گروہ میں شامل فرما کر ان کی دنیا اور آخرت دونوں برباد کرنے کی پوری پوری سعی فرمائی......اور الزام اس ناچیز کو دیا جا رہا ہے...... ''ایں چہ بوالعجبی است......؟'' میں سمجھتا ہوں اور مجھے یہ کہنے میں کچھ باک نہیں کہ حضرت علامہؒ پر سب سے بڑا ظلم خود مصنفِ ''مظلوم اقبال'' نے روا رکھا...... اقبال اگر مظلوم ہیں تو ان کی وجہ سے۔ اگر دوسروں نے غلط بیانیاں کیں تو وہ تو غیر تھے مگر اپنوں کا ظلم تو زیادہ نا قابلِ برداشت ہوا کرتا ہے...... چنانچہ روحِ اقبال یقیناً اس ظلم عظیم پر بے طرح تڑپ رہی ہو گی اور پکار پکار کر کہہ رہی ہو

گی ''مجھے میرے چہیتوں کے ظلم سے بچاؤ!''

میری والدہ مرحومہ جن کی یادداشتوں پر ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اوّل) میں درج زیادہ تر واقعات کا انحصار ہے' کی حضرت علامہؒ کے پاس اپنے بچپن اور جوانی میں موجودگی کے لیے کسی حمایت کی ضرورت تو نہیں لیکن پھر بھی اتمامِ حجت کے طور پر میں جاوید ماموں کی تحقیق یہاں پیش کرنا چاہوں گا' جو میرے لیے باعثِ تقویت اور معترضین کے لیے یقیناً باعثِ ندامت ہے۔ ''زندہ رود'' میں ڈاکٹر جاوید اقبال اس سلسلے میں یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

> ''انارکلی والا مکان' جس میں اقبال صرف علی بخش کے ساتھ رہا کرتے تھے' 1913ء میں سیالکوٹ والے گھر کی طرح خاصا آباد ہو گیا۔ مختار بیگم اور سردار بیگم کے علاوہ' اقبال کی ایک غیر آباد بہن کریم بی بی بھی یہیں رہنے لگیں۔ نیز شیخ عطا محمد کی دو چھوٹی بیٹیوں عنایت بیگم اور وسیمہ بیگم کو سردار بیگم سیالکوٹ سے اپنے ساتھ لے آئیں۔ گھر میں چہل پہل ہو گئی۔ سب کے سب خوشی و مسرت سے دن گزارنے لگے۔ اقبال شام کو کاموں سے فراغت کے بعد اپنی بہن اور بیویوں کے ساتھ عموماً تاش یا لڈو کھیلتے' اپنی بھتیجیوں کے ساتھ ہنسی مذاق کی باتیں کرتے یا کوٹھے پر چڑھ کر کبوتر اُڑاتے' بیویوں اور بہن کے اصرار پر اقبال نے اپنی پہلی بیوی کو بھی بلوا لیا۔ سو کریم بی بی (علامہ صاحب کی پہلی بیوی) ایک آدھ بار انارکلی والے مکان میں آکر سب کے ساتھ رہیں' مگر صرف چند دنوں کے لیے۔ مردانے میں پہلے کی طرح اقبال کے احباب کی محفلیں لگتیں۔ گرامی آجاتے تو کئی کئی دن قیام کرتے۔ گرمیوں کی تعطیلات میں سب سیالکوٹ چلے جاتے اور وہاں رونق لگتی۔''[36]

یہ 1913ء کی آخری سہ ماہی کا ذکر ہونا چاہیے' کیونکہ سردار چچی جان (والدۂ جاوید) کی رخصتی اگست یا ستمبر 1913ء[37] میں ہوئی۔ میری والدہ ماجدہ کی پیدائش فروری 1912ء کی ہے یعنی وہ ابھی دو برس سے بھی کم عمر تھیں کہ ان کی سردار چچی ان کو اپنے ساتھ لاہور لے گئیں اور یوں وہ 1913ء سے 1934ء تک یعنی اپنی شادی تک' اپنے چچا جان کی ''درونِ خانہ زندگی'' کی عینی شاہد بنیں۔ چنانچہ ''اقبال درونِ خانہ'' میں مندرج حضرت علامہؒ کی گھریلو زندگی کی وہ سرگرمیاں ہی پیش کرنے کی کوشش کی گئی' جن میں میری والدہ محترمہ وسیمہ بیگم کی شمولیت یقینی رہی۔ مصنفِ ''مظلوم اقبال'' اگر ان پر اعتراض فرما رہے ہیں تو ان سے دریافت کیا جانا چاہیے کہ آپ جب وہاں موجود ہی نہیں تھے تو پھر آپ

کس بنیاد پران باتوں اور واقعات میں خود کو خواہ مخواہ منصف بنا رہے ہیں۔ ہر وقت گھر میں موجود فرد گھر میں لحہ بہ لحہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات کو زیادہ بہتر اور تفصیل سے جان سکتا ہے یا وہ شخص جو یا تو سیالکوٹ میں رہا اور جب لاہور میں پڑھتا بھی رہا تو ''ریواز ہاسٹل'' میں مقیم رہا۔[38]

''زندہ رود'' میں ایک دوسری جگہ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''انار کلی والے مکان یا میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں اقبال کی دو بھتیجیاں (عنایت بیگم اور وسیمہ بیگم) بھی ان کے ساتھ رہتی تھیں، جو یہیں جوان ہوئیں۔''[39]

ایک اور مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

''گھر بھر کا کھانا سردار بیگم پکاتیں اور ان کی مدد اقبال کی بھتیجیاں یا ایک ملازمہ کرتی تھیں۔''[40]

میکلوڈ روڈ والی رہائش گاہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''کوٹھی کی پشت پر مصلیوں (نو مسلم) کا محلہ تھا جن کی لڑکیاں سردار بیگم سے قرآن مجید پڑھنے آتیں، اقبال کی بھتیجیوں عنایت بیگم اور وسیمہ بیگم سے معمولی اردو پڑھنا لکھنا یا سینا پرونا سیکھتیں اور گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹاتیں۔''[41]

اسی طرح ایک جگہ اپنی میعادی بخار کی وجہ سے طویل علالت کے متعلق یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

''جب راقم (جاوید اقبال) صحت یاب ہو کر بستر سے اٹھا تو بسبب کمزوری اس سے چلا نہ جاتا تھا۔ سردار بیگم اور تایا زاد بہن وسیمہ بیگم، جو دونوں یہیں مقیم تھیں، کا سہارا لے کر چلتا تھا۔ تب راقم کی عمر تقریباً ساڑھے سات برس اور منیرہ بیگم کی عمر تقریباً ڈیڑھ برس تھی۔''[42]

میری والدہ محترمہ وسیمہ بیگم کا کئی دوسرے واقعات میں ذکر کرنے کے بعد جاوید ماموں نے ان کے متعلق اپنی جو آخری یادداشت دہرائی ہے، وہ کچھ اس طرح سے ہے:

''وسیمہ بیگم بھی شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ سیالکوٹ میں رہنے لگیں۔''[43]

مندرجہ بالا اقتباسات کو یہاں پیش کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میری والدہ واقعتاً 1913ء سے 1934ء تک لاہور میں اپنے عم محترم کے زیر سایہ پروان چڑھیں، گو میرے خیال میں اس کے لیے جناب جاوید اقبال کی کسی قسم کی تائید کی ضرورت تو نہ تھی کیونکہ میری والدہ، جاوید ماموں سے تقریباً بارہ برس بڑی تھیں اور جاوید کو انھوں نے گودوں کھلایا تھا مگر پھر بھی خواہ مخواہ کے اعتراض کرنے والوں کے لیے شاید یہ ایک تازیانۂ عبرت ثابت ہو۔ میری والدہ مرحومہ کی روایت کردہ باتوں اور

واقعات کے لیے کسی کی کسی قسم کی منظوری وغیرہ کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ اگر کوئی صاحب بزعم خود خاندانِ اقبال کے ''گاڈ فادر'' بننے کی سعی لاحاصل فرماتے رہے ہیں تو یہ ان کا انفرادی فعل ہے۔ ہمیں ان کی کسی قسم کی کسی تائید یا حمایت کی ضرورت تھی اور نہ ہے...... میری والدہ محترمہ یا میرے والد محترم نے جو کچھ اپنی یادداشتوں سے بیان فرمایا' وہ اس کی صحت کے خود ذمہ دار ہیں۔ کسی دوسرے کو اس سلسلے میں خواہ مخواہ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انھوں نے جو کچھ بیان کیا' بقائمی ہوش وحواس اور ہر طرح سمجھ سوچ کر کیا۔

اب آیئے ایک نگاہ اس طرف بھی ڈالی جائے کہ ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اوّل) میں میری والدہ مرحومہ کے بیان کردہ واقعات کو مصنفِ ''مظلوم اقبال'' نے جو ''جھوٹ کا پلندہ'' اور ''الف لیلوی کہانیوں'' سے تشبیہ دینے کی کوشش فرمائی ہے' اس میں کس قدر صداقت ہے۔ میرے خیال میں اس طرح خود ان کا اپنا پول کھل گیا ہے کہ وہ جو یہ دعویٰ کرتے نہیں تھکتے کہ حضرت علامہ اقبالؒ کے متعلق ان کی معلومات سب سے زیادہ مبنی بر صداقت ہیں اور ان کی چھوٹی ہمشیرہ غلط بیانیوں سے کام لے رہی ہیں۔ اگر اس کے جواب میں میری والدہ بھی ان پر یہی الزام لگاتیں کہ سب کچھ انھوں نے اپنے دل سے گھڑا ہے تو ان کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ وہ بالکل درست فرما رہے ہیں...... ان کی تو بنیاد ہی جھوٹ پر ہے' اس لیے ان سے کسی سچ کی توقع عبث ہے۔ اسی لیے تو انھوں نے دل کھول کر اور جی بھر کر دروغ گوئی فرمائی ہے اور اس طرح کے بے بنیاد الزامات لگائے ہیں کہ الامان والحفیظ...... انھیں ذرا بھی خیال نہیں آیا کہ ان کے عم محترم کا کیا مقام ہے اور وہ کس طرح ان کی شخصیت کو داغدار کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ میری والدہ مرحومہ کو دروغ گوئی سے آخر کیا فائدہ تھا...... مگر یہ تو اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں کہ اس طرح اپنے ''پیر صاحب'' کا بدلہ عم محترم سے دل کھول کر لے رہے ہیں۔

اسی طرح میرے والد محترم کے متعلق ان کا جو رویہ رہا تو اس کی بھی کچھ ناگفتنی وجوہات تھیں۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ میرے والد مرحوم نے ان کی طرف سے بیعت کی پیشکش کو ٹھکرا دیا تھا۔ تفصیل اس کی کچھ یوں ہے کہ جب میرے والد محترم اپنے خاندانی کاروبار کو ناگزیر وجوہات کی بنا پر خیر باد کہہ کر اپنا گھر بھی چھوڑ آئے تو انھوں نے ملازمت کے حصول کے لیے سب سے پہلے مصنفِ ''مظلوم اقبال'' سے ہی رابطہ کیا۔ چنانچہ انھیں دلی آنے کے لیے کہا گیا کیونکہ موصوف اُن دنوں وہیں مقیم تھے۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر انھیں صرف ایک شرط پورا کرنے کا کہا گیا جس کے بعد ہر قسم کی مدد کا وعدہ کیا گیا اور وہ شرط کیا تھی...... ایمان کی نیلامی...... یعنی منکرینِ ختم نبوت کے گروہ میں شمولیت......
میرے والد محترم جو بچپن سے ہی ''صوفی صاحب'' کے لقب سے پہچانے جاتے تھے' ایک انتہائی کٹر قسم

کے سنی مسلمان، عاشقِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور فنافی اللہ کے لیے یہ شرط تو دشنام کے مترادف تھی، چنانچہ وہ اسی وقت واپس چلے آئے۔ شیخ صاحب کو اس ''گستاخی'' کی وجہ سے بے حد غصہ اور رنج ہوا۔ چنانچہ ساری عمر انھوں نے سگے بہنوئی سے دل پر خاش رکھی اور کبھی بھی کسی کام نہ آئے، بلکہ جب میرے والدِ محترم نے اللہ کے فضل سے خود ہی ملازمت تلاش کر لی تو اس میں بھی روڑے اٹکانے سے باز نہیں آئے کیونکہ میرے والدِ محترم نے جو ملازمت پیراشوٹ فیکٹری میں حاصل کی تھی، ان دنوں جنگ عظیم دوم کا زمانہ تھا اور یہاں سیالکوٹ میں ایک بہت بڑی پیراشوٹ فیکٹری کام کر رہی تھی، وہاں ان کے آفیسر انچارج نہ صرف شیخ صاحب کے دوست بلکہ ہم مذہب بھی تھے۔ دونوں ذاتِ شریف کی اس دوران ملاقات ہوئی تو انچارج صاحب نے شیخ صاحب کو اپنی طرف سے اچھی خبر دیتے ہوئے ان کے بہنوئی کی بڑی تعریف کی اور بتایا کہ عنقریب صوفی صاحب کی بڑی اچھی سی ترقی ہونے والی ہے۔ ان کے سینے پر تو سانپ لوٹ گیا کہ جو شخص ان کی پیشکش کو ٹھکرا آیا تھا، وہ یہاں ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ چنانچہ اپنے پیر بھائی کو صورتِ حال سمجھا کر ان کو بھی وہی شرط عائد کرنے کا مشورہ دیا کہ پہلے منکرینِ ختمِ نبوت کے گروہ میں شامل ہوں تو پھر ترقی ملے گی۔ مگر ایک دفعہ آزما لینے کے باوجود شاید شیخ صاحب ابھی تک یہ امید لگائے ہوئے تھے کہ وہ صوفی صاحب کو دنیا کی جھلک دکھا کر رام کر لیں گے۔ مگر یہ ان کی بھول تھی۔ میرے والدِ محترم تو ایک صوفی منش انسان تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی دنیا کو دین پر فوقیت نہیں دی اور نہ کبھی اصولوں پر سمجھوتا کیا...... اسی بنا پر تو وہ اپنے گھر سے بے گھر ہوئے اور کروڑوں کی جائیداد اور وسیع کاروبار کو جوتے کی نوک سے ٹھوکر مار دی...... بے چارے شیخ صاحب کی کیا حیثیت تھی کہ چند ٹکوں کے لیے انھیں بہکانا چاہ رہے تھے...... دنیا کے ایک معمولی سے فائدے کے عوض ان کے ایمان کا سودا کرنا چاہتے تھے...... اس عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مرتدین میں شامل کرنا چاہتے تھے...... ان کی یہ مجال، یہ جرأت؟ چنانچہ جب میرے والدِ محترم کو ان کے آفیسر انچارج نے وہ شرط سنائی کہ اگر ترقی چاہیے تو ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں، تو صوفی صاحب بتایا کرتے تھے کہ...... ''میرا پارہ ساتویں آسمان کی خبر لانے لگا اور میں نے ان صاحب کو صاف صاف بتا دیا کہ آپ کیا سمجھتے ہیں، اس معمولی سی دنیاوی ترقی کے لیے میں اپنا ایمان بیچ دوں گا اور اس ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خلاف آپ لوگوں کا ہمنوا بن جاؤں گا جس کی خوشنودی کے لیے یہ معمولی سی ترقی کیا چیز ہے، میں تو اپنی پوری دنیا قربان کر دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہوں۔'' صوفی صاحب کہتے ہیں کہ ''میں نے انھیں صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کس کے اشارے پر یہ سب کر رہے ہیں۔ میرا پیغام ان کو دے دیجیے کہ صوفی نظیر احمد اس قدر ارزاں اور راستے میں گری پڑی کسی چیز کا نام

نہیں کہ جس کا جی چاہے اٹھا کر جیب میں رکھ لے۔'' چنانچہ اس کا اثر معکوس ہوا' ترقی کی بجائے تنزلی ملی مگر صوفی صاحب کی پیشانی پر بل نہیں پڑا۔ اس دوسری شکست کے بعد شیخ صاحب تمام زندگی مارگزیدہ کی طرح تڑپتے رہے اور اپنے بہنوئی سے ہمیشہ خدا واسطے کا بیر رکھا اور جناب صوفی صاحب ہمیشہ ان کے لیے مندرجہ ذیل شعرِ اقبالؒ کی زندہ تفسیر بنے رہے

تبرک ہے مرا پیراہن چاک
نہیں اہلِ جنوں کا یہ زمانہ!

(بالِ جبریل)

اب رہی یہ بات کہ بقول شیخ اعجاز احمد صاحب ''اقبال درونِ خانہ'' (حصہ اوّل) جھوٹ کا پلندہ ہے یا نہیں؟ میرے خیال میں اس سے پیشتر کہ اس پر اظہار خیال کیا جائے بہتر ہوگا اگر ''مظلوم اقبال'' میں شیخ صاحب کی دو ایک عظیم غلط بیانیوں کا پول کھول دیا جائے تو نہ صرف مناسب رہے گا بلکہ اصلیت کو بے نقاب کرنے میں ممد و معاون بھی ثابت ہوگا اور اس ملمع کو اتارنے اور تصنع کے اس پردہ کو سرکانے میں بھی کامیابی ہوگی جس کی آڑ میں یہ تمام مذموم کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

گزشتہ صفحات میں ایسی کئی ایک دروغ گوئیوں کی نشان دہی کی گئی ہے جن میں خاص طور پر وہ واقعہ جو پھوپھی کریم بی بی مرحومہ سے متعلق ہے' جس میں بڑے غیر محسوس انداز میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اپنی دوسری باتوں کو درست ثابت کرنے کے لیے انھوں نے پھوپھی جی کو 1964ء میں دوبارہ زندہ کر دیا اور ایسا واقعہ ان سے منسوب کر دیا جو اس لیے ممکن نہیں ہے کیونکہ پھوپھی کریم بی بی صاحبہ 1958ء میں انتقال فرما چکی تھیں۔ وہ واقعہ کچھ یوں ہے:

> ''میاں جی کی اس خصوصیت کا ذکر میرے حوالے سے روزگارِ فقیر حصہ دوئم جو 1964ء میں شائع ہوا' میں بھی کیا ہے۔ ہماری پھوپھی کریم بی بی نے روزگارِ فقیر میں یہ ذکر پڑھا تو ایک دن مجھے بتلایا۔''44

گو مندرجہ بالا واقعہ بالکل بے ضرر سا ہے اور اپنے اندر شاید کوئی ایسی بات پوشیدہ نہیں رکھتا' جس کی بنا پر اسے اس قدر اہمیت دی جاتی کہ اس کا تذکرہ خصوصی طور پر کیا جاتا مگر اس میں جو اصل خواہش پوشیدہ ہے' وہ یہ ہے کہ اپنی دوسری باتوں اور واقعات کو درست ثابت کرنے کے لیے بنیاد فراہم کی جائے۔ اس میں غلطی صرف اتنی ہوئی ہے کہ وقت کے حساب کا دامن تھوڑا سا پھسل گیا اور 1958ء میں فوت شدہ پھوپھی کریم بی بی صاحبہ 1964ء میں ''روزگارِ فقیر'' حصہ دوئم میں شامل واقعات پڑھ کر ان پر مہر تصدیق ثبت فرما رہی ہیں۔ اس قسم کے کئی ایک واقعات کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان کو دوہرانا مناسب

نہ ہوگا' البتہ اب جس دروغ گوئی کا ذکر کیا جا رہا ہے' وہ انتہائی درجہ کی ضرر رساں سازش کا حصہ ہے۔ اس کے پس منظر کو کھنگالنے کی شاید ضرورت نہ پڑے' کیونکہ سب کچھ پیش منظر میں ہی واضح ہے اور انتہائی دیدہ دلیری اور ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ کو اس صفائی سے پیش کیا گیا ہے کہ عام آدمی اس کو حرف بحرف سچ سمجھ لینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا کیونکہ حضرت علامہؒ کا اپنا خون اس کا راوی ہے۔ انھوں نے علامہ صاحب کو چیلنج کیا کہ ان (علامہ صاحب) کی معلومات بالکل سطحی تھیں اور وہ اپنی عقل استعمال فرمانے کی بجائے دوسروں کے بہکاوے میں آسانی سے آ جایا کرتے تھے اور قادیانیت کے خلاف جو کچھ بھی انھوں نے لکھا یا کہا' اس میں ان کے اپنے مطالعہ یا علم کا کوئی دخل نہیں تھا بلکہ یہ سب کچھ دوسروں نے ان کے کان میں ڈالا اور انھوں نے بغیر سوچے سمجھے دوسروں کے بہکاوے میں آ کر خواہ مخواہ بے چارے قادیانیوں پر چڑھائی کر دی۔ ''مظلوم اقبال'' کا یہ اقتباس قدرے طویل ہے مگر اس کو پورا دیکھنا اشد ضروری ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ''احمدیت کے خلاف محاذ آرائی کے دنوں میں اخبار کے ایک نمائندے نے ان (علامہ صاحب) کی 1910ء والی علی گڑھ کی تقریر کے حوالے سے ان سے دریافت کیا کہ آپ تو اس فرقہ (قادیانی فرقہ) کو 'اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ' سمجھتے تھے۔ علامہ نے جواب میں اعتراف کیا کہ 25 سال پہلے انھیں اس تحریک سے اچھے نتائج برآمد ہونے کی امیدیں تھیں' لیکن انھیں اس وقت شکوک پیدا ہوئے جب بانی اسلام کی نبوت سے برتر ایک نئی نبوت کا دعویٰ کیا گیا۔ بانی سلسلہ احمدیہ نے کبھی حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت سے برتر نبوت کا دعویٰ نہیں کیا' نہ کوئی احمدی بانی سلسلہ احمدیہ کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے برتر یقین کرتا ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن کریم میں خاتم النبیین کہا گیا ہے اور انھیں خاتم النبیین تسلیم کرنا ہر احمدی کا جزوِ ایمان ہے۔ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت سے برتر نبوت کے دعوے کی تہمت احراریوں اور علامہ کے حاشیہ نشینوں نے ان کے عشقِ رسول کو **Exploit** کرتے ہوئے ان کو احمدیت کے خلاف بھڑکانے کے لیے تراشی اور علامہ نے اسے درست باور کر لیا۔ اپنی خداداد عقل و دانش کے ساتھ ساتھ علامہ میں ایک ذرا بچوں والی معصومیت اور بھولپن بھی تھا۔ ان معنوں میں کہ وہ سنی سنائی باتوں کا بغیر تحقیق یقین کر لیتے۔ اس کی ایک

مثال جس نے انھیں ایک بڑی مشکل سے دوچار کیا' مولانا سالک کے ''ذکرِ اقبال'' میں بیان کی گئی ہے۔

1922ء میں کسی حاشیہ نشین نے گپ ہانکی کہ روس کی سلطنت کا صدر اب ایک مسلمان محمد ستالین نام مقرر ہوا ہے۔ علامہ نے باور کر لیا اور بڑے شوق سے یہ ''خبر'' اپنے بڑے بھائی کو خط میں لکھی۔ 1926ء میں کسی ملنے والے سے سنا کہ البانیہ میں مسلمانوں نے نماز سے پہلے وضو کرنا غیر ضروری قرار دے دیا ہے۔ دوسرے نے ترکی میں نماز میں تبدیلیوں کی خبر سنائی۔ تیسرے نے کہا مصر میں بھی ایسی ہی تحریک جاری ہے۔ علامہ ان خبروں سے دل گرفتہ ہوئے اور بڑے افسوس سے سیّد سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں ان کا ذکر کیا۔ انھوں نے جواباً اطمینان دلایا کہ خبریں غلط اور بے اصل ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اسی طرح کسی عقیدت مند حاشیہ نشین نے احمدیت سے اپنے عناد کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہہ دیا ہوگا کہ احمدی بانی سلسلہ احمدیہ کو (نعوذ باللہ' نعوذ باللہ) رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے Superior (برتر) مانتے ہیں۔ علامہ نے اس افترا کو سچ سمجھ لیا حالانکہ اس کی تحقیق کچھ مشکل نہ تھی اور تحقیق کے لیے گھر سے باہر جانے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ اس طرح ایک معتقد نے جو آخری ایام میں ان کے بہت قریب تھے' غلط قصہ گھڑا کہ ''جماعتِ احمدیہ میں ہر کوئی شامل ہوسکتا ہے خواہ اس کے عقائد کچھ بھی ہوں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ احمدیوں کے خلیفہ کی بیعت کر لے۔'' غرضیکہ ان دنوں احمدیت کے خلاف ایسی ایسی بے بنیاد اور بے سروپا باتیں ان کے حضور بیان کی جاتیں اور باور کر لی جاتیں۔ اس کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہا جائے ؎

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا'' 45

اتنا طویل اقتباس پیش کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ جس دیدہ دلیری اور چابکدستی سے مرزا غلام احمد قادیانی کا دفاع کیا گیا ہے' وہ کھل کر سامنے آ جائے۔ یعنی جو حقیقت ساری دنیا کے سامنے موجود ہے' وہ اس کو غلط ثابت کرنے پر کمر بستہ ہیں اور لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی سعی لاحاصل فرما رہے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی تحریروں اور

بیانات میں اس سلسلے میں کیا کچھ نہیں کہا...... ہر بات لوگوں کے علم میں ہے اور اس سلسلے میں بے شمار طویل بحثیں اور مناظرے برپا ہو چکے ہیں لیکن شاید ان کا خیال ہے کہ لوگ ان باتوں کو فراموش کر چکے ہیں اور موجودہ نسل اس سے واقفیت نہیں رکھتی یا شاید یہ سمجھ رہے ہیں کہ اب متذکرہ تحریریں اور بیانات لوگوں کی دسترس میں نہیں رہے تو یہاں ایک بار پھر ان کے چند اقتباسات پیش کر دیے جاتے ہیں تا کہ یہ غلط فہمی دور ہو جائے کہ مسلمانوں کے حافظے اس قدر کمزور نہیں' جتنا ان کا خیال ہے۔

سب سے پہلے مرزا غلام احمد قادیانی اپنی کتاب ''تذکرہ'' (طبع چہارم) کے صفحہ 643 پر خود کو تمام انبیائے کرام بشمول آنحضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اعلیٰ وارفع ثابت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''آسمان سے کئی تخت اتارے گئے مگر تیرا تخت سب سے اونچا بچھایا گیا۔''46

اسی طرح ''اعجازِ احمدی'' کے صفحہ 71 پر اپنے آپ کو ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے افضل نبی'' قرار دیا۔47

'ایک غلطی کا ازالہ' میں یہاں تک کہہ دیا کہ:

''ایک بروزِ محمدی جمیع کمالاتِ محمدی کے ساتھ آخری زمانے کے لیے مقدر تھا سو وہ ظاہر ہو گیا۔ اب بجز اس کھڑکی کے اور کوئی کھڑکی نبوت کے چشمے سے پانی لینے کے لیے باقی نہیں۔''48

مرزا غلام احمد قادیانی کے اس بنیادی نکتہ کی تشریح ان کے صاحبزادے اور خلیفہ ثانی میاں محمود نے مختلف مقامات پر کی ہے۔ مثلاً ختم نبوت کے متعلق لکھتے ہیں:

''انھوں نے سمجھ لیا کہ خدا کے خزانے ختم ہو گئے......ان کا یہ سمجھنا خدا تعالیٰ کی قدر کو ہی نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے۔ ورنہ ایک نبی کیا' میں تو کہتا ہوں' ہزاروں نبی ہوں گے۔'' (انوارِ خلافت صفحہ 26)49

ایک دفعہ کسی نے سوال کیا کہ جب آئندہ بھی نبیوں کا آنا ممکن ہے تو پھر آپ مرزا غلام احمد کو آخری زمانے کا نبی کس طرح کہتے ہیں؟ جواب دیا:

''آخری زمانے کا نبی اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے توسط کے بغیر کسی کو نبوت کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اب کوئی نبی ایسا نہیں آ سکتا جو یہ کہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے براہِ راست تعلق پیدا کر کے نبی بن سکا۔ حضرت مسیح موعودؑ فرماتے ہیں۔ میری اتباع کے بغیر کسی کو قربِ الٰہی حاصل

نہیں ہوسکتا۔ پس آئندہ خواہ کوئی نبی ہو اس کے لیے حضرت مسیح موعودؑ پر ایمان لانا ضروری ہے۔" (الفضل' قادیان' مورخہ 2 مئی 1933ء)[50]

ایک دوسرے مقام پر اس کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جب کوئی نبی آ جائے تو پہلے نبی کا علم بھی اس کے ذریعے سے ملتا ہے۔ یوں اپنے طور پر نہیں مل سکتا اور بعد میں آنے والا نبی پہلے نبی کے لیے بمنزلہ سوراخ ہوتا ہے۔ پہلے نبی کے آگے دیوار کھینچ دی جاتی ہے اور کچھ نظر نہیں آتا سوائے آنے والے نبی کے ذریعے دیکھنے کے۔ یہی وجہ ہے کہ اب کوئی قرآن نہیں' سوائے اس قرآن کے جو حضرت مسیح موعود نے پیش کیا اور کوئی حدیث نہیں سوائے اس حدیث کے جو حضرت مسیح موعود کی روشنی میں پیش آئے اور کوئی نبی نہیں سوائے اس کے جو حضرت مسیح موعود کی روشنی میں دکھائی دے۔ اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود اس ذریعے سے نظر آئے گا کہ حضرت مسیح موعود کی روشنی میں دیکھا جائے۔ اگر کوئی چاہے کہ آپ سے علیحدہ ہو کر کچھ دیکھ سکے تو اسے کچھ نظر نہیں آئے گا۔ ایسی صورت میں اگر کوئی قرآن کو بھی دیکھے گا تو وہ اس کے لیے یھدی من یشاء والا قرآن نہیں یضل من یشاء والا قرآن ہوگا۔"

(خطبہ جمعہ میاں محمود احمد مندرجہ الفضل' بابت 15 جولائی 1924ء)[51]

اس کے علاوہ مرزا غلام احمد قادیانی نے جبریل امین کے ذریعہ نزول وحی کا دعویٰ کیا ہے:

"ظاہر ہے کہ اگرچہ صرف ایک ہی دفعہ کا نزول فرض کرلیا جائے اور صرف ایک ہی فقرہ حضرت جبریل لائیں اور پھر چپ ہو جائیں تو یہ امر بھی ختم نبوت کا منافی ہے کیونکہ جب ختمیت کی مہر ہی ٹوٹ گئی اور وحی رسالت نازل ہونی شروع ہوگئی تو پھر تھوڑا یا بہت نازل ہونا برابر ہے۔" (ازالہ اوہام۔ صفحہ 577)[52]

مرزا غلام احمد قادیانی ہی نہیں بلکہ ان کے صاحبزادے میاں محمود احمد بھی برملا ان کی برتری (Superiority) کا اظہار اور اعلان کررہے ہیں' مگر شیخ اعجاز احمد صاحب پھر بھی اس پر مُصر ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو کبھی کسی قادیانی نے ارفع و اعلیٰ نہیں سمجھا بلکہ ہمارا ایمان تو ختم نبوت پر پکا ہے اور حضرت علامہؒ نے کسی کے بہکاوے میں آ کر بلا تحقیق قادیانی جماعت اور اس کے بانی کو موردِ الزام ٹھہرا دیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا مندرجہ بالا تمام دعاوی جو مرزا غلام احمد قادیانی وقتاً فوقتاً فرماتے رہے' علامہؒ

کے علم میں نہیں تھے؟ کیا وہ کتابیں جن میں یہ تمام دعاوی اور ان کی تفصیل درج ہوئی ہے' حضرت علامہؒ کی نظر سے کبھی نہیں گزریں؟ جب آج یہ سب دستیاب ہیں اور ہر کس و ناکس ان کے حوالہ جات کے ساتھ بات کرتا ہے تو کیا اس وقت علامہ صاحب نے ان کا مطالعہ نہیں کیا ہوگا اور قادیانیت کے خلاف ایسے ہی آنکھیں بند کر کے سب کچھ ضبطِ تحریر میں لے آئے ہوں گے کہ ان کو ان کے حاشیہ نشینوں نے جو بتا دیا' انھوں نے اس پر آمنا و صدقنا کہہ دیا ہوگا۔ جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے کیونکہ حضرت علامہؒ کے وہ تمام بیانات' مضامین اور اشعار جو رد قادیانیت کے سلسلے میں ان سے منسوب ہیں' کو اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو ان میں شامل دلائل حیران کن ہیں۔ حضرت علامہؒ نے اس قدر مدلل باتیں کی ہیں کہ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود ان کے دلائل کا کوئی جواب آج تک کسی سے ممکن نہیں ہو سکا۔ علاوہ ازیں ان کے مندرجہ ذیل شعر۔

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نورِ شمع عرفاں کردۂ

نے اس الجھاؤ کو جو قادیانیت (احمدیت) نے پیدا کر دیا تھا اور جس کے باعث تمام مسلمانوں کے ذہن مضطرب تھے' ہر طرح اس کی مکمل تردید کر دی۔ ورنہ کسی بھی مفہوم میں ختم نبوت کے عقیدے کو تسلیم نہ کرنا حضرت علامہ اقبالؒ کے نزدیک شرک فی النبوت کیوں قرار پاتا؟

''زندہ رود'' میں جناب ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے بھی بڑے مدلل انداز میں شیخ اعجاز صاحب کی جانب سے اپنے عم محترم (علامہ صاحب) پر لگائے گئے بے سر و پا الزامات جو انھوں (شیخ اعجاز) نے ایک ''نوٹ'' 53 کی صورت میں انھیں (جاوید اقبال کو) بھجوائے تھے' جواب دیا ہے۔ ان الزامات میں اوّل تو یہ کہ قادیانیوں کے خلاف تحریک میں شدت احراریوں نے علامہ اقبالؒ کے ساتھ مل کر ایک سازش کے تحت کی اور مرزا بشیر الدین محمود کو اس سازش کے تحت کشمیر کمیٹی کی صدارت سے علیحدہ کروا دیا۔ 54 اس کے علاوہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی نبوت سے برتر نبوت کے دعویٰ کی تہمت' احراریوں اور علامہ اقبالؒ کے حاشیہ نشینوں نے انھیں احمدیت کے خلاف بھڑکانے کے لیے تراشی 55 اس ضمن میں ڈاکٹر جاوید اقبال حضرت علامہؒ کا مکمل بیان درج کر رہے ہیں۔ کیونکہ شیخ اعجاز جان بوجھ کر اس بیان کا اصل حصہ حذف کر گئے ہیں۔ ''زندہ رود'' کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اس کے بعد شیخ اعجاز احمد فرماتے ہیں کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی نبوت سے برتر نبوت کے دعوے کی تہمت احراریوں اور اقبال کے حاشیہ نشینوں نے انھیں احمدیت کے خلاف بھڑکانے کے لیے تراشی تھی' لیکن افسوس

ہے شیخ اعجاز احمد نے اس ضمن میں اقبال کا پورا فقرہ درج نہیں کیا۔"

اقبال فرماتے ہیں:

"ذاتی طور پر مجھے اس تحریک کے متعلق اس وقت شبہات پیدا ہوئے جب ایک نئی نبوت' جو بانی اسلام کی نبوت سے بھی برتر تھی' کا دعویٰ کیا گیا اور تمام عالم اسلام کے کافر ہونے کا اعلان کیا گیا۔ بعدازاں میرے شبہات نے اس وقت مکمل بغاوت کی صورت اختیار کر لی جب میں نے اپنے کانوں سے اس تحریک کے ایک رکن کو پیغمبر اسلام کے بارے میں نہایت نازیبا زبان استعمال کرتے ہوئے سنا۔"56

ڈاکٹر جاوید اقبال اسی سلسلے میں مزید تحریر فرماتے ہیں:

"پس یہ محض احراریوں یا حاشیہ نشینوں کے بھڑکانے کا نتیجہ نہیں تھا' اقبال کے اپنے کان بھی تھے جنھیں وہ سننے کے لیے استعمال میں لاتے تھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ممکن ہے' بقول شیخ اعجاز احمد' بانی سلسلہ احمدیہ نے کبھی حضور رسالت مآبؐ کی نبوت سے برتر ہونے کا دعویٰ نہ کیا ہو اور نہ کوئی احمدی بانی سلسلہ احمدیہ کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے برتر یقین کرتا ہو' مگر کسی بھی مفہوم میں ختم نبوت کے عقیدے کو تسلیم نہ کرنے میں یہی تو قباحت ہے کہ یوں بعد کی نئی نبوت کی برتری کے اظہار کی طرح ڈالی جا سکتی ہے یا ایسے منفی اندازِ فکر کے لیے دروازہ کھل جانے کا امکان ہے۔ عین ممکن ہے کہ شیخ اعجاز احمد یا دیگر احمدیوں کا عقیدہ وہی ہو جو انھوں نے بیان کیا ہے' لیکن جس بدبخت کی باتوں کو اقبال نے اپنے کانوں سے سنا' وہ بھی تو اپنے آپ کو تحریکِ احمدیہ کا رکن ہی سمجھتا تھا۔"57

جاوید اقبال صاحب' شیخ اعجاز احمد کے ان بے بنیاد الزامات کے جواب میں مزید دلائل پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہوتے ہیں:

"شیخ اعجاز احمد کا خیال ہے کہ اقبال اپنی خداداد عقل و دانش کے ساتھ ساتھ بچوں کی طرح معصوم اور بھولے بھالے تھے۔ سنی سنائی بات کا بغیر تحقیق کیے یقین کر لیتے۔ اس ضمن میں انھوں نے اقبال کے بھولپن کی تین مثالیں پیش کی ہیں۔ جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ تحریک احمدیہ کے عقائد

کے متعلق بھی انھوں نے سنی سنائی باتوں کا بغیر تحقیق کیے یقین کر لیا تھا۔ راقم (جاوید اقبال) کی رائے میں ایک ایسا شخص جو ہندو رہنماؤں یا انگریز حکمرانوں کی سیاسی چالوں کو پوری طرح سمجھتا ہو، جس کی بیخ بستہ منطق نے واضح کیا ہو کہ مسلمانوں کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ علیحدہ نیابت کے مطالبے کو کسی قیمت پر بھی نہ چھوڑیں، جو ایک تجربہ کار وکیل کی حیثیت سے انفرادی یا اجتماعی لین دین کے معاملات میں اپنی فلسفہ دانی یا شاعرانہ تخیل کے باوجود عملی اور کاروباری قسم کا آدمی ہو، اس سے ایسی معصومیت یا بھولپن کی توقع رکھنا یا یہ سمجھنا کہ اس نے سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے احمدیت کے خلاف بلاوجہ شور مچا دیا، قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ اعجاز احمد، اقبال کے تمام سوانح حیات میں غالباً یہی تین مثالیں ان کے بھولپن کی پیش کر سکتے تھے۔ مگر راقم (جاوید اقبال) کے نزدیک یہ مثالیں، اقبال کے بھولپن کو ثابت کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔ مثلاً سردار بیگم (والدۂ جاوید اقبال) کے ساتھ نکاح کے بعد بعض گمنام خطوں پر ان کا یقین کر لینا اور پھر اپنی غلطی پر پشیمان ہونا، ان کا بھولپن ظاہر نہیں کرتا بلکہ ذہنی اضطراب یا بے چینی کی کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ ان کی پہلی شادی ناکام رہی تھی اور وہ دوسری بار ضرورت سے زیادہ محتاط ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر یہ کہنا کہ کسی کی گپ پر اعتبار کرتے ہوئے انھوں نے یقین کر لیا کہ روس کا نیا صدر محمد استالین مسلمان ہے۔ اس سلسلہ میں بتا دینا ضروری ہے کہ وسط ایشیا کے مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لیے یا انھیں اپنا مطیع رکھنے کی خاطر شروع میں روسی کیمونسٹوں نے اسی قسم کا پراپیگنڈہ کیا تھا اور عین ممکن ہے کہ یہ پراپیگنڈہ سرحدیں عبور کر کے برصغیر میں بھی پہنچا ہو۔ اقبال نے غالباً اسی پراپیگنڈہ سے متاثر ہو کر اپنے بڑے بھائی کو یہ خوشخبری سنائی، لیکن بعد میں تحقیق پر یہ خبر غلط ثابت ہوئی۔ اسی طرح اس زمانے میں مغربی پریس دنیائے اسلام میں اس قسم کی غلط خبروں کی تشہیر بطور پالیسی کیا کرتا تھا کہ کسی ملک کے مسلمانوں نے نماز سے پہلے وضو اُڑا دیا یا کسی مسلم ملک میں نماز میں تبدیلیاں کر دی گئیں یا ایسی تحریک دیگر ممالک میں بھی جاری ہے۔ اس پراپیگنڈہ کا مقصد دنیائے اسلام کے حصے بخرے کرنا یا اس میں انتشار پھیلانا تھا اور اس قسم کا طرزِ عمل آج بھی

یہود نواز مغربی پریس اختیار کر لیتا ہے۔ اس اعتبار سے ایسی خبروں سے اقبال کا دل گرفتہ ہونا ان کا بھولپن یا معصومیت کا ثبوت فراہم نہیں کرتا' بلکہ ملت اسلامیہ کے متعلق ان کی فکر مندی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کشمیر کمیٹی میں اقبال اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر احمدیوں سے مایوس ہوئے تھے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ احمدیوں کے مخالفین نے جن میں احراری بھی شامل تھے' اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اقبال کو ان کے عقائد کے متعلق بے سروپا باتیں یا غلط قصے گھڑ کر سنائے ہوں۔"58

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ شیخ اعجاز احمد کس غیر محسوس طریقے سے اپنے اس عم محترم کو جس کی وجہ سے ان کو اعلیٰ عہدہ اور مقام ملا' مطعون کرنے کے درپے ہیں اور کس کس طرح ان پر بے بنیاد بہتان تراشتے رہے ہیں۔ "اقبال درونِ خانہ" میں مندرج ان بے ضرر واقعات میں جو میری والدہ مرحومہ نے انتہائی معصومیت سے بیان فرمائے اور اپنے بلند منزلت عم محترم کے پاس قیام کے دنوں میں جو کچھ دیکھا' من وعن بیان کرنے کی سعی فرمائی' اُن میں تو جھوٹ کی آمیزش نظر آئی اور الف لیلوی قصوں کا گمان گزرا مگر اپنی دروغ گوئیوں اور افترا پردازیوں کا احساس نہیں ہو سکا۔ اس قبیل کے لوگ دوسروں کی آنکھ کے تنکوں کی خبر تو ضرور لیتے ہیں مگر اپنی آنکھ کے شہتیر بھی ان سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ کیونکہ

اگرچہ پاک ہے طینت میں راہبی اس کی
ترس رہی ہے مگر لذتِ گناہ کے لیے
(ضربِ کلیم)

حال ہی میں ایک کتاب "اگر اب بھی نہ جاگے تو......" دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مولانا شمس نوید عثمانی کے اس غنچۂ فکر کو جسیم بکڈ پو' اردو بازار' جامع مسجد دہلی نے فروری 1989ء میں مشتہر کیا ہے۔ اپنے مندرجات کی بنا پر یہ خاصی عجیب وغریب حیثیت کی حامل کتاب ہے اور مولانا عثمانی نے بڑے چونکا دینے والے اور ایمان افروز انکشافات اس میں کیے ہیں۔ دورانِ مطالعہ ایک ایسا تاریخی واقعہ بھی پڑھنے کو ملا جس کے پس منظر کو اگر بالواسطہ دیکھا جائے تو اس کے واقعات وحقائق کچھ اس انداز سے انہی دنوں میں وقوع پذیر ہونے والے ایک دوسرے واقعہ سے اس طرح منسلک نظر آتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایسی شخصیت جو اپنی فکر کی طاقت سے ان تمام واقعات کا ادراک رکھتے ہوئے اور اسرارِ حیات وکائنات کا پردہ چاک کرتے ہوئے ان حقائق کا ذکر اپنے ایک مراسلے میں فرماتی ہے' تو کم نظر اور کج فہم لوگ اس کو ایک "اخباری گپ" سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور اس زمانہ ساز اور عظیم شخصیت پر "بلا تحقیق"

ہر بات کا یقین کر لینے کا بہتان دھرتے ہیں۔ مگر اس تاریخی واقعہ کے تناظر میں جب متعلقہ تحریروں کا جائزہ لیا جاتا ہے تو وہ نہ صرف یہ کہ چونکا دیتی ہیں بلکہ بصیرت افروز بھی نظر آتی ہیں۔

صورتِ حال کو صحیح طرح سمجھنے کے لیے تھوڑا سا پس منظر میں جانا پڑے گا۔ گزشتہ صفحات میں حضرت علامہ اقبالؒ کے متعلق ''مظلوم اقبال' کے حوالے سے یہ بہتان آپ کی نظر سے شاید گزرے ہوں کہ علامہ صاحب سنی سنائی باتوں [59] پر بلا تحقیق [60] یقین کر لیا کرتے تھے اور جو بھی کچھ ان کے حاشیہ نشین [61] ان کے کان میں ڈال دیا کرتے تھے، وہ آنکھیں بند کر کے اس پر آمنا و صدقنا کہہ دیا کرتے تھے [62] اور ان سب کے ثبوت میں ایک ایسے واقعہ کا سہارا لیا گیا ہے جو حضرت علامہؒ نے اپنے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد مرحوم کو 1922ء میں ایک مراسلے میں تحریر کیا تھا۔ بہتر ہو اگر یہاں متذکرہ مراسلہ کا متن دیکھ لیا جائے:

''لاہور 28 ستمبر 1922ء

برادرم مکرم السلام علیکم

اعجاز کے خط سے معلوم ہوا کہ مسہل کے بعد بخار رک گیا ہے۔ الحمدللہ۔ میں آپ کے لیے دعا کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ آپ کی صحت ضرور اچھی ہو جائے گی۔ میں نے جو نسخہ آپ کو بتایا تھا اس پر ضرور عمل کیے جائیے۔ اس کی بنا محض فلسفیانہ خیالات پر نہیں بلکہ اس انکشاف پر ہے جو خدا تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے قلب انسانی کے متعلق مجھ کو عطا فرمایا ہے۔ اگر بعض خیالات آپ کو افسردہ کر رہے ہیں تو ان کو یک قلم دل سے نکال دینا چاہیے۔ خدا تعالیٰ آپ کی تمام مشکلات رفع کر دے گا اور برکت نازل کرے گا۔ اگر آپ زندگی سے دل برداشتہ بھی ہوں تو محض اس خیال سے کہ اسلام پر بہت اچھا زمانہ عنقریب آنے والا ہے، اپنی صحت کی طرف توجہ کیجیے تاکہ آپ اپنی آنکھوں سے اس زمانے کا کچھ حصہ دیکھ لیں۔ آج چودہ یا شاید سوا سال ہو گئے جب مجھ کو اس زمانے کا احساس انگلستان کی سرزمین پر ہوا تھا۔ اس وقت سے آج تک یہی دعا رہی ہے کہ بارالٰہی اس وقت تک مجھے زندہ رکھ۔ یہاں تک کہ اپنی بعض پرائیویٹ مشکلات کے متعلق بھی میں نے شاذ ہی دعا مانگی ہوگی۔

آپ نے اخباروں میں پڑھ لیا ہوگا کہ ترکوں کا قبضہ بغیر جنگ کے اپنے تمام ممالک پر ہو گیا ہے۔ آبناؤں پر ان کا اقتدار تسلیم کر لیا گیا ہے البتہ یہ اقتدار بعض شرائط کا پابند ہوگا جس کا فیصلہ مجلسِ اقوام کرے گی۔ ترکستان کی جمہوریت کو بھی روس کی گورنمنٹ نے تسلیم کر لیا ہے۔ اس کے صدر غازی انور پاشا ہوں گے۔ اس سے بھی زیادہ معنی خیز خبر یہ ہے کہ روس کی سلطنت کا صدر اب ایک مسلمان محمد ستالین نام ہے۔ لینن جو پہلے صدر تھا، بوجہ علالت رخصت پر چلا گیا ہے۔ اس کے علاوہ روسی گورنمنٹ کا

وزیر خارجہ بھی ایک مسلمان مقرر ہوا ہے جس کا نام ''قرہ خان'' ہے۔ ان تمام واقعات سے انگریزی پولیٹیکل حلقوں میں اضطراب پیدا ہو گیا ہے اور ان سب باتوں پر طرہ یہ ہے کہ ایشیا میں ایک لیگ اقوام کی قائم ہونے والی ہے جس کے متعلق افغانی اور روسی گورنمنٹ کے درمیان گفتگو ہو رہی ہے۔ یہ سب اخباروں کی خبریں ہیں اور مجھے یقین ہے کہ حقیقت ان سے بھی زیادہ ہے۔ غالباً اب مسلمانانِ ایشیا کا فرض ہے کہ تمام اسلامی دنیا میں چندہ کر کے کابل اور قسطنطنیہ کو بذریعہ ریل ملا دیا جائے اور یہ ریل ان تمام ریاستوں سے ہو کر گزرے جو روس کے انقلاب سے آزاد ہوئی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تجویز ضرور عمل میں آئے گی۔ باقی خدا کا فضل و کرم ہے جو واقعات رونما ہوئے ہیں انھوں نے قرآنی حقائق پر مُہر لگا دی ہے کہ حقیقت میں کوئی کمزور یا طاقتور نہیں جس کو اللہ چاہتا ہے طاقتور بنا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے آن کی آن میں تباہ کر دیتا ہے۔ والدِ مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔

محمد اقبال لاہور''63

اس خط کا تعارف کراتے ہوئے شیخ اعجاز صاحب مصنفِ ''مظلوم اقبال'' بڑی دور کی کوڑیاں لائے ہیں:

> ''اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ تحریر خط سے 16 سال قبل قیام انگلستان کے زمانے میں انھیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ اسلام پر اچھا زمانہ عنقریب آنے والا ہے۔ ان کے اس بیان کی تائید ان کی ''زمانہ آیا ہے بے حجابی کا'' والی غزل سے بھی ہوتی ہے جو قیام انگلستان کے دوران 1907ء میں کہی گئی جو ''بانگ درا'' میں شائع ہو چکی ہے۔ اسلام کی نصرت اور سربلندی کے لیے ان کی تڑپ کا یہ عالم تھا کہ ''اخباری گپ'' پر بھی یقین فرما لیتے۔ اخباری خبر کہ روس کا صدر ستالین مسلمان ہے اور اس کا نام ''محمد ستالین'' ہے ''اخباری گپ'' ہی تھی ورنہ واقعتاً یہ بات درست نہ تھی۔ بہرحال ''اسلام پر جلد بہت اچھا زمانہ آنے'' کا ان کا احساس اپنی جگہ درست تھا۔ ان کی حیات میں تو ان کے ''آئینۂ افکار میں آنے والے دور کی تصویر دھندلی'' سی تھی لیکن ان کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد اس تصویر کے نقوش ابھرنے لگے۔ اسلامی دنیا میں سیاسی انقلاب برپا ہوا۔ ان کا پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ دیکھتے ہی دیکھتے درجنوں اسلامی ممالک غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزاد ہوئے۔ انقلاب کا یہ عمل ابھی جاری ہے۔ سیاسی انقلاب کے علاوہ ایک روحانی انقلاب بھی برپا ہے جس کی طرف ابھی سیاسی

دنیا کی توجہ نہیں۔ لیکن قرآن کریم کی پیشین گوئی ''هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ'' پوری ہو کر رہے گی۔ ان شاء اللہ۔ 64

اس سیر حاصل تبصرے سے یہ حقیقت عیاں ہو رہی ہے کہ شیخ اعجاز احمد صاحب کو حضرت علامہؒ کی روشن ضمیری اور اسلام کی سربلندی کے لیے ان کی تڑپ سے کوئی انکار نہیں بلکہ مندرجہ بالا مراسلے میں درج ان تمام پیشین گوئیوں کے وہ دل سے معترف ہیں جو حرف بحرف سچ ثابت ہوئیں مگر انھیں اگر کوئی اختلاف ہے تو صرف ایک بات سے جو ان کے خیال میں ایک ''اخباری گپ'' سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اتنی مختصر سی تحریر میں حضرت علامہؒ نے اس قدر سچی باتیں لکھ دی ہیں۔ اس لیے حیرت ہوتی ہے کہ صرف ایک بات غلط کیسے ہو سکتی ہے، جسے بنیاد بنا کر ان پر بلا تحقیق ہر بات پر یقین کر لینے کا بہتان لگایا گیا۔ میرے خیال میں یہ صرف اس لیے کیا گیا کہ اس طرح اس قبیل کے افراد اس ایک بات کو زیادہ سے زیادہ اچھال کر اس کے حوالے سے اپنے مطلب کی باتوں میں زیادہ آسانی سے کامیابی حاصل کر سکتے تھے، وگرنہ ان کو بھی یہ احساس یقیناً رہا ہوگا کہ اس قدر روشن ضمیر شخصیت جس کی ہر بات سولہ آنے یعنی حرف بحرف درست ثابت ہو رہی ہے آخر کس طرح 'بلا تحقیق' کوئی بات خود سے منسوب ہونے کی اجازت دے سکتی ہے۔ حضرت علامہؒ کا درج ذیل فرمان اس پر مہر تصدیق کا حکم رکھتا ہے:

خاکِ من روشن تر از جامِ جم است
محرم از نازادہائے عالم است

(اسرارِ خودی)

اسی پر بس نہیں بلکہ اسی ایک واقعہ کو بنیاد بناتے ہوئے شیخ اعجاز احمد نے اپنی متذکرہ کتاب ''مظلوم اقبال'' میں اس بہتان کا اعادہ فرمایا ہے اور ''علامہ اقبال اور احمدیت'' کے تحت دلائل جمع فرماتے ہوئے، جس میں وہ مرزا غلام احمد قادیانی کو ''معصوم'' ثابت کرنے کے لیے بڑی دور کی کوڑی لائے ہیں اور متذکرہ بالا مراسلے میں درج روسی صدر کے مسلمان ہونے کے واقعہ کا سہارا لے کر یہ ثابت کرنا چاہ رہے ہیں کہ چونکہ حضرت علامہ تحقیق کرنے میں دلچسپی نہیں لیتے تھے، اس لیے مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق بھی انھوں نے کوئی تحقیق نہیں فرمائی اور جو کچھ ادھر ادھر سے سنا، یا ان کے حاشیہ نشینوں نے زبردستی ان کے کان میں ڈال دیا، اس پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا اور خواہ مخواہ قادیانیت کے خلاف ہو گئے اور بلا جواز ہی اس کے پرزے اڑا ڈالے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مصنفِ ''مظلوم اقبال'' کو یہ حسرت بھی رہی کہ علامہؒ نے دوسروں کی بے سروپا باتوں پر یقین کر لیا مگر گھر میں موجود 'عالمِ بے بدل'

سے مشورہ نہ فرمایا۔اس سلسلے میں بے چارے یوں رقمطراز ہو رہے ہیں:

''معلوم ہوتا ہے اسی طرح کسی عقیدت مند حاشیہ نشین نے احمدیت سے اپنے عناد کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہہ دیا ہوگا کہ احمدی بانی سلسلہ احمدیہ کو (نعوذ باللہ نعوذ باللہ) حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے **Superior** (برتر) مانتے ہیں۔علامہ نے اس افترا کو سچ سمجھ لیا' حالانکہ اس کی تحقیق کچھ مشکل نہ تھی اور تحقیق کے لیے گھر سے باہر جانے کی بھی ضرورت نہ تھی۔''65

یہی نہیں بلکہ مصنفِ ''مظلوم اقبال'' حضرت علامہؒ کو مخاطب کرتے ہوئے شعر کی زبان میں یہاں تک فرما رہے ہیں:

''غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا''66

حیرت ہوتی ہے کہ کچھ لوگ کس طرح اپنے متعلق اس قدر خوش گمانی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ پوری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے سے بھی نہیں ہچکچاتے۔''ردِ قادیانیت'' میں حضرت علامہؒ کے دلائل سے کون آگاہ نہیں۔صرف اس ایک موضوع پر اب تک بے شمار مضامین اور کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور علامہ صاحب نے ردِ قادیانیت کے سلسلے میں جو دلائل عالم اسلام کے سامنے رکھے تھے' ان کا کوئی جواب آج تک کسی قادیانی سے ممکن نہیں ہو سکا۔چنانچہ اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے اب ایک دوسرے طریق سے حضرت علامہؒ کے دلائل کا اثر زائل کرنے کا وطیرہ اختیار کیا گیا ہے کہ علامہ صاحب کو تو درحقیقت ''قادیانیت'' سے کوئی بیر نہیں تھا بلکہ یہ تو ان کے حاشیہ نشینوں نے ان کو خواہ مخواہ قادیانیوں کے خلاف اکسایا اور علامہ صاحب نے ''بلا تحقیق'' اپنے ان حاشیہ نشینوں کی ''بے سروپا'' اور ''لغو'' باتوں کا یقین کر لیا اور بلا جواز دردِ سری مول لے کر انتہائی عرق ریزی فرمائی اور ''ردِ قادیانیت'' میں دلائل اور براہین جمع فرما کر مشتہر کر دیے کیونکہ ان کی عادت ''بلا تحقیق'' ہر بات پر یقین فرما لینے کی تھی۔اگر وہ تھوڑی سی تحقیق اس سلسلے میں صرف مصنفِ ''مظلوم اقبال'' سے فرما لیتے جو گھر میں ہی موجود تھے اور حقیقی بھتیجے کے ناطے ہر وقت ان کی تسلی و تشفی کے لیے بسر و چشم حاضر تھے' تو صورتِ حال یقیناً مختلف ہوتی ۔

بسے نادیدنی را دیدہ ام من
مرا اے کاشکے مادر نزادے

(ارمغانِ حجاز)

حضرت علامہؒ کے فرزندِ ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال نے ''زندہ رود'' میں مصنفِ ''مظلوم

اقبال'' کے متذکرہ بالا الزام کا جس انداز میں جواب دیا ہے' اسے بھی یہاں ایک نظر دیکھ لینا مناسب رہے گا۔

''پھر یہ کہنا کہ کسی کی گپ پر اعتبار کر کے انھوں نے یقین کر لیا کہ روس کا نیا صدر محمد ستالین مسلمان ہے۔ اس سلسلے میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وسط ایشیا کے مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لیے یا انھیں اپنا مطیع رکھنے کی خاطر شروع میں روسی کمیونسٹوں نے اسی قسم کا پراپیگنڈہ کیا تھا اور عین ممکن ہے کہ یہ پراپیگنڈہ سرحدیں عبور کر کے برصغیر میں بھی پہنچا ہو۔'' 67

ممکن ہے ڈاکٹر جاوید اقبال کی مندرجہ بالا توجیہ بھی کسی حد تک درست رہی ہو مگر جو اقتباس ''اگر اب بھی نہ جاگے تو......'' نامی کتاب' جس کا ذکر شروع میں ہوا' سے یہاں پیش کیا جا رہا ہے' وہ شاید اس سے قبل کبھی بھی اس سلسلے میں دستیاب نہیں ہو سکا کیونکہ جہاں تک مجھے علم ہے اب تک ڈاکٹر جاوید اقبال کے علاوہ شاید ہی کسی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور مصنفِ ''مظلوم اقبال'' کے اس بہتان کا اس قدر تفصیلی جواب دیا ہو اور جہاں تک میری ناقص معلومات کا تعلق ہے' کسی نے بھی' بشمول ڈاکٹر جاوید اقبال' اب تک یہ نہیں کہا کہ جس واقعہ کو شیخ اعجاز (مصنفِ ''مظلوم اقبال'') ایک ''اخباری گپ'' قرار دے رہے ہیں' وہ درحقیقت بالکل سچ ہے اور اگر حضرت علامہؒ نے اس کا ذکر اپنے برادرِ بزرگ کے نام خط میں کیا' تو وہ محض ایک اخباری خبر کی وجہ سے نہیں تھا' گو انھوں نے خود بھی اس کا ذکر اجمالاً انہی الفاظ میں کیا' بلکہ وہ اس کے مکمل سیاق و سباق کا علم رکھتے تھے اور ان دنوں جو کچھ اس سلسلے میں دنیا کے اس حصہ یعنی کمیونسٹ روس میں وقوع پذیر ہو رہا تھا اور عنقریب منصہ شہود پر آنے والا تھا' کا پورا پورا اور اک یقیناً انھیں اپنے علم باطنی کی بنا پر ہو چکا تھا اور وہ محض ایک ''اخباری خبر'' پر تکیہ کرتے ہوئے اتنی بڑی بات نہیں کہہ رہے تھے بلکہ اپنے متذکرہ خط میں تحریر کردہ دوسری سچائیوں کے ساتھ ساتھ ایشیا کے ایک عظیم ملک یعنی روس کے مستقبل کے متعلق بھی بالکل صحیح پیش گوئی فرما رہے تھے۔

راز دانِ خیر و شر گشتم ز فقر
زندہ و صاحب نظر گشتم ز فقر

(مسافر)

''اگر اب بھی نہ جاگے تو......'' کا اقتباس جس کا ذکر گزشتہ سطور میں متعدد بار کیا گیا ہے' کو دیکھ لینا اب سودمند رہے گا۔ اقتباس گو خاصا طویل ہے مگر اس کو مکمل دیکھنا بے حد ضروری ہے تا کہ اس کے پس منظر اور پیش منظر سے پوری طرح آگہی حاصل ہو سکے:

''دو زبردست حادثے[68]''

تبلیغ میں حکمت کی اتنی زبردست اہمیت قرآن نے کیوں رکھی ہے' اس کے واضح ثبوت تاریخی واقعات میں ہمیں ملتے ہیں۔ اسی صدی میں دو موڑ تاریخ میں ایسے آ چکے ہیں جب مسلمانوں کے حکمتِ عملی سے کام نہ لینے سے غیر مسلمین کی حکمتِ عملی کامیاب ہوئی اور دونوں مرتبہ کروڑوں کی تعداد میں پوری پوری قومیں اسلام میں داخل ہوتے ہوتے لوٹ گئیں۔ ان دونوں زبردست حادثوں میں سے ایک کا تعلق روس سے ہے اور دوسرے کا ہمارے ملک ہندوستان سے۔

روسی کمیونسٹ انقلاب کے رہنما کامریڈ لینن تمام مذاہب عالم کا مطالعہ کرنے کے بعد اسلام سے بہت متاثر ہوئے تھے اور روسی عوام کے قبولِ اسلام کی خواہش رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں باور کیا جاتا ہے کہ ان کی اسلام سے دلچسپی ایک بزرگ ''بقرا خان''[69] سے ملاقات کا نتیجہ تھی جن سے وہ کافی متاثر ہوئے تھے اور جن کے فیضِ صحبت کا لینن پر بہت اثر تھا۔ بہر حال لینن نے کوشش کی لیکن علمائے مصر کی لاعلمی وغیر دانش مندی اور برطانوی حکومت کی حکمتِ عملی سے یہ زریں موقع ضائع ہو گیا۔

اس سانحے کی تفصیلات ایک ہندوستانی کمیونسٹ لیڈر نے بیان کی ہیں' جن کے لینن سے ذاتی تعلقات تھے۔ محمد عبداللہ ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس کی زبان میں سنیے:

> ''ایم این رائے (M.N.Roy) ہندوستان کے معروف لیڈر تھے اور 1921-28ء کے درمیان وہ کمیونسٹ انٹرنیشنل روس کے فعال کارکن تھے۔ جرمنی' فرانس اور چین کے مزدوروں کی تحریک میں انھوں نے اہم خدمات انجام دیں۔ لینن سے ان کے اچھے تعلقات تھے اور انھیں کے ایک ساتھی اور ہندوستانی نے اس وقت کے سیاسی حالات کے تحت ہندوستان چھوڑ کر روس میں پناہ لی تھی۔ ان سے بھی لینن کے ذاتی تعلقات تھے۔ انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لینن کی اسلام سے دلچسپی اور عقیدت کے بارے میں جو صراحت کی' وہ قابلِ ملاحظہ ہے:
>
> ''زارِ روس کے دور کے خاتمے پر جب لینن برسر اقتدار آئے اور انھوں نے کمیونسٹ حکومت قائم کر لی تو ایک دن اپنے قریبی دوستوں کی میٹنگ طلب کی اور اس میں انھوں نے فرمایا:
>
> ''ہم اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن اس کو برقرار رکھنے اور

اس کو چلانے کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ ہم ایسے نظریۂ حیات کو اپنائیں جو انسانی فطرت کے مطابق ہو' اس لیے کہ انسان کو اپنی بقا کے لیے صرف روٹی نہیں چاہیے بلکہ اس کی روح کی تسکین کے لیے ایک مذہب کی بھی ضرورت ہے۔ میں نے تمام مذاہب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ میرے نزدیک سوائے ایک مذہب کے کسی اور میں یہ صلاحیت نہیں ہے جو ہمارے نظریۂ کمیونزم کا ساتھ دے سکے۔ اس لیے میں ابھی اس مذہب کا نام ہی بتلاؤں گا۔ اس بارے میں رائے قائم کرنے میں آپ جلدی نہ فرمائیں اس لیے کہ یہ سوال کمیونزم کی موت اور حیات کا ہے۔ آپ وقت لیں اور غور کریں۔ ہوسکتا ہے میں غلطی پر ہوں لیکن ہمیں اپنے تصفیہ کے بارے میں ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ''اسلام'' ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اپنے مادی رجحانات میں کمیونزم پر پورا اترتا ہے۔''

یہ سن کر مجمع میں شور ہونے لگا تو لینن نے ٹھنڈے دل سے پھر غور کرنے کی ہدایت دی کہ آج سے پورے ایک سال کے بعد ہم پھر ملیں گے اور اس وقت طے کریں گے کہ کمیونسٹ کو کوئی مذہب اختیار کرنا چاہیے! اور کون سا؟''

برطانوی حکومت کے محکمہ خارجہ کو جب اس کا علم ہوا تو اس نے اس میں برطانوی سلطنت کے لیے بڑا خطرہ محسوس کیا کہ اگر کمیونزم اور اسلام مل جائیں تو روس کو برطانیہ پر ایک ناقابلِ تسخیر قوت اور فوقیت حاصل ہو جائے گی۔ فوری انھوں نے ایک مسئلہ کھڑا کیا......

(کیا) ''اسلام کے لیے مارکسزم جیسا خدا سے منحرف اور ملحدانہ نظریہ قابلِ قبول ہوسکتا ہے؟''

علمائے ازہر نے جو اس سوال کے پس منظر سے واقف نہ تھے' ایسا فتویٰ صادر کر دیا جو برطانوی حکومت چاہتی تھی۔ یہ فتویٰ طبع کروا کر دنیا کے کونے کونے میں تقسیم کروا دیا گیا۔ حتیٰ کہ روس کے اسلامی علاقوں میں اس فتوے کی کاپیاں ابھی تک بعض مسلمانوں کے پاس ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا علم لینن کو ہوگیا۔ انھوں نے اپنی حیرت کا اظہار کیا اور کہا......

''میں سمجھتا تھا کہ مسلمان سمجھدار ہوں گے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے وہ بھی اور

مذاہب کی طرح بڑے کٹر اور دقیانوسی ہیں۔"
جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکیم دھری کی دھری رہ گئی اور اس کے مخالفین نے اطمینان کا سانس لیا۔"70

آپ نے حیران کن مماثلت ملاحظہ فرمائی کہ حضرت علامہؒ نے 1922ء میں جب روس کے صدر کے متعلق اطلاع اپنے برادرِ بزرگ کو پہنچائی تو اس وقت یا تو یہ تمام واقعات کمیونسٹ روس میں وقوع پذیر ہو چکے تھے یا بہت جلد منظرِ عام پر آنے والے تھے اور یقیناً علامہؒ اچھی طرح ان کے نتائج سے آگہی رکھتے تھے۔ اسلام اور کمیونزم میں جو نیا تعلق پیدا ہونے والا تھا' وہ ان کی دوررس نگاہوں میں تھا۔ مصنفِ "مظلوم اقبال" اور دوسرے "اکابرین" نے اگر اپنی عقلِ ناقص کی بنا پر اس کو محض ایک "اخباری گپ" سے تعبیر کیا تو یہ ان کا اپنا قصور تھا' ورنہ اقبالؒ نے تو برملا فرما دیا۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے
(بالِ جبریل)

کمیونسٹ روس کے من حیث القوم قبولِ اسلام کے متذکرہ واقعہ پر کسی اظہارِ خیال کا شاید یہ مناسب وقت اور موقع نہیں کیونکہ اس کے فوائد و علل پر بحث اب محض "لکیر پیٹنے" کے زمرے میں آئے گی۔ مندرجہ بالا طویل اقتباس کو یہاں پیش کرنے کا واحد مقصد حضرت علامہؒ کی اس بہتان سے بریت ہے جس کے ذریعے انھیں "بلا تحقیق" ہر بات کا یقین کر لینے والا ثابت کیا جا تا رہا ہے۔ اب یہاں دلچسپ صورتِ حال یہ پیدا ہو چکی ہے کہ مندرجہ بالا بہتان کو ہوا دینے والوں' جن میں مصنفِ "مظلوم اقبال" پیش پیش نظر آتے ہیں' نے خود کسی تحقیق کی کوشش نہیں فرمائی اور "بلا تحقیق" ایک اظہر من الشمس حقیقت کو "اخباری گپ" قرار دیتے ہوئے حضرت علامہؒ جیسی ہستی پر بے بنیاد بہتان تراشی کے مرتکب ہوئے ہیں تاکہ قادیانی جماعت اور اس کے بانی کے حق میں زمین ہموار کر سکیں اور یہ ثابت کرنے کی سعی لاحاصل فرماتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ علامہؒ نے "قادیانیت" کے خلاف جو تحقیق فرمائی اور جو دلائل امتِ مسلمہ کے سامنے رکھے' وہ سب بلا جواز تھے کیونکہ انھوں نے "بلا تحقیق" محض اپنے چند "حاشیہ نشینوں" کی بے سروپا باتوں پر یقین کر لیا اور خواہ مخواہ قادیانیت کے ڈھول کا پول کھول دیا جس کی وجہ سے بے چارے قادیانیوں کے بہت سے رازہائے درونِ خانہ طشت از بام ہو گئے ورنہ اگر علامہؒ تھوڑی سی تحقیق فرمانے کے عادی ہوتے تو ایسی صورتِ حال کبھی پیدا نہ ہوتی؟ یا عجب!

یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ حضرت علامہؒ جو ایک اعلیٰ پائے کے قانون دان اور محقق تھے'

شاید ہی کوئی بات بلاتحقیق کہنے' سننے یا لکھنے کے متحمل ہو سکتے تھے۔ اپنی پوری حیاتِ مستعار میں انھوں نے صرف ایک کام ہی تو کیا اور وہ تھا ''تحقیق'' ...... علم کی تحقیق' قانون کی تحقیق' مذہب کی تحقیق' سیاست کی تحقیق' زبان کی تحقیق آخر کس کس کا ذکر کیا جائے ...... اگر ان کی پوری زندگی پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی جائے تو ان کا تو اوڑھنا بچھونا ہی یہی تھا۔ اس لیے اگر ان کی سیاسی' سماجی' ادبی یہاں تک کہ انفرادی حیثیت کا تصور کیا جائے تو ان سے کسی قسم کی غیر ذمہ دارانہ حرکت کا احتمال عبث ہے۔ میرے خیال میں ان کے متعلق اس قسم کے سطحی اور بے جا الزامات کا سہارا لے کر ان کی عظیم شخصیت کو داغدار بنانا کسی طور ممکن نہیں اور اب جب کہ ان عاقبت نااندیشوں کی سازش بے نقاب ہو چکی ہے تو یہ کہنا کسی طور بے جا نہ ہوگا کہ حضرت علامہؒ نے اپنی حیات میں کبھی بھی کوئی غیر ذمہ دارانہ بات نہیں کہی بلکہ ہمیشہ ہی اپنی ہر بات اور عمل کے لیے پورے پورے دلائل فراہم فرمائے۔ جو اصحابِ فراست صرف ایک واقعہ کو بنیاد بنا کر ان کی شخصیت کو متنازعہ بنانے کے درپے تھے' اب اس واقعہ کے بالکل سچ ثابت ہو جانے کے بعد یقیناً مستقبل میں اس قسم کی قبیح حرکت سے گریز کریں گے۔ خداوند کریم عقل کے ان اندھوں کو ''عقلِ سلیم'' سے نوازے اور آئندہ محتاط رہنے کی توفیق ارزاں فرمائے۔

کیا یہ تمام حقائق علامہؒ کی فراست اور روشن ضمیری کی ایک زندہ مثال کے ساتھ ساتھ ان کے اس فرمان کی تفسیر ثابت نہیں ہو رہے۔

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے
(بانگِ درا)

حواشی

1۔ ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد۔ صفحہ 226۔

2۔ ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد۔ صفحہ 208 اور 209۔

3۔ ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد۔ صفحہ 199۔

4۔ ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد۔ صفحہ 206 اور 207۔

5۔ ''زندہ رود'' از جاوید اقبال۔ صفحہ 912۔

6۔ ''زندہ رود'' از جاوید اقبال۔ صفحہ 912 اور 913۔

7۔ ''زندہ رود'' از جاوید اقبال۔ صفحہ 913۔

8۔ ''مظلوم اقبال'' تب تک شائع نہیں ہوئی تھی اس لیے اعجاز صاحب نے ایک نوٹ جاوید صاحب کے استفسارات کے جواب میں انھیں بھجوایا تھا' جس کا ذکر ''زندہ رود'' میں جا بجا ملتا ہے۔

9۔ ''اقبال درونِ خانہ'' (جلد اوّل) صفحہ 17 (حاشیہ)۔

10۔ ''زندہ رود'' از جاوید اقبال۔ صفحہ 912۔

11۔ ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد صفحہ 189۔

12۔ ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد صفحہ 98۔

13۔14۔ ڈاکٹر جاوید اقبال ''زندہ رود'' میں لکھتے ہیں..... ''نظیر صوفی کے بیان میں قطعیت ہے حالانکہ وہ عمر میں شیخ اعجاز احمد اور شیخ مختار احمد سے چھوٹے تھے۔'' (زندہ رود صفحہ 74)

15۔16۔17۔ ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد صفحہ 187۔

18۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ چونکہ شیخ عطا محمد صاحب قادیانی جماعت کے ممبر نہیں تھے اس لیے کوئی بھی نمازِ جنازہ کے لیے نہیں آیا کیونکہ وہ کسی غیر قادیانی کا جنازہ نہیں پڑھ سکتے تھے۔

19۔ معراج بیگم۔

20۔ ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد صفحہ 58۔

21۔ ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد صفحہ 140-141۔

22۔ ''اقبال اور مشاہیر کشمیر'' از کلیم اختر۔ صفحات 234 اور 235۔

23۔ ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد صفحہ 139۔

24 ''اقبال درونِ خانہ''(حصہ اوّل)صفحہ 17 پیش لفظ از مولانا مہر۔

25 پیش لفظ''اقبال درونِ خانہ''(حصہ اوّل)ازمولانا غلام رسول مہر۔صفحات 12 اور 13۔

26 یہ خط انگریزی میں ہے اس لیے اس کا انگریزی متن''علامہ اقبال کی تاریخ ولادت''از ڈاکٹر وحید قریشی کے صفحہ 117(انگریزی حصہ)میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

27 اپریل 1971ء۔

28 مئی 1983ء(تیسرا ایڈیشن زیر طبع)

29 ''مظلوم اقبال''از اعجاز احمد صفحہ 196۔

30 ایضاً صفحہ 189۔

31 ایضاً صفحہ 208 اور 214۔

32۔33 ایضاً صفحات 199 اور 206۔

34 ''زندہ رود''میں ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے اس سلسلے میں مزید تحقیق فرمائی ہے اور میرے بیان کردہ واقعات کی تصدیق اور تقویت کا باعث ہوئے ہیں۔تفصیلات کے لیے باب نمبر 8 اور 9 ملاحظہ ہو۔

35 علامہ اقبال کی تاریخ ولادت از ڈاکٹر وحید قریشی۔انگریزی حصہ صفحہ 11 شیخ اعجاز صاحب کا انگریزی مضمون''علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش۔''

36 ''زندہ رود''از جاوید اقبال صفحہ 271۔

37 ''زندہ رود''از جاوید اقبال صفحہ 270۔

38 ''مظلوم اقبال''از اعجاز احمد صفحہ 121۔

39 ''زندہ رود''از جاوید اقبال صفحہ 286۔

40 ''زندہ رود''از جاوید اقبال صفحہ 432۔

41 ''زندہ رود''از جاوید اقبال صفحہ 489۔

42 ''زندہ رود''از جاوید اقبال صفحہ 764۔

43 ''زندہ رود''از جاوید اقبال صفحہ 765۔

44 ''مظلوم اقبال''از اعجاز احمد صفحہ 99۔

45 ''مظلوم اقبال''از اعجاز احمد صفحہ 208 اور 209۔

46 ''عقیدۂ ختم نبوت اور فتنہ قادیانیت''مرتبہ صادق علی زاہد صفحہ 46۔

47 ''عقیدۂ ختم نبوت اور فتنہ قادیانیت''مرتبہ صادق علی زاہد صفحہ 49۔

48۔49۔50 ''ختم نبوت اور تحریک احمدیت''از پرویز صفحہ 60۔

51 ''ختم نبوت اور تحریک احمدیت'' صفحہ 61۔

52 ''ختم نبوت اور تحریک احمدیت'' صفحہ 65۔

53 تب تک اعجاز صاحب نے اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' ابھی شائع نہیں کی تھی۔

54-55 ''زندہ رود'' از جاوید اقبال صفحہ 939۔

56 ''زندہ رود'' از جاوید اقبال صفحہ 939۔

57 ''زندہ رود'' از جاوید اقبال صفحہ 939 اور 940۔

58 ''زندہ رود'' از جاوید اقبال صفحہ 940 اور 941۔

59 تا 62 ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد صفحات 209 اور 341۔

63 ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد۔ خط نمبر 81۔ صفحات 340 اور 341۔

64 ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد' صفحات 341 اور 342۔

65-66 ''مظلوم اقبال'' از اعجاز احمد صفحہ 209۔

67 ''زندہ رود'' از جاوید اقبال۔ صفحات 940 اور 941۔

68 پہلے زبردست حادثے کے متعلق اقتباس یہاں درج کیا جا رہا ہے۔ مگر دوسرا چونکہ اس بحث سے قدرے غیر متعلق ہے' اس لیے اس کا ذکر آخری صفحات پر ملاحظہ ہو کیونکہ غیر متعلق ہونے کے باوجود بھی وہ مسلم امہ کے لیے نشانِ عبرت کا حکم رکھتا ہے۔

69 حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنے متذکرہ بالا مراسلہ..... جو انھوں نے اپنے برادرِ بزرگ کو تحریر کیا' میں بھی ایک ''قرہ خان'' کا ذکر کیا ہے جو روس کا وزیر خارجہ مقرر ہوا.....

70 ''اگر اب بھی نہ جاگے تو.....'' از مولانا شمس نوید عثمانی' صفحات 203 تا 205۔

ڈاکٹر نظیر صوفی

علامہ اقبالؒ کے برادرِ بزرگ پر قادیانی بہتان

''جھوٹے نبی کی جھوٹی باتیں'' لکھتے لکھتے آپ نے (شورش کاشمیری نے) جن اُمور پر روشنی ڈالنے کے لیے مجھے مخاطب کیا ہے' انھیں تحریر کرنے کی شاید کبھی نوبت نہ آتی۔ لیکن اب کہ قادیانی کذب تراشوں کے غلط پروپیگنڈے کو جھٹلانا عین فرض ہے، حقائق سپردِ قلم ہیں۔

آپ کا یہ خیال کہ علامہؒ کے والدِ گرامی اور برادرِ بزرگ کو قادیانی کہنا محض تلبیسی روایت ہے، بالکل درست ہے۔ صدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ کے دعویٰ کی تردید میں بس اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ دونوں بزرگوں کے مزار حضرت امام صاحبؒ کے قبرستان میں ہیں، نہ کہ قادیان کے ''بہشتی مقبرہ'' میں۔ اگر علامہؒ کے والد اور برادرِ بزرگ میرزائی ہوتے تو علامہؒ کی سبکی کے لیے میرزائی انھیں ہر قیمت پر قادیان کے ''بہشتی مقبرہ'' میں دفناتے۔

والدِ علامہؒ 17 اگست 1930ء کو 95 سال کی عمر میں راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ علامہؒ اور ان کے برادرِ بزرگ مسلمانوں کے جمِ غفیر کے ساتھ ان کے جنازہ کو کندھا دیتے ہوئے حضرت امام صاحبؒ کی جنازگاہ تک لے گئے۔ نمازِ جنازہ حنفی العقیدہ میاں فضل احمد مرحوم امام مسجد نائیاں' گلی پُوڑی گراں نے پڑھائی۔ کسی مرزائی کو شریکِ جنازہ ہونے کی جرأت نہ ہوئی۔

علامہؒ کے برادرِ بزرگ 12 دسمبر 1940ء کو فوت ہوئے۔ ان کا جنازہ حسبِ وصیت سنی مسلمانوں نے اٹھایا۔ یہ وصیت انھوں نے دورانِ بیماری مجھے کی تھی۔ میرے برادرانِ نسبتی ملازمت کے سلسلہ میں سیالکوٹ سے باہر تھے۔ وہ ان کے آخری دموں ہی پر پہنچے۔ ان کی نمازِ جنازہ بھی حنفی العقیدہ مولوی سکندر خاں مرحوم' امام مسجد جہانگیری نے پڑھائی اور وہ حضرت امام صاحبؒ سے ملحقہ قبرستان میں سالوں پہلے خود بنوائی ہوئی پختہ قبر میں دفن کیے گئے۔

علامہؒ کی بھاوجہ اہلیہٗ شیخ عطا محمد مرحوم 13 فروری 1959ء کو فوت ہوئیں۔ ان کا جنازہ بھی سنی مسلمانوں نے اٹھایا۔ البتہ شیخ اعجاز احمد صاحب کے ساتھ ساتھ دو چار مرزائی بھی چل رہے تھے جب

جنازہ سنہری مسجد کے قریب پہنچا تو میں نے خود سنا کہ شیخ صاحب اپنے مرزائی ساتھیوں سے کہہ رہے تھے کہ میں تو اپنی والدہ کی نمازِ جنازہ مسلمانوں میں شامل ہو کر پڑھ لوں گا۔ اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو جنازے کا ساتھ یہیں سے چھوڑ دو۔ اس پر وہ سب کترا کر چلے گئے۔ علامہؒ کے اس ''اکلوتے'' قادیانی بھتیجے نے حنفی العقیدہ مولوی سکندر خاں مرحوم کے پیچھے مسلمانوں کے ساتھ اپنی والدہ کا جنازہ پڑھا۔ وہ اپنے والد مرحوم و مغفور کے جنازہ پر مسلمانوں سے علیحدہ کھڑے رہنے کا تلخ تجربہ کر چکے تھے۔ اس لیے قادیانی مسلک کو دُہرانے کی ہمت نہ ہوئی۔ ان کی والدہ کو بڑے شیخ صاحب کے پہلو میں پہلے سے بنی ہوئی پختہ قبر میں ابدی نیند سلا دیا گیا۔

علامہؒ کے برادرِ بزرگ پر مرزائی ہونے کی تہمت تراشنے والوں میں اگر ذرا سی سوجھ بوجھ ہوتی تو سوچتے کہ اگر وہ مرزائی ہوتے تو جیتے جی اپنی اور اپنی اہلیہ کی قبر مسلمانوں کے قبرستان میں ہرگز نہ بنواتے اور نہ ہی مسلمان انھیں بنوانے دیتے۔ بلکہ ان کا قادیانی ''اکلوتا'' بیٹا انھیں قادیان کے ''بہشتی مقبرہ'' میں دفن کرانے کا اہتمام کرتا۔

یہ کہنا کہ علامہؒ کے خاندان کے کئی افراد نے مرزائیت قبول کر لی تھی، سراسر جھوٹ ہے۔ حضرت علامہؒ کے والدؒ، والدہ، چچا، چچی، بہنیں اور بھائی اور ان کی اولادیں سب ہی سنی مسلمان تھے اور ہیں۔ سوائے ایک بھتیجا کے جو کہ ججی میں ترقی کے لیے چوہدری ظفر اللہ کے زیر اثر چھ بہن بھائیوں میں سے ''اکلوتا'' قادیانی بن گیا۔

علامہ کے والدِ گرامی مرزا قادیانی کے مرید کیا ہوتے وہ تو خود قیامِ سیالکوٹ کے دوران علامہؒ کے والدؒ کے زیرِ تربیت رہا۔ **1864**ء میں **24** سالہ مرزا قادیانی جب ملازمت کے لیے سیالکوٹ میں وارد ہوا تو میاں جی اس وقت قادریہ طریق میں رشد و ہدایت کے مقام پر فائز المرام تھے۔ طالبانِ حق اور محلہ کے سر برآوردہ لوگوں کی مجلس ان کے ہاں ہر روز لگتی تھی۔ اتفاق سے مرزا قادیانی بھی محلہ کشمیریاں کی ایک گلی میں رہائش پذیر ہوا۔ محلہ داروں کے ساتھ وہ بھی حاضرِ مجلس ہونے لگا۔ تسبیح بدست تو رہتا ہی تھا۔ میاں جی نے قادریہ طریق پر اس کی تربیت شروع کر دی۔ ابھی وہ اس کا ظرف ہی جانچ رہے تھے کہ انانیت کی بھول بھلیوں سے نکلنے سے پہلے ہی مختار پٹوار کے امتحان میں بار بار فیل ہو جانے سے دل برداشتہ ہو کر قادیانی پدھارا، چندے اور ٹھہر کر اگر وہ قادری طریق سے نفسِ امارہ پر قابو پا لیتا تو میاں جی اپنے مرشد سائیں عبداللہ قادریؒ سے سفارش کر کے اس کی چشمِ باطن کھلوا دیتے۔ لیکن افسوس کہ مرزا کی قسمت میں تمام عمر آتشیں دریائے انانیت معلم الملکوتی کے دسوسی بھنوروں ہی میں چکر کھاتے رہنا تھا۔ قادیان میں راہِ طریقت میں رہنمائی کے لیے کوئی دوست نہ ملا۔ اس لیے بھٹک گیا۔

ظلماتِ انانیت میں اگر کسی خضرِ راہ کی رہنمائی حاصل نہ ہو تو ناری تجلیات کی گرمی سے سالکِ راہ کے سر پر تمام اولیاء سے بڑا ہونے کا خبط ہی سوار نہیں ہو جاتا، بعض اوقات وہ نبی بلکہ میں ہی میں ہوں کی واردات میں اپنے آپ کو خدا بھی سمجھنے لگتا ہے۔ مرزا جی پر یہی افتاد پڑی۔ اس کے غیر اسلامی عقائد کی وجہ سے جب میاں جی نے توجہ ہٹالی، تو وہ بے مرشد انانیت کے آتشیں دریائے ذخار کے قعرِ وسواس میں ایسا ڈوبا کہ پھر زندگی بھر اُبھر نہ سکا۔

آپ خیال کریں کہ جس شخص نے "احمدیت علامہ اقبالؒ کی نظر میں" لکھتے ہوئے پہلی چھ سطروں ہی میں پانچ جھوٹ کترے ہیں، اس نے باقی مضمون میں کونسی سچی باتیں لکھی ہوں گی۔ علامہؒ کے خویش و اقارب میں سے صرف ایک بھتیجا اکلوتا قادیانی ہے۔ جن دنوں انھوں نے حکومتِ ہند سے مرزائیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ مرزا محمود قادیانی نے ان کے خلاف ایک جمعہ میں وعظ کرتے ہوئے کہا کہ انھیں اپنے برادر زادہ شیخ اعجاز احمد کی "پاکیزہ جوانی" سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ گلی حکیم حسام الدین کے مرزائیوں نے سمجھا کہ بیٹے کی تعریف سن کر بڑے شیخ صاحب خوش ہوں گے، انھیں الفضل پڑھانے کے لیے آئے۔ شیخ صاحب اقبال منزل کے باہر بازار کی طرف سیڑھیوں کے آگے کھڑے تھے۔ مرزائیوں نے انھیں مرزا محمود کے الفاظ سنائے تو اخبار دیکھنے دکھانے سے پہلے ہی شیخ صاحب نے قادیانی خلیفے اور اس کے ساتھیوں کو بہت برا بھلا کہا اور فرمایا کہ مرزا محمود کو گز اقبالؒ خود پھیر لے گا۔ البتہ میرے بیٹے میں اگر بصیرت ہوتی تو قادیانی خلیفے کی سیالکوٹ میں گزاری ہوئی "پاکیزہ زندگی" کے پیش نظر سیّد احمد شاہ بن سیّد حامد شاہ قادیانی کی طرح قادیانی خلیفے اور اس کے مذہب پر دو حرف بھیجتا۔

علامہؒ کے والد شیخ نتھو مرحوم سلسلۂ قادریہ میں منسلک تھے۔ ان کے مرشد سائیں عبداللہ قادریؒ اپنے وقت کے سیف زبان صاحبِ کرامت بزرگ تھے۔ وہ خواجہ عمر بخش قادریؒ گوجرانوالوی کے خلیفۂ اوّل تھے۔ ان کا مزار دارہ سائیں عبداللہ قادریؒ (نزد لیڈی اینڈرسن ہائی سکول سیالکوٹ) میں ہے۔ صحیح روایت ہے کہ علامہؒ جس وقت قریباً چار برس کے تھے تو خواجہ عمر بخشؒ اپنے خلیفہ اور دوست سائیں عبداللہ قادریؒ کو ملنے کے لیے سیالکوٹ تشریف لائے۔ میاں جی نے اپنے دادا پیر کی دعوت کی اور علامہؒ کو مرشد کے توسط سے بسم اللہ کے لیے دادا پیر کی گود میں بٹھایا۔ سائیں عبداللہؒ نے میاں جی کی استدعا مرشد سے عرض کی تو انھوں نے مسکرا کر اپنا لبِ دہن علامہؒ کے منہ میں لگا کر بسم اللہ پڑھوائی۔ ان ہر دو بزرگوں کی تقدیر ساز توجہ اور اپنے والدِ گرامی کی دعاؤں ہی سے علامہؒ حکیم الامت بنے۔

❁......❁......❁

بیگم رشیدہ آفتاب اقبال

چند وضاحتیں

میں کسی مذہبی بحث میں اُلجھنا نہیں چاہتی اس لیے کہ مجھے اس قسم کے مباحثے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میرا ایمان ہے کہ روز قیامت اچھے اور برے افعال کی جزا و سزا کا ہمیں سامنا کرنا ہے۔ خدائے برتر بعض کو اس دنیا میں بھی سزا دیتا ہے اور اگر ہمیں یقین نہ آئے تو اس کا کیا علاج؟ اسلام کو بعض کم علم طبقوں نے اپنے جوش سے غلط رنگ دے رکھا ہے اور اسلام کی غلط تعبیر سے لوگوں کو فرقوں میں بانٹ رکھا ہے۔

گزشتہ سال (2000ء) 10 جولائی' 11 جولائی اور 12 جولائی کو تین خطوط مختلف پتوں پر موصول ہوئے۔ تین خطوط کے ایڈریس میری کتاب سے لیے گئے اور حق کے کسی مبلغ نے اپنا نام تک نہ لکھا۔ ایک خط احمدی ہفت روزہ ''الفضل انٹرنیشنل'' بابت 23 جون تا 27 جون 2000ء کی ایک کٹنگ بعنوان ''علامہ اقبال کی بڑی بہو کی جلی کٹی باتیں'' ہے۔

مرزا صاحب نے نہ جانے کیسے نبوت کا دعویٰ کر دیا؟ ابھی قیامت تک اور بہت سے جھوٹے مدعیانِ نبوت ہوں گے۔ میں نے مرزا صاحب کی سب پیش گوئیاں جھوٹی پائی ہیں اور شاید جھوٹ کو آپ کے ہاں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

آپ نے میرے خاوند آفتاب اقبال کے بارے میں کہا کہ چند سال پہلے (1983ء) آفتاب اقبال اپنے ایک بیٹے کو احمدیہ مسجد فضل لندن میں لائے اور چودھری سر محمد ظفر اللہ خاں سے درخواست کی کہ اسے احمدی بنالیں۔ حضرت چودھری صاحب فرماتے ہیں' میں نے آفتاب سے کہا' پہلے اسے تعلیم احمدیت سے واقف ہونا چاہیے۔

آفتاب اقبال 1983ء سے پہلے وفات پا چکے تھے (1979ء میں)۔ اس لیے یہ قصہ من گھڑت ہے۔ اصل واقعہ یوں ہے کہ ہم 1962ء میں اپنے منجھلے بیٹے پاشا (وقار اقبال) کو سکاٹ لینڈ کے ایک سکول جو ایبرڈین میں تھا' داخل کرانے گئے تھے۔ اس وقت اس کی عمر تقریباً 14 سال تھی۔ میں

آفتاب اقبال کے ہمراہ تھی۔ میرا بیرونِ ملک یہ پہلا سفر تھا، لہٰذا میں نے طے کیا کہ پہلے دو چار دن لندن ٹھہریں، سیر کریں، پھر ایبرڈین جائیں گے۔

سیر کرتے کرتے ایک جگہ ٹھہر کر انھوں نے مجھے بتایا کہ یہ احمدیوں کی مسجد ہے اور آج کل سر ظفر اللہ خاں بھی یہیں رہتے ہیں۔ میں نے اصرار کیا کہ مجھے احمدیوں کی لندن کی مسجد بھی دکھائیں اور چودھری صاحب سے بھی ملائیں۔ میرے کہنے پر ہم تینوں وہاں گئے۔

چودھری صاحب سے ملے۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ وہ اپنی بیماری کے متعلق بتاتے رہے' کافی کمزور اور بوڑھے لگ رہے تھے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

اس واقعے کو کیا سے کیا بنا دیا گیا؟

باقی رہا کہ اقبال کو بھائی سے محبت تھی' عزت کرتے تھے۔ اقبال نے بھائی کی تعریف اشعار میں کی ہے۔

یہ اشعار شروع کے ہیں۔ جب بچوں پر ظلم و ستم حد سے بڑھ گیا' جب معراج اپنے بھائی کی جدائی کی یاد میں تڑپ تڑپ کر مرگئی۔ پھر اقبال ان سے نفرت کرنے لگے۔ ظاہر نہیں کر سکتے تھے' کیونکہ بھائی کے بچپن کے احسانات (بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم کے اخراجات) کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ حالانکہ اس کے بعد علامہؒ سے ان کے بڑے بھائی اپنی خرچ کردہ رقم سے زیادہ وصول کر چکے تھے اور علامہؒ کو اپنی اولاد کے لیے وقف کر رکھا تھا۔

علامہؒ کی اہلیہ سردار بیگم (والدۂ جاوید اقبال) کے انتقال کے بعد ''جاوید منزل'' میں علی گڑھ سے آنے والی گورنس مس ڈورس احمد نے اپنی کتاب **Iqbal: As I Knew Him** میں شیخ عطا محمد کے بارے میں اپنے سال ہا سال کے تجربے کے بعد کیا خیالات ظاہر کیے تھے' بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ میری معروضات کو چھوڑیں' بے چاری ڈورس احمد کے الفاظ کو پڑھیں کہ ''وہ اپنے والدین پر اپنا رعب داب رکھتے تھے۔''

شیخ عطا محمد کے اپنے فرزند شیخ اعجاز احمد اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' کے صفحہ 62 پر لکھتے ہیں:

> جذباتی طور پر اس قدر قریب ہونے کے باوجود کئی باتوں میں ان کے مزاج ایک دوسرے سے مختلف تھے۔
>
> چچا جان ''جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم'' اور ابا جان ''دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان۔'' ابا جان ناراض ہوتے تو برسات کی اس گھٹا کا سماں ہوتا...... چچا جان ''حلقۂ یاراں ہو تو (بلکہ بچوں کے ساتھ بھی) ریشم کی

طرح نرم۔''

پھر جھوٹ کہ اقبال نے اپنے بیٹے کو قادیاں بھیجا تھا۔ عطا محمد نے اپنے بھائی کی ساکھ کو خراب کرنے کے لیے یا لوگوں پر یہ تاثر دینے کے لیے کہ اقبال احمدیت کا حامی ہے ایسا کیا تھا۔ اسی کو میں نے بڑے بھائی کا چھوٹے بھائی سے مذہبی انتقام قرار دیا تھا۔

اقبال بھائی کے ارتداد اور غلط مذہب ''احمدیت'' کو کب تک برداشت کرتے؟

1935ء میں انھوں نے انگریزی میں مضمون لکھا جس میں انھوں نے حکومت کو تجویز کیا کہ ''احمدیت'' کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں اسے علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے۔

''زمیندار'' اخبار میں ایک کھلا خط شائع ہوا کہ احمدیت یا قادیانیت ہرگز اسلام کا کوئی فرقہ نہیں ہے۔

1974ء میں پاکستان کی اسمبلی نے ایک بل پاس کیا اور ''قادیانی'' غیر مسلم قرار دیے گئے۔ اس کے بعد اب احمدی یا دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں یا باہر ملکوں میں بھاگ رہے ہیں۔ پاکستان میں اب یہ جماعت عالم نزع میں ہے۔

ایک انکشاف

شیخ عطا محمد کی بیوی نے بھی یہ مذہب قبول نہیں کیا تھا اور شیخ عطا محمد اس پر بہت ظلم ڈھاتے تھے۔ یہ بات مجھے آفتاب اقبال اور ان کی والدہ کریم بی بی صاحبہ نے بتائی تھی۔

شیخ اعجاز نے اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' میں اپنے والد شیخ عطا محمد کے قادیانی مذہب پر تفصیل سے لکھا ہے۔ آفتاب اقبال کے بارے میں ایک لفظ تک اس کتاب میں نہیں ہے اور علامہ اقبال کو غیر احمدی کا سرٹیفکیٹ عطا کیا گیا ہے۔

شیخ عطا محمد کے سلسلے میں شیخ اعجاز احمد کا اعتراف ''مظلوم اقبال'' صفحہ 187:

> ''ابا جان جماعتِ احمدیہ میں ابتدائی شامل ہونے والوں میں سے تھے۔ وہ ان 313 دوستوں میں سے ہیں جن کے نام بانی سلسلہ نے اپنی کتاب ''ضمیمہ انجام اتھم'' میں درج کیے ہیں۔ اس فہرست میں ان کا نام نمبر 224 پر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بانیِ سلسلہ سے ان کا ذاتی تعلق بھی تھا اور خط و کتابت بھی تھی۔ وفات کے بعد ان کی کتابوں کی الماری سے بانیِ سلسلہ کی تصنیف کردہ کئی کتابیں ملیں جن میں سے تین کتابیں تو حضور کے دستخطوں سے بھی مزین ہیں۔ ان کے کیش

بکس سے حضور کا دستخطی 21 دسمبر 1907ء کا ایک مکتوب بھی حفاظت سے رکھا ہوا ملا اور حضور کی شبیہ مبارک تو وفات تک ان کے کمرے کی زینت رہی ہے۔ پھر صفحہ 188 پر لکھتے ہیں:

خط کے ذریعے 1929ء کی بات ہے حضور نے بیعت منظور بھی کر لی تھی۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دو ایک سال کے بعد میرے ہمراہ قادیاں گئے اور میرے مواجہ میں دستی بیعت بھی کی۔ اس کی خبر روزنامہ ''الفضل'' کی 10 اپریل 1934ء کی اشاعت میں درج ہے۔''

اب ان کی اولاد مجھے معلوم نہیں قادیانی مذہب پر قائم ہے یا نہیں۔ لیکن ان کے چند رشتے دار یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ عطا محمد قادیانی نہیں تھے۔ آخر بیٹے سے بڑھ کر کون سچا ہو سکتا ہے جب کہ وہ ان کے قادیانی ہونے کے دستاویزی ثبوت بھی پیش کر رہے ہیں۔

شیخ اعجاز احمد کے دستاویزی ثبوت کے بعد عطا محمد قادیانی قرار پاتے ہیں اور ان کے نواسے کا انھیں حنفی المذہب قرار دینا شاید کسی مصلحت کے تحت ہے۔ میرا کام حقائق پیش کرنا تھا' اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔

شیخ صاحب ذرا ان کتابوں پر ایک نظر ڈالیں:

-1	قادیانی مذہب	پروفیسر محمد الیاس برنیؒ
-2	قادیانی قول و فعل	پروفیسر محمد الیاس برنیؒ
-3	قادیانیت	ابوالحسن علی ندویؒ
-4	حرفِ محرمانہ	ڈاکٹر غلام جیلانی برقؔ
-5	رئیسِ قادیاں	مولانا محمد رفیق دلاوریؒ
-6	الکاویۃ علی الغاویۃ	عالم آسی
-7	عالم گیر نبوت	سیّد محمد ہاشم فاضل شمسی
-8	مرزا غلام احمد	راحت ملک
-9	ربوہ کا مذہبی آمر	راحت ملک
-10	Ahmediyya Movement	قائم حسین جعفری
-11	سیف چشتیائی	پیر سیّد مہر علی شاہ گولڑوی
-12	شمس الہدایۃ	پیر سیّد مہر علی شاہ گولڑوی

13- غازی منجم اور قادیانی نبی — غازی منجم
14- نوازش نامے — سیّد انیس شاہ جیلانی
15- آپ بیتی — خواجہ حسن نظامی
16- قومی ڈائجسٹ (قادیانیت نمبر) (1984ء)

دو اقتباسات

1- مولوی فیروز الدین مرحوم (بانیٔ ادارہ فیروز سنز) اپنی آپ بیتی ''جہادِ زندگی'' صفحہ 42 پر لکھتے ہیں:

''حیرت ہوتی ہے ان لوگوں پر جو دعوے تو بڑے بڑے کرتے ہیں لیکن دنیا سے بے خبر اور بے احساس مر جاتے ہیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی اپنے کرشن ہونے پر لاہور میں لیکچر دینے آئے۔ تاریخ اور وقت مقرر ہو چکا تھا مگر اس سے صرف ایک رات پہلے انھیں ہیضہ ہوا اور وفات پا گئے۔ ایسے شخص کا جو پیغمبری کا دعویٰ کرتا ہو اپنی موت سے اتنا بے خبر ہونا نہ صرف باعثِ تعجب بلکہ قابلِ غور ہے۔ ہم صرف مسلمان ہیں، ولایت یا کشف کے دعوے دار نہیں لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ مرنے سے پہلے کچھ نہ کچھ اشارہ ہو جاتا ہے۔ تو ایک شخص جو مسیح ہونے کا دعویٰ کرے یوں بے خبر مر جائے۔''

2- مولانا وحید الدین خان ''الرسالہ'' بابت ماہ مئی 2000ء صفحہ 27 پر بیان کرتے ہیں:

''یہاں کچھ لوگ میری قیام گاہ (بیگم پٹ) آئے اور بتایا کہ وہ احمدی جماعت (قادیانی جماعت) سے تعلق رکھتے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے بارے میں جو دعویٰ کیا اس کی بنیاد دو میں سے کسی ایک ذریعہ علم پر ہو سکتی ہے۔ سائنس یا قرآن۔

میں نے کہا کہ سائنس سرے سے اس کو نہیں مانتی کہ کوئی زندہ خدا ہے جو انسان کے اوپر الہام کرتا ہے۔ اس لیے سائنس آپ کے دعوے کی بنیاد نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے دعوے کی بنیاد قرآن ہے۔ میں نے کہا کہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاتم الانبیاء ہونے کا اعلان کر چکا ہے۔ اس لیے قرآن کی بنیاد پر اس قسم کے دعوے کی سرے سے گنجائش نہیں۔ انھوں نے

قرآن کی کچھ آیتیں (مثلاً تتنزل علیھم) پیش کیں۔ میں نے کہا کہ ان آیتوں سے مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوے کی تائید نکالنا ایسا ہی ہے جیسے کچھ لوگ قرآن سے لفظ ودا (مریم 96) لے کر کہتے ہیں کہ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ وید بھی قرآن کی طرح آسمانی کتاب ہے۔ میں نے کہا' اس قسم کی باتیں استدلال نہیں بلکہ صرف اپنی بے علمی کا اشتہار ہیں۔

قادیاں کی یاترا

میری بھابھی' محمود نظامی مرحوم کی بیوی' مرزا جلال الدین کی پوتی تھیں۔ ان کے ماموں اور والدہ نے قادیانی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ میں اس زمانے میں نویں جماعت کی طالبہ تھی۔ اتنی سوجھ بوجھ نہیں تھی کہ احمدیت کیا ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ جس طرح صوفیا کے روحانی سلسلے ہیں (چشتی' قادری' سہروردی' نقشبندی) اس طرح کا کوئی سلسلہ ہوگا اور جیسے ہمارے خاندان کے افراد سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے مرشد قاری اللہ بچایاؒ کے مرید ہیں' یوں قادیاں میں بھی ان کے کوئی روحانی مرشد ہوں گے۔

غالباً 1940ء کی بات ہے کہ بھاوج نے مجھے بھی قادیاں چلنے کی دعوت دی۔ مزاجاً مجھے مختلف جگہیں دیکھنے کا شوق تھا اور میں نے یہ موقع غنیمت سمجھا اور گھر والوں سے ان کے ساتھ جانے کی اجازت چاہی۔ مجھے بڑی مشکل سے اجازت ملی۔ قصہ مختصر یہ کہ میں اپنے دل میں یہ تصور قائم کیے ہوئے تھی کہ قادیاں کوئی چھوٹا موٹا قصبہ ہوگا اور کچے اور نیم پختہ چھوٹے چھوٹے گھروندوں کی طرح مکانات ہوں گے۔ لیکن لاہور سے جب قادیاں پہنچی تو میں نے قادیاں کو اپنے تصورات سے بالکل مختلف پایا۔ یہاں صاف ستھری سڑکیں، سکول، مساجد، کوٹھیاں وغیرہ تھیں اور بجلی بھی تھی۔ سفر کی تھکاوٹ دُور ہوئی تو شام کو بھاوج کی امی جان نے مجھے احمدیت پر لیکچر دینا شروع کیا۔ وہ کہنے لگیں کہ مرزا غلام احمد نبی تھے۔ ان کے بعد ان کے خلیفۂ اوّل حکیم نورالدین تھے اور اب حکیم نورالدین کی وفات کے بعد دوسرے خلیفہ مرزا بشیرالدین محمود ہیں۔ مرزا صاحب غلام احمد قادیانی کے فرزند ہیں اور لوگ ان سے بیعت ہوتے ہیں۔

اس قسم کی معلومات فراہم کر کے وہ مجھے قادیانی امت میں دھکیلنے کے لیے زمین ہموار کر رہی تھیں۔ میں اپنے گھر والوں سے دور اکیلی اس دلدل میں پھنسنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے بچپن میں گھریلو ماحول کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسول سے کماحقہٗ آگاہی تھی اور دارالبنات کے مذہبی مدرسے کی تعلیمات میری گھٹی میں پڑی تھیں اور اتنے پاکیزہ ماحول میں تربیت پانے والی بچی کو آسانی سے اتنے مکروہ اور گھناؤنے جال میں نہیں پھانسا جا سکتا تھا۔ ان لوگوں کے عزائم سے آگاہی پا کر میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگی کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس شہر سے فوری طور پر نکل جانے کی سبیل نکالے اور میں واپس لاہور

چلی جاؤں۔

دوسرے روز میری خوب خاطر مدارات ہونے لگی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر سب مرزا بشیر الدین محمود کے حویلی نما بنگلے آ پہنچے۔ راستے میں' میں ہر چیز کو بغور دیکھتی رہی۔ بنگلے میں تھوڑی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے تو شاید یہ عورتوں سے ملنے اور انھیں بیعت سے مشرف کرنے کی مخصوص جگہ تھی۔ چاروں طرف کمرے ہی کمرے تھے۔ شاید ''اُم المومنین'' کے کمرے۔ ایک بیوی کا نام بھی عائشہ صدیقہ تھا۔ میری اس سے ملاقات ہوئی۔ خوب صورت نوجوان عورت تھی۔ مجھے مرتد بنانے کی کارروائیاں اپنے بام عروج پر تھیں۔ میں اپنی روحانی تربیت کے سہارے اتنی جلدی ان لوگوں کے دام تزویر میں پھنسنے والی نہیں تھی۔ خیر ہم تھوڑی دیر بعد خلیفہ صاحب کے سامنے جا بیٹھے۔ خلیفہ صاحب نے مجھے دیکھ کر خوشی کا اظہار فرمایا۔ میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پیار دیا۔ ارشاد ہوا کہ بیٹی طاہرہ مہمان بیٹی کو قادیاں کی سیر کرائیں اور انھیں مقدس مقامات دکھائیں۔ پھر ہم لوگ مرزا صاحب سے رخصت ہوئے اور ہماری سیر میں جنت البقیع، تعلیم الاسلام ہائی سکول، کئی اور سکول، مساجد اور بازار شامل تھے۔

اس سیر کے بعد پلٹے تو کھانا کھایا۔ میں نے مرزا بشیر الدین محمود اور احمدیت کے بارے میں مکمل سکوت اختیار کیا۔ صرف شہر کے بازاروں اور صفائی ستھرائی کے بارے میں رطب اللسان رہی۔ میری بھابھی کو جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ مجھ سے کھل کر مرید ہونے کی بات چیت کرے۔ پھر بھابھی صاحبہ نے کوشش کی کہ میں ان کے ماموں کے پاس بیٹھوں اور یوں مرزا صاحب کی بیعت کے لیے تیاری کا پلان تیار کیا جائے۔ میں نے سر درد کی شکایت کی اور اندر کمرے میں چلی گئی۔ دوسرے روز میں نے بھاوج سے کہا کہ وہ مجھے لاہور چھوڑ آئیں۔ یوں میں اور بھاوج واپس آ گئیں۔ وہ قادیاں کا پورا گروپ مجھے اپنے مشن میں بے بس نظر آیا۔ میں نے بھاوج کو بتایا کہ ان کے گھر والے اور ماموں مرتد ہو گئے ہیں۔ انھیں سمجھاؤ کہ وہ توبہ کر لیں تا کہ ان کا ایمان محفوظ ہو جائے۔ میں نے قادیاں کی سیر کا پورا واقعہ بھائی محمود نظامی کو بتایا۔ انھوں نے بھاوج کی خوب خبر لی۔ اس کے بعد میں نے بھاوج سے ملنا کم کر دیا۔

میرے بھائی مرزا افضل بیگ اور دوسرے اہل خانہ کو علم ہوا تو وہ مجھ پر بگڑے اور ڈانٹا کہ تم آئندہ اکیلی نہیں جاؤ گی۔

میرا تاثر

مجبور اور غریب لوگوں کو خوش حالی کا جھانسا دے کر انھیں مرتد کیا جا رہا ہے۔ لوگ غربت کو مٹانے کے لیے اپنا ایمان فروخت کر رہے ہیں اور یہ بے چارے لوگ اپنا ایمان بڑا سستا فروخت کر

رہے ہیں۔ یہ جھوٹا مذہب ایک روز ختم ہو کر رہے گا۔ بہت سے لوگوں نے جھوٹی نبوت کا دعویٰ کیا۔ عورتوں نے بھی اس کارِ قبیح میں حصہ لیا اور آج کل کچھ آثار بتا رہے ہیں کہ عنقریب ایک لیڈی پیغمبر دعوائے نبوت کرنے والی ہیں۔

جھوٹے نبی آئے اور چند روزہ زندگی گزار کر راہی ملک عدم ہوئے۔ اس چند روزہ زندگی میں ایک خدا اور اس کے نبی برحق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان ہی ہمیں اس دنیا کے ثمرات سے بہرہ ور کر سکتا ہے۔ جھوٹے نبی بے چارے بڑے اونچے اونچے دعوے کرنے والے اپنے انجام سے بے خبر چل بسے۔ ہمارے لیے یہ سامانِ عبرت ہے' اچھا شیخ عبدالماجد صاحب آپ کا قلم اب نہ جانے کس راہ پر چل نکلے۔ مجھے سادہ انداز میں جو کہنا تھا کہہ دیا۔ اب یہ باتیں جلی کٹی نہیں ہیں' میری زندگی کا تلخ تجربہ ہیں اور شاید اب آپ اپنے جھوٹے مذہب کو بیچ چوراہے پر دیکھ سکیں۔ حقائق کو کب تک چھپا کر خلقِ خدا کو گمراہ کیا جا سکتا ہے!؟

علامہ اقبالؒ اور قادیانی

علامہ اقبال نے ایک مقام پر کہا ہے:

''اگر قادیانی مسلمان ہیں تو مسلمان غیر مسلم قرار پائیں گے۔''

20 جون **1933**ء کشمیر کمیٹی سے استعفے پر بیان:

بد قسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں' جو اپنے مذہبی فرقے (قادیانیت) کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں۔ مجھے ایسے شخص سے ہمدردی ہے' جو کسی روحانی سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی مقبرے کا مجاور یا کسی زندہ نام نہاد پیر کا مرید بن جائے۔

مولانا ظفر علی خان اور قادیانی

اگر چندے کی حاجت ہے تو کر دعویٰ رسالت کا
بغیر اس ڈھونگ کے چندہ مہیا ہو نہیں سکتا
سنا ہے قادیاں میں بانسری بجتی ہے گوکل کی
مگر ہر بانسری والا کنہیا ہو نہیں سکتا
یہ آساں ہے کہ بدلے جون اور بچھو بنے لیکن
کبھی بھی شہد کی مکھی تتیا ہو نہیں سکتا

اگر کے سے بھی وہ ڈھچوں ڈھچوں کرتا آ جائے
قیامت تک خرِ عیسیٰ گویا ہو نہیں سکتا
مجدد الف ثانیؒ سے غلام احمد کو کیا نسبت
ثریٰ کتنا بھی اونچا ہو ثریا ہو نہیں سکتا
برادر خواندگی کی شرط اگر رکھی ہے مرزائیت
قیامت تک بھی ہم سے یہ تو بھیا ہو نہیں سکتا
سرشتِ مردِ مومن کا بدلنا غیر ممکن ہے
چنبیلی کا یہ پودا بھٹ کٹھیا ہو نہیں سکتا
وطن کے پوجنے والو تعلق نوعِ انساں کا
تلاطم سے محبت کا تلیا ہو نہیں سکتا
جسے اسلام کی عزت پہ کٹ مرنا نہ آتا ہو
مسلمانوں کے بیڑے کا کھویا ہو نہیں سکتا

ارشادِ باری تعالیٰ

مومنو! اگر تم کافروں کا کہا مان لو گے تو وہ تم کو اُلٹے پاؤں پھیر (کر مرتد کر) دیں گے پھر تم بڑے خسارے میں پڑ جاؤ گے۔
(یہ تمھارے مددگار نہیں ہیں) بلکہ اللہ تمہارا مددگار ہے اور وہ سب سے بہتر مدد گار ہے۔

ڈاکٹر وحید عشرت

''مظلوم اقبال''

''مظلوم اقبال'' کتاب کی طرف فوری طور پر متوجہ ہونے کی دو وجوہات ہیں، پہلی تو اس کا نام ہے کہ قاری اسے پڑھتے ہی چونک جاتا ہے اور سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اس کتاب میں حکیم الامت علامہ اقبال کے حوالے سے متعدد ایسی غلطیوں کی نشاندہی کی کوشش کی گئی ہوگی جس سے علامہ کی شخصیت کو گھٹانے، مسخ کرنے یا ان کے بارے میں غلط بیانیوں پر مبنی باتیں پھیلانے کی کوشش کی گئی ہوگی، تاہم کتاب کو دیکھ کر خاصی مایوسی ہوتی ہے کہ بہت معمولی قسم کی واقعاتی اور تاریخی باتوں میں اختلاف کے سوا فاضل مصنف نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے کتاب کے نام کا جواز پیدا کیا جاسکے۔ اس کتاب کے اس نام کی شانِ نزول جو انھوں نے بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی صاحب قرآن کریم کی تفسیر لکھ رہے تھے تو علامہ نے اس پر فرمایا کہ ایک زمانے میں حسینؓ مظلوم تھے، ان دنوں قرآن مظلوم ہے کہ جو اٹھتا ہے اس کی تفسیر لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔

اقبال کی مظلومیت کے لیے شیخ اعجاز کے بیانات کی حقیقت

شیخ صاحب نے مظلوم اقبال کے جواز میں دوسری روایت فیض احمد فیض کی بیان کی ہے۔ کہتے ہیں، روزنامہ جنگ کے زیر اہتمام منعقدہ ایک مذاکرے میں فیض احمد فیض نے کہا کہ ''آج کل کے دور میں اگر شعراء میں سب سے مظلوم کوئی ہے تو وہ علامہ اقبال ہیں۔ ہر نقاد اور مبصر اقبال کو اپنے نظریات اور خیالات اور عقائد کی اقلیم میں کھینچ تان کر لانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے حضرات علامہ اقبال کا کوئی نہ کوئی مصرعہ یا شعر اپنے خیالات کی تائید کے لیے پیش کر دیتے ہیں۔''

مظلوم اقبال نام رکھنے کے لیے شیخ صاحب نے ان دو واقعات سے استدلال فرمایا ہے کہ ان الفاظ میں اقبال بھی مظلوم ہے کہ ان پر ہر کہ و مہ لکھ رہا ہے اور عجیب عجیب فرضی روایات ان سے منسوب کر رہا ہے۔ چنانچہ شیخ صاحب نے اس کتاب میں بالخصوص مولانا عبدالمجید سالک، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی،

خالد نظیر صوفی اور جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتابوں کو مختلف حوالوں سے ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب زندہ رود کو حرفِ آخر اور مستند کتاب قرار دینے کے باوجود محض اس لیے نشانۂ تنقید بنایا ہے کہ اس میں علامہ اقبال کے خاندان ماں' باپ' بھائی اور دوسرے عزیز و اقارب کے قادیانی ہونے کی مستند اور مدلل حوالوں سے تردید کی گئی ہے۔ دوسروں کی روایت کو سنی سنائی اور ساقط الاعتبار قرار دیتے ہوئے وہ خود جن روایات کو بیان کرتے ہیں' وہ سنی سنائی اور قادیانی جماعت کے تشہیری بیانات پر مشتمل ہیں۔ اکثر جگہ ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ خود کوئی مستند حوالہ دینے کی بجائے اپنی روایت کی ہوئی بات کو بلا دلیل مستند سمجھتے ہوئے دوسروں کے دلائل کو رد کرتے ہیں۔ متعدد جگہ خود انھوں نے بالخصوص قادیانیت کے حوالے سے جو گھپلا کیا ہے' اس سے ان کی دوسری روایتوں کی صحت کا حال بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

دوسری وجہ جو شیخ صاحب نے اس کتاب کے ضمن میں فیض احمد فیض کے حوالے سے بیان کی ہے' وہ بھی کوئی لائقِ اعتناء نہیں۔ اقبال ایسی قد آور شخصیت پر جو اسلامی نشاۃِ ثانیہ کی علامت ہے اور عصرِ حاضر میں مسلمانوں کے عمرانی، سیاسی، فکری اور الٰہیاتی مسائل کے بارے میں روشنی دینے والی بصیرت ہے۔ اقبال کا نام دنیا میں اسلامی قوتوں کے لیے سرچشمۂ طاقت ہے جس نے برصغیر کی سیاسی بساط کے تمام مُہروں کو مات دی اور انگریز اور ہندو کی شاطرانہ سیاست کی چالیں الٹ دیں۔ انھوں نے انگریز اور ہندوؤں کی چالوں سے متذبذب مسلمانوں کو دو قومی نظریہ اور علیحدہ وطن کا نصب العین دیا۔ ان پر جس قدر لکھا جائے کم ہے' پھر ابھی اقبال پر مواد جمع ہونے کا مرحلہ ہے۔ ایک وقت پھر ایسا آئے گا' جب اس مواد کو جانچا اور پرکھا جائے گا۔ ایسے میں اقبال کی اس ہمہ گیر اور جادو اثر شخصیت پر بہت سی مستند کتب کے ساتھ ساتھ بہت سی غیر مستند کتب بھی شائع ہوئی ہیں تو اس سے اقبال کو مظلوم نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا جادو ہے جس نے پوری دنیا کو ان کی طرف متوجہ کر دیا۔ پھر اگر یہ کہا جائے کہ فکرِ اقبال کو سب سے زیادہ بگاڑنے کی کوششیں فیض نہیں تو اس کے نظریاتی بھائی بندوں نے زیادہ سرانجام دی ہیں تو مضائقہ نہیں اس لیے کہ کمیونسٹ پارٹی کا یہ واضح اشارہ ہے کہ اگر تم کسی فکر اور نظریے کو رد نہیں کر سکتے تو اس کو مختلف تعبیرات اور توجیہات کے ذریعے اتنا الجھا دو کہ وہ اپنی ہیئت کھو دے۔ اقبال کو اشتراکیانے کی مختلف جہات سے کوششیں اسی ذیل میں آتی ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود اقبال کا اپنا ایک تشخص ہے اور اپنی الگ شناخت ہے جو ان پر طوائف کو قتل کرنے' شراب نوشی اور رندی و سرمستی کے بہتانوں اور اتہامات کے باوجود کبھی کم نہیں ہوا۔ لہٰذا اقبال کو مظلوم بنانے یا ثابت کرنے کا شغل کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کتاب کا عنوان نہایت کچا اور بودا ہے۔ سستی جذباتیت کے ذریعے کچھ مقاصد کے لیے ہمدردی حاصل کرنے کی ایک بھونڈی کوشش ہے تاہم لوگوں کو چونکا دینے اور

کتاب کی سیل ویلیو بڑھانے کے لیے ایسے نام کسی طور پر مفید قرار دیے جاسکتے ہیں مگر اس عنوان سے کتاب کی معنویت ثابت نہیں کی جاسکی۔

مظلوم اقبال کے مطالعہ کی دوسری وجہ

اس کتاب کی مقبولیت کی دوسری وجہ ظاہر و باہر ہے کہ یہ کتاب علامہ اقبال کے ''صالح'' بھتیجے کے قلم سے لکھی گئی ہے لہٰذا اس میں ایسے متعدد نئے انکشافات ہوں گے جن سے علامہ اقبال کی زندگی کے کچھ نئے گوشے منور ہوتے ہوں گے۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے۔ اس کتاب میں بہت سے خطوط بھی ہیں جو معلومات افزا اور نئے بھی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اہم اور مفید ہے۔ اس کتاب میں 103 خطوط شیخ صاحب نے شامل کیے ہیں جو کتاب کو اقبال شناسوں میں وقیع بنانے کے لیے کافی ہیں۔ شیخ صاحب نے اپنی کتاب میں جو شجرۂ نسب درج کیا ہے وہ تقریباً وہی ہے جو جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی کتاب میں دیا ہے۔ صرف عبدالرحمٰن کے بیٹے احمد کی اولاد میں اختلاف ہے۔ شیخ صاحب نے اس کی تفصیل یوں درج کی ہے۔ احمد کی اولاد میں سراج دین' تاج دین' حاکم بی بی' زینب' احمد دین اور حیات شامل ہیں جبکہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے احمد کی اولاد کی تفصیل یوں دی ہے۔[1] کہ سراج الدین' تاج دین' حاکم بی' زینب بی' حسن بی' احمد دین اور حیات۔ یعنی حسن بی ڈاکٹر صاحب کے شجرہ میں ایک اور نام ہے جو شیخ صاحب کے شجرہ میں رہ گیا ہے۔

کتاب میں ایک اور بات بڑی نمایاں ہے۔ شیخ صاحب علامہ اقبال کا ذکر چچا جان کے بطور کرتے ہیں یا کہیں علامہ اقبال بھی لکھتے ہیں تو بڑی ملائمت' محبت اور چاہت سے ذکر کرتے ہیں۔ کتاب میں کئی جگہ انھوں نے علامہ کا دفاع بھی کیا ہے۔ خصوصاً شراب نوشی کی روایات کو غلط قرار دیا ہے اور یہ شہادت دی ہے کہ انھوں نے انھیں ایسا کرتے کبھی نہیں دیکھا بلکہ ایک محفل میں تو اقبال نے کہا کہ میں نے تو یورپ میں بھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ پھر ڈاکٹر اجمل اور سلیم احمد کے اس موقف کو بھی سختی سے رد کیا ہے کہ علامہ اقبال کو کوئی نفسیاتی یا جنسی عارضہ[2] تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''پچھلے چند سالوں میں دو ایک دانشوروں نے ماہر نفسیات کا لبادہ اوڑھ کر علامہ کی تحریروں کی روشنی میں ان کی نفسیات کا جائزہ لینے کے بہانے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں۔ ایک کہتے ہیں' اقبال نہ زبان کے شاعر ہیں نہ رعایتِ لفظی کے۔ نہ صنائع بدائع کے اور جذبات و محسوسات کے۔'' ان کے خیال میں وہ تصورات اور خیالات کے شاعر ہیں اور تصورات و خیال بھی روایتی

نہیں ان کے اپنے ہیں؟'' پھر وہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ''خیالات کی شاعری اچھے یا برے معنوں میں شاعری ہوتی بھی ہے یا نہیں؟'' دوسرے لفظوں میں ان کے نزدیک علامہ اقبال کی شاعری شاعری ہی نہیں۔ یہاں تو خیر علمی بات تھی۔ ہر کس بہ خیالِ خویش خبطے دارد۔ غالب کے متعلق ان کی زندگی میں، مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے، کہا جاتا تھا۔ گر نہ بیند بروز شپرہ چشم۔ لیکن علامہ کی شاعری پر اعتراض سے ان کے حسد کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی۔ فرماتے ہیں کبھی کبھی میرے دل میں ایک خطرناک خیال آتا ہے لیکن میں کسی ذریعے سے اس کی تصدیق نہیں کر سکتا۔ کیا علامہ کسی خطرناک جسمانی (جنسی) عارضے میں مبتلا تھے؟ ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے۔

دوسرے دانشور ماہر نفسیات کی رائے میں اقبال 'کامل مرد نہیں تھے۔'

لیکن وہ یہ نہیں فرماتے کہ یہ انکشاف ان پر کیسے اور ان کی کس تحریر سے ہوا۔ رشید احمد صدیقی ایسی تحریروں کے متعلق اپنی رائے کا اظہار اپنے ایک مضمون میں کر چکے ہیں جس کے بعد ان ہفوات کے متعلق مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔''[3]

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر محمد اقبال کے بارے میں ایسی کچی اور ناپختہ باتوں کا نوٹس لیتے وقت اپنا سارا وزن علامہ کے پلڑے میں ڈالا ہے اور ہر اس شخص کی خبر لینے کی کوشش کی ہے جو ان کے ہاتھ آیا اور یہاں ان کی زبان علامہ کے حق میں بڑی زوردار اور جاندار ہے۔ تاہم جہاں قادیانیت کے بارے میں علامہ کا مؤقف بیان کیا ہے وہاں خود ان کا اپنا لہجہ علامہ کے بارے میں غیر ثقہ' غیر ہمدردانہ بلکہ افسوسناک حد تک جارحانہ ہے اور انھوں نے ہر چھوٹا بڑا دہ واقعہ بیان کر دیا ہے جو کسی صورت بھی علامہ کے قادیانیت سے تعلق کو ظاہر کر سکتا ہو۔ یہاں ان کا اور جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال دونوں کے بارے میں لہجہ تلخ اور کڑوا ہے۔

مظلوم اقبال کے مذموم مقاصد

اگر شیخ صاحب کی کتاب کو قادیانیت کے تناظر میں دیکھا جائے تو اقبال سے بڑا واقعی کوئی مظلوم نہیں۔ انھوں نے نہایت چابکدستی سے غیر متعلقہ اور جزوی واقعات کے حوالے سے اقبال کو قادیانیت کے کیمپ میں دھکیلنے کی کوشش کی ہے اور علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد' والدہ کریم بی بی' بھائی جو ان کے والد ہیں' بھابھی جی جو ان کی والدہ ہیں اور اپنی پھوپھیوں سب کو ایک ہی ہلے سے قادیانی بنا دیا

ہے اور ان پر اس سے زیادہ ظلم اور کیا ہوگا کہ ان کی سند بھی شیخ صاحب کی یہ ہے کہ انھوں نے اپنی بھابھی (والدہ) اور پھوپھیوں سے ایسا سنا۔ اقبال اس لحاظ سے مظلوم اور بدقسمت ہے کہ خود اس کے چہیتے بھتیجے نے جوان سے پیار اور محبت کا مدعی ہے ان کے عقائد پر حملہ کیا ہے اور اپنے عقائد کے استناد کے لیے علامہ اقبال کی شہرت کو بلیک میل کیا ہے۔ ورنہ ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کی کتاب زندہ رُود جسے وہ حرف آخر اور مستند قرار دیتے ہیں کے اقبال اور احمدیت کے سلسلے میں دلائل کے بعد اس کتاب کا کیا جواز تھا۔ اگر یہ کتاب زندہ رود سے پہلے آئی ہوتی تو اس کا ایک جواز مان لیا جاتا۔ مگر ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کو خاندانِ اقبال کے قادیانی ہونے کے بارے میں اپنے دلائل کی مکمل تفصیل دینے اور شائع کرانے کے بعد ان کا مظلوم اقبال کے نام سے کتاب لکھنا ان کے کچھ دوسرے مقاصد کی نشاندہی کرتا ہے جو ان سے چھپائے نہیں چھپتے۔ اگر مظلوم اقبال سے پہلے یا اس کے پڑھنے کے بعد کوئی غیر جانبدار شخص زندہ رود کی تیسری جلد کے صفحات 551 تا 599 پڑھے تو قادیانیت کے بارے میں علامہ اقبال کے خاندان اور اقبال کا پورا موقف دلائل کے ساتھ مفصل طور پر سامنے آ جاتا ہے اور شیخ اعجاز احمد کے دلائل کی قلعی کھل جاتی ہے۔ انھوں نے محض اپنے خونی اور خاندانی رشتے کے بل پر علامہ اقبال جو اس ملک کے نظریہ ساز ہیں کے دل میں قادیانیت کے لیے نرم گوشہ ثابت کرنے کے لیے جو ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے اس کی وجہ ملک کی وہ صورت حال ہے جس میں قادیانیت کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جا چکا ہے۔ ایسے وقت میں اس کتاب کی بڑے اہتمام کے ساتھ اشاعت دراصل اس سبب سے ہے کہ علامہ اقبال کے ساتھ قادیانیت کو نتھی کر کے یہ ثابت کیا جائے کہ اس ملک میں جس کی بنیاد فکر اقبال پر ہے وہاں قادیانیت کو جس سے وہ ہمدردی رکھتے تھے غیر مسلم اقلیت قرار دیا جانا مناسب نہیں۔ شیخ صاحب کے یہ بیان کہ اقبال پر احراریوں کا اثر تھا جس کی بنا پر انھوں نے 1935ء میں سیاسی دباؤ کے تحت قادیانیت کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی حمایت کی' کے پس منظر میں شیخ صاحب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے پیچھے احراریوں کی ہی تحریک ہے۔

کیا اقبال 1935ء تک قادیانیت کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے؟

مظلوم اقبال میں یوں تو پوری کتاب کے بین السطور میں اقبال کی مظلومیت کی آڑ میں قادیانیت کی نام نہاد مظلومی کا رونا رو دیا گیا ہے اور اقبالیات کے پردے میں قادیانیت کو پیش کیا گیا ہے مگر شیخ صاحب کھل کر اپنی کتاب میں باب 32 اور 33 میں سامنے آئے ہیں۔ باب 32 کا عنوان ہے ''زندہ رود۔ علامہ اقبال کے سوانح حیات'' اور باب 33 کا عنوان ہے ''علامہ اقبال اور احمدیت'' زندہ

رود کے بارے میں ان کی رائے ہے:

> ''زندہ رود کی اشاعت سے پہلے علامہ اقبال کے سوانح حیات کی کوئی مستند کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔ زندہ رود نے اس کمی کو احسن طریق سے پورا کر دیا ہے۔ اس میں صرف ان کے نجی زندگی کے حالات ہی نہیں ان کے افکار اور نظریات کے بتدریج ارتقا کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ میں کوئی نقاد نہیں لیکن اقبالیات کے ایک قاری کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ علامہ کے سوانح حیات پر یہ کتاب حرفِ آخر سمجھی جائے گی۔''[4]

اس ابتدائی تمہید کے بعد شیخ اعجاز لکھتے ہیں کہ انھوں نے جسٹس جاوید اقبال کو لکھا کہ وہ اقبال اور احمدیت کے بارے میں صحیح صورتِ حال پیش کرنا چاہتے ہیں جس پر ڈاکٹر جاوید اقبال نے انھیں لکھا کہ وہ اقبال اور احمدیت کے موضوع پر ایک مفصل نوٹ بھیج دیں تو وہ اختلاف کے باوجود اسے شائع کر دیں گے۔ چنانچہ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے وہ نوٹ کتاب میں شامل کر دیا جو زندہ رود کی جلد سوم کے بیسویں باب میں شامل ہے۔ جسٹس جاوید اقبال کی طرف سے ان کے موقف کی شمولیت پر شیخ صاحب نے اظہارِ انبساط کیا ہے اور اسے جاوید اقبال کی طرف سے اعلیٰ جوڈیشل کی مثال قرار دے کر کہا ہے کہ ان کا اگلا باب اسی کے ترمیم و اضافے پر مشتمل ہے۔ مختصر اًزندہ رود اور اقبال اور احمدیت کے ابواب میں شیخ صاحب نے بنیادی طور پر جو باتیں کی ہیں ان کا جواب مفصل طور پر جسٹس جاوید اقبال نے اپنی کتاب زندہ رود کی جلد سوم میں دے کر یہ فرض چکا دیا ہے۔ یہاں ہم قارئین کے استفادے کے لیے مختصراً اس بحث کا تذکرہ کرتے ہیں۔ شیخ صاحب کا بنیادی موقف یوں ہے کہ:

1- ''1935ء سے قبل احمدیت کے دو ایک عقائد سے اتفاق اور دو ایک سے سخت اختلاف کے باوجود چچا جان احمدیوں کو قطع نظر ان کے عقائد کے مسلمانوں کا ہی ایک فرقہ سمجھتے تھے اور جماعتِ احمدیہ کو دائرہ اسلام سے خارج قرار نہ دیتے تھے۔

2- ''اپنی حیات کے آخری تین چار سالوں میں چچا جان نے احمدیت کے خلاف جو محاذ کھڑا کیا، اس کی ابتداء مئی 1935ء میں ہوئی۔ بیان کا ماحصل یہ تھا کہ چونکہ احمدی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ختم نبوت کے قائل نہیں اس لیے دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ بیان میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم اس جماعت کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اس مطالبہ پر سٹیٹس مین میں اس پر تنقید ہوئی اور نہرو نے رسالہ ماڈرن ریویو کلکتہ

میں تنقیدی مضامین شائع کیے۔

3- ''معلوم ہوتا ہے ان مضامین سے علامہ اور برافروختہ ہوئے۔ نہرو کی تنقید سے انھیں احمدی کانگریسی سیاسی گٹھ جوڑ کا شبہ ہوا جو بے بنیاد تھا۔ انھوں نے ایڈیٹر سٹیٹس مین کے اداریے کے جواب میں ان کو ایک خط لکھا (2) اور پنڈت نہرو کے جواب میں بھی ایک مفصل وضاحتی بیان میں اپنے پہلے بیان کا اعادہ کیا (3) ان سب تحریروں کا لب لباب وہی ہے جو پہلے بیان کیا گیا ہے۔''

4- ''احمدیوں کے متعلق ان کے تکفیری بیانات کو مسلمانوں کے سنجیدہ حلقوں میں بھی تعجب سے پڑھا گیا۔ اوّل اس لیے کہ چچا جان تو ملاؤں کے شغلِ تکفیر بازی کو ناپسند کرتے تھے کیونکہ وہ خود بھی اس اوچھے اور کثرتِ استعمال سے کند شدہ ہتھیار سے گھائل ہو چکے تھے۔ دوسرے اس لیے کہ احمدیوں کے دو ایک عقائد سے اتفاق اور دو ایک سے اختلاف کے باوجود علامہ عمر بھر اپنے قول و فعل سے احمدیوں کو مسلمانوں کا ایک فرقہ تسلیم کرتے تھے اور مئی 1935ء سے قبل انھوں نے کبھی احمدیت کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار نہیں کیا تھا اور اس وقت تک بانیٔ سلسلۂ احمدیہ اور ان کے دو جانشینوں کے متعلق ان کی رائے عقیدت مندانہ رہی تھی۔''

قادیانیت کے خلاف اقبال کا تاریخی معرکہ

اس کے بعد شیخ صاحب علامہ اقبال کے 1935ء کے قبل کے رویے کو زیر بحث لاتے ہوئے متعدد مثالیں دیتے ہیں جن سے علامہ اقبال کے قادیانی جماعت کے بانی، حکیم نورالدین، بشیرالدین محمود وغیرہم سے ملاقاتوں اور تعلقات کا ذکر ہے کہ اگر اقبال کو شکایت ہوتی تو وہ ایسا کیوں کرتے۔ اقبال سے بھی اس قسم کا سوال کیا گیا کہ پہلے تو آپ قادیانیت کی کسی نہ کسی پہلو سے تعریف کرتے تھے مگر اب آپ کا رویہ کیوں تبدیل ہو گیا ہے؟ آپ کے خیالات میں تناقض کیوں ہے؟ چنانچہ ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر کے حوالے سے اقبال نے جو جواب دیا وہ یوں ہے:

> ''مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس نہ وہ تقریر اصل انگریزی میں محفوظ ہے اور نہ اس کا اردو ترجمہ جو مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ تقریر میں نے 1911ء یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں

کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ اس تقریر سے بہت پہلے مولوی چراغ علی مرحوم نے جو مسلمانوں میں کافی سربرآوردہ تھے اور انگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، بانی تحریک کے ساتھ تعاون کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کتاب موسومہ ''براہینِ احمدیہ'' میں انھوں نے بیش قیمت مدد پہنچائی لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہیے۔ تحریک کے دو گروہوں کے باہمی نزاعات اس امر کے شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانیِ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے، معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی۔ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اُس وقت بیزار ہوا تھا' جب ایک نئی نبوت...... بانیِ اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی۔ جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویے میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔''[5]

یہاں شیخ صاحب سے صرف اس قدر کہنا ہے کہ اقبال نے قادیانیت کے خلاف محاذ کھڑا نہیں کیا بلکہ اپنے سوا تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے کر ان کا سوشل بائیکاٹ کر کے اور ان کے نماز و جنازہ میں شرکت سے انکار سے قادیانیت نے تمام مسلمان امت کے خلاف محاذ کھڑا کیا۔ اگر وہ پوری امتِ مسلمہ کو اپنے عقائد کی رُو سے کافر کہہ سکتے ہیں یا تقیہ کر کے کافر نہیں کہتے صرف دل سے سمجھتے ہیں تو جمہور مسلمانوں اور ان کے ایک ممتاز قومی اور سیاسی لیڈر کی طرف سے غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے مطالبہ پر کس اخلاقی اصول کے تحت سیخ پا ہوتے ہیں۔ مسلمانوں نے قادیانیوں سے خود کو نہیں کاٹا بلکہ قادیانیوں نے خود کو مسلمانوں سے کاٹ کر خود کو کافر کہلوانے اور غیر مسلم اقلیت بننے کی راہ ہموار کی ہے۔ اس کے باوجود شیخ صاحب تصویر کا یہ رُخ دکھاتے ہیں کہ اقبال نے قادیانی جماعت سے بہتری کی توقعات بھی رکھیں اور بعض مواقع پر ستائش بھی کی۔ مگر اس طرف نہیں آتے کہ جماعت احمدیہ سے اقبال کے وہ اختلاف کیا تھے' جنھیں شیخ صاحب خود' سخت اختلاف کہتے ہیں اور نہ وہ ان اختلافات کا ذکر کرتے ہیں

جو 1901ء کے مرزا قادیان کے دعویٰ نبوت کے بعد اقبال کے ہاں پیدا ہوتے ہیں اور جس کا اظہار اقبال نے 1902ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں اس شعر سے کیا:

اے کہ بعد از نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک
بزم را روشن زنُورِ شمع عرفان کردۂ 6

پھر 1914ء میں انھوں نے ایک بیان دیا کہ:

''جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی ایسے نبی کا قائل ہے جس کا انکار مستلزم کفر ہو وہ خارج از اسلام ہوگا۔ اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔'' 7

اس سے صاف مترشح ہے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اور کافر سمجھنے کا اقبال کا رویہ 1935ء میں سامنے نہیں آیا بلکہ وہ 1902ء اور 1914ء یعنی ایک تواتر کے ساتھ اس مسئلہ کا سنجیدگی سے نوٹس لے رہے تھے اور اس جماعت کے عقائد کو اسلام کے منافی تصور کرتے تھے۔ 1902ء میں ہی انھوں نے مئی 1902ء کے مخزن اور 11 جون کے محمد دین فوق کے ''پنجۂ فولاد'' میں نظم شائع کرائی جس میں قادیانی مذہب کے نتائج کا تجزیہ کیا۔

تُو جدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
اس عبادت کو کیا سراہوں میں
مرگِ اغیار پر خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہوں میں 8

اس میں قادیانیت کی طرف سے منافرت' بھائی بھائی میں تفریق اور مرزا قادیان کی طرف سے دوسروں کے لیے موت کی پیش گوئیوں پر تنقید کی گئی ہے اور ان کے رویہ کو غیر پیغمبرانہ بتایا گیا ہے۔ یہ تو شیخ صاحب کے اس خیال کا جواب ہے کہ وہ 1935ء سے قبل قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج نہیں سمجھتے تھے۔

جملہ معترضہ کے طور پر ہم یہ بھی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اگرچہ 1901ء میں دعویٰ نبوت کر دیا تھا مگر وہ پوری جرأت کے ساتھ کبھی بھی اس پر قائم نہ رہا' کبھی خود کو مسیح موعود' کبھی مہدی' کبھی مصلح' کبھی ظلی نبی' کبھی بروزی نبی یعنی کبھی کچھ اور کبھی کچھ کے دعووں میں الجھتا رہا

تاکہ وہ ہر موقع پر حسب منشاء اس کی تاویل کر سکے۔ خود نورالدین نے مرزا قادیان کو کبھی نبی تسلیم نہ کیا بلکہ اسے دعویٰ نبوت سے کسی حد تک باز رکھنے کی کوشش بھی کی۔ خود حکیم نورالدین نے اپنے عہد خلافت میں کبھی مرزا قادیان کو نبی نہ کہا اور نہ مانا۔ یہ مرزا غلام احمد قادیانی کا بیٹا بشیر الدین محمود تھا جس نے حکیم نورالدین کی وفات کے بعد خلیفہ بنتے ہی اپنے باپ کی نبوت کو منوانا شروع کر دیا اور یوں مرزا قادیانی' بشیر الدین محمود کے ہاتھوں ''پکا'' نبی بن گیا ورنہ وہ تو ساری عمر مختلف اور متضاد دعووں کے درمیان ہی گھرا رہا۔ اس کے باوجود 1901ء میں جب علامہ کے کان میں اس جھوٹی نبوت کی بھنک پڑی تو انھوں نے شرک فی النبوت کہہ کر اس کا فوری نوٹس لیا۔ پھر بلاشک 1911ء میں اس اعتراف کے باوجود کہ قادیانیوں نے ''ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ'' بننے کی سعی کی ہے محض دعویٰ نبوت کی بنا پر انھیں 1914ء میں اپنے بیان کے ذریعے اسلام سے خارج کہا۔ چنانچہ 1935ء تک قادیانیت جس طرح عمرانی' تہذیبی اور سیاسی قوت بننے کے لیے ہاتھ پیر مار رہی تھی' اس کے ممکنہ نتائج کو محسوس کر کے اقبال نے اسے غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کر دیا۔

کشمیر اور پنجاب کو قادیانی صوبہ بنانے کی سازش

جہاں تک شیخ صاحب کے دوسرے نکتہ کا تعلق ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی حیات کے آخری سالوں میں قادیانیت کے خلاف محاذ کھڑا کیا، وہ یوں غلط ہے کہ ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ 1902ء اور 1914ء میں وہ قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے تھے اور 1901ء میں مرزا قادیان کے دعویٰ نبوت کو انھوں نے شرک فی النبوت قرار دیا اور 1914ء میں اپنے بیان میں واضح کر دیا کہ اگر قادیانی جماعت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نبوت کی قائل ہے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ 1935ء میں علامہ نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا مطالبہ کیوں کیا؟ اس کی وجہ شیخ صاحب سیاسی تصور کرتے ہیں تو وہ حق بجانب ہیں اس لیے کہ 1935ء میں صوبائی اسمبلیوں کا انتخاب ہونا تھا اور مرکزی اسمبلی کا انتخاب ان ہی صوبائی اسمبلیوں سے ہونا تھا۔ اب صورت یہ تھی کہ فضل حسین اور ظفر اللہ خان کے گٹھ جوڑ سے یہ خدشہ تھا کہ ان انتخابات کے نتیجے میں در پردہ قادیانی صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں نہ پہنچ جائیں اور اپنے ناموں سے جمہور مسلمانوں کو دھوکہ دے کر کانگریس کے ہاتھ میں مسلمانوں کے مفادات فروخت نہ کر دیں' اور قادیانی انگریز اور کانگریس کے ساتھ مل کر علیحدہ وطن کے منصوبے کو سبوتاژ نہ کر دیں۔ یہ خدشہ تھا جس کی بنا پر اقبال چاہتے تھے کہ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات سے قبل مسلمانوں کی وحدت کے اندر نقب لگانے والی جماعت کو غیر مسلم قرار دے کر بے نقاب کر دیا جائے۔

جہاں تک قادیانیت کی طرف سے ظفر اللہ خاں کو برصغیر کی سیاست میں فیصلہ کن لیڈر بنانے کی سازش اور احراریوں کا معاملہ ہے، شیخ اعجاز نے اپنی کتاب میں جس اقبال کی تصویر ہمیں خود دکھائی ہے وہ اتنا کم ظرف نہ ہوسکتا تھا کہ ظفر اللہ خاں کی وائسرائے کی کونسل کی ممبری پر اتنا بڑا فیصلہ کرتا۔ تاہم اصل بات یہ بھی ہے مگر ذرا ایک دوسرے رُخ سے، جس طرح قادیانی سر فضل حسین سے اپنے مراسم کے ذریعے ظفر اللہ خاں کو برصغیر کی سیاست میں کاشت کر رہے تھے اور من حیث الجماعت سر فضل حسین سے مسلمانوں کے مفادات کے منافی فیصلے کروا رہے تھے اور ظفر اللہ خاں جیسے استحقاق نہ رکھنے والے شخص کی پشت پناہی کر کے اس کی لیڈری کو معتبر بنا رہے تھے اور اسے جس طرح انھوں نے سر فضل حسین کے ذریعے وائسرائے کی کونسل تک پہنچایا، اقبال کے لیے یہ تجربہ بھی بڑا تلخ تھا۔ وہ اس سارے ڈرامے کے عینی شاہد تھے کہ قادیانی پہلے کشمیر کو کشمیر کمیٹی کے ذریعے قادیانے اور پھر مسلم لیگ کی صدارت کے ذریعے جس کا نوٹس دہلی کے مسلمانوں نے بروقت لیا اور اس میں ناکامی کے بعد قادیانی یونینسٹ پارٹی اور سر فضل کے توسط سے پنجاب کو قادیانی صوبہ بنانے کا جتن کر رہے تھے۔ اقبال اس سے قبل پنجاب کو سکھوں کے پاؤں تلے روندا ہوا دیکھ چکے تھے۔ اب وہ قادیانیوں کے نرغے میں پنجاب کو آتا دیکھ کر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے خواہشمند تھے۔ اسی پس منظر میں انھوں نے یہ 1935ء والا بیان دیا۔ شیخ اعجاز اس پس منظر میں دیکھیں کہ فوری وجہ ظفر اللہ خاں کی ممبری نہیں تھی بلکہ 1935ء میں پنجاب کی سیاسی صورت حال کا یہ تقاضا تھا جو انھوں نے کمال جرأت کے ساتھ پورا کیا۔ جہاں تک احراریوں کے کہنے پر علامہ کے قادیانیوں کے خلاف محاذ آرا ہونے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ اقبال پنجاب کی سیاست اور قادیانیت کی پیدائش اور ارتقاء کے احراریوں سے زیادہ باخبر اور عینی شاہد تھے لہٰذا وہ خود یہ فیصلہ کر سکتے تھے کہ انھیں کب اور کس وقت اس فتنے پر وار کرنا ہے۔ چنانچہ پنجاب اور برصغیر کی سیاست کے نہایت اہم موڑ پر انھوں نے از خود یہ راست اقدام کیا۔ لہٰذا احراریوں کے کہنے پر اقبال کے اس فیصلے کو محمول کرنا صریحاً جھوٹ ہے۔ اقبال اگر کانگریس سے احراریوں کے تعلق کی مخالفت کرتے ہوئے ان کے دباؤ میں نہ آئے تو قادیانیت کے سلسلے میں وہ دباؤ میں کس طرح آ سکتے تھے؟ پھر اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ احراریوں کے کہنے پر انھوں نے ایسا کیا تو کیا برا کیا، اگر ایک صائب فیصلہ تک پہنچنے میں انھیں احراریوں سے مدد یا راہنمائی ملی تو اس میں ہرج ہی کیا ہے! دیکھنا تو یہ ہے کہ ان کا یہ فیصلہ اپنے تناظر میں درست تھا یا نہیں۔ اگر قادیانیت کو 1935ء میں علامہ کے کہنے پر غیر مسلم قرار دیا جاتا تو یہ فتنہ اسی وقت مر سکتا تھا۔ بہر حال جمہور علماء کی قادیانیت کے خلاف جنگ میں اقبال نے جمہور علماء اور مسلمانوں کے حق میں وزن ڈال کر مسلمانوں کو توانائی بخشی جس کے نتیجے میں ایک طویل محاذ آرائی

کے بعد 1974ء میں آخر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دلوا کر اہلِ پاکستان نے علمائے اسلام اور اقبال کے خواب کو اسی طرح تکمیل تک پہنچایا جس طرح ایک علیحدہ وطن کے ان کے خواب کو تعبیر بخشی تھی' حالانکہ افسوس اس وقت ہوتا اگر اقبال قادیانیوں کے بارے میں اس واضح موقف کا اظہار نہ کرتے۔

کچھ خاندانِ اقبال کے بارے میں

شیخ اعجاز احمد نے اپنے دادا دادی اور والد کے قادیانی ہونے پر تو اصرار کیا ہے مگر ڈاکٹر جاوید اقبال اور ڈاکٹر نظیر صوفی کے اس بیان کی تردید نہیں کی کہ خود شیخ اعجاز کی اپنی اولاد بھی جو دو بیٹوں اور دو بیٹیوں پر مشتمل ہے قادیانی نہیں بلکہ خدا کے فضل سے مسلمان ہے۔

"ان کی (شیخ اعجاز احمد کی) اولاد جو دو بیٹوں اور تین بیٹیوں پر مشتمل ہے میں سے کوئی بھی ان کے عقیدے یا مسلک کا حامی نہیں بلکہ ختم نبوت کے مسئلہ پر ان سب کا موقف وہی ہے جو عام مسلمانوں کا موقف ہے۔"[9]

خود اقبال کی رائے بھی شیخ اعجاز کے بارے میں اچھی نہ رہی تھی۔ سر راس مسعود کو لکھتے ہیں:

"شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے' نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہو سکتا ہے یا نہیں؟"[10]

اب شیخ صاحب خود علامہ کی نظروں میں اپنے عقائد کے لحاظ سے کس قدر معتبر تھے' وہ واضح ہے۔ اسی طرح ان کا اپنے دادا' دادی اور والد پر قادیانیت کا بہتان بھی واضح ہے۔ شیخ عطا محمد اقبال کے بڑے بھائی کچھ عرصہ قادیانیت کے دامِ فریب میں ضرور اسیر رہے مگر علامہ اقبال کی مسلسل صحبت سے بالآخر انھوں نے' ان کے بیٹے مختار احمد اور بیٹیوں عنایت بیگم اور وسیمہ بیگم نے بھی احمدیت کو ترک کر کے اسلام قبول کر لیا۔ اس کا ایک ثبوت ان کی قبروں کا مسلمانوں کے قبرستان میں ہونا اور ان کی نمازِ جنازہ کا مسلمانوں کی طرف سے پڑھا جانا ہے۔ شیخ اعجاز احمد نے محض ان کے عقائد کو مشکوک بنانے کے لیے ان کی اپنے احمدی دوستوں کے ساتھ نمازِ جنازہ پڑھی اور غیر قادیانیوں کی نمازِ جنازہ نہ پڑھنے کے قادیانی حکم کا بھی بطلان کیا۔ اس پر پہلی گواہی تو ہم نے جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال کی فراہم کی تو دوسری گواہی شیخ عطا محمد کے داماد ڈاکٹر نظیر صوفی کی دیتے ہیں جن کے شیخ اعجاز احمد سالے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ کہنا کہ علامہ کے خاندان کے کئی افراد نے مرزائیت قبول کر لی تھی سراسر جھوٹ ہے۔ حضرت علامہ کے والد' والدہ' چچا' چچی' بہنیں بھائی اور ان کی

اولادیں سب ہی سنی مسلمان تھے اور ہیں سوائے ایک بھتیجے کے جو کہ ججی میں ترقی کے لیے چوہدری ظفر اللہ کے زیر اثر چھ بہن بھائیوں میں سے' اکلوتا ''قادیانی بن گیا۔''[11]

اس کی گواہی حکیم عبدالرحمٰن جواہر نے بھی ایک نجی ملاقات میں دی۔ حکیم صاحب اس وقت حیات ہیں۔ شام نگر میں اب بھی مطلب کرتے ہیں اس سے قبل وہ علامہ اقبال کے محلے میں مطب کرتے تھے۔ وہ شیخ اعجاز احمد کے ہمعصر اور بچپن کے ساتھی ہیں۔ انھوں نے راقم کو بتایا کہ شیخ اعجاز چودھری ظفر اللہ کا پروردہ ہے اور نوکری کے لالچ میں دین سے ہاتھ دھو بیٹھا' ڈاکٹر نظیر صوفی کے مطابق:

''علامہ کے برادر بزرگ 12 دسمبر 1940ء کو فوت ہوئے۔ ان کا جنازہ حسب وصیت سنی مسلمانوں نے اٹھایا۔ یہ وصیت انھوں نے دورانِ بیماری مجھے کی تھی...... ان کی نمازِ جنازہ بھی حنفی العقیدہ مولوی سکندر خان مرحوم امام مسجد جہانگیری نے پڑھائی اور وہ حضرت امام صاحب سے ملحقہ قبرستان میں سالوں پہلے خود بنوائی ہوئی پختہ قبر میں دفن کیے گئے۔''[12]

شیخ اعجاز کی والدہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''علامہ کے اس اکلوتے قادیانی بھتیجے نے حنفی العقیدہ مولوی سکندر خان مرحوم کے پیچھے مسلمانوں کے ساتھ اپنی والدہ کا جنازہ پڑھا۔ وہ اپنے والد مرحوم و مغفور کے جنازہ پر مسلمانوں سے علیحدہ کھڑے رہنے کا تلخ تجربہ کر چکے تھے۔ اس لیے قادیانی مسلک کو دُہرانے کی ہمت نہ ہوئی۔''[13]

یہ دو واضح شہادتیں اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ اقبال کے والد' ان کے بھائی' ان کی والدہ' ان کی بہنیں حتیٰ کہ شیخ صاحب کے بھائیوں' بہنوں اور اولاد کا بھی قادیانیت سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ قادیانیت صرف شیخ اعجاز نے قبول کی اور بقول ان کے وہ اس پر اب بھی قائم ہیں جبکہ خاندانِ اقبال سے اگر کبھی کوئی ہمدردی بھی رکھتا تھا تو اس نے اس سے اپنا دامن چھڑا لیا۔

تاریخِ پیدائش کا معاملہ

ایک اور نازک معاملہ اقبال کی تاریخ پیدائش کا بھی ہے جو شیخ اعجاز احمد نے دوبارہ اٹھایا ہے اور اس کے لیے دلائل فراہم کیے ہیں کہ 9 نومبر 1877ء علامہ کی صحیح تاریخِ پیدائش ہے۔ اب چونکہ سرکاری طور پر یہ طے پا چکا ہے کہ علامہ کی تاریخ پیدائش 9 نومبر 1877ء ہے تو اس مسئلے کو بار بار چھیڑنا درست نہیں اور سرکاری اعلان کردہ تاریخ کو ہی درست سمجھنا صائب ہے کیونکہ بار بار اس مسئلہ کو اٹھانا

قومی مفاد کے منافی ہے جبکہ سچی بات تو یہ ہے کہ خود علامہ اقبال کو بھی اپنی صحیح تاریخِ پیدائش معلوم نہ تھی۔ ورنہ وہ کیمبرج سے اپنے والد کو خط نہ لکھتے۔ ان کی تاریخِ پیدائش کے بارے میں ساری باتیں ہی تخمینے ہیں۔ دلائل کے اعتبار سے ڈاکٹر نظیر صوفی کے بیان کو دیکھا جائے تو وہ بھی قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ علامہ 1873ء میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر نظیر صوفی کا یہ کہنا بھی غلط معلوم نہیں ہوتا کہ چند سیاسی مصالح کے تحت 1877ء کی تاریخ مقرر کی گئی اس لیے کہ جب صد سالہ جشن اقبال منانے کا فیصلہ کیا گیا تھا تو اس وقت 1973ء یا تو گزر چکا تھا یا گزر رہا تھا اور صد سالہ جشن اس سال منانا ممکن نہ تھا۔ صوفی نظیر کے دلائل ان کی کتاب حیات و پیام اقبال میں موجود ہیں، جنھیں ایک نظر دیکھ لینا بھی کوئی بری بات نہیں۔ تاہم قومی مصالح کے تحت 9 نومبر 1877ء کی تاریخ کو قبول کر لینا اب واحد چارہ کار ہے۔ اس پر مفصل بحث زندہ رود باب 3 میں تاریخِ ولادت کا مسئلہ کے تحت آ گئی ہے جس میں جسٹس جاوید اقبال نے تمام ہی تواریخ پیدائش کے تجزیے کے بعد اپنی رائے بھی 9 نومبر 1877ء کے پلڑے میں ڈالی ہے۔ اب تو یہی درست تصور کی جانی چاہیے۔

اقبال اور تفضیل علیؓ

شیخ اعجاز احمد نے اپنی کتاب کا باب 20 اس عنوان سے لکھا ہے کہ کیا علامہ اقبال تفضیلی عقیدہ رکھتے تھے۔ جس طرح شیخ صاحب نے اقبال کو قادیانیت کے ساتھ باندھنے کی کوشش کی ہے، اسی طرح کچھ لوگ انھیں تفضیلی کہہ کر شیعہ بنانے پر بھی تلے رہتے تھے۔ تاہم شکر ہے کہ شیخ اعجاز نے اس تفضیلیت کا جواب خود ہی فراہم کر دیا ہے کہ اقبال اہلِ بیت سے دلی محبت رکھتے تھے۔ دراصل اقبال حضرت علیؓ کی شخصیت، ان کے علمی فضائل اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت کے قائل ضرور تھے مگر حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ پر نہ مرتبے میں اور نہ خلافت میں فضیلت کے قائل تھے کیونکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں ان کی رائے اس شعر سے ثابت ہوتی ہے:

ہمت او کشتِ ملت را چو ابر
ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر [14]

اتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آ گیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار [15]

جس کے بعد یہ واضح ہے کہ وہ خلافت کے مسئلہ پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی فضیلت کے ہی قائل تھے۔ وہ انھیں ثانی اسلام کہتے تھے یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد ان کو سب سے افضل مانتے تھے۔

مظلوم اقبال میں 103 خطوط

شیخ اعجاز احمد نے اپنی کتاب مظلوم اقبال میں 103 خطوط شائع کیے ہیں جن میں سے بیشتر شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اقبال کی ازدواجی زندگی کے بارے میں بعض خطوط کے اہم حصے کاٹ دیے ہیں۔ اب جب کہ اقبال کی ازدواجی زندگی کوئی سربستہ راز نہیں رہی اور سب جانتے ہیں کہ آفتاب اقبال کے ایماء پر ''اقبال کی پہلی بیوی'' کتاب لکھی گئی جس میں والدۂ آفتاب اور اقبال کے کشیدہ تعلقات کے حوالے سے اقبال کو موردِ الزام ٹھہرایا گیا۔ پھر جسٹس جاوید اقبال اور خالد نظیر صوفی اور ڈاکٹر نظیر صوفی کے ان معاملات کو کھول کر بیان کرنے کے بعد کوئی ایسی پوشیدہ بات نہیں رہی جس کا اخفا ضروری تھا۔ شیخ صاحب کو اقبال کے خطوط مکمل طور پر شائع کرنے چاہئیں تھے ان کو خطوط کی قطع و برید کا حق نہ تھا کہ اس سے اب یہ کنفیوژن پیدا ہوا ہے کہ آخر وہ کون سی بات تھی جو شیخ صاحب کو چھپانا مطلوب تھی۔ یہ خط مکمل طور پر شائع کر کے حقائق کو اس کے تناظر میں سمجھنے سمجھانے کا موقع دینا واجب تھا۔ تاہم شیخ صاحب کے ایسا کرنے سے جو خطوط سامنے آئے ہیں ان میں کچھ پتہ نہیں کہ انھوں نے کیا رہنے دیا اور کیا کاٹ دیا؟ پھر ان 103 خطوط کی اگر عکسی نقول بھی شائع کی جاتیں' تو زیادہ صائب ہوتا۔ اب ہر قاری کے لیے ان خطوط کی تصدیق کے لیے نیشنل میوزیم کراچی جانا تو ممکن نہیں' عکسی نقول کی مدد سے وہ ان عبارتوں کی تصدیق تو کر سکتا تھا جو شیخ صاحب نے نقل کی ہیں۔ تاہم سوائے چند ایک خطوط کے اکثر نجی اور ذاتی نوعیت کے ہیں جن کا تعلق گھریلو خیر و عافیت سے ہے۔ کچھ خطوط میں شیخ اعجاز کا ذکر ہے۔ کچھ ان کے نام ہیں جن میں ان کی تعلیم ان کی اولاد کے نام رکھنے وغیرہ طرز کی باتیں ہیں۔ کچھ شیخ عطا محمد کے نام ہیں جس میں شیخ اعجاز کے بارے میں اطلاعات ہیں۔ کچھ انگلستان میں گول میز کانفرنس کی یاد کے ہیں۔ ایک خط میں 1919ء کے پنجاب میں مارشل لاء کا ضمناً تذکرہ ہے کچھ علامہ کے والد کی بیماری اور دیگر گھریلو مصروفیات کا ذکر ہے یوں یہ خط اس لحاظ سے تو اہم ہیں کہ یہ علامہ اقبال کے ہیں اور ان کی خاندانی زندگی اور ان کی مصروفیات کا پتہ دیتے ہیں تاہم یہ خط ملک کی سیاسی صورت حال' مسلمانوں کے مستقبل یا کسی دقیق علمی' ادبی' شعری یا فکری مسئلے پر روشنی نہیں ڈالتے۔ ان خطوط کا محور کیونکہ خود شیخ اعجاز کی ذات ہے یہی وجہ ہے کہ انھیں پورے اہتمام کے ساتھ جگہ دی گئی ہے۔ تاہم یہ بات پھر اہم ہے کہ اس کتاب کے توسط سے علامہ کے خطوط اقبال شناسوں کو پڑھنے کو ملے۔ یہی اس کتاب کا اصل سرمایہ ہے جو شیخ اعجاز احمد نے اقبال شناسوں کو دیا ہے۔

❁……❁……❁

حواشی

1. جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال۔ زندہ رود جلد اوّل شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور بار اوّل شجرۂ نسب کا آغاز میں چارٹ۔
2. سلیم احمد۔ اقبال ایک شاعر۔ نقشِ اوّل کتاب گھر لاہور۔ 1398ھ ص 116۔
3. شیخ اعجاز احمد۔ مظلوم اقبال۔ کراچی 1985ء ص 176-177۔
4. شیخ اعجاز احمد۔ مظلوم اقبال۔ کراچی 1985ء ص 183۔
5. بشیر احمد ڈار۔ اقبال اور احمدیت۔ آئینہ ادب لاہور ص 58-59۔
6. جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال۔ زندہ رود جلد سوم۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور 1984۔ ص 571۔
7. محمد رفیق افضل۔ گفتارِ اقبال۔ ص 22۔
8. غلام رسول مہر (مرتبہ) سرودِ رفتہ۔ ص 30۔
9. جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال۔ زندہ رود جلد سوم۔ ص 571۔
10. جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال۔ زندہ رود جلد سوم۔ ص 570۔
11. ڈاکٹر نظیر صوفی۔ حیات و پیامِ اقبال۔ ص 91۔
12. ایضاً۔ ایضاً۔ ص 90-91۔
13. ڈاکٹر نظیر صوفی۔ حیات و پیامِ اقبال۔ ص 90۔
14. شیخ اعجاز احمد۔ مظلوم اقبال۔ ص 143۔
15. علامہ محمد اقبال۔ بانگِ درا۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور۔ ص 224۔

تبصرہ لکھنے کے دوران مندرجہ ذیل کتب بھی جزوی طور پر زیرِ مطالعہ رہیں

1۔ قادیانی مذہب۔ الیاس برنی۔ شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور بار ششم۔
2۔ قادیانی قول و فعل۔ الیاس برنی۔ 1356ھ شیروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ۔
3۔ ذکرِ اقبال۔ عبدالمجید سالک۔ بزمِ اقبال لاہور۔ مئی 1983ء۔
4۔ سرگزشتِ اقبال۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور 1977ء۔
5۔ قادیانیت (مطالعہ و جائزہ) مولانا ابوالحسن ندوی۔ ادارہ نشریاتِ اسلام لاہور 1966ء طبع دوم۔
6۔ تحدیثِ نعمت۔ چودھری ظفر اللہ خاں کی خودنوشت سوانح۔
7۔ روایاتِ اقبال۔ عبداللہ چغتائی۔ اقبال اکادمی پاکستان لاہور 1977ء۔
8۔ فضل حسین۔ ایک سیاسی بیاگرافی۔ عظیم حسین۔ انگلش۔
9۔ براہینِ احمدیہ۔ جلد اوّل۔ غلام احمد قادیانی۔

❁......❁......❁
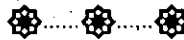
ڈاکٹر وحید عشرت

قصہ ایک خط کا

اقبالیات جولائی 1986ء میں علامہ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کی کتاب ''مظلوم اقبال'' پر تبصرہ شائع کیا گیا تھا جس میں ان حالات وواقعات کا ذکر کیا گیا تھا جن کے نتیجے میں علامہ اقبال اس نتیجے پر پہنچے کہ قادیانی چونکہ خود اپنے سوا جمہور مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں اور وہ انگریز اور ہندو کے ساتھ مل کر ایسی ریشہ دوانیوں میں مصروف ہیں جن سے مسلمانوں کا اجتماعی تشخص اور مفاد خطرے میں ہے' لہٰذا ان کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دے کر مسلمانوں کو اس فتنے سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ شیخ اعجاز نے کتاب میں عجیب منطق استعمال کی تھی۔ ان کے بیان کے مطابق علامہ اقبال تھے تو نابغہ اور عبقری مگر انھوں نے احراریوں کے کہنے پر 1935ء میں قادیانیت کے خلاف اپنا لب ولہجہ، بہکاوے میں آ کر' سخت کر لیا تھا۔ نیز ان کے بیشتر عزیز واقارب بھی قادیانی تھے اور خود اقبال بھی قادیانیت کے لیے ایک عرصے تک نرم گوشہ رکھتے تھے اور وہ چند شدید اختلافات کے باوجود بھی قادیانیوں کو کافر نہیں سمجھتے تھے۔

ہم نے اپنے تبصرے میں شیخ اعجاز کی اس صریح غلط بیانی اور اقبال پر بہتان کا پردہ چاک کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ علامہ اقبال 1902ء سے لے کر 1914ء اور 1935ء تک قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج تصور کرتے چلے آ رہے تھے۔ 1935ء میں دستورِ جدید کے تحت چونکہ عام انتخابات ہونے والے تھے چنانچہ ڈر تھا کہ مسلمانوں کے بھیس میں قادیانی اسمبلیوں میں پہنچ کر مسلمانوں کے علیحدہ آزاد وطن کی تحریک کو سبوتاژ نہ کر دیں لہٰذا انھوں نے کھل کر سیاسی بنیادوں پر قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیے جانے کا مطالبہ کیا۔ ہم نے یہ بھی بتایا کہ علامہ اقبال کے اعزہ میں شیخ اعجاز ہی چودھری ظفر اللہ کی طرف سے دیے گئے سب ججی کے لالچ کے تحت قادیانی ہوئے تھے۔ خود علامہ اقبال انھیں صالح تصور کرتے تھے مگر ان کے قادیانی عقائد کی وجہ سے انھیں ناپسند کرنے لگے تھے۔ حتیٰ کہ اقبال نے انھیں اپنے بچوں کی گارڈین شپ سے بھی فارغ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور ان کی جگہ سر راس مسعود کو لانا چاہا اور سر راس مسعود کے نام خط میں شیخ اعجاز کے عقائد کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

ہمارے اس بیان پر پہلا تبصرہ تو خود شیخ اعجاز احمد صاحب نے کیا کہ آپ کے موقر مجلہ میں ''مظلوم اقبال'' کا ذکر بہ بدی ہی سہی کیا تو گیا جبکہ متعدد دوسرے اصحاب نے ہم سے شیخ اعجاز صاحب

کے بارے میں علامہ اقبال کے سرراس مسعود کے نام خط کا حوالہ طلب کیا۔ ہم نے اس سلسلے میں اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ دیکھا تو ہم پر یہ عقدہ کھلا کہ اقبال نامہ کے ایک ہی ایڈیشن کے دونسخوں کے درمیان اس قدر تفاوت ہے کہ اس خط میں دانستہ تحریف کا یقین نہ کرنا حماقت ہے۔ خود ہم نے زندہ رود جلد سوم سے یہ حوالہ [1] لیا تھا اور زندہ رود کے فاضل مصنف جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے ڈاکٹر اخلاق اثر کے مرتبہ اقبال نامے کا حوالہ دیا تھا۔ ہم نے اس سلسلے میں بھوپال میں ڈاکٹر اخلاق اثر سے مراسلت کی۔ انھوں نے فرمایا کہ علامہ کا یہ خط جس کا عکس ان کی کتاب ''اقبال اور ممنون حسن خان'' میں بھی موجود ہے۔ اقبال نامے میں اصل خط کی عبارت کا بھی ایک حصہ چھوٹ گیا تھا' جو اقبال نامے کے اس نسخے میں جو انھوں نے مجھے بھجوایا ہے انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ اس خط میں تحریفات کے چیستان سے ایک بات پوری طرح عیاں ہے کہ ان تحریفات کے پیچھے کوئی طاقت ور ہاتھ کام کرتا رہا ہے اور اس کا مقصد علامہ اقبال کی شیخ اعجاز اور ان کے مذہب کے بارے میں رائے کو چھپانا ہے۔ ہم اس مختصر سے مضمون میں اس خط کے حوالے سے چند معروضات پیش کرتے ہیں۔

اس خط کے بارے میں ''مظلوم اقبال'' کے صفحہ 333 سے 339 تک شیخ اعجاز احمد کے مباحث بھی دیکھنے کے لائق ہیں۔ ان کے بقول یہ خط انھیں 52 سال بعد یعنی 1973ء میں سرراس مسعود کے نام خطوط میں پڑھنے کو ملا جو علامہ نے 10 جون 1937ء کو سرراس مسعود کو لکھا تھا۔ شیخ اعجاز کے بقول:

> ''یہ خط اور سید صاحب موصوف کے نام کئی اور خطوط صہبا لکھنوی مدیر ''افکار'' کراچی کی مرتبہ کتاب ''اقبال اور بھوپال'' میں شائع ہوئے جسے اقبال اکادمی نے 1973ء میں شائع کیا۔ 10 جون والے اس خط کا ذکر ذرا تفصیل سے کرنا ضروری ہے۔ شاید قارئین کی دلچسپی کا باعث ہو۔ چچا جان کے بہت سے مکتوبات اوّل اوّل شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور نے 45ء میں ''اقبال نامہ'' اوّل کے نام سے شائع کیے تھے۔ انھیں شیخ عطاء اللہ پروفیسر علی گڑھ کالج نے مرتب کیا تھا۔ ''اقبال نامہ'' (حصہ اوّل) میں چچا جان کے کئی خطوط سید راس مسعود کے نام شامل ہیں جن میں 10 جون 37ء والا خط بھی ہے۔ اقبال نامہ 45ء کا ایک نسخہ میرے پاس ہے لیکن اس میں 10 جون 37ء والے خط میں میرے متعلق ان کا بھتیجا اور نہایت صالح آدمی ہونے کا کوئی ذکر نہیں۔ میں نے صہبا صاحب سے دریافت کیا کہ 10 جون 37ء والا خط انھوں

نے کہاں سے نقل کیا ہے۔ ان سے یہ معلوم ہو کر تعجب ہوا کہ وہ خط اور سیّد راس مسعود کے نام دوسرے خطوط جو ''اقبال اور بھوپال'' میں شائع کیے گئے ہیں سب کے سب شیخ محمد اشرف کے اقبال نامہ حصہ اوّل سے نقل کیے گئے ہیں۔ اپنے بیان کی تائید میں انھوں نے ''اقبال نامہ'' کا وہ نسخہ مجھے دکھایا جس سے یہ سب خطوط نقل کیے گئے جب اس نسخہ میں مندرج خطوط بنام سر راس مسعود کا مقابلہ ان خطوط سے کیا گیا جو میرے پاس والے نسخہ میں شامل ہیں تو مزید تعجب ہوا کیونکہ دونوں نسخے اگر چہ 45ء والے پہلے ایڈیشن کے ہیں (دوسرا ایڈیشن شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی) لیکن ان میں حسب ذیل تین اختلاف ہیں:

1- خط محررہ 30 مئی 1935ء کا کچھ حصہ میرے پاس والے نسخے میں حذف شدہ ہے۔

2- خط محررہ 11 دسمبر 1935ء میرے پاس والے نسخے میں سرے سے موجود ہی نہیں۔

3- خط محررہ 10 جون 1937ء کا کچھ حصہ جس میں میرے متعلق متذکرہ بالا کلمۂ خیر لکھا گیا ہے' میرے پاس والے نسخہ میں حذف شدہ ہے۔''[2]

اس عقدہ کو بھی شیخ اعجاز نے خود ہی کھولا ہے کہ ''اقبال نامہ'' میں تحریفات کی شانِ نزول کیا ہے۔ شیخ اعجاز لکھتے ہیں:

''جب صہبا صاحب نے شیخ محمد اشرف سے اس معمہ کی گرہ کشائی چاہی تو انھوں نے اپنے خط محررہ 3 اکتوبر 1974ء میں یہ جواب دیا۔

مکاتیبِ اقبال کا ایک ایڈیشن شائع ہوا ہے' دوسرا ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔ پہلا ایڈیشن 1945ء میں طبع ہوا تھا جس وقت یہ کتاب چھپ کر بازار میں آئی' اس وقت چودھری محمد حسین جن کو آپ خوب جانتے ہوں گے' زندہ تھے۔ چودھری صاحب پریس برانچ کے سپرنٹنڈنٹ تھے اور پیپر کنٹرولر بھی تھے۔ میرے ان سے تعلقات بھی تھے۔ علامہ اقبال مرحوم نے ایک خط سر راس مسعود کو تحریر کیا ہوا تھا جو بالکل درست تھا۔ وہ خط بھی طبع شدہ ایڈیشن میں موجود تھا۔ چودھری صاحب پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ خط اس مجموعہ میں شامل ہو۔ میں نے ہر چند ان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اس خط کو حذف نہ کیا جائے مگر وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ مجبوراً وہ خط حذف کر دیا گیا۔ جو نسخے قبل ازیں فروخت ہو گئے ان میں وہ خط شامل ہو گا' بقایا نسخے اس خط کے بغیر ہوں گے۔ یہ ہی فرق ہے جس کی

طرف آپ نے نشان دہی کی ہے۔ اس خط کا عکس اب بھی میرے پاس موجود ہے۔ اصل خط شیخ عطاء اللہ صاحب مرحوم کے پاس موجود تھے انھوں نے واپس نہیں کیے تھے۔ اب غالباً ان کے صاحب زادے مختار مسعود کے پاس موجود ہوں گے۔ آپ نے صحیح تحریر فرمایا ہے بعض نسخوں میں صفحات بھی کم ہیں اور عبارتیں بھی مختلف ہیں، چونکہ ایک اہم اور طویل خط حذف کر دیا گیا تھا اس وجہ سے صفحات اور عبارت میں ضرور فرق ہونا لازمی تھا۔ امید ہے آپ کی الجھن دور ہوگئی ہوگی۔''[3]

شیخ محمد اشرف کے صہبا لکھنوی کو اس جواب کے نقل کرنے کے بعد شیخ اعجاز نے اپنے چھوٹے بھائی شیخ مختار کو جو لاہور میں رہتے تھے یہ ساری صورت حال بتائی۔ چنانچہ شیخ مختار نے شیخ اشرف سے ملاقات کر کے اپریل 1975ء کو اپنے بڑے بھائی شیخ اعجاز کو خط لکھا کہ:

''میں کل شیخ محمد اشرف صاحب کو ملا تھا وہ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اقبال نامہ حصہ اوّل کے بارے میں انھوں نے وہی بات بتائی جس کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس کتاب کی قریباً 100 کاپیاں جب فروخت ہوگئیں تو چودھری محمد حسین صاحب نے چند خطوں کے بعض حصوں کو حذف کرنے کو کہا۔ میں نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا، سب نے یہی کہا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے علم ہوا کہ چودھری صاحب چھ ماہ کے بعد ریٹائرڈ ہو جائیں گے، چودھری صاحب اُس لڑائی کے زمانے میں پیپر کنٹرولر بھی تھے اور کاغذ کا کوٹہ بھی وہی دیتے تھے۔ انھیں انکار بھی نہیں کرسکتا تھا۔ فیصلہ کیا کہ ابھی کتاب کی فروخت بند کر دی جائے اور کسی طرح چھ ماہ گزر جائیں، ان کے ریٹائر ہونے کے بعد کتاب فروخت کریں گے۔ چودھری صاحب کو دو سال کی ایکسٹینشن مل گئی۔ میں مجبور ہوگیا کتاب کی چار ہزار کاپیاں چھپی تھیں، ان کاپیوں میں ورق تبدیل کرنے پڑے جس میں مجھے کافی نقصان ہوا۔ انھوں نے کہا کہ میرے پاس اب کوئی کاپی نہیں، ورنہ میں آپ کو مایوس نہ کرتا۔''[4]

شیخ اعجاز نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے سیّد نذیر نیازی سے بھی پوچھا جس پر سیّد نذیر نیازی نے بھی تسلیم کیا کہ

''بعض (خطوط) میں چودھری صاحب مرحوم نے مصلحتاً کچھ تبدیلیاں بھی کیں

ان معنوں میں کہ جو عبارت پسند نہ آئی اسے قلم زد کر دیا۔''[5]

شیخ اعجاز اس ساری بحث کے بعد خط میں تحریف کا سارا الزام چودھری محمد حسین پر دھرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس کی اشاعت میرے محترم شریک کار (ہم دونوں (یعنی چودھری محمد حسین اور شیخ اعجاز) جاوید اور منیرہ کے گارڈین تھے) کی سیاست کو گوارا نہ ہوتی۔ اس سیاست بازی کے متعلق کچھ کہنا مناسب نہیں۔''[6]

شیخ اعجاز ڈاکٹر اخلاق اثر کے اقبال نامے میں چھپنے والے 10 جون 1937ء کے خطوط کے بارے میں لکھتے ہیں کہ شیخ عطاء اللہ کے مجموعہ خطوط کے اس اصل خط کی بھی نقل انھوں نے پنجاب پبلک لائبریری سے حاصل کر لی ہے جو چودھری محمد حسین کی تحریف سے بچ گیا تھا۔ تاہم ڈاکٹر اخلاق اثر کے اقبالنامے کا وہ فیصلہ اصل خط دیکھ کر ہی کر سکتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ اصل خط کس کے پاس ہے۔ پھر انھوں نے اصل خط کی فوٹو کاپی دینے کی استدعا کی ہے حالانکہ اس خط کی فوٹو کاپی اقبال اور ممنون حسن خان مصنف ڈاکٹر اخلاق اثر نامی کتاب میں صفحہ 15 پر موجود ہے۔ خود اقبالنامے مرتبہ ڈاکٹر اخلاق اثر میں بھی اس خط کا پورا متن شائع نہیں ہوا جبکہ علامہ اقبال نے اس خط میں یہ بھی وضاحت کر دی تھی کہ خود قادیانی مسلمانوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ اس واسطے ان کے نزدیک یہ امر شرعاً مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ہم علامہ صاحب کے اس خط کا عکس اقبال اور ممنون حسن خان مصنف ڈاکٹر اخلاق اثر سے لے کر شائع کر رہے ہیں۔ جس کے بعد ہم بھی چاہیں گے کہ شیخ اعجاز نے اس خط کے بارے میں جو یہ عذر تراشا ہے کہ شیخ مختار مسعود اور ممنون حسن خان نے ان کے استفسارات کے جواب نہیں دیے ورنہ

''اگر اس کتاب کی طباعت سے پہلے ان میں سے کوئی ایک فوٹو کاپی مل گئی تو صورتِ حال عرض کر دی جائے گی۔''[7]

اب شیخ صاحب فرمائیں کہ اس عکسی نقول کی اشاعت کے بعد وہ بیچ اس معاملہ کے کیا فرماتے ہیں کیونکہ انھوں نے ساری تان اس خط کی عدم دریافت پر توڑ دی ہے۔ اس خط میں چودھری محمد حسین نے کیوں تحریف کی؟ شیخ محمد اشرف کیوں ان سے کسی قدر دبے رہے اور شیخ عطاء اللہ اور شیخ مختار مسعود نے اس کے بارے میں کبھی کوئی وضاحت کیوں نہیں کی۔ ایسے جواب ہیں جو ان ہی متعلقہ افراد کے لواحقین یا احباب دے سکتے ہیں مگر یہ دلچسپ حقیقت سمجھ میں نہیں آتی کہ اس پردۂ زنگاری میں کون تھا جو چودھری محمد حسین کو یہ خط شائع نہ کرنے پر مجبور کر رہا تھا اور شیخ محمد اشرف نے چودھری محمد حسین کی

ریٹائرمنٹ کے بعد اس خط کو اپنی اصل حیثیت میں پھر کبھی شائع کرنے یا اس کے بارے میں لکھنے کی ضرورت کیوں نہیں محسوس کی۔ پھر شیخ اعجاز کا یہ الزام کہ اقبال کی طرف سے انھیں ملنے والے صالحیت کے سرٹیفکیٹ کے اخفا سے چودھری محمد حسین نے شیخ اعجاز سے کوئی سیاست کی، بھی نا قابلِ فہم ہے اس لیے کہ صالحیت کے اس سرٹیفکیٹ کو چھپانے کا چودھری صاحب کو کوئی فائدہ نہ تھا، اس لیے کہ صالحیت کے سرٹیفکیٹ سے زیادہ خطرناک بات شیخ اعجاز کے قادیانی عقائد کے حوالے سے اس خط میں موجود تھی جو ان کی صالحیت کی خوشی سے زیادہ اذیت ناک ہے اور ان کی صالحیت ان کے عقیدے کے ظاہر ہونے کے بعد بے معنی ہو جاتی ہے۔ چوہدری صاحب کو شیخ اعجاز کا عقیدہ سیاست کرتے وقت ان کی صالحیت اور گارڈین شپ کے لیے زیادہ مہلک ہتھیار کے طور پر ہاتھ آ سکتا تھا مگر انھوں نے ایسا نہ کیا۔ لہٰذا چودھری صاحب پر شیخ اعجاز کا یہ الزام ناروا ہے اور کوئی معنی نہیں رکھتا۔

اس خط کے بارے میں یہ سند کافی ہے کہ یہ خط سر راس مسعود کو لکھا گیا جو بھوپال میں اس وقت وزیر تعلیم تھے اور ممنون حسن خان ان کے سیکرٹری تھے۔ اس امر کا اعتراف خود مظلوم اقبال میں ص 338 میں موجود ہے۔ تاہم یہ سوال قارئینِ اقبال کے لیے حل طلب ہے کہ علامہ اقبال کے خطوط میں کتر بیونت کا حق کیا اقبال نے ان کو دیا یا انھوں نے خود ہی اپنے مفادات یا اپنی صواب دید کے تحت کیا' اور ان کی یہ مصلحتیں کیا تھیں' خود شیخ اعجاز نے مظلوم اقبال میں خاندانی اور ذاتی حوالے کے پردے میں خطوطِ اقبال کی کتر بیونت کیوں کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان خطوط میں بھی اقبال کی شخصیت کے نہایت اہم گوشے شیخ صاحب کی کرم فرمائی سے اوجھل رہ جائیں۔ چودھری صاحب نے شیخ اعجاز سے سیاست کی تھی تو شیخ اعجاز نے کیا اقبال سے سیاست کی ہے؟ لیجیے ہم اس موضوع پر کچھ کہنے سے پیشتر آپ کی خدمت میں ڈاکٹر محمد اقبال کا یہ خط عکسی نقل کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

یہ خط ہم نے نیچے نقل کر دیا ہے تاکہ اس کا مفہوم سمجھنے اور عبارت پڑھنے میں کسی کو کوئی دقت نہ ہو۔

لاہور 10 جون 1937ء

ڈیئر مسعود

پرسوں میں نے تمھیں ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہو گا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا جو اَب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardian مقرر کیے تھے۔ یہ Guardian ازروئے وصیت مقرر کیے گئے تھے جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں:

1- شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان

کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔

2- چودھری محمد حسین ایم۔اے۔ سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں اور نہایت مخلص مسلمان۔

3- شیخ اعجاز احمد بی۔اے ایل ایل بی سب جج دہلی۔

4- عبدالغنی مرحوم۔ عبدالغنی بیچارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اس کی جگہ خان صاحب میاں امیر الدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے نمبر (3) شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے' نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رُو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں۔ اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا **Guardian** ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ وہ خود بہت عیال دار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو **Guardian** مقرر کروں۔ مجھے امید ہے کہ تمھیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے گارڈین تمھارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ نادرہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا۔ کہتے ہیں کہ آیوڈیکس اس کے لیے بہت مفید ہے۔ یہ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے' دوسری سیال صورت میں۔ موخر الذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام

محمد اقبال

اب اس خط کا قصہ سنیے کہ تمام جگہ دوسرے سارے مضامین میں اس کی اشاعت میں سر موفرق نہیں مگر ہر کہیں فرق ہے تو شیخ اعجاز احمد اور قادیانیت کے بارے میں علامہ اقبال کے ریمارکس میں۔ شیخ اعجاز کہتے ہیں کہ گارڈین شپ میں ان کے حریف چودھری محمد حسین نے سیاست کرتے ہوتے علامہ اقبال کی طرف سے ان کی صالحیت کے سرٹیفکیٹ کو دبانے کے لیے یہ تحریف کی حالانکہ شواہد یہ ہیں کہ چودھری محمد حسین نے اس تحریف کے ذریعے شیخ اعجاز احمد کی گارڈین شپ کو محفوظ کر دیا اور عبدالغنی مرحوم کی جگہ سر راس مسعود کو گارڈین شپ دینے کی اقبال کی خواہش ظاہر کی۔ ہم اقبال نامے کی دونوں عبارتوں کا عکس دے کر اس صورتِ حال کی وضاحت کرتے ہیں۔

خط نمبر 1۔ اقبال نامہ کا وہ خط ہے جو چودھری محمد حسین کی قطع و برید سے قبل شائع ہوا۔ اس میں لکیر زدہ عبارت ملاحظہ ہو، اس میں مندرجہ ذیل باتیں واضح ہیں:۔

1- عبدالغنی مرحوم کی جگہ میاں امیر الدین سب رجسٹرار کو مقرر کرنے کا علامہ نے ارادہ ظاہر کیا۔

2- شیخ اعجاز کی جگہ سرراس مسعود کو Guardian مقرر کرنا چاہا۔

جبکہ تحریف کردہ خط نمبر 2 میں۔

1- عبدالغنی مرحوم کی جگہ میاں امیر الدین کے تقرر کا کوئی ذکر نہیں۔

2- عبدالغنی کی جگہ سرراس مسعود کے تقرر کا مسئلہ بنا دیا گیا ہے۔

3- یوں شیخ اعجاز کی Guardian شپ کو محفوظ کر دیا گیا ہے۔

یعنی چودھری محمد حسین نے تو شیخ اعجاز سے سیاست نہیں کی بلکہ شیخ اعجاز کی گارڈین شپ محفوظ کرنے کے لیے اقبال کے خط کی عبارت کو بدل دیا اور شیخ اعجاز کے عقائد اور ان کی Guardian شپ سے محرومی کی وجہ کو چھپا دیا ہے اور انھیں خط سے نکال کر شیخ اعجاز کی خدمت انجام دی۔ اس لیے شیخ اعجاز کو تو چودھری محمد حسین کا احسان مند ہونا چاہیے حالانکہ وہ اُلٹا گلہ کر رہے ہیں کہ چودھری صاحب نے شیخ اعجاز کی متنازعہ شخصیت کو غیر متنازعہ بنا دیا۔ اس کی وجہ بچوں کی گارڈین شپ میں شیخ اعجاز کو شریک رکھنا بھی مطلوب ہوسکتا ہے کہ خاندان اقبال کے اس فرد کو کسی نہ کسی طرح گارڈین شپ میں باقی رکھا جائے۔ تاہم نیک نیتی سے بھی کی گئی اس کتر بیونت کے اخلاقی جواز کی تفہیم نہیں ہوتی کہ جس چیز کو علامہ شرعاً مشتبہ سمجھتے تھے اس کو اس عبارت سے حذف کر کے مباح کرنے کی سعی کیوں کی گئی اور شیخ اعجاز کے لیے یہ نرم گوشہ کیونکر پیدا کیا گیا۔ ذیل میں ہم اقبال اور بھوپال' از صہبا لکھنوی میں شائع کیے گئے اس خط کا عکس شائع کر رہے ہیں۔

لاہور...... 10 جون 1937ء

ڈیئر مسعود پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا، جو اَب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardians مقرر کیے تھے۔ یہ ازروئے وصیت مقرر کیے گئے تھے، جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں:

(1) شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔

(2) چودھری محمد حسین ایم۔ اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور۔ یہ بھی میرے

قدیم دوست ہیں اور نہایت مخلص مسلمان۔

(3) شیخ اعجاز احمد بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی سب جج دہلی۔[1]

(4) عبدالغنی مرحوم۔[2] عبدالغنی بیچارے کی بابت تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔اس کی جگہ خاں صاحب میاں امیر الدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔نمبر 3 شیخ اعجاز احمد میرا بھتیجا ہے نہایت صالح آدمی ہے لیکن وہ خود بہت عیالدار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو Guardian مقرر کردوں۔مجھے امید ہے کہ تمھیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے Guardian تمھارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔نادرہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔امید کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہو گا۔کہتے ہیں کہ iodex اس کے لیے بہت مفید ہے۔ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے' دوسری سیال صورت میں۔موخرالذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام

محمد اقبال

راس مسعود نے اس خط کا فوراً جواب دیا۔ان کا یادگار اور تاریخی خط ملاحظہ ہو۔

''بھوپال...... 14 جون 1937ء

نہایت پیارے اقبال......تمہارا خط مورخہ 10 جون ابھی 3 بجے میں نے بغور پڑھا۔چوتھے گارڈین کی بابت میری رائے یہ ہے کہ چونکہ میں نہ لاہور میں رہتا ہوں اور نہ کوئی امید لاہور کے قریب رہنے کی ہے۔تو مجھے مقرر نہ کرو بلکہ کسی ایسے دوست کو جو کم سے کم پنجاب ہی میں مقیم ہوں۔البتہ اپنی وصیت میں یہ ضرور لکھو کہ اگر گارڈین کو کسی معاملہ میں جہاں تک کہ منیرہ سلمہا اور جاوید سلمہ' کی تعلیم کا تعلق ہے کوئی مالی دقت پیش آئے تو پہلے میں مطلع کیا جاؤں کیونکہ جب تک کہ ان دونوں کی انشاءاللہ بائیس برس کی عمر نہ ہو جائے میں ہر ممکن طریقہ سے مدد دینے کے لیے تیار ہوں۔بشرطیکہ میں زندہ رہا۔یہ خود ایک بڑی ذمہ داری میں اپنے اوپر اس عشق کے ثبوت میں لے رہا ہوں جو مجھے تم سے ہے۔یہ ضرور کرنا کہ میرے متعلق اس سلسلے میں جو الفاظ اپنے وصیت نامہ میں درج کرو جو کہ رجسٹرار کے پاس محفوظ کر رہے ہو' ان کی ایک نقل میرے پاس ضرور بھیج دینا۔اگر خدانخواستہ ضرورت پیش آئی تو یقین رکھو کہ

اقبال نامہ ۳۸۶ حصہ اول

(۲۲۹) ———— (۲۳۰)

خط نمبر ۲

لاہور
۱۰ جون ۱۹۳۶ء

ذی شعور

پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔
اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا۔ جو اب لکھتا ہوں۔
میں نے جاوید اور منیرہ کے چار guardian مقرر کئے تھے۔ یہ guardians انہیں وصیت مقرر کئے گئے تھے جو سب جج لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں۔

(۱) شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں۔ جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے (۲) چودھری محمد حسین ایم اے سپرنٹنڈنٹ پولیس برانچ سول سکریٹریٹ۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں۔ اور نہایت مخلص مسلمان (۳) شیخ اعجاز احمد بی اے ایل ایل بی سب جج دہلی (۴) عبدالغنی

اقبال نامہ ۳۸۷ حصہ اول

عبدالغنی بیمارے کی بابت تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو guardian مقرر کروں۔ مجھے امید ہے کہ شیخ صاحب کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہو تو لاہور میں رہنے والے guardians تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا موسم حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ ناصرہ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا۔ کہتے ہیں کہ Iodex اس کے لئے بہت مفید ہے۔ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے۔ دوسری سیال صورت میں۔ موخر الذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام

محمد اقبال

اقبال نامہ ۳۸۶ حصہ اول

(۲۲۹) ———— (۲۳۰)

خط نمبر ۱

لاہور
۸ جون ۱۹۳۶ء

ذی شعور

پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔
اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا۔ جو اب لکھتا ہوں۔
میں نے جاوید اور منیرہ کے چار guardian مقرر کئے تھے۔ یہ guardians انہیں وصیت مقرر کئے گئے تھے۔ جو سب جج لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں۔

(۱) شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں۔ جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے (۲) چودھری محمد حسین ایم اے سپرنٹنڈنٹ پولیس برانچ سول سکریٹریٹ۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں۔ اور نہایت مخلص مسلمان (۳) شیخ اعجاز احمد بی اے ایل ایل بی سب جج دہلی (۴) عبدالغنی

اقبال نامہ ۳۸۷ حصہ اول

عبدالغنی بیمارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ ان کی جگہ ملک صاحب میاں امیر الدین سب جج لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔ نمبر ۳ شیخ اعجاز احمد میرا بھتیجا ہے۔ نہایت صالح آدمی ہے لیکن وہ خود بہت عیال دار ہے اور ملازمت کے باعث لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو guardian مقرر کروں۔ مجھے امید ہے کہ شیخ صاحب کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہو تو لاہور میں رہنے والے guardians تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا موسم حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ ناصرہ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا۔ کہتے ہیں کہ Iodex اس کے لئے بہت مفید ہے۔ ایک تو مرہم کی شکل میں ہوتی ہے۔ دوسری سیال صورت میں۔ موخر الذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔ والسلام

محمد اقبال

تمھارے ان دونوں بچوں کے لیے ان کی تعلیم کے مسئلے میں، میں وہی کروں گا جو اپنی اولاد کے لیے۔ یہ ضرور صلاح دیتا ہوں کہ جہاں تک جائداد وغیرہ کا تعلق ہے اس کا انتظام اپنے سامنے ہی ایسا کر دو کہ کسی قسم کا ابہام باقی نہ رہے۔ شکر ہے خدا کا نادرہ اب ذرا بہتر ہے۔

میں ہوں تمہارا چاہنے والا...... راس مسعود

''اقبال اور بھوپال'' میں علامہ اقبال کے اس خط کی اشاعت کا عکس اور سر راس مسعود کی طرف سے اس کے جواب کی اشاعت کا عکس اس بات کو تو ظاہر کرتا ہے کہ یہ خط ہر لحاظ سے درست اور صحیح ہے کیونکہ 10 جون 37ء کو علامہ نے خط لکھا اور 14 جون 37ء کو راس مسعود نے خط کا جواب دیا اور لکھا کہ 10 جون کا خط میں نے بغور پڑھا۔ اب خط پر اعتراض بے معنی ہے' تاہم ''اقبال اور بھوپال'' کے اس خط میں بھی شیخ اعجاز کے عقائد اور قادیانیت کے بارے میں علامہ اقبال کے ریمارکس حذف کر دیے گئے ہیں۔ اب جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے زندہ رود جلد سوم میں جو اقتباس دیا ہے اس کے بارے میں اقبال نامے کے مرتب ڈاکٹر اخلاق اثر نے ہمارے نام ایک خط میں وضاحت کی کہ وہ بھی مکمل نہیں ہے کیونکہ خود اقبال نامے کی کتابت میں سے یہ عبارت رہ گئی:

> ''کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں۔ اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے۔''[12]

ڈاکٹر اخلاق اثر نے اس میں بتایا ہے کہ اصل میں اقبال نامے کا جو نسخہ ڈاکٹر جاوید اقبال کو دیا گیا اس میں یہ عبارت موجود نہ تھی۔ ملاحظہ کیجیے ڈاکٹر اخلاق اثر کے خط کا عکس:

Dr.Akhlaq Asar

محترم وحید عشرت صاحب! وعلیکم السلام

زندہ رود (تین جلدیں) اور اقبال اور حیدر آباد موصول ہوئیں۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ کی حسب فرمائش اپنی تالیفات ''اقبال اور شیش محل'' ''اقبال نامے'' اور تصنیف ''اقبال اور ممنون'' رجسٹری سے روانہ کر رہا ہوں۔ ''اقبال نامے'' کا دوسرا اڈیشن اور ''اقبال کا وظیفہ'' اپریل تک مکمل ہونے کی امید ہے۔ ''مظلوم اقبال'' اور دیکھنا چاہتا ہوں تا کہ اقبال کے اقتصادی اور معاشی حالات پر معلومات مکمل ہو جائیں۔ اگر ممکن ہو تو یہ زحمت اور برداشت فرمائیں۔ میری تالیفات کے بارے میں آپ کی نیک خواہشات میرے لیے اہمیت رکھتی ہیں۔

''مظلوم اقبال'' پر آپ کا تبصرہ پڑھ لیا تھا۔ اس میں اقبال کے 10 جون 37ء کے مکتوب کا حوالہ تھا جو آپ نے ''زندہ رود'' سے لیا تھا۔ اس وقت تک میں نے ''زندہ ...'' نہیں دیکھی تھی اور یہ

معلوم نہ تھا کہ وہ اقتباس ''اقبال نامے'' سے لیا گیا ہے۔ اس مکتوب کا مکمل متن ''اقبال اور ممنون'' صفحہ 15 پر فوٹو کاپی کی شکل میں دیا گیا ہے۔ ''زندہ رود'' میں اس مکتوب کا اہم حصہ رہ گیا جو بعد کے نسخوں میں ہاتھ سے بڑھا دیا گیا تھا اور یہ تو ہر اس نسخہ میں بڑھائی نہ جا سکی تھی جو جناب جاوید اقبال صاحب کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ کتابت کی غلطی بہت بعد میں نظر آئی۔ وہ اہم حصہ یہ ہے:

''کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں۔ اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے۔''

امید ہے کہ 10 جون 37ء کے مکتوب کے فوٹو کاپی سے آپ کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ دیگر مکاتیب کے علاوہ یہ مکتوب بھی مجھے جناب ممنون حسن خاں صاحب سے موصول ہوا تھا' جس کی تفصیل ''اقبال نامے'' میں دی ہوئی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے جناب رفیع الدین ہاشمی صاحب اس مکتوبِ اقبال کی فوٹو کاپی شیخ اعجاز احمد صاحب کو ارسال کر چکے ہیں۔

میری جن تصانیف یا تالیفات کے حقوق اشاعت کی ضرورت سمجھیں تحریر فرمائیں اور رائلٹی کی شرائط کی تفصیلات بھی لکھیں تا کہ میں اپنے محکمہ سے اجازت لے کر کوئی کارروائی کروں۔ امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ تعاون کے لیے ایک بار پھر شکریہ۔ آپ کا۔

اخلاق اثر

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب سے ہم نے استفسار کیا تو انھوں نے کہا کہ مجھے اس مکتوب کی فوٹو کاپی نہیں ملی اور نہ میں نے شیخ اعجاز کو کوئی کاپی ارسال کی ہے۔ ڈاکٹر اخلاق اثر نے اپنے اس خط میں ان احوال کی وضاحت کر دی ہے کہ کیونکر یہ عبارت مکمل طور پر زندہ رود جلد سوم میں نہیں آ سکی۔

اب ایک اور محکم شہادت جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال اور منیرہ بیگم کی آیا محترمہ ڈورس احمد نے اپنی حالیہ انگریزی کتاب ''اقبال جیسا کہ میں جانتی ہوں'' میں فراہم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ علامہ اقبال شیخ اعجاز احمد کو بہت عزیز رکھتے تھے مگر علامہ ان کے قادیانی ہو جانے کی وجہ سے ان سے سخت نالاں تھے اور وہ اپنے بچوں کے سرپرستوں میں سے بھی انھیں نکال کر کسی اور متبادل کی تلاش میں تھے؟ چنانچہ علامہ نے ان سے متعدد بار اپنے اس کرب کا اظہار کیا اور شیخ اعجاز کے قادیانی ہو جانے کے عمل کو ہمیشہ اور مکمل طور پر ناپسند کیا۔ 14

اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ اس خط میں تحریف کوئی نادانستہ طور پر کسی ایک فرد نے نہیں کی بلکہ کسی خاص فرد اور جماعت کی طرف سے ایک خاص منصوبہ بندی اور کوشش سے مختلف اشخاص سے

اپنے اثر ونفوذ کی بنیاد پر تحریف کروائی گئی ہے اور اس کا مقصد شیخ اعجاز ان کے عقیدے اور قادیانیوں کے بارے میں علامہ اقبال کے واضح اور صریح اظہار و موقف کو چھپانے کی سعی نامسعود کی گئی ہے۔ تاہم مختلف خطوط میں مختلف عبارات نے اس سراسر جھوٹ کو بے نقاب کر دیا ہے۔ ہماری طرف سے اس تازہ خط اور اس کی عکسی نقل کی اشاعت کے بعد چند باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں:

-1 علامہ اقبال کے جملہ خطوط کی چھان بین کی جائے۔

-2 تحریفات اور خطوں کی عبارت کی قطع و برید کو ختم کیا جائے اور علامہ کے خط ان کی اصل حالت میں شائع کیے جائیں۔

-3 ذاتی اور خانگی حالات کی آڑ میں علامہ کے خطوط کی تصحیح یا قطع و برید نہ کی جائے۔ اس لیے کہ علامہ کے خانگی حالات پر بہت کچھ سامنے آ چکا ہے۔ موجودہ صورت میں قطع و برید غلط فہمیوں کو جنم دے گی۔

-4 علامہ کے خطوط کی عکسی نقول بھی شائع کی جائیں۔

-5 علامہ کے اصل خطوط اقبال میوزیم میں یا کسی اور محفوظ مقام پر اپنی اصل حالت میں محفوظ رکھنے کا بندوبست کیا جائے۔

-6 تمام اردو اور انگریزی خطوط کو ایک کلیات مکاتیب اقبال میں عکسی نقول کے ساتھ شائع کر دیا جائے۔

-7 خطوط کے بارے میں معلومات' مکتوب الیہ' خطوط کا زمانۂ تحریر' وجہ تحریر' مقام تحریر وغیرہم واضح طور پر دی جائیں۔

-8 مختلف خطوط کے مجموعوں کے تقابلی مطالعہ سے خطوط کی اصل عبارت کا تعین کیا جائے۔

-9 تمام مکتوبات کی مائیکروفلمیں بنائی جائیں۔

اس طریق کار سے علامہ اقبال کے خطوط محفوظ ہو سکیں گے اور تحقیق کاروں کو اصل متن اور ان کے مفہوم تک پہنچنے میں سہولت ہو گی اور بہت سے سیاسی' اخلاقی' ادبی' علمی اور تاریخی حقائق تک اقبال کی اپروچ سے آگاہی ہو سکے گی۔

حواشی

1. جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال۔ زندہ رود جلد سوم۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔
2. شیخ اعجاز احمد۔ مظلوم اقبال۔ جی 213 داؤد پوتہ روڈ کراچی 4' ص 334۔
3. شیخ اعجاز احمد۔ مظلوم اقبال۔ جی 213 داؤد پوتہ روڈ کراچی 4' ص 334-335۔
4. شیخ اعجاز احمد۔ مظلوم اقبال۔ جی 213 داؤد پوتہ روڈ کراچی 4' ص 335-336۔
5. شیخ اعجاز احمد۔ مظلوم اقبال۔ جی 213 داؤد پوتہ روڈ کراچی 4' ص 336۔
6. شیخ اعجاز احمد۔ مظلوم اقبال۔ جی 213 داؤد پوتہ روڈ کراچی 4' ص 337۔
7. شیخ اعجاز احمد۔ مظلوم اقبال۔ جی 213 داؤد پوتہ روڈ کراچی 4' ص 338۔
8. ڈاکٹر اخلاق اثر۔ اقبال اور ممنون حسن۔ دارالاقبال بھوپال۔ ص 15۔
9. شیخ عطاء اللہ۔ اقبال نامہ۔ شیخ محمد اشرف لاہور۔ ص 386-387۔
10. صہبا لکھنوی۔ اقبال اور بھوپال۔ اقبال اکادمی کراچی حال لاہور۔ ص 245۔
11. صہبا لکھنوی۔ اقبال اور بھوپال۔ اقبال اکادمی کراچی حال لاہور۔ ص 245۔

12-13. ڈاکٹر اخلاق اثر کا ڈاکٹر وحید عشرت کے نام خط۔

14. ڈورس احمد۔ اقبال جیسا کہ میں جانتی ہوں (انگریزی) اقبال اکادمی پاکستان لاہور 1986ء ص 43۔

قادیانیت شکن شاعری

لا نبی بعدی

پس خُدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد

رونق از ما محفلِ ایام را
اُو رُسل را ختم و ما اقوام را

خدمتِ ساقی گری با ما گذاشت
داد ما را آخریں جامے کہ داشت

لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ ز احسانِ خدا است
پردہ ناموسِ دینِ مصطفےٰ است

قوم را سرمایۂ قوت ازُو
حفظِ سرِ وحدتِ ملت ازُو

حق تعالیٰ نقشِ ہر دعویٰ شکست
تا اَبد اسلام را شیرازہ بست

دل ز غیر اللہ مسلماں برکَند
نعرۂ لَا قَوْمَ بَعْدِیْ می زَنَد

(مثنوی ''رموزِ بےخودی'' از مجموعہ اسرار و رموز)

(ترجمہ)

1- خداتعالیٰ نے ہم پر شریعت اور ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر رسالت ختم کردی۔

2- ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر سلسلۂ انبیاء اور ہم پر سلسلۂ اقوام تمام ہو چکا' اب بزمِ جہاں کی رونق ہم سے ہے۔

3- میخانۂ شرائع کا آخری جام ہمیں عطا فرمایا گیا' قیامت تک ساقی گری کی خدمت اب ہم ہی انجام دیں گے۔

4- رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ فرمان کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں' احساناتِ خداوندی میں سے ایک بڑا احسان ہے۔ دینِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عزت و ناموس کا محافظ بھی یہی ہے۔

5- مسلمانوں کا اصل سرمایہ قوت یہی عقیدۂ ختم نبوت ہے اور اسی میں وحدتِ ملت کے تحفظ کا راز پوشیدہ ہے۔

6- اللہ عزوجل نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد ہر دعویٰ نبوت کو باطل ٹھہرا کر اسلام کا شیرازہ ہمیشہ کے لیے مجتمع کردیا ہے۔

7- اسی عقیدہ کے باعث مسلمان ایک اللہ کے سوا سب سے تعلق توڑ لیتا اور اُمتِ مسلمہ کے بعد کوئی امت نہیں' کا نعرہ بلند کرتا ہے۔

اے کہ بعد از تُو نبوت شد بہر مفہوم شرک

اے کہ بر دلہا رموزِ عشق آساں کردہ ای
سینہ ہا را از تجلی یوسفستاں کردہ ای

اے کہ صد طور است پیدا از نشانِ پائے تو
خاکِ یثرب را تجلی گاہِ عرفاں کردہ ای

اے کہ بعد از تُو نبوت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن . زنورِ شمعِ عرفاں کردہ ای

اے کہ ہم نامِ خدا بابِ دیارِ علم تو
اُمیے بودی و حکمت را نمایاں کردہ ای

فیضِ تو دشتِ عرب را مطلعِ انظار ساخت
خاکِ ایں ویرانہ را گلشن بداماں کردہ ای

دل نہ نالہ در فراقِ ماسوائے نورِ تو
خشک چوبے را ز ہجرِ خویش گریاں کردہ ای

(یہ نعت علامہ اقبال کے کسی مجموعۂ کلام میں شامل نہیں ہے۔ یہ انجمنِ حمایت اسلام کی روداد 1902ء کے صفحہ 32 سے منقول ہے۔ اسے سب سے پہلے آغا شورش کاشمیری مرحوم نے ''چٹان'' لاہور کے شمارہ 8 اپریل 1974ء کے صفحہ 17 پر شائع کیا تھا)

(ترجمہ)

1- آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دلوں کو رموزِ عشق سے آشنا فرمایا اور اپنے جلوؤں سے سینوں کو مطلعِ انوار بنا دیا۔

2- آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نشانِ پا سے سینکڑوں طور ابھرتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم ہی کے خرامِ ناز کا فیض ہے کہ خاکِ بطحا معرفت کی تجلّیاں لیے ہوئے ہے۔

3- آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دعویٰ نبوت بہر نوع' بہر مفہوم اور بہر رنگ شرکت (فی النبوّت) ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی نے محفلِ ہستی کو معرفت کی شمع سے نورانی کر دیا۔

4- آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ویارِ علم ہیں اور شہرِ علم کا دروازہ علیؓ ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ کا ایک نام بھی ''علی'' ہے' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امّی ہوتے ہوئے علم و دانش اور حکمت و بصیرت کے ایوان آراستہ فرمائے۔

5- آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیض نے عرب کے ریگستان کو نگاہوں کا مرکز بنا دیا اور اس ویرانے کی خاک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں کے طفیل گلشن بداماں ہے۔

6- میرا دل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی پُرنور شخصیت کے فراق میں گریاں ہے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی تھے جن کے ہجر نے خشک لکڑی (اسطوانہ حنانہ) کو رُلا دیا تھا۔

(ترجمہ، پروفیسر محمد اقبال جاوید)

نبوّت

میں نہ عارف ' نہ مجدد ' نہ محدِث ' نہ فقیہ
مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام

ہاں مگر عالم اسلام پہ رکھتا ہوں نظر
فاش ہے مجھ پہ ضمیرِ فلکِ نیلی فام

''وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام''

(ضربِ کلیم)

جعلی نبوّت

غدّارِ وطن اس کو بتاتے ہیں برہمن
انگریز سمجھتا ہے مسلماں کو گداگر

پنجاب کے اربابِ نبوّت کی شریعت
کہتی ہے کہ یہ مومنِ پارینہ ہے کافر

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
"مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر!"

(ضربِ کلیم)

مہدی

قوموں کی حیات اُن کے تخیل پہ ہے موقوف
یہ ذوق سکھاتا ہے ادب مُرغِ چمن کو

مجذوبِ فرنگی نے بہ اندازِ فرنگی
مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو

اے وہ کہ تُو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار
نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو

ہو زندہ کفن پوش تو میت اسے سمجھیں
یا چاک کریں مردک ناداں کے کفن کو؟
(ضربِ کلیم)

مہدیٔ برحق

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیار

پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں
نے جدتِ گفتار ہے، نے جدتِ کردار

ہیں اہلِ سیاست کے وہی کہنہ خم و پیچ
شاعر اسی افلاسِ تخیل میں گرفتار

دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار
(ضربِ کلیم)

امامت

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

موت کے آئنے میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دُشوار کرے

دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اُس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے
(ضربِ کلیم)

پنجابی مسلمان

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت
کر لے کہیں منزل تو گزرتا ہے بہت جلد

تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا
ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد

تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے
یہ شاخِ نشیمن سے اُترتا ہے بہت جلد
(ضربِ کلیم)

جہاد

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دُنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر

لیکن جنابِ شیخ کو معلوم کیا نہیں
مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سُود و بے اثر

تیغ و تفنگ دستِ مسلماں میں ہے کہاں؟
ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذّت سے بے خبر

کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل
کہتا ہے کون اس کو مسلماں کی موت مر

تعلیم اس کو چاہیے ترکِ جہاد کی
دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر

باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر

ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر

حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگزر

(ضربِ کلیم)

الہام

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملّت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

وحدت کی حفاظت نہیں بے قوتِ بازو
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقلِ خداداد

اے مردِ خدا! تجھ کو وہ قوت نہیں حاصل
جا بیٹھ کسی غار میں اللہ کو کر یاد

مسکینی و محکومی و نومیدیٔ جاوید
جس کا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد

(ضربِ کلیم)

O

ہو بندۂ آزاد اگر صاحبِ الہام
ہے اُس کی نگہ فکر و عمل کے لیے مہمیز

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

(ضربِ کلیم)

درسِ غلامی

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذتِ کردار، نہ افکارِ عمیق

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

(ضربِ کلیم)

نفسیاتِ غلامی

سخت باریک ہیں امراضِ امم کے اسباب
کھول کر کہیے تو کرتا ہے بیاں کوتاہی

دینِ شیری میں غلاموں کے امام اور شیوخ
دیکھتے ہیں فقط اک فلسفۂ روباہی

ہو اگر قوتِ فرعون کی در پردہ مرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی!

(ضربِ کلیم)

مرزا قادیانی

عصرِ من پیغمبرے ہم آفرید
آنکہ در قرآن بغیر از خود ندید

تن پرست و جاہ مست و کم نگہ
اندرونش بے نصیب از لا الٰہ

در حرم زاد و کلیسا را مرید
پردۂ ناموسِ ما را بر درید

دامنِ رو را گرفتن ابلہی است
سینۂ او از دلِ روشن تہی است

الحذر! از گرمئی گفتارِ او
الحذر! از حرفِ پہلو دارِ او

شیخ او لرد فرنگی را مرید
گرچہ گوید از مقامِ بایزید

گفت دین را رونق از محکومی است
زندگانی از خودی محرومی است

دولتِ اغیار را رحمت شمرد
رقصہا گردِ کلیسا کرد و مُرد

(مثنوی پس چہ باید کرد)

(ترجمہ)

1- میرے زمانے نے ایک نبی (مرزا قادیانی) بھی پیدا کیا
جس کو اپنے سوا قرآن میں کچھ نظر نہ آیا

2- خود پسند ' عزت چاہنے والا ' کوتاہ نظر
اس کا دل لا الہ سے خالی ہے

3- مسلمانوں کے گھر پیدا ہوا اور عیسائیوں کا غلام بنا
اس نے ہماری ناموس کے پردے کو چاک کرایا

4- اس سے عقیدت رکھنا حماقت ہے
اس کا سینہ دل کی روشنی سے خالی ہے

5- اس کی چرب زبانی سے بچ
اس کی چالبازانہ باتوں سے بچ

6- اس کا پیر شیطان اور فرنگی کا غلام ہے
اگرچہ وہ کہتا ہے کہ میں بایزید کے مقام سے بول رہا ہوں

7- وہ کہتا ہے کہ غلامی میں ہی دین کی رونق ہے
اس کی زندگی خودی سے محروم ہے

8- غیروں کی دولت کو وہ رحمت جانتا ہے
اس نے گرجا کے گرد رقص کیا اور مر گیا

O

رفت لذّت آں مستی و ذوق و سرود
دینِ او اندر کتاب و او بگور!

صحبتش با عصرِ حاضر در گرفت!
حرفِ دیں را از دو "پیغمبر" گرفت!

آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد
آں ز حج بیگانہ و ایں را جہاد!

تا جہاد و حج نماند از واجبات
رفت جاں از پیکرِ صوم و صلوٰت!

روح چوں رفت از صلوٰۃ و از صیام
فرد ناہموار و ملت بے نظام!

سینہ ہا از گرمیِ قرآں تہی
از چنیں مرداں چہ امیدِ بہی!

از خودی مردِ مسلماں در گذشت
اے خضر دستے کہ آب از سر گذشت

(جاوید نامہ)

(ترجمہ)

1- وہ مستی اور ذوق و سرور کھو چکا ہے۔ دین اب کتاب ہی میں رہ گیا ہے۔ مسلمان مر چکا ہے۔
2- وہ عصر حاضر کی صحبت اختیار کر چکا ہے اب وہ دو جعلی پیغمبروں سے دین سیکھتا ہے۔
3- ان میں سے ایک (بہاء اللہ) ایرانی ہے اور دوسرا (مرزا قادیانی)۔ پہلے نے حج منسوخ کر دیا اور دوسرے نے جہاد۔
4- جب جہاد اور حج واجب نہ رہے تو صوم و صلوٰۃ کی رُوح بھی ختم ہو گئی۔
5- نماز روزے کی روح جاتی رہی تو فرد بے لگام ہو گیا اور ملت بے نظام۔
6- سینے حرارتِ قرآنِ پاک سے خالی ہو گئے۔ ایسے لوگوں سے بھلائی کی کیا اُمید؟
7- مسلمان نے خودی ترک کر دی۔ اے خضر! مدد کو پہنچ۔ پانی سر سے گزر گیا۔

❁......❁......❁

علامہ اقبالؒ اور فتنۂ قادیانیت

جسٹس (ر) جاوید اقبال

زندہ رود

مصائب و آلام اور طرح طرح کی الجھنوں کے باوجود اقبال اپنی علمی و شعری کاوشوں مسلمانوں کی شیرازہ بندی اور ان کے سیاسی مسائل کے حل کے لیے وقت نکالتے رہے۔ انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس کی خاطر نواب بھوپال کو صدارت کے لیے لاہور بلوانے کی کوشش کی[1] ''زبور عجم'' بمعہ اردو ترجمہ (جو حواشی کی شکل میں تھا) کی اشاعت کا ارادہ کیا[2] ''صورِ اسرافیل'' (جو 1936ء میں ''ضربِ کلیم'' کے نام سے شائع ہوئی) کے لیے اشعار کی تخلیق کا سلسلہ جاری رکھا اور اسی طرح انہی ایام میں احمدیت کی تردید میں اپنا پہلا انگریزی بیان بعنوان ''قادیانیت اور صحیح العقیدہ مسلمان'' تحریر کیا۔ یہ بیان برصغیر کے مختلف انگریزی اخباروں مثلاً ایسٹرن ٹائمز' ٹریبیون' سٹار آف انڈیا کلکتہ' دکن ٹائمز وغیرہ میں شائع ہوا۔ علاوہ اس کے اردو اخباروں میں اس کا ترجمہ بھی چھپا۔ 14 مئی 1935ء کو سٹیٹسمین نے اسے شائع کیا اور ساتھ اس پر لیڈنگ آرٹیکل بھی لکھا۔

''قادیانیت اور صحیح العقیدہ مسلمان'' میں مختصراً اقبال کا استدلال یہ تھا کہ مسلمانوں کی ملی وحدت کی بنیادیں مذہبی تصور پر استوار ہیں۔ اگر ان میں کوئی ایسا گروہ پیدا ہو جو اپنی اساس ایک نئی نبوت پر رکھتے ہوئے یہ اعلان کرے کہ تمام مسلمان جو اس کا موقف قبول نہیں کرتے وہ کافر ہیں' تو قدرتی طور پر ہر مسلمان ایسے گروہ کو ملتِ اسلامیہ کے استحکام کے لیے ایک خطرہ قرار دے گا اور یہ بات اس لیے بھی جائز ہو گی کہ مسلم معاشرے کو ختم نبوت کا عقیدہ ہی سالمیت کا تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک قبل از اسلام مجوسیت کے جدید احیاء نے جن دو تحریکوں کو جنم دیا' ان میں ایک بہائیت ہے اور دوسری قادیانیت۔ بہائیت اس اعتبار سے زیادہ دیانت پر مبنی ہے کہ وہ اسلام سے اعلانیہ علیحدگی کا رستہ اختیار کرتی ہے لیکن قادیانیت اسلام کے بعض اہم ظواہر کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی روح اور نصب العین سے انحراف کرتی ہے۔ اقبال کے بیان کے مطابق ''بروز'' ''حلول'' اور ''ظل'' کی اصطلاحات مسلم ایران میں اسلام سے منحرف تحریکوں نے اختراع کیں اور ''مسیحِ موعود'' کی اصطلاح بھی مسلم دینی

شعور کی تخلیق نہیں ہے۔ آخر میں فرماتے ہیں کہ ہندوستان کے حاکموں کے لیے بہترین راستہ یہی ہے کہ قادیانیوں کو ایک علیحدہ مذہبی فرقہ قرار دے دیں۔ [3]

اس بیان پر احمدی اخباروں نے کئی اعتراض کیے اور اقبال پر مختلف قسم کے الزام لگائے۔ ہفتہ وار ''لائیٹ'' کے نمائندے نے ان کی توجہ ایک اور احمدی ہفتہ وار ''سن رائز'' کی طرف مبذول کراتے ہوئے سوال کیا کہ اس اخبار کے مطابق انھوں نے اپنے کسی گذشتہ خطبے میں احمدیت کے متعلق مختلف رائے کا اظہار کیا تھا۔ سوان کے اب کے بیان اور اس خطبہ میں تناقض کیوں ہے؟ اقبال کا جواب تھا کہ وہ یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتے کہ اب سے ربع صدی پیشتر انھیں اس تحریک سے اچھے نتائج کی توقع تھی لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں ظاہر نہیں ہو جاتی بلکہ اپنے مکمل اظہار کے لیے کئی عشرے لیتی ہے۔ اس تحریک کے دو گروہوں کے درمیان اندرونی اختلافات بھی اس حقیقت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ جو لوگ بانیِ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے' انھیں بھی یہ معلوم نہ تھا کہ آگے چل کر تحریک نے کیا صورت اختیار کرنی ہے۔ درخت کو جڑ سے نہیں اس کے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ پس اگر ان کے رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل لے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر ہی اپنے آپ کو نہیں بدلتے۔ [4]

اقبال نے سٹیٹسمین کے لیڈنگ آرٹیکل میں اپنے بیان پر تبصرہ کا جواب ایک خط کے ذریعہ دیا جو 10 جون 1935ء کو سٹیٹسمین میں شائع ہوا۔ جواب کے اہم نکات یہ تھے: اوّل یہ کہ برصغیر کے مسلمانوں کی طرف سے سی رسمی عرض داشت کی وصولی کا انتظار کیے بغیر انگریزی حکومت کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں اور احمدیوں کے عقائد میں بنیادی اختلاف کا انتظامی طور پر نوٹس لے' جیسے کہ سکھوں کو 1919ء تک انتظامی اعتبار سے ایک علیحدہ سیاسی یونٹ نہ سمجھا جاتا تھا۔ مگر بعد میں بغیر ان کی طرف سے کسی عرض داشت کی وصولی کے انھیں ایسا تصور کیا گیا' باوجود اس کے کہ ہائی کورٹ لاہور کے فیصلہ کی رُو سے سکھ کوئی علیحدہ مذہبی فرقہ نہیں بلکہ ہندو تھے۔ دوم یہ کہ احمدیوں کے سامنے صرف دو ہی راستے تھے یا تو بہائیوں کی طرح مسلمانوں سے اپنے آپ کو خود مذہباً الگ کر لیں یا مسئلہ ختم نبوت کے متعلق اپنی تمام تاویلات مسترد کر کے اسلامی موقف قبول کریں۔ آخر دائرہ اسلام میں رہتے ہوئے اِن کا اسلام کے منافی تاویلات اپنانے میں اور کیا مقصد ہو سکتا تھا سوائے اس کے کہ سیاسی فائدہ اٹھایا جائے۔ سوم یہ کہ (اور یہ نکتہ خصوصی اہمیت رکھتا تھا) احمدیوں کو علیحدہ مذہبی فرقہ قرار دینے میں اگر انگریزی حکومت نے مسلمانوں کا مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانانِ برصغیر یہ شک کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ انگریزی حکومت جان بوجھ کر اس مذہبی فرقہ کو اس وقت تک مسلمانوں سے الگ نہ کرے گی جب تک کہ احمدیوں

کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو جاتا' کیونکہ فی الحال احمدی اپنی تعداد میں کمی کے سبب پنجاب میں سیاسی طور پر مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کے علاوہ ایک چوتھا مذہبی فرقہ بن سکنے کے قابل نہ تھے لیکن اگر ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تو وہ پنجاب میں مسلمانوں کی تھوڑی سی اکثریت کو صوبائی لیجسلیچر میں شدید نقصان پہنچا سکتے تھے۔ پس اگر انگریزی حکومت 1919ء میں سکھوں سے کسی رسمی عرضداشت کی وصولی کا انتظار کیے بغیر انھیں ہندوؤں سے الگ مذہبی فرقہ تسلیم کر سکتی ہے تو اس ضمن میں اسے احمدیوں کی طرف سے کسی رسمی عرضداشت کی وصولی کا انتظار کیوں ہے۔5

پندرہ روزہ اخبار ''اسلام'' کے نمائندے نے اقبال کی توجہ مرزا بشیر الدین محمود کے ایک خطبۂ جمعہ کی طرف دلائی جس میں ان پر الزام لگایا گیا تھا کہ وہ انگریزی حکومت سے احمدیوں کو مسلمانوں کے حوالے کر دینے کا مطالبہ کر رہے ہیں جیسے رومیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہود کے حوالے کر دیا تھا اور انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھا دیا۔ اقبال نے اپنے جواب مورخہ 22 جون 1935ء میں جو اس اخبار میں شائع ہوا' واضح کیا کہ ان کے گذشتہ بیان میں ایسا کوئی فقرہ موجود نہ تھا۔ البتہ انھوں نے یہ کہا تھا کہ انگریزی حکومت میں مسلمانوں کو اتنی آزادی بھی حاصل نہیں جتنی یہود کو رومی سلطنت میں حاصل تھی کیونکہ رومی اس بات کے پابند تھے کہ یہود کی مجلسِ امور مذہبی میں جو فیصلہ ہو گا وہ دیکھیں گے کہ اس کی تعمیل قطعی طور پر ہو جاتی ہے۔6

''طلوعِ اسلام'' بابت اکتوبر 1935ء میں نذیر نیازی نے بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے اقبال کی بعض تحریروں کے اقتباسات پیش کیے جس میں انھوں نے نبوت کے دو اجزاء پر بحث کی تھی' یعنی نبوت روحانیت کے ایک خاص مقام کی حیثیت سے اور نبوت ایک ایسے ادارے کی حیثیت سے جو نئی اخلاقی فضا تخلیق کر کے انسانوں میں سیاسی اور معاشرتی تغیر کا سبب بنے۔ بقول اقبال اگر دونوں اجزاء موجود ہوں تو وہ نبوت ہو گی اور اگر صرف پہلا جزو موجود ہو' تو تصوف یا ولایت۔ اقبال نے تحریر کیا:7

> ''ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعدِ اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزا نبوت کے موجود ہیں یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے۔''

بالآخر احمدیوں کی حمایت میں پنڈت جواہر لعل نہرو بھی اس بحث میں کود پڑے اور انھوں نے اپنے تین انگریزی مضامین بعنوان ''اتحادِ اسلام'' اقبال کے مضمون پر تبصرہ'' میں جو کلکتہ کے رسالے ماڈرن ریویو میں نومبر 1935ء میں شائع ہوئے' اقبال کے نظریات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔

اقبال نے ان کے مضامین کا ایک نہایت جامع جواب بعنوان ''اسلام اور احمدیت'' تحریر کیا جو ''اسلام'' مورخہ 22 جنوری 1936ء میں شائع ہوا۔ اس طویل جوابی مضمون میں بھی' جو کئی بار چھپ چکا ہے انھوں نے مسئلہ ختم نبوت کے متعلق مسلمانوں کے موقف کی وضاحت کی۔ نیز ثابت کیا کہ مسلمانوں کے تنزل کا اصل سبب ملائیت' تصوف اور مطلق العنان سلطنت ایسی منفی قوتیں تھیں۔ پھر جدید ترکی میں سیکولر قسم کی اصلاحات کی مدافعت میں تحریر کیا کہ وہ اسلام کے منافی نہیں ہیں۔ آخر میں پنڈت جواہر لعل نہرو کے اس ریمارک کہ ان کے خیال میں سر آغا خان بھی صحیح العقیدہ مسلمان نہیں سمجھے جاتے، کے جواب میں اقبال نے آغا خان ہی کی ایک تقریر کا حوالہ دیا جس میں انھوں نے اپنے مریدوں کو ہدایت کی تھی کہ تم سب مسلمان ہو اور مسلمانوں کے ساتھ ہی رہ سکتے ہو۔ لہٰذا اپنے بچوں کے اسلامی نام رکھو۔ مسلمانوں کے ساتھ مل کر مساجد میں نماز ادا کرو روزے باقاعدہ رکھو اسلامی شریعت کے اصولوں کے مطابق شادیاں کرو اور سب مسلمانوں کو اپنے بھائی سمجھو۔ اس مضمون کا پورا احاطہ کر سکنا تو یہاں ممکن نہیں لیکن اقبال کا درج ذیل نکتہ یقیناً خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ 8

> ''ظاہر ہے ایک ہندوستانی قوم پرست (یعنی پنڈت نہرو) جس کے سیاسی آئیڈیلزم نے اس کی حقیقت کو پرکھنے کی حس کا خاتمہ کر رکھا ہے' یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے دل میں حق خود ارادیت کا جذبہ پیدا ہو۔ میرے نزدیک اس کی یہ سوچ غلط ہے کہ ہندوستانی نیشنلزم کے فروغ کے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ مختلف ثقافتی وحدتوں کو مکمل طور پر کچل دیا جائے۔''

بالآخر اپنے خط بنام پنڈت جواہر لعل نہرو مورخہ 21 جون 1936ء میں اقبال نے احمدیوں کے سیاسی رویہ کا تجزیہ کرتے ہوئے تحریر کیا' میرے ذہن میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔ 9

گذشتہ سالوں میں احمدی تحریک کے بارے میں اقبال کا نظریہ کیا تھا! احمدیت کی تردید کی ضرورت انھیں کیوں پڑی یا اس تحریک کے خلاف ان کے بیانات کس پس منظر میں دیے گئے؟ احمدیوں نے ان پر کیا کیا اعتراض کیے یا کیا کیا الزام لگائے؟ ان تمام سوالات پر علیحدہ بحث آگے آ رہی ہے...........

جنوری 1936ء کے ابتدائی ہفتوں میں اقبال اپنے مضمون ''اسلام اور احمدیت'' کی تکمیل میں مصروف تھے' اس لیے بھوپال جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ 10 16 فروری 1936ء کو ایڈیٹر اخبار ''لائیٹ'' نے ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کی موت کو بہانہ بنا کر اپنے افتتاحیہ کالم میں اقبال کی ذات پر حملہ

کیا۔ 11 اس کا پس منظر یہ ہے کہ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ احمدی عقیدہ رکھتے تھے اور انجمن حمایت اسلام کے ایک اہم رکن تھے۔ کیونکہ اس زمانہ میں احراری قادیانی نزاع نے پنجاب بھر کے مسلمانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر رکھی تھی' اس لیے اقبال نے بحیثیت صدر انجمن کو مشورہ دیا کہ اسے احمدیت کے متعلق اپنی پالیسی غیر مشتبہ الفاظ میں واضح کر دینی چاہیے۔ چنانچہ 2 فروری 1936ء کو انجمن کی جنرل کونسل نے زیر صدارت خلیفہ فضل حسین بہ تحریکِ عبدالمجید ایک قرارداد پیش کی جس میں ختم نبوت کے مسئلہ پر انجمن کے موقف کی وضاحت کی گئی تھی۔ اس سے پیشتر اسی موضوع پر انجمن کی طرف سے ایک اعلان بدیں مضمون بھی تیار کیا گیا تھا جو بعد میں اخبارات میں شائع ہوا کہ عقائد نبوت' وحی اور خاتمیت میں انجمن عامۃ المسلمین کی ہم نوا ہے اور کونسل اس امر کا اعلان ضروری سمجھتی ہے کہ مسئلہ ختم نبوت اسلام کا ایک اساسی اصول ہے اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی کسی رنگ میں نہیں آ سکتا۔ پس انجمن کا مسلک یہی ہے اور ایسا ہی رہے گا۔ خیر شیخ اکبر علی وکیل اور مولانا احمد علی نے قرارداد کی تائید کی۔ پھر انجمن کے ریکارڈ کے مطابق ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ نے نہ صرف قرارداد کی تائید کی بلکہ ارشاد فرمایا:

> ''جس صاحب کو جنرل کونسل کا رکن منتخب کرنا ہو اس سے پہلے اس اعلان (جو اخبارات میں شائع ہوا) کے مطابق ختم نبوت کے عقیدے کا عہد لیا جائے کہ وہ اسی مسلک پر کاربند ہے اور رہے گا۔''

اس کے بعد ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین نے سیکرٹری انجمن کی حیثیت سے صدر انجمن (یعنی اقبال) کے مطالبہ کی وضاحت کرتے ہوئے مندرجہ ذیل الفاظ میں قرارداد کی تائید کی:

> ''صدر محترم نے یہ محسوس کیا ہے کہ انجمن دن بدن مسلمانوں میں اپنا وقار کھو رہی ہے۔ جب تک احمدیت کے متعلق انجمن کی پالیسی غیر مشتبہ الفاظ میں واضح طور پر پبلک کے سامنے نہ کی جائے تب تک مسلمان مطمئن نہیں ہو سکتے اور ایک بڑی بات جس پر کہ مسلمانوں میں ہیجان تھا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی کسی رنگ میں آ سکتا ہے یا نہیں' اس ریزولیوشن میں اس کو واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔''

اس مرحلہ پر ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ جوش میں آ کر اٹھ کھڑے ہوئے اور چلا کر بولے:

> ''جناب ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب نے جو تشریح کی ہے وہ غلط ہے بلکہ مجازی رنگ میں نبی آ سکتا ہے۔''

مولوی غلام محی الدین ایڈووکیٹ نے انھیں ٹوکتے ہوئے کہا:

''انجمن عامۃ المسلمین پر اپنی جنرل کونسل کے ذریعہ واضح کرنا چاہتی ہے کہ انجمن عامۃ المسلمین کے ساتھ ہے۔ مرزا صاحب کو اختلاف پیدا نہیں کرنا چاہیے۔ اصولِ مندرجہ بالا کے علاوہ ان کا کوئی عقیدہ ہے تو وہ اسے اپنے تئیں رکھیں اور انجمن میں ذریعۂ اختلاف نہ بنائیں اور میں اس اعلان کی پرزور تائید کرتا ہوں۔''

ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ غصہ میں میٹنگ سے واک آؤٹ کر گئے۔ نو دن کے بعد ان پر فالج کا حملہ ہوا اور 11 فروری 1936ء کو رات کے گیارہ بجے فوت ہو گئے۔

انجمن کی اس کارروائی کے متعلق اخبار ''لائیٹ'' کے ایڈیٹر نے تحریر کیا کہ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کی موت کا باعث انجمن کا وہ اعلان تھا جو اقبال کے مطالبے پر جنرل کونسل نے احمدیت کے بارے میں 2 فروری 1936ء کو تیار کر کے اپنے اخبار ''حمایتِ اسلام'' مورخہ 6 فروری 1936ء میں شائع کیا۔ مزید لکھا کہ اقبال نے انھیں کافر کہا تھا اور انجمن سے مطالبہ کیا تھا کہ جب تک ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کو انجمن کی ممبری سے الگ نہیں کیا جاتا وہ صدارت قبول نہ کریں گے۔ بعدازاں ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین نے کونسل میں محولہ بالا اعلان کی بابت قرارداد پاس کرتے وقت ان کے خلاف متشددانہ رویہ اختیار کیا۔ چنانچہ وہ اپنی طبعی موت نہیں مرے بلکہ وہ انجمن سے حق کے لیے جہاد کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اس کے بعد ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ایڈیٹر نے اقبال کے بارے میں تحریر کیا:

''ایک بہترین صبح کو ڈاکٹر محمد اقبال نے یہ خیال کیا کہ مرزا یعقوب بیگ کافر ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر اقبال نے انجمن حمایتِ اسلام کو چیلنج بھیج دیا کہ مرزا یعقوب بیگ کو الگ کر دیا جائے۔ جیسا کہ وہ اس احسان فراموش اور بے ضمیر کتوں کی جماعت میں بوجہ اپنی شرافت کے رہنے کے قابل نہ تھا۔ خدا نے اس کو اپنی طرف بلا لیا۔ ہم ڈاکٹر محمد اقبال اور اس کے رہزن گروہ کو مبارک باد دیتے ہیں کہ اب گندہ آدمی دنیا میں نہیں رہا اور ڈاکٹر صاحب انجمن کی کرسی صدارت کو زینت بخشیں۔''

سیکرٹری انجمن ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین کے متعلق لکھا:

''ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین کی بابت یہ رپورٹ ملی ہے کہ انھوں نے خاص طور پر جنرل کونسل میں متشددانہ رویہ اختیار کیا ہے اور جونہی کہ وہ (ڈاکٹر مرزا یعقوب

بیگ)اس میٹنگ سے باہر آئے ان پر فالج گرا اور 11 فروری 1936ء کو رات
کے گیارہ بجے مر گئے۔ پس ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ اسلام کے شہید ہیں۔"

اقبال نے "لائیٹ" کے لگائے گئے الزامات کا نوٹس نہ لیا۔ البتہ ہفت روزہ "حمایتِ اسلام" نے جنرل کونسل کی کارروائی کی تفصیل پیش کرتے ہوئے واضح کیا کہ یہ سراسر غلط ہے کہ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ جونہی میٹنگ سے باہر نکلے اور مر گئے۔ پس شہید اسلام ہیں۔ دراصل کونسل کا اجلاس 2 فروری 1936ء کو منعقد ہوا تھا اور ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ 11 فروری 1936ء کو فوت ہوئے..........

اب احمدیت کی تردید میں اقبال کی تحریروں کے پس منظر پر بحث کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے ان تحریروں کے سبب اقبال احمدیوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے۔ ان کی وفات کے پندرہ سولہ برس بعد' اضطرابات پنجاب کے سلسلہ میں منیر انکوائری کمیشن کے سامنے شہادت دیتے ہوئے ایک احمدی گواہ نے اپنے بیان میں کہا کہ اقبال نے مرزا غلام احمد کی بیعت کی تھی اور 1930ء تا 1931ء تک اس بیعت کے پابند رہے لیکن اس کے بعد کشمیر کمیٹی میں مرزا بشیر الدین محمود اور اقبال کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے جس کے نتیجہ میں انھوں نے احمدیت کے خلاف بیانات دینا شروع کر دیے۔ جرح کے دوران گواہ نے پہلے تو کہا کہ یہ بیعت 1893ء یا 1894ء میں ہوئی تھی پھر کہا کہ 1897ء میں ہوئی تھی۔ بعد ازاں گواہ نے اپنی شہادت کے کسی اور حصہ میں بتایا کہ اقبال 1930ء تک مرزا غلام احمد کو مجدد مانتے رہے' پھر کہا کہ اس نے اپنے بیان میں یہ کہیں بھی نہیں کہا کہ اقبال احمدی تھے۔ 12 اسی طرح بعض احمدی حلقوں کی طرف سے یہ مشہور کرنے کی کوشش کی گئی کہ اقبال کا احمدیت کے ساتھ گہرا تعلق رہا۔ ان کے خاندان کے کئی افراد نے احمدیت کو قبول کیا۔ ان کے والد احمدی تھے۔ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد احمدی تھے اور ان کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد احمدی ہیں' جنھیں اقبال نے وصیت نامہ میں اپنے نابالغ بچوں کے اولیاء کی فہرست میں شامل کیا تھا۔ پس اگر بعد میں وہ احمدیت کے خلاف ہو گئے تو اس کی وجوہات ذاتی اور سیاسی تھیں۔ 13

اقبال کی زندگی میں ان کے احمدی نقادوں نے ان کے متعلق یہ باتیں نہ کہی تھیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد کی سوچ بچار کا نتیجہ ہیں۔ بہر حال اس بات میں کوئی صداقت نہیں کہ اقبال نے اپنی زندگی کے کسی مرحلہ پر مرزا غلام احمد قادیانی کی بیعت کی یا احمدیت کے ساتھ ان کا گہرا تعلق رہا۔ اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ان کے والد شیخ نور محمد احمدی تھے۔ البتہ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے اپنی زندگی کے ایک حصہ میں احمدی مسلک قبول کیا اور کچھ مدت تک جماعت احمدیہ میں شامل رہے۔ مگر بقول ان کے فرزند شیخ مختار احمد اور دختران عنایت بیگم و وسیمہ بیگم بعد ازاں احمدیت کو ترک کر

کے جماعت سے رشتہ توڑ دیا۔ شیخ عطا محمد اقبال کی وفات کے تقریباً دو سال بعد 22 دسمبر 1940ء کو سیالکوٹ میں فوت ہوئے اور انھیں امام صاحب کے معروف قبرستان میں دفنایا گیا۔ ان کے جنازے میں راقم بھی شریک تھا۔ نمازِ جنازہ شہر کے ایک سنی امام مولوی سکندر خان نے پڑھائی۔ البتہ شیخ اعجاز احمد اور ان کے چند احمدی احباب نے غالباً شیخ عطا محمد کے گذشتہ یا مفروضہ عقیدے کے پیش نظر علیحدہ نماز جنازہ پڑھی۔ شیخ عطا محمد کی اولاد میں صرف شیخ اعجاز احمد احمدی عقیدہ رکھتے ہیں۔ اقبال نے وصیت نامہ میں ان کا نام برادر زادہ ہونے کی حیثیت سے اور ان کی صالحیت کی بنا پر اپنے نابالغ بچوں کے اولیاء کی فہرست میں شامل کیا تھا۔ یہ وصیت نامہ انھوں نے احمدیت کے خلاف اپنا پہلا بیان دینے کے پانچ ماہ بعد لکھا۔ لیکن تقریباً دو سال بعد وہ شیخ اعجاز احمد کی جگہ سر راس مسعود کو گارڈین نامزد کرنا چاہتے تھے۔ جیسا کہ ان کے خط مورخہ 10 جون 1937ء بنام سر راس مسعود سے ظاہر ہے، دیگر اولیاء کا ذکر کرنے کے بعد تحریر کرتے ہیں:14

> ''نمبر 3 شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے۔ نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس کے علاوہ وہ خود بہت عیالدار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو گارڈین مقرر کروں۔ مجھے امید ہے کہ تمھیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔'' ....
>
> شیخ اعجاز احمد کی صالحیت کی ایک مثال یہ ہے کہ انھوں نے آج تک کسی پر اپنا عقیدہ ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی۔ لہٰذا ان کی اولاد جو دو بیٹوں اور تین بیٹیوں پر مشتمل ہے، میں سے کوئی بھی ان کے عقیدے یا مسلک کا حامی نہیں، بلکہ ختم نبوت کے مسئلہ پر ان سب کا موقف وہی ہے جو عام مسلمانوں کا موقف ہے۔............

اب اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ختم نبوت کے مسئلہ کے متعلق ابتدا ہی سے اقبال کا اپنا ذاتی موقف کیا تھا' اس ضمن میں سب سے پہلے راقم اقبال کی نظم بعنوان ''اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں کو'' کا حوالہ دینا چاہتا ہے۔ یہ نظم انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ اجلاس منعقدہ 22 فروری 1902ء میں پڑھی گئی۔ اس نظم کے نویں بند میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توصیف کی گئی ہے اور درجِ ذیل شعر میں اقبال فرماتے ہیں:15

اے کہ بعد از تُو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک
بزم را روشن زنورِ شمعِ عرفاں کردہ ای

اس شعر کو نظم میں شامل کرنے سے صاف ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں عقیدۂ ختم نبوت کے بارے میں احمدیت نے جو الجھاؤ پیدا کر دیا تھا اور جس کے باعث مسلمانوں کے ذہن مضطرب تھے' اس کی تردید مقصود تھی۔ ورنہ کسی بھی مفہوم میں ختم نبوت کے عقیدے کو تسلیم نہ کرنا اقبال کے نزدیک شرک فی النبوت کیوں قرار پاتا۔

اس کے بعد اقبال کی ایک اور نظم بعنوان ''خطِ منظوم پیغامِ بیعت کے جواب میں'' خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔ یہ نظم مخزن بابت مئی 1902ء میں اور پھر محمد دین فوق کے اخبار ''پنجۂ فولاد'' مورخہ 11 جون 1902ء میں شائع ہوئی۔ اس نظم کے عنوان ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ بقول محمد عبداللہ قریشی' اقبال پر بھی احمدیت قبول کرنے کے لیے ڈورے ڈالے گئے۔ 16 اس نظم کو احمدی ہفت روزہ ''الحکم'' قادیان نے اپنی 10 , 17 اور 24 جنوری 1903ء کی اشاعت میں نقل کیا اور ساتھ ہی مرزا غلام احمد قادیانی کے ایک مخلص مرید سیّد حامد شاہ کی طرف سے اس کا منظوم جواب بھی شائع کیا۔ محمد عبداللہ قریشی کی رائے میں چونکہ سیّد حامد شاہ مولانا سیّد میر حسن کے عزیزوں میں سے تھے اور اقبال کے دوست اور ہم محلہ تھے' اس لیے عین ممکن ہے کہ اس قرب کی وجہ سے انھوں نے ہی اقبال کو مرزا غلام احمد کی بیعت کے لیے لکھا ہو جس کا جواب اقبال نے اس نظم کے ذریعے دیا۔ 17 اس نظم کے مطالعہ سے عیاں ہے کہ وہ احمدیت کو ملت اسلامیہ میں ایک علیحدگی پسند تحریک سمجھ کر ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے' کیونکہ مسلمانوں کے اتحاد کو برقرار رکھنا ان کے ایمان کا لازمی جزو تھا۔ فرماتے ہیں: 18

پردۂ میم میں رہے کوئی
اس بھلاوے کو جانتا ہوں میں
تنکے چن چن کے باغِ الفت کے
آشیانہ بنا رہا ہوں میں
ایک دانہ پہ ہے نظر تیری
اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں
تُو جدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے

ایسی عبادت کو کیا سراہوں میں
مرگِ اغیار پہ خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہوں میں
میرے رونے پہ ہنس رہا ہے تُو
تیرے ہنسنے کو رو رہا ہوں میں

ان کی انگلستان سے واپسی کے چند برس بعد اخبار ''الحکم'' قادیان مورخہ 28 اگست 1910ء میں ایک خبر شائع ہوئی کہ شیخ یعقوب علی تراب کی نواسی کا نکاح بعد از نماز مغرب پانچ سو روپے حق مہر پر ڈاکٹر محمد اقبال سے ہوا۔ اقبال کے احباب واعزہ کو تعجب ہوا کہ انھوں نے قادیان جا کر احمدیوں سے رشتہ ناطہ جوڑ لیا، جن کے عقائد کے وہ خلاف تھے۔ اقبال کو اس بے سروپا خبر کی تردید چھپوانی پڑی جو ''پیسہ اخبار'' مورخہ 15 ستمبر 1910ء میں شائع ہوئی۔ فرمایا:[19]

''اس عبارت سے میرے اکثر احباب کو غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے مجھ سے زبانی اور بذریعہ خطوط استفسار کیا ہے۔ سب حضرات کی آگاہی کے لیے بذریعہ آپ کے اخبار کے اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مجھے اس معاملہ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ جن ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کا ذکر ایڈیٹر صاحب ''الحکم'' نے کیا ہے وہ کوئی اور صاحب ہوں گے۔''

احمدی اخبار ''الفضل'' مورخہ 9 اکتوبر 1915ء میں ایک مضمون بعنوان ''جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب کی رائے اختلاف جماعت احمدیہ کے بارے میں'' شائع ہوا۔ یہ مضمون سیّد انعام اللہ شاہ سیالکوٹی کا تحریر کردہ تھا اور احمدیوں میں قادیان پارٹی اور لاہوری پارٹی کے اختلاف سے متعلق تھا۔ اس مضمون میں اقبال سے یہ کلمہ منسوب کیا گیا کہ عقائد کے لحاظ سے قادیان والے سچے ہیں لیکن مجھے لاہور والوں سے ہمدردی ہے۔ اقبال کو اس کی تردید بھی بذریعہ خط بنام ایڈیٹر کرنی پڑی جو ''پیغام صلح'' مورخہ 13 نومبر 1915ء میں شائع ہوئی۔ اپنی پوزیشن کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا:[20]

''اختلاف سلسلہ احمدیہ کے متعلق وہی شخص رائے دے سکتا ہے جو مرزا صاحب مرحوم کی تصانیف سے پوری آگاہی رکھتا ہو اور یہ آگاہی مجھے حاصل نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بدیہی ہے کہ ایک غیر احمدی مسلمان جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی نبی کے آنے کا قائل نہ ہو وہ کس طرح یہ بات کہہ سکتا ہے کہ عقائد کے لحاظ سے قادیان والے سچے ہیں۔''

بہر حال ختم نبوت اور دیگر متعلقہ مسائل پر وقتاً فوقتاً اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار بعد کی تحریروں اور منظومات میں بھی کیا ہے، جن سے احمدی عقائد کی تردید ہوتی ہے۔ مندرجہ بالا مثالوں سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ 1935ء ہی میں پہلی بار انھوں نے ختم نبوت کے مسئلہ پر احمدی عقائد کو اپنی تنقید کا نشانہ نہیں بنایا بلکہ گذشتہ کئی برسوں سے وہ ان کی تردید کرتے چلے آرہے تھے۔ فرق اتنا تھا کہ 1935ء سے پیشتر انھوں نے اس سلسلہ میں کبھی مناظرانہ رویہ اختیار نہ کیا تھا۔ اقبال نے عالم دین ہونے کا دعویٰ کبھی نہیں کیا، نہ ہی وہ مسلمانوں میں موجود مختلف فرقوں کے دینی اختلافات پر کسی رائے کا اظہار کرنا پسند کرتے تھے، کیونکہ ان کا نصب العین منتشر ملت اسلامیہ میں اتفاق کے فروغ کے ذریعہ اتحاد و یگانگت کو وجود میں لانا تھا۔............

سو 1935ء سے پیشتر انھوں نے ختم نبوت اور متعلقہ مسائل پر کبھی احمدیوں سے مناظرہ کرنے کا قصد نہ کیا تھا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے! اس کا جواب ڈھونڈنے کے لیے 1902ء سے بھی پیچھے جانے کی ضرورت ہے۔

اقبال کی ولادت سے پیشتر مرزا غلام احمد قادیانی سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں چار پانچ برس سیالکوٹ میں مقیم رہے اور اس زمانہ میں وہ عیسائی مشنریوں اور آریہ ساجیوں کے اسلام پر پے در پے حملوں کا جواب دیتے اور ان سے مناظرہ کیا کرتے تھے۔ اسی سبب سے ایک عالم دین کی حیثیت سے سیالکوٹ کے لوگ ان کی تعظیم کرتے تھے اور وہاں کے دیگر علماء و فضلا مثلاً مولانا غلام حسن، مولانا سیّد میر حسن وغیرہ کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے جہاں تک اقبال کے والد شیخ نور محمد کا تعلق ہے، وہ چونکہ مولانا غلام حسن اور مولانا سیّد میر حسن کے خاص دوستوں اور ہم نشینوں میں سے تھے، اس لیے مرزا غلام احمد کو جانتے تھے۔ سیّد تقی شاہ فرزند مولانا سیّد میر حسن فرماتے ہیں کہ جب عیسائی مشنریوں کے ساتھ مرزا غلام احمد کے مناظرے ہوا کرتے تو مولانا سیّد میر حسن کو حکم بنایا جاتا تھا۔[21] بہر حال مرزا غلام احمد سیالکوٹ سے رخصت ہو گئے۔ خاصی مدت کے بعد انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا اور ایک دو سال بعد پھر سیالکوٹ تشریف لے آئے۔ یہ اقبال کی طالب علمی کا دور تھا۔ سیالکوٹ میں مرزا غلام احمد کا قیام اقبال کے گھر کے قریب تھا۔ اس لیے اقبال انھیں گلیوں میں آتے جاتے دیکھتے تھے۔ سیالکوٹ کے علماء نے مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ شہر کے لوگوں میں ان کی مخالفت روز بروز بڑھنے لگی۔ اس مرحلے پر مولانا سیّد میر حسن نے سر سیّد احمد خان کو ایک خط لکھا اور مرزا غلام احمد کی نبوت کے بارے میں ان کی رائے پوچھی۔ سر سیّد نے انھیں اپنے خط مؤرخہ 9 دسمبر 1891ء میں جواب دیا:[22]

"مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے کیوں لوگ پیچھے پڑے ہیں۔ اگر ان کے نزدیک ان کو الہام ہوتا ہے تو بہتر ہم کو اس سے کیا فائدہ۔ نہ ہمارے دین کے کام کا نہ دنیا کے۔ ان کا الہام ان کو مبارک ہے۔ اگر انھیں ہوتا ہے اور صرف ان کے توہمات اور خللِ دماغ کا نتیجہ ہے' تو ہم کو اس سے کیا نقصان ہے' وہ جو ہوں سو ہوں' اپنے لیے ہیں۔ میں سنتا ہوں آدمی نیک' بختاور' نمازی پرہیزگار ہیں۔ یہی ان کی بزرگداشت کو کافی ہے۔ جھگڑا اور تکرار کس بات کا ہے ان کی تصانیف میں نے دیکھیں۔ وہ اس قسم کی ہیں جیسا کہ ان کا الہام' نہ دین کے کام کی نہ دنیا کے کام کی۔ مولوی حکیم نورالدین کی کوئی تحریر میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ دینیات میں کسی کا الہام جب تک اس کو شارع تسلیم نہ کر لیا جائے کسی کام کا نہیں۔" ....

ایک نکتہ جسے پوری طرح سمجھے بغیر بحث کو آگے نہیں بڑھایا جا سکتا' یہ ہے کہ اقبال نے کبھی بھی سیاست کو دین سے الگ تصور نہ کیا۔ ان کے سوانح حیات کے مطالعہ سے عیاں ہے کہ وہ سیکولر سیاست کے قائل نہ تھے اور نہ کبھی اس میں ملوث ہوئے۔ ان کے ہاں سیاست سے مراد مسلمانانِ برصغیر کے مفادات کا بہر صورت تحفظ تھا۔ ملت اسلامیہ کے اتحاد' یگانگت' یک جہتی اور سالمیت کی خاطر وہ اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار تھے اور یہ جذبہ شروع سے لے کر آخر تک ان کے دل و دماغ پر حاوی رہا۔ پس اقبال کے ضمن میں جب سیاست کی اصطلاح استعمال کی جائے تو اس کے معانی ہوں گے مسلمانان برصغیر کے مفادات کا تحفظ' کیونکہ یہی تمام عمر اقبال کی سب سے اہم سیاسی غرض رہی۔

اس مرحلہ پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ 1935ء سے قبل ختم نبوت کے مسئلہ پر احمدی عقائد کو اپنی تنقید کا نشانہ بنانے کے باوجود اقبال کے جماعت احمدیہ کو دائرہ اسلام سے خارج قرار نہ دینے میں کیا سیاسی مصلحت تھی؟ بالفاظ دیگر اگر بقول اقبال' انھیں تحریک احمدیہ سے اچھے نتائج کی توقع تھی تو وہ اچھے نتائج کیا ہو سکتے تھے۔ برصغیر کے بیشتر علماء نے تو ابتدا ہی سے مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور اسی طرح ختم نبوت اور دیگر متعلقہ مسائل کے بارے میں بھی احمدی عقائد پر شدید اعتراضات کے باعث ان کا مطالبہ تھا کہ احمدیوں کو ایک علیحدہ مذہبی فرقہ قرار دے دیا جائے۔ علاوہ ازیں عام مسلمان بھی احمدیوں کو غیر مسلم سمجھنے لگے تھے۔ بقول سیّد شمس الحسن 1931ء میں جب سر ظفر اللہ خان کو مسلم لیگ کا صدر بنایا گیا تو دہلی کے مسلمانوں نے شدید احتجاج اور مظاہرہ کیا کیونکہ وہ سر ظفر اللہ خان کو احمدی ہونے کی وجہ سے غیر مسلم سمجھتے تھے اور مزید مظاہروں کے خوف سے لیگ کا سالانہ

اجلاس فتح پوری سکول ہال کے بجائے سیّد نواب علی نامی ایک ٹھیکہ دار کے گھر میں منعقد کیا گیا۔
.........23

آل انڈیا کشمیر کمیٹی میں اقبال کو تحریک احمدیہ کے ارکان کے ساتھ کام کرتے وقت کس قسم کا تجربہ حاصل ہوا! کشمیر کمیٹی کے صدر مرزا بشیر الدین محمود مقرر کیے گئے تھے اور سیکرٹری عبدالرحیم درد (یعنی دونوں اہم عہدے احمدیوں کو سونپے گئے تھے) ان کے علاوہ کمیٹی کے دیگر ارکان مسلمان بھی تھے اور احمدی بھی۔ جولائی 1931ء میں کمیٹی قائم کرتے وقت چونکہ خیال تھا کہ یہ ایک عارضی تنظیم ہے۔ لہٰذا اس کے لیے کسی قسم کا دستور وضع کرنے یا قواعد وضوابط مرتب کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ صدر اور سیکرٹری کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ دو ایک برس میں احمدی ارکان پر الزام لگا کہ وہ کشمیر کمیٹی کو احمدیت کی تبلیغ کی خاطر استعمال کر رہے ہیں اور اس کے ذریعے ان کا اصل مقصد کشمیری مسلمانوں کو احمدی بنانا ہے۔ اب شیخ اعجاز احمد کے نزدیک یہ سب احمدیوں کے خلاف احراریوں کا پراپیگنڈا تھا اور ان کے دباؤ یا ڈرانے دھمکانے کے پیش نظر اقبال جیسی شخصیت نے بھی اس الزام کو درست تسلیم کر لیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جماعت احمدیہ کے ممبران اپنے عقیدے کی نشر و اشاعت یا تبلیغ میں جوش وخروش کے اظہار کی وجہ سے مشہور یا بدنام نہیں ہیں؟ اگر واقعی ایسا ہے تو اس تہمت پر یقین کرنے والے حق بجانب بھی سمجھے جا سکتے تھے۔

بہر حال کشمیر کمیٹی کے بعض ارکان نے' جن میں اقبال بھی شامل تھے' تجویز پیش کی کہ چونکہ کمیٹی کو بحیثیت ایک تنظیم ابھی کچھ مدت تک قائم رکھنا پڑے گا' اس لیے اس کی خاطر دستور اور قواعد و ضوابط وضع کر لینے چاہئیں تا کہ ہر کام ان کے مطابق انجام دیا جا سکے اور کسی کو کسی کے خلاف شکایت کرنے کا موقع نہ ملے۔ احمدی ارکان کو یہ تجویز منظور نہ تھی کیونکہ ان کی دانست میں اس کا مقصد ان کے امیر کے لامحدود اختیارات کو محدود کرنا تھا۔ پس اس مرحلہ پر مرزا بشیر الدین محمود کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہو گئے لیکن شیخ اعجاز احمد کے نزدیک یہ حقیقت نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ احراریوں نے اقبال کے ساتھ سازش کر کے فیصلہ کیا تھا کہ مرزا بشیر الدین محمود کو کشمیر کمیٹی کی صدارت سے علیحدہ کیا جائے۔ چنانچہ اس فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' میں خبر شائع کرائی گئی کہ کشمیر کمیٹی کا صدر غیر قادیانی مسلمان ہونا چاہیے اور اس کے بعد مرزا بشیر الدین محمود کو کمیٹی کا اجلاس برائے انتخاب عہدہ داران بلانے کے لیے تحریر کیا گیا۔ انھوں نے وہ اجلاس بلوایا اور انتخاب عہدہ داران کے لیے رستہ صاف کرنے کی غرض سے اپنا استعفا پیش کر دیا۔ یہاں بھی ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا کشمیری مسلمانوں میں احمدی عقیدے کی تبلیغ کے الزام کو غلط ثابت کرنے کے لیے احمدی ارکان نے کوئی قدم اٹھایا! جواب

ہے۔نہیں اس کی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ مرزا بشیر الدین محمود نے اپنا استعفا پیش کر دیا تھا۔

مرزا بشیر الدین محمود کی جگہ اقبال کو کشمیر کمیٹی کا قائم مقام صدر منتخب کیا گیا اور جب اقبال نے کمیٹی کے دستور کا مسودہ تیار کر کے اجلاس میں پیش کیا تو احمدی ارکان نے ان کی مخالفت کی۔ بلکہ دورانِ بحث اقبال پر واضح کر دیا کہ احمدیوں کے نزدیک کشمیر کمیٹی یا مسلمانوں کی کسی بھی تنظیم کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ وہ اپنے عقیدے کے مطابق کسی وفاداری کے پابند ہیں تو صرف ان کی امیر کے ساتھ وفاداری ہے۔یعنی وہ مسلمانوں کی اکثریت کی بنا پر وضع کیے ہوئے کسی دستور کے پابند نہیں ہو سکتے بلکہ وہ تو وہی کریں گے جو ان کے امیر کا حکم ہوگا۔ بالفاظِ دیگر احمدی بظاہر کشمیر کمیٹی کو قائم رکھتے ہوئے اسے اندر سے دو حصوں یعنی مسلمانوں اور احمدیوں میں تقسیم کرنے کے درپے تھے۔ یہ صورت اقبال کے لیے ناقابلِ قبول تھی، اس لیے انھوں نے کشمیر کمیٹی سے استعفا دے دیا اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ اگر مسلمانانِ ہند اپنے کشمیری بھائیوں کی امداد اور رہنمائی کرنا چاہتے ہیں تو کوئی اور کشمیر کمیٹی بنائیں جو صرف مسلمانوں پر مشتمل ہو۔لیکن شیخ اعجاز احمد فرماتے ہیں کہ اقبال احراریوں کے ایماء پر کشمیر کمیٹی کی تخریب میں مصروف ہو گئے اور احراریوں کی حوصلہ افزائی کرنے لگے...... بعد میں احمدیوں نے ''تحریکِ کشمیر'' کے نام سے ایک نئی جماعت قائم کی اور اقبال کو اس کی صدارت پیش کی لیکن اقبال نے اس پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے اپنے بیان مورخہ 2 اکتوبر 1933ء میں فرمایا: 24

> ''قادیانی ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے ابھی تک ایسا کوئی واضح اعلان جاری نہیں ہوا کہ اگر قادیانی حضرات مسلمانوں کی کسی سیاسی تنظیم میں شامل ہوں گے تو ان کی وفاداریاں منقسم نہیں ہوں گی۔ دوسری طرف واقعاتی طور پر یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ جسے قادیانی پریس ''تحریکِ کشمیر'' کے نام سے پکارتا ہے اور جس میں بقول قادیانی اخبار ''الفضل'' مسلمانوں کو محض اخلاقی طور پر شامل ہونے کی اجازت دی گئی ہے، ایک ایسی تنظیم ہے، جس کے مقاصد اور محرکات آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے مختلف ہیں۔''

شیخ اعجاز احمد فرماتے ہیں کہ احمدیت کے خلاف محاذ آرائی کے ایام میں جب اقبال سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ تو اس فرقہ کو ''اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ'' سمجھتے تھے، تو جواب میں انھوں نے اعتراف کیا کہ پچیس برس پیشتر انھیں اس تحریک سے اچھے نتائج برآمد ہونے کی توقعات تھیں لیکن انھیں اس وقت شکوک پیدا ہوئے جب بانیٔ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت سے برتر ایک نئی نبوت کا دعویٰ کیا گیا۔ اس کے بعد شیخ اعجاز احمد فرماتے ہیں کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت سے

برتر نبوت کے دعوے کی تہمت احراریوں اور اقبال کے حاشیہ نشینوں نے انھیں احمدیت کے خلاف بھڑکانے کے لیے تراشی تھی لیکن افسوس ہے شیخ اعجاز احمد نے اس ضمن میں اقبال کا پورا فقرہ درج نہیں کیا۔ اقبال فرماتے ہیں:25

''ذاتی طور پر مجھے اس تحریک کے متعلق اس وقت شبہات پیدا ہوئے جب ایک نئی نبوت' جو بانیِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت سے بھی برتر تھی' کا دعویٰ کیا گیا اور تمام عالم اسلام کے کافر ہونے کا اعلان کیا گیا۔ بعد ازاں میرے شبہات نے اس وقت مکمل بغاوت کی صورت اختیار کر لی' جب میں نے اپنے کانوں سے اس تحریک کے ایک رکن کو پیغمبرِ اسلام کے بارے میں نہایت نازیبا زبان استعمال کرتے ہوئے سنا۔''

پس یہ محض احراریوں یا حاشیہ نشینوں کے بھڑکانے کا نتیجہ نہ تھا۔ اقبال کے اپنے کان بھی تو تھے' جنھیں وہ سننے کے لیے استعمال میں لاتے تھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ممکن ہے بقول شیخ اعجاز احمد' بانیِ سلسلہ احمدیہ نے کبھی حضور رسالت مآب کی نبوت سے برتر نبوت کا دعویٰ نہ کیا ہو اور نہ کوئی احمدی بانیِ سلسلہ احمدیہ کو سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے برتر یقین کرتا ہو' مگر کسی بھی مفہوم میں ختم نبوت کے عقیدے کو تسلیم نہ کرنے میں یہی تو قباحت ہے کہ یوں بعد کی نئی نبوت کی برتری کے اظہار کی طرح ڈالی جاسکتی ہے یا ایسے منفی اندازِ فکر کے لیے دروازہ کھل جانے کا امکان ہے۔ عین ممکن ہے کہ شیخ اعجاز احمد یا دیگر احمدیوں کا عقیدہ وہی ہو جو انھوں نے بیان کیا ہے لیکن جس بدبخت کی باتوں کو اقبال نے اپنے کانوں سے سنا' وہ بھی تو اپنے آپ کو تحریک احمدیہ کا رکن ہی سمجھتا تھا۔

شیخ اعجاز احمد کا خیال ہے کہ اقبال اپنی خداداد عقل و دانش کے ساتھ ساتھ بچوں کی طرح معصوم اور بھولے بھالے تھے۔ سنی سنائی بات کا بغیر تحقیق کیے یقین کر لیتے۔ اس ضمن میں انھوں نے اقبال کے بھولپن کی تین مثالیں پیش کی ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ تحریک احمدیہ کے عقائد کے متعلق بھی انھوں نے سنی سنائی باتوں کا بغیر تحقیق کیے یقین کر لیا تھا۔ راقم کی رائے میں ایک ایسا شخص جو ہندو رہنماؤں یا انگریز حاکموں کی سیاسی چالوں کو پوری طرح سمجھتا ہو' جس کی نخ بستہ منطق نے واضح کیا ہو کہ مسلمانوں کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ علیحدہ نیابت کے مطالبے کو کسی قیمت پر بھی نہ چھوڑیں جو ایک تجربہ کار وکیل کی حیثیت سے انفرادی یا اجتماعی لین دین کے معاملات میں اپنی فلسفہ دانی یا شاعرانہ تخیل کے باوجود عملی اور کاروباری قسم کا آدمی ہو اس سے ایسے معصومیت یا بھولپن کی توقع رکھنا یا یہ سمجھنا کہ اس نے سنی سنائی باتوں پر یقین کر کے احمدیت کے خلاف بلاوجہ شور مچا دیا' قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ اعجاز احمد

اقبال کے تمام سوانح حیات میں غالباً یہی تین مثالیں ان کے بھولپن کی پیش کر سکتے تھے۔ مگر راقم کے نزدیک یہ مثالیں اقبال کے بھولپن کو ثابت کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔ مثلاً سردار بیگم کے ساتھ نکاح کے بعد بعض گمنام خطوں پر ان کا یقین کر لینا اور پھر اپنی غلطی پر پشیمان ہونا' ان کا بھولپن ظاہر نہیں کرتا بلکہ ذہنی اضطراب یا بے چینی کی کیفیت کی طرف اشارہ کرتا ہے کیونکہ ان کی پہلی شادی ناکام رہی تھی اور وہ دوسری بار ضرورت سے زیادہ محتاط ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ پھر یہ کہنا کہ کسی کی گپ پر اعتبار کرتے ہوئے انھوں نے یقین کر لیا کہ روس کا نیا صدر محمد استالین مسلمان ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وسط ایشیا کے مسلمانوں کو مرعوب کرنے کے لیے یا انھیں اپنا مطیع رکھنے کی خاطر شروع میں روسی کمیونسٹوں نے اسی قسم کا پراپیگنڈا کیا تھا اور عین ممکن ہے کہ یہ پراپیگنڈا سرحدیں عبور کر کے برصغیر میں بھی پہنچا ہو۔ اقبال نے غالباً اسی پراپیگنڈا سے متاثر ہو کر اپنے بڑے بھائی کو یہ خوشخبری سنائی لیکن بعد میں تحقیق پر یہ خبر غلط ثابت ہوئی۔ اسی طرح اس زمانے میں مغربی پریس دنیائے اسلام میں اس قسم کی غلط خبروں کی تشہیر بطور پالیسی کیا کرتا تھا کہ کسی ملک کے مسلمانوں نے نماز سے پہلے وضو اڑا دیا' یا کسی مسلم ملک میں نماز میں تبدیلیاں کر دی گئیں یا ایسی تحریک دیگر مسلم ممالک میں بھی جاری ہے۔ اس پراپیگنڈے کا مقصد دنیائے اسلام کے حصے بخرے کرنا یا اس میں انتشار پھیلانا تھا اور اس قسم کا طرز عمل آج بھی یہود نواز مغربی پریس اختیار کر لیتا ہے۔ اس اعتبار سے ایسی خبروں سے اقبال کا دل گرفتہ ہونا ان کے بھولپن یا معصومیت کا ثبوت فراہم نہیں کرتا بلکہ ملتِ اسلامیہ کے متعلق ان کی فکر مندی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کشمیر کمیٹی میں اقبال اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر احمدیوں سے مایوس ہوئے تھے۔

شیخ اعجاز احمد سمجھتے ہیں کہ کشمیر کمیٹی کے قیام کے دوران اقبال اور جماعت احمدیہ کے تعاون میں احراری رخنہ انداز ہوئے اور انھوں نے اقبال کو ڈرا دھمکا کر اپنے ساتھ مفاہمت کرنے کی راہ ہموار کی۔ پس اسی مفاہمت کے پس منظر میں اقبال اور احراریوں کی سازش کے ذریعہ مرزا بشیر الدین محمود کو کشمیر کمیٹی کی صدارت سے الگ کیا گیا اور بعد میں اقبال' مجلسِ احرار کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ بقول ان کے احراریوں نے احمدی عقائد کے متعلق بے بنیاد باتیں تراش کر اقبال کے عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایکس پلائیٹ کرتے ہوئے انھیں احمدیت کے خلاف بھڑکایا اور اقبال نے بغیر تحقیق کیے ان کی باتوں کو درست تسلیم کر لیا۔

کشمیر کمیٹی میں احمدیوں کے ساتھ مل کر کام کرنے میں اقبال کا ذاتی تجربہ تھا' علاوہ ازیں ضمن میں ان کے بیانات سے ظاہر ہے کہ وہ احمدیوں سے مایوس ہوئے تھے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اقبال احمدیوں سے من حیث الجماعت 1933ء میں مایوس ہوئے لیکن انھوں نے تحریکِ

احمدیہ کے خلاف اپنا پہلا بیان دو سال بعد یعنی 1935ء میں جاری کیا۔ احراریوں کی جماعت احمدیہ سے پرانی عداوت تھی اور جب اقبال کشمیر کمیٹی میں احمدیوں سے مایوس ہوئے تو عین ممکن ہے کہ احراریوں نے احمدیوں کے خلاف ان سے مفاہمت کرنے کی کوشش کی ہو کیونکہ یہ صورت حال دونوں فریقوں کو ایک دوسرے کے قریب تر لانے کا ذریعہ بنتی تھی مگر اس صورت حال کے صحیح تجزیہ کے لیے تین چار دیگر امور بھی ذہن میں رکھنے چاہئیں، جنھوں نے مستقبل میں بالخصوص پنجاب کی مسلم سیاست پر اثر انداز ہونا تھا۔ یہ امور تھے: کمیونل ایوارڈ' محمد علی جناح کے ہاتھوں 1934ء میں مسلم لیگ کا احیاء 1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت صوبائی خود مختاری کا مسئلہ' سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی کا پروگرام اور پنجاب میں مسلم اکثریت کو بروئے کار لانے کے سلسلہ میں درپیش خطرات' ان امور کے پس منظر میں محمد علی جناح' اقبال اور پنجاب کے دیگر مسلم لیگی رہنماؤں' احراریوں' یونینسٹوں اور احمدیوں کے سیاسی عزائم نے 1935ء تک جو شکل اختیار کی' اس کی روشنی ہی میں اقبال کے تحریکِ احمدیہ کے خلاف بیانات کو پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

اصل سوال یہ ہے کہ اگر اقبال احمدیوں سے 1933ء میں مایوس ہو گئے تھے تو انھوں نے دو برس انتظار کے بعد 1935ء میں احمدیت کے متعلق اپنی تبدیلی رائے کا برملا اظہار کیوں کیا؟ ایک طبقۂ فکر کی رائے ہے کہ جب احمدیوں کے سیاسی عزائم واضح طور پر سامنے آ گئے تو اقبال نے احمدیت سے بیزاری کا اعلان کر دیا۔[26] آخر احمدیوں کے کوئی سیاسی عزائم تھے تو کیا تھے؟ بالفاظ دیگر اگر اقبال نے عامۃ المسلمین کے لیے تحریکِ احمدیہ کے سیاسی عزائم سے کوئی خطرہ محسوس کیا تو وہ کیا تھا؟

یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ برصغیر میں سیاسی بیداری کے دور میں بھی تحریکِ احمدیہ انگریزی حکومت کی اطاعت اور وفاداری کا دم بھرتی تھی۔ اپنے ابتدائی ایام ہی میں اس نے جہاد کی حرمت کا اعلان کر رکھا تھا اور اس سے مراد یہ لی گئی کہ احمدیوں کے نزدیک انگریز کے ساتھ وفاداری کو اس قدر اہمیت حاصل تھی کہ اس کے خلاف سیاسی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا بھی حرام قرار دیا گیا تھا۔ تحریکِ احمدیہ کا تعلق خالصتاً پنجاب کی سرزمین سے تھا پنجاب میں غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمانوں کی اکثریت تھوڑی سی تھی اور اس اکثریت کے بل بوتے پر یہاں کسی مستحکم مسلم وزارت تشکیل دے سکنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا البتہ اگر مسلمانوں میں اتحاد برقرار رکھا جا سکے تو وہ مخلوط وزارت قائم کر سکتے تھے۔ چنانچہ پنجاب میں سر فضل حسین نے غیر فرقہ وارانہ سیاسی جماعت یونینسٹ پارٹی قائم کر رکھی تھی۔ سر فضل حسین کے والد کے بانی تحریک احمدیہ سے خاندانی مراسم تھے۔ جب سر فضل حسین انگلستان سے اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد واپس تشریف لائے تو ان کے والد انھیں ساتھ لے کر مرزا غلام احمد کی خدمت

میں حاضر ہوئے اور ان کے لیے دعا کی درخواست کی۔ 27 بعد میں 1926ء میں جب سر ظفر اللہ خان پنجاب کی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے تو مرزا بشیر الدین محمود (سلسلہ احمدیہ کے دوسرے جانشین) نے انھیں ہدایت کی کہ کونسل میں اور سیاسی میدانِ عمل میں سر فضل حسین کے ساتھ پورا تعاون کیا جائے۔ 28 سر ظفر اللہ خان فرماتے ہیں: 29

''میں تو پہلے ہی میاں صاحب کا مداح اور ممنونِ احسان تھا اس لیے حضور کے ارشاد کی تعمیل میرے لیے آسان تھی۔''

سو پنجاب میں جماعتِ احمدیہ نے سیاسی میدانِ عمل میں سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی کے ساتھ تعاون کے ذریعہ اپنی سیاسی زندگی کی ابتدا کی۔ سر ظفر اللہ خان نے مرزا بشیر الدین محمود کی ہدایت کے تحت یونینسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی اور یہ تعلق آخر تک قائم رہا۔ سر فضل حسین کے بارے میں ان کے فرزند عظیم حسین کی تحریر کردہ کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ وہ اپنی رائے سے اختلاف کرنے والوں کو قطعی پسند نہ کرتے تھے اور اپنے اردگرد صرف ایسے لوگوں کو دیکھنے کے خواہش مند تھے جو ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں یا ان کی رائے سے اتفاق کرتے رہیں۔ سر ظفر اللہ خان بھی اسی سبب سے ان کے منظورِ نظر تھے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جماعتِ احمدیہ جو اصلاً ایک مذہبی جماعت تھی کو سیاسی وابستگی پیدا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ جواب ہے' سیاسی قوت حاصل کیے بغیر کوئی بھی مذہبی تحریک نہ تو اپنا الگ تشخص برقرار رکھ سکتی ہے اور نہ اس کے اراکین کی تعداد میں اضافہ ہو سکنے کا امکان ہے۔ جماعت احمدیہ نے یونینسٹ پارٹی کے ساتھ تعلق کس سیاسی مصلحت کے تحت قائم کیا تھا۔ اس سوال کا جواب بڑا آسان ہے۔ اوّل یہ کہ یونینسٹ پارٹی ایک غیر فرقہ وارانہ سیاسی جماعت تھی' یعنی باوجود اس کے کہ اس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی' وہ اصولاً ایک سیکولر پارٹی تھی جس میں احمدی بحیثیت ایک مذہبی فرقہ مسلمانوں میں رہتے ہوئے بھی انھیں اندر سے تقسیم کر کے اپنی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہونے تک اپنی علیحدہ حیثیت برقرار رکھ سکتے تھے۔ دوم یہ کہ یونینسٹ پارٹی انگریزی حکومت کی اطاعت کا دم بھرتی تھی اور اس کے ذریعہ احمدی (جو عقیدتاً انگریزی حکومت کے وفادار تھے) بظاہر عامۃ المسلمین میں شمار ہوتے ہوئے وہ مناصب حاصل کر سکتے تھے جو مسلمانوں کے لیے مخصوص تھے۔ بہرحال اس زمانہ میں مسلم لیگ یا مسلم کانفرنس جیسی سیاسی جماعتیں عوامی نہ تھیں۔

اسی دور میں کشمیر کمیٹی میں اقبال کو خالصتاً احمدی قیادت میں کام کرنے کا تجربہ حاصل ہوا۔ کشمیر کمیٹی ایک عارضی تنظیم کی صورت میں عجلت میں بنائی گئی تھی۔ اس کا نہ تو کوئی دستور تھا اور نہ قواعد

ضوابط۔ جب احمدی ارکان پر الزام لگا کہ وہ کشمیر کمیٹی کو کشمیر میں احمدیت کی تبلیغ کی خاطر استعمال کر رہے ہیں تو اس قسم کے الزامات کے تدارک کے لیے تجویز پیش کی گئی کہ کشمیر کمیٹی کے لیے دستور اور قواعد و ضوابط وضع کر لیے جائیں تا کہ کسی کو کسی کے خلاف شکایت کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ لیکن بجائے اس کے کہ الزام کو غلط ثابت کرنے کے لیے قدم اٹھائے جاتے' احمدیوں نے اس تجویز کو اپنے امیر کے لامحدود اختیارات کو محدود کرنے کے لیے ایک چال تصور کیا اور مرزا بشیر الدین محمود نے کشمیر کمیٹی سے استعفاء دے دیا۔ جب اقبال کشمیر کمیٹی کے قائم مقام صدر منتخب ہوئے تو احمدی اراکین نے ان کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا اور بقول اقبال ان پر واضح کر دیا کہ احمدیوں کے نزدیک کشمیر کمیٹی یا مسلمانوں کی کسی بھی تنظیم کی کوئی اہمیت نہیں اور ان کے عقیدے کے مطابق اگر وہ کسی وفاداری کے پابند ہیں تو صرف ان کی امیر کے ساتھ وفاداری ہے۔ پس اقبال پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ احمدی اگر مسلمانوں کی کسی سیاسی تنظیم میں شامل ہوں گے تو ان کی وفاداریاں یقیناً منقسم ہوں گی۔ یعنی ان کی اوّلین وفاداری اپنی جماعت کے ساتھ ہو گی' نہ کہ ملت اسلامیہ کے ساتھ۔ یہ وہ وقت تھا جب مسلمانوں میں اور بالخصوص پنجاب کے مسلمانوں میں اتحاد کی اشد ضرورت تھی۔ بعد ازاں اقبال کے کان میں کسی احمدی کے منہ سے نکلی ہوئی دو ایک ناخوشگوار باتیں پڑیں جن کے سبب وہ جماعتِ احمدیہ سے بیزار ہو گئے۔ یہ سب 1933ء میں ہوا لیکن اقبال نے احمدیت کے خلاف اپنا پہلا بیان 1935ء میں جاری کیا۔ اس کی وجہ کیا تھی؟

شیخ اعجاز احمد کا خیال ہے کہ 1935ء میں احراریوں نے احمدیوں کے خلاف ایک عام تحریک چلا رکھی تھی۔ چنانچہ احراریوں یا اپنے کسی احمدیت کے مخالف حاشیہ نشین کے بھڑکانے پر اقبال نے بھی احمدیت کے خلاف مضمون داغ دیا۔ اس ضمن میں وہ اپنے بیان کی تائید میں عبدالمجید سالک کا حوالہ پیش کرتے ہیں۔ مگر راقم کی رائے میں شیخ اعجاز احمد اور عبدالمجید سالک دونوں کا استدلال درست نہیں۔ اقبال نے احمدیت کی تردید میں اپنا پہلا بیان کسی کے اکسانے پر محض اتفاقی یا حادثاتی طور پر نہیں دیا تھا بلکہ اس کے چند اہم محرکات تھے جن کا تعلق پنجاب میں مسلم سیاست کے مستقبل سے تھا۔ علاوہ ازیں یہ بیان گورنر پنجاب سر ہربرٹ ایمرسن کی تقریر کے جواب میں دیا گیا جس میں اس نے احمدیت کے خلاف احرار کی ایجی ٹیشن کا حوالہ دیتے ہوئے مسلمانوں کو رواداری کا درس دیا تھا۔

ایمرسن نے انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس کے موقع پر اپنے خطبہ میں احمدیت کے خلاف مجلس احرار کے مظاہروں کا ذکر کرتے ہوئے نہ صرف مسلمانوں کو رواداری کی تلقین کی تھی بلکہ مسلمانوں کے باہمی نفاق پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے مسلمانانِ پنجاب کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی قوم

میں کوئی بلند پایہ لیڈر پیدا کریں۔ پس تحریکِ احمدیہ کے خلاف اقبال کا پہلا بیان ''قادیانیت اور صحیح العقیدہ مسلمان'' اسی کے جواب میں جاری کیا گیا۔

اس بیان کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ اقبال نے ایمرسن کے درسِ رواداری کو مسلمانوں کے تمدنی نقطہ نگاہ سے بے خبری قرار دیا اور فرمایا کہ انگریزی حکومت کو اس بات سے غرض نہیں کہ مسلمانوں کا اتحاد برقرار رہتا ہے یا نہیں' کیونکہ اس کا مفاد تو صرف اسی میں ہے کہ نئے مذہب کا جو بانی بھی ابھرے وہ برطانیہ کا وفادار رہے۔ اس ضمن میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی خاطر انھوں نے اکبرالٰہ آبادی کا درجِ ذیل شعر بھی پیش کیا ہے ۔

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
''انا الحق'' کہو اور پھانسی نہ پاؤ

اقبال نے مزید کہا کہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اسلام کے باغی گروہ کو تو اپنے اشتعال انگیز عقائد کی تبلیغ جاری رکھنے کی آزادی ہو لیکن اگر ملتِ اسلامیہ کوئی دفاعی تدبیر اختیار کرے تو اسے رواداری کا سبق دیا جائے۔ اگر انگریزی حکومت اس گروہ کی خصوصی خدمات کے سبب اسے پسند کرتی ہے تو اسے اس کی خدمات کا جو جی چاہے صلہ دے سکتی ہے مگر یہ زیادتی ہے کہ مسلمانوں سے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ اپنے معاشرے کی سالمیت کے تحفظ کے لیے فکر مند نہ ہوں۔ 30

شیخ اعجاز احمد' احمدی حلقوں' سرفضل حسین یا عظیم حسین کے خیال میں اقبال نے احمدیت کی مخالفت اپنی سیاسی اغراض کے حصول کی خاطر کی تھی لیکن اوپر واضح کیا جا چکا ہے کہ اقبال کی سب سے اہم سیاسی غرض مسلمانانِ برصغیر کے مفادات کا تحفظ تھی۔ نظریاتی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرک سب سے بڑا گناہ ہے کیونکہ مشرک اللہ تعالیٰ کی توحید' یکتائیت اور خودی کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے اور اس کی پاداش میں دوزخ میں جھونکا جاتا ہے۔ لیکن اقبال کے ہاں امت محمدیہ یا ملتِ اسلامیہ کے اتحاد' یگانگت' یک جہتی اور سالمیت کو پارہ پارہ کرنے والا تو اس کی اجتماعی خودی کا منکر ہے لہٰذا ایسا گنہگار ہے جسے دوزخ بھی قبول کرنے کو تیار نہیں۔

کیا اقبال نے اپنی کسی ذاتی غرض کی تحصیل کی خاطر یا احساسِ محرومی کے سبب تحریک احمدیہ کی مخالفت کی تھی؟ شیخ اعجاز احمد یہ تحریر کرتے ہیں کہ اس زمانے میں چونکہ انگریزی حکومت نے اقبال کے بجائے سرظفراللہ خان کو مستقل طور پر وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن مقرر کر دیا تھا اس لیے اقبال نے تحریک احمدیہ کی مخالفت میں بیان جاری کرنے شروع کر دیے۔ یہ عذر کچھ اسی قسم کا ہے جو ہندو اخبار ''ٹریبیون'' نے اقبال کے خطبۂ الٰہ آباد 1930ء کے موقع پر پیش کیا تھا۔ یعنی اقبال نے برصغیر میں

علیحدہ مسلم ریاست کا تصور انتقاماً دیا کیونکہ حکومت برطانیہ نے انھیں پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو نہ کیا تھا۔ اقبال نے اگر انگریزی حکومت کی ملازمت ہی کرنی تھی تو سر فضل حسین سے بنا کر رکھتے یا ان کی یونینسٹ پارٹی سے آخری دم تک وابستگی قائم رکھتے۔ انگریز حکمران سر فضل حسین پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ اس لیے 1932ء میں جب وہ چار ماہ کی رخصت پر گئے تو سر فضل حسین کی سفارش پر ہی سر ظفر اللہ خان کو عارضی طور پر وائسرائے کی کونسل کا رکن مقرر کیا گیا[31]۔ اسی طرح جب اکتوبر 1934ء میں مستقل طور پر سر ظفر اللہ خان کے اس منصب پر تقرر کا اعلان ہوا تو اسے بھی سر فضل حسین کی کوششوں کا نتیجہ سمجھا گیا۔ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان کے ''زمیندار'' ''ویکلی میل'' اور ''مجاہد'' میں تند و تیز بیانات یا احراریوں کی ایجی ٹیشن صرف سر ظفر اللہ خان کے تقرر یا احمدیوں کے خلاف ہی نہ تھی بلکہ سر فضل حسین اور یونینسٹ پارٹی کے خلاف بھی تھی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اسی اثنا میں سر ہربرٹ ایمرسن کے خطبہ کے جواب کی صورت میں اقبال کو بھی یونینسٹ احمدی گٹھ جوڑ پر کھل کر تبصرہ کرنے کا موقع ملا اور انھوں نے احمدیت کی تردید کے ساتھ ساتھ سر فضل حسین کے کردار پر بھی کڑی نکتہ چینی کی۔ سر فضل حسین پر الزام لگایا گیا کہ وہ انگریز حاکموں کے اشارے پر شہری دیہاتی تفریق کے ساتھ احمدیوں کو آگے بڑھا کر پنجاب میں مسلمانوں کے اتحاد پر ضربِ کاری لگا رہے ہیں۔ سر فضل حسین وائسرائے کی کونسل میں سر ظفر اللہ خان کے تقرر پر مسلمانوں میں اضطراب سے بخوبی آگاہ تھے۔ انھوں نے اپنے خط مورخہ 24 ستمبر 1934ء بنام سر ظفر اللہ خان میں اس اضطراب کی وجوہات بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں لیکن ساتھ ہی تحریر کیا:[32]

> ''اب انھوں نے اپنی تمام تر توجہ میری طرف مبذول کر لی ہے اور کہتے ہیں کہ زیادہ عرصہ تک اونچے منصب پر فائز رہنے کے سبب میں مسلم رائے عامہ سے بے پروا ہو گیا ہوں اور میں نے آمرانہ رویہ اختیار کر لیا ہے۔ خیر، مجھے توقع ہے کہ اب تک آپ کے تقرر کا فیصلہ ہو چکا ہو گا' گو میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ تقرر کے اعلان سے مخالفت ختم ہو جائے گی' بلکہ کچھ بڑھ ہی جائے گی۔ بہر حال میں دیکھوں گا کہ اس کے خاتمے کے لیے کیا قدم اٹھانے چاہئیں۔''

اقبال کی اگر وائسرائے کی کونسل کی رکنیت میں دلچسپی تھی تو سر فضل حسین کی ڈائری یا خطوط میں اس کا کہیں ذکر ملتا یا عظیم حسین کی تصنیف میں اس کی طرف کوئی اشارہ ہوتا۔ دراصل عظیم حسین کا تو گلہ ہی یہی ہے کہ ان کے والد سر فضل حسین اقبال کو انگریزی حکومت میں کسی بلند عہدے پر فائز کروانے کے لیے بار بار کوشش کرتے تھے۔ مگر اقبال ہر بار انگریزی حکومت پر نکتہ چینی کر کے حکومتی حلقوں کا اعتماد

کھو دیتے۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ انگریز حکمران اتنے کمزور نہیں تھے کہ احراریوں کی ایجی ٹیشن پر یا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان کے اخبارات میں اقبال کا نام لینے پر انھیں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن مقرر کر دیتے۔ یہ درست ہے کہ اس منصب پر سر ظفر اللہ خان کی متوقع تقرری کے خلاف ''زمیندار'' اور دیگر اخباروں میں سخت احتجاج ہو رہا تھا اور کہا جا رہا تھا کہ ایک احمدی کے بجائے کسی جلیل القدر مسلمان کو یہ منصب دیا جائے اور اس ضمن میں اقبال کا نام بھی لیا جا رہا تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ اقبال اس منصب کے لیے امیدوار تھے' درست نہیں۔ انگریز حکمرانوں کو اس قسم کے تقرر کرتے وقت سب سے پہلے ایسے لوگوں کی تلاش ہوتی تھی' جو ان کے اطاعت گزار اور وفادار ہوں' نہ کہ ان کے نقاد۔ اس لیے یہ بات پنجاب میں ہر کوئی جانتا تھا کہ وائسرائے کی کونسل کی رکنیت کے لیے اسی شخص کا تقرر ہو گا جو انگریز حاکموں کی توقعات کے مطابق سر فضل حسین کا صحیح جانشین ہو' جسے سر فضل حسین یا انھی کی طرح کی کسی شخصیت کی حمایت حاصل ہو اور اگر یہ محسوس کیا جاتا کہ مسلم ایجی ٹیشن کے سبب سر ظفر اللہ خان کا تقرر مناسب نہ رہے گا' تو اس منصب کے لیے سر فضل حسین کو کسی اور جانشین کی سفارش کرنے کے لیے کہا جاتا لیکن اقبال جیسی شخصیت' جس نے کئی بار انگریزی حکومت کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا' کے تقرر کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

اس ضمن میں شیخ اعجاز احمد میاں محمد شفیع (م۔ش) کے بیان کو سند کے طور پر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جن ایام میں سر فضل حسین کے جانشین کے تقرر کا معاملہ زیر غور تھا تو وائسرائے لارڈ ولنگڈن نے ایک ملاقات میں اقبال کو یہ کہہ کر کہ اب ہم اکثر ملتے رہیں گے' سر فضل حسین کی جگہ ان کے تقرر کی طرف اشارہ بھی کر دیا تھا۔ راقم کو اس روایت کی صحت پر کئی اعتراض ہیں۔ اوّل یہ کہ 1934ء یا 1935ء میں میاں محمد شفیع (م۔ش) سے اقبال کے کسی قسم کے روابط قائم نہ ہوئے تھے بلکہ اس زمانے میں وہ میاں محمد شفیع (م۔ش) کو جانتے تک نہ تھے۔ دوم یہ کہ ان دو سالوں میں ایسی کوئی شہادت راقم کی نظر سے نہیں گزری جس سے ثابت ہو سکے کہ اقبال کی لارڈ ولنگڈن سے ملاقات ہوئی تو کہاں ہوئی تھی۔ سوم یہ کہ جس روایت کا شنید پر انحصار ہو اور جس کی تائید کسی واقف حال ہمعصر شخصیت کے بیان یا کسی معتبر تحریری ذریعہ سے نہ ہوتی ہو وہ تحقیقی نقطہ نگاہ سے قابل اعتماد نہیں سمجھی جا سکتی۔

مئی 1935ء میں جب احمدیت کے خلاف اقبال نے اپنا پہلا بیان جاری کیا تو گلے کا عارضہ لاحق ہوئے ڈیڑھ برس کی مدت گزر چکی تھی۔ بھوپال سے برقی علاج کا پہلا کورس مکمل کر کے واپس لاہور آئے تھے۔ آواز بہت نحیف تھی۔ صحت مسلسل گر رہی تھی اور مستقل طور پر صاحب فراش ہو چکے تھے بلکہ انھی ایام میں سردار بیگم کی تشویش ناک بیماری' پھر ناگہانی موت' اور نابالغ بچوں کی نگہداشت

دغیرہ ایسے مصائب و آلام نے انھیں بالکل نڈھال کر دیا تھا۔ آواز کی خرابی کے سبب تقریباً ڈیڑھ برس سے وکالت بھی چھوٹ چکی تھی۔ یہ درست ہے کہ اقبال کو مالی فراغت یا آسودگی کبھی نصیب نہ ہوئی لیکن 1934ء اور 1935ء میں تو بوجہ علالت وہ اس قابل ہی نہ رہے تھے کہ وائسرائے کی کونسل کی رکنیت قبول کرتے۔ اس حالت میں یہ کہنا کہ اقبال وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی رکنیت کے امیدوار تھے' یا اس منصب پر تقرری کے خواب دیکھ رہے تھے اور جب ان کی بجائے یہ منصب وزیر ہند نے سر ظفر اللہ خان کو سونپ دیا تو وہ انتقاماً احمدیت کی مخالفت میں بیانات جاری کرنے لگے، اصل حقائق سے بے خبری ہے یا انھیں تعصب کی عینک سے دیکھنے والوں کی آنکھ سے دیکھنا ہے۔ 33

حواشی

1. اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ جلد اوّل صفحہ 354۔
2. مکتوبات اقبال مرتبہ سیّد نذیر نیازی صفحہ 270۔ یہ کبھی شائع نہ ہوا۔
3. بیان کے انگریزی متن کے لیے دیکھئے اقبال کی تقریریں اور بیانات مرتبہ اے آر طارق (انگریزی صفحات 91 تا 98)
4. ایضاً صفحات 99 تا 104۔
5. ایضاً صفحات 105 تا 108۔
6. اقبال کی تقریریں' تحریریں اور بیانات مرتبہ لطیف احمد شیروانی (انگریزی) صفحات 174 تا 176۔
7. انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار صفحات 45-46۔
8. اسلام اور احمدیت کے انگریزی متن کے لیے دیکھئے اقبال کی تقریریں' تحریریں اور بیانات مرتبہ لطیف احمد شیروانی (انگریزی) صفحات 176 تا 199۔ اقتباس صفحہ 177 سے لیا گیا ہے۔
9. ایضاً صفحہ 200۔
10. مکتوبات اقبال مرتبہ سیّد نذیر نیازی صفحہ 315۔
11. اقبال اور انجمن حمایت اسلام از محمد حنیف شاہد صفحات 131 تا 136۔
12. مضمون ''قادیانیت اور علامہ اقبال'' نوائے وقت مورخہ 13 اپریل 1954ء۔
13. دیکھئے کتابچہ بمشتمل چودہ صفحات بعنوان ''احمدیت علامہ اقبال کی نظر میں'' مرتبہ عبدالمالک خان ناظر اصلاح وارشاد وصدر انجمن احمدیہ پاکستان ربوہ۔ مزید دیکھئے اس کتابچہ پر تبصرہ ہفت روزہ چٹان مورخہ 27 مئی 1974ء صفحات 17,24,25۔
14. اقبال نامے مرتبہ اخلاق اثر بھوپال صفحات 76,77۔ یہ خط اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ حصہ اوّل صفحات 386,387 پر بھی موجود ہے لیکن اس میں یہ فقرے ''مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے تم کو

معلوم ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہو سکتا ہے یا نہیں۔'' حذف کیے گئے ہیں۔

باقیات اقبال مرتبہ محمد عبداللہ قریشی صفحہ 129۔

معاصرین اقبال کی نظر میں صفحہ 232۔

ایضاً صفحات 232 تا 241۔

باقیاتِ اقبال مرتبہ محمد عبداللہ قریشی صفحہ 163 تا 165۔

معاصرین اقبال کی نظر میں مرتبہ محمد عبداللہ قریشی صفحات 231،232،241،242۔

خطوطِ اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی صفحات 124 تا 126۔

روایاتِ اقبال مرتبہ محمد عبداللہ چغتائی صفحہ 45۔

خط کے اقتباس کے لیے دیکھیے مضمون ''سر سیّد احمد خان، شمس العلماء مولوی میر حسن سیالکوٹی اور مرزا غلام احمد قادیانی'' از کلیم اختر ہفت روزہ چٹان مورخہ 17 نومبر 1975ء صفحہ 27۔

صاف گو مسٹر جناح (انگریزی) صفحہ 53۔

اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات مرتبہ لطیف احمد شیروانی (انگریزی) صفحات 234-235۔

اقبال کی تقریریں اور بیانات مرتبہ اے آر طارق (انگریزی) صفحہ 101۔

خطوطِ اقبال مرتبہ رفیع الدین ہاشمی صفحہ 124۔ اقبال اور قادیانی از نعیم آسی۔ اقبال اور قادیانیت از شورش کشمیری۔ اقبال نے انھیں اپنے مقالے مسلم کمیونٹی کے انگریزی مسودے کے حاشیہ میں ذہناً ''میگین'' قرار دیا ہے۔

تحدیثِ نعمت از سر ظفر اللہ خان صفحہ 10۔

ایضاً صفحہ 237۔

ایضاً صفحہ 237۔

اقبال کی تقریریں اور بیانات مرتبہ اے آر طارق (انگریزی) صفحات 95،96۔

فضل حسین ایک سیاسی بیاگرافی از عظیم حسین (انگریزی) صفحات 313-314 میاں فضل حسین کی ڈائری اور نوٹس مرتبہ ڈاکٹر وحید احمد (انگریزی) اندراجات ڈائری مورخہ 17 مئی و 22 مئی 1932ء صفحات 138 تا 140۔

فضل حسین ایک سیاسی بیاگرافی از عظیم حسین (انگریزی) صفحہ 314۔ میاں فضل حسین کی ڈائری اور نوٹس مرتبہ ڈاکٹر وحید احمد (انگریزی) صفحہ 154۔

احمدیوں کو چونکہ ہندو اور سکھ مسلمان سمجھتے تھے اس لیے قیام پاکستان پر احمدیوں نے بھی دیگر مسلمانوں کی طرح مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے پاکستان میں پناہ لی اور قادیان کے بجائے سرگودھا کے نزدیک ربوہ کو اپنا مرکز بنایا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کے دوران 1974ء میں آئین کی ترمیم کے ذریعہ انھیں غیر مسلم یا ایک علیحدہ مذہبی فرقہ قرار دے دیا گیا اور 1984ء میں جنرل ضیاء الحق کی حکومت نے تعزیرات پاکستان میں ایک ترمیم کے ذریعہ ان کے لیے اسلامی اصطلاحات کا استعمال جرم قرار دے دیا۔

• آغا شورش کاشمیریؒ

اِقبال اور قادیانیت

علامہ اقبال مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے داعی تھے اور اپنی فکر کے مطابق انھیں کائنات میں فائز المرام دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس دور میں پیدا ہوئے جب مسلمانوں کا آفتاب گہنا چکا تھا اور ان کی آنکھوں کے سامنے ملتِ اسلامیہ کا حصار مختلف حادثوں سے گر رہا تھا۔ ان کے افکار ابتداء ہی میں گردو پیش کے سانحوں سے شدید متاثر تھے لیکن پہلی جنگِ عظیم کے بعد تاریخ کے تجربوں کی طویل گزرگاہ سے وہ مطالعہ و مشاہدہ کی ایک ایسی منزل تک پہنچ چکے تھے کہ مسلمانوں کے حصار کا انہدام ان کے لیے عظیم سانحہ تھا اور وہ ان اسباب و وجوہ کی تلاش میں تھے جو مسلمانوں کے زوال و ادبار کا باعث ہوئے تھے۔ ان کے لیے یہ سفر ذہنی اذیت کا باعث ضرور تھا' لیکن ان بنیادوں کو پالینا ان کے لیے مشکل نہ تھا۔ ان کے سامنے ہندوستان کی سیاسی تحریکیں بھی تھیں' ایشیا کے نشیب و فراز بھی تھے اور یورپ کا وہ استعماری چنگل بھی تھا جو مشرق کا گلا گھونٹ رہا تھا لیکن یورپ کا اپنا گلا بھی اسی کے ہاتھوں گھٹ رہا تھا۔ ان کے نزدیک یورپ کا استعماری نظام اور صنعتی تہذیب خوش آئند نہ تھے۔ ان کا دوٹوک نظریہ تھا کہ مشرق تو مغرب کے ہاتھوں مر رہا ہے' لیکن یورپ بھی اپنے ہاتھوں پنپ نہیں سکتا بلکہ اپنے ہی خنجر سے خودکشی کر رہا ہے۔

علامہ اقبال کی سوچ کسی سیاست دان کی سوچ نہ تھی وہ ایک مدبر کی طرح سوچتے تھے اور ان کے تجزیے ایک مفکر کے تجزیے تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی مشترکہ جدوجہدِ آزادی کو مسلمانوں کے حسب حال نہ پا کر ان کے لیے الگ راستہ تجویز کیا۔ ان کا پیغام سارے ایشیا کے لیے تھا۔ لیکن اُن کا پہلا معمل ہندوستان تھا اور ان کے ابتدائی مخاطب اسی خطہ کے مسلمان تھے۔ بالفاظ دیگر انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی معرفت ایشیائی مسلمانوں کو مخاطب کیا۔ مسلمانوں کی شکست و ریخت کا پورا نقشہ ان کے سامنے تھا۔ وہ مسلمان ریاستوں کے وفاق سے پہلے تمام مسلمانوں کی وحدت چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک کرۂ ارض کے مسلمانوں کا اسلامی وحدت میں ڈھلنا اس وقت تک ناممکن تھا جب تک ان کا داخلی وجود ان عوارض سے چھٹکارہ پا کر صحت یاب نہ ہو جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں کئی

واسطوں سے مختلف رُوپ دھار کر پھیل چکے تھے۔

علامہ اقبالؒ کے مقالات اور ان سے متعلق بعض سوالات کی تصریحات اتنی جامع تھیں کہ امتِ قادیاں کے پاؤں تلے کی زمیں نکل گئی اور وہ آئیں بائیں شائیں پر آ گئی۔ علامہ اقبالؒ مسلمانوں کی محبوب متاع تھے، ان کا ہر جگہ احترام کیا جاتا حتیٰ کہ پنڈت جواہر لال نہرو بھی شدید سیاسی فاصلے کے باوجود ان کا احترام کرتے اور انھیں ہندوستان و ایشیا کی ذہنی بیداری کے سرفہرست زعماء میں گردانتے تھے۔ پنڈت جی کی مشہور کتاب تلاشِ ہند (Discovery of india) سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے..... پنڈت جی علامہ اقبالؒ سے خط و کتابت کرتے اور علامہ انھیں جواب لکھتے۔ پنڈت جی لاہور آتے تو اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود علامہ سے ضرور ملتے اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ان سے مبادلہ افکار کرتے۔ علامہ اقبالؒ کی جامع تصریحات کے بعد پنڈت جی قلم انداز ہو گئے' بالفاظ دیگر اعتراف فرما لیا کہ علامہؒ نے جو کچھ لکھا وہ درست ہے۔ غرض محولہ مقالہ اسلام اور قادیانیت کے مسئلہ میں حرفِ آخر تھا۔

میرزا بشیر الدین محمود نے اپنے والد میرزا قادیانی کی پیروی میں علامہ کے خلاف رطب و یابس اختیار کیا اور قادیانی امت کے بعض منچلوں نے مختلف اخباروں کی خرید و فروخت سے علامہ سے متعلق ژاژ خائی شروع کی' لیکن علامہؒ نے انھیں معذور سمجھا' ژاژ خائی کو نظر انداز کیا اور اپنے متبعین و مخلصین کو اس مسئلہ میں تو تکار سے روک دیا۔ علامہؒ کے خلاف لاف گزاف کی خاطر میرزائی روپیہ کلکتہ سے لاہور تک گردش کرتا رہا لیکن ایک آدھ گمنام پرچے کے سوا علامہؒ کے خلاف کسی مسلمان جریدے سے وہ کچھ لکھوا نہ پائے۔ اس مسلمان جریدے نے بھی ادب و احترام کو ملحوظ رکھا' لیکن کچھ عرصہ بعد اس جریدے کے مالک و مدیر نے میرزائی اُمت کے خلاف ایک مبسوط کتاب لکھی کہ اس امت کا ڈھانچہ کن مقاصدِ مشئومہ کے تحت قائم ہوا ہے۔

میرزا بشیر الدین محمود نے 18 جولائی 1935ء کے ''الفضل'' میں علامہ اقبالؒ کے جواب میں مقالہ تحریر کیا جو محض رطب و یابس تھا' پھر اس کو ٹریکٹ کی شکل میں چھاپ کر ملک بھر میں تقسیم کیا گیا۔ میرزا صاحب نے لکھا کہ:

> ''احمدی سر محمد اقبال اور ان کے ہمنواؤں کو روحانی بیمار قرار دے کر انھیں اپنے علاج کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور ان کے ایمان کی کمزوریوں کو ان پر ظاہر کرتے ہیں۔'' (تاریخ احمدیت جلد ہشتم صفحہ 190)

علامہ اقبالؒ سے خلیفۂ ثانی (میرزا بشیر الدین محمود) کے بغض اور کد کا یہ حال تھا کہ اُس نے اپنی جماعت کو پنڈت جواہر لال نہرو کی لاہور میں آمد پر شاندار استقبال کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ 31 مئی 1936ء

کے الفضل میں استقبال کی روداد درج ہے۔ اخبار کی شہ سرخی ہے:

''فخرِ وطن پنڈت جواہر لال کا لاہور میں شاندار استقبال۔''

رپورٹ الفضل کے خاص رپورٹر کی ہے۔ استقبال 29 اپریل کو کیا گیا۔ رپورٹ میں درج ہے (اسی کے الفاظ) کہ

1- استقبال کے لیے قادیاں سے تین سو اور سیالکوٹ سے دو سو کے قریب والنٹیرز لاہور پہنچے۔ انھیں احمدیہ ہوسٹل میں ٹھہرایا گیا' جہاں شیخ بشیر احمد ایڈووکیٹ صدر آل انڈیا نیشنل لیگ نے ایک مختصر برمحل اور برجستہ تقریر میں بتایا کہ آج ہم اپنے عمل سے یہ ثابت کرنے کے لیے آئے ہیں کہ آزادیِ وطن کی خواہش میں ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

2- پنڈت جی کے استقبال کو صبح چھ بجے باوردی والنٹیرز باقاعدہ مارچ کرتے ہوئے ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔ استقبال کا تمام انتظام کور ہی کر رہی تھی۔ یہ نظارہ حد درجہ جاذبِ توجہ اور رُوح پرور تھا۔ پلیٹ فارم پر جناب چودھری اسد اللہ خاں (قادیانی) بیرسٹر ایم ایل سی قائداعظم آل انڈیا نیشنل لیگ کور زرنفس نفیس موجود تھے۔ شیخ بشیر احمد ایڈووکیٹ نے پنڈت جی کی آمد پر ان کے گلے میں کور کی طرف سے ہار ڈالے' اس کور کے پاس جھنڈیوں پر حسب ذیل ماٹو خوبصورتی سے آویزاں تھے:

1- **Beloved of the Nation welcome you.**

قوم کے محبوب ہم آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

2- **We Join in Civil Liberties Union.**

ہم سول لبریٹز میں شامل ہوتے ہیں۔

3- **Long Live Jwahar Lal.**

جواہر لال زندہ باد!

(الفضل 31 مئی 1936ء)

میرزا بشیر الدین محمود نے جمعہ کے خطبہ میں اس استقبال کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

''پنڈت صاحب نے ڈاکٹر اقبال کے ان مضامین کا رد لکھا جو انھوں نے احمدیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ قرار دیے جانے کے لیے لکھے تھے اور نہایت عمدگی سے ثابت کیا کہ ڈاکٹر صاحب کے احمدیت پر اعتراض اور احمدیوں کو علیحدہ کرنے کا سوال بالکل نامعقول اور خود ان کے گزشتہ رویہ کے خلاف ہے' تو

ایسے شخص کا استقبال بہت اچھی بات ہے۔"

(الفضل جلد 23 نمبر 287 مورخہ 11 جون 1936ء)

ایک سال بعد دوبارہ پنڈت جواہر لال نہرو 1937ء میں لاہور آئے تو ریلوے سٹیشن سے سیدھا اپنی قیام گاہ لاجپت رائے بھون چلے گئے۔ وہاں مولانا ظفر علی خاں کو بلوایا' راقم ساتھ تھا۔ پنڈت جی نے مولانا سے کہا کہ انھیں پارسال جون میں اقبالؒ کا خط ملا تھا' وہ علامہؒ سے فوراً ملنا چاہتے ہیں۔ مولانا نے کہا میں ابھی انھیں کہلواتا اور جواب پہنچاتا ہوں۔ مولانا وہاں سے سیدھا علامہؒ کے ہاں گئے۔ علامہؒ نے کہا پنڈت جی ہر لحظہ تشریف لا سکتے ہیں۔ مولانا نے پنڈت جی کے پاس راقم کو بھیجا ہے۔ اس کے گھنٹہ بعد پنڈت جی علامہ کے ہاں چلے گئے اور وہاں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تخلیہ میں ملاقات کی۔ علامہؒ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پنڈت جی سنا پارسال قادیانی آپ کے استقبال کو آئے تھے اور اب کی دفعہ غائب رہے ہیں۔"

پنڈت جی نے کھلکھلاتے ہوئے کہا:

"تب آپ سے جو بغض پیدا ہوا تھا وہ انھیں وہاں لے آیا تھا۔ دراصل وہ میری آڑ لے کر آپ کو بتانے آئے تھے کہ ہم بھی ہیں۔"

علامہؒ نے فرمایا:

"میرزا محمود نے اس طرح دہلی سرکار کو ٹنڈر داخل کیا تھا کہ مجھے مناؤ میں روٹھ گیا ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔"

علامہؒ کا وہ خط حسب ذیل ہے جو آپ نے 21 جون 1936ء کو پنڈت جی کے نام لکھا' اور اب **A Bunch of Old Letters** مرتبہ پنڈت جواہر لال نہرو کے صفحہ 181ء پر درج ہے۔ اس کے علاوہ سیّد عبدالواحد معینی نے بھی **Thoughts and Reflections of Iqbal** میں نقل کیا ہے۔

علامہ اقبالؒ کا خط

پنڈت جواہر لال نہرو کے نام

لاہور 21 جون 1936ء

مائی ڈیئر پنڈت جواہر لال!

نامۂ گرامی کل ہی ملا' بہت بہت شکریہ۔ جب میں نے آپ کے مقالوں کا جواب لکھا تو مجھے

یقین تھا کہ آپ کو احمدیوں کے سیاسی رویے سے متعلق کوئی علم نہیں۔ بلاشبہ یہ جواب لکھنے کا اہم سبب یہ تھا کہ میں بالخصوص آپ پر یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ مسلمانوں کی وفاداری کا اصل سرچشمہ کیا ہے اور احمدیت میں کس طرح اس کو نیا رنگ دیا گیا ہے۔ میرے مقالات کی اشاعت کے بعد یہ جان کر مجھے انتہائی تعجب ہوا کہ تعلیم یافتہ مسلمان بھی ان تاریخی وجوہ سے ناآشنا ہیں جو احمدیت کی تعلیمات کو متشکل کرنے کا باعث ہوئیں۔ مزید برآں پنجاب اور دوسرے علاقوں میں آپ کے مداح مسلمانوں میں آپ کے مقالات پر اضطراب پیدا ہوگیا۔ وہ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ آپ کی ہمدردیاں احمدیہ تحریک کے ساتھ ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ کے مقالات پر احمدی بہت مسرور ہیں' اور آپ کے بارے میں یہ غلط فہمی پیدا کرنے کی زیادہ تر ذمہ داری احمدیہ پریس پر ہے' تاہم مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کے متعلق میرے تاثرات غلط تھے۔ میں بھی ذاتی طور پر علم الکلام سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتا' لیکن اس مذاکرہ میں محض اس لیے الجھا ہوں کہ احمدیوں سے انھیں کی نہج پر مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا مقالہ اسلام اور ہندوستان کے لیے بہترین خواہشات کا مظہر ہے۔ میرے ذہن میں اس سے متعلق کوئی ابہام نہیں کہ احمدی' اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔

معذرت خواہ ہوں کہ لاہور میں آپ سے ملاقات نہ کرسکا۔ میں ان دنوں شدید بیمار تھا اور اپنے کمرہ سے باہر نہیں جاسکتا تھا۔ پچھلے دو سال سے میں مسلسل علالت کی وجہ سے عملاً ریٹائرمنٹ کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ براہِ کرم مطلع فرمایئے کہ آپ پنجاب دوبارہ کب آ رہے ہیں؟ کیا آپ کو میرا وہ خط مل گیا ہے جو میں نے شہری آزادیوں سے متعلق آپ کی مجوزہ یونین کے بارے میں لکھا ہے؟ چونکہ آپ نے اپنے خط میں اس کا ذکر نہیں کیا' اس لیے مجھے خدشہ ہے کہ شاید آپ تک نہیں پہنچا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

(ترجمہ انگریزی خط)

ملفوظاتِ اقبالؒ کے مضمرات

ہندوستان میں برطانوی عملداری نے اپنی تعلیم و طاقت سے مسلمانوں کی دینی عصبیت کو معطل کر دیا تھا۔ مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا ضرور تھا جو دین کی تڑپ رکھتا تھا اور ان کی اکثریت جہاد باللسان سے دستبردار نہ ہوئی تھی لیکن جو لوگ حکومت سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعاون کر رہے تھے' وہ دین کے ان امور میں ہمیشہ غیر جانبدار رہتے' جو انگریزوں کی منشا کے اُلٹ ہوتے۔ مثلاً ہندوستانی مسلمانوں میں ایک بڑا طبقہ اعتقادات و عبادات میں سچا ہونے کے باوصف ان معاملات میں حکومت کی ناراضی کا

خطرہ کبھی مول نہ لیتا' بلکہ اپنی پسپائی کا جواز پیدا کر لیتا' جن معاملات میں انگریزی حکومت کی منشا مختلف ہوتی۔ گو ان واقعات کی ایک طویل فہرست ہے لیکن پہلی جنگِ عظیم میں مسلمان ریاستوں پر جو بیتی اور دوسری جنگ عظیم میں مسلمان ممالک کا جو حال رہا' ہندوستانی مسلمانوں کا سرکاری عنصر اعتقادات میں استغراق و انہماک اور عبادات میں خضوع و خشوع کے باوجود حکومت کے اشارۂ ابرو کی متابعت فرض گردانتا تھا۔ پھر یہ حالت صرف انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ ہی کی نہ تھی بلکہ دانشمندانِ دین میں بھی شروع سے آخر تک اس قسم کے لوگ پیدا ہوتے رہے جن کے متعلق اقبالؒ کو کہنا پڑا کہ

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے مسلمان ہے آزاد

ان دانشمندانِ دین میں صرف افراد ہی نہ تھے بلکہ بعض فرقے پیدا ہو چکے تھے اور ان کا ہندوستانی مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت پر قوی اثر تھا۔ مسلمان عوام سیاسی مسائل کی جدوجہد میں ہندوؤں کے مدمقابل سخت قسم کے مسلمان تھے لیکن انگریزوں کے مقابلہ میں مردم شماری ہی کے مسلمان تھے۔ انھیں انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر کسی مسلمان ملک پر چڑھائی کرنے میں کوئی عار نہ تھا۔ ان کے پیر انھیں جنگ کے زمانہ میں تعویذ دیتے تھے کہ وہ بازو پہ باندھ کر یا گلے میں پہن کر لڑیں گے تو کوئی ملک بھی انھیں شکست نہ دے سکے گا۔ جب ترکوں سے پنجابی مسلمان نبرد آزما ہوئے تو یہی تعویذ ان کے ''پشتیبان'' تھے۔

ہندوستان میں تحریکِ خلافت کے بعد مسلمانوں کی تاریخ یہ ہو گئی تھی کہ وہ کفرِ مغلوب سے لڑتے اور کفرِ غالب سے دبتے بلکہ اس سے تعاون کرتے تھے۔ چونکہ انڈین نیشنل کانگریس نے مسلمانوں کے حقوق سے اعراض و اغماض کیا' لہٰذا وہ کافرانہ ادارہ تھا۔ اس کے گاندھی و نہرو تو ''کافر'' تھے۔ لیکن ابوالکلامؒ اور حسین احمدؒ بھی کافر تھے کہ وہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے مل جل کے آزادئ ہندوستان کی جدوجہد میں شرکت کی دعوت دیتے تھے لیکن میرزا غلام احمد کی امت سے انھیں کوئی تعرض نہ تھا۔ میرزا صاحب نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا' جو انھیں نہ مانے اسے کافر کہا اور اس طرح سوادِ اعظم کو دائرہ اسلام سے خارج کر ڈالا۔ ان کے جانشینوں نے ان دعاوی میں اتنی شدت پیدا کی کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو دوزخ کا ایندھن قرار دیا اور جہاد کی تنسیخ فرما کر میرزا غلام احمد کے نہ ماننے والوں کو فاحشہ عورتوں کی اولاد کہا' لیکن اس ارتداد کے خلاف مسلمانوں کی انگریزی خواندہ سیادت کا جم غفیر چپ رہا' کیا اس لیے کہ انگریزی حکومت کی ناراضی کا خطرہ تھا یا وہ میرزا غلام احمد کے دعاوی سے نابلد تھے۔

علماء نے اپنے دوائر کے مطابق میرزا غلام احمد اور ان کے جانشینوں کی چھاڑ کی اور دین کے محاذ پر ڈٹ کے مقابلہ کیا' پھر جب قادیانی بے نقاب ہو گئے اور اس خطرہ کو فعال علماء نے محسوس کیا' تو سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور ان کے رفقاء کی بدولت میرزائیت کے پھیلاؤ کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ قادیانی امت کا تبلیغی محاذ سونا پڑ گیا...... المختصر علامہ اقبالؒ کے احتساب سے پہلے مذہب کی حیثیت سے قادیانی تحریک رُک چکی تھی۔ علامہ اقبالؒ کے محولہ بیانوں نے میرزائیت کو سیاسی ہندوستان میں (قبل از آزادی) بے نقاب کیا اور ان کے باطنی مفہوم سے پردہ اٹھایا۔ علامہ کے محولہ ارشادات قادیانی امت کے سر پہ ضرب کاری تھے۔ علامہ نے اس غرض سے ان علماء و فضلاء سے قادیانی مسئلہ کی چھان پھٹک کی اور ختم نبوت کے مفہوم سے آگاہ ہوئے جن سے وہ مختلف دینی مسائل میں استفسار کرتے اور مشورہ چاہتے تھے۔ انھوں نے حضرت علامہ انور شاہؒ ' حضرت پیر مہر علی شاہ نور اللہ مرقدہ اور علامہ سیّد سلیمان ندوی قدس سرہ العزیز سے خط و کتابت کی۔ جب ختم نبوت کا مسئلہ ان کے فہم و فکر میں رچ بس گیا تو پھر اس مسئلہ کے علمی و عمرانی اور سیاسی و قومی مضمرات پر نہایت شرح و بسط سے روشنی ڈالی کہ یہی اسلوب و استدلال تھا جو قادیانی تحریک کے مالہ و ماعلیہ کو ان دماغوں میں اُتار سکتا تھا جن کے نزدیک کسی وجہ سے یہ کوئی مسئلہ ہی نہ تھا' اگر مسئلہ تھا تو ملائیت کا جھمیلا تھا۔

علامہ اقبالؒ نے سر ایمرسن گورنر پنجاب کی تقریر کے فوراً بعد قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ کر دینے اور ایک علیحدہ اقلیت بنانے کا مطالبہ کیا تو وہ کوئی مذہبی مجادلے کے خطوط نہ تھے بلکہ قادیانی تحریک کے مضمرات کا جواب تھا۔ پنڈت نہرو نے قادیانی امت کا دفاع کیا تو علامہ اقبالؒ کا جواب علمی' تاریخی' عمرانی اور معاشرتی بنیادوں پر تھا۔ آخری مقالے کے بین السطور کا سیاسی خول پنڈت جواہر لال نہرو کی سیاسی شخصیت کا جواب تھا۔

یہ چیز تو حضرت علامہؒ نے شروع ہی میں صاف کر دی کہ وہ کسی مذہبی بحث میں اُلجھنا نہیں چاہتے۔ ظاہر ہے کہ علامہ اقبالؒ کا مطالبہ انگریزی حکومت سے تھا اور حکومت سے مذہبی بحث کا سوال ہی نہ تھا اور نہ علامہؒ قادیانی امت سے مخاطب تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ علماء قادیانی نبوت کو دینی محاذ پر شکست دے چکے ہیں۔

علامہؒ نے فرمایا کہ وہ قادیانی تحریک کے بانی کا نفسیاتی تجزیہ بھی نہیں کرنا چاہتے کیونکہ اس کے لیے ہندوستان میں ابھی وقت نہیں آیا۔ علامہ اس وقت سے بہت پہلے رحلت فرما گئے۔ پاکستان علامہ کے تصور کی اساس پر تھا' لیکن اس نے میرزائیت کو اس طرح پناہ دی کہ میرزائیوں کو اقلیت قرار دینے کا جو مطالبہ اقبالؒ نے انگریزی حکومت سے کیا تھا وہ پاکستان میں متروک ہو گیا۔ میرزا غلام احمد

کے نفسیاتی تجزیے کا وقت پاکستان میں تھا' لیکن اقبالئین نے اقبالؒ کا نفسیاتی تجزیہ کیا اور جو اقبالؒ کے موضوع تھے ان سے روگردانی کی۔ ضروری تھا کہ علامہ اقبالؒ کے افکار کی بنیادیں تلاش کی جاتیں اور ان اصطلاحات کے ماخذ ڈھونڈے جاتے جو قرآن و سیرت کے علاوہ عجمی فضا میں ایجاد ہوئی تھیں' لیکن لغو چیزوں کے تحقیقی انبار لگتے رہے اور جو چیزیں اساسی تھیں وہ اقبالئین کی تحقیق سے خارج ہو گئیں اور یہ افکارِ اقبالؒ سے متعلق خیانتِ مجرمانہ کا ارتکاب تھا۔ ممکن ہے وہ ان کے فہم سے قاصر ہوں یا ان موضوعات پر انھیں دستگاہ نہ ہو' لیکن بروز' حلول اور ظل وغیرہ اصطلاحات کے ماخذ ڈھونڈنا مشکل نہ تھا۔ علامہؒ نے لکھا ہے کہ مسیحِ موعود کی اصطلاح بھی اسلامی نہیں اجنبی ہے' لیکن اقبالؒ کے محققوں میں کسی نے اِدھر توجہ ہی نہ کی۔ وہ دین کا سوال ہو تو اقبالؒ کی سیاست دیکھتے اور سیاست کا مسئلہ ہو تو ان کی شاعری میں جھانکتے ہیں اور یہ ایک دلچسپ گریز ہے۔

ختم نبوت کے مضمرات پر کسی اقبالی مصنف نے قلم نہیں اُٹھایا' حالانکہ مسلمانوں کی وحدت ختم نبوت کے بغیر قائم نہیں رہتی۔ علامہؒ نے تشکیل جدید الٰہیات میں لکھا ہے کہ:

''اسلام بحیثیت دین خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت نے اٹھایا ہے۔''

ایک دوسری جگہ لکھا ہے:

''دین خدا سے آتا ہے لیکن ملت کی تشکیل پیغمبر کرتے ہیں۔''

وطن سے بغاوت جرم ہے' حکومت سے بغاوت جرم ہے لیکن نبوت سے بغاوت جرم نہیں جب کہ اس سے ایک قوم کی وحدت استوار ہوتی اور اسی وحدت پر وطن کا مدار اور حکومت کا استحکام ہے۔ علامہ اقبالؒ کے مطالبہ کا لب لباب کیا ہے کہ مِرزائی مسلمانوں سے الگ ہو جائیں۔ انھیں اعتراض تھا تو ان کے مسلمانوں میں رہنے پر' اور دوسرا کوئی مطالبہ نہیں تھا۔

اقبالئین کا فرض تھا کہ وہ انگریزی ہندوستان میں جہاد کی منسوخی کے متعلق تحقیق فرماتے کہ اس تحریک کا آغاز کب ہوا اور کن کن عناصر نے اس میں حصہ لیا۔ میرزا غلام احمد نے کب اور کیونکر ربانی سند مہیا کی۔ پنجاب ہی اس غرض سے کیوں منتخب کیا گیا۔ اس زمانہ میں ہندوستانی مسلمانوں کے علاوہ دنیائے اسلام کے مسلمانوں کی سیاسیات کا میلان و رجحان کیا تھا' لیکن قلمکارانِ اقبال اس باب میں آج تک مُہر بلب ہیں۔ علامہؒ نے پنڈت جی کے جواب میں فرمایا (تلخیصات) کہ:

ہندوستان میں 1799ء سے دینیات کی جو تاریخ رہی ہے' اس کی روشنی میں احمدیت کے اصل مظروف کو سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ اسی سال سلطان ٹیپو کو شکست ہوئی اور ہندوستان میں

مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کی امیدوں کا خاتمہ ہو گیا۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد اپنے ہمراہ کئی سوالات لائی تھی اور یہ سوالات برطانوی شہنشائیت کے استحکام کی اساس تھے' مثلاً:

1- کیا اسلام میں خلافت کا تصور ایک مذہبی ادارے کو مستلزم ہے؟

2- وہ مسلمان جو ترکی سلطنت سے باہر ہیں' وہ ترکی خلافت سے کیونکر وابستہ رہ سکتے ہیں؟

3- ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالسلام؟

4- اسلام میں نظریۂ جہاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟

5- قرآن کی رُو سے اُولی الامر سے مراد کیا ہے؟ کیا مسلمان یا ان کے علاوہ کوئی دوسرا حکمران بھی اس کا اہل ہے؟

6- امام مہدی کی حدیث کے معنوی اطلاق کی نوعیت کیا ہے؟

علامہ فرماتے ہیں کہ ان سوالات سے جو مناقشات پیدا ہوئے وہ اسلامی ہند کی تاریخ کا ایک باب ہیں۔ یہ حکایت دراز ہے اور ایک طاقتور قلم کی منتظر!

قلمکارانِ اقبالؒ نے اپنے طاقت ور قلم کو معطل رکھا بلکہ موقوف کر دیا اور جو موضوع فکرِ اقبال کے تذکرے میں منتخب کیے وہ کتابی تھے' جو کسی قوم کی تاریخ نہیں' تفریح ہوتے ہیں۔ ان کا تعلق ادب برائے زندگی سے نہیں ہوتا بلکہ ادب برائے ادب سے ہوتا ہے۔

اقبالیین کی اس جماعت کا مقصود اقبال کے افکار نہیں' سوانح ہیں اور سوانح کا بھی وہ حصہ جس کا تعلق فکر سے نہیں ذکر سے ہے۔

افکارِ اقبال کے عناصرِ خمسہ

افکارِ اقبال نظم و نثر دونوں میں ہیں۔ نثر میں ان کے خطوط ہیں' مقالات ہیں' خطبات ہیں' بیانات ہیں اور بعض تقاریر ہیں۔ اسی طرح بعض تجویزیں اور ان کے خاکے ہیں۔ بلاشبہ علامہ اقبال کی شاعری کے مجموعے ہی ان کی عظمت کا طرۂ دستار ہیں' لیکن علامہ اقبالؒ کی نثریات ایک ایسا گنجِ شائگاں ہیں کہ ان سے افکارِ اقبال کے مربوط سلسلے آشکار ہوتے اور انسانی ذہن کو جلا ملتی ہے۔ نظم میں استدلال نہیں حسن ہوتا ہے اور وہ انسان کے جذبے کو متحرک کرتا ہے۔ نثر افکار کے انضباط کا نام ہے اور اس سے دماغ مطمئن ہوتے ہیں۔ مختصراً شاعری میں سچائی اور حسن اور نثر میں دلیل و صداقت کا دبدبہ کام کرتا ہے۔ اقبال نے جو کچھ نثر میں لکھا وہ اس قدر واضح ہے کہ اس میں کوئی سی چیز مبہم نہیں۔ شاعری میں تو

ذوق کے مطابق معنوی راہیں مختلف ہوسکتی اور ہوتی ہیں لیکن نثر میں معنویت صراطِ مستقیم ہے۔اقبالؒ نے قادیانیت پر جو کچھ کہا وہ عمر بھر کی ارتقائی بصیرت کا نچوڑ تھا لیکن یہی چیز پاکستان میں طاقِ نسیاں کا چراغ ہوگئی اور اس کا تذکرہ اقبالی ادب کے بازار عکاظ کی ضرورت ہوگیا۔

علامہ اقبالؒ کے مستند مجموعوں میں اشعار کی تعداد 12491 ہے۔ان میں 94 شعر اور ایک مصرعہ مستعار ہیں۔کلامِ اقبالؒ کے عناصر خمسہ ہیں:

1- خودی۔
2- مشرق کی نشاۃِ ثانیہ۔
3- توحید و رسالت کی اساس پر اسلام سے غیر متزلزل وابستگی۔
4- مغرب پر تنقید۔
5- عشق کی پختگی عقل کی خام کاری۔

نظر بہ ظاہر یہ پانچوں الگ الگ موضوع ہیں لیکن تمام وادیاں قطع کرنے کے بعد ان کی یکجائی ہی سے اقبال کا معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

خودی کا مطلب ہے احساسِ نفس، معرفت حق اور تعینِ ذات۔علامہ فرماتے ہیں "خودی کا عرفان قرآن کے سوا اور کہیں نہیں۔جب تک اقوام کی خودی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہو امنِ عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی......حدودِ خودی کے تعین کا نام شریعت اور شریعت کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔"

مشرق پیغمبروں کی سرزمین ہے۔تمام مذاہب کے سوتے مشرق سے پھوٹے، لیکن مشرق مغلوب ہوگیا اور مغرب مقتدر، مشرق کی نشاۃِ ثانیہ ہی سے کرۂ ارض کا انسانی اضطراب رفع ہوسکتا ہے۔ اسلام عالمِ انسانی کے لیے ضابطۂ حیات ہے، بشرطیکہ توحید و رسالت کے تصور میں کوئی سا خلل نہ ہو۔ مغرب پر تنقید کا مطلب ہے، سائنس اور فلسفہ کی ناتمامیوں سے اجتناب، مادی تصورات سے قطع تعلق اور قرآنی عدل و قسط کی فرمانروائی۔عشق کی پختگی سے ایمان کی تکمیل ہوتی یعنی زوالِ شک ہوتا اور عقل کی خامکاری کا عقیدہ انسان کے دماغ کو یمین و یسار کے تذبذب سے روکتا اور آخرت کا سبق دیتا ہے۔ ایک ایسے معاشرہ ہی میں اوامر و نواہی انسان کی اپنی خواہش بن جاتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک مسلمان نظریاتی اعتبار سے ایک ایسے وفاق کے شہری ہیں جو مختلف ملکوں کی مسلمان اقوام کو اسلامی معاشرہ مہیا کرتا اور انھیں دینی وحدت کی لڑی میں پرو کر بالآخر انسانی وحدت کی طرف لے جاتا ہے۔

میرزا غلام احمد کا وجود اس کی نفی پر تھا۔ ان کا پیدا ہونا مسلمانوں کے زوال کا آغاز تھا۔ آج ان کی موت کو بھی تقریباً ستر برس ہوتے ہیں لیکن مسلمانوں کا زوال وادبار ٹلا نہیں بڑھا ہے۔ پیغمبر ملتوں کے احیا و استحکام کے لیے آتے ہیں نہ کہ زوال و ادبار کے لیے۔ میرزا صاحب اور ان کے جانشین مسلمانوں کی شکست وریخت پر خوشیاں مناتے اور چراغاں کرتے رہے۔ ان کے فرزند میرزا محمود احمد (خلیفۂ ثانی) کے الفاظ میں یہ سب اس لیے تھا کہ مسلمانوں نے میرزا صاحب کو تسلیم نہیں کیا تو کیا عیسائیوں، یہودیوں اور بعض دوسری مشرک قوموں نے انھیں نبی تسلیم کر لیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلاموں پر انھیں فتح و کامرانی حاصل ہوتی گئی۔ کسی نبی نے غلامی پر فخر نہیں کیا لیکن میرزا غلام احمد اور ان کے جانشینوں نے برطانوی گورنمنٹ کو اپنے لیے خدا کی نعمت اور انگریزوں کو محسنِ اعظم کہا۔ خدا کے پیغمبر اپنی ملتوں کے اقبال و عروج اور فلاح و بہبود پر فخر کرتے ہیں لیکن میرزا صاحب کا سرمایۂ تفاخر یہ تھا کہ ''میں نے برطانوی حکومت کی طاعت وحمایت میں تنسیخِ جہاد کی غرض سے اتنی کتابیں لکھی ہیں کہ ان سے پچاس الماریاں بھر سکتی ہیں۔''

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب ''قادیانیت'' کے آخری باب میں ''قادیانیت نے عالمِ اسلام کو کیا عطا کیا'' کے زیرِ عنوان لکھا ہے کہ:

> ''میرزا صاحب نے اسلام کے علمی و دینی ذخیرہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا جس کے لیے اصلاح و تجدید کی تاریخ ان کی معترف اور مسلمانوں کی نسلِ جدید ان کی شکر گزار ہو۔ ان کی جدوجہد کا تمام تر میدان مسلمانوں کے اندر ہے اور اس کا نتیجہ صرف ذہنی انتشار اور غیر ضروری مذہبی کشمکش ہے جو اس نے اسلامی معاشرے میں پیدا کی۔ اگر ہندوستان میں وہ ذہنی انتشار نہ ہوتا جس کا پنجاب خاص میدان تھا اور اسلامی ذہن ماؤف نہ ہو چکا ہوتا تو قادیانی تحریک اتنی مدت باقی نہ رہ سکتی لیکن اسلام کی دعوت سے انحراف اور اس ملک کے مخلصین و مجاہدین کی ناقدری کی سزا خدا نے یہ دی کہ ہندوستانی مسلمانوں پر ایک ذہنی طاعون مسلط کر دیا اور ایک ایسے شخص کو ان کے درمیان کھڑا کر دیا جو امت میں فساد کا مستقل بیج بو گیا ہے۔'' (تلخیصات)

قادیانیت پاکستان میں

قادیانی پاکستان میں نہیں آنا چاہتے تھے۔ وہ اگر پاکستان میں آنا چاہتے تو ریڈکلف

باؤنڈری کمیشن کو قادیان کے الگ ریاست بنانے کی یادداشت پیش نہ کرتے بلکہ گورداسپور کو پاکستان میں شامل کرنے کے لیے ساعی ہوتے' لیکن چودھری سر ظفر اللہ خاں نے مسلم لیگ کی وکالت کے باوجود (اور ہم اس میں ہار گئے) قادیان سے متعلق علیحدہ مقدمہ پیش کیا اور مسلمانوں سے الگ امت کی بنا پر مطالبہ کیا کہ ان کے لیے قادیان پاکستان سے الگ ایک مقدس شہر کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ وہ ان کے نبی کا مولد' مسکن اور مرقد ہے۔

کیا یہ پاکستان سے میرزائی امت کا اخلاص تھا؟ ہمارے سامنے ایسا کوئی اعلان نہیں جس سے معلوم ہو کہ میرزائی امت کبھی لیگ میں شامل ہوئی ہو' ان کے خلیفہ نے لیگ میں شمول کا حکم دیا ہو' قائداعظمؒ کو...... قائداعظمؒ تسلیم کیا ہو یا مسلم لیگ کے لیے کسی عنوان سے کوئی چندہ دیا ہو۔ واقفانِ حال کا بیان ہے کہ میرزا بشیر الدین محمود قائداعظم سے معاملہ کرنا چاہتے تھے لیکن قائداعظم نے ان سے کہا آپ مسلمانوں میں سے ہیں تو لیگ میں شامل ہو جائیں، کسی معاہدے یا شرط کا سوال ہی نہیں۔ بعض کوتاہ فکر فرماتے ہیں' قادیانی اُمت پاکستان سے متفق نہ ہوتی تو چودھری سر ظفر اللہ باؤنڈری کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کے وکیل کیوں ہوتے؟ یہ ایک بودا استدلال ہے۔ چودھری سر ظفر اللہ خان مسلمان کی حیثیت سے باؤنڈری کمیشن کے سامنے پیش نہیں کیے گئے بلکہ ایک ایڈووکیٹ کی حیثیت سے قائداعظمؒ نے انھیں نامزد کیا تھا اور شاید قائدؒ کے ذہن میں یہ نقشہ تھا کہ مسئلہ قانون سے کہیں زیادہ سیاسی ہے۔ چونکہ ظفر اللہ خاں سرکارِ انگلشیہ کے فرزند دلبند ہیں لہٰذا انھیں پیش کرنے سے ممکن ہے مثبت نتائج مرتب ہوں۔ قائداعظمؒ ان مسائل میں صرف قانون کو دیکھتے تھے۔ قائداعظمؒ کو شہید گنج کی مسجد کے مسئلہ میں وکالت کے لیے گزارش کی گئی تو آپ نے مقدمہ کی نوعیت کے پیش نظر ایک انگریز کا نام تجویز کیا اور اسے وکیل کیا گیا۔ المختصر ایک مسجد کے مسئلہ میں ایک انگریز وکیل تھا۔

اس طائفہ کی ایک اور دلیل ہے کہ میرزا غلام احمد کی حلقہ بگوشی کے باعث ظفر اللہ خاں نامسلمان ہوتے تو قائداعظمؒ انھیں پاکستان کی کابینہ میں نہ لیتے۔ اس کٹ حجتی کا علاج نہیں۔ قائداعظمؒ دینی پیشوا نہ تھے' وہ ہندوستان کی سیاسی جنگ میں مسلمانوں کے سب سے بڑے قائد تھے اور اپنے صوابدید کے مطابق پاکستان حاصل کیا۔ ان کی زندگی وفا کرتی تو پاکستان اس طرح خوار نہ ہوتا جس طرح آج ابتلاء و تذبذب کے نرغہ میں ہے، نہ میرزا بشیر الدین محمود کو اپنے اقتدار کی خفی خواہش کے اقتضاء پر سیاسی پھلجڑیاں چھوڑنے کا حوصلہ ہوتا اور نہ 1953ء میں مسلمانوں کے سینے ختم نبوت کی پاداش میں گولیوں سے چھلنی کیے جاتے۔ ظفر اللہ خاں پاکستانی کابینہ میں جوگندر ناتھ منڈل کی طرح ایک وزیر تھے۔ کیا منڈل مسلمان تھا؟ اگر پاکستانی کابینہ میں شمول کے باوجود وہ مسلمان نہیں تھا تو ظفر

اللہ خاں کے وزیر ہو جانے سے ان کا اسلام کیونکر ثابت ہوتا ہے۔

قائداعظمؒ ایک سال ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے جانشین لیاقت علی خاں تھے لیکن انھیں ایک شقی القلب کی گولی نے ابدی نیند سُلا دیا۔ ظفر اللہ خاں، خواجہ ناظم الدین کی وزارت کے زمانہ میں وزیر خارجہ تھے یا پھر محمد علی بوگرہ کی وزارت میں ٹکے رہے، تو یہ استعماری طاقتوں کا شعبدہ و منشاء تھا اور پاکستان اپنے سیاست دانوں کی بدعملیوں کے باعث ان کے ہاتھوں مجبور تھا۔ خواجہ ناظم الدین نے منیر انکوائری کمیشن کے روبرو اظہار کیا تھا کہ ظفر اللہ خاں کو سبکدوش کر کے ہم امریکہ سے گندم حاصل نہ کر سکتے تھے، ان دنوں پاکستان غذائی بحران سے گزر رہا تھا۔ گویا ظفر اللہ خاں پاکستان کابینہ میں مسلمان ہونے کی وجہ سے نہ تھے۔ قائداعظمؒ نے انھیں اپنی کابینہ میں لیا تھا تو محض اس لیے کہ انھیں برطانوی ہندوستان میں مرکزی حکومت کا طویل تجربہ تھا۔ ان کے بعد وہ پاکستان میں استعماری ہدایت پر تھے۔

میرزائی قیامِ پاکستان سے ناخوش تھے۔ میرزا بشیر الدین محمود نے مئی 1947ء میں خطبہ دیا تھا کہ ''ہم ہندوستان کی تقسیم پر خوشی سے راضی نہیں ہوں گے بلکہ مجبوری سے، پھر یہ کوشش کریں گے کہ ہندوستان کسی نہ کسی طرح متحد ہو جائے۔'' (روزنامہ الفضل 16 مئی 1947ء)

15 اگست 1947ء کے الفضل میں میرزا محمود کی تقریر درج ہے جس میں الفاظ ذیل ہیں:

> ''بہر حال ہم چاہتے ہیں اکھنڈ ہندوستان بنے اور ساری قومیں باہم شیر و شکر ہو کر رہیں۔''
>
> ایک اور موقع پر مرزا بشیر الدین محمود نے کہا تھا کہ ''ہم ہندوستان کی تقسیم پر رضامند ہوئے تو خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری سے اور پھر یہ کوشش کریں گے کہ کسی نہ کسی طرح پھر متحد ہو جائیں۔'' (روزنامہ الفضل قادیان 17 مئی 1947ء)

جسٹس منیر نے فسادات پنجاب کی تحقیقاتی رپورٹ میں تسلیم کیا ہے کہ احمدی پاکستان کو اپنے لیے منتخب نہ کرتے ...... ان کا خلیفۂ ثانی 1922ء ہی میں اعلان کر چکا تھا کہ:

> ''ہم احمدی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔'' (الفضل 14 فروری 1922)

لیکن میرزائی پاکستان میں استعماری گماشتہ کی حیثیت سے وارد ہوئے۔ انھیں معلوم تھا کہ ہندوستان میں وہ استعماری جاسوس کی حیثیت سے نہیں رہ سکتے اور نہ انھیں کسی مرحلے میں کوئی مقام حاصل ہو سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ رحلت کر چکے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں آغوشِ لحد سے قریب تھے۔ میرزا بشیر الدین محمود کا خیال تھا کہ مسلم لیگ کی سیاسی مزاحمت کے باعث فعال علماء پٹ چکے ہیں اور احرار مسلم لیگ کی مخالفت کے باعث مسلمانوں کے مغضوب و معتوب ہو چکے ہیں۔ ان کے لیے حکومت میں کوئی

سی جگہ نہیں اور نہ ان کی سرکاری دوائر میں کوئی آواز ہے۔ میرزا بشیر الدین محمود نے قائداعظمؒ کی وفات کو قادیانی امت کے لیے نیک فال جانا۔ جب لیاقت علی خاں شہید ہو گئے تو پاکستان کا سیاسی میدان ان کے لیے زیادہ صاف تھا۔ ان کا پہلا شبخون محاربۂ کشمیر میں فرقان بٹالین تھا۔ سر ڈگلس گریسی اس کے سرپرست تھے۔ میرزا بشیر الدین نے مسٹر ڈی وائی فل (پولیٹیکل ایجنٹ کوئٹہ) اور مسٹر جیفرے ایجنٹ جنرل بلوچستان سے پخت وپز کے بعد بلوچستان کو استعماری مقاصد کے لیے میرزائی صوبہ بنانے کا اعلان کیا۔ ان کا یہ خطبہ 4 اگست **1948**ء کے الفضل میں درج ہے اور جسٹس منیر کی انکوائری رپورٹ میں اس کا حوالہ آچکا ہے۔ اگر **1953**ء میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کی تحریک نہ چلتی اور اس کے ہمہ گیر اثرات مرتب نہ ہوتے تو میرزائی امت کا خواجہ ناظم الدین اور ملک غلام محمد کے زمانہ میں گل کھلانا مشکل نہ تھا' لیکن اس تحریک نے انھیں پیچھے کو دھکیل دیا اور انھیں اپنا طریق **(Strategies)** بدلنا پڑا۔ امریکہ وروس اپنے ذہن کے مطابق ہندوستان کو چین کے خلاف استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ہندوستان نے عذر کیا کہ ان کے دوطرف شانے پر پاکستان بیٹھا ہے اور وہ اس کی پیٹھ میں خنجر کے مصداق ہے۔ پہلے اس کو ٹھیک کیا جائے پھر چین کے مسئلہ پر غور ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کے لیے پاکستان کا مطلب مغربی پاکستان رہا ہے۔ اسی صوبہ کی عسکری طاقت پاکستان کی فوجی طاقت تھی' چنانچہ **1965**ء کی جنگ عالمی استعمار نے میرزائیت کے بزرجمہروں کی معرفت پاکستان کے سر پر مڑھ دی۔ لیکن خدا کا فضل و کرم پاکستان کے شامل حال تھا۔ فوج کی جواں مردی اور حمیتِ دینی کام آئی' اس طرح پاکستان بچ گیا۔

عالمی استعمار اور ہندوستان کے لیے یہ ایک اور ذہنی شکست تھی۔ اس کے بعد پاکستان قادیانی امت اور بعض دوسرے سیاسی عناصر کی معرفت خارجی مداخلتوں کا محور ہو گیا...... اس کی تفصیلات بڑی ہی اندوہناک اور جانگداز ہیں اور یہ موضوع ان سے مختلف ہے۔ المختصر میرزائیت نے ایک خارجی تحریک کے طور پر اس طرح سر اُٹھایا کہ:

اوّلاً: اسرائیل کی ملی بھگت سے پاکستان کے اسلامی ذہن کو غارت کیا اور اس کے سرمائے سے ملک کی سیاسی زندگی کے شب و روز اُتھل پتھل کیے۔ پاکستان میں اسلام کے خلاف دورانِ انتخابات میرزائی' اسرائیلی سرمائے سے تخریبی عناصر کی معاونت کرتے رہے اور اپنے حسبِ منشا ذہنی مزاج کے نتائج پیدا کیے۔

ثانیاً: مشرقی پاکستان الگ کرانے کی سازش بہ لطائف الحیل کاشت کی اور اس کی مختلف واسطوں سے آبیاری کرتے رہے۔ ایم ایم احمد نے مالیاتی اعتبار سے مشرقی پاکستان کو برہم کیا جس سے علیحدگی کا ذہن بھڑک اُٹھا اور منظم ہو گیا۔ اس کے بعد مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کا فوجی عمل

میرزائیت کی ہولناک منصوبہ بندی کے تحت ایک المیہ تھا۔ پنجاب کی عسکری روایات ٹوٹ گئیں اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش ہو کر الگ ہو گیا۔ مشرقی پاکستان کی موجودگی میں میرزائیت کے لیے مغربی پاکستان میں پنپنا ناممکن تھا۔

ثالثاً: اب مغربی پاکستان میرزائیت کے بین الاقوامی مہروں چودھری ظفر اللہ خاں' مسٹر ایم ایم احمد اور ڈاکٹر عبدالسلام وغیرہ کی معرفت استعمار کے تقسیمی منصوبوں کی جولاں گاہ ہے اور پاکستان میں ربوہ کا مرکز ان منصوبوں کا سر دفتر ہے۔ منصوبے کیا ہیں؟ مغربی پاکستان کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کرنا اور انھیں خود مختاری کا فریب دے کر نظریاتی و استعماری تحویل میں رکھنا' جس طرح یورپ میں بلقان کی ریاستیں تقسیم کی گئیں اور پہلی جنگ عظیم میں عربوں کے ہاتھوں ترکوں کو پچھاڑ کر جزیرۃ العرب کی بندر بانٹ کی گئی۔ اسی طرح عالمی استعمار مغربی پاکستان کو پختونستان' بلوچستان' سندھو دیش اور پنجاب کی علیحدہ علیحدہ ریاستوں میں بانٹنا چاہتا اور کراچی کو ہانگ کانگ کی طرح مسلمانوں کی ایک خاص جماعت کے حوالے کر کے ایک آزاد بندرگاہ بنانا چاہتا ہے اور یہ ابوظہبی' کویت' قطر' مسقط وغیرہ کے طرز کی الگ الگ ریاستیں بنا دینے کا منصوبہ ہے...... پاکستان میں قادیانی اُمت اس مقصد کے لیے سرگرم جہد ہے اور وہ پاکستان کی مختلف سیاسی تنظیموں میں اشتراک و تعاون یا مفاہمت و میثاق کی ہر فضا کو سبوتاژ کر رہی ہے۔ میرزائیت نے پاکستان میں مالیات کے مختلف شعبوں کو تصرف میں لانے اور عسکریات میں اپنی طاقت بڑھانے کے منصوبے کو بال و پردے کر ملک سے باہر افریشیائی ریاستوں میں اسرائیل کے لیے عربوں کی جاسوسی اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ ان خدمات ہی کے صلہ میں استعماری منصوبے کے مطابق پنجاب کی ریاست سکھوں کو ملا کر انھیں عطا کرنے کا استعماری فیصلہ ہو چکا ہے۔ جس طرح شریفِ مکہ نے ترکوں سے غداری کی اور برطانیہ کا آلہ کار ہو کر حجاز حاصل کیا تھا اسی طرح میرزا ناصر احمد پاکستان سے غداری کر رہا اور استعمار کا آلہ کار ہو کر پنجاب پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہا ہے۔

پاکستانی مسلمانوں کی غفلت

پاکستان اقبالؒ کی عبقریت کا نام ہے۔ اقبالؒ کو پاکستان سے حذف کر دیں تو پاکستان ایک بغیر دماغ ڈھانچہ رہ جاتا ہے...... نپولین نے کہا تھا' فرانس کا انقلاب کیا ہے' روسو! وکٹر ہیوگو نے کہا تھا کہ والٹیئر اور اس کی روح کو سمجھنا اٹھارویں صدی کی روح کو سمجھ لینا ہے۔ روس و چین کے انقلابی معمار بلاشبہ لینن و ماؤزے ہیں لیکن ان کے فلسفہ کی روح مارکس ہے۔ پاکستان کے تصوراتی معمار اقبال تھے لیکن ملکی سیاست دانوں اور قومی دانشوروں نے فکرِ اقبالؒ سے غداری کی ہے۔ وہ اپنے سیاسی استحکام یا

شخصی مقام کے لیے تو اقبال کو بڑھ بڑھ کے پیش کرتے ہیں لیکن اقبالؒ جو چاہتے اور جن بنیادوں سے ان کے افکار متجلی ہوتے تھے ان دانشوروں اور سیاست دانوں نے ان کو لپیٹ کے رکھ دیا اور ان کا تذکرہ بعض حالتوں میں جرم قرار دیا۔ وہ اقبالؒ کے گلے میں اپنی آواز ڈال کر اقبال کو پیش کرتے ہیں اور افکارِ اقبال کی اصل روح کو ہلاک کرنے سے شرماتے تک نہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم نے پہلے ایک کتابچہ ''مُلا اور اقبال'' پھر ''فکرِ اقبال'' ایسی ضخیم کتاب لکھ کر اس خیانت مجرمانہ کا ارتکاب کیا۔ جن بنیادوں پر افکارِ اقبال کا مدار تھا' ان کی تغلیط کی اور جن کا ان کے ہاں ذکر تک نہ تھا انھیں افکارِ اقبال کا موضوع بنایا۔

علامہ اقبالؒ نے تشکیلِ جدید الٰہیات کے پانچویں خطبہ میں ختم نبوت کے تصور پر بحث کی اور مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کا لازمہ قرار دیا ہے کہ اس تصور میں کوئی سا خلل پیدا ہوتو وحدتِ اسلامی ہی باقی نہیں رہتی۔ علامہ نے پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں لکھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی شخص کے ملہم ہونے کا سوال ہی خارج از بحث ہے۔ جو شخص ایسا دعویٰ کرتا ہے وہ اسلام کا غدار ہے۔ مسٹر محمود نظامی نے بعض حلقہ نشینانِ اقبال کے مختلف مقالات پر مشتمل 1938ء میں ''ملفوظات'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ جناب محمد حسن عرشی اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں:

علامہؒ نے فرمایا:

''قادیانی فرقہ کا وجود عالم اسلامی' عقائدِ اسلام' شرافتِ انبیاء' خاتمیتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کاملیتِ قرآن کے لیے قطعاً مضر ومنافی ہے۔''

علامہ نے پروفیسر الیاس برنی کو ایک خط میں لکھا تھا:

''بروز کا مسئلہ عجمی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اصل اس کی آرین ہے۔ میری رائے میں اس مسئلہ کی تاریخی تحقیق قادیانیت کا خاتمہ کرنے کے لیے کافی ہے۔''

لیکن اقبالئین نے جنھیں اپنے فضلاء و محقق ہونے پر ناز ہے اقبالؒ کے یومِ ولادت کی تلاش میں کئی سال گزار دیے لیکن اقبال کا جو مشن تھا اس سے فرار کیا۔

عبدالرشید طارق نے ملفوظات میں لکھا ہے ''علامہ موسیٰ جار اللہ نے حضرت علامہ سے اس مصرعہ کی وضاحت چاہی۔

ایں زحج بیگانہ کرد آں از جہاد

فرمایا:

بہا اللہ ایرانی اور غلام احمد قادیانی۔

جناب خضر تمیمی اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسم سے فرمایا:

''قادیانیت اسلام کی سیزدہ صد سالہ علمی و دینی ترقی کے منافی ہے۔'' (ملفوظات)

خضر تمیمی راوی ہیں:

''علامہ کا ارشاد تھا کہ **الیوم اکملت لکم دینکم** کے بعد اجرائے نبوت کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ قادیانی اسلاف کی تحریروں کو محرف کر دیتے ہیں۔''

جناب بشیر احمد ڈار اقبال اکادمی کراچی کے اڈیٹر تھے۔ انھوں نے علامہ اقبالؒ کی تقاریظ، خطوط، مضامین اور کلام وغیرہ کے باقیات انوارِ اقبالؒ کے نام سے مرتب کیے اور مارچ 1967ء میں وہ مجموعہ شائع کیا، اس کے صفحہ 45 پر علامہ اقبالؒ کے ایک خط کا فوٹوسٹیٹ ہے۔ علامہ نے مسئلہ ختم نبوت سے متعلق جو کہا وہ کتابت کے صفحہ پر بھی ہے، لیکن جو علاج بتایا وہ درج نہیں، البتہ فوٹوسٹیٹ میں درج ہے، علامہؒ فرماتے ہیں:

''ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزائے نبوت موجود ہیں یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے، تو وہ شخص کاذب ہے اور واجب القتل۔ مسیلمہ کذاب کو اسی بنا پر قتل کیا گیا۔''

جسٹس ایس اے رحمٰن سپریم کورٹ سے ریٹائر ہونے کے بعد آج کل بزمِ اقبال لاہور کے سرخیل ہیں۔ ان کے علم و فضل میں کلام نہیں، لیکن مسئلہ ارتداد پر حال ہی میں آپ نے جو کتاب حوالۂ قلم کی وہ علامہ اقبال کے اس نظریہ کی نفی کرتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ بزمِ اقبال لاہور میں خصوصی شہرت کے فضلاء اقبال کے بنیادی نظریات کی نفی کرتے اور اس کو افکارِ اقبال کی خدمت گزاری پر محمول کرتے ہیں۔

یورپی فکر کے محققین

اقبال کے شارحین و ناقدین و محققین کی وہ کھیپ جو علومِ مغربی سے بہرہ مند ہے، وہ علوم اسلامی اور معارفِ قرآنی سے نابلد ہونے کے باعث معذوری و کوتاہی کا شکار ہے۔ المختصر فہم اقبال سے قاصر ہے۔ علامہؒ نے علی گڑھ کے مشہور ادیب پروفیسر آل احمد سرور کو لکھا تھا:

''میرے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے پہلے حقائقِ اسلامیہ کا مطالعہ ضروری ہے۔''

لیکن جن لوگوں نے پاکستان میں سرکاری اکادمیوں سے حصول زر کے لیے اقبال پر قلم اُٹھایا ہے یا جو لوگ علم کے جدید و قدیم سے آشنا نہیں اور آشنا ہیں تو یک طرفہ جدید کے یا قدیم کے، ان سے

متعلق ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے فیضانِ اقبال کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ:

''فکرِ اقبال سر پیٹ رہا ہے کہ مجھے ان اکادمیوں اور مدرسوں سے بچاؤ جن میں میری روح ذبح کی جا رہی ہے۔ افسوس کہ یہ لوگ جو کچھ میرے بارے میں کہہ رہے ہیں وہ میرے حاشیۂ خیال میں کبھی نہیں گزرا۔''

ان لوگوں نے اقبالؒ سے متعلق جو ستم کیا وہ یہ تھا کہ ان کے افکار کو یورپی فلاسفروں کے اخذ و تاثر سے منسوب کیا اور اس طرح ان کی اسلامی فکر کو ارادی طور پر نہ سہی غیر ارادی طور پر تاراج کرنا چاہا۔

پروفیسر شیخ عطاء اللہ نے علامہ اقبال کے خطوط ''اقبال نامہ'' کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیے۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علامہ عمر بھر علمائے اسلام کی حقیقی جماعت سے مختلف مسائل میں استفادہ و مشورہ کرتے رہے، لیکن شارحینِ اقبال جو مغربی تعلیم کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے اور اپنے تئیں ان کا وارث گردانتے رہے، وہ ان علماء سے مستفید ہونا تو ایک طرف رہا، ان کی اہانت کے مرتکب ہوتے رہے۔ انھوں نے غور ہی نہ کیا کہ اقبالؒ نے جو کام پاکستان سے شروع کیا اس کی انتہا سارے ایشیا کے اسلامی انقلاب تک پہنچتی ہے اور اقبالؒ ہی کی فکری بنیاد پر ایشیا میں اسلامی انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔

اقبالؒ نے سیّد سلیمان ندوی کو ایک خط میں لکھا تھا کہ:

''مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے۔''

عبدالماجد دریا آبادی کو لکھا کہ:

''مغربی کالجوں کے پڑھے ہوئے نوجوان روحانی اعتبار سے فرومایہ ہیں، ان کو معلوم نہیں اسلامیات کیا ہیں؟''

اقبالؒ نے یورپی تعلیمات کے اس طائفہ کو اپنے کلام میں جن الفاظ سے یاد کیا، ان کی عمومی فہرست حسبِ ذیل ہے:

(1) بتانِ وہم و گماں (2) زناری برگساں (3) خانزادگانِ کبیر (4) نقش ہائے فرنگ (5) نیام تہی (6) وجود محض (7) مرکب ایام (8) فتنۂ عصر (9) مورو مگس (10) لب گور (11) ارواحِ خبیثہ (12) بیگانۂ خودی (13) غارت گرِ دین (14) داشتۂ فرنگ (15) بندگانِ معاش (16) قمار باز (17) مردِ بے کار (18) زنِ تہی آغوش (19) رات کا شہباز (20) ادراک فروش (21) ابلیس زادے (22) سوداگرانِ مے دقمار (23) تاجرانِ زنانِ بازاری (24) جان بھی گرد غیر بدن بھی گرد غیر (25) کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مُردہ ضمیر (26) مُردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس (27) جوانانِ خاکباز (28)

کرگس (29) شکم پرست (30) پُر کار و سخن ساز (31) صید ظن و تخمیں (32) ذریت افرنگ (33) مولا (34) جہلِ مرکب (35) نگاہش نقشبندِ کافری ہا (36) سلطانی بہ شیطانی بہم کرد (37) بینائے غلط بیں (38) بے دین دانشمند (39) فروتر از زاغِ دخمہ (40) خرِ استعمار (41) چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر (42) نہ معرفت نہ محبت نہ زندگی نہ نگاہ (43) زاغِ دشتی (44) حشیش فروش (45) شرعِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بیزار (46) شکارِ مردہ (47) ہم نفسانِ خام (48) مفلسانِ شعر۔

اقبال نے شروع سے آخر تک مغرب اور اس کے ایشیائی بالخصوص مسلمان حلقہ بگوشوں پر سخت سے سخت تنقید کی ہے۔ان کے نزدیک مرگھٹ کا کوّا ان سے بہتر ہے۔مغربی نظامِ تعلیم کے ان خوشہ چینوں ہی کا کرشمہ ہے کہ طلبہ کے گلے لا الٰہ الا اللّٰہ سے محروم ہو گئے۔شاہبازوں نے خاکبازی کا سبق حاصل کیا اور مکتب مذبح بن گئے۔اقبالؒ نے اس مغرب زدہ طبقہ ہی سے متعلق کہا ہے کہ ؎

اگر ایں آب و جاہے از فرنگ است
جبینِ خود منہ جُز بر درِ او
سریں را ہم بہ چوبش رہ کہ آخر
حقے دارد بہ خر پالاں گرِ او

اس سے بڑھ کر درشت تنقید کیا ہو سکتی ہے اور یہ وہی عبقری عصر کہہ سکتا تھا جس کا گھر اپنوں ہی کے چراغ سے جل رہا ہو۔ان چار مصرعوں میں ایک احتجاج ہے کہ "تیری فراست و عظمت اگر مغرب کی وجہ سے ہے تو پھر اپنی پیشانی کو اس کی چوکھٹ کے سوا اور کہیں نہ جھکا۔اور دلیل کیا دی ہے کہ اس کے ڈنڈے میں اپنے چوتڑوں کو دے دے کہ گدھے پر کمہار کا حق ہے۔

ارمغانِ حجاز میں اس کھیپ سے متعلق اقبالؒ کے بہت سے قطعات ہیں' مثلاً:

زمن گیر ایں کہ مردے کور چشمے
ز بینائے غلط بینے نکوتر
زمن گیر ایں کہ نادانے نکو کیش
ز دانشمندِ بے دینے نکوتر

بینائے غلط بیں سے مردِ کور چشم نکوتر ہے اور بے دین دانشمند سے نکو کیش نادان افضل ہے۔

اقبالؒ کی بصیرت نے ان اکادمیوں کے فضلاء ہی کا اندازہ کیا تھا کہ ؎

چو رختِ خویش بر بستم ازیں خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا بود

و لیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

خلیفہ عبدالحکیم، ملک غلام محمد (گورنر جنرل) سے مخصوص دوستی کے باعث عمر بھر ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور کے سربراہ رہے اور انجمن ستائشِ باہمی کی معرفت افکار اقبال پر اتھارٹی (Authority) قرار دیے گئے۔ انھوں نے جن دوستوں سے اقبال پر کتابیں لکھوائیں وہ ان کی منڈلی کے ارکان تھے اور ان کے ذہن کی نمائندگی کرتے تھے۔ خود خلیفہ صاحب نے فکرِ اقبال لکھی اور اس کی بدولت نامور ہونا چاہا لیکن خلیفہ صاحب نے اس میں کیا لکھا' مُشتے نمونہ از خروارے ملاحظہ فرمایئے۔ فکر اقبال کے صفحہ 201 , 215 , 218 , 223 پر فرماتے ہیں:

1- ''اقبال کے ہاں مغربی تہذیب کے متعلق زیادہ تر مخالفانہ تنقید ہی ملتی ہے اور یہ مخالفت اس کے رگ و ریشہ میں اس قدر رچی ہوئی ہے کہ اپنی اکثر نظموں میں جا و بے جا ضرور اس پر ایک ضرب رسید کر دیتا ہے۔ مجموعی طور پر اثر ہوتا ہے کہ اقبال کو مغربی تہذیب میں خوبی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ اس کے اندر باہر فساد ہی فساد دکھائی دیتا ہے۔ گویا یہ تمام کارخانہ ابلیس کی تجلی ہے۔ بعض نظمیں تو خالص اسی مضمون کی ہیں۔ اپنی غزلوں میں بھی حکمت و عرفان' تصوف اور ذوق و شوق کے اشعار کہتے کہتے یونہی ایک آدھ ضرب مغرب کو رسید کر دیتے ہیں۔ بالِ جبریل کی اکثر غزلیں بہت ولولہ انگیز ہیں لیکن اچھے اشعار کہتے کہتے ایک شعر میں فرنگ کے متعلق غصہ اور بیزاری کا اظہار کر دیتے ہیں اور پڑھنے والے صاحبِ ذوق انسان کو دھکا سا لگتا ہے کہ فرنگ عیوب سے لبریز سہی لیکن یہاں اس کا ذکر نہ کیا جاتا تو اچھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصفا آبِ رواں کا لبِ جو بیٹھے لطف اٹھا رہے تھے کہ اس میں یک بیک ایک مردہ جانور کی لاش بھی تیرتی ہوئی سامنے آ گئی۔''

2- ''مغرب کے خلاف اقبال نے اس قدر تکرار کے ساتھ لکھا ہے کہ پڑھنے والا اس مغالطہ میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ اقبال بڑا مشرق پرست' جامد ملا اور رجعت پسند ہے۔''

3- ''اقبال نے جو تنقید مغرب پر کی ہے اس سے کہیں زیادہ مغربی مفکرین نے اپنے عیوب گنوائے اور ان کے علاج تجویز کیے ہیں۔''

-4 بالِ جبریل میں ایک شعر ہے ؎

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہ گزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

خلیفہ صاحب فرماتے ہیں:

''چلو قصہ تمام ہوا۔ ہم تو ڈوبے تھے صنم' تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔''

اقبال نے اسی مغرب زدہ طائفہ سے متعلق کہا تھا:

''میں قرونِ وسطیٰ کا ڈکٹیٹر بن جاؤں تو اس طبقہ ہی کو ہلاک کر دوں۔''

ایک قومی ضرورت

پاکستان اقبالؒ کے خواب کی تعبیر تھا' لیکن یہ سب کچھ اقبالؒ سے پاکستان میں ہوا۔ چونکہ اقبالؒ ایک قومی ضرورت تھا لہٰذا ان کا چرچا شدت سے کیا گیا۔ پاکستان بنا تو بعض ''دانشور'' جو اس وقت قلیل التعداد تھے' اقبالؒ کی فکر سے کٹ کے رہنا چاہتے ادران کی شخصیت کو پاکستان کا ذہنی ہیرو یا اس خطے کے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا محرک قرار دینے کے خلاف تھے۔ وہ نہ تو اس کی فکر کو فکر تسلیم کرتے اور نہ اس رعایت سے انھیں مسلمانوں کا ذہنی راہنما مانتے تھے۔ وہ انھیں ایک شاعر کے درجہ تک رکھنا چاہتے تھے۔ ان میں اکثریت اشتراکیوں اور اشتمالیوں کی تھی اور ان کے ساتھ کچھ ایسے عناصر بھی تھے جو اس وقت اپنے ذہنی بغض کی نمائش کرتے ہوئے خوف محسوس کرتے تھے۔ کئی ایک صوبائی عصبیتوں کا شکار تھے اور ان کا پاکستان کی جدوجہد سے متعلق ایک منفی ذہن تھا۔

بہر حال پاکستان میں اقبالؒ کا نام اجتماعی طور پر تو شدت سے لیا گیا' لیکن اقبالؒ کا کام جو اس کے افکار کا نصب العین تھا' اس کے ساتھ اغماض کیا گیا۔ جن لوگوں کو ناز تھا کہ وہ اقبال کی زندگی میں ان کے صحبت نشیں تھے انھوں نے اقبالؒ پر شاذ ہی قلم اٹھایا۔ اگر کسی نے ایک دراز مدت کے بعد کچھ لکھا تو وہ اقبالؒ کا نصب العین نہیں تھا اور نہ ان افکار کا تذکرہ تھا جو اُن کے ہاں ملّی وحدت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے تھے۔ اقبالؒ سے متعلق عمومی لٹریچر کی بہتات ہے۔ کئی ایک کتابیں ان کے سوانح و افکار پر آ چکی ہیں' لیکن ان کے پاکستانی سوانح نگار بہمہ وجوہ کئی ایک تشنگیاں رکھتے ہیں اور کچھ غلط چیزیں بعض ناگفتہ بہ مصلحتوں کے تابع سوانح میں شامل کی گئی ہیں۔ رہا افکار کا مسئلہ تو اس بارے میں زیادہ تر فروعات پر قلم اٹھایا گیا اور ان موضوعات کو فی الجملہ روحِ اقبال سے نسبت دی گئی ہے جو افکارِ اقبال کا اساسی نہیں عموی حصہ ہیں۔ ان موضوعات کو اقبال کے نصب العین سے کوئی نسبت نہیں۔

ان شارحینِ اقبال میں اکثریت ان ''حکماء'' و''فضلاء'' کی ہے جو اسلام کی بہ نسبت اقبال کے طرفدار اور اقبال کے مقابلہ میں اپنی ذات کے پیش کار ہیں۔

جن لوگوں نے تصنیفات و تالیفات کے تحت پاکستان میں اقبالؒ پر قلم اٹھایا' انھیں سات حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1- وہ لوگ جو فی الواقعہ اقبالؒ سے مخلص ہیں۔انھوں نے کسی ایک موضوع یا بعض سوانحی عنوانوں پر قلم اٹھایا ہے' لیکن وہ کوئی جامع چیز پیش نہیں کر سکے اور نہ اقبالؒ کی دعوت و پیام اور تشریح و تفسیر پر قادر ہیں۔

2- وہ لوگ جو اقبالؒ سے جذباتی تعلق رکھتے' لیکن اس کے نظریوں سے ابلاغ کا تعلق پیدا کرنے کے بجائے اس کی یادوں کے چراغ جلاتے ہیں۔

3- وہ لوگ جو سرکاری اکادمیوں سے منسلک ہو کر اپنی معاش کے لیے غیر ضروری عنوانوں اور موضوعوں پر کتابیں لکھتے لکھواتے اور ڈھیر لگواتے رہے ہیں' ان کتابوں میں بعض چیزیں سرکاری منشا سے لکھی گئیں اور ان کے بین السطور میں حکومت کی خواہش کو دخل تھا۔

4- کئی لوگ جو خود کوئی سی ادبی وجاہت یا علمی منزلت نہ رکھتے تھے اور ان کا اہل قلم میں مستقلاً شمار نہ ہوتا تھا' انھوں نے اقبال کی معرفت مختلف واسطوں سے اپنی ذات کو قائم کرنے کے لیے اقبال سے متعلق تصنیفات کا پیشہ اختیار کیا۔

5- وہ لوگ جو اقبالیات کے فہم سے قاصر ہیں اور ان کی استعداد کمزور ہے' لیکن اقبالیات کے زمرۂ نگارش میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔

6- وہ لوگ جو اقبالؒ کو شاعر کی حیثیت سے دیکھتے لیکن اس کی فکر سے نابلد ہیں۔وہ صرف اقبالؒ کے شاعر ہونے پر زور دیتے ہیں اور انھیں اقبال کے محض شاعر ہونے پر اصرار ہے۔وہ اقبال کی فکر سے انکار کرتے اور ان کے نظریات سے اغماض برتتے ہیں۔

7- وہ لوگ جو اشتراکی فکر کے ہیں،وہ اپنی روایتی تکنیک کے تحت اقبالؒ پر تضاد کا الزام لگا کر ان کی شاعرانہ رفعت کا تذکرہ کرتے لیکن اس آڑ میں ان کی فکر کو سبوتاژ کرتے ہیں۔

سرکاری ادارے

اقبالؒ سے متعلق سرکاری اعانت سے دو ادارے قائم ہوئے۔ایک بزمِ اقبال نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ لاہور' دوسرا اقبال اکادمی کراچی۔ان اداروں نے اقبال سے متعلق جتنی کتابیں شائع

کیں' اقبال کی دعوت و پیام سے ان کا تعلق کھینچا تانی کے باوجود مترشح نہیں ہوتا' کچھ سوانحی خطوط ہیں۔ بعض چیزیں اقبال کی لغزیدہ پائی سے متعلق ہیں اور بعض دوراز کار مباحث یا مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ سے لاتعلق مسائل کا مجموعہ ہیں۔ اس سلسلہ میں بزم اقبال لاہور کے بانی ڈائریکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی فریبِ تصنیف ''فکر اقبال'' سب سے فروتر تصنیف ہے اور اس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ انھوں نے اقبالؒ کو مسخ کیا اور ان کے پیغام کو تضحیک کے لہجہ سے ملانا چاہا ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم نے تحریک ختم نبوت کے زمانہ میں ''اقبال و مُلّا'' کے عنوان سے **28** صفحہ کا ایک کتابچہ لکھا جو سرکاری طور پر تقسیم کیا گیا یا میرزائی امت نے بانٹا' لیکن اس کتابچہ کا مافی الضمیر سو فیصد غلط تھا۔ مطالب کی مینا کاری مؤلف کے ذہن کی کھٹ تے ہے۔ اقبال کا نظریۂ فن' اقبال کا نظریۂ ابلیس' اقبال اور برگساں' اقبال کا تصورِ ارتقاء اور جمالیات' اقبال کی تشکیل' قسم کے مقالات کو جمع کرنا اور انھیں فلسفۂ اقبال کے نام سے شائع کرنا اضحوکۂ افکار ہے۔ کیا اقبالؒ اس فلسفہ کے لیے اپنے شب و روز پیچ و تابِ رازی اور سوز و سازِ رومی کی نذر کرتے رہے۔ آخر پاکستان کی نوزائیدہ مملکت کے عوام اس سے کیونکر اپنی قومی تعمیر کے بال و پر حاصل کر سکتے تھے؟

اقبال اکادمی کراچی نے اپنی مطبوعات میں لاہور کی بزم اقبال کے مقابلہ میں سوانحی حد تک یا فنی رعایت سے ایک دو عمدہ چیزیں نکالی ہیں لیکن اقبالؒ کی دعوت و پیام کے اصل خطوط اس کی مطبوعات میں بھی سرکاری مصالح کی نذر ہوتے رہے ہیں۔ کئی تالیفات محض میلہ اقبال کے غبارے ہیں۔

اقبالؒ نے تعلیم سے فارغ ہو کر ابتداءً ''فلسفہ عجم'' اور ''علم الاقتصاد'' شائع کیں۔ یہ ان کے امتحانی مقالے تھے...... ''فلسفہ عجم'' بہر حال امتحانی مقالہ تھا اور وہ ان دونوں کتابوں کو اپنے خیالات کی پختگی کے بعد ابتدائی مشق سمجھتے تھے لیکن یار لوگوں نے ساٹھ سال بعد...... ان کی اشاعت لازم قرار دے لی کہ اقبال کے قلم سے ہیں' حالانکہ ان کا پاکستان کی ملی تاسیس سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ان کے مندرجات افکارِ اقبال کی اساس تھے۔ علم الاقتصاد **1902**ء میں شائع ہوئی تھی لیکن اقبال اکادمی کراچی نے **1961**ء میں اسے شائع کیا کہ خواہ اقتصادیات کے نظریے یکسر بدل چکے ہیں لیکن علم الاقتصاد بہر حال اقبال کے قلم سے ہے۔

آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی نے اقبال کے تعلیمی نظریات پر ایک کتاب شائع کی جو انجمن کے نام کی رعایت سے درست ہو لیکن اس میں اقبال کی دعوت یا فکر کا پرتو تک نہیں۔ ایک صاحب نے علامہ اقبالؒ کی پہلی بیوی (والدۂ آفتاب اقبال) کے نام سے شیخ عطا محمد برادرِ اکبر علامہ اقبال کے خطوط نہایت عمدہ کاغذ پر شائع کیے جو مرتب کی ایک نامسعود حرکت ہیں۔ ادارۂ ثقافتِ

اسلامیہ کلب روڈ لاہور نے اقبال کا نظریۂ اخلاق چھاپا جو عوام کے حدودِ فہم سے خارج تھا۔ ایک صاحب نے خوشحال خاں خٹک اور اقبال تصنیف فرمائی جو اقبال کی فکر میں خوشحال خاں خٹک کی فکر کے داخلہ کا تذکرہ ہے۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے اقبال کے آخری دو سال لکھ کر لیگ کے اندرونی اختلافات کی حکایت بیان کی۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایک جید انسان تھے۔ انھوں نے ''حکمتِ اقبال'' کے نام سے خودی کے موضوع پر تقریباً پانچ سو صفحات قلمبند کیے۔ ''اقبال اور سیاستِ ملی'' اقبال اکیڈمی کراچی نے شائع کی۔ مصنف رئیس احمد جعفری ہیں، لیکن اس میں بھی قلم کی مصلحتوں کا خلاء موجود ہے۔ بزمِ اقبال لاہور کی ایک اور کتاب ''مطالعۂ اقبال'' مرتبہ گوہر نوشاہی ہے، لیکن 19 مضامین کے اس مجموعہ میں اقبال اور کشمیر، اقبال اور حیدر آباد دکن، اقبال اور مسئلہ جبر و قدر، اقبال اور آرٹ، طرز کے مضامین تو ہیں لیکن اقبال کی وہ دعوت مطلقاً نہیں جو اقبال کا نصب العین تھا۔ آخر اقبال اور حیدر آباد اور اقبال و بھوپال کے مطالعہ سے وہ کونسی بصیرت حاصل ہوتی ہے جو افکارِ اقبال کی پہچان میں مدد دیتی ہے اور اگر انھیں شائع نہ کیا جاتا تو اقبال ادھورا رہ جاتا؟

فیلڈ مارشل ایوب خاں کے زمانہ میں ادیبوں اور شاعروں کے ڈنک کو ٹھنڈا کرنے کے لیے رائٹرز گلڈ قائم ہوا، اس کی معرفت مختلف کتابوں پر تقسیمِ انعامات کا دام بچھایا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایک منڈلی قائم ہوگئی جس نے ادنے پونے ادب پر حقِ دوستی ادا کیا۔ اس سال (1974ء) ''اقبال اور بھوپال'' کو دو میں سے ایک معیاری تصنیف قرار دے کر پانچ ہزار روپے انعام دیا گیا۔ اس کتاب میں ہے کیا؟ بعض دوسرے مضمرات سے قطع نظر ہمارے اس نظریے کی توثیق ہوتی ہے کہ اقبال روایتی قلمکاروں کے مذبح میں ہے اور اس کا نصب العین اس طائفہ کی دستگاہ میں نہیں یا ان کے فہم سے ماوریٰ ہے، یا پھر وہ عقیدتِ اقبال کی آڑ میں مسخِ اقبال کی مہم چلا رہے ہیں۔

اقبالؒ اور عشقِ رسول ﷺ

اقبال اور عشقِ رسول ﷺ ایک مستقل موضوع ہے۔ اس عنوان سے ایک ضخیم کتاب ہو سکتی ہے۔ بعض دوستوں نے جن کا تعلق سرکاری اکادمیوں سے نہیں، اس موضوع پر کلامِ اقبال جمع کیا اور نعت گوئی کے مختصرات بھی لکھے ہیں۔ لیکن اقبالؒ نے عشقِ رسول کے تحت جو کچھ لکھا حقیقتہً بہت کچھ لکھا۔ اس کا پس منظر اور تہہ منظر ان کی نگاہ سے اوجھل رہا ہے۔ علامہ، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کائناتِ انسانی کے سب سے بڑے راہنما کی حیثیت سے پیش کرتے تھے، ان کے کلام کی بنیاد یہی عشق تھا۔ وہ اس مطمحِ نظر کے تھے کہ جب تک کسی دعوت یا تعلیم کی علمبردار کوئی عظیم شخصیت نہ ہو، اس دعوت و

تعلیم کا طاقتور رہنا ممکن ہی نہیں اور نہ کوئی معاشرہ اس دعوت و تعلیم پر قائم ہوسکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کے عشق کا یہ حال تھا کہ آپ کی ذاتِ اقدس کو ازل سے ابد تک کائناتِ انسانی کے لیے سب سے بڑا قائد اور سب سے بڑا معلم سمجھتے تھے۔ دوسرا کوئی انسان ان کی مثل نہیں۔ ان کے بعد کسی ظلی یا بروزی نبوت کا سوال ہی عبث ہے۔ وہ اس کو کفر کے مصداق سمجھتے اور وحدتِ اسلامیہ کی شکست و ریخت کا حربہ خیال کرتے۔ ان کی دعوت کا مرکزی نکتہ پہلے بھی عرض کیا' یہی تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک ایسے وفاق کے شہری ہیں جو مختلف ملکوں کی مسلمان اقوام کو اسلامی معاشرہ مہیا کرتا اور انھیں اپنی وحدت کی لڑی میں پرو کر بالآخر انسانی وحدت کی طرف لے جاتا ہے۔

''روزگارِ فقیر'' کے مصنف نے علامہ اقبالؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:

''قرآن کو اس زاویۂ نگاہ سے مت پڑھو کہ تمھیں فلسفہ کے مسائل سمجھائے گا' اسے اس زاویۂ نگاہ سے پڑھو کہ اللہ تعالیٰ سے تمہارا رشتہ کیا ہے؟ اور کائنات میں تمہارا مقام کیا ہے؟''

نیاز الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''قرآن مجید کثرت سے پڑھنا چاہیے تاکہ قلب میں محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نسبت پیدا کرے۔''

میلادالنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک تقریر مطبوعہ ''صوفی'' اکتوبر 1926ء میں فرماتے ہیں:

''قرآن و حدیث کے غوامض بتانا بھی ضروری ہیں لیکن عوام کے دماغ ابھی ان مطالبِ عالیہ کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ فی الحال مسلمانوں کو اخلاقِ نبوی کی تعلیم دینی چاہیے۔''

ایک دوسری جگہ فرمایا:

''مسلم بحیثیت فرد وحی خداوندی کی رُو سے احسن التقویم ہے اور ملتِ اسلامیہ خیر الامم۔''

آل انڈیا مسلم لیگ الٰہ آباد کا خطبۂ صدارت جس میں پہلی دفعہ پاکستان کا تصور پیش کیا گیا' فرمایا کہ:

''اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں یعنی وحدتِ الوہیت پر ایمان' انبیاءؑ پر ایمان اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم رسالت پر ایمان۔ یہ آخری تعین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے

درمیان وجہ امتیاز ہے۔"

میرزائیت نہ صرف ختم رسالت کی نفی پر ہے بلکہ اس عالمی وفاق کے اسلامی معاشرہ کی تغلیط وتنسیخ کرتی ہے جو دینی وحدت کے سانچے میں ڈھل کر انسانی وحدت کا محرک ہوسکتا ہے۔

قادیانی ہائی کمانڈ نے حال ہی میں مسلمانوں کے احتساب سے خوفزدہ ہوکر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کا "اقرار" شروع کیا ہے لیکن عقیدۃً وہ خاتم النبیین کی مختلف تعبیریں اور تاویلیں کرتے ہیں۔ میرزا غلام احمد کی نبوت ان کا اساسی عقیدہ ہے۔ ان کے نزدیک خاتم النبیین کے معنی ہیں کہ اب کوئی کتاب اللہ نازل نہیں ہوگی' لیکن اس زمانہ میں رسول اللہ کی دعوت کا احیاو تکمیل میرزا غلام احمد کی نبوت کو منتقل ہو چکا ہے۔ وہ مسیحِ موعود اور مہدیٔ موعود ہیں۔ ان کی کتاب تذکرہ جسے وہ قرآن پاک کے برابر درجہ دیتے ہیں' میں ہے اور جو مسلمان ان کو نہیں مانتے وہ کافر ہیں۔ اس کے علاوہ ان پر فحش سے فحش گالیاں بکی ہیں۔

میرزا غلام احمد کے نہ ماننے والوں کو کافر گردانتا' ان سے دینی ومعاشرتی طور پر الگ رہنا اور خود مسلمان کہلانا فی الواقعہ ملتِ اسلامیہ کو غارت کرنے کی استعماری سازش کا خطرناک منصوبہ ہے جو ہندوستان میں انگریزی راج کے ورود نے پیدا کیا اور اب قادیانی امت اپنی ریاست قائم کرنے کی غرض سے مسلمان ریاستوں میں عالمی استعمار کا ففتھ کالم ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اجرائے نبوت کا سوال نہیں' سوال اُنؐ کی ملت کے اسلامی معاشرہ کا ہے کہ وہ قائم ہو تو کائناتِ انسانی کا اضطراب ختم ہوتا ہے۔ لیکن میرزا غلام احمد اور ان کے جانشینوں کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے افکار کی پاداش میں ساری دنیائے اسلام کو کافر قرار دے کر بہ لطائف الحیل لاکھ سوا لاکھ انسانوں کی ایک جماعت پیدا کر سکے ہیں اور یہ فصل بھی اسی نوے برس کے درمیان کاشت ہوئی ہے۔ قادیانی امت کا مشن کیا ہے کہ وہ "کافر مسلمانوں" کو "احمدی مسلمان" بناتی ہے لیکن عملاً عالمی استعمار کے لیے جس میں امریکہ' برطانیہ اور اسرائیل شامل ہیں' وہ کئی ایک اسلامی ریاستوں میں استعماری نراج برپا کراتی اور مسلمانوں کے روپ میں استعمار کے لیے جاسوسی کرتی ہے۔

فی الجملہ میرزا غلام احمد کا واحد کارنامہ یہ ہے کہ اس کی بدولت تمام دنیائے اسلام کافر ہو چکی ہے۔ یہود و نصاریٰ اہل کتاب ہیں لیکن مسلمان کافروں کی جاسوسی میرزائی امت کا فریضہ ہے۔ آج تک میرزائی امت جواب نہیں دے سکی کہ اس کے تبلیغی مشن ان علاقوں ہی میں کیوں ہیں' جہاں استعماری طاقتیں اپنے اجیروں کی معرفت سیاسی ناٹک کھیلتی ہیں۔ اسرائیل عرب مسلمانوں کی نفی پر ہے اور دنیا بھر کے یہود وہاں بسائے جارہے ہیں۔ وہاں عیسائی تبلیغی مشن قائم کرنے کی اجازت نہیں لیکن قادیانی تبلیغی مشن

قائم ہے۔ آخر اسرائیل میں قادیانی تبلیغ کن لوگوں پر ہوتی ہے؟ کیا یہود قادیانی ہوتے ہیں یا حجازی مسلمانوں کو قادیانی مسلمان بنانا مقصود ہے؟ کوئی یہودی مسلمان ہوا؟ ایک نہیں، تو پھر اسرائیل میں ''زر مبادلہ'' کس غرض سے صرف کیا جاتا ہے یا پھر عربوں کی جاسوسی کے لیے مشن کے تمام اخراجات حکومتِ اسرائیل برداشت کرتی ہے؟

اقبالؒ کے خلاف سازش

قلمکارانِ اقبال نے ان کے نصب العین سے جو برتاؤ کیا اس کا اجمالی ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اگر اس طائفہ میں کوئی فرد اقبالؒ سے مخلص ہوتا تو وہ ضرور اقبال اور قادیانیت کے موضوع اور اس موضوع سے متعلق علامہؒ کے اشارات دارشادات پر تحقیقی قلم اٹھاتا۔ لیکن قادیانی امت بالخصوص میرزا بشیر الدین محمود اور چودھری سر ظفر اللہ خاں نے پاکستان آ کر جو بخت وپز کی، اس کی مختلف شاخوں میں ایک شاخ کا منشا اقبال کی ہیٹی اور اس کے فکر کا اخفاء تھا۔ ان دونوں قادیانی ''بزرجمہر دں'' نے اپنی عقلِ عیار سے اس طرح کام لیا کہ افکار اقبال کو بالواسطہ اور بلاواسطہ غائب غلہ کرایا اور اقبالؒ کی رحلت سے پہلے جو افکار د نظریات تشکیلِ ملت کی بنیاد تھے انھیں گلدستۂ طاقِ نسیاں بنوا دیا۔ اقبالؒ قادیانی امت سے متعلق ایک طاقت در قلم کی ضرورت پر زور دے گئے تھے۔ کسی نے اس قلم کی ضرورت کا احساس نہ کیا اور کوئی رجلِ رشید نہ تھا جو ہندوستان میں تنسیخ جہاد کی استعماری سرگزشت پر تحقیق کرتا اور کھوج لگاتا کہ میرزا غلام احمد کو کن استعماری ضرورتوں کے تابع پیدا کیا گیا۔

یہ سب اقبالؒ کے خلاف ایک سازش تھی۔ ہمارے حکمران مغربی تعلیم اور یورپی تفکر کے سیکولر انسان تھے۔ انھوں نے قادیانی مسئلہ کو فرقہ دار مسئلہ قرار دے کر قادیانی امت کو معسکر مہیا کیا کہ وہ طاقتور ہوتی رہی...... بعض نے فرمایا کہ علامہ اقبالؒ نے قادیانی جماعت کو 1911ء میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ کہا تھا، اب ان کی مخالفت تضاد پیدا کرتی ہے۔ ان لوگوں کو تضاد کے معنی ہی کا علم نہیں کہ تضاد کیا ہے؟ افکار کا ارتقاء کسے کہتے ہیں؟ علم کس طرح پختگی حاصل کرتا اور قطعیت کو پہنچتا ہے؟ علامہ اقبالؒ نے خود اس کا جواب دیا تھا۔ جب ان کے محاسبہ پر قادیانی امت نے اسی ایک فقرے کا حوالہ دیا، تو فرمایا کہ اُس وقت میرے سامنے وہ الفاظ نہیں، تاہم دنیا میں پتھر ہی سوچنے سے انکار کر سکتے ہیں۔ میں نے اس وقت قادیانیت کے داخلی احوال وظروف کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اب اس مطالعہ کے بعد میں اس کے حقیقی خدوخال سے آگاہ ہو کر اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ وہ (قادیانی) محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں نقب لگا کر ایک الگ امت پیدا کرنا چاہتے اور مسلمانوں سے الگ تھلگ ایک دوسری ملت ہیں، انھیں خود اپنے عقائد کی بنا پر بھی ملتِ اسلامیہ میں رہنے کا حق نہیں ہے۔

غرض اس طرز کے ادچ پوچ دلائل پر قادیانی نبوت اور قادیانی خلافت کا انحصار ہے۔ اگر یہ دلیل کوئی دلیل ہوتی تو شاید افکار عالم کی سچائیوں کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ کسی چیز کے بارے میں رائے وہی ہوتی ہے جو آخری اور قطعی ہو۔ میرزائی استدلال کے مطابق قرآن کی وہ آئتیں جن سے پہلی آئتوں کے احکام منسوخ ہوئے' گویا نا قابلِ قبول ہیں کہ ان سے پہلے مختلف احکام ہیں۔ افراد کا معاملہ لیا جائے تو پھر حضرت عمرؓ کا اسلام (خاکم بدہن) قابل امتداد تھا کہ وہ قبولِ اسلام سے پہلے اسلام سے نبرد آزما تھے اور گھر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے آئے تھے۔ میرزائی منطق کے مطابق انھیں کیا حق تھا کہ اسلام کی حمایت کرتے اور قریشِ مکہ کے جہل و شرک کو رگیدتے۔

بزمِ اقبال لاہور ارادی حادثوں کا شکار رہی ہے؟ یا اقبالؒ سے متعلق اس کا لٹریچر اتفاقی سانحہ ہے لیکن عجیب سی چیز ہے کہ خلیفہ عبدالحکیم کی ''فکرِ اقبال'' کے علاوہ عابد علی عابد کی تالیف ''شعرِ اقبال'' بھی اغلاط کا پلندہ ہے۔ تیسری کتاب علامہ اقبال کے سوانح ''ذکرِ اقبال'' مولانا عبدالمجید سالک کے قلم سے ہے۔ مولانا خود ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور ان کے صاحبِ طرز ادیب ہونے میں شک ہی نہ تھا لیکن ان کے والد چونکہ قادیانی العقیدہ تھے اس لیے ان کا دل قادیانی مسئلہ میں علامہ اقبالؒ سے متفق نہ تھا کیونکہ اس طرح ان کے والد پر آنچ آتی اور سگے بھائی کٹ جاتے تھے۔ مولانا نے ''یارانِ کہن'' میں مولانا ابوالکلام آزاد کا تذکرہ لکھا تو ان کے قادیان جانے کا ذکر کیا اور میرزا کی رحلت پر روزنامہ ''وکیل'' امرتسر میں جو شذرہ چھپا تھا اس کو مولانا سے منسوب کیا۔ مولانا حیات تھے۔ انھوں نے سالک صاحب کو ڈپٹ پلا کر تردید و تصحیح کروائی کہ مذکورہ روایت معناً غلط ہے۔ علامہ اقبالؒ سے متعلق ذکرِ اقبال میں لکھا ہے کہ جاوید اقبال کی والدہ سے متعلق ایک بدبخت کے خفیہ خط سے جو سُوءِ ظن پیدا ہوا، اس کی تلافی کے لیے علامہ اقبالؒ نے میرزا جلال الدین کو مولوی حکیم نورالدین کے پاس قادیان بھیجا کہ مسئلہ پوچھ آؤ۔ میرزا نے مسئلہ پوچھا، واپس آ کر ایک مولوی کو طلب کیا اور ان کے حسبِ مشورت نکاح دوبارہ پڑھوایا گیا۔

اس احترام کے باوجود جو سالک مرحوم کے لیے احقر کے دل میں ہے' یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ''ذکرِ اقبال'' میں اس داستان سرائی سے انھوں نے اقبال کی ہیٹی کی ہے اور میرزائیوں نے اس روایت سے اقبال پر چھینٹے اُڑائے ہیں۔ ''اقبال و احمدیت'' کے زیرِ عنوان ذکرِ اقبالؒ کے صفحہ 210 پر مولف نے مولانا ظفر علی خاں اور مجلس احرار کی تحریک کا ذکر کیا اور لکھا ہے کہ ''خدا جانے علامہ اقبالؒ نے کس عقیدت مند کی درخواست پر ایک مضمون لکھ دیا' جس میں بتایا کہ اس فرقے کی بنیاد ہی غلطی پر ہے''......

اس خدا جانے پر غور کیجیے۔ علامہ اقبال کے عقیدت مند کی درخواست ماننے پر توجہ فرمایئے اور فرقہ کی بنیاد میں غلطی کا لفظ پر کھیے کہ علامہ نے غلطی لکھا یا کچھ اور فرمایا ہے۔ تعجب ہے کہ قادیانیت کے کفر کو سالک

صاحب نے غلطی کہا اور اقبال سے منسوب کیا' حالانکہ انھوں نے غداری' کفر اور ارتداد کے الفاظ لکھے ہیں۔

علامہ فرماتے ہیں کہ میں نے کبھی کسی دوسرے شخص کے ضمیر کی پیروی نہیں کی' میں اس آدمی کو اسلام اور انسانیت کا غدار سمجھتا ہوں جو دوسروں کے ضمیر کی پیروی کرتا ہے۔" (خطوط و خطبات)

پاکستان میں قادیانی امت نے غایت درجہ عیاری کے ساتھ اپنے مسئلہ کو احرار قادیانی نزاع کا نام دے کر حکومت کے مختلف الاصل افسروں اور لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس محمد منیر کی حمایت حاصل کی۔ حمایت کے پس منظر میں بعض شاعرانہ پہلو بھی تھے جو اسرائیلیوں کی طرح قادیانیوں کے نخاسہ بازار کا ہتھکنڈا ہیں۔ کیا اقبال اسلام سے نہیں احرار سے متاثر تھے؟ اور اسی تاثر کو انھوں نے اسلام کا نام دیا تھا۔

ان لوگوں کے نزدیک وہ کسوٹی کیا ہے جس سے معلوم ہو کہ فلاں افکار پر اقبال نے خود سوچا اور فلاں افکار خارجی محرکات کا نتیجہ تھے اور ان افکار میں اقبالؒ کا دماغ اپنا نہیں پرایا تھا۔ گویا جن افکار کی ان لوگوں کو ضرورت ہے وہ اقبال کے ہیں اور جن کی ضرورت نہیں وہ اقبال کے نہیں' کسی عقیدت مند کے ہیں۔ اگر یہ مفروضہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر افکارِ اقبال کی ساری عمارت ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خلاف اقبال کا ایک قطعہ ہے اور سیاسی چھچھورے اب تک مولانا کے کفن میں اس قطعہ کو ٹانکتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔ گویا شاعری جو اضطراری ہوتی ہے وہ اقبال کی ہے' لیکن نثر جو ذہن کی صحیح نمائندہ ہوتی ہے' اقبالؒ کی نہیں ۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

خلیفہ عبدالحکیم بھی رحلت فرما گئے' عابد علی عابد بھی وفات پا گئے اور مولانا عبدالمجید سالک بھی رخصت ہو گئے۔ ان کے بعد بزمِ اقبال جن لوگوں کے ہاتھ میں آئی' ان میں جسٹس ایس اے رحمٰن جیسے فاضل انسان نے مرتد کے مسئلہ پر ایک ایسی کتاب لکھی جو اس مسئلہ میں اقبال کی نفی کرتی ہے۔ آج (1974ء) پنجاب یونیورسٹی کے سبکدوش وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خاں بزمِ اقبال میں رونق افروز ہیں' آپ نے پنجاب یونیورسٹی میں مسندِ اقبال کا صدر ایک سکہ بند قادیانی پروفیسر کو بنایا تھا۔ آپ سے عرض کیا گیا' این چیست؟ تو آپ نے ماتھے پر شکن ڈالی۔ تب آپ اقتدار کے اسپِ تازی پر سوار تھے۔

مختصرات

قادیانیت سے متعلق اقبالؒ نے شاعری نہیں کی۔ ہر سخن نثر کی ترازو میں ناپ تول کے لکھا

ہے۔کام اس پر ہونا چاہیے اور جواب بھی اسی کا ہونا چاہیے۔اقبالؒ جذبات کی مخلوق نہ تھے اور نہ کوئی ایجی ٹیٹر تھے۔وہ ملتِ اسلامیہ کے حکیم تھے۔سیاست دان اپنے مستقبل پر اور مدبر ملت کے مستقبل پر سوچتے ہیں۔ایک مدبر' ایک حکیم اور ایک مفکر کی حیثیت سے انھوں نے قادیانیت کا جائزہ لے کر اس کا محاسبہ کیا۔ان کا یہ سوال جائز تھا کہ ''جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں تو پھر سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل ہونے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟''مسلمانوں کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔جو لوگ اس مسئلہ میں رواداری کا درس دیتے یا کمزوری کو اختیار کرتے ہیں وہ قومی خودکشی کے مرتکب ہوتے ہیں' کیونکہ جو ملت اپنی دینی سرحدوں کی حفاظت نہیں کر سکتی وہ بالآخر مٹ جاتی ہے۔پاکستان برعظیم کے مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کے دینی خدوخال کی اساس پر ایک جغرافیائی ریاست کا ظہور تھا۔اسلام کے نام سے قائم ہوا اور اسلام ہی اس کو باقی رکھ سکتا ہے۔اگر ہندوؤں سے الگ ہونے کا موقف اس لیے اختیار کیا تھا کہ ہم محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں سے ہیں' تو پاکستان میں ایک ایسی امت کا جواز کیا ہے جو ''قادیانی پیغمبر'' کے استعماری اغراض کی پیداوار ہے؟ لیکن حجازی پیغمبر (فداہ امی وابی) کی امت سے چوری کی گئی ہے اور جس کے نزدیک وہ تمام مسلمان جو میرزا غلام احمد کو نہیں مانتے کافر ہیں۔قادیانی اس عالمگیر تکفیر پر نصرانی واسرائیلی استعمار سے منسلک ہو کر جاسوسی کرنا اپنے پیغمبر کے ''اسوۂ حسنہ'' کا اتباع سمجھتے ہیں۔ہندوستان کو اس لیے بانٹا تھا کہ برعظیم کا سیاسی مسلمان محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت کے باعث اپنی ایک الگ ریاست چاہتا تھا' اور اب پاکستان کا سیاسی مسلمان قادیانی اقلیت سے اس لیے مرعوب ہے کہ استعماری طاقتیں اس کی سرپرست ہیں۔گویا افریشیا میں مقبوضہ نظام ختم ہو جانے کے بعد ایک مقبوضہ امت مسلمانوں کی روحانی وحدت کو پارہ پارہ کرنے میں یورپ کے نصرانی واسرائیلی استعمار کی آلہ کار ہے۔
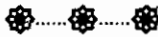
آغا شورش کاشمیریؒ

قادیانیت' اقبال کی نظر میں

''احمدیت، علامہ اقبال کی نظر میں'' کے زیرِ عنوان عبدالمالک خاں ناظر اصلاح وارشاد صدر انجمنِ احمدیہ پاکستان ربوہ نے ایک کتابچہ مرتب کیا ہے۔ سرورق نصرت آرٹ پریس ربوہ میں چھپا۔ نظارتِ اشاعت نے ضیاء الاسلام پریس ربوہ سے چھپوا کر شائع کیا اور خفیہ طور پر سیکولر قسم کے خواص اور سادہ دل عوام میں تقسیم کیا جارہا یا ڈاک کے ذریعہ بھجوایا جارہا ہے۔ مضمون کے صفحات چودہ ہیں۔ مذکورہ کتابچہ ایک دوست نے ربوہ سے ارسال کیا ہے۔

عبدالمالک خان جو بزعم خویش مولانا کہلاتے ہیں' آغاز ہی میں تحریر فرماتے ہیں:

''علامہ اقبال جو اس برصغیر کے ایک بڑے شاعر اور فلسفی تھے، ان کا احمدیت کے ساتھ بڑا گہرا تعلق رہا (کب اور کہاں؟ مرتب نے یہ نہیں بتایا' چٹان) ان کے خاندان کے کئی افراد نے احمدیت کو قبول کیا۔ ان کے والد مرحوم احمدی تھے، ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد احمدی تھے، ان کے اکلوتے بھتیجے احمدی ہیں۔ علامہ موصوف نے اپنے وصیت نامہ میں ان کو اپنے نابالغ بچوں کے اولیاء کی فہرست میں شامل کیا۔''

صحیح جواب تو علامہ اقبال کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبال ہی دے سکتے ہیں کہ ان کے دادا جان سے متعلق میرزائی تلبیس کی اساس کیا ہے؟ یا پھر صوفی نظیر احمد سیالکوٹ سے روشنی ڈال سکتے ہیں کہ ان کی بیگم صاحبہ کے دادا جان اور ان کے خسر شیخ عطا محمد قادیانی تھے یا نہیں؟

ہم تو یہی کہہ سکتے ہیں کہ علامہ اقبال کے والد کو قادیانی کہنا محض تلبیسی روایت ہے۔ اس سے پہلے قادیانی امت نے کبھی انکشاف نہ کیا اور جب علامہ اقبال نے میرزائی امت سے متعلق معرکہ آراء و بصیرت افروز مضامین لکھے اور انھیں اسلام کا غدار اور قرآن حکیم کی رُو سے مرتد قرار دیا بلکہ ان کے واجب القتل ہونے تک کا اظہار کیا (ملاحظہ ہو انوار اقبال میں سیّد نذیر نیازی کے نام حضرت علامہ کے

خط کا عکس) تو اس وقت بھی میرزائیوں نے اظہار نہ کیا۔ آج ان کی رحلت کو 36 برس ہوتے ہیں تو میرزائی خفیہ طور پر اپنی بدگوئی کو پھیلا رہے ہیں کہ علامہ اقبال کے والد خدانخواستہ احمدی تھے۔

شیخ عطا محمد احمدی ہوتے تو سیالکوٹ کے مسلمان انھیں کبھی امام علی الحق ؒ کے قبرستان میں دفن نہ ہونے دیتے۔ ان کا انتقال علامہ اقبال کی وفات کے تین سال بعد 1940ء میں ہوا۔ علامہ اقبال کی بیٹی کے لیے میرزائی ان کی لاش قادیان لے جاتے اور اخباروں میں غلغلہ کرتے۔ ان کی دختر فرخندہ اختر صوفی نظیر احمد کے ساتھ نہ بیاہی جاتی۔ وہ احمدی ہو کر غیر احمدی کے ساتھ اپنی بیٹی بیاہتے تو میرزا البشیر الدین ان کے مقاطعہ کی تحریک کرتے' ان سے جواب طلبی کی جاتی؟ اُن کی وفات پر جنازہ کوئی میرزائی پڑھاتا۔ نہ جانے میرزائی اپنی اس یاوہ گوئی سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ شیخ عطا محمد کی شہرت کا سبب علامہ اقبال ہیں۔ علامہ اقبال کی شخصیت کا سبب وہ نہیں۔ شیخ عطا محمد کوئی شخصیت ہوتے تو علامہ اقبال پر حجت ہو سکتے تھے۔ مولانا عبدالمجید سالک کی بعض روائتیں قادیانی امت کے لیے حجت ہیں اور اگر یہی معیار ہے تو انھوں نے ذکرِ اقبال کے صفحہ 9 پر لکھا ہے کہ شیخ عطا محمد نے معمولی سی تعلیم پائی تھی۔ گویا خاندان کی فضیلت علامہ اقبال سے ہے۔ رہا علامہ اقبال کے بھتیجے (شیخ اعجاز احمد) کا سوال تو ان کے متعلق ہم تک یہی روایت پہنچی ہے کہ وہ احمدی تھے اور ان کے احمدی ہونے کا سبب ظفر اللہ خاں تھا جو اُن کی ملازمت اور اس میں ترقی کا زینہ تھا۔ وہ ان کے دام کا شکار ہو گئے لیکن شیخ اعجاز احمد کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اب وہ احمدیت سے متنفر ہیں۔ پچھلے دنوں لاہور آئے تو اپنے چچا (علامہ اقبال) کے مزار پر حاضر ہو کر آبدیدہ ہو گئے اور رو رو کر میرزائیت سے تائب ہونے کا اظہار کرتے رہے۔ چونکہ اس روایت سے متعلق ہمیں ذاتی معلومات نہیں اس لیے ہم اپنی ذمہ داری پر ان سے متعلق کچھ عرض کرنے سے معذور ہیں۔ تاہم ہماری مصدقہ معلومات یہ ہیں کہ ان کی اولاد ان کے روبرو میرزا غلام احمد پر تبرّیٰ تولتی اور اس کی نبوت کا مذاق اُڑاتی ہے۔ یہی معاملہ ان کی بیگم صاحبہ کا ہے۔ وہ بھی میرزا غلام احمد اور ان کے جانشینوں کو استعماری مسخرہ قرار دیتی ہیں۔

عبدالمالک خان نے خاندانِ اقبال پر اس اتہام کے بعد لکھا ہے کہ انھوں نے رسالہ انڈین اینٹی کیوری 1900ء میں ایک مضمون تحریر کیا اور لکھا ہے کہ:

> ”موجودہ ہندی مسلمانوں میں میرزا غلام احمد قادیانی سب سے بڑے دینی مفکر ہیں۔“

اوّل تو یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ میرزائی اس قسم کے غلط حوالے وضع کرنے میں دلیر ہیں۔ لازم تھا کہ وہ اس مضمون کی بالعموم اور اس فقرے کی بالخصوص فوٹوسٹیٹ شائع کرتے! بالفرض

علامہ نے مذکورہ فقرہ لکھا ہوتو یہ کوئی حجت نہیں۔انھوں نے پیغمبر نہیں، دینی مفکر لکھا ہے۔تب علامہ اقبال کی عمر ہی کیا تھی وہ 27 برس کے تھے۔وہ کوئی عالم دین نہ تھے۔تب نہ کسی دینی تحریک یا کسی دینی شخصیت سے ان کا تعلق تھا۔وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم تھے۔پروفیسر ٹامس آرنلڈ ان کے استاد تھے۔ انھوں نے 1899ء میں ایم اے کیا۔ایک سال بعد 1900ء میں ان کے قلم سے ایسا کوئی مضمون نکلا ہوتو وہ قلم کا ابتدائی سفر تھا۔اس اقبال کے قلم سے نہ تھا جو ایک طویل ذہنی سفر کے بعد حکیم الامت کے درجہ پر فائز ہوا اور پیغمبری عمر میں داخل ہوتے ہی اس شخص کا پوسٹ مارٹم کیا جو برطانوی سیاست کی شعبدہ بازی سے مسیحِ موعود، مہدیِ موعود اور ظل و بروز کا جامہ اوڑھ کر نبی بن گیا تھا۔

دروغ گورا حافظہ نہ باشد کے مصداق عبد المالک کو یاد نہیں رہا کہ اس کے نبی کی سوانح عمری کیا ہے۔میرزا غلام احمد نے اپنے نبی ہونے کا دعویٰ 1901ء میں کیا اور علامہ اقبال کا مضمون اگر قادیانی امت کے لیے کوئی سند ہے تو 1900ء میں لکھا گیا ہے۔عجیب استدلال ہے کہ علامہ اقبال نے 1900ء میں فلاں بات کہی وہ درست ہے لیکن جس نتیجہ پر 1936ء میں پہنچے وہ غلط ہے۔اگر معیار یہی ہے کہ پہلی بات درست ہے اور دوسری غلط تو قادیانی کس دلیل کے تحت میرزا غلام احمد کو نبی مانتے ہیں۔میرزا کی بے شمار تحریریں اپنے نبی ہونے کا انکار کرتی ہیں اور اس کو مخبوط الحواس قرار دیتی ہیں جو حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی طرز کی نبوت پر فائز ہونے کی گستاخی کرتا ہے میرزا غلام احمد کا اپنا قول ہے کہ ایسا شخص ذہنی طور پر دیوالیہ ہو کر پاگل ہو چکا ہے۔
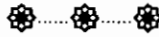
آغا شورش کاشمیریؒ

اقبالی مجرم

''ذکرِ اقبال'' مولانا عبدالمجید سالک کے قلم سے علامہ اقبال کی سوانح عمری ہے۔ ناشر بزم اقبال نرسنگھ داس گارڈن' کلب روڈ لاہور' سائز $\frac{18x22}{8}$ صفحات 296 سالِ اشاعت 1955 عیسوی۔

مولانا سالک ایک باغ و بہار ادیب تھے۔ ان کے سیاسی خیالات سے قطع نظر انہیں قلم پر قدرت حاصل تھی۔ ان کی سیرت میں کوئی ایسا داغ نہ تھا جس سے یہ محسوس ہو کہ وہ کسی کو زخم لگانا چاہتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ سے انھیں ایک گونہ عقیدت تھی' ذکر اقبال کے ''عرضِ حال'' میں لکھتے ہیں کہ ''پچیس برس تک انھیں خود بھی علامہ کی خدمت میں نیاز حاصل رہا۔'' اقبال کا ذکر چھڑتا تو ان کا تذکرہ نہایت تپاک سے کرتے۔ راقم نے ان سے بارہا عظیم معلومات حاصل کیں۔ علامہ سے متعلق ان کے دل و دماغ میں احترامات فائقہ تھے لیکن ''ذکرِ اقبال'' مرتب کرتے وقت ان کا پُر بہار قلم حدودِ انشاء پھاند گیا اور بعض اُڑتی ہوئی روایتوں اور حکایتوں کے ہو کے رہ گئے جو اُن کے دوستوں نے بیان کیں اور انھیں سوانح میں شامل کر لیا۔ شاید ان کے علم میں نہ تھا کہ بعض حلقوں نے اقبال کی سیرت داغدار کرنے کی مہم شروع کر رکھی ہے اور وہ اقبال کے حکیم الامت ہونے کا تصور پاش پاش کرنا چاہتے ہیں۔ قادیانی اس مہم میں اندر خانہ پیش پیش تھے۔ میرزا بشیر الدین محمود سے مولانا سالک کا میل ملاپ تھا۔ مولانا کے والد قادیانی تھے' اور سگا بھائی بھی قادیانی تھا۔ غالباً اسی باعث مولانا قادیانیت سے متعلق متشدد نہ تھے لیکن نجی محفلوں میں مرزا غلام احمد کی ''پھبتیوں'' سے چٹخارے کرتے۔ تعجب ہے کہ ذکر اقبال میں میرزا کو سہارا دیا اور دو ایک مضحک باتیں علامہ سے اس طرح منسوب کی ہیں' گویا ان کا تعلق فی الواقعہ سوانح اقبال سے ہے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ اور علامہ اقبالؒ برعظیم میں اپنے دور کے عظیم مسلمان عبقری تھے۔ مولانا سالک نے ''یارانِ کہن'' (مطبوعہ مکتبہ چٹان) میں مولانا ابوالکلام کے ذکر کو بھی مرزائیت کی بالواسطہ مدافعت میں استعمال کیا' اپنے مختصر خاکے میں لکھا کہ ''مولانا مرزا غلام احمد سے ملنے کے لیے قادیان گئے تھے اور ان کی رحلت پر امرتسر کے سہ روزہ ''وکیل'' میں تعزیتی شذرہ لکھا تھا۔'' مولانا ابوالکلام آزاد نے

اس کی تردید میں اپنے سیکرٹری پروفیسر محمد اجمل خاں سے راقم کو خط لکھوایا' ادھر مولانا سالک کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے دہلی گئے تو اس خفگی میں مولانا نے ان سے ملاقات نہ کی۔ سالک نے لاہور پہنچ کر ہفتہ وار چٹان میں اس کی تصحیح کر دی' اب وہ تصحیح ''یارانِ کہن'' کے دوسرے ایڈیشن میں آ چکی ہے۔ سوانح اقبال میں سالک کا نقطہ نظر اپنی آپ بیتی ''سرگذشت'' سے قطعاً مختلف ہے' اپنی سوانح عمری مشرقی انداز کی ہے لیکن اقبالؒ کے سوانح حیات' مغربی انداز میں تحریر کیے ہیں کہ جب تک حسب ونسب کی ہڈیاں توڑ نہ لیں مغرب کے سوانح نگاروں کو اپنے ممدوحین کے سوانح حیات ادھورے محسوس ہوتے ہیں۔ مولانا سالک نے صفحہ 10 پر لکھا ہے کہ:

> ''علامہ کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے 82 سال کی عمر میں وفات پائی اور امام صاحب (امام علی الحقؒ) کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔ شیخ صاحب احمدی عقائد رکھتے تھے۔''

شیخ عطا محمد کا ''احمدی'' ہونا مشہور ہے لیکن خاندانِ اقبال کی روایت ہے کہ اقبالؒ کا برادرِ بزرگوار ہونے کے باوجود وہ علامہ کے ہاں آتے تو مرزا غلام احمد کو زبان کے اڑنگے پر لا کر پٹخنی دیتے اور اس کی خانہ ساز نبوت پر تبرّیٰ تولتے تھے۔ اگر وہ قادیانی ہوتے تو سیالکوٹ جیسے شہر میں جو مدینۃ الاحرار تھا' ان کا امام صاحب کے قبرستان میں دفن ہونا ناممکن تھا' وہ ابتداءً کسی وجہ سے قادیانی ہوئے تھے لیکن علامہ نے مرزائی امت سے متعلق اپنے معرکہ خیز مقالات لکھے' تو انھوں نے قادیانیت سے توبہ کر لی اور مسلمان ہو گئے' البتہ ان کے فرزند شیخ اعجاز احمد ضرور قادیانی ہیں لیکن ان کا حال عجیب ہے کہ ان کی اہلیہ اور عیال' مرزا غلام احمد پر قہقہے لگاتے اور قادیانی امت کو خارج از اسلام سمجھتے ہیں۔

''دوسری شادی'' کے ضمن میں مولانا سالک رقمطراز ہیں:

> ''چونکہ علامہ اپنی اس شادی سے جو گجرات میں ہوئی تھی' مطمئن نہ تھے اور موافقت و مصالحت کی کوششیں ناکام ہو چکی تھیں' اس لیے وہ انگلستان سے واپس آنے کے بعد دوسری شادی کے خواہاں تھے۔ احباب میں ذکر ہوا تو شیخ گلاب دین وکیل نے موچی دروازے کے ایک کشمیری خاندان کی صاحبزادی کے متعلق تحریک کی جو اس وقت وکٹوریا گرلز سکول میں پڑھتی تھی' جب بات پکی ہو گئی تو علامہ کے برادرِ بزرگ شیخ عطا محمد سیالکوٹ سے آئے اور مرزا جلال الدین' میاں شاہنواز بیرسٹر' مولوی احمد دین وکیل اور شیخ گلاب دین کو ساتھ لے کر علامہ کا نکاح پڑھا گیا۔ اس موقع پر صرف نکاح ہوا تھا' رخصتی عمل میں نہیں آئی تھی' نکاح ہو جانے کے بعد علامہ کے پاس چند گمنام خطوط پہنچے جن میں

منکوحہ خاتون کے خلاف نامناسب شکایات لکھی تھیں۔ علامہ سخت ضغطے میں پڑ گئے۔ دوستوں سے ذکر کیا' انھوں نے حالات کی چھان بین کا وعدہ کر لیا' ان حالات کی وجہ سے رخصتی کا معاملہ غیر معین وقت تک ملتوی ہو گیا۔ علامہ اس زمانے میں بے حد ذہنی پریشانی میں مبتلا تھے۔ ایک بیوی سے اَن بَن ہو گئی تھی' دوسری کے متعلق یہ حالات رونما ہو گئے۔''

علامہ نے تیسری شادی لدھیانہ کے نولکھا خاندان میں کی۔ اس دوران میں دوسری شادی کا معاملہ معلق رہا' مولانا سالک لکھتے ہیں کہ کچھ مدت بعد یہ واقعات رونما ہوئے:

1- ''وکٹوریا گرلز سکول کی ہیڈ مسٹرس مس بوس سے مرزا جلال الدین کی بیگم نے اس لڑکی کے متعلق پوچھا تو اس نے اس لڑکی کی بے حد تعریف کی اور اس کی ذہانت' طباعی اور نیکی کو بیحد سراہا۔''

2- ''علامہ کے والد مرحوم نے جو بیحد پرہیز گار اور مقدس بزرگ تھے' استخارہ کرنے کے بعد فرمایا کہ وہ لڑکی بالکل پاکدامن ہے۔''

3- مرزا جلال الدین اور دوسرے دوستوں نے اپنے منشیوں اور کارکنوں کے ذریعے سے تحقیق کرائی تو معلوم ہوا کہ گمنام خطوط کا ذمہ دار نبی بخش وکیل تھا جو یہ چاہتا تھا کہ اس لڑکی کی شادی اس کے بیرسٹر لڑکے سے ہو جائے۔''

4- ''جب یہ انکشاف ہو چکے تو اس لڑکی نے خود علامہ کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں اس بات پر بیحد افسوس ظاہر کیا کہ علامہ نے بہتان پر یقین کر لیا؟ اور ساتھ ہی لکھ دیا کہ میرا نکاح آپ سے ہو چکا ہے' اب میں دوسرے نکاح کا تصور بھی نہیں کر سکتی' اسی حالت میں پوری زندگی بسر کروں گی اور روزِ قیامت آپ کی دامنگیر ہوں گی۔ آخر علامہ اس بیگم کو لانے کے لیے تیار ہو گئے۔ انھیں شبہہ تھا کہ وہ چونکہ طلاق دینے کا ارادہ کر چکے تھے اس لیے مبادا شرعاً طلاق ہی ہو چکی ہو' انھوں نے مرزا جلال الدین کو مولوی حکیم نور الدین کے پاس قادیان بھیجا کہ مسئلہ پوچھ آؤ۔ مولوی صاحب نے کہا کہ شرعاً طلاق نہیں ہوئی لیکن اگر آپ کے دل میں کوئی شبہ اور وسوسہ ہے تو دوبارہ نکاح کر لیجئے۔ چنانچہ ایک مولوی صاحب کو طلب کر کے علامہ کا نکاح اس خاتون سے دوبارہ پڑھوایا گیا۔ یہی خاتون جاوید اور منیرہ کی والدہ ہیں۔

اس کے بعد اقبال نے کبھی کسی عورت کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ ساری رنگ رلیاں ختم ہو گئیں۔ یہ 1913ء کا واقعہ ہے۔"

"اقبال عنفوانِ شباب میں اپنے شہر کے دوسرے نوجوانوں سے مختلف نہ تھے۔ بلاشبہ وہ مصری کی مکھی ہی رہے شہد کی مکھی کبھی نہ بنے۔ آج بھی ان کے بعض ایسے کہن سال احباب موجود ہیں جو اس گئے گزرے زمانہ کی رنگین صحبتوں کی یاد کو سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ خود اقبال نے اپنی ابتدائی لغزشوں کو چھپانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ان کے تمام ہم نشیں اس حقیقت کے گواہ ہیں۔ رموزِ بیخودی کے آخر میں بحضور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عرضِ حال کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ میں مدتوں عشق مجاز اور اس کے متعلقات میں مبتلا رہا۔ فرماتے ہیں۔

مدتے با لالہ رویاں ساختم
عشق با مرغولہ مویاں باختم

بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم
بر چراغ عافیت داماں زدم

برقہا گردِ حاصلم
رہزناں بردند کالائے الم

ایں شراب از شیشۂ جانم نہ ریخت
ایں زرا سادا زدامانم نہ ریخت"

(صفحہ 67 تا 71)

کیا یہ سوانح عمری ہے؟ وہ کیا چیز تھی جو اس کے بغیر تشنہ رہتی؟ یاذکر اقبال ادھورا رہتا؟ سوانح اس لیے مرتب کیے جاتے ہیں کہ دوسروں کے لیے نمونہ ہوں اور لوگ ان سے مختلف العنوان بالیدگی حاصل کریں۔ جس سوانح حیات میں کوئی سی افادیت نہیں' یا کوئی تاریخی پہلو نہیں' اور جو واقعہ بیان کیا ہے' اس میں کوئی سی خوبی یا حسن نہیں' بلکہ ذم کا پہلو ہے اس کو سوانح میں درج کرنا کس منطق واستدلال کی رُد سے جائز ہے' اور اس میں کونسی بڑائی ہے۔ اس قسم کے واقعات بہت سی زندگیوں کو پیش آتے اور وہ ان سانحات میں سے گزرتی ہیں لیکن ان کے لیے مشرقی سوانح حیات میں کوئی سی جگہ نہیں اور نہ مشرقی ادب کے سوانح نگاروں نے ان حادثوں کو کسی رعایت سے کوئی جگہ دی ہے۔ علامہ اقبال نے دوسری شادی کی تو عفیفہ خاتون پر افترا باندھا گیا لیکن آخر کار وہ جھوٹ چھٹ گیا۔ مولانا سالک نے اس کا ذکر کیوں

ضروری خیال کیا؟ واللہ اعلم!

آخرنئی پود کے لیے اس میں کیا ہے؟ الا یہ کہ نئی پود عنفوانِ شباب میں لہو ولعب کی زندگی بسر کرنے کے لیے علامہ کے عنفوانِ شباب کو حجت بنا لے اور اس خیال سے مطمئن ہو کہ عنفوانِ شباب میں معصیت کی راہوں سے گزرنا ناگزیر روایت ہے۔

محولہ بالا اقتباس میں سوانح حیات کی ادنیٰ سی رفعت بھی نہیں ہے۔

یہ روایت کہ علامہ نے والدۂ جاوید کو حرم میں لانے کے لیے مرزا جلال الدین کو حکیم نور الدین خلیفۂ اوّل کے پاس قادیان بھیجا کہ شرعی مسئلہ پوچھ آؤ۔ پھر اس کی رائے کے مطابق ایک مولوی صاحب کو بلا کر دوبارہ نکاح پڑھا گیا' بظاہر ایک افسانہ ہی ہے۔ نہ جانے اس کا واضع کون ہے؟ سالک صاحب نے یہ جانتے ہوئے کہ علامہ قادیانیت کے ارتداد کا اعلان کر چکے ہیں اور وہ قادیانی امت کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتے تھے' اس روایت کو اس تفصیل سے بیان کیا کہ بالواسطہ احمدیت کا ''دفاع'' ہو گیا ہے۔ کیا لاہور میں تب کوئی عالم دین نہ تھا۔ علامہ اس زمانے میں ہندوستان بھر کے چیدہ علماء سے خط و کتابت رکھتے تھے' کیا اُن سے نہ پوچھ سکتے تھے؟ بالفرض علامہ اس زمانے میں مرزائیت کے خدوخال سے ناواقف تھے اور تب انھیں مسلمانوں ہی میں شامل سمجھتے تھے لیکن اس معمولی سی بات کے لیے اپنے ایک دوست کو حکیم نورالدین کے پاس قادیان بھیجنا محض شوخیِ تحریر ہے۔ اس کے حق میں کوئی سی روایت یا درایت نہیں۔ علامہ مسئلے کی نوعیت خط لکھ کر دریافت کر سکتے تھے اور اگر خط اس لیے نہ لکھا کہ اس میں رسوائی کا پہلو تھا یا وہ سبکی محسوس کرتے تھے تو سالک صاحب نے اس واقعے یا افسانہ کو لکھ کر علامہ کی دستارِ عزت میں کونسا طرۂ ٹانکا ہے۔ اگر سالک صاحب کے لیے ''دوسری شادی'' کا ذکر سوانح حیات کا لازمہ تھا تو چار فقروں میں بیان کر سکتے تھے' لیکن انھوں نے اس کہانی کو پھیلا کر سیرتِ اقبال کو ہیٹا کیا ہے۔ مولانا سالک نے خاندانِ اقبالؒ اور علامہ اقبالؒ ہی سے مرزا غلام احمد' حکیم نورالدین یا ان کی امت کا رشتہ نہیں ٹانکا بلکہ ان کے استاد شمس العلماء سیّد میر حسن شاہ کے ضمن میں بھی مرزا غلام احمد اور حکیم نورالدین سے ان کی ملاقات کا ذکر کیا ہے کہ:

> ''شاہ صاحب کے داماد سیّد خورشید انور بعارضۂ دق بیمار ہو گئے تو وہ انھیں قادیان لے گئے تا کہ حکیم نورالدین سے علاج کرائیں۔ قادیان پہنچ کر مسجد میں گئے اور اس دریچے میں جا بیٹھے جہاں مرزا صاحب بیٹھتے تھے' لوگ ان کو جانتے نہ تھے۔ انھوں نے انھیں وہاں سے اٹھا دیا لیکن وہ پھر دریچے کے پاس ہی آ بیٹھے' مرزا صاحب آئے تو سلام کا معمولی جواب دے کر بیٹھ گئے' اور متوجہ نہ ہوئے۔ شاہ صاحب نے کہا غالباً آپ نے مجھے پہچانا نہیں' مرزا صاحب نے

دیکھا تو بڑی محبت اور تپاک سے ملے اور مولوی عبدالکریم سیالکوٹی کو بلا کر کہا کہ شاہ صاحب کو اچھی جگہ ٹھہراؤ' دو باتوں کی خاص طور سے تاکید کی۔ ایک یہ کہ شاہ صاحب کو صبح ہی صبح بھوک لگ جاتی ہے کیونکہ یہ عادتاً کالج جانے سے پہلے کھانا کھا لیتے ہیں۔ اس لیے ان کی حسب خواہش صبح ہی صبح کھانا دے دیا جائے' دوسرے انھیں اچھی کتابیں پڑھنے کے لیے دی جائیں' ساتھ ہی کہا صبح چائے میرے ساتھ پئیں' بہت خاطر تواضع کی' اور جب شاہ صاحب واپس جانے لگے تو مرزا صاحب دو میل تک یکے کے ساتھ ساتھ آئے۔ پکی سڑک پر پہنچ کر کہا کہ میں کچھ باتیں علیحدگی میں کرنا چاہتا ہوں۔ شاہ صاحب نے ایک طرف جا کر ان کی باتیں سنیں' بعد میں مفصل معلوم نہ ہو سکا کہ کیا باتیں ہوئیں' نہ شاہ صاحب ہی نے بیان کیں۔'' (ذکرِ اقبال صفحہ 278)

سالک صاحب مرزائیت کے معاملے میں اس قدر فیاض تھے کہ علامہ اقبالؒ نے اس کے متعلق جو کچھ کہا اور جو قدم اٹھایا وہ تمام حذف کر دیا ہے۔ جہاں ذکر کیا ہے مفہوم اُلٹا کر اختصار کے ساتھ لیکن مرزا غلام احمد اور ان کے حواریوں کے لیے ان سوانح میں جگہ ضرور نکالی ہے' آخر اس واقعہ کا سوانح اقبال سے کیا تعلق ہے۔ ذکر بس اتنا تھا کہ شمس العلماء میر حسن شاہ علامہ اقبالؒ کے اُستاد تھے' ان کے سوانحی حالات نہیں لکھے' اقبالؒ کے شاگرد ہونے یا بعض دوسرے معروف شاگردوں پر ان کے التفات کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ان کے قادیان جانے کا ذکر ''شتر گربہ'' کے طور پر جڑ دیا ہے۔ مرزا صاحب نے شاہ صاحب سے علیحدگی میں باتیں کی ہوں گی' لیکن سالک صاحب کے لیے مسئلہ یہ تھا:

''معلوم نہ ہو سکا کیا باتیں ہوئیں نہ شاہ صاحب ہی نے بیان کیں۔''

اب اس سے کیا اخذ کیا جائے؟ کبھی اس طرح کے دو آدمی آپس میں ملیں اور معلوم نہ ہو کہ ان کے درمیان کیا باتیں ہوئیں' تو ظاہر ہے کہ اس ملاقات کا ذکر ان کی یا کسی دوسرے کی مستقل سوانح عمری میں حشوِ محض ہوگا' گمان غالب ہے کہ سالک صاحب نے تاریخ احمدیت کو مواد مہیا کرنے کے لیے اس قسم کے ماخذ قائم کیے ہیں۔

سالک صاحب نے کبھی ان لوگوں کا تذکرہ احسن طریق سے نہیں کیا جو مرزائیت کے خلاف تھے۔ مولانا ظفر علی خاں ان کے قلم کی شدید زد میں رہے' حالانکہ اپنے صحافتی سفر کا آغاز سالک نے زمیندار سے کیا تھا اور مولانا کے دبستانِ صحافت سے فیضیاب ہوئے تھے۔ مرزا غلام احمد سے متعلق ان کا قلم ہمیشہ محتاط رہا۔ علامہ اقبالؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کے سوانحی تذکرے یا سوانحی خاکے میں مرزا غلام

احمد کا ذکر بلا ضرورت شامل کیا۔ واضح رہے کہ برعظیم میں مسلمانوں کے سیاسی مکتبِ فکر دو تھے' ایک کے عظیم ذہنی رہنما اقبالؒ تھے' دوسرے کے مولانا ابوالکلام آزاد' سالک نے ان دونوں کو مرزا غلام احمد کے آستانے پر حاضر کیا۔ پس منظر میں کیا تھا؟ اللہ تعالیٰ ہی علیم وخبیر ہیں۔

برعظیم کی آزادی کے بعد مرزا غلام احمد اور ان کے جانشینوں کی انگریز پرستی اور کاسہ لیسی کا تذکرہ عام ہوا تو مرزا صاحب کی صفائی کے خیال سے ان کے پیروؤں نے مسلمانوں کی استعمار دشمن شخصیتوں کے انگریز سے ''تعاون'' کی دریافت شروع کی' حالانکہ قومی تحریک سے پہلے جنگِ عظیم اوّل کے دوران یعنی بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک برطانوی حکومت سے تعاون ایک استبدادی امر تھا۔ عجیب بات ہے کہ امتوں کے لیے حجتِ قاطع نبیوں کا کردار ہوتا ہے لیکن ''قادیانی نبی'' کی امت نے شاعروں کی گفتار کو اپنے نبی کے کردار کی حجت بنایا۔ مولانا ظفر علی خاں کے ''زمیندار'' کی پیشانی پر 1910ء سے پہلے جب ان کے والد اس کے مالک و مدیر تھے' ذیل کا شعر درج ہوتا تھا۔

تم خیر خواہِ دولت برطانیہ رہو
سمجھیں جنابِ قیصرِ ہند اپنا جاں نثار

مرزائیوں نے چرچا کیا کہ ظفر علی خاں مرزا صاحب پر کاسہ لیسی کا الزام دھرتے ہیں لیکن ان کے اپنے اخبار کی پیشانی پر مذکورہ شعر لکھا ہوتا تھا۔

علامہ اقبالؒ سے متعلق قادیانی امت نے سالک سے روایت حاصل کی جو اس کے جوابی لیکن ابلہانہ لٹریچر میں نقل کی جاتی ہے۔ ذکرِ اقبال میں سالک رقمطراز ہیں کہ:

''مولانا محمد علی' مولانا شوکت علی' مولانا ابوالکلام' مولانا ظفر علی خاں اور بے شمار دوسرے علمبردارانِ اتحادِ اسلامی قید و بند میں تھے۔ اگر علامہ اس دور میں کوئی ایسی نظم لکھتے جو حکامِ وقت کو ناگوار ہوتی تو حکومت کی اشد شدید گرفت میں آ جاتے اور کوئی نتیجہ بھی مرتب نہ ہوتا بلکہ جب اواخرِ جنگ میں وائسرائے نے دہلی میں وار کانفرنس منعقد کی تو بطورِ خاص نواب ذوالفقار علی خاں کی وساطت سے علامہ اقبال کو بھی طلب کیا اور اس موقع کے لیے ایک نظم کی فرمائش کی۔ علامہ نے مجبور ہو کر ایک مسدس لکھی جس کے کل نو بند تھے۔ بطورِ نمونہ دو بند ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔ یہ نظم یونیورسٹی ہال لاہور میں پڑھی گئی۔

اے تاجدارِ خطۂ جنت نشانِ ہند
روشن تجلیوں سے تری خاورانِ ہند
محکم ترے قلم سے نظامِ جہانِ ہند

تیغِ جگر شگاف تری پاسبانِ ہند
ہنگامۂ وفا میں مرا سر قبول ہو
اہلِ وفا کی نذرِ محقر قبول ہو
تلوار تری دہر میں نقاد خیر و شر
بہ روز جنگ توز' جگر سوز' سینہ در
رایت تری سپاہ کا سرمایۂ ظفر
آزادہ' پر کشادہ پری زادہ یم سپر
سطوت سے تیری پختہ جہاں کا نظام ہے
ذرے کا آفتاب سے اونچا مقام ہے

(ذکرِ اقبال صفحہ 87)

اسی کتاب کے صفحہ 90 پر "جلسۂ فتح اور اقبال" کے زیرِ عنوان سالک صاحب لکھتے ہیں:

"11 نومبر 1918ء کو یورپ کی پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی۔ جرمنی، آسٹریا اور ترکی شکست کھا گئے۔ 15 دسمبر 1918ء کو سر مائیکل اوڈ وائر لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے بریڈلا ہال میں فتح کا ایک جلسہ منعقد کیا جس میں علامہ اقبال بھی نواب ذوالفقار علی خاں کے ساتھ شریک ہوئے اور لاٹ صاحب کی فرمائش پر دو تین چھوٹی چھوٹی نظمیں ارشاد فرمائیں۔"

سر مائیکل اوڈ وائر انگریزی فرمانروائی میں پنجاب کا سب سے مستبد گورنر تھا۔ اس نے پنجاب میں مارشل لاء لگایا اور جلیانوالہ باغ امرتسر کو انسانی خون سے لالہ زار کرایا تھا۔ وہ ہندوستان کی آزادی اور مسلمانوں کے وجود سے ہمیشہ متنفر رہا۔ اس کے نزدیک صرف قادیانی ہی معتمد مسلمان تھے۔ سالک صاحب کا حوصلہ تھا کہ انھوں نے ترکی کی شکست اور برطانیہ کی فتح کے اس جلسے میں جو سر مائیکل اوڈ وائر کی صدارت میں منعقد ہوا' اقبال کی شرکت ان کے سوانح میں درج کی' گویا اس کے بغیر ذکر اقبال ناقص رہتا اور سوانح مکمل نہ ہوتے۔ اقبال کے سوانحِ حیات اسی کا نام ہے تو معلوم ہوتا ہے سالک صاحب نے کسی خلاء کی تشفی کے لیے انھیں سینت سینت کر رکھا تھا۔ اقبال رحلت کر گئے' ملک آزاد ہو گیا۔ اس جلسے کو 37 برس ہو گئے تو سالک نے پاکستان کی آزاد نسلوں کو آگاہ کیا' کہ تمہارا "فقرِ غیور" بھی اس وادی میں گلگشت کر چکا ہے۔

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

علامہ کی سب سے بڑی نثری تحریر' تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے خطبات ہیں' ان خطبات سے وہ عمر کے آخری دور میں مطمئن نہیں تھے، فرماتے ''علم بہت آگے بڑھ چکا ہے چونکہ انسانی فکر نے بہت سی راہیں ڈھونڈھ لی ہیں لہٰذا خطبات نظر ثانی کے مستحق ہیں'' اس کے بعد علامہ کی سب سے بڑی نثری تحریر' قادیانیت سے متعلق ہے اور اس بارے میں علامہ نے آخر تک کوئی ترمیم نہیں کی۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں جو کچھ لکھا یا اس سے پہلے قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دینے کے متعلق جو بیان دیا' اور کئی اخباری سوالات کے جوابات جن نپے تلے الفاظ میں دیے، وہ سب ان کی نثری تحریروں کا حرفِ آخر ہیں۔ سالک صاحب نے ان عظیم بیانوں کا ذکر ایک صفحے سے زیادہ نہیں کیا۔ فرماتے ہیں:

> ''خدا جانے علامہ اقبالؒ نے کس عقیدت مند کی درخواست پر ایک مضمون لکھ دیا جس میں یہ بتایا کہ اس فرقے (احمدیت) کی بنیاد ہی غلطی پر ہے۔ اس کے علاوہ بعض اور علمی نکات بیان کیے اور آخر میں حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ اس فرقے کو ایک علیحدہ جماعت تسلیم کرے۔
>
> علامہ نے انتہائی اشتعال و ناراضی کی حالت میں بھی بانی احمدیت امام جماعت احمدیہ' اور احمدیوں کے خلاف کوئی دل آزار لفظ نہیں لکھا بلکہ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نہایت متین و سنجیدہ عالمانہ انداز اختیار کیا۔'' (صفحہ 210)

سالک صاحب کی ذہنی اُپج ہے کہ انھوں نے قادیانیت سے متعلق علامہ کے خیالات کو ''خدا جانے کس عقیدت مند کی درخواست'' قرار دیا ہے۔ قادیانیت کی بنیاد علامہ نے غلطی پر نہیں لکھی بلکہ اپنے مقالے کے بین السطور میں برطانوی استعمار کی تخلیق قرار دیا' اسلام سے غداری پر محمول کیا اور اس کا تجزیہ مستقبل میں ایک طاقتور قلم کے حوالے کیا ہے۔

سالک صاحب نے سوانح کے ضمن میں بعض سرسری واقعات بھی رقم کیے ہیں لیکن حضرت علامہ نے کشمیر کمیٹی سے جس اساس پر استعفا دیا اس کا رُخ ہی پھیر دیا ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ علامہ کشمیر کمیٹی سے قادیانی امت کی دسیسہ کاری کے باعث الگ ہوئے تھے۔ اسی طرح سالک صاحب نے انجمن حمایتِ اسلام سے مرزائی امت کے نکالے جانے کا ذکر ہی نہیں کیا کہ علامہ نے اس وقت تک اجلاس ہی نہ ہونے دیا جب تک ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کو اجلاس سے اٹھا کر رخصت نہ کیا۔ قادیانی امت سے متعلق سالک صاحب کی اس فیاضی کا سبب کیا ہے کہ ان کے والد قادیانی المذہب تھے۔ ان کے بھائی بھی قادیانی تھے اور وہ خود بھی مرزا بشیر الدین محمود سے ملتے ملاتے تھے۔

تاریخِ احمدیت جلد ہفتم مؤلفہ دوست محمد شاہد ادارۃ المصنفین ربوہ نے 1967ء میں شائع کی' اس کے صفحہ 240 پر عبدالمجید سالک کے ایک خط کا عکس ہے جو مرزا بشیر الدین محمود کے نام لکھا تھا' اس میں لکھا ہے:

محترمی حضرت قبلہ۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ

''جتنی ساعتیں میں نے قادیان میں گزاریں' آپ کی برکت سے بے حد مسرت و اطمینان سے بسر ہوئیں۔ مولوی عبدالوہاب عمر' عبدالعزیز خاں صاحب' شاکر صاحب نے میری خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ افسوس ہے کہ میں بوقتِ رخصت آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکا اس لیے کہ آپ مجلس شوریٰ میں مصروف تھے۔مہر صاحب کی طرف سے سلام مسنون۔''

عبدالمجید سالک

11 نومبر 1956ء کو (ذکرِ اقبال کی اشاعت کے بعد) سالک صاحب نے ربوہ میں تعلیم الاسلام کالج کے متعلق لکھا کہ:

''تعلیم الاسلام کالج احمدی جماعت اور پرنسپل میاں ناصر احمد کی مخلصانہ مساعی اور شبانہ روز محنت کا ایک عظیم الشان معجزہ ہے۔اس کالج کے کارکن جماعت کے تعمیری و تعلیمی تصورات کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف ہیں اور میرے نزدیک ایک ایسی درسگاہ کی سب سے بڑی خصوصیت اور برکت یہ ہے کہ ربوہ کی فضا آج کل کی شہری آلودگیوں سے قطعی طور پر محفوظ ہے اور وہ ترغیبات بالکل مفقود ہیں جو تربیتِ اخلاقی میں حائل ہو کر تعلیم کے بلند تصورات کو برباد کر دیتی ہیں۔اللہ تعالیٰ اس درسگاہ کو پاکستانیوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید و بابرکت بنائے اور اس کے کارپردازوں کو بیش از بیش سعی و جدوجہد کی توفیق عطا فرمائے۔

ربوہ 11 فروری 1956ء عبدالمجید سالک

(تاریخ احمدیت جلد دہم صفحہ 161-162)

واضح رہے کہ ''ذکرِ اقبال'' اور ''محولہ اقتباس'' پنجاب کی خلافِ قادیان تحریک 1953ء کے بعد کی تحریریں ہیں۔ مسلمانوں کا فیصلہ دوٹوک تھا کہ وہ قادیانی امت کو ملتِ اسلامیہ میں شامل نہیں کرتے اور دائرہ اسلام سے خارج گردانتے ہیں۔ مرزا بشیر الدین محمود نے اس کے فوراً بعد اپنی مدافعت کے لیے مسلمان اکابر کے تذکروں میں پناہ لینا شروع کی اور اس غرض سے ان اہل قلم کو تلاش کیا جو

اپنے قلم کی معرفت مسلمانوں میں قادیانی امت کے لیے راہ ہموار کر سکیں۔ ''ذکرِ اقبال'' اس رعایت سے ایک مدافعتی شہ پارہ ہے۔ اس کے علاوہ اس میں کئی ایک سیاسی غلطیاں ہیں۔ مثلاً 'یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ'' کے زیرِ عنوان صفحہ 203 پر لکھا ہے کہ:

> ''یونینسٹ پارٹی ہندو' مسلمان' سکھ زمینداروں کی مخلوط پارٹی تھی' اور اس کی وجہ سے شہری و دیہاتی حلقے الگ الگ ہو گئے تھے لیکن علامہ اس طرزِ سیاست کے افادی پہلو کو پسِ پشت ڈال کر یہ مثالی عقیدہ اپنے سامنے رکھتے تھے کہ مسلمانوں کو کسی غیر مسلم جماعت سے کوئی مفاہمت کرنے کی ضرورت نہیں اور طبقات و درجات کی تقسیم غیر اسلامی ہے۔......... اس میں شک نہیں کہ یونینسٹ پارٹی پنجاب کی بہترین سیاسی پارٹی تھی۔''

خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے۔ گویا علامہ اقبالؒ کا سوءِ تدبر تھا کہ وہ یونینسٹ پارٹی کے افادی پہلو کو پس پشت ڈال کر پنجاب کی اس بہترین سیاسی پارٹی پر مسلم لیگ کی بالا دستی قائم کرنا چاہتے تھے۔

فی الجملہ سالک صاحب نے سوانحِ اقبالؒ اس طرح مرتب کیے ہیں کہ اقبال کی عظمت کا مینار قائم نہیں رہتا' اس میں بہت سی دراڑیں یا خلل محسوس ہوتے ہیں۔ سالک جہاں ان کے سوانح کا ذکر کرتے وہاں اس انداز سے قلم لگاتے ہیں کہ علامہ کی شخصیت لہو ولعب سے نکلی ہوئی محسوس ہوتی ہے' اور جہاں ان کے افکار کا ضمناً تذکرہ کیا ہے وہاں ہندوؤں سے متعلق ان کی مغائرت کھل کے لکھی ہے۔ گاندھی و نہرو پر طنزیں کی ہیں اور وہ مسلمان جو انڈین نیشنل کانگرس کے ساتھ تھے' انھیں بھی نیشنلسٹ ہونے کے جرم میں رگیدا ہے' لیکن رجعت پسند سرکاری مسلمانوں کا ذکر احترام سے کیا اور ان کی کاسہ لیسی کو مخفی رکھا ہے' قادیانیت کا ذکر اس طرح کیا ہے گویا علامہ اقبالؒ نے ان کے متعلق جو کچھ لکھا وہ بداہتہً کسی عقیدت مند کی درخواست پر تھا' ان کے اپنے ''مطالعہ و تجزیہ'' اور ''غور و فکر'' کا حاصل نہیں تھا ورنہ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد قادیانی العقیدہ تھے اور والدۂ جاوید کے متعلق علامہ کی بدگمانی رفع ہو گئی تو ازدواجی زندگی قائم کرنے کے لیے حکیم نور الدین (خلیفۂ اوّل) سے شرعی مسئلہ دریافت کیا۔ پھر انہی کے حسبِ مشورہ عمل کیا۔

حضرت علامہ نے یہ کہیں نہیں کہا کہ قادیانی امت کی بنیاد غلطی پر ہے۔ انھوں نے اس کی بنیاد اسلام سے ''غداری'' قرار دی ہے۔ غداری کو غلطی کہنا قلم کی اچھوتی بانگی ہے۔ المختصر ذکرِ اقبال کئی ایک غلطیوں کا مجموعہ نہیں بلکہ سالک کے بہار آفریں قلم کی سب سے بڑی غلطی ہے۔

❁......❁......❁

پروفیسر ڈاکٹر ایوب صابر

علامہ اقبالؒ پر قادیانیوں کے اعتراضات کا جائزہ

علامہ اقبال پر مرزائیوں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے غیر مرزائی اقبال دشمنوں نے بھی فائدہ اٹھایا ہے اور بے بنیاد اعتراضات سے گمراہی پھیلائی ہے۔ اس ضمن میں بعض غیر معروف اور بے حیثیت اہلِ قلم کے اعتراضات زیادہ شدید اور زیادہ ناروا ہیں۔ ایسے غیر معروف اور بے حیثیت افراد مرفوع القلم رہنے چاہئیں۔[1] لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جب کوئی زہریلی کتاب شائع ہو جاتی ہے تو کسی نہ کسی سطح پر اس کا زہر معاشرے میں نفوذ کرتا ہے جس کا تریاق ضروری ہوتا ہے۔ ایسی ایک کتاب ''صدائے احتجاج'' کے نام سے شمیم رجز نامی شخص نے شائع کی ہے۔[2] اس کتاب میں اقبال کی مسخ شدہ تصویر پیش کی گئی ہے اور متعدد دوسرے الزامات عائد کرنے کے علاوہ علامہ اقبال کو بتکرار قادیانی کہا گیا ہے۔ کتاب کے ابتدائی صفحات ہی میں اس قسم کے جملے درج ہیں:

> ''وہ ایک کٹر قادیانی تھے اور کم از کم اس وقت تک ایک کٹر قادیانی ہی رہے جب ان کی عمر اٹھاون سال ہو گئی تھی۔ (1935ء) اور قریب قریب ان کا سارا کلام سپردِ قرطاس ہو چکا تھا۔''
>
> ''سر اقبال نے اپنی زندگی کے آخری تین برسوں کے دوران تین ایسے مضامین لکھے تھے جن کو پڑھ کر یہ خیال ہو سکتا تھا کہ اب وہ قادیانیت سے تائب ہو گئے ہیں لیکن ان کے بھتیجے اعجاز احمد قادیانی کی کتاب ''مظلومِ اقبال'' نے جو 1985ء میں شائع ہوئی ہے اس خیال کی تردید کر دی ہے۔''[3]

حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں بھی اس شخص کی رائے قابلِ غور ہے۔ لکھا ہے کہ ''حضرت علی عوامی حمایت سے اس لیے محروم تھے کہ انھوں نے کافروں کو کثیر تعداد میں قتل کیا تھا اور مسلم عوام انہی کافروں کی اولاد یا رشتہ دار تھے جبکہ ابوبکر کے ہاتھ سے کوئی کافر قتل نہ ہوا اس لیے مسلم عوام کی اکثریت ان کے ساتھ تھی۔[4] قادیانیت کے ضمن میں موصوف کے دعووں کا بنیادی ماخذ ''مظلوم اقبال'' ہے۔[5]

اس کتاب میں پیش کیے گئے بارہ نکات یہ ہیں:

1- اقبال نے 1901ء میں مرزا قادیانی کو "سب سے بڑا دینی مفکر" (Profoundest theologian) قرار دیا۔

2- 1902ء میں جب ان کو بعض فقہی مسائل پر رائے درکار ہوئی تو ہندوستان بھر کے علماء وفقہا کو چھوڑ کر قادیانی جماعت کے پہلے جانشین حکیم نورالدین سے رجوع کیا۔

3- خطبۂ علی گڑھ (1910ء) میں جماعت احمدیہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: "پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جسے فرقۂ قادیانی کہتے ہیں۔"

4- یہ اسی رائے کا نتیجہ ہوگا کہ انہی دنوں علامہ نے اپنے بڑے بیٹے بھائی آفتاب مرحوم کو جو سیالکوٹ کے ایک مشن سکول میں تعلیم پا رہے تھے' قادیان بھیج کر وہاں کے تعلیم الاسلام سکول میں داخل کرایا۔

5- 1913ء میں چچا جان کو ایک ذاتی معاملہ میں شرعی فتوے کی ضرورت پڑی تو اپنے دوست مرزا جلال الدین بیرسٹر کو قادیان بھیجا کہ حکیم نورالدین سے مسئلہ دریافت کریں۔ نورالدین نے جو مشورہ دیا علامہ نے اس پر عمل کیا۔

6- مارچ 27ء میں قادیانی جماعت کے دوسرے جانشین مرزا بشیرالدین محمود کا ایک لیکچر "مذہب اور سائنس" کے موضوع پر علامہ اقبالؒ کے زیرِ صدارت لاہور میں ہوا۔ لیکچر کے بعد صدارتی خطاب میں علامہ نے فرمایا "ایسی پُر از معلومات تقریب بہت عرصہ بعد لاہور میں سننے میں آئی ہے اور خاص طور پر جو قرآنِ کریم کی آیات سے مرزا صاحب نے استنباط کیا ہے' وہ نہایت عمدہ ہے۔

7- 5 ستمبر 30ء کو علامہ نے جماعتِ احمدیہ کے امام کے سیکرٹری کو ایک خط میں لکھا: "چونکہ آپ کی جماعت منظم ہے اور نیز بہت سے مستعد آدمی اس جماعت میں موجود ہیں، اس واسطے آپ بہت مفید کام مسلمانوں کے لیے انجام دے سکیں گے۔"

8- 25 جولائی 1931ء کو نواب ذوالفقار علی خان کی کوٹھی واقعہ شملہ میں ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں علامہ اقبالؒ اور ہندوستان کے بہت سے مسلم اکابرین شامل ہوئے۔ طے پایا کہ ایک آل انڈیا کشمیر کمیٹی بنائی جائے جو تحریکِ آزادیٔ کشمیر کے سارے کام کو اپنے ہاتھ میں لے۔ علامہ اقبالؒ نے تجویز کیا کہ جماعتِ احمدیہ کے امام اس کمیٹی کے صدر ہوں کیونکہ ان

کے پاس مخلص اور کام کرنے والے کارکن بھی ہیں اور وسائل بھی۔

9- 1931ء میں احمدیہ مسجد لندن کے امام فرزند علی نے علامہ اقبال اور بعض دوسرے اکابرین کو مسجد میں ایک تقریب میں شمولیت کی دعوت دی۔ مولانا غلام رسول مہر بھی اس تقریب میں شامل ہوئے۔ انھوں نے لکھا کہ اقبال نو مسلم انگریزوں کی زبان سے قرآن مجید سن کر خوش ہوئے۔

10- 32ء میں چودھری محمد احسن کے نام اپنے خط میں علامہ اقبال نے لکھا: ''اشاعتِ اسلام کا جوش جوان (بانی سلسلۂ احمدیہ) کی جماعت کے اکثر افراد میں پایا جاتا ہے' قابلِ قدر ہے۔''

11- انجمنِ حمایتِ اسلام کی مجلسِ عاملہ کے دو ایک احمدی بھی رکن ہوتے تھے۔ محاذ آرائی سے پہلے علامہ نے کبھی اس پر اعتراض نہ کیا۔ اسی طرح مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس میں احمدیوں کی شمولیت پر علامہ کی طرف سے کبھی اعتراض نہ ہوا' بلکہ ایک سال تو چودھری ظفر اللہ خان احمدی' لیگ کے صدر بھی رہے لیکن علامہ کی طرف سے کوئی احتجاج نہیں ہوا۔

12- پنجاب کونسل کے انتخاب میں چودھری ظفر اللہ خان ایک مسلم حلقہ سے منتخب ہوئے۔ علامہ اقبال کی طرف سے چودھری صاحب کے ایک مسلم حلقہ سے منتخب ہونے پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔

یہ معلومات درج کرنے کے بعد شیخ اعجاز احمد لکھتے ہیں:

> ''مندرجہ بالا حقائق اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ 35ء کے آغاز تک علامہ اقبال کے نزدیک احمدی دائرہ اسلام سے خارج نہ تھے...... احمدی جماعت جو بقول علامہ اقبالؒ اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ تھی' 35ء میں ایکا ایکی کیوں علامہ اقبال کی رائے میں دائرہ اسلام سے یکسر خارج ہوگئی۔''[6]

اس کیوں کا جو جواب شیخ اعجاز احمد نے دیا ہے' وہ محلِ نظر ہے۔[7] اپنی تبدیلی رائے کی جو وجوہ خود اقبال نے بیان کی ہیں انھیں غلط ٹھہرانے کا کوئی جواز نہیں ہے۔[8] قطع نظر ان امور کے اس مقام پر جس نکتے کی وضاحت مطلوب ہے، وہ یہ ہے کہ شمیم رجز نے شیخ اعجاز احمد کی کتاب ''مظلوم اقبال'' کی بنیاد پر علامہ اقبالؒ کے 1935ء یا اس کے بھی بعد تک ''کٹر قادیانی'' ہونے کا جو دعویٰ کیا ہے' وہ صریحاً غلط ہے۔ اس ضمن میں شیخ اعجاز احمد کے دلائل و شواہد کا ماحصل یہ ہے کہ 1935ء سے پہلے علامہ قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار نہ دیتے تھے۔ معترض شمیم رجز کا دعویٰ اس سے مختلف ہے اور غلط بیانی پر مبنی ہے۔ موصوف نے اقبال کو کٹر قادیانی بنایا ہے۔ یہ جسارت بدبختانہ اور افسوس ناک ہے۔ کسی لکھنے والے کے لیے ایسا دعویٰ اور اس پر اصرار شرمناک ہے۔ اقبال ایک دن کے لیے بھی کبھی قادیانی نہیں رہے تھے۔ انھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی یا کسی بھی دوسرے قادیانی امیر کے ہاتھ پر کبھی بیعت

نہیں کی تھی اور نہ کبھی ایک لمحے کے لیے ختم نبوت کے عقیدے سے دست بردار ہوئے۔ جب بیعت کی دعوت دی گئی تو اسے ایک نظم لکھ کر رد کر دیا اور ختم نبوت کے عقیدے کا ہمیشہ اظہار و اعلان کرتے رہے۔

علامہ اقبال نے 1935ء میں مرزائیوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا۔ اس سے پہلے شیخ اعجاز احمد کے الفاظ میں ''احمدیوں کے دو ایک عقائد سے اتفاق اور دو ایک سے اختلاف کے باوجود علامہ عمر بھر اپنے قول و فعل سے احمدیوں کو مسلمانوں کا ایک فرقہ تسلیم کرتے رہتے تھے۔''[9] اقبال نے قادیانیت کے کسی بنیادی عقیدے سے اتفاق نہیں کیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کو نہ نبی تسلیم کیا نہ مجدد۔ تاہم شیخ اعجاز احمد کا یہ دعویٰ درست ہے کہ اقبال نے احمدی جماعت کو 1935ء سے پہلے دائرہ اسلام سے خارج قرار نہیں دیا تھا۔ اقبال سمیت اس سلسلے میں جن اکابر نے' قادیانیوں کو' غیر مسلم قرار دینے میں کوتاہی یا تاخیر کی' اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قادیانی جماعت مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ ہے۔ جن علما نے قادیانی لٹریچر کا مطالعہ کیا' وہ مرزا قادیانی کو' دعویٰ نبوت کے بعد' ابتدا ہی سے' کافر قرار دے رہے تھے۔ رفتہ رفتہ اس پر امتِ مسلمہ کا اجماع ہو گیا اور اقبال نے بھی اپنی کوتاہی کا ازالہ کر دیا۔ اس اجماع سے پہلے کی صورتِ حال کو قادیانی بار بار یاد کرتے ہیں اور اسے قادیانیت کا جواز بنانا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی نظر بطورِ خاص علامہ اقبال پر ہے۔ ان کی کوشش ہے کہ اقبال کا احمدیت سے گہرا تعلق ثابت کیا جائے اور اسے قادیانیت کی تقویت کا ذریعہ بنایا جائے۔ یہ کوششیں اگرچہ عرصے سے جاری تھیں،[10] تاہم ایک بلند بانگ دعویٰ شیخ عبدالماجد نے کیا ہے۔ ''اقبال کا احمدیت کے ساتھ گہرا تعلق'' کا عنوان جما کر موصوف رقم طراز ہیں:

> ''واضح رہے کہ برصغیر کے متعدد مسلم مشاہیر ایسے ہیں' جنھوں نے بانی سلسلۂ احمدیہ یا احمدیت کی مخالفت نہیں کی یا تعریف کی ہے۔ ان میں مولانا شبلی نعمانی' مولانا حالی' مولانا اکبر الہ آبادی' مولانا عبدالحلیم شرر' علامہ کے استاد مولانا سیّد میر حسن' خواجہ حسن نظامی' مولانا غلام رسول مہر' مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا محمد علی جوہر' مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ شامل تھے۔ لیکن ان میں سے کسی کا بھی احمدیت کے ساتھ ایسا گہرا تعلق نہیں رہا کہ اس نے اپنے لختِ جگر کو دینی تعلیم کے حصول کے لیے سالہا سال تک قادیان بھجوائے رکھا ہو۔ بانی سلسلۂ احمدیہ کو ہندی مسلمانوں میں غالباً سب سے بڑے دینی مفکر کے طور پر پیش کیا ہو۔ آپ کی جماعت کو ''اسلامی سیرت کے ٹھیٹھ نمونہ کی حامل جماعت'' قرار دیا ہو۔ پھر کسی کا بھی اتنا گہرا تعلق نہیں رہا کہ اس نے اپنے ذاتی یا رفیقہ حیات کے

معاملات کے سلسلے میں شرعی فتوے قادیان سے منگوائے ہوں۔ وفاتِ مسیح کا
اقرار کیا ہو اور امت میں نئے مسیحا (New Christ) کی ضرورت کو تسلیم کیا
ہو۔ احمدیت کے خلاف محاذ آرائی کے دور میں بھی ''صالح آدمی'' قرار دیتے
ہوئے اپنے اس عزیز کو اپنے نابالغ بچوں کے اولیاء میں شامل کیا ہو جو کچھ عرصہ
پیشتر تحریکِ احمدیہ میں شامل ہو چکا ہو۔''[11]

آفتاب کے ضمن میں ''لختِ جگر'' استعارہ اور دینی تعلیم ''مغالطہ'' ہے۔ آفتاب نے 1916ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔[12] اگر اقبال کا سکاچ مشن سکول اور کالج میں داخلہ شیخ نور محمد کے عیسائیت سے گہرے تعلق کا مظہر نہیں ہے تو آفتاب کا تعلیم الاسلام سکول قادیان میں داخلہ قادیانیت سے اقبال کے گہرے تعلق کا مظہر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خصوصاً جبکہ آفتاب کے امور لاہور کے بجائے زیادہ تر سیالکوٹ میں طے پاتے تھے جہاں شیخ عطا محمد کا دخل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال بڑے بھائی کے ممنون تھے اور ان کی خوشنودی چاہتے تھے۔ 1911ء کے خطبۂ علی گڑھ میں اقبال نے مغربی طرز کے تعلیمی نظام پر سخت تنقید کی جو مغربی تہذیب کے نمونے تیار کر رہا تھا۔ مرزائی چونکہ داڑھی اور دوسرے ظاہری مسلم شعائر کی پابندی کرتے تھے، اس لیے اقبال نے ''قادیانی فرقے'' کو ''مسلم سیرت کا طاقت ور مظہر'' قرار دیا۔ اصل خرابی یہ تھی کہ اقبال، دوسرے متعدد اکابر کی طرح، قادیانی جماعت کو مسلمانوں ہی کا ایک فرقہ سمجھتے تھے، جس میں ان کے بڑے بھائی تب شامل تھے۔ بعض شواہد جو اقبال کے، قادیانیت کے ساتھ، تعلق کو ظاہر کرتے ہیں انھیں اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ تاہم متعدد شواہد، اس دور سے متعلق بھی، ایسے ہیں جن سے اقبال کی نہ صرف قادیانیت سے بے تعلقی بلکہ دوری ظاہر ہوتی ہے اور اقبال قادیانی عقائد کی مزاحمت کرتے ہوئے اور ان پر ضرب لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان شواہد کا ذکر کچھ آگے آ رہا ہے۔

قادیانیت کے ضمن میں اقبال کے رویے کا سراغ لگاتے ہوئے ان کے فکری ارتقاء کو پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ اقبال بیسویں صدی کے اوائل تک روایتی عجمی تصوف کے قائل تھے۔ ان کا پہلا مضمون (The doctrine of Absolute Unity as Expounded by Abdul Karim Al-Jilani) بمبئی کے رسالے Indian Antiquary میں 1900ء میں شائع ہوا۔ کسی قدر ترمیم کے ساتھ اسے ڈاکٹریٹ کے مقالے میں شامل کر دیا گیا۔ 1900ء میں مرزا غلام احمد قادیانی کے لیے ''غالباً جدید ترین ماہرِ دینیات'' (Probably the profoundest theologian) کے الفاظ لکھے گئے تھے۔ اس کی ایک

وجہ تو وہ شہرت تھی جو مرزا قادیانی کو آریہ سماجیوں اور عیسائی پادریوں کے ساتھ مناظروں کے باعث حاصل ہوئی تھی اور دوسری وجہ مرزا قادیانی کا ''فصوص الحکم'' سے استفادہ تھا۔[13] بعد میں اقبال نے ''فصوص الحکم'' کے لیے ''الحادوزندقہ'' کے الفاظ استعمال کیے۔[14]

رفیقۂ حیات کے ضمن میں شرعی فتویٰ قادیان سے منگوانے کا واقعہ ضروری نہیں کہ درست ہو۔ اس کے راوی مرزا جلال الدین ہیں اور مرزا موصوف کے بیان کردہ بعض واقعات غلط ثابت ہوئے ہیں۔[15] وفاتِ مسیح کے بارے میں اقبال کی رائے دوسرے مرزائی حضرات نے بھی بیان کی ہے لیکن کسی نے اس ضمن میں بنیادی ماخذ کا حوالہ دینا مناسب نہیں سمجھا۔[16] متعلقہ متن کو سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھا جائے تو مرزائیت سے اقبال کے ذہنی قرب کا نہیں بُعد کا اندازہ ہوتا ہے۔ پنڈت نہرو کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں:

> ''مسلم عوام کو جن میں مذہبی جذبہ بہت شدید ہے' صرف ایک ہی چیز قطعی طور پر متاثر کر سکتی ہے اور وہ ربانی سند ہے......اس الہامی بنیاد کو احمدیت نے فراہم کیا۔ خود احمدیوں کا دعویٰ ہے کہ برطانوی شہنشاہیت کی سب سے بڑی خدمت ہے جو انھوں نے انجام دی ہے۔ پیغمبرانہ الہام کو ایسے دینیاتی خیالات کی بنیاد قرار دینا جو سیاسی اہمیت رکھتے ہیں گویا اس بات کا اعلان کرنا ہے کہ جو لوگ مدعیٔ نبوت کے خیالات کو قبول نہیں کرتے اوّل درجہ کے کافر ہیں اور ان کا ٹھکانا نارِ جہنم ہے۔ جہاں تک میں نے اس تحریک کے منشا کو سمجھا ہے' احمدیوں کا یہ اعتقاد ہے کہ مسیح کی موت ایک عام فانی انسان کی موت تھی اور رجعتِ مسیح گویا ایسے شخص کی آمد ہے جو روحانی حیثیت سے اس کا مشابہ ہے۔ اس خیال سے اس تحریک پر ایک طرح کا عقلی رنگ چڑھ جاتا ہے لیکن یہ ابتدائی مدارج ہیں اس تصورِ نبوت کے، جو اسی تحریک کے اغراض کو پورا کرتا ہے جن کو جدید سیاسی قوتیں وجود میں لائی ہیں...... مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے۔''[17]

مرزائی حضرات نے درمیان کا ایک فقرہ پکڑ کر اقبال کی مرزائیت سے قربت کا تاثر پیدا کیا۔[18] جبکہ اقبال وفات و حیاتِ مسیح' جیسے مسائل کو الٰہیات کے لات و منات قرار دیتے ہیں۔[19] انھوں نے توجہ اس پر صرف کی کہ مسلمان آزاد ہوں' تعمیرِ نو کے عمل سے گزریں' اتحاد قائم کریں اور دنیا سے ملوکیت و استعمار کا خاتمہ کر کے اسے حریت' مساوات اور اخوت کی اقدار کا گہوارہ بنائیں۔ چنانچہ حقیقت

یہی ہے کہ اگرچہ مرزائیوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دینے کی بات اقبال نے عرصے بعد کی لیکن ان کے ایمان و عمل کا رخ مرزا غلام احمد کے برعکس تھا۔ جہاں مرزائیت سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کر رہی تھی، وہاں اقبال نے 1907ء ہی سے، برطانوی شہنشاہیت کو للکارنا شروع کر دیا تھا۔ عبدالماجد نے شیخ اعجاز احمد کی ''صالحیت'' کو مرزائیت کے کھاتے میں ڈالا ہے۔ یہ بات محل نظر ہے۔[20] ایک عنوان یہ بھی قائم کیا ہے کہ ''علامہ نے احمدیوں کے خلاف 1935ء سے قبل زبان کیوں نہ کھولی؟''......اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ یہ علامہ اقبال کی کوتاہی تھی۔ اقبال کا ایک شعر ہے:

می شود پردۂ چشم پرے کاہے گاہے
دیدہ ام ہر دو جہاں را بنگاہے گاہے[21]

احمدیوں کے خلاف 1935ء سے قبل اقبال نے زبان اس طرح نہ کھولی تھی جس طرح 1935ء میں کھولی۔ 1935ء میں انھیں غیر مسلم قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ ایسا مطالبہ پہلے نہیں کیا تھا۔ اسلام اور مرزائیت کے بنیادی فرق اور تضاد کو واضح کیا۔ پہلے اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا تھا۔ اس کی وجہ اقبال نے بیان کر دی ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی اس پر روشنی ڈالی ہے۔[22] تاہم یہ حقیقت نمایاں اور واضح ہے کہ اقبال کے فکر و عمل کا رُخ قادیانیت کے الٹ تھا......قادیانیت سے قربت کے جو شواہد مرزائیوں نے اکٹھے کیے ہیں، ایسے شواہد ہندو دھرم کے ساتھ 'اقبال کی قربت کے' بھی پیش کیے جا سکتے ہیں اور کیے گئے ہیں۔[23] تو کیا اقبال کا ہندومت سے ''گہرا تعلق'' ہے؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ مرزائیت اور اقبال کا بُعد 'بنیادی امور میں' ہمیشہ رہا ہے۔ یہ بنیادی امور حسبِ ذیل عنوانات کے تحت زیرِ بحث لائے جا سکتے ہیں:

(1) ''مسیحِ موعود'' کا تصور (2) ختمِ نبوت کا عقیدہ
(3) بیعت کا معاملہ (4) جہاد کے ضمن میں بُعد و اختلاف

ان امور کے ضمن میں جو حقائق ہیں، ان سے قادیانیت کے ساتھ اقبال کے مذکورہ ''گہرے تعلق'' کی تردید ہو جاتی ہے۔

مسیحِ موعود کا تصور

مرزا غلام احمد قادیانی نے 1891ء میں مثیلِ مسیح ہونے کا دعویٰ کیا، اس کے بعد مسیحِ موعود ہونے کا اور 1901ء میں نبوت کا دعویٰ بھی کر دیا۔ قادیانیت کی ابتدا مثیلِ مسیح اور مسیحِ موعود کے دعووں سے ہوئی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے مسیحِ موعود ہونے پر قادیانی اب بھی بہت زور دیتے ہیں، جبکہ سیّد ابو

الاعلیٰ مودودی سمیت اکابر علماء نے حضرت عیسیٰؑ کی آمدِ ثانی اور مرزا غلام احمد کے دعووں میں جو فرق و امتیاز ہے اس کی واضح نشاندہی احادیث کی روشنی میں کر دی ہے۔ 24 اقبال اس سے بھی آگے گئے ہیں لیکن قادیانی حضرات بشمول شیخ عبدالماجد نے اقبال کے کچھ جملوں کا سہارا لے کر انھیں مسیحِ موعود کے تصور سے منسلک کرنا چاہا ہے۔ شیخ عبدالماجد نے ''اقبال نئے مسیحا کی آمد کے متمنی تھے'' کے زیرِ عنوان اس ضمن میں تین شواہد پیش کیے ہیں، 25 جن سے مرزا قادیانی کے مسیح موعود ہونے کا اثبات نہیں ہوتا بلکہ تردید ہوتی ہے۔ 26 در حقیقت مسیحِ موعود اور اس سے ملتے جلتے تصورات کو اقبال نے کلیتاً رد کیا ہے اور مرزا غلام احمد کی زندگی میں ایسا کر دیا تھا۔ اقبال مرزا قادیانی کو نہ مثیلِ مسیح مانتے ہیں نہ مثیلِ محمد۔ ابتدا میں مسلمانوں کے عام عقیدے کے مطابق آمدِ مہدی سے انکار نہیں کرتے لیکن چند برس بعد اس سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ حسب ذیل اشعار میں سے پہلا 1903ء کا ہے اور دوسرا 1905ء کا:

مجھ کو انکار نہیں آمدِ مہدی سے مگر
غیر ممکن ہے کوئی مثل ہو پیدا تیرا 27

مینارِ دل پہ اپنے خدا کا نزول دیکھ
یہ انتظارِ مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے 28

اس طرح اقبال نے وہ شاخ ہی کاٹ دی جس پر مرزائیت کا گھونسلا بنایا گیا تھا۔ معرکۂ قادیانیت کے دوران مرزائیوں نے مسلمانوں کو، یہ کہہ کر کہ اقبال عیسیٰؑ کی آمدِ ثانی کو نہیں مانتے' ''ابھارنے کی کوشش کی، مگر وہاں کچھ اثر نہ ہوا۔'' 29

ختم نبوت، بروز، حلول اور ظل

مرزا غلام احمد قادیانی کے متعدد و متفرق دعووں میں سے ایک یہ ہے کہ ''میں بروزی طور پر وہی نبی خاتم الانبیاء ہوں اور خدا نے میرا نام محمد اور احمد رکھا ہے اور مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ہی وجود قرار دیا ہے...... کیونکہ ظل اپنے اصل سے علیحدہ نہیں ہوتا۔'' 30 شیخ عبدالماجد نے اقبال کو بروز کا قائل ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ 31 لیکن یہ محض مغالطہ دینے کی کوشش ہے۔ اقبال نے مرزا قادیانی کو کبھی بروزی یا ظلی نبی تسلیم نہیں کیا۔ 32 اور انھوں نے اپنے موقف کا اظہار 1902ء ہی میں کر دیا تھا:

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نورِ شمعِ عرفاں کردۂ 33

''رموزِ بے خودی'' 1918ء میں (1935ء سے سترہ برس قبل) شائع ہوئی۔ حسبِ ذیل اشعار لائقِ توجہ ہیں:

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را
او رسل را ختم و ما اقوام را
لاَ نَبِیَّ بَعْدِیْ ز احسانِ خدا است
پردۂ ناموسِ دینِ مصطفٰےؐ است
قوم را سرمایۂ قوت ازو
حفظِ سرِ وحدتِ ملت ازو [34]

کلمہ طیبہ نیز اسلامی تمدن کے دو بنیادی نکات توحید اور رسالت ہیں۔ توحید پہلا اور رسالت دوسرا نکتہ ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ اقبال کے خطبے The Spirit of Muslim Culture میں اوّلیت تصورِ ختمِ نبوت کو حاصل ہے۔ اقبال لکھتے ہیں:

"In Islam prophecy reaches its perfection in discovering the need of its own abolition."[35]

چنانچہ 1935ء سے پہلے بھی اقبال ختم نبوت کے قائل، حامی، مفسر اور علمبردار تھے۔[36] یہ وہ عقیدہ ہے جسے اقبال کے نظامِ فکر میں تسلسل، استقلال اور بنیادی اہمیت حاصل ہے اور اقبال کے نزدیک یہ تصور اسلامی تمدن کی جان ہے۔

کیا اقبال نے مرزا قادیانی کی کبھی بیعت کی؟

بیعت کے معاملے میں مرزائیوں نے خاصی جعل سازی سے کام لیا ہے۔ جھوٹی عدالتی گواہی کے بل بوتے پر اس کو ہوا دی ہے۔[37] ''دو مختلف آراء'' کا شوشہ چھوڑا ہے اور ''لڑکپن کی بیعت'' جیسا عنوان جمایا ہے۔[38] جبکہ شیخ اعجاز احمد جن کی صالحیت کو مرزائیت کا اثر ظاہر کیا گیا ہے، اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ ''ان (اقبال) کے عقیدے کے مطابق مہدی کی آمد، مسیحؑ کے دوبارہ ظہور اور مجددیت کے متعلق جو احادیث ہیں، وہ ایرانی اور عجمی تخیلات کا نتیجہ ہیں۔ عربی تخیلات اور قرآنِ کریم کی صحیح سپرٹ سے ان کا کوئی سروکار نہیں...... اس عقیدہ کو رکھتے ہوئے وہ کسی مسیحِ موعود کا دعویٰ کرنے والے کی بیعت کیسے کر سکتے تھے۔ قصہ مختصر ان کے بیعت کرنے کی بات درست معلوم نہیں ہوتی۔''[39]

حقیقت یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی یا میر حامد سیالکوٹی (مرزائی) کی طرف سے اقبال کو بیعت کا پیغام 1902ء میں ملا۔ اقبال نے بیعت نہ کی اور ایک طویل نظم ''بہ جوابِ دعوتِ بیعت مرزا'' لکھی جو ''مخزن'' مئی 1902ء میں ''خطِ منظوم (پیغامِ بیعت کے جواب میں) کے زیرِ عنوان شائع ہوئی۔ اسی عنوان سے ''پنجۂ فولاد'' لاہور 14 جولائی 1902ء کو شائع ہوئی۔ تفصیل ''معاصرین اقبال کی نظر میں'' اور ''ابتدائی کلامِ اقبال'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔[40] اس موضوع پر مرزائیوں بشمول شیخ عبدالماجد نے جتنی بھی خامہ فرسائی کی ہے' سب قیاس آرائی اور غلط بیانی پر مبنی ہے۔ جو بنیادی نکتہ اقبال کا مرزائیت سے دوری کا تھا' اسے خلطِ بحث کے ذریعے قربت اور گہرے تعلق کا آئینہ دار ظاہر کیا گیا ہے۔ 1902ء میں اقبال قادیانی تحریک کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھے' اس کا اندازہ ان کے حسبِ ذیل اشعار سے ہوتا ہے:

جام ٹوٹا ہوا ہوں میں لیکن
مئے حق سے بھرا ہوا ہوں میں
ایک دانے پہ ہے نظر تیری
اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں
تو جدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
اس عبادت کو کیا سراہوں میں
مرگِ اغیار پر خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہوں میں[41]

اگر اقبال نے 1897ء میں بیعت کی ہوتی تو اس طویل نظم میں اس کا ذکر ہوتا۔ اقبال کے متعدد اشعار کے جواب میں شیخ عبدالماجد نے حامد شاہ کے اشعار نقل کیے ہیں۔[42] حامد شاہ کی نظم میں بھی مذکورہ بیعت کا کوئی حوالہ نہیں۔ مرزائی کسی ایک بات پر قائم نہیں رہتے۔[43] جو بات یقینی ہے وہ اقبال کے مندرجہ بالا اشعار سے واضح ہے۔ اقبال نے نہ صرف مرزا قادیانی کی بیعت نہیں کی بلکہ موصوف کو آڑے ہاتھوں بھی لیا ہے۔

فریضۂ جہاد

جہاد کے معاملے میں بھی مرزائیت اور اقبال کا بُعد 1902ء سے شروع ہوتا ہے' اور اقبال

زندگی بھر اسے نہ صرف قائم رکھتے ہیں بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک طرف تو اقبال جہاد پر بے مثل اشعار تخلیق کرتے ہیں اور دوسری طرف' جہاد کے حوالے سے' مرزا قادیانی پر کاری ضربیں لگاتے ہیں۔ تاہم اس ضمن میں بھی قادیانی حضرات نے تاویل' مغالطے اور جعل سازی کے حربوں سے خاصا خلطِ مبحث پیدا کیا ہے۔ عبدالماجد نے مرزائیت' جہاد اور اقبال کے تناظر میں تفصیل سے لکھا ہے اور مناسب یہی ہے کہ اس ضمن میں ان کے بیانات کا جائزہ لیا جائے۔ شیخ عبدالماجد نے مرزا غلام احمد قادیانی کی یہ تحریر درج کی ہے کہ ''شریعتِ اسلامیہ کا یہ واضح مسئلہ ہے' جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ ایسی سلطنت سے لڑائی اور جہاد کرنا جس کے زیرِ سایہ مسلمان امن اور عافیت اور آزادی سے زندگی بسر کرتے ہوں...... قطعی حرام ہے۔''[44] چند سطور آگے یہ قطعی حرام ''التوائے جہاد'' کا فتویٰ بن گیا ہے۔[45] اگلے صفحے پر لکھا ہے کہ جب اقبال ''قرآن مجید پر تدبر کر کے کوئی نتیجہ نکالتے ہیں تو وہ وہی ہے جس کا اظہار بانی تحریکِ احمدیہ نے کیا ہے۔'' اس ضمن میں شیخ عبدالماجد کی ایک دلیل حسبِ ذیل ہے:

> ''راقم عرض کرتا ہے کہ بانی سلسلۂ احمدیہ کی زندگی میں علامہ سنجیدگی سے اسی بات کے قائل تھے کہ تلوار کے دن لد چکے' اب قلم کا دور دورہ ہے۔ اب قلم ہی سیف کا کام دکھاتی ہے۔ چنانچہ قلم کی کشور کشائی کے منکروں کو سمجھانے کے لیے آپ نے 1902ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے اجلاس میں پڑھی جانے والی نظم میں یہ شعر شامل کیا:
>
> تیغ کے بھی دن کبھی تھے اب قلم کا دور ہے
> بن گئی کشور کشا یہ کاٹھ کی تلوار کیا''[46]

شیخ عبدالماجد نے یہ تو لکھا ہے کہ مندرجہ بالا شعر اس نظم میں شامل تھا جو 1902ء میں انجمن حمایتِ اسلام کے اجلاس میں پڑھی گئی تھی لیکن اس شعر کے ماخذ کا حوالہ نہیں دیا تاکہ فوراً پکڑے نہ جائیں۔ مذکورہ نظم غلام رسول مہر اور صادق علی دلاوری کے مرتب کردہ مجموعے ''سرودِ رفتہ'' میں شامل ہے۔''[47] یہ شعر اس طویل نظم کے پانچویں بند کا ساتواں شعر ہے۔ اس بند کے پورے دس اشعار میں سے ہر ایک کے آخر میں استفہامیہ نشان (؟) موجود ہے۔ ''ابتدائی کلامِ اقبال'' میں بھی یہی صورت ہے۔[48] چنانچہ شعر کی اصل صورت یہ ہے:

> تیغ کے بھی دن کبھی تھے اب قلم کا دور ہے
> بن گئی کشور کشا یہ کاٹھ کی تلوار کیا؟

پہلا مصرع مرزا قادیانی کا قول ہے اور دوسرا مصرع اس کا جواب ہے۔ سوالیہ نشان ہٹا کر

عبدالماجد نے شعر کے مفہوم کو الٹ دیا ہے۔ یہ ایک کھلی جعل سازی ہے۔ جس مفہوم کی وکالت عبدالماجد نے کی ہے وہ درست ہوتا اگر مرزا غلام احمد نے ''کاٹھ کی تلوار'' سے دو چار ملک فتح کر لیے ہوتے۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ سوالیہ انداز اسی صورت حال کو اجاگر کرتا ہے۔ مزید یہ کہ نظم کے اندرونی شواہد عبدالماجد کے موقف کی تائید نہیں کرتے۔ نظم کا عنوان ہے۔ ''اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے''۔ اسلامیہ کالج کی جگہ کسی قادیانی تعلیمی ادارہ کی ترجمانی ہوتی اور شعر کے آخر میں استفہامیہ نشان بھی نہ ہوتا تو مذکورہ الٹے مفہوم کی گنجائش نکل سکتی تھی اگرچہ واقعاتی اعتبار سے شعر پھر بھی بے معنی ہوتا۔ علاوہ ازیں اسی نظم کے نویں اور آخری بند میں یہ شعر ہے:

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نورِ شمعِ عرفاں کردہ ای

اس شعر میں اقبال نے ظلی اور بروزی نبوت کو رد کر دیا ہے۔ پانچویں بند میں تنسیخِ جہاد کو ہدف طنز و اعتراض بنانا ابتدا تھی۔ انتہا یہ تھی کہ آخری بند میں مرزا غلام احمد کی ظلی یا بروزی نبوت کا قلع قمع کر دیا۔ جس طرح ختم نبوت کے عقیدے سے اقبال کی وابستگی شروع سے آخر تک رہی ہے اسی طرح نکتۂ جہاد ابتدا سے اخیر تک ان کی دلچسپی کا خاص موضوع رہا ہے، چنانچہ ضربِ کلیم کی نظم ''جہاد'' زیر نظر شعر کی صدائے بازگشت ہے:

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
لیکن جنابِ شیخ کو معلوم کیا نہیں؟
مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود بے اثر
باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر
ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگزر؟

شیخ کلیسا نواز سے مراد مرزا غلام احمد ہے۔ ایک طرف عیسائی مشنریوں سے مناظرے کر کے مسلمانوں میں شہرت و مقبولیت حاصل کرنا اور دوسری طرف اپنی ''بروزی نبوت'' کو مسلمانوں کی محکومیت

کے لیے ''الہامی سند'' کے طور پر استعمال کرنا مرزا قادیانی کا طرۂ امتیاز ہے۔ صلیبی جنگوں نیز سراج الدولہ اور ٹیپو شہید کے ساتھ جنگی تجربے کے تناظر میں برطانوی حکومت کی یہ بنیادی ضرورت تھی کہ جہاد کی حرمت کا فتویٰ الہامی سند کے ساتھ منظر عام پر آئے۔ شیخ عبدالماجد کی ''التوائے جہاد'' کی تاویل بھی آزادی کی نوید نہیں بلکہ برطانوی استعمار کی محکمی کا اشاریہ ہے۔ 49 موصوف نے یہ تاثر دیا ہے کہ ''مسیح موعود'' کا عیسائی مشنریوں سے مقابلہ ''دجال'' سے مقابلہ تھا۔ یہ مغالطہ دینے کی کوشش ہے۔ شیخ عبدالماجد کی حسبِ ذیل تحریر توجہ طلب ہے:

> ''دجال جس نے مسیح ابن مریم کے نزول سے قبل خروج کرنا تھا...... سے مراد ایک ایسی قوم تھی جو اپنے انتہائی دجل اور دھوکہ آمیز سیاست کے ذریعے دنیا میں بڑا فتنہ پیدا کرنے والی تھی...... مغرب کی عیسائی اقوام نے جو سواریاں ایجاد کی ہیں، دجال کے گدھے کی تصویر بعینہٖ ان پر صادق آتی ہے۔'' 50

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ''دجال'' سے عیسائی مشنری مراد لینا غلط ہے۔ مندرجہ جملے ظاہر کرتے ہیں کہ دجال کا اطلاق مغرب کی عیسائی اقوام پر ہوتا ہے جنھوں نے عیسائیت کو ایک طرف رکھ کر سائنسی ترقی کی اور انتہائی دجل اور دھوکہ آمیز سیاست سے دنیا میں فتنہ پیدا کیا۔ عبدالماجد کی اپنی اس توضیح کے مطابق اس ترقی اور اس سیاست کی حامل یورپ کی استعماری اقوام دجال کے مترادف ہیں نہ کہ عیسائی مشنری۔ برصغیر کے تناظر میں انتہائی دجل اور دھوکہ آمیز سیاست والی قوت برطانوی حکومت تھی اور مرزا غلام احمد قادیانی اسی دجال کے وفادار تھے۔ مرزا قادیانی کا یہ کہنا کہ ''ایسی سلطنت سے لڑائی اور جہاد کرنا جس کے زیرِ سایہ مسلمان امن اور عافیت اور آزادی سے زندگی بسر کرتے ہیں...... قطعی حرام ہے۔'' مسلمانوں کو استعمار کا محکوم رکھنے کے لیے یہ الہامی سفر ہے۔ جہاد کے خلاف یہ الہام جعلی اور محکوم پیغمبر کا ہے۔ ضربِ کلیم کی نظم ''الہام اور آزادی'' میں اقبال کہتے ہیں:

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے یہ صورتِ چنگیز!

''جاوید نامہ'' کا آغاز 1927ء میں ہوا اور تکمیل 1931ء میں ہوئی۔ آخری نظم ''خطاب بہ جاوید --- سخنے بہ نژادِ نو'' میں علامہ اقبال نے دو جعلی پیغمبروں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک (بہاء اللہ) نے حج کو منسوخ کیا اور دوسرے (مرزا قادیانی) نے جہاد کو:

آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد
آں ز حج بیگانہ و ایں از جہاد!

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فروری 1902ء میں کہی گئی نظم بعنوان ''اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں کو'' میں ختم نبوت کا واضح اعلان ہے' اور اس نظم میں جہاد کی تنسیخ پر گرفت کی گئی ہے۔ ''اسرار خودی'' میں جہاد کی تلقین ہے اور ''رموزِ خودی'' میں عقیدۂ ختم نبوت کا بیان ہے۔ ''جاوید نامہ'' میں حج اور جہاد کی تنسیخ کو جعلی پیغمبری کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ان حقائق وشواہد سے واضح ہے کہ مرزا قادیانی کے اعلانِ نبوت کے بعد فروری 1902ء سے لے کر 1933ء (جاوید نامے کی اشاعت) تک اقبال ختم نبوت اور جہاد کے علمبردار رہے اور اس کے بعد قادیانیت کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا۔ چنانچہ قادیانیوں کی طرف سے انگریزوں کی اطاعت و وفاداری کے ضمن میں علامہ اقبال کے ریکارڈ کو پیش کرنا مغالطہ پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ [۵۱] اسی طرح جہاد کی تنسیخ یا التوا کے سلسلے میں اقبال کو مرزا غلام احمد کا ہمنوا ظاہر کرنا بھی مغالطہ ہے۔ [۵۲] اقبال کو نئے مسیحا کا منتظر دکھانا بھی مغالطہ ہے اور بحیثیتِ مجموعی 1935ء سے پہلے علامہ اقبال کا قادیانیت سے ''گہرے تعلق'' کا دعویٰ بھی مغالطہ ہے۔ بنیادی امور وعقائد کے تناظر میں اقبال' ابتدا ہی سے' مرزائیت کے خلاف سینہ سپر نظر آتے ہیں۔

حواشی

1. ''اقبال دشمنی: ایک مطالعہ'' کے ضمن میں میرا ایک انٹرویو ریڈیو پاکستان اسلام آباد کی عالمی سروس سے نشر ہوا۔ اس میں سوال اٹھایا گیا کہ صائب عاصمی جیسے مجہول شخص کے ذکر کی کیا ضرورت تھی۔ اسی تناظر میں ایک انٹرویو بی بی سی کی اردو سروس سے 10 نومبر 1996ء کی شام کو نشر ہوا۔ اس میں بھی غیر اہم لوگوں کو اہمیت دینے پر گرفت کی گئی۔
2. شمیم رجز گنگا جمنا کے درمیانی علاقے سے بسلسلۂ ملازمت لاہور آئے: 38 برس یہاں رہے اور ''مشاعروں میں شرکت کی وجہ سے بڑے بڑے مقتدر حضرات کے ساتھ دعوتوں میں شریک ہوتے رہے۔'' (صدائے احتجاج' صفحہ 73) ''صدائے احتجاج'' کراچی سے شائع کی۔
3. دیکھئے' صدائے احتجاج' صفحات 3 تا 10۔ دو سو صفحات کی کتاب میں مصنف اصرار اور تکرار سے علامہ اقبال کو قادیانی لکھتا رہا ہے۔
4. ایضاً' صفحہ 147۔

5. اس ضمن میں ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ "حال ہی میں سر اقبال کے محبوب بھتیجے اور ان کے محبوب بڑے بھائی عطا محمد قادیانی کے بیٹے اعجاز احمد قادیانی کی کتاب "مظلوم اقبال" شائع ہوئی ہے۔ اس میں انھوں نے بجا طور پر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سر اقبال قادیانی تھے اور ہمیشہ قادیانی رہے۔" (صدائے احتجاج' صفحہ 105)

6. مظلوم اقبال' صفحات 195 تا 199۔

7. شیخ اعجاز احمد نے اپنا موقف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"احمدیت کے متعلق علامہ کی رائے میں تبدیلی' جس کے لیے شاید قلبِ ماہیت کا لفظ زیادہ موزوں ہو' کی وجہ کانگریس احرار سازش کے تحت احرار کا دباؤ اور ان کی ریشہ دوانیاں تھیں۔ سازشیوں کی خوش قسمتی سے انہی دنوں ایک ذاتی معاملہ میں علامہ کا احساسِ محرومی بھی شامل ہوگیا' جس کی وجہ سے احمدیت کے خلاف ان کے بیانات میں وہ شدت اور تلخی در آئی جو عام طور پر ان کے شیوہ کے مطابق نہ تھی۔" (مظلوم اقبال' صفحہ 199)

مبینہ احساسِ محرومی کے ضمن میں شیخ اعجاز کا بیان ہے کہ:

"احرار کی خوش قسمتی سے انہی دنوں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے علامہ کو احمدیہ جماعت سے کشیدہ کرنے میں احرار کی مدد کی۔ سر فضل حسین وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن جون 32ء سے چار ماہ کی رخصت پر جانے والے تھے۔ ان کی جگہ عارضی تقرری کے لیے علامہ کا نام بھی لیا جا رہا تھا لیکن حکومتِ برطانیہ نے چودھری ظفر اللہ خان ایک احمدی کو مقرر کر دیا۔" (مظلوم اقبال' صفحہ 203)

شیخ اعجاز احمد کی بیان کردہ وجوہ سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال یقین کے جس مرتبے پر فائز تھے' چار ماہ کی کونسل کی رکنیت کا معاملہ ان کی قلبِ ماہیت کا باعث نہیں بن سکتا تھا۔ اس دور کے کلام پر نظر ڈالیں تو اقبال کی ذہنی سطح کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ نظم "دعا" میں کہتے ہیں:

راہِ محبت میں ہے کون کسی کا رفیق
ساتھ مرے رہ گئی' ایک مری آرزو!
میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر!
میرا نشیمن بھی تو' شاخِ نشیمن بھی تو!

شیخ اعجاز احمد کی یہ شکایت محلِ نظر ہے کہ اقبال کے بیانات میں احمدیت کے خلاف "شدت اور تلخی" ہے۔ شدت اور تلخی بلکہ دشنام طرازی مرزا غلام احمد کے بیانات میں ہے' ان کے خلاف جو جعلی نبوت کے منکر تھیں۔ (دیکھیے "ثبوت حاضر ہیں" ...... مرتبہ محمد متین خالد' صفحات 391 تا 394) جبکہ علامہ کی تحریروں میں عالمانہ وقار اور عمیق و بلند حقائق کا اظہار ہے۔

شیخ اعجاز احمد نے ڈاکٹر جاوید اقبال کو ایک نوٹ بھیجا تھا جسے انھوں نے ''زندہ رود'' میں شامل کر کے اس پر تبصرہ کیا اور انصاف کی بات یہ ہے کہ قادیانیت کے بارے میں اقبال کی تبدیلیِ رائے کے ضمن میں شیخ اعجاز احمد کی بیان کردہ دونوں مذکورہ وجوہ کو دلائل سے رد کر دیا۔ (دیکھیئے زندہ رود صفحات 578 تا 599) اس مفصل جائزے سے جو اقبال کی تحریروں اور دوسرے شواہد سے آراستہ ہے شیخ اعجاز احمد نے آنکھیں چراتے ہوئے وہی نوٹ ''مظلوم اقبال'' میں شامل کر دیا۔ جاوید اقبال نے اعجاز احمد کی بیان کردہ م ش کی ایک روایت کو ناقابلِ اعتماد ٹھہرایا تھا۔ اعجاز احمد نے اس کے جواب میں م ش کی یہ عبارت درج کی کہ ''میں نے جو روایت آپ کے سامنے بیان کی تھی میں نے اپنے کانوں سے حضرت علامہ اقبالؒ کی زبانِ اقدس سے سنی تھی۔'' (مظلوم اقبال صفحہ 207) روایت یہ تھی کہ جن دنوں میاں فضل حسین کے جانشین کے تقرر کا معاملہ زیرِ غور تھا لارڈ ولنگٹن وائسرائے ہند نے ایک ملاقات میں علامہ کو یہ کہہ کر کہ اب ہم اکثر ملتے رہیں گے سر فضل حسین کی جگہ اقبال کے تقرر کا اشارہ کر دیا تھا۔ چلیے یوں ہی سہی۔ لیکن کیا یہ اشارہ اس الزام کے لیے کافی ہے کہ اقبال ذاتی احساسِ محرومی کا شکار ہو کر قادیانیت کے خلاف ہو گئے تھے؟ جبکہ بقول شیخ اعجاز احمد ''اس میں جماعتِ احمدیہ کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔''

شیخ اعجاز احمد نے ''مظلوم اقبال'' کے 32 ویں باب میں زندہ رود پر تبصرہ کیا ہے لیکن قادیانیت کی بحث کو دادا جان ابا جان اور علامہ اقبال کی بیعت کے معاملے تک محدود رکھا ہے۔ ان کے نزدیک شیخ نور محمد نے مرزا قادیانی کی بیعت کی تھی لیکن 1902ء میں جماعتِ احمدیہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ شیخ عطا محمد ہمیشہ احمدی رہے اور علامہ اقبال نے کبھی بیعت نہ کی۔ (مظلوم اقبال صفحات 184 تا 191) قادیانیت کے ضمن میں جاوید اقبال نے علامہ اقبال کی تبدیلیِ رائے کی مبینہ وجوہ پر جو رائے زنی کی ہے اس سے اعجاز احمد نے تعارض نہیں کیا اور اگلے باب میں اپنا نوٹ شامل کر دیا ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اقبال کی تبدیلیِ رائے کے پس منظر میں احرار کا کوئی کردار ہے تو بھی اقبال کے نقطۂ نظر کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ شیخ اعجاز احمد کو علامہ اقبال کے بیان کردہ نکات پر بات کرنا چاہیے تھی جو وہ نہیں کر پائے۔ صرف اس بات کی تردید کی کہ احمدی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے برتر کسی نبوت کے قائل ہیں۔ یہ موقف بھی محلِ نظر ہے۔ بہر حال قادیانیت کے خلاف اقبال نے جو دلائل و شواہد پیش کیے ان میں وزن تھا اور وہ ناقابلِ تردید تھے۔ وہ دلائل و شواہد مختصراً حسب ذیل ہیں:

ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بناء نئی نبوت پر رکھے اور بزعم خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لیے ایک خطرہ تصور کرے گا اور یہ اس لیے کہ اسلامی وحدت ختم نبوت سے ہی استوار ہوتی ہے۔ (حرف اقبال صفحہ 104)

اسلامی ایران میں موبدانہ (The Magian) اثر کے ماتحت ملحدانہ تحریکیں اٹھیں اور انھوں نے بروز حلول ظل وغیرہ اصطلاحات وضع کیں...... حتیٰ کہ مسیحِ موعود کی اصطلاح بھی اسلامی نہیں بلکہ اجنبی ہے اور

اس کا آغاز بھی اسی موبدانہ تصور میں ملتا ہے۔ یہ اصطلاح ہمیں اسلام کے دورِ اوّل کی تاریخ اور مذہبی ادب میں نہیں ملتی۔(ایضاً' صفحہ 105)

o ایران میں بہائیوں نے ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلایا لیکن ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ الگ جماعت ہیں اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین کے خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن اسلام بحیثیت ملت کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شخصیت کا مرہونِ منت ہے۔ میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں۔ یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں یا پھر ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ قبول کر لیں۔(ایضاً' صفحہ 117)

o اگر کسی قوم کی وحدت خطرے میں ہو' تو اس کے لیے اس کے سوا چارۂ کار نہیں رہتا کہ وہ معاندانہ قوتوں کے خلاف اپنی مدافعت کرے۔ پھر کیا یہ مناسب ہے کہ اصل جماعت کو رواداری کی تلقین کی جائے' حالانکہ اس کی وحدت خطرے میں ہو اور باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو اگرچہ وہ تبلیغ جھوٹ اور دشنام سے لبریز ہو۔(ایضاً' صفحہ 107)

o بانیِ تحریک نے ملتِ اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے اور اپنے مقلدین کو ملتِ اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں ان کا بنیادی اصولوں سے انکار' اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی) مسلمانان کی قیامِ نماز سے قطعِ تعلق' نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ، اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دنیائے اسلام کافر ہے' یہ تمام امور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں---- میری رائے میں حکومت کے لیے بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان ان سے ویسی رواداری سے کام لے گا' جیسے وہ باقی مذاہب کے معاملے میں اختیار کرتا ہے۔ (ایضاً' صفحات 117-118' 109)

o مسلمانوں کے بے شمار فرقوں کے مذہبی تنازعوں کا ان بنیادی مسائل پر کچھ اثر نہیں پڑتا جن مسائل پر سب فرقے متفق ہیں' اگرچہ وہ ایک دوسرے پر الحاد کے فتوے ہی دیتے ہوں۔(ایضاً' صفحہ 107۔ اقبال کا بیان کردہ یہ نکتہ اس حقیقت کا مظہر ہے کہ پوری امتِ مسلمہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ قادیانی جماعت دائرہ اسلام سے خارج ہے۔)

8 اقبال لکھتے ہیں: ''مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ اس تقریر (خطبۂ علی گڑھ) سے بہت پہلے مولوی چراغ مرحوم نے جو مسلمانوں میں کافی سربرآوردہ تھے اور انگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے' بانیِ تحریک کے ساتھ تعاون کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے' کتاب موسومہ ''براہینِ احمدیہ'' میں انھوں نے بیش قیمت مدد بہم پہنچائی۔ لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اچھی طرح ظاہر ہونے کے

لیے برسوں چاہئیں۔تحریک کے دوگروہوں کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانی تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے' معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی۔ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت، بانیِ اسلام کی نبوت سے بالاتر نبوت' کا دعویٰ کیا گیا تھا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا...... درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔'' (حرفِ اقبال' صفحہ 112)

تاہم اس بیان کو ہدفِ اعتراض بنایا گیا۔اس ضمن میں شیخ اعجاز احمد رقمطراز ہیں:

''بانیِ سلسلۂ احمدیہ نے کبھی حضور رسالت مآبؐ کی نبوت سے برتر نبوت کا دعویٰ نہیں کیا، نہ کوئی احمدی بانی سلسلہ احمدیہ کو سرکار دو عالمؐ سے برتر یقین کرتا ہے۔حضرت محمد مصطفیٰؐ کو قرآنِ حکیم میں خاتم النبیین کہا گیا ہے اور انھیں خاتم النبیین تسلیم کرنا ہر احمدی کا جزوِ ایمان ہے۔حضور رسالت مآبؐ کی نبوت سے برتر نبوت کے دعوے کی تہمت احراریوں اور علامہ کے حاشیہ نشینوں نے ان کے عشقِ رسول کو Exploit کرتے ہوئے ان کو احمدیت کے خلاف بھڑکانے کے لیے تراشی اور علامہ نے اسے درست باور کر لیا...... اُن دنوں احمدیت کے خلاف ایسی ایسی بے بنیاد اور بے سروپا باتیں ان کے حضور بیان کی جاتیں اور باور کر لی جاتیں۔اس کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہا جائے:

غیروں سے کہا تم نے غیروں سے سنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا''

(مظلوم اقبال' صفحہ 208-209)

شیخ اعجاز احمد نے یہ بھی لکھا ہے کہ اقبال سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیتے تھے۔یہ بات جاوید اقبال کو بھیجے گئے نوٹ میں بھی درج تھی اور جاوید اقبال نے اس کی مناسب تردید بھی کر دی تھی۔(دیکھیے' زندہ رود' صفحات 587-588) شیخ موصوف نے عبدالمجید سالک کی یہ تحریر بھی درج کی ہے کہ ''1935ء میں مولانا ظفر علی خان اور مجلسِ احرار نے احمدیت اور احمدیوں کے خلاف ایک عام تحریک کا آغاز کیا...... خدا جانے علامہ اقبال نے کس عقیدت مند کی درخواست پر ایک مضمون لکھا جس میں بتایا کہ اس فرقہ کی بنیاد ہی غلطی پر ہے...... اور آخر میں حکومت کو یہ مشورہ دیا کہ اس فرقہ کو ایک علیحدہ جماعت تسلیم کر لے۔'' (مظلوم اقبال' صفحہ 206 / ذکرِ اقبال' صفحہ 210)

کشمیر کمیٹی میں قادیانیوں کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے اقبال ایک حتمی نتیجے تک پہنچ چکے تھے۔1935ء میں مرزائیت کے خلاف عام تحریک کا آغاز ہوا تو اقبال نے مزید خاموش رہنے کے بجائے اس مسئلے کے بارے میں سنجیدگی سے اپنا موقف بیان کر دیا۔یہ کسی عقیدت مند کی درخواست یا سنی سنائی بے سروپا باتوں کا

ردعمل نہیں تھا۔ ذاتی مشاہدے' مطالعے اور گہرے غور و فکر کا ماحصل تھا۔ افسوس ہے کہ سالک نے اس مقام پر کسی مصلحت سے کام لیا ہے اور شیخ موصوف نے اصل مسئلے کو قلم زد کر دیا ہے۔ اصل مسئلہ ''نئی نبوت'' کا تھا اور اس کے نتیجے میں ''مسلمانوں کو کافر'' قرار دینے کا۔ شیخ اعجاز احمد نے دونوں مسائل کو ایک طرف رکھ کر ''برتر نبوت'' پر اظہار خیال شروع کر دیا اور اس ضمن میں لکھ دیا کہ غیروں سے کہنے سننے کے بجائے اقبال شیخ موصوف سے رجوع کرتے تو وہ انھیں بتاتے کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت سے برتر نبوت کا عقیدہ رکھنے کا الزام احمدیوں پر تہمت ہے۔ کوئی شخص جب نئی نبوت کو مان لیتا ہے تو بڑی سے بڑی قباحت کا راستہ آپ سے آپ ہموار ہو جاتا ہے۔ ایک طرف حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین کہنا اور دوسری طرف مرزا غلام احمد کو کسی بھی قسم کا نبی ماننا صریح تضاد اور بہت بڑا دھوکا ہے۔ اقبال نے اس دھوکے کا پردہ چاک کیا ہے۔ برتر نبوت کے معاملے پر بحث بعد میں' پہلے بنیادی مسئلے یعنی نئی نبوت کے مسئلے پر اقبال کا موقف ایک مرتبہ پھر بیان کرنا مناسب ہے۔ اقبال لکھتے ہیں:

> ''وہ اجتماعی اور سیاسی تنظیم جسے اسلام کہتے ہیں مکمل اور ابدی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں ہے جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے' وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔ قادیانیوں کا اعتقاد ہے کہ تحریکِ احمدیت کا بانی ایسے الہام کا حامل تھا لہٰذا وہ تمام عالم اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔'' (حرفِ اقبال' صفحہ 127)

اس بیان میں کون سی بات بے بنیاد اور بے سروپا ہے اور ''احراریوں یا علامہ کے حاشیہ نشینوں'' کی تراشی ہوئی ہے۔ مرزا غلام احمد نے وحی والہام اور نبی ہونے کا دعویٰ بار بار کیا ہے اور مرزا بشیر الدین محمود نے مسلمانوں کو کافر بار بار کہا ہے۔ مثلاً مرزا غلام احمد نے لکھا ہے کہ ''میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے جو میرے اوپر نازل ہوا۔'' آگے نبوت کا دعویٰ ہے۔ ''اور میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اسی نے مجھے بھیجا ہے اور اسی نے میرا نام نبی رکھا ہے اور اسی نے مجھے مسیحِ موعود کے نام سے پکارا ہے اور اسی نے میری تصدیق کے لیے بڑے بڑے نشان ظاہر کیے ہیں، جو تین لاکھ تک پہنچتے ہیں۔'' (حقیقت الوحیٰ' صفحہ 387' روحانی خزائن: نمبر 22' صفحہ 502) مرزا بشیر الدین محمود نے لکھا ہے کہ ''ہر ایک ایسا شخص جو موسیٰؑ کو تو مانتا ہے مگر عیسیٰؑ کو نہیں مانتا یا عیسیٰؑ کو مانتا ہے مگر محمدؐ کو نہیں مانتا اور یا محمدؐ کو مانتا ہے پر مسیحِ موعود کو نہیں مانتا وہ نہ صرف کافر بلکہ پکا کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔'' (کلمتہ الفصل صفحہ 110 از مرزا بشیر الدین احمد ایم اے) مرزائی اس طرح کا لٹریچر غائب کر رہے ہیں لیکن محمد متین خالد نے ایسی سینکڑوں خرافات حوالوں اور اصل کتب کے عکس سمیت ''ثبوت حاضر ہیں'' میں جمع کر دی ہیں۔ (مذکورہ حوالوں کے لیے دیکھیے' صفحات 78-392,79) اقبال کو 1911ء میں قادیانی تحریک سے اچھے نتائج کی جو توقع تھی وہ درست نہیں تھی۔ اس کے برعکس تحریک نے نئی نبوت پر اصرار کیا اور عالم اسلام کو کافر قرار دے دیا۔

شیخ اعجاز احمد کا بیان ہے کہ حضور رسالت مآبؐ کو خاتم النبیین تسلیم کرنا ہر احمدی کا جزو ایمان ہے۔ نیز حضورؐ کی نبوت سے برتر نبوت کے دعوے کی تہمت احراریوں اور علامہ کے حاشیہ نشینوں کی تراشی ہوئی ہے اور اگر علامہ اقبال، اعجاز احمد سے رجوع کرتے تو وہ ان کی غلط فہمی دور کر دیتے۔ یہ باتیں مغالطے اور فریب پر مبنی ہیں اور اصل حقائق وہی ہیں جو اقبال نے بیان کیے ہیں۔ مرزا غلام احمد نے لکھا ہے کہ "یہ کس قدر لغو اور باطل عقیدہ ہے کہ ایسا خیال کیا جائے کہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وحیِ الٰہی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔" اور "یہ بات روزِ روشن کی طرح ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ کھلا ہے۔" نیز "میں بارہا بتلا چکا ہوں کہ میں بموجب آیت وَ آخرین منهم لما یلحقو بهم بروزی طور پر وہی نبی خاتم الانبیاء ہوں اور خدا نے آج سے بیس برس پہلے براہینِ احمدیہ میں میرا نام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رکھا ہے اور مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہی وجود قرار دیا ہے۔" مزید یہ کہ "میں آدمؑ ہوں، میں نوحؑ ہوں، میں داؤدؑ ہوں، میں عیسٰی ابنِ مریمؑ ہوں، میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں۔" (ثبوت حاضر ہیں، صفحات 153,82,81) گویا مرزا قادیانی تمام اکابر انبیاء کا مجموعہ ہے۔ یہ سب بکواس کیا احراریوں اور اقبال کے حاشیہ نشینوں کی تراشی ہوئی ہے؟

شیخ عبدالماجد نے، شیخ اعجاز احمد کی حمایت میں، بانیِ اسلام سے برتر نبوت کے دعوٰی کو اتہام قرار دیتے ہوئے بانیِ سلسلہ احمدیہ یا امامِ جماعت احمدیہ کی تحریروں کا ثبوت مانگا ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے "اقبال اور قادیانیت"..... صفحات 278-279) بانیِ سلسلۂ احمدیہ کی تحریریں درج کر دی گئی ہیں۔ امام جماعتِ احمدیہ کا بیان ہے: "یہ بالکل صحیح بات ہے کہ ہر شخص ترقی کر سکتا ہے اور بڑے سے بڑا درجہ پا سکتا ہے حتیٰ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی بڑھ سکتا ہے۔" (حضرت خلیفۃ المسیح مرزا بشیر الدین محمود کی ڈائری، اخبار الفضل قادیان نمبر 5، جلد 10، 17 جولائی 1922ء بحوالہ "ثبوت حاضر ہیں" صفحہ 163) خود شیخ عبدالماجد نے امام جماعتِ احمدیہ کا یہ پیغام نقل کیا ہے:

> "مشرقی پنجاب کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں..... ایک ایسا مذہبی راہنما مبعوث ہوا جس نے خدا کے اذن سے دورِ آخر میں ظاہر ہونے والے آسمانی مصلح ہونے کا دعویٰ کیا..... دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب کے پیروکار، کیا یہودی اور کیا عیسائی، کیا مسلمان اور کیا ہندو، کیا بدھ اور کیا زرتشتی اور کیا کنفیوشس کے ماننے والے سبھی اپنے اپنے مذہب کی راہ پر آخری زمانہ کے موعود مصلح کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ یہود کو بھی ایک مسیح کی انتظار تھی جس نے دورِ آخر میں ظاہر ہونا تھا اور عیسائیوں کو بھی ایک مسیح کی آمد کا انتظار تھا۔ مسلمان بھی ایک موعود مسیح کی آمد کے منتظر تھے..... ہر مذہب میں ایسی قطعی اور واضح پیش گوئیاں موجود تھیں کہ آخری زمانے میں سچائی کے عالمگیر غلبہ کی خاطر خدا تعالیٰ کسی مصلح کو ضرور بھیجے گا..... ایک ایسے موعود عالم کو مبعوث فرمانا تھا جو تمام مذاہب کے موعود مصلحین کی بھی نمائندگی کرتا، ثانیِ آدم کو ایک

عالمی وحدت کی لڑی میں پرو کر توحیدِ خالق کا ایک روح پرور نظارہ' توحیدِ خالق کے آئینہ میں دکھایا جائے۔''

(از پیغام حضرت امام جماعتِ احمدیہ برموقع احمدیہ صد سالہ جشن تشکر 1889ء۔ 1989ء' ''اقبال اور احمدیت''...... صفحات 83-84)

یہ پیغام حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغمبر آخر الزمان اور خاتم الانبیاء ہونے کا کھلم کھلا انکار ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن حکیم نے تصورِ توحید کامل طریقے سے پیش نہیں کیا اور ''توحید خالق کا روح پرور نظارہ'' جو ''بنی آدم کو ایک عالمی وحدت کی لڑی میں پرو'' سکتا ہے' مرزا قادیانی نے دکھایا ہے۔ اس ''پیغام'' میں ''برتر نبوت'' کے الفاظ بے شک نہیں ہیں لیکن یہ برتر نبوت کا صریح اور واضح اظہار و اعلان ہے۔ مرزا بشیر الدین نے اپنے پیغام میں مرزا قادیانی کے دعووں کی توثیق کی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نئی نبوت کس طرح ختم نبوت پر متصرف ہو جاتی ہے۔ برتر نبوت کے دعووں سے قطع نظر نبوت کی خاتمیت بجائے خود برتر نبوت ہے۔ اقبال اس فریب کا پردہ چاک کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''جب میں بانیِ احمدیت کی نفسیات کا مطالعہ ان کے دعویٰ نبوت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیغمبرِ اسلام کی تخلیقی قوت کو صرف ایک نبی یعنی تحریکِ احمدیت کے بانی کی پیدائش تک محدود کر کے پیغمبرِ اسلام کے آخری نبی ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے روحانی مورث کی ختم نبوت پر متصرف ہو جاتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ میں پیغمبرِ اسلام کا ''بروز'' ہوں۔ اس سے وہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام کا بروز ہونے کی حیثیت سے اس کا خاتم النبیین ہونا دراصل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا ہے۔'' (حرفِ اقبال' صفحہ 128)

اقبال قادیانیت کو' ایک حد تک' ابتدا سے سمجھتے تھے لیکن اس پر کبھی گہری نگاہ نہیں ڈالی تھی۔ کشمیر کمیٹی میں قادیانیوں کے ساتھ جب کام کرنے کا موقع ملا تو ان کے اعتقادی و نفسیاتی رویے سے براہِ راست آگاہی ہوئی۔ قادیانیت کے خلاف مسلم اضطراب بھی بڑھ رہا تھا' چنانچہ اقبال نے اس مسئلے پر پوری توجہ مبذول کی اور اس کے جملہ پہلوؤں کو اعلیٰ ترین علمی و فکری سطح پر بے نقاب کر دیا۔ اقبال نے 1935ء سے پہلے قادیانی جماعت کو کبھی غیر مسلم قرار نہیں دیا تھا۔ متعدد دوسرے اکابر نے بھی ایسا نہیں کیا تھا لیکن رفتہ رفتہ پوری امتِ مسلمہ کا اس پر عمومی اتفاقِ رائے ہو گیا کہ یہ جماعت دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اقبال نے جب اس رائے کا اظہار کیا تو اس کی معقول وجوہ بھی بیان کیں۔ اقبال نے جو حقائق پیش کیے وہ حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال کی تبدیلیِ رائے کو کسی کے دباؤ یا بھڑکانے یا ذاتی احساسِ محرومی کے کھاتے میں ڈال دینے سے حقائق نہیں بدل سکتے۔ اقبال کے بیان کردہ حقائق کا ثبوت قادیانی لٹریچر سے ملتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ قادیانی حضرات اپنے خود ساختہ نبی اور اپنی جماعت کے امام صاحبان کے دعووں کی تردید بھی

کرتے ہیں اور تائید و توثیق بھی کرتے جاتے ہیں۔

9. مظلوم اقبال' صفحہ 195۔

10. مثلاً دیکھئے ''علامہ اقبال اور احمدیت: تاریخی حقائق کے آئینے میں'' از نور احمد منیر اور ''احمدیت علامہ اقبال کی نظر میں'' از عبدالمالک۔

11. اقبال اور احمدیت: جناب جسٹس جاوید اقبال کی کتاب زندہ رود پر تبصرہ' صفحات 32-33۔

12. دیکھئے' محمد عبداللہ قریشی کا مضمون بعنوان ''آفتاب اقبال'' مشمولہ ''صحیفہ'' اقبال نمبر' اکتوبر دسمبر 1985ء صفحہ 19۔

13. بقول اقبال ''میرے والد صاحب کی دکان پر ابن عربی کی فصوص الحکم با قاعدہ پڑھی جایا کرتی تھی......مرزا غلام احمد صاحب قادیانی بھی اس صحبت میں شریک ہوا کرتے تھے۔ مجاز اور حقیقت کی داستان وہ ابنِ عربی سے سنتے رہے۔ یہی فلسفہ بعد میں انھوں نے حقیقی اور مجازی نبوت کی شکل میں پیش کیا۔ (ملفوظاتِ اقبال' صفحہ 143) 1900ء والے مقالے میں ابنِ عربی کا ذکر تین مرتبہ ہوا ہے اور محمد سہیل عمر کے الفاظ میں ''تینوں مقامات پر علامہ کی تحریر سے صراحتاً پتہ چلتا ہے کہ وہ شیخِ اکبر کو نہایت اعلیٰ درجے کے ایک مفکر اور عظیم روحانی شخصیت کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔'' (سیارہ' سالنامہ 95ء' صفحہ 37) مرزا غلام احمد کے استفادۂ ابنِ عربی کے لیے مزید دیکھئے' اقبال اور احمدیت مرتبہ بشیر احمد ڈار' صفحہ 11۔ شیخ نور احمد منیر نے لکھا ہے کہ ''کیا علامہ اقبال نے اپنے یہ الفاظ کبھی واپس لیے؟ ہرگز نہیں۔'' واضح رہے کہ اگلے سال یعنی 1901ء میں مرزا قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا اور 1902ء میں اقبال نے اس دعوے کو رد کر دیا۔ (تفصیل آ رہی ہے۔) اور کچھ عرصے بعد جب اقبال نے مذکورہ مضمون کو اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے میں ضم کیا تو مرزا غلام احمد کے لیے کہے گئے الفاظ اس میں شامل نہ کیے۔ کیا یہ ان الفاظ کی واپسی نہیں ہے؟

14. دیکھئے' سراج الدین پال کے نام اقبال کا خط مورخہ 19 جولائی 1916ء کلیاتِ مکاتیب اقبال' جلد اوّل' صفحہ 524۔

15. مثلاً مرزا جلال الدین نے لکھا ہے کہ ''ایک مرتبہ ہم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لکھنؤ گئے۔'' نیز سردار بیگم کے بارے میں لکھا ہے کہ ''یہ صاحبزادی وکٹوریہ گرلز سکول میں پڑھتی تھی۔'' یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ (دیکھئے' دوسرا باب: عنوان ''معاشقے اور رنگ رلیاں'') تاہم مرزا جلال الدین کا بیان کردہ مذکورہ واقعہ درست بھی ہو سکتا ہے۔ حکیم نور الدین نے نہ صرف اقبال کا بلکہ ان کی والدہ کا بھی کامیاب علاج کیا تھا۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے' ملفوظاتِ اقبال' صفحات 134-135) یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اس ذاتی تعلق کے علاوہ اقبال تب احمدیوں کو غیر مسلم تصور نہیں کرتے تھے۔ جو سوالات پوچھے تھے وہ فقہی و علمی تھے' ان کا تعلق قادیانیت سے نہیں تھا۔ (تفصیل کے لیے دیکھئے' علامہ اقبال اور احمدیت' نور احمد منیر' صفحات 12-13)

16. دیکھئے۔ (i) احمدیت علامہ اقبال کی نظر میں' عبدالمالک' صفحات 8-9۔ (ii) علامہ اقبال اور احمدیت' شیخ نور

احمد منیر' صفحات 21-22۔ کیا اصلی ماخذ سے بچنے کی وجہ یہ تو نہیں کہ منقولہ اقتباس کے بعد کی تحریر مرزائیت کا اصل راز فاش کرتی ہے؟

17۔ حرفِ اقبال' صفحات 132-133۔

18۔ مثلاً عبدالمالک اور شیخ نور احمد منیر نے دو مختلف ثانوی حوالوں سے ایک ہی عبارت کے دو تراجم نقل کیے ہیں۔ ''جہاں تک میں نے اس تحریک کے منشا کو سمجھا ہے ...... عقلی رنگ چڑھ جاتا ہے۔'' (احمدیت علامہ اقبال کی نظر میں: صفحہ 8' علامہ اقبال اور احمدیت: صفحات 21-22) موخر الذکر نے لکھا ہے کہ ''جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ کیا علامہ اقبال نے اپنی اس رائے کو کبھی غلط قرار دیا؟ علامہ موصوف وفاتِ مسیح اور مثیلِ مسیح کے مسئلے کو خاص اہمیت دے رہے ہیں اور ان اعتقادات کو معقولیت کی بنا پر درست قرار دے رہے ہیں۔'' اقبال نے مرزائیوں کے وفاتِ مسیح اور مثیلِ مسیح کے اعتقاد کے بارے میں لکھا ہے کہ ''اس خیال سے اس تحریک پر عقلی رنگ چڑھ جاتا ہے۔'' اس کو درست قرار نہیں دیا۔ جبکہ ان کا اپنا موقف لفظ ''لیکن'' کے بعد بیان ہوا ہے جس سے مرزائیت کی تردید ہوتی ہے۔

19۔ زندگی کے آخری دور میں اقبال نے ابلیس کی زبان سے کہا ہے:

ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟
ہیں صفاتِ ذاتِ حق' حق سے جدا یا عینِ ذات؟
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات؟
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟
کیا مسلماں کے لیے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟

(ابلیس کی مجلسِ شوریٰ: ارمغانِ حجاز)

شیخ نور احمد منیر نے لکھا ہے کہ سر سیدؒ' مفتی محمد عبدہ' مولوی چراغ علی' مولانا آزاد اور کئی دوسرے اکابر وفاتِ مسیح کے قائل تھے۔ (علامہ اقبال اور احمدیت' صفحہ 21) اب اگر اقبال وفاتِ مسیح کے قائل تھے تو اسے مرزا قادیانی کا جادو کیوں سمجھا جائے؟ تاہم جو بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اقبال مسیحؑ کی آمدِ ثانی کے قائل نہیں تھے لہٰذا کسی مسیح موعود کو ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

20۔ ''فکرِ اقبال اور تحریکِ احمدیہ'' کا آٹھواں باب اس بحث کا تکملہ ہے جو شیخ عبدالماجد اور ڈاکٹر وحید عشرت کے مابین ''مہارت'' میں چلی۔ اقبال کے خط بنام سر راس مسعود مورخہ 10 جون 1936ء کو شیخ عبدالماجد ''سراسر جعلی'' قرار دیتے ہیں (مہارت 11 مارچ 1993ء بحوالہ کتاب مذکور صفحہ 193) جبکہ مبینہ اصلی اور

جعلی خطوط کتاب کے صفحہ 198 پر درج کیے ہیں۔اس سے ظاہر ہے کہ موصوف کی اپنی پیشکش کے مطابق بھی خط ''سراسر جعلی'' نہیں ہے۔شیخ عبدالماجد کے دعوے کو درست مان لیا جائے تو بھی علامہ اقبال کے اس موقف میں کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مرزائی دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔غیر مسلم ڈورس احمد بھی تھیں جنھوں نے بچوں کی تربیت کی۔تاہم اگر اقبال' اعجاز احمد کی عیالداری ہی کے سبب انھیں سرپرستی سے ہٹانا چاہتے تھے تو ''نہایت صالح آدمی'' لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہاں ڈاکٹر وحید عشرت کی حمایت پیش نظر نہیں ہے۔ان کے بعض تحقیقی تسامحات حیران کن ہیں۔مثلاً ان کا دعویٰ ہے کہ اقبال نے 1914ء میں قادیانی جماعت کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا۔(دیکھیے (i) ''شاعر'' اقبال نمبر' بمبئی 1988ء' صفحہ 249 (ii) اقبالیات' جولائی ستمبر 1986ء' صفحہ 340 (iii) اقبال 86ء' مرتبہ ڈاکٹر وحید عشرت' صفحہ 439) وحید عشرت نے ''گفتارِ اقبال'' صفحہ 22 کا حوالہ دیا ہے جو غلط ہے۔موصوف نے بغیر تحقیق کیے بشیر احمد ڈار کے دیے ہوئے حوالے کو اختیار کر لیا۔ (دیکھیے' اقبال اور احمدیت' صفحہ 439) لیکن قادیانی حضرات بشمول شیخ عبدالماجد قادیانیت کی تقویت کے لیے بڑی بڑی جعل سازیاں کر رہے ہیں۔اقبال کا ایک مشہور جملہ ہے کہ

I have no doubt in my mind that the Ahmadies are traitors both to Islam and India. (thoughts and reflections of Iqbal, 306)

ملک اشفاق نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے: ''احمدیوں اور مسلمانوں میں زیادہ اختلافات نہیں ہیں' نہ ہی احمدی اسلام اور نہ ہی ہندوستان کے لیے دہشت گرد ہیں۔'' جدوجہد آزادی پر ایک نظر' ناشر فکشن ہاؤس' لاہور' 1999ء' صفحہ 175) ڈاکٹر وحید قریشی نے اس جعل سازی کا ذکر اپنے کالم میں کیا ہے۔''اقبال کشی کی مہم'' روزنامہ ''پاکستان'' 21 اپریل 2000ء)۔

شیخ عبدالماجد کے بقول شیخ اعجاز احمد نے 1931ء میں احمدیت قبول کی۔(فکرِ اقبال اور تحریکِ احمدیہ' صفحہ 199) وہ ''نہایت صالح آدمی'' پہلے سے تھے۔ان کی صالحیت کو قادیانیت کے کھاتے میں ڈالنا ستم ظریفی ہے۔

21 زبورِ عجم' صفحہ 2۔

22 ڈاکٹر جاوید اقبال نے سرسیّد کے موقف اور اقبال پر اس کے بالواسطہ اثرات کا ذکر کیا ہے۔(زندہ رود' صفحات 584-585) چنانچہ اقبال نے زیادہ تر قادیانیت کو نظر انداز کیا۔اپنے خط بنام مدیر ''پیغامِ صلح'' مورخہ 13 نومبر 1915ء میں اقبال نے مرزا قادیانی کی تصانیف سے آگاہ نہ ہونے کا ذکر کیا ہے۔واضح رہے کہ ''پیغامِ صلح'' مرزائیوں کا اخبار ہے۔(تفصیل کے لیے دیکھیے' کلیاتِ مکاتیب اقبال' جلد اوّل' صفحات 429-431)

23 مثلاً دیکھیے: شعر اقبال کا ہندوستانی پس منظر' مشمولہ ''اقبال اور اس کا عہد'' از جگن ناتھ آزاد۔نیز محب وطن اقبال' مظفر حسین برنی۔کچھ نکات و اشعار حسب ذیل ہیں:

1- جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے/ ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے (صدائے درد: بانگِ درا)

2- اقبال نے ''گایتری'' منتر کا ترجمہ کیا (آفتاب: بانگِ درا)

3- وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں/ چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں (سیّد کی لوحِ تربت: بانگِ درا)

4- پرونا ایک ہی تسبیح میں اِن بکھرے دانوں کو/ جو مشکل ہے، تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا (تصویرِ درد: بانگِ درا)

5- ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے/ سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں (نیا شوالہ: بانگِ درا)

6- ایک ہندو سوامی رام تیرتھ پر نظم لکھی۔

7- رام چندر جی پر نظم لکھی، جس میں رام کو ''امامِ ہند'' اور ''چراغِ ہدایت'' کہا۔ (رام: بانگِ درا)

8- ''اسرارِ خودی'' کے دیباچے میں سری کرشن اور سری رام نوج کی تحسین کی ہے۔

9- ''بانگِ درا'' کی نظم ''طلوعِ اسلام'' میں ذہنِ ہندی کی تعریف کی ہے۔

10- ''جاوید نامہ'' میں جہاں دوست (وشوامتر) کو ایک روحانی اور فلسفی راہنما کی حیثیت سے دکھلایا ہے۔

11- ''جاوید نامہ'' میں بھرتری ہری کی تعریف و توصیف کی ہے۔

12- بھرتری ہری کا شعر ''بالِ جبریل'' کی پیشانی پر درج کیا۔

24 تفصیل کے لیے دیکھئے ''مسیحِ موعود کی حقیقت'' مشمولہ تفہیم القرآن، جلد چہارم، صفحات 154 تا 166۔

25 یہ دلائل و شواہد ہیں۔ (1) مسلمانوں کی اسلام سے دوری دیکھ کر اقبال کا دل پکار اٹھتا: ''کاش کہ مولانا نظامی کی دعا اس زمانے میں مقبول ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پھر تشریف لائیں اور ہندی مسلمانوں پر اپنا دین بے نقاب کریں۔'' (2) ''جب دیکھتے کہ موجودہ زمانہ روحانیت کے اعتبار سے تہی دست ہے، تو فرماتے: لیکن تاریکی کا انجام سفید ہے۔ کیا عجب اللہ تعالیٰ جلد اپنا فضل کرے اور بنی نوعِ انسان کو پھر ایک دفعہ ''نورِ محمدی'' عطا کرے۔ بغیر کسی بڑی شخصیت کے اس بدنصیب دنیا کی نجات نظر نہیں آتی۔'' (3) اقبال نے اپنے خط محررہ 24 جنوری 1921ء بنام ڈاکٹر نکلسن پروفیسر میکنزی کے دو پیراگراف نقل کیے، جس نے لکھا تھا کہ ''ہمیں معلم بھی چاہیے اور پیغمبر بھی...... غالباً ہمیں ایک نئے مسیحا (A New Christ) کی ضرورت ہے۔'' (اقبال اور احمدیت، صفحہ 284) یہ باتیں پہلے شیخ اعجاز احمد نے لکھی تھیں۔ (مظلوم اقبال، صفحات 191-192)

اقبال کی پہلی تحریر 19 جولائی 1916ء کی ہے۔ (اقبال نامہ، حصہ اوّل، صفحہ 41) دوسری تحریر 3 جون 1920ء کی ہے۔ (مظلوم اقبال، صفحات 293-294) اور تیسری تحریر 24 جنوری 1921ء کی۔ (کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، جلد دوم، صفحات 230-231)

26 مندرجہ بالا تینوں تحریریں مرزا غلام احمد قادیانی کی وفات (1908ء) کے بعد کی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ''نظامی کی دعا''...... ''نورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم'' اور ''بڑی شخصیت''...... نیز ''پیغمبر'' یا ''نئے

مسیحا'' کا تعلق مرزا قادیانی سے نہیں ہے۔ اقبال نے مرزا موصوف کو نظر انداز اور رد کر دیا ہے۔ ممتاز حسن نے ایک مضمون ''اقبال ایک پیغمبر کی حیثیت سے'' کے زیر عنوان اقبال کی زندگی میں لکھا تھا۔ (اقبال معاصرین کی نظر میں' پہلا مضمون) اسی طرح عبدالرحمٰن بجنوری کا یہ جملہ بہت مشہور ہوا کہ ''اقبال ہمارے درمیان مسیح بن کر آیا ہے۔'' (ایضاً' صفحہ 375) لیکن لکھنے اور پڑھنے والوں نے اس کا مطلب ''پیغمبر'' یا ''مسیح'' نہیں لیا۔ اقبال بھی کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوئے۔ دراصل یہ ادبی اسالیب ہیں اور مرزائی حضرات کوئی حقیقی دلیل مرزائیت کے حق میں نہ پا کر ایسے الفاظ سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔

پروفیسر نکلسن کے نام طویل خط میں اقبال نے ''برتر انسان'' ...... ''بڑی شخصیت'' یا ''نائب حق'' کے تصور پر روشنی ڈالی ہے۔ (اصل متن کے لیے دیکھئے: Thoughts and Reflections of Iqbal صفحات 93 تا 102) یہ پوری تحریر ''اسرارِ خودی'' اور اس پر کیے گئے اعتراضات کے حوالے سے ہے۔ اقبال کے تصورِ مومن کو مرزا قادیانی سے منسلک کرنا خلطِ مبحث پیدا کرتا ہے۔

27۔28 ابتدائی کلامِ اقبال' صفحات 196 , 280۔

29. تفصیل کے لیے دیکھئے' ملفوظاتِ اقبال' صفحات 142-143۔

30 ''ایک غلطی کا ازالہ'' ...... صفحہ 10' روحانی خزائن جلد 18' صفحہ 212 ...... عکس کے لیے دیکھئے ''ثبوت حاضر ہیں'' ...... صفحہ 178۔

31 شیخ عبدالماجد نے ''اقبال اور احمدیت'' کے صفحہ 304 پر ایک مربع بنایا ہے۔ اقبال اور عطیہ فیضی کو محوِ گفتگو دکھا کر اور ''بروزی کیفیت'' کا عنوان جما کر اقبال کا یہ جملہ لکھا ہے: ''جب میرا ذوق جوش پر آتا ہے تو حافظ کی روح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میں خود حافظ بن جاتا ہوں۔'' (اقبال نامہ' حصہ دوم' صفحہ 106) سوال یہ ہے کہ کیا ''بروزی کیفیت'' یہی ہوتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو کیا حافظ اور اقبال ایک ہی شخصیت ہے یا دو الگ شخصیتیں؟ اگر یہ دو الگ شخصیتیں ہیں اور بروز اصل سے الگ ہوتا ہے تو کیا مرزا غلام احمد قادیانی کو ایسے ڈھکوسلوں کی بنیاد پر خاتم الانبیاء مانا جا سکتا ہے؟

32 اقبال نے 1902ء میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نبوت کو ''ہر مفہوم'' میں رد کر دیا۔ یہی کیفیت 1935ء کے مضامین کی ہے۔ اقبال بروزی نبوت کو بار بار رد کرتے ہیں۔ شیخ عبدالماجد کے الفاظ میں: ''1936ء میں اقبال نے پنڈت جواہر لال نہرو کو لکھا کہ سلسلۂ احمدیہ کے بانی کے دعویٰ کی بنیاد ''بروز'' پر ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔'' (فکرِ اقبال اور تحریکِ احمدیہ' صفحہ 386) ''حقیقت بھی یہی ہے'' شیخ عبدالماجد کے الفاظ ہیں۔ تاہم اقبال نے بروزی نبوت کو آڑے ہاتھوں لیا ہے اور اسے موبدیت کا بہروپ (Magian in disguise) قرار دیا ہے۔ (دیکھئے: Thoughts and Reflections of Iqbal صفحہ 268) واضح رہے کہ اقبال نے مذکورہ اظہارِ خیال 1935ء میں پنڈت نہرو کے سوالوں کے جواب میں کیا تھا۔ 27 مئی 1937ء کے اپنے مکتوب بنام پروفیسر الیاس برنی

میں اقبال لکھتے ہیں:

''قادیانی تحریک یا یوں کہیے کہ بانیِ تحریک کا دعویٰ مسئلہ بروز پر مبنی ہے۔ مسئلہ بروز کی تحقیق تاریخی لحاظ سے ازبس ضروری ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ مسئلہ عجمی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اصل اس کی آرین ہے۔ نبوت کا سامی تخیل بہت اعلیٰ اور ارفع ہے۔ میری رائے ناقص میں اس مسئلہ کی تاریخی تحقیق قادیانیت کا خاتمہ کرنے کے لیے کافی ہوگی۔''

(کلیاتِ مکاتیب اقبال' جلد چہارم' صفحہ 476۔ عکس' صفحہ 475)

گویا عقیدۂ بروز عقیدۂ تناسخ کے مترادف ہے۔ شیخ عبدالماجد نے اقبال کا آخری جملہ لکھ کر اقبال شناسوں کو بار بار مسئلہ بروز کی تحقیق کی دعوت دی ہے۔ (اقبال اور قادیانیت' صفحہ 300...... فکر اقبال اور تحریکِ احمدیہ' صفحہ 386) پاکستان کی کوئی یونیورسٹی ''بروز'' کے بارے میں ایم فِل کی سطح پر تحقیقی مقالہ تیار کرا لے تو بہتر ہے...... اگرچہ مرزائی پھر بھی مانیں گے نہیں۔ اہم اور اصل بات یہ ہے کہ مسئلہ بروز کا تعلق اسلام سے ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو اسے ثابت کرنے کے لیے تحقیق کا بار مرزائیوں پر ہے۔ گذشتہ ایک صدی کے دوران انھوں نے باتیں تو بہت بنائی ہیں لیکن کوئی ایسا تحقیقی مقالہ پیش نہیں کر سکے جو ''بروز'' کو اسلامی ثابت کرتا ہو۔ دراصل ایسا تحقیقی مقالہ پیش کرنا ناممکن ہے۔

قادیانی حضرات بشمول شیخ عبدالماجد الجھاؤ اور مغالطہ پیدا کرتے ہیں۔ اقبال کے تناظر میں اصل سوال یہ ہے کہ کیا اقبال نے زندگی کے کسی بھی حصے میں بروزی' حلولی یا ظلی نبوت کو مانا ہے یا نہیں۔ اس سوال کا جواب ہے کہ ''نہیں۔'' اقبال لکھتے ہیں:

''اسلامی ایران میں موبدانہ اثر کے ماتحت ملحدانہ تحریکیں اٹھیں اور انھوں نے بروز' حلول' ظل وغیرہ اصطلاحات وضع کیں تاکہ تناسخ کے اس تصور کو چھپا سکیں۔ ان اصطلاحات کا وضع کرنا اس لیے لازم تھا کہ وہ مسلمانوں کے قلوب کو ناگوار نہ گزریں' حتیٰ کہ مسیحِ موعود کی اصطلاح بھی اسلامی نہیں' بلکہ اجنبی ہے اور اس کا آغاز بھی اسی موبدانہ تصور میں ملتا ہے۔ یہ اصطلاح ہمیں اسلام کے دورِ اوّل کی تاریخ اور مذہبی ادب میں نہیں ملتی۔''

(حرفِ اقبال' صفحہ 105۔ اصل انگریزی متن کے لیے دیکھیے: Thoughts and Reflections of Iqbal۔ صفحات 250-251)

دیکھیے۔ (i) رختِ سفر' صفحہ 221۔ (ii) اقبال کا ابتدائی کلام' صفحہ 159۔

کلیاتِ اقبال فارسی' صفحہ 102۔ اشعار کا مفہوم یہ ہے کہ ہم پر شریعت اور ہمارے رسول پر خدا نے رسالت ختم کر دی۔ اب قیامت تک دنیا کی رونق ہماری وجہ سے ہے۔ رسولوں کا سلسلہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور اقوام کا ملتِ اسلامیہ پر ختم ہو گیا۔ ختم نبوت خدا کا احسان اور ناموسِ اسلام کا پردہ ہے۔ اسی عقیدے کے باعث ہمارے پاس سرمایۂ قوت ہے اور یہی عقیدہ ملی وحدت کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔

35 The Reconstruction of Religious Thought in Islam۔ صفحہ 101۔
اس جملے کا ترجمہ ہے: ''اسلام میں نبوت چونکہ اپنے معراجِ کمال کو پہنچ گئی لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا''...... علامہ اقبال کا استدلال قرآنِ حکیم کی اس آیت پر مبنی ہے: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا طـ ''آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔''

36 شیخ عبدالماجد کا یہ عنوان و سوال محلِ غور ہے: ''اقبال چالیس سال تک احمدیہ عقائد و نظریات سے متاثر رہے''/''اقبال نے ختم نبوت کے مسئلے کو زندگی اور موت کا مسئلہ کب اور کیوں بنایا؟ (دیکھیے' فکرِ اقبال اور تحریکِ احمدیہ' صفحات 434-447)

متنِ اقبال کو نظر انداز کر کے شیخ موصوف نے اقبال کا تعلق' ختم نبوت کے ضمن میں' احمدیہ عقائد و نظریات سے جوڑا ہے اور قیاس آرائیوں سے بات بنانے کی کوشش کی ہے۔ قیاس آرائیوں پر مبنی تحریروں کا سہارا لے کر' غلط بیانیوں کے بل بوتے پر' چھوٹی باتوں کو بڑا ظاہر کر کے اور انھیں بار بار دہرا کر اسالیبِ بیان کو من پسند مفہوم پہنا کر شیخ موصوف نے ایک نہیں دو کتابیں لکھ دی ہیں۔

37۔38 شیخ نور احمد منیر نے لکھا ہے: ''علامہ اقبال پر حضرت بانیِ احمدیت کی عظیم شخصیت کا نمایاں اثر تھا۔ آپ کے اشاعتِ اسلام کے جذبہ کو مشاہدہ کر کے وہ آغوشِ احمدیت میں آ جاتے ہیں۔ چنانچہ نوائے وقت 15 نومبر 1953ء میں تحقیقاتی عدالت کی کاروائی شائع ہوئی ہے۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ کے ڈائریکٹرز کے چیئرمین خواجہ نذیر احمد صاحب نے اپنے سابقہ بیان کی تصحیح کرتے ہوئے کہا:

> ''علامہ اقبال نے 1893ء یا 1894ء میں بیعت نہیں کی تھی جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے بلکہ 1897ء میں کی تھی۔ مجھے یہ واقعہ مولوی غلام محی الدین قصوری نے بار رُوم میں یاد کروایا جبکہ میں نے ان سے اس مسئلے پر بات چیت کی تھی' یہ بیان بتلاتا ہے کہ اقبال احمدی رہے ہیں اور انھوں نے بیعت بھی کی تھی۔'' (علامہ اقبال اور احمدیت' تاریخی حقائق کے آئینے میں)

شیخ عبدالماجد نے ''علامہ اقبال کی بیعت'' کا عنوان قائم کیا ہے اور اس ضمن میں ''دو آرا'' کا ذکر کیا ہے۔ ایک رائے قادیانیوں کی ہے جس سے دھوکا کھا کر بشیر احمد ڈار نے لکھا کہ ''ایک روایت کے مطابق اقبال نے 1892ء یا 1893ء میں مرزا غلام احمد کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔'' (اقبال اور احمدیت' صفحہ 9) عبدالماجد نے اسے ''اقبالیات کے عظیم سکالر'' کی رائے کے طور پر پیش کیا۔ اس کے بعد خواجہ نذیر احمد کی گواہی کا بیان ہے۔ اس ضمن میں ایک موٹا عنوان ان الفاظ میں قائم کیا ہے: ''کیا اقبال 1931ء تک قادیانی رہے؟''...... بعد ازاں ''لڑکپن کی بیعت'' کے زیرِ عنوان بیعت کی توثیق کی ہے اور لکھا ہے کہ اقبال نے اسے نبھایا نہیں البتہ 1897ء سے 1932ء تک جماعتِ احمدیہ سے ''سلسلۂ موانست و مواخات'' قائم

کیے رکھا۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے: ''اقبال اور احمدیت''۔ صفحات 38 تا 44)

39 تفصیل اور حوالے کے لیے دیکھیے' مظلوم اقبال' صفحات 189 تا 191۔

40 ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں: ''یہ نظم مخزن مئی 1902ء میں اس عنوان سے شائع ہوئی: ''خطِ منظوم (پیغام بیعت کے جواب میں)'' اسی عنوان سے پنجہ فولاد لاہور 14 جولائی 1902ء جلد 2 شمارہ 27 میں شائع ہوئی...... میرے پیش نظر جو قلمی کلام اقبال ہے اس میں ذیلی عنوان یہ ہے: (بہ جواب دعوت بیعت مرزا) اس سے یہ واضح ہو گیا کہ یہ دعوت بیعت مرزا غلام احمد قادیانی کی طرف سے تھی۔'' (ابتدائی کلامِ اقبال' صفحہ 163) مزید دیکھیے۔ (i) سرودِ رفتہ' صفحہ 103۔ (ii) معاصرین اقبال کی نظر میں' صفحات 232 تا 241۔

41 رختِ سفر' محمد انور حارث' صفحہ 40۔

42 اقبال اور احمدیت' صفحات 59-60۔

43 نور احمد منیر کا کہنا ہے کہ ''اقبال آغوشِ احمدیت میں آ جاتے ہیں۔'' یہ بھی لکھا ہے کہ خواجہ نذیر احمد کا ''بیان بتلاتا ہے کہ اقبال احمدی رہے ہیں۔'' خواجہ نذیر احمد کے بیانات مختلف ہیں۔ اس بیان میں تضاد بھی ہے کہ ''میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ علامہ اقبال قادیانی تھے۔ میں نے یہ کہا تھا کہ علامہ اقبال نے بیعت کی تھی۔'' (اقبال اور احمدیت' شیخ عبدالماجد' صفحہ 41) شیخ اعجاز احمد نے' جن کو عبدالماجد نے موٹے حروف سے ''صالح آدمی'' لکھا ہے (ایضاً' صفحہ 33) بیعت کی تردید کی ہے۔

44 اقبال اور احمدیت' صفحہ 168۔

45 شیخ عبدالماجد لکھتے ہیں کہ ''بانی تحریکِ احمدیہ کا وہ شعر جس سے مخالفین عام طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آپ نے جہاد کو دائمی طور پر حرام قرار دے دیا ہے، درج ذیل ہے: اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو کا خیال/ دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال۔ مخالفین اس سے ملحقہ اشعار کو نظر انداز کر دیتے ہیں...... فرما چکا ہے سیّد کونین مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم/ عیسیٰ مسیح جنگوں کا کر دے گا التوا۔ یعنی میری طرف سے جہاد کی دائمی حرمت کا فتویٰ نہیں ہے بلکہ التوائے جہاد کا فتویٰ ہے۔'' شیخ عبدالماجد نے خود مرزا قادیانی کے حسب ذیل اشعار نظر انداز کر دیے ہیں:

اب آ گیا مسیح جو دیں کا امام ہے
دیں کے تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
اب آسماں سے نورِ خدا کا نزول ہے
اب جنگ اور جہاد کا فتویٰ فضول ہے
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد
منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد

(تحفہ گولڑویہ ضمیمہ ص 42۔ مندرجہ روحانی خزائن جلد 17 ص 77-78 از مرزا قادیانی بحوالہ ''ثبوت حاضر

ہیں''۔صفحہ 750)

46 اقبال اور احمدیت'صفحہ 171۔

47 دیکھئے'سرودِرفتہ'صفحات 30 تا 38۔

48 ابتدائی کلام اقبال'مرتبہ ڈاکٹر گیان چند'صفحہ 157۔

49 ''التوا'' آخر کب تک اور کیوں؟ اس التوا کا خاتمہ ایک پوری صدی کے بعد بھی نہیں ہوا اور استعمار مرزائیت کا اسی طرح پشتی بان ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ دراصل ''التوائے جہاد'' شیخ عبدالماجد کی تاویل ہے ورنہ مرزا غلام احمد نے'مبینہ طور پر'''ممانعتِ جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔'' (تریاقِ القلوب'ص 28,27۔مندرجہ روحانی خزائن جلد 15'ص 155-156 از مرزا غلام احمد قادیانی۔ بحوالہ ''ثبوت حاضر ہیں''۔صفحہ 746) مرزائیت کا استعمار سے کتنا گہرا ربط ہے اس کا اندازہ بشیر احمد کی کتاب (Ahmadiyya Movement British-Jewish Connections) سے کیا جا سکتا ہے۔ اس موضوع پر یہ ایک چشم کشا کتاب ہے۔

50 اقبال اور احمدیت'صفحات 78-79۔

51 دیکھئے'کتابِ مذکور کا چوتھا باب اور زیرِنظر تصنیف کے دوسرے باب میں اس کا مفصل جائزہ''انگریز سرکار سے وفاداری'' کے زیرِعنوان۔

52 قادیانی حضرات نے اقبال کے مکتوب بنام ظفر احمد صدیقی مورخہ 12 دسمبر 1936ء سے'جنگ کے بارے میں'اقتباس نقل کر کے دعویٰ کیا ہے کہ'' علامہ اقبال کا موقف جہاد کے متعلق بھی بعینہ وہی تھا جو جماعتِ احمدیہ کا ہے۔'' (علامہ اقبال اور احمدیت: تاریخی حقائق کے آئینے میں'نور احمد منیر'صفحہ 22۔ نیز دیکھئے' احمدیت علامہ اقبال کی نظر میں'عبدالمالک' صفحات 9 تا 11...... مزید دیکھئے'اقبال اور احمدیت' شیخ عبدالماجد'صفحہ 169)

مذکورہ خط میں اقبال نے لکھا ہے کہ ''جوع الارض کی تسکین کے لیے جنگ کرنا دینِ اسلام میں حرام ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دین کی اشاعت کے لیے تلوار اٹھانا بھی حرام ہے۔'' (تفصیل کے لیے دیکھئے'اقبال نامہ' حصہ اوّل'صفحات 203-204) یہ واقعتاً اسلامی نقطہ نظر ہے لیکن جن صورتوں میں جہاد کی اجازت اور جہاد کا حکم ہے'اقبال اس کی تائید وحمایت کرتے ہیں جبکہ مرزا غلام احمد نے ایسی کوئی تائید وحمایت نہیں کی بلکہ جہاد کی کلی طور پر ممانعت کی ہے۔ اقبال پر بڑا اعتراض جنگ کی حمایت کا ہے۔ تبلیغ اور جوع الارض کے لیے اقبال کے نزدیک جنگ جائز نہیں ہے۔ یہ موقف وہی نہیں جو مرزائیت کا ہے۔ مرزائیت نے جہاد کو منسوخ کیا ہے جبکہ اقبال استبداد کے خاتمے کے لیے اسے ضروری خیال کرتے ہیں۔ اپنے دفاع اور سامراج سے آزادی کے لیے اقبال جہاد کی تلقین کرتے ہیں جبکہ مرزائیت کا یہ موقف نہیں ہے۔ نظم بعنوان''جہاد'' کے منتخب

اشعار گذشتہ اوراق میں نقل ہو چکے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ اقبال کا موقف مرزائیت کے برعکس ہے۔ مسلمانوں میں جہادی کلچر کے احیاء میں کلامِ اقبال کا نمایاں کردار ہے۔ جہاد سے متعلق اشعار کا نمونہ دیکھئے:

مرکبِ خاک و خوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے؟ تب و تابِ جاودانہ!

(کلیاتِ اقبال اردو' صفحہ 307)

یہ غازی یہ تیرے پُر اسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم' ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

(کلیاتِ اقبال اردو' صفحہ 397)

اُٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

(کلیاتِ اقبال اردو' صفحہ 415)

یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ!

(کلیاتِ اقبال اردو' صفحہ 472)

وہی ہے بندۂ حر جس کی ضرب ہے کاری
نہ وہ کہ حرب ہے جس کی تمام عیاری!

(کلیاتِ اقبال اردو' صفحہ 505)

سرور جو حق و باطل کی کار زار میں ہے
تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیے!
جہاں میں بندۂ حر کے مشاہدات ہیں کیا
تیری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیے!

(کلیاتِ اقبال اردو' صفحہ 515)

محمد عطاء اللہ صدیقی

علامہ اقبالؒ کے خلاف قادیانی پروپیگنڈا

ربِ کائنات اور رحمتہ للعالمین کی ہدایت و گواہی کے بعد اسلام اپنی صداقت اور حقانیت کے لیے کسی انسان کی حمایت وشہادت کا مکلف ومحتاج نہیں خواہ وہ حکمت اور دانش، قوت وعظمت اور فہم و بصیرت کے کتنے ہی بلند درجے پر فائز کیوں نہ ہو۔ مگر قادیان سے خانہ ساز نبوت کا پرچم لہرانے والے مرزا غلام احمد کی جماعت اپنے موقف کو سچا ثابت کرنے کے لیے کبھی چوہدری ظفر اللہ کی ''سیاسی بصیرت'' کا ڈھنڈورا پیٹتی ہے، کبھی ڈاکٹر عبدالسلام کے نوبل پرائز کو لہرا کر لوگوں کو غیر ضروری طور پر مرعوب کرنے کی کاوش میں مبتلا دکھائی دیتی ہے تو کبھی شاعرِ مشرق اور ان کے خاندان کے مرزا آنجہانی کے ساتھ ''گہرے تعلق'' کا ''سراغ'' لگا کر اس کی جھوٹی نبوت کے شجرِ خشک کو سیراب کرنے کی بے کار سعی میں ہلکان ہوتی نظر آتی ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے اشعار اور مضامین کے ذریعے مرزا غلام قادیانی کی جھوٹی نبوت پر وہ کاری ضربات لگائی ہیں کہ ان کی چوٹ سے قادیان و ربوہ کا پایۂ چوبیں آج بھی لرزہ براندام ہے۔ اقبال نے قادیانیت کے لیے ''برگِ حشیش، غارت گر، فتنۂ ملتِ بیضاء، یہودیت کا مثنیٰ، قوتِ فرعون کی در پردہ مرید، سٹہ باز، وغیرہ جیسے ہوش ربا الفاظ استعمال کیے۔ انھوں نے قادیانیوں کو ''اسلام اور ہندوستان دونوں کا غدار'' قرار دیا۔ اس لیے اگر علامہ اقبال ان قادیانی محققین کی کاوش ہائے ''تحقیق'' کا آئے دن نشانہ بنے رہتے ہیں تو یہ بات زیادہ تعجب انگیز نہیں ہے۔

اقبال کے خلاف پراپیگنڈہ کے اسباب

قادیانی مصنفین اپنے مخصوص مقاصد کی تکمیل کے لیے نہایت تواتر سے یہ دعویٰ کرتے رہتے ہیں کہ علامہ اقبال کا قادیانیت سے ''گہرا تعلق'' یا ''گہری وابستگی'' رہی ہے۔ ان کے خیال میں اقبال کی یہ گہری وابستگی 1932ء تک قائم رہی، بعد میں مجلسِ احرار کے زیر اثر اور کچھ اپنی ذاتی محرومیوں کی وجہ سے وہ قادیانیت کے شدید مخالف ہو گئے۔ اقبال کے قادیانیت سے اس ''گہرے تعلق'' کے ثبوت کے

طور پر وہ درج ذیل واقعات پیش کرتے ہیں۔

1- علامہ اقبال نے 1911ء میں خطبہ علی گڑھ میں قادیانی فرقہ کو ''اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ'' قرار دیا۔

2- اقبال نے مرزا غلام احمد قادیانی کے بارے میں کہا تھا کہ ''وہ غالباً ہندوستانی مسلمانوں میں سب سے بڑے دینی مفکر ہیں۔'' (اقبال اور احمدیت از شیخ عبدالماجد قادیانی)

3- 1897ء میں اقبال نے مرزا غلام احمد قادیانی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔

4- اقبال نے اپنے بڑے بیٹے آفتاب اقبال کو تعلیم الاسلام ہائی سکول قادیان میں دینی تعلیم کے حصول کے لیے بھیجا تھا۔

5- خاندان اقبال کی احمدیت اور بانی سلسلہ احمدیہ سے گہری وابستگی تھی۔

ان باتوں کے بیان کرنے سے قادیانی مصنف ایک سے زیادہ مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے پہلے تو وہ یہ گمراہ کن تاثر دینا چاہتے ہیں کہ قادیانی مذہب صداقت پر مبنی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اقبال جیسا حکیم الامت شاعر اتنا طویل عرصہ اس جماعت سے ''گہرا تعلق'' کیوں رکھتے؟ ان کا دوسرا مقصد اقبال کی شخصیت کے متعلق عوام الناس میں شکوک و شبہات پیدا کرنا ہے اور مسلمانوں کے دلوں میں اقبال اور فکر اقبال سے متعلق عقیدت و احترام کے جذبات کو ختم کرنا ہے۔ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اقبال مستقل مزاج دانشور نہ تھے، مذہب کے متعلق ان کی اپروچ محض سطحی تھی، وہ جذبات میں آ کر کسی گروہ کے خلاف ہو جاتے تھے، وغیرہ۔ ان کے خیال میں جب اقبال کی اپنی شخصیت مشکوک قرار پائے گی، تو اقبال کے ان مضامین کا عوام پر اثر باقی نہیں رہے گا جو انھوں نے 1935ء اور 1936ء کے دوران قادیانیت کے خلاف تحریر کیے تھے۔ یہ مضامین رد قادیانیت کے ضمن میں معرکتہ الآرا لٹریچر کا درجہ رکھتے ہیں، قادیانی ذہن شروع سے ان کے اثرات کو زائل کرنے کی تدابیر سوچنے میں مصروف رہا ہے۔

ایک عام شخص جس کا اقبال کے متعلق مبلغ علم بانگ درا، بالِ جبریل یا اسرار و رموز تک ہی محدود ہو اور وہ ان کی سوانح کے تمام پہلوؤں سے واقفیت نہ رکھتا ہو، یا وہ دیسی یہودیت یعنی قادیانیت کے پراپیگنڈہ کے ''اسرار و رموز'' کے بارے میں کچھ نہ جانتا ہو، وہ اگر ایسی باتیں پڑھ کر چکرا جائے اور اقبال سے اس کی عقیدت کا روحانی رشتہ متزلزل ہوتا نظر آئے تو اس میں حیرت کا شائبہ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اقبال اور قادیانیت کے حوالہ سے یہ وہ زہریلا پراپیگنڈہ ہے جس کا فسوں بہت سے لوگوں کے قلوب میں اوہام پیدا کر چکا ہے۔ وہ ذرا بھر کے لیے یہ سوچنے کو بھی تیار نہیں ہیں کہ ''بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست'' کا درس دینے والا اور ''خودی کا سرِ نہاں، لا الہ الا اللہ'' جیسے دلوں کو گرمانے

والے ترانوں کا حدی خواں، اقبال قادیانیت کے لیے ''ٹھیٹھ نمونہ'' جیسے الفاظ بھی کہہ سکتا ہے؟ کیا وہ مرزا غلام احمد کو عظیم ''دینی مفکر'' بھی کہہ سکتا ہے؟ قادیانی دانش بازوں کے یہ سوال ایسے نہیں ہیں کہ انھیں نظر انداز کر دیا جائے یا انھیں خود ساختہ بے بنیاد الزامات کہہ کر دل کو مطمئن کر لیا جائے۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ کیا قادیانی پراپیگنڈہ کا شکار ہو کر اقبال سے عقیدت کا تعلق توڑ لیا جائے؟ کلام اقبال جیسے عظیم تہذیبی ورثہ سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا جائے؟ کیا مان لیا جائے کہ اقبال وہ کچھ تھا جو قادیانی ہمیں دکھانا چاہتے ہیں؟ مجھے اعتراف کر لینا چاہیے کہ اقبال کی شخصیت کا یہ پہلو اس کے عام قاری کو ایک اچھی خاصی آزمائش میں مبتلا کر سکتا ہے۔ مگر یہ آزمائش اور امتحان کا مرحلہ محض اس وقت تک رہتا ہے جب تک ایک قاری اپنے آپ کو ''اقبال اور احمدیت'' کے مصنف کی جمع کردہ معلومات تک ہی محدود رکھتا ہے۔ اگر اس میں طلبِ صادق ہے اور وہ حقیقی معنوں میں ان سوالات کے صحیح جوابات تلاش کرنے میں ذرا بھر بھی سنجیدہ ہے، اگر وہ ملتِ اسلامیہ کے عظیم ترین شاعرانہ و تہذیبی ورثہ سے محض قادیانی مصنفین کی گواہی کی بنیاد پر محروم نہیں ہونا چاہتا تو پھر جلد ہی اصل حقائق اس پر منکشف ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے بعد اس کی وہی کیفیت ہوتی ہے جو قادیانیت کے ایک عام طالب علم کی اصل حقائق سے آگاہی کے بعد ہوتی ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ عبدالماجد یا اس طرح کا کوئی قادیانی مصنف اسے کہیں سرِ راہ مل جائے اور وہ اس کا گریبان پکڑ کر پوچھے، کہ اقبال جیسے عاشقِ رسول کو قادیانیت کے گند سے ملوث کرنے کی تو نے جسارت کیونکر کی؟ جسے تو نے حقائق بنا کر پیش کیا ہے، کذبِ صدق نما کی طرح کی باتیں ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

علامہ اقبال سے منسوب مندرجہ بالا واقعات و خیالات نہ تو سب کی سب جھوٹ اور ''بے بنیاد'' باتیں ہیں اور نہ یہ ''تاریخی شواہد'' اور ''تمام تر حقائق'' کا درجہ رکھتے ہیں۔ بعض معمولی سے واقعات کو قادیانی پراپیگنڈہ مشینری نے اپنی ابلاغی مہارت سے کام لیتے ہوئے ایک خاص رنگ میں پیش کرنے کی کاوش کی ہے۔ تفصیلات آگے آئیں گی، یہاں ہم مختصراً نہایت ذمہ داری کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان باتوں سے اقبال کا قادیانیت سے ''گہرا تعلق'' ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ 1911ء میں اقبال نے اپنے انگریزی خطبہ میں جن الفاظ کا استعمال کیا تھا، ان کا ترجمہ ''اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ'' درست نہیں ہے۔ اقبال نے 1897ء میں قادیان جا کر مرزا غلام احمد کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی۔ اقبال نے مرزا قادیانی کو ''دینی مفکر'' کبھی نہیں کہا۔ آفتاب اقبال کو قادیان تعلیم کے لیے علامہ اقبال نے نہیں، بلکہ ان کے بھائی شیخ عطا محمد نے بھیجا تھا۔ تازہ ترین حقائق کے مطابق خاندانِ اقبال میں سوائے شیخ اعجاز احمد کے کسی نے بھی قادیانی مذہب اختیار نہیں کیا۔ خاندانِ اقبال کے کسی دوسرے فرد نے کبھی بھی مرزا کی نبوت کے دعویٰ کو قبول نہ کیا۔ اقبال کا کچھ پڑھے لکھے قادیانیوں سے تو تعلق رہا، مگر قادیانیت سے ان کا

کبھی تعلق نہیں رہا۔ ان دونوں باتوں میں جو اصولی فرق ہے، اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اقبال نے جو کچھ کہا اس کا حقیقی مفہوم اس دور کے معروضی حالات کو پیش نظر رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے۔ اقبال سے منسوب ان باتوں کے مختصر جوابات ظاہر ہے عام قاری کے لیے مکمل تشفی کا باعث نہیں بن سکتے۔ لہٰذا اپنے اس دعویٰ کی تائید میں ہم نے ان تمام نکات کو ترتیب وار مفصل بیان کر دیا ہے۔ ان کو پڑھنے کے بعد قارئین کرام خود ہی فیصلہ کر لیں کہ اقبال کا قادیانیت سے کس حد تک تعلق تھا۔

اب آیئے ذرا دیکھتے ہیں کہ ان باتوں کا پس منظر اور حقیقت کیا ہے جس کی بنیاد پر قادیانی مصنف شیخ عبدالماجد اقبال کے قادیانیت سے ''گہرے تعلق'' کا دعویٰ کرتا ہے۔

1- ''اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ؟''

قادیانی فرقہ سے علامہ اقبال کے گہرے تعلق کو ثابت کرنے کے لیے قادیانی محققین اپنے فرسودہ تخیل کی پٹاری سے جو دلائل ڈھونڈنے میں کامیاب ہوئے ہیں ان میں ہماری نگاہ میں ''اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ'' والی دلیل سب سے زیادہ قابل توجہ ہے۔ اگر ہم اس معاملہ کے متعلق اقبال کے بارے میں مطمئن ہو جائیں تو دیگر دلائل سطح سمندر پر حباب کی مانند نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مضمون کا اچھا خاصا حصہ ہم نے اسی موضوع کے لیے مختص کیا ہے۔

جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، علامہ اقبال نے **1911**ء میں علی گڑھ میں **The Muslim Community - A Sociological Study,** کے عنوان سے ایک خطبہ دیا تھا۔ مولانا ظفر علی خان نے اس خطبہ کا اردو ترجمہ ''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' کے عنوان سے شائع کیا تھا، مگر اصل انگریزی خطبہ ناپید ہو گیا، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا بھلا ہو کہ وہ اپنی تحقیق کے دوران اقبال میوزیم سے اس عظیم الشان خطبہ کا پورا انگریزی متن ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ انھوں نے **1980**ء میں اسے دوبارہ شائع کرایا۔ ہاشمی صاحب کے بقول اصل خطبہ معدوم ہو چکا تھا۔ خود اقبال کے پاس بھی اس کی نقل محفوظ نہ تھی۔ ڈاکٹر رفیع الدین کو جو مسودہ ملا ہے، اس کے آغاز میں اقبال کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا وضاحتی شذرہ بھی ہے۔ یہ اس اعتبار سے بے حد اہم ہے کہ خود اقبال نے اپنے ہاتھ سے یہ وضاحت لکھ دی کہ اس خطبہ میں انھوں نے قادیانیت کے بارے میں جو کچھ کہا اس کا پس منظر کیا تھا۔

''مسلم کمیونٹی'' والے خطبہ میں ایک ادھورا جملہ ایسا ہے، جس سے قادیانی مصنفین نے اقبال کے خلاف اپنے پراپیگنڈہ کی عمارت کو استوار کرنا چاہا ہے۔ وہ جملہ یوں ہے:

"1n the Punjab, the essentially Muslim type of

character has found a powerful expression in the so-called Qadiani sect."

مولانا ظفر علی خان جو عربی اور فارسی زبان کے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ زبردست مترجم بھی تھے، نجانے کس کیفیت میں تھے کہ انھوں نے اس جملہ کا ترجمہ یوں کیا:

''پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت میں ظاہر ہوا ہے جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں۔''

مولانا کے ذوقِ نظر اور اردو محاورہ سے بے پناہ شغف نے ایسا رنگ دکھایا کہ ترجمہ میں محاورہ کا رنگ کچھ چوکھا ہی پڑ گیا۔ انہیں اگر ذرا برابر بھی خدشہ ہوتا کہ بعد میں قادیانی پراپیگنڈہ باز ان کے اس بامحاورہ ترجمہ کو قادیانیت کی تشہیر کے لیے یوں لے اُڑیں گے' تو وہ محاورہ بازی سے ضرور باز رہتے اور اردو زبان پر اپنے عبور کے اظہار کو کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھتے۔ مولانا کی روح سے ذرا معذرت کے ساتھ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اقبال کے خطبہ کے انگریزی الفاظ اور مولانا کے ترجمہ کردہ الفاظ میں تاثیر اور ابلاغ کے اعتبار سے بہت نمایاں فرق ہے۔ انگریزی الفاظ کے مقابلے میں ترجمہ کردہ الفاظ بے حد جاندار' بلیغ' تیکھے اور مؤثر ہیں۔ تاثر کا فرق اس قدر زیادہ ہے کہ جی چاہتا ہے کہہ دوں کہ یہ ترجمہ درست نہیں ہوا۔ مولانا اگر زندہ ہوتے تو شاید اس خطا گرفتنی پر ناک بھوں چڑھانے کے بجائے داد ضرور دیتے۔ میں **"Muslim type of character"** کا ترجمہ ''اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ'' کرنے کے متعلق تحفظات کا شکار ہوں اور ترجمہ کی صحت کو قبول کرنے میں تامل کا شکار ہوں۔ ان انگریزی الفاظ کے لیے ''اسلامی سیرت'' اور ''ٹھیٹھ نمونہ'' کی تراکیب دلکش اور بامحاورہ ہونے کے باوجود لفظی ترجمہ کی حدود سے بہت دور جا پڑی ہیں۔ میں ابھی تک یہ جاننے سے قاصر ہوں کہ مولانا نے اپنے جملہ میں ''جماعت'' کا لفظ کس انگریزی لفظ کے ترجمہ کے طور پر استعمال کیا۔ اسلامی لٹریچر میں ''سیرت'' کا لفظ عام طور پر ''سیرت النبیؐ '' کے مفہوم میں ادا ہوتا ہے' کسی گروہ کے لیے ''کردار'' ہی بہتر سمجھا جاتا ہے۔ قادیانی فرقہ کے لیے ''سیرت'' کا لفظ بارِ خاطر گراں گزرتا ہے' مزید برآں مولانا نے جملہ میں **So-called** کا ترجمہ ''نام نہاد'' شامل نہیں کیا۔ غالباً مولانا ظفر علی خان کے دماغ میں قادیانی فرقہ کے بارے میں ''اسلامی سیرت'' کی تراکیب استعمال کرتے ہوئے اس کے وہ مضمرات نہ تھے جو بعد میں ظاہر ہوئے۔ بعد میں قادیانیوں نے مولانا ظفر علی خان کے ان چار الفاظ کو اپنے حق میں اس طرح استعمال کیا کہ گویا اب اس کے بعد کسی اور صداقت کی سند کی انہیں حاجت نہیں رہی۔ شیخ عبدالماجد قادیانی نے اپنی کتاب ''اقبال اور احمدیت'' میں کم از کم 50 مقامات پر ان الفاظ کو دُہرا کر اقبال کو طعنہ

دیا ہے کہ 1910ء میں قادیانیت کو ''اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ'' کہنے والا اقبال 1935ء میں محض سیاسی مقاصد کے لیے اس پر شدید تنقید پر اتر آیا۔ اپنی مطلب براری کے لیے ان الفاظ کی تکرار قادیانی پراپیگنڈے کی ایک خاص ٹیکنیک کو ظاہر کرتی ہے جو معلوم ہوتا ہے انہوں نے یہودیوں سے سیکھی ہے۔

اقبال اور قادیانیت کے حوالہ سے شاید ہی کسی قادیانی کا کوئی مضمون یا کتاب ہو جس میں ''اسلامی سیرت'' اور ''ٹھیٹھ نمونہ'' کے الفاظ کا ذکر نہ پایا جاتا ہو۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جب جسٹس (ر) جاوید اقبال نے ''زندہ رود'' تحریر کی تو مولانا ظفر علی خان کے ترجمہ کو نقل کرنے کی بجائے اپنی جانب سے ان الفاظ کا ترجمہ ''خالصتاً مسلم کردار کا طاقتور مظہر'' کے الفاظ میں کیا جو نسبتاً بہتر ہے، لیکن راقم کو اس ترجمہ پر بھی کلیتاً اطمینانِ قلب نہیں ہے۔ جناب جاوید اقبال نے 'Essentially' کا ترجمہ ''خالصتاً'' کیا ہے، جو شاید قریب ترین تو ہے مگر حقیقی لفظی ترجمہ نہیں ہے۔ اس انگریزی لفظ کے لیے ''بنیادی طور پر'' یا ''بدیہی طور پر'' کے الفاظ زیادہ قریبی مفہوم ادا کرتے ہیں پھر انھوں نے 'Muslim type of character' کا ترجمہ ''مسلم کردار'' کیا ہے۔ راقم کی ناقص رائے میں یہ ترجمہ 'Muslim character' کا ہے، ''مسلم ٹائپ آف کریکٹر'' کا ترجمہ شاید تھوڑا سا مختلف ہونا چاہیے تھا، اس کے لیے ''مسلم طرز کا کردار'' کی ترکیب انگریزی الفاظ کے زیادہ قریب نظر آتی ہے بہرحال جاوید اقبال صاحب کی طرف سے ''مسلم کردار'' کے الفاظ مولانا ظفر علی خان کے ''اسلامی سیرت کے ٹھیٹھ نمونہ'' سے بدرجہا بہتر ہیں۔ میرے خیال میں ''طاقتور مظہر'' کے الفاظ بھی انگریزی الفاظ سے زیادہ قوی تاثر دیتے ہیں۔ مندرجہ بالا انگریزی جملہ کا ترجمہ اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے:

''پنجاب میں بنیادی اعتبار سے مسلم نوعیت کا کردار مؤثر طور پر نام نہاد قادیانی فرقہ میں ظاہر ہوا ہے۔''

سوال پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے خطبہ میں مسلم طرز کے کردار کے قادیانی فرقہ میں ظہور کی بات کس تناظر میں کی اور کیوں کی؟ ان سوالات کا جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم دیکھیں کہ اقبال نے اس خطبہ میں کن موضوعات پر اظہارِ خیال کیا۔ اقبال نے خطبہ کے تمہیدی کلمات میں خود ہی بیان کیا کہ وہ ''مسلم کمیونٹی'' کے بارے میں کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لیے تین بنیادی نکات پر اظہارِ خیال کرنا ضروری سمجھتے ہیں: یعنی

1- The general strurture of Muslim community.

2- The uniformity of the Muslim culture.

3- The type of character essential to a continuous

National life of Muslim community.

''نکتہ نمبر 1'' کے تحت مسلم کمیونٹی کی عمومی ساخت بیان کرتے ہوئے اقبال نے کہا کہ مسلم قوم اور دیگر اقوامِ عالم کے درمیان بنیادی فرق ہمارا مخصوص تصورِ قومیت ہے۔ زبان، ملک یا معاشی مفادات کی وحدت ہماری قومیت کی بنیاد نہیں ہیں، ہماری بنیاد اس تصور پر مبنی ہے کہ ہمارا کائنات کے متعلق نظریہ ایک ہے اور ہم اس سوسائٹی کے ارکان ہیں جس کی بنیاد پیغمبرِ اسلامؐ نے ڈالی تھی۔ اقبال نے نہایت وضاحت سے بیان کیا کہ علاقائی یا وطنی قومیت کا تصور اسلام سے میل نہیں کھاتا۔ انھوں نے وطنی قومیت کے تصور کو بت پرستی سے تشبیہ دیتے ہوئے اس کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اقبال نے فرمایا کہ درحقیقت تمام قوموں میں ایک خاص نوعیت کی بنیاد پرستی (Fanaticism) پائی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آپ ایک فرانسیسی کے مذہب پر تنقید کریں، وہ اس کا زیادہ بُرا نہیں منائے گا۔ مگر آپ اس کے وطن، تہذیب اور قومی رویہ پر معمولی سی تنقید کریں تو وہ بھڑک اٹھے گا۔ انھوں نے کہا کہ ایک مسلمان کے جذبات اس کے مذہب پر تنقید سے برانگیختہ ہوتے ہیں، کیونکہ اس کی عصبیت کی بنیاد مذہب ہے نہ کہ وطن۔ اقبال نے بتایا کہ اسلام کی اہمیت ہمارے لیے محض ایک مذہب کی نہیں ہے، یہ ہمارے لیے ایک قومی مفہوم بھی رکھتا ہے۔ لہٰذا اسلامی اصولوں پر ایمان لائے بغیر ہماری سماجی زندگی ناقابلِ تصور ہے۔ مذہب ہمارے لیے تمام چیزوں سے اعلیٰ و برتر معاملہ ہے۔

''نکتہ نمبر 2'' کے ضمن میں اقبال نے فرمایا کہ یہی عقیدے کی وحدت جس پر ہماری سماجی زندگی انحصار کرتی ہے، مسلم کلچر کی وحدت سے تقویت پاتی ہے۔ محض اسلامی اصولوں پر ایمان ہی کافی نہیں ہے۔ اجتماعی زندگی میں بھرپور شرکت کے لیے ایک فرد کا ذہن مکمل انقلاب سے گزرتا اور مختلف اسلامی اداروں سے تشکیل پاتا ہے۔ ہمارا کلچر نسبتاً آفاقی نوعیت کا ہے، یہ کسی خاص علاقے کے لوگوں پر انحصار نہیں کرتا۔ مسلمانوں کے کلچر کی تشکیل میں ایران کا ذکر کرتے ہوئے اقبال نے ایران کی فتح کو اسلامی تاریخ کا اہم ترین واقعہ قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا مسلم کلچر سامی اور آریائی تہذیبوں کے امتزاج سے پروان چڑھا ہے۔ مسلم معاشرے کا رکن بننے کے لیے ایک فرد کے لیے ضروری ہے کہ وہ مذہبی اصول پر غیر مشروط ایمان رکھتا ہو اور اسے چاہیے کہ وہ اسلامی کلچر کو اپنے اندر مکمل طور پر جذب کرے۔ اس انجذاب کا مقصد یہ ہے کہ ایک متفقہ ذہنی نکتہ نظر پیدا کیا جائے، ایک متعین مطمحِ نظر جس کی روشنی میں ان مخصوص اقدار کا ادراک کیا جائے جو ہمیں بحیثیت قوم دوسری اقوام سے ممتاز کرتی ہیں اور ایک مسلمان کی اس انداز میں ماہیتِ قلبی کرتا ہے کہ جس کے پیشِ نظر ایک مخصوص مقصد اور نصب العین ہو۔ اقبال نے انجذاب کے ان مقاصد کی تکمیل کو ''بنیادی طور پر مسلم طرز کا کردار'' **Essentially**

Muslim type of character کا نام دیا۔ یہ Phrase زیر بحث امور کو سمجھنے کے لیے ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔

اقبال نے قادیانی فرقہ کا ذکر نکتہ نمبر 3 کی وضاحت کے ضمن میں کیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس نکتہ کا مکمل متن سامنے رکھنے کے بعد اس پر بات کی جائے تاکہ اس بات کا سیاق وسباق دیکھتے ہوئے اقبال کے منشاء کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ انھوں نے کہا:

"The third point need not detain us long. The above remarks indicate the principal features of an essentially Muslim type of character. The various types of character, however, that become popular in a community do not appear haphazard. Modern Sociology teaches us that the moral experience of nations obeys certain definte laws. In primitive societies where the struggle for existences is extremely keen and draws more upon man's physical rather than intellectual qualities it is the valiant man who becomes an object of universal admiration and imitation. When, however, the struggle relaxes and the peril is over, the valorous type is displaced, though not altogether, by what Giddings calls the convivial type, which takes a due share in all the pleasures of life and combines in itself the virtues of liberality, generosity and good fellowship. But these two types of character have a tendency to become reckless and by way of reaction against them appears the third great type which holds up the ideal of self control, and is dominated by a more serious view of life. In so far as the evolution of the Muslims community in India is concerned. Temur represented the first type, Babar combined the first and the second. Jahangir embodied pre-eminently the second, while the third type was foreshadowed in Alamgir whose life and activity forms, in my opinion the starting point in the growth of the Muslims nationality in India. To those whose knowledge of Alamgir derived from the Western interpreters of Indian history, the name of Alamgir is asociated with all sorts of cruelty, intolerance, treachery and political intrigue. I shall be drifting

away from the main point of this lecture if I undertake to show, by a right interpretation of contemporary history, the legitimacy of motives that guided Alamgir's political life. A critical study of his life and times has convinced me that the charges brought against him are based on a misinterpretation of contemporary facts, and a complete misunderstanding of the name of social and political forces, which were then working in the Muslims State. To me the ideal of character, foreshadowed by Alamgir is essentially the Muslim type of character, and it must be the object of all our education to develop that type. If it is our aim to secure a continuous life of the community, we must produce a type of character, which at all costs, holds fast to its own, and while it readily assimilates all that is good in other types, it carefully excludes from its life all that is hostile to its cherished traditions and institutions. A careful observation of the Muslim Community in India reveals the point on which the various lines of moral experience of the community are now tending to converge. In the Punjab the essentially Muslims type of character has found a powerful expression in the so-called Qadiani-sect: while in the United Provinces, owing to a slightly different intellectual environment, the need of such a type of character is loudly proclaimed by a great poetic voice. In his light-hearted humour Maulana Akbar of Allahabad, aptly called the tongue of the times, conceals a keen perception of the nature of the forces that are at present working in the Muslim Community. Do not be misled by the half-serious tone of his utterances; he keeps his tears veiled in youthful laughter, and will not admit you into his workshop until you come with a keener glance to examine his wares. So deeply related are the currents of thought and emotion in a homogeneous community that if one portion reveals a certain organic craving the material to satisfy that craving is almost simultaneously produced by the other."

(تصانیفِ اقبال از ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صفحہ 498-499)

''تیسرے نکتہ'' کے ضمن میں اقبال نے جدید عمرانی علوم کی روشنی میں تاریخی ارتقاء کے اعتبار سے اقوام کو تین مختلف درجات (Types) میں تقسیم کیا۔ وہ کہتے ہیں تمدن کی بالکل ابتدائی شکل وہ ہوتی ہے جہاں جہد للبقاء بہت اہمیت رکھتی ہے، اس میں انسان کی عقلی صلاحیتوں کے مقابلے میں جسمانی طاقت زیادہ قابلِ اعتناء ہوتی ہے۔ اس دور میں تشدد پسند انسان ہی ''نمونہ'' سمجھا جاتا ہے۔ پھر جب جہد للبقاء کی کشمکش ڈھیلی پڑتی ہے تو قوموں کے کردار کی دوسری شکل سامنے آتی ہے، اس میں تشدد اور عسکریت پسندی میں کافی حد تک کمی واقع ہوتی ہے۔ زندگی سے لطف اٹھانے کا داعیہ تو ہوتا ہے، آزاد پسندی، فیاضی اور باہمی مصاحبت کے اوصاف سامنے بھی آتے ہیں۔ البتہ پہلی اور دوسری صورتوں میں جبر کا رجحان باقی رہتا ہے۔ ان کے ردعمل میں قوموں کے کلچر کی تیسری عظیم صورت رونما ہوتی ہے جس میں ضبطِ نفس کو نصب العین سمجھا جاتا ہے اور اس عرصہ کے دوران زندگی کے متعلق سنجیدہ اور پختہ نکتہ نظر تشکیل پاتا ہے۔ اقبال انڈیا میں مسلم کمیونٹی کے ارتقاء کی مثالیں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تیمور پہلی ٹائپ کا نمائندہ تھا، بابر میں پہلی اور دوسری صورتوں کا امتزاج تھا جبکہ تیسری صورت کی مثال ہمیں عالمگیر میں ملتی ہے جو کہ انڈیا میں مسلم کمیونٹی کے ارتقاء کا نقطہ آغاز تھا۔ اس کے بعد کی سطور ''ٹھیٹھ نمونہ'' والے جملہ سے فوراً پہلے آتی ہے، اس لیے ہم یہاں ان کا لفظ بہ لفظ ترجمہ پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں:

''عالمگیر کی حیات اور اس کے دور کے ناقدانہ مطالعہ کے بعد میں قائل ہو گیا ہوں کہ اس کے خلاف عائد کردہ الزامات عصری حقائق کی غلط تعبیر اور اُس وقت کی مسلم ریاست میں سیاسی اور سماجی قوتوں کے متعلق غلط رائے قائم کرنے پر مبنی ہیں۔ میرے نزدیک وہ مثالی کردار جو عالمگیر کی شکل میں نمودار ہوا، ''اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ'' (مولانا ظفر علی خان کا ترجمہ) ہے اور ہماری تمام تعلیم کا مقصد ہی یہ ہونا چاہیے کہ وہ اس طرز کے کردار کو فروغ دے۔ اگر ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم ملت اسلامیہ کی حیات کے تسلسل کا تحفظ کریں، ہمیں ایک ایسی طرز کا کریکٹر پیدا کرنا چاہیے جو کہ ہر قیمت پر قائم رہے، یہ دوسری اقوام کے اچھے اوصاف کو اپنے اندر جذب ضرور کرے مگر اسے اپنی اجتماعی حیات سے ان عناصر کو نکال باہر کرنا چاہیے جو ہماری محبوب روایات اور اداروں سے متصادم ہوں۔ ہندوستان میں مسلمان معاشرے کا ایک محتاط مشاہدہ ایک خاص مرکزی نقطہ کو ظاہر کرتا ہے کہ جس پر امت کے مذہبی تجربے کی مختلف شکلیں مرتکز ہونے کا میلان ظاہر کر رہی ہیں۔ پنجاب میں بنیادی طور پر مسلم طرز کا کردار (اسلامی سیرت کے ٹھیٹھ نمونہ۔ ظفر علی خان) موثر انداز میں نام نہاد قادیانی فرقہ میں ظاہر ہوا ہے۔''

فقرہ ابھی مکمل نہیں ہوا۔ اس جملہ کا سیاق سمجھنے کے لیے اس کے بعد آنے والی سطور کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے:

......جبکہ یو پی میں، نسبتاً مختلف فکری فضا کی بناء پر، ایک عظیم شاعرانہ آواز کی طرف سے اس طرز کے کریکٹر کی ضرورت کی صدا بلند کی جارہی ہے۔ مولانا اکبرالہ آبادی جنھیں بجاطور پر لسان العصر کہا جاتا ہے، نے اپنے ہلکے پھلکے مزاحیہ کلام میں مسلم کمیونٹی میں کارفرما عناصر کی نوعیت کو لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اکبرالہ آبادی کے نیم سنجیدہ لہجہ کے متعلق غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے، وہ اپنے بھرپور قہقہہ میں آنسوؤں کی مالا چھپائے رکھتے ہیں اور وہ اپنے خیالات سے مزین دکان میں اس وقت تک داخلہ کی اجازت نہیں دیتے جب تک کہ انھیں یقین نہ ہو جائے کہ آپ ان کی اشیاء کے سنجیدہ خریدار ہیں۔ باہم متجانس مسلم کمیونٹی میں خیالات اور جذبات کی لہریں اس حد تک باہمی طور پر منسلک ہیں، کہ اگر ایک حصہ ایک مخصوص نامیاتی تجسس کو ظاہر کرے تو اس تجسس کی تسکین کے لیے دوسرا حصہ بیک وقت مواد پیدا کرتا ہے۔'' (تصانیفِ اقبال صفحہ 499)

قارئین کرام، آپ دیکھ سکتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اپنے خطبہ میں منطقی ترتیب کے ساتھ پہلے مسلم کمیونٹی کے عمومی ڈھانچے کا علمی تجزیہ پیش کیا، پھر مسلم کلچر میں قدرِ اشتراک کی نشاندہی فرمائی، اس کے بعد مسلمانوں کی قومی زندگی کے تسلسل کے لیے مخصوص طرز کے کردار کی تشکیل پر تفصیل سے روشنی ڈالی، دوسرے نکتہ کے آخری حصہ میں انھوں نے ''مسلم ٹائپ کے کریکٹر'' کی وضاحت کی۔ انھوں نے اس کریکٹر کے لیے مذہبی اصولوں پر غیر مشروط ایمان اور اسلامی کلچر میں انجذاب کو ضروری قرار دیا، ان کی رائے میں مسلم ٹائپ کریکٹر ایک مخصوص آفاقی تصور اور نصب العین رکھتا ہے جو ملت اسلامیہ کو دیگر اقوام سے خصوصی امتیاز عطا کرتا ہے۔ قوموں کے کردار کی تین مختلف صورتیں بیان کرنے کے بعد علامہ اقبال نے برصغیر کی مسلم تاریخ سے شہنشاہ عالمگیر کے کردار کو آئیڈیل ''مسلم ٹائپ کریکٹر'' کا نام دیا۔ اس کے بعد انھوں نے پنجاب میں اس طرز کے کردار کے ظاہر ہونے کو امکانات کے طور پر قادیانی فرقہ کا نام لیا۔ ابھی قادیانی فرقہ کا نام ہی لیا تھا کہ فوراً لسان العصر اکبرالہ آبادی کا تذکرہ فرمایا۔ ظفر علی خان کے الفاظ کو مستعار لیا جائے تو یوں کہا جانا چاہیے کہ ''اسلامی سیرت کے ٹھیٹھ نمونہ'' کا ان کی نگاہ میں حقیقی مصداق عالمگیر اورنگ زیب اور ان کے دور کا مسلم کلچر تھا۔ اسے وہ آئیڈیل قرار دیتے ہیں اور پھر اکبرالہ آبادی جس مسلم کلچر کے احیاء کے لیے اپنی شاعری کو بروئے کار لا رہے تھے، وہ کلچر بھی اقبال کے خیال میں عالمگیر کے دور کا کلچر ہی تھا۔ یہاں تک تو بات خوب تھی، مگر چلتے چلتے انھوں نے ''قادیانی فرقہ'' کا تذکرہ بھی کردیا جسے تاریخ کے صفحات نے محفوظ رکھا، اصل سخن درایں است'' والا معاملہ اس خطبہ کے اس

ادھورے جملے نے پیدا کیا ہے۔ اقبال کی زبان سے عالمگیر اور اکبر الٰہ آبادی کے سیاق وسباق کے ساتھ درمیان میں ''قادیانی فرقہ'' کا ذکر نہ صرف توجہ طلب ہے بلکہ بہت سوں کے لیے آج بھی حیران کن ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلم ٹائپ کے کردار کی مثالیں دیتے ہوئے اقبال ''قادیانی فرقہ'' کو بیچ میں کیوں گھسیٹ لائے؟ ؎ چہ نسبت ایں خاک را بہ عالم پاک۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے ہم اقبال کو موقع دیں کہ وہ خود اس کا جواب دیں بعد میں ہم اس دور کے معروضی حالات کی روشنی میں اقبال کے اس بیان کی عقلی ونقلی توجیہ پیش کریں۔

اقبال کی وضاحت

اقبال کی طرف سے محولہ بالا مضمون پر فوری طور پر دو حوالہ جات راقم کے سامنے ہیں، ممکن ہے ان کے اور بھی بیانات ریکارڈ پر ہوں لیکن اس کا علم راقم کو نہیں ہے۔ بیان کے اہم جملے حسب ذیل ہیں:

1- ''مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں ظاہر نہیں ہو جاتی۔ اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہیے۔

2- ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت، پیغمبرِ اسلام سے بھی برتر (نعوذ باللہ) کا دعویٰ واضح طور سے پیش کیا گیا اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔

3- بعد میں میرا یہ شبہ، یقین میں اور رغبت بغاوت میں اس وقت بدل گیا جب میں نے اپنے کانوں سے تحریک کے ایک پیرو کو پیغمبرِ اسلامؐ کا تذکرہ سخت تحقیر آمیز زبان میں کرتے ہوئے سنا۔

4- کسی درخت کی جڑوں سے نہیں بلکہ اس کے ثمر سے آپ اس کی حقیقت کو پہچان سکتے ہیں۔

5- اگر میرا موجودہ رویہ میری اپنی تردید کرتا ہے تو صرف زندہ اور سوچنے والے انسان ہی کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ اپنی تردید آپ کر سکے۔ صرف پتھر ہی اپنی تردید آپ نہیں کر سکتے۔''

''مسلم کمیونٹی'' والے خطبہ کی وضاحت کے متعلق دوسرا حوالہ اقبال کا وہ وضاحتی شذرہ ہے جو آپ نے اس کے اصل مسودہ پر نظر ثانی کرتے ہوئے اپنے ہاتھ سے 21 اکتوبر 1935ء کو تحریر کیا۔ اس شذرہ کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:

''کتاب تصانیف اقبال صفحہ نمبر 491''

ترجمہ: ''یہ لیکچر 1911ء میں علی گڑھ میں دیا گیا تھا۔ اس لیکچر میں قادیانیوں کے بارے میں ریمارکس پر 1911ء کے بعد سے اس تحریک کی اصل روح کے متعلق انکشافات کی روشنی میں نظر ثانی کی جانی چاہیے۔ قادیانی اب بھی ظاہری طور پر مسلمان دکھائی دیتے ہیں۔ درحقیقت وہ اپنے ظاہری معاملات کے بارے میں خاص طور پر محنت کرتے ہیں۔ لیکن اس تحریک کی روح جو اکثر ظاہر ہوتی رہتی ہے، مکمل طور پر اسلام دشمنی پر مبنی ہے۔ بظاہر وہ مسلمان دکھائی دیتے ہیں اور ایسا نظر آنے کے لیے بے تاب بھی رہتے ہیں، لیکن اندرونی طور پر ان کی تمام ذہنیت مجوسیوں جیسی ہے۔ امکان غالب ہے کہ یہ تحریک بالآخر بہائیت پر جا کر منتج ہوگی جس سے لگتا ہے کہ بنیادی طور پر یہ اثر قبول کر کے پروان چڑھی ہے۔''

علامہ اقبال نے مندرجہ بالا سطور میں جو وضاحت کر دی ہے، اس سے بہتر وضاحت ان حالات میں مشکل تھی۔ بے حد ایجاز و اختصار پر مبنی اسلوب میں آپ نے بیان کر دیا کہ ربع صدی قبل قادیانی تحریک کے متعلق ان کے خیالات کیا تھے اور بعد میں ان کے دل میں اس کے خلاف بیزاری اور حقارت کے جذبات کیوں پیدا ہو گئے۔ ان کا بے باکانہ اعتراف ان کے عظمتِ کردار کی دلیل ہے۔ سوال کرنے والے شخص نے ان پر تناقض (inconsistency) کا الزام عائد کیا تھا اور بادیٔ النظر میں یہ الزام کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھا، مگر اقبال جیسے عظیم فلسفی نے خاندانِ مرزا اور ان کے غالی حواریوں کی طرح دجل و فریب اور سوئے تاویل یا اپنی جھوٹی انا کی پاسداری کا کوئی بھی اسلوب اختیار نہ کیا بلکہ صاف صاف الفاظ میں بتا دیا کہ وہ اس تحریک سے اچھے نتائج کی توقع رکھتے تھے۔ انھوں نے جن الفاظ میں اعتراف کیا اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اپنی اس اجتہادی غلطی کا احساس بھی تھا۔ مگر کم ظرف قادیانیوں نے ایک عظیم انسان کے اس انکسارانہ مگر عظیم اعتراف کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور برابر ان کی کردار کشی کی گھناؤنی تحریک کو جاری رکھا۔ اگر قادیانی حضرات علامہ محمد اقبال کی اس وضاحت کو قبول کر لیتے تو اس کا مطلب ہوتا:

1- قادیانی مرزا غلام احمد کی جھوٹی نبوت کو پیغمبر اسلامؐ کی حقیقی نبوت سے برتر جانتے ہیں۔ گو اپنے قلوبِ باطلہ میں وہ یہ فتنہ لاکھ پالتے رہیں مگر اس سوچ کے برملا اظہار و اعتراف کے مضمرات سے وہ بخوبی واقف ہیں۔

2- مرزا غلام احمد کے حواری اس کی محبت میں اس حد تک غلو کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وہ رسالت مآبؐ کی شان میں نازیبا کلمات کہنے سے بھی باز نہیں آتے۔ اگر قادیانی برملا یہ بات مان لیں تو ان کے ''ظلی و بروزی'' نبوت والے مکڑی کے جال کب تک کیسے رہ سکتے ہیں کیونکہ عقلی اعتبار سے ''بروز'' اصل سے برتر کیسے ہو سکتا ہے۔ اور جو اصل کے متعلق نازیبا کلمات

کہہ سکتا ہے، اس کی ''بروز'' کے بارے میں عقیدت پر اعتبار کیسے کیا جا سکتا ہے؟

3- قادیانی بظاہر مسلمان لگتے ہیں، مگر قادیانی تحریک اسلام دشمن ہے۔ علامہ اقبال کا یہ تجزیہ آج بھی سو فیصد درست معلوم ہوتا ہے کہ قادیانی اپنے آپ کو غیر مسلم کہلوانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ اسلام کے پردہ میں رہ کر ہی قادیانیت پھیلانے کے ماہر ہیں۔

4- قادیانی تحریک اپنے خیالات میں بہائیت کے زیر اثر ہے۔

5- قادیانی ذہن مجوسیت کا عکس لیے ہوئے ہے۔

اس لیے قادیانی علامہ اقبال کے اس اعتراف اور وضاحت کو اپنے گلیے موت کا پیغام سمجھتے ہیں۔ قادیانی اپنے تئیں یہ خیال کرتے تھے کہ اقبال کے خلاف شدید منفی پراپیگنڈہ کر کے وہ اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چپ کرا دیں گے یا نفسیاتی طور پر اس قدر مرعوب کر دیں گے کہ وہ ہاتھ کھڑے کر دیں گے۔ مگر علامہ صاحب نے اپنی فکری لغزش کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ قادیانی ٹولہ کی اجتماعی نفسیات اور اس تحریک کے عوامل و نتائج کا اس قدر بلیغ اور مؤثر انداز میں تجزیہ فرمایا کہ ان کی فراست کی داد دینی پڑتی ہے۔

قادیانیوں کے لیے تو علامہ اقبال کی وضاحت کو رد کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا مگر علامہ اقبال کے بعض عقیدت مندوں کے ذہن میں بھی کئی سوالات جنم لے سکتے ہیں۔ کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ جب علامہ صاحب خود کہتے ہیں، ''اگر میرے موجودہ رویہ میں تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان ہی کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ اپنی تردید آپ کر سکے'' تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قادیانی فرقہ کو ''مسلم کریکٹر'' کا مظہر سمجھتے تھے۔ اگر وہ ایسا سمجھتے تھے تو کیوں سمجھتے تھے؟ مزید برآں وہ قادیانیوں سے اچھے نتائج کی توقع کیوں رکھتے تھے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس ''کیوں'' کا فوری اور سادہ جواب تو یہی ہے کہ شہنشاہ عالمگیر کے دور کے مسلم کردار سے قادیانی فرقہ کو تشبیہ دینا یا ''مسلم ٹائپ آف کریکٹر'' کی جو تعریف علامہ اقبال نے خود وضع کی، اس کا قادیانی فرقے کو کسی بھی درجہ میں مصداق سمجھنا صحیح تعبیر و توضیح کے زمرے میں نہیں آتا۔ یہ ایک سوچنے والے ذہن کی one-time اجتہادی خطا تھی۔ علامہ اقبال جیسے فلسفی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص کی طرف سے اس طرح کی فکری لغزش کے ارتکاب کے اسباب کا تعین کرنے کے لیے ان کے خاندانی پس منظر، قادیانی تحریک کے ارتقاء، علامہ اقبال کے حلقۂ احباب، اس وقت کی عمومی فضا، سماجی و سیاسی عوامل، اقبال کے فلسفیانہ مزاج وغیرہ کے متعلق جاننا ضروری ہے۔

1910ء میں علامہ اقبال قادیانی فرقہ کے متعلق ایسا کیوں سوچتے تھے؟

اقبال نے قادیانی فرقہ کا نام کیوں لیا؟

قارئین اگر ٹھنڈے دل سے ان نکات پر غور کریں تو شاید ان کے دل میں اس طرح کے سوالات جنم نہ لیں:

(1) اقبال بنیادی اعتبار سے فلسفہ کے آدمی تھے۔ انھیں مذہب کی وہ باتیں زیادہ مرغوب تھیں جن میں مافوق الطبیعیاتی مسائل کو فلسفیانہ انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ 1910ء میں جب انھوں نے خطبہ علی گڑھ دیا، ان کا ذہن مشرق اور مغرب کے فلسفیانہ افکار کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ اس خطبہ کا آغاز انھوں نے بے حد فلسفیانہ انداز میں کیا، اس میں بے حد مشکل فلسفیانہ اصطلاحات استعمال کیں۔ ان کے خطبہ کا پورا متن فلسفیانہ رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اگرچہ انھوں نے ''مسلم کمیونٹی'' کو عمرانیات کے اصولوں میں بیان کرنے کی کوشش کی، مگر ان کا طرزِ استدلال ایک ماہر عمرانیات کی بجائے ایک ماہر فلسفی کا سا ہے۔ ظاہر ہے اس مزاج کے شخص کا تجزیہ ایک عالم دین کے تجزیہ سے مختلف ہوگا۔ 1905ء سے 1906ء کے درمیان اقبال یورپ میں بغرضِ تعلیم قیام پذیر رہے۔ یہ عرصہ بھی ان کے فلسفیانہ مزاج کی تشکیل میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ یہی دور تھا جب وہ جرمنی، فرانس اور انگلینڈ کے نامور فلسفیوں کے کاموں سے نہ صرف متعارف ہوئے، بلکہ وہاں کے اہل علم کی مجالس سے بھرپور مستفید بھی ہوئے۔ اب ان کا ذہن ایک عام ہندوستانی کی بجائے ایک ایسے انسان کی طرح سوچنے لگا جو کائنات کے بارے میں آفاقی نقطہ نظر کا قائل ہو اور جو اپنی فکر کی جولانگاہ کے لیے روزمرہ کے موضوعات کی بجائے اعلیٰ نظریات وافکار کو منتخب کر چکا ہو۔ اقبال جب ہندوستان واپس آئے تو ان کا حساس ذہن اُس بلندی سے نیچے آنے کے لیے مائل نہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے مسائل کو وہ درخورِ اعتناء نہ سمجھتے تھے۔ کیا بعید ہے کہ رد قادیانیت جیسے مباحث میں حصہ لینا وہ فلسفیانہ شان سے فروتر سمجھتے ہوں۔

(2) مصنف ''زندہ رود'' کا کہنا ہے کہ ''اقبال کے دوستوں میں بعض احمدی بھی تھے'' انگلستان میں قیام کے دوران ان کا جن افراد سے ملنا جلنا تھا، ان میں بھی بعض قادیانی تھے۔ خواجہ کمال الدین جو ایک معروف قادیانی مبلغ تھے اور جن کو خاص طور پر انگلستان میں ''اشاعتِ اسلام'' کے لیے بھیجا تھا، ان سے اقبال کی ملاقات اکثر ہو جاتی تھی۔ انگلستان میں Voking کے مقام پر ایک مسجد تعمیر کی گئی تھی، اس کے لیے سرمایہ بھوپال کی نواب شاہ جہاں بیگم نے فراہم کیا تھا۔ اس مسجد پر آہستہ آہستہ خواجہ کمال الدین اور دیگر قادیانیوں نے قبضہ کر لیا۔ یہ لوگ وہاں اپنے آپ کو سچے مبلغین اسلام کے طور پر پیش کرتے تھے اور نشاۃِ اسلامیہ کے اپنے آپ کو پُرجوش علمبردار بنا کر پیش کرتے تھے۔ کافی عرصہ

تک لوگ ان کو مسلمان سمجھتے رہے۔ان کے ہاتھ پر بعض اہم انگریزوں نے ''اسلام'' قبول کیا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ 1912ء میں جب مولانا ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' جاری کیا تو خواجہ کمال الدین باقاعدگی سے انگلینڈ میں اپنی ''اشاعتِ اسلام'' پر مبنی سرگرمیوں کی رپورٹ بھیجتے رہے، جو ''الہلال'' میں شائع ہوتی تھی۔اس میں بڑے فخریہ انداز میں بیان کیا جاتا تھا کہ ایک ''مبلغِ اسلام'' نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور انگلینڈ جیسے اہم یورپی ملک میں ''اشاعتِ اسلام'' کے کیا کیا امکانات روشن ہیں۔بعض روایات کے مطابق اقبال انگلینڈ میں قیام کے دوران Voking مسجد سے وابستہ رہے اور وہاں ان کا آنا جانا رہتا تھا۔ان دنوں میں عبداللہ سہروردی اور شبیر حسین قدوائی نے لندن میں پان اسلامک سوسائٹی قائم کی تھی۔اقبال اس سوسائٹی میں دلچسپی لیتے رہے۔شبیر حسین کے متعلق راقم نے سب سے پہلے ''الہلال'' میں پڑھا۔یہ خواجہ کمال الدین کے دوست تھے اور اُن کے بارے میں بھی مشہور تھا کہ یہ احمدی تھے۔اقبال کے قریبی دوست شیخ عبدالقادر ایڈیٹر ''مخزن'' بھی ان دنوں انگلینڈ میں تھے۔اقبال ان سے اکثر ملتے تھے۔شیخ عبدالقادر کے متعلق قادیانی پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ وہ قادیانیت دوست تھے۔خواجہ کمال الدین اور دیگر قادیانی بھی فلسفہ سے رغبت رکھتے تھے۔کیا بعید ہے کہ اقبال ان کی ''اشاعتِ اسلام'' کی کوششوں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھتے ہوں اور ان افراد نے قادیانیت کے بارے میں جو معلومات دی ہوں، وہ انھیں درست سمجھنے کا میلان رکھتے ہوں۔ یہاں ایک بات سمجھنا ضروری ہے کہ کوئی بھی قادیانی مبلغ کسی مسلمان کے سامنے مرزا غلام احمد کے وہ بیانات پیش نہیں کرتا جس میں اس نے ''نبوت'' کا دعویٰ کیا تھا، مرزا غلام احمد کا تعارف ایک مجدد کے طور پر کرایا جاتا ہے جو امت مسلمہ کے روشن مستقبل کا خواب دیکھتا تھا۔آہستہ آہستہ اس کی ''مسیح موعود'' والی حیثیت کی اہمیت بیان کی جاتی ہے۔پھر مرزا غلام احمد کے وہ منتخب جوشیلے بیانات کثرت سے بیان کیے جاتے ہیں جس میں وہ عیسائیت کے نیست ونابود ہونے اور اسلام کے احیاء کے نعرے لگاتا تھا۔''مسلم ثقافت'' کا احیاء بھی قادیانیوں کا ایک مرغوب موضوع ہے۔مزید برآں ہر قادیانی مبلغ اپنے آپ کو حضورِ اکرم کا عقیدت مند ظاہر کرنے کی شعوری کوشش کرتا ہے تاکہ ایک مسلمان اس کے بارے میں اچھا تاثر قبول کرے۔شاید ہی کوئی قادیانی ہو جو کھل کر اپنے اصل خیالات بیان کرے۔ایسی صورت میں ہر اس شخص کے فریب کھانے کا امکان باقی رہتا ہے جس نے قادیانیت کے لٹریچر کا بہ تمام مطالعہ نہ کیا ہو اور ان کی اجتماعی نفسیات سے بخوبی واقف نہ ہو۔اگر میں یہ گمان کروں کہ اقبال جیسا ابھرتا ہوا فلسفی نوجوان قیام انگلستان کے دوران مذکورہ قادیانی مبلغین کی چرب زبانی کا شکار ہو گیا ہو، تو اسے اقبال کے متعلق کسی سُوئے ظن کی بجائے ان معروضی حالات میں اقبال کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے کی ادنیٰ کاوش پر محمول کیا جانا

چاہیے۔ راقم الحروف نے اس مسئلہ پر اقبالیات کے معروف ماہر پروفیسر عبدالجبار شاکر صاحب سے جب اقبال کے ''ٹھیٹھ نمونہ'' والے بیان کی توجیہ چاہی، تو انھوں نے بھی اس کے پس منظر میں مذکورہ معروضی حالات کا ذکر کیا۔ کچھ دیگر ماہرین اقبالیات بھی اس توجیہ کی تائید کرتے ہیں۔ مگر یہ دورانیہ بہت طویل نہ تھا، اقبال کو جلد ہی یہ احساس ہوگیا کہ قادیانی فرقہ ''ٹھیٹھ نمونہ'' کا مصداق نہیں ہے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اقبال کے قادیانیوں سے متاثر ہونے کے امکان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ختم نبوت کے عقیدے پر ان کا ایمان کسی بھی وقت متزلزل ہوا ہو یا وہ مرزا غلام احمد کو ''نبی'' کا درجہ دینے لگے ہوں۔ ایسا نہ آج تک کسی قادیانی مصنف نے دعویٰ کیا ہے اور نہ ہی اقبال کی کسی تحریر یا تقریر سے اس طرح کا کوئی شائبہ ابھرتا ہے۔ ختم نبوت کے بارے میں ان کا عقیدہ ہمیشہ اس طرح کے خیال سے مبرا رہا ہے۔ اگر راقم کو کسی بھی لمحے اقبال کے بارے میں یہ بدگمانی ہوتی تو یہ سطور ان کے دفاع میں کبھی بھی نہ لکھتا، بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا ان کے عظیم الشان شاعرانہ مرتبے کے علی الرغم ان کی مذمت میں اپنی تمام توانائیاں بروئے کار لانے کو اپنا ایمان جانتا۔

(3) ملتِ اسلامیہ کی تاریخ بتاتی ہے کہ اسلام دشمنی پر مبنی جب بھی کسی فتنہ نے سر اٹھایا ہے عامتہ المسلمین میں اس کے خلاف حساسیت بہت دیر بعد بیدار ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض فتنے جو معمولی سی کاوش سے کچلے جاسکتے تھے، وقتی چشم پوشی یا بروقت بیداری کے نہ ہونے کی وجہ سے بعد میں اس قدر قوت پکڑ گئے کہ ریاستی قوت کے استعمال کے باوجود ان کی مکمل بیخ کنی نہ کی جاسکی۔ خوارج اور سبائیت کے فتنے اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ انیسویں صدی کے نصف میں ایران میں محمد علی باب نے جب اپنی تعلیمات کا آغاز کیا تو بہت کم لوگوں نے توجہ دی۔ جب یہ فتنہ خطرناک حد تک پروان چڑھا، تو ریاستی قوت کے استعمال سے محمد علی باب کو سزائے موت دی گئی، مگر پھر بھی اس کے پیروکاروں کو ختم نہ کیا جاسکا۔ حسن بن صباح کے گروہ پر اگر شروع میں ہی توجہ دی جاتی تو ان کے شر کے اثرات سے حکمران بھی غیر محفوظ نہ ہوتے۔ اس بارے میں دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ میں سے جب بھی کوئی گروہ انتشار و افتراق پر مبنی فلسفہ لے کر سامنے آیا، اس کی اکثریت نے کبھی اس کو اپنے وجود کے لیے خطرہ محسوس نہ کیا۔ ایک مختصر گروہ اس شر پسند ٹولہ کے خلاف ردِعمل کا آغاز کرتا ہے، جب کہ اکثریتی طبقہ عام طور پر اس تصادم اور کشمکش سے اپنے آپ کو بچائے رکھتا ہے۔ مسلمانوں کا دانش ور اور تعلیم یافتہ طبقہ جسے اس طرح کے فتنہ کے خلاف علمی جدوجہد کرنی چاہیے، عموماً وہ اس تصادم میں پرجوش فریق بن کر حصہ لینے سے گریز کرتا ہے۔ اب ذرا ان تلخ حقائق کی روشنی میں قادیانیت کے ظہور و ارتقاء پر غور کیجئے۔ یہ فتنہ اس اعتبار سے منفرد فتنہ تھا کہ اسے فتنہ سمجھتے سمجھتے بھی ایک زمانہ لگا۔ مرزا غلام احمد نے چھوٹتے ہی ظلی و بروزی نبوت

کا میز ائل نہیں داغ دیا تھا۔ شروع شروع میں وہ عیسائی پادریوں کے سیلاب کے خلاف بند باندھنے کے لیے میدان میں اترے۔ پھر انھوں نے آریہ سماجی شر پسندوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ یکا یک اس جوش و خروش کے ساتھ اسلام کے دفاع کے لیے میدان میں اترے، کہ جلد ہی اس اسلامی پہلوان کو مسلمانوں میں پذیرائی حاصل ہوگئی۔ قادیان کے اس رئیس زادے نے عیسائی پادریوں اور آریہ پنڈتوں کو شکست سے دوچار کرنے کے لیے اپنے قلم کے ساتھ زبان کا بھی بھرپور استعمال کیا۔ آئے روز مناظرے ہونے لگے اور بحث و جدل کا وہ بازار گرم ہوا کہ مرزا غلام احمد قادیانی جہاں بھی جاتا لوگ ''عظیم مبلغ اسلام'' کے طور پر اس کا استقبال کرتے۔ ابھی ان مناظروں سے فارغ ہی نہیں ہوئے تھے کہ موصوف نے اپنے الہامات کو بروئے کار لاتے ہوئے ''اشاعت اسلام'' کا بیڑا اٹھالیا۔ اب کیا تھا نت نئے الہامات کی بارش ہونے لگی، کبھی وہ مجدد ہونے کا مژدہ سناتے، کبھی محدث ہونے کا راگ الاپتے، جب دیکھا کہ ان کے دعووں کی کوئی خاص مخالفت نہیں ہوئی، تو ایک الہامی تدبیر کے زیر اثر مسیحِ موعود کا نقارہ بجادیا، پھر مہدویت کا تاج بھی سر پر سجا کر ''ہم ساہو تو سامنے آئے'' کا نعرۂ مستانہ لگادیا۔ ابھی لوگ ان کے ایک دعویٰ پر غور و فکر کر رہے ہوتے تو وہ زقند لگا کر کسی اور طرف جا گھستے۔ 1870ء سے لے کر 1892ء تک مرزا صاحب یہ منزلیں طے کر چکے تھے۔ مرزا غلام احمد کی پذیرائی کو سمجھنے کے لیے 1857ء کے بعد کے مخصوص سیاسی، معاشرتی اور معاشی تناظر کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ مسلمان اس قدر بے بس اور کچلے گئے تھے کہ کہیں سے کوئی شخص ان کے روشن مستقبل کی نوید سناتا، وہ باؤلوں کی طرح اس کی طرف لپک پڑتے تھے۔ یہ بھی خیال نہیں کرتے تھے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، اس میں کس قدر صداقت ہے۔ مرزا غلام احمد تو واجبی طور پر پڑھا لکھا اور فارسی و عربی علوم کا کسی حد تک فاضل تھا، اگر کوئی نرا جاہل آدمی بھی بے سروپا دعووں کے ساتھ اپنی سیاست و شعبدے بازی کی دکان چمکانا چاہتا، تو اسے بھی گاہکوں کی کمی کی شکایت کبھی نہ ہوتی۔

(4) 1910ء تک یہ حالت تھی کہ قادیانیت کے متعلق عام مسلمانوں کو بہت کم آگاہی تھی، عام مسلمان تو ایک طرف بڑے بڑے علماء اور دینی سکالر بھی اس فتنہ کے مضمرات کے بارے میں زیادہ فکر مند یا حساس نہیں تھے۔ قادیانیت کے خلاف جو علماء نبرد آزما تھے، ان کا زیادہ تر تعلق قادیان سے جغرافیائی طور پر قریبی علاقوں سے تھا۔ بٹالہ، لدھیانہ اور امرتسر کے علماء مکانی قربتوں کی وجہ سے نسبتاً زیادہ حساس ہوگئے تھے۔ انھوں نے اپنے تئیں لوگوں کو اس فتنہ کے خلاف بیدار کرنے کی کوشش کی، مگر اس دور میں جب ٹیکنالوجی نام کو بھی نہ تھی، ان کی صدائے احتجاج ایک محدود علاقے میں سنی گئی، لاہور میں علماء کا ایک گروہ اس احتجاج میں شامل تھا، مگر اجتماعی طور پر فضا زیادہ **Charged** نہ تھی۔ دہلی میں

بھی چندلوگ مرزا غلام احمد قادیانی کے خلاف آواز اٹھا رہے تھے مگر فضا ایسی نہیں تھی کہ جسے عام بیداری کہا جا سکے۔ اس وقت کے دینی سکالر اس طرف کم ہی متوجہ تھے۔ اہل ندوہ تو شاید ایسے مباحثوں اور تحریکی جدل کو اپنی علمی ثقاہت سے کوئی فروتر معاملہ سمجھتے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی اور اس دور کے دیگر ندوہ کے بزرگوں کی شاید ہی کوئی تحریر ہو جسے رد قادیانیت میں شمار کیا جا سکے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے 1912ء سے لے کر 1915ء تک ''الہلال'' بے حد جوش و جذبہ سے نکالا۔ وہ علی گڑھ تحریک کا مسلسل محاکمہ وتعاقب کرتے رہے، اہل ندوہ کی کمزوریوں کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے رہے، مگران کا اصل میدان عالمی جدوجہد تھا۔ ان کے ''الہلال'' کا دو تہائی حصہ خلافت عثمانیہ اور ترکوں کے تازہ حالات پر مبنی ہوا کرتا تھا۔ قادیان کے مدعی نبوت کے خلاف ''الہلال'' میں انھوں نے اپنی طرف سے ایک بھی مضمون نہ لکھا۔ یہ اس وجہ سے نہ تھا کہ وہ مرزا غلام احمد سے متاثر تھے، شاید وہ مرزا کے خلاف کچھ لکھنا اپنے مرتبہ سے کم تر خیال کرتے تھے۔ ان حالات میں اقبال جیسا نوجوان فلسفی اگر لاعلمی میں قادیانی فرقہ سے کوئی ''اچھی توقعات'' وابستہ کر لیتا ہے، تو وہ معاف کیے جانے کا پورا مستحق ہے۔ 1910ء میں کوئی شخص مولانا محمد حسین بٹالوی کا رسالہ ''اشاعۃ السنۃ'' نہ پڑھتا یا مولانا ثناءاللہ امرتسریؒ کی کتابیں اس کی نگاہ سے نہ گزرتیں یا لدھیانہ کے علماء کے مناظروں کے متعلق کچھ نہ جانتا اور نہ ہی مرزا غلام احمد کی کتابوں کو براہ راست پڑھنے کا اُسے موقع میسر آتا، تو ایسا شخص قرآنِ مجید کا چاہے ہر روز مطالعہ کرتا، یا اسلامی تاریخ و فلسفہ پر اس کی کتنی ہی گہری نگاہ کیوں نہ ہوتی، قادیانیت کے خلاف محاذ قائم کرنے کی اس سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہی وہ المیہ تھا جس سے ہمارا ممدوح فلسفی دوچار تھا، یہی وہ حالات تھے جس میں اقبال نے علی گڑھ میں خطبہ ارشاد فرمایا۔

(5) 1910ء میں اقبال کی زبان سے ''قادیانی فرقہ'' کا ذکر سن کر کچھ تعجب تو ہوتا ہے، مگر اس سے کہیں بڑھ کر خوشگوار حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اس کے فوراً بعد کے برسوں میں انھوں نے جو کلام تخلیق کیا اس میں ان کی اسلام سے شیفتگی، رسالت مآبؐ سے والہانہ محبت اور حتیٰ کہ ختم نبوت کے عقیدے پر ان کے غیر متزلزل ایمان کا بھرپور اظہار بھی ہوتا ہے۔ اقبال نے 1910ء کے بعد ہی جس عظیم نظم کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا، اور جس کا ذکر انھوں نے اپنے کئی دوستوں سے بھی کیا، وہ بالآخر 1913ء میں ''اسرار خودی'' کے نام سے منظر عام پر آئی، یہ طویل مثنوی صرف انڈیا ہی نہیں پوری اسلامی تاریخ کا انمول شاعرانہ وتہذیبی سرمایہ ہے۔ اسی عرصہ کے فکر سخن کے نتیجہ میں ان کی دوسری مثنوی ''رموز بے خودی'' کے نام سے 1918ء میں شائع ہوئی۔ ''اسرار و رموز'' بلاشبہ قرآن و سنت کی تفسیر، محبت رسول اور ملت اسلامیہ کے استحکام، قرآن کو راہنما بنانے کے اصول اور اسلامی ثقافت کے نادر

واقعات کا خوبصورت اور جادو اثر مرقع ہے۔اس کا ایک ایک شعر ایسے شاعر کا تخلیق کردہ ہے، جو عشق رسول میں خود بھی مست ہو اور ملت اسلامیہ کے ہر فرد کو بھی اس مستی میں شریک کرنا چاہتا ہو۔اسرار ورموز میں ہمیں ایسے اشعار جواہر پاروں کی طرح ہر صفحہ پر بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔

آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم
گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

ترجمہ: ''وہ کتاب زندہ قرآن حکیم ہے۔اس کی حکمت غیر زوال پذیر بھی ہے اور قدیم بھی۔ اگر مسلمان بن کر زندہ رہنا چاہتا ہے تو یاد رکھ کہ سوائے قرآن پر قائم رہنے کے اور کوئی طریقہ کار نہیں۔''

اسرار ورموز میں ''لانبی بعدی'' کی تفسیر پر مبنی اشعار بھی ہیں۔یہی وہ اشعار ہیں جو ایک ایسے قاری کے لیے خوشگوار حیرت اور بے پایاں مسرت کا باعث بنتے ہیں جس کا ذہن خطبۂ علی گڑھ کے زیر اثر ہو۔اس موضوع پر اشعار کا ایک طویل سلسلہ ہے۔مگر یہاں ہم صرف چند منتخب اشعار نقل کریں گے۔ اقبال فرماتے ہیں۔

ماز حکمِ نسبت او ملتیم
اہل عالم را پیام رحمتیم
دینِ فطرت از نبی آموختیم
در رہ حق مشعلے افروختیم
پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را
او رسل را ختم و ما اقوام را
لا نبی بعدی ز احسانِ خدا است
پردہ ناموسِ دین مصطفےٰ است
قوم را سرمایۂ قوت ازو
حفظ سرِ وحدتِ ملت ازو
حق تعالیٰ نقش ہر دعویٰ شکست

تا ابد اسلام را شیرازہ بست
دل زغیر اللہ مسلمان برکند
نعرۂ لا قوم بعدی ی زند

ترجمہ: ہم جو ایک ملت قرار پاتے ہیں، تو آنحضرتؐ سے نسبت پیدا کر لینے کی وجہ سے۔ آپ کی ذات رحمتہ للعالمین ہے۔ لہٰذا ہم بھی دنیا کے لیے پیغام رحمت ہیں۔ مسلمان کی وحدت دین فطرت سے حاصل ہوتی ہے۔ ہم نے یہ دین فطرت نبی کریمؐ سے سیکھا اور آپ ہی کی تلقین کے توسط سے حق کے راستے میں مشعل روشن کی......

پس خدا نے شریعت ہم پر ختم کر دی، اسی طرح جیسے ہمارے رسولؐ پر رسالت کا اتمام کیا۔ ہم سے محفلِ ایام کی رونق ہے۔ حضورؐ کی ذاتِ گرامی رسولوں کی خاتم ہے اور ہم اقوام امم کے خاتم ہیں۔ یہ خدا کا بڑا احسان ہے کہ اس نے اپنے رسول کی زبانی کہلوا دیا کہ اب میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ یہ قولِ حق دین مصطفیٰ کی عزت و آبرو ہے۔ قوم کو اسی سے سرمایۂ قوت حاصل ہوتا ہے اور وحدتِ ملی کا بھید بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لیے ہر دعویٰ کو باطل کر دیا اور ابد تک کے لیے اسلام کی شیرازہ بندی کر کے اس کو استحکام بخشا۔ اسی لیے مسلمان غیر اللہ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا اور ''لاقوم بعدی'' کا نعرہ بلند کرتا ہے۔ (ترجمہ از ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی)

ان اشعار میں اقبال نے ختم نبوت کو اللہ تعالیٰ کا احسان اور اس عقیدہ کو دینِ اسلام کی ناموس کا نام دیا ہے۔ یہ مصرعہ: ''حق تعالیٰ نقشِ ہر دعویٰ شکست'' بھی قابل غور ہے۔ راقم خاکسار کا خیال ہے کہ یہ شعر علامہ اقبال نے مرزا غلام احمد قادیانی کو ذہن میں رکھ کر تحریر فرمایا جو آئے دن اپنے باطل دعوؤں کے ثبوت کے لیے نت نئے نقش ہائے آسمانی والہامی بیان کرتا رہتا تھا۔ اقبال قادیانیوں کو ان اشعار کے ذریعے بتانا چاہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ختم نبوت کا احسان فرما کر ایسے تمام دعوے پہلے ہی باطل قرار دے دیے ہیں لہٰذا تم اب حق کے سامنے جبین جھکا دو۔ اس شعر کا دوسرا مصرعہ بھی ردقادیانیت کا انداز لیے ہوئے ہے۔ یعنی ''تا ابد اسلام را شیرازہ بست۔''

اقبال ختم نبوت کو اسلام کی شیرازہ بندی قرار دیتے ہیں اور منکرین ختم نبوت کو اس شیرازہ کو منتشر کرنے والے سمجھتے تھے۔ یہاں قارئین اقبال کے 1902ء میں کہے گئے اشعار ذہن میں لائیں جس میں آپ نے فرمایا۔

ایک دانہ پہ نظر ہے تیری
اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں

تو جدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں

ان دونوں اشعار کا آپس میں معنوی ربط ہے۔ مختلف لوگوں نے قادیانیت کے رد کا مختلف اسلوب اختیار کیا۔ اقبال کے ہاں رد قادیانیت کا انداز شروع میں اسلام کے شیرازہ کو منتشر کرنے کے پس منظر میں ملتا ہے۔

قارئین کرام! اس طرح کے اشعار کہنے والا اقبال کیا ایسے فرقہ کو ''اسلامی کردار کا مظہر'' کہہ سکتا ہے جو ختم نبوت کا منکر ہو۔ یہ ہمیں تسلیم کر لینا چاہیے کہ اقبال کی طرف سے یہ الفاظ کسی لاعلمی کا نتیجہ تھے۔ یہ لاعلمی جلد ہی رفع ہو گئی اور انھیں انشراحِ صدر ہو گیا۔ یہ اشعار اسی انشراحِ صدر کا مظہر ہیں۔

(6) 1910ء تک اقبال کو بعض باتوں کے متعلق انشراحِ صدر نہیں تھا، اسی لیے وہ قادیانیوں کو مسلمانوں کا ایک فرقہ سمجھتے تھے۔ اس الجھن کا شکار اقبال ہی نہیں، بہت سے مسلمان رہے ہیں اور بعض تو شاید اب بھی ہیں۔ وہ مرزا قادیانی کو نبی نہیں سمجھتے مگر قادیانیوں کو ''کافر'' قرار دینے پر بھی تعجب کا اظہار کرتے ہیں۔ دراصل قادیانی یہ دلیل دیتے ہیں کہ ہم تو رسولِ اکرم کو خاتم الانبیاء مانتے ہیں، ہم منکر اور دائرہ اسلام سے خارج کیسے ہوئے؟ اقبال نے 1935ء میں اپنے مضمون میں خود اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:

''جب کسی نے آنحضرت کو خاتم الانبیاء مان کر آپؐ کے بعد کسی اور نئے نبی کی نبوت کو تسلیم کر لیا تو اس کا خاتم الانبیاء کا اقرار باطل ہو گیا۔ گویا دائرہ اسلام سے نکلنے کے لیے حضورؐ کا انکار ضروری نہیں۔ کسی نئے نبی کا اقرار بھی آدمی کو اسلام کے دائرے سے باہر نکال دیتا ہے۔''

معلوم ہوتا ہے کہ یہ انشراحِ صدر انھیں 1910ء میں اس وقت نہیں تھا جب انھوں نے قادیانی فرقہ کو ''مسلم کردار کا مظہر'' کہا۔ اس موضوع پر آئندہ سطور میں مفصل روشنی ڈالی جائے گی۔ ان شاء اللہ!

(7) صرف اقبال کو ہی مطعون کیوں ٹھہرایا جائے، دورِ اول میں بہت سے جید علماء بھی تھے جنھوں نے مرزا غلام احمد کے متعلق فتوائے تکفیر سے اختلاف کیا، ان میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ علمائے احناف میں نہایت ممتاز مقام رکھتے تھے، وہ دیوبند کے معروف علماء کے استاد بتائے جاتے ہیں۔ یہ بات آج ہمیں تعجب انگیز لگتی ہے کہ مولانا گنگوہیؒ نے شروع میں علمائے لدھیانہ کے فتویٰ تکفیر کی مخالفت میں ایک مضمون لکھ کر مرزا قادیانی کو ''مردِ صالح'' بھی قرار دیا، بلکہ انھوں نے ان علمائے لدھیانہ پر تنقید بھی کی جنھوں نے اسے ''کافر'' قرار دیا تھا۔ مولوی محمد حسین لدھیانویؒ، مولوی عبداللہ لدھیانویؒ اور

دیگر علماء نے مولانا گنگوہیؒ کے اس مضمون کا مفصل جواب لکھ کر انھیں بھیجا اور اس میں مرزا قادیانی کے کلماتِ کفریہ پر مفصل روشنی ڈالی۔ مولانا گنگوہیؒ کو اپنے استدلال کی کمزوری کا احساس ہوا۔ بعد میں یہی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تھے جنھوں نے 1892ء میں فتویٰ دیا۔

''مرزا غلام احمد قادیانی اپنی تاویلاتِ فاسدہ اور ہفواتِ باطلہ کی وجہ سے دجال کذاب اور طریقہٴ اہل سنت و جماعت سے خارج، اس کے پیرو بھی اسی کی مانند ہیں۔''

(حوالہ رئیس قادیان، مولانا رفیق دلاوری صفحہ 372، 451)

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے پہلے حسنِ ظن کا باعث ان کا قریب الوطن نہ ہونا اور مرزائی کتابوں کا مطالعہ نہ کرسکنا بتایا جاتا ہے۔ یہ یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ 1910ء میں اقبال نے مرزا کی کتابیں مثلاً ''فتحِ اسلام، توضیح المرام، ازالۂ اوہام'' وغیرہ کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ ورنہ وہ ہرگز اس رائے کا اظہار نہ کرتے۔

(8) 1901ء میں ''قادیانی فرقہ'' کے متعلق علامہ اقبال کا تمام تر علم مرزا کے غالی معتقدین کی روایات پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ اس فرقۂ ضالہ کے اندرونی حالات کا انھیں ہرگز علم نہیں تھا ورنہ وہ اسے ''مسلم کردار کا مظہر'' کبھی قرار نہیں دیتے، خود مرزا قادیانی کو اعتراف تھا:

''گو میری جماعت نے قوتِ استدلالی (بحث و مناظرہ) میں کافی ترقی کرلی ہے اور مخالف بھی کمزوری ظاہر کرتا ہے۔ مگر اصل غرض جس کے لیے میں بھیجا گیا ہوں ابھی اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ یعنی جماعت میں مکارمِ اخلاق، تقویٰ و صلاح، اسوۂ حسنہ پر عمل درآمد اور اسلامی کو شعار بنالینا موجود نہیں ہوا۔''

(سیرۃ المہدی از مرزا بشیر احمد)

بشیر احمد مصری جو قادیان میں پیدا ہوئے، بعد میں قادیانی خلیفہ دوم کے کرتوت دیکھ کر قادیانیت سے علیحدہ ہوئے، لکھتے ہیں:

''ان لوگوں کے خلاف میرا ابتدائی ردِعمل بداخلاقی اور جنسی بدکاریوں کی وجہ سے تھا''...... پتہ چلا کہ اس نیم دیوتا (خلیفۂ قادیان) نے زناکاری کا ایک خفیہ اڈا بنا رکھا ہے، جس میں منکوحہ، غیر منکوحہ حتیٰ کہ محرمات کے ساتھ کھلے بندوں زناکاریاں ہوتی ہیں۔ صرف یہ بدذات شخص اکیلا جنسی خبط میں مبتلا نہ تھا، بلکہ اس کے دونوں بھائی اور نام نہاد ''خاندانِ نبوت'' کے اکثر افراد بھی اسی رنگ میں رنگے ہوتے تھے، حتیٰ کہ اس جماعت کے سرکردگان جو ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز تھے، ان میں سے بھی اکثر نمائشی ڈاڑھیوں کو لہراتے اپنے اپنے سیاہ کاریوں کے اڈے جمائے بیٹھے تھے۔''

قاضی خلیل احمد صدیقی جامعہ احمدیہ ربوہ کے متعلم تھے۔ ''میں نے قادیانیت کیوں چھوڑی'' میں لکھتے ہیں:

میں بااثر قادیانیوں سے تعلق رکھتا ہوں..... مرزا طاہر احمد کے ذریعے مجھے قصرِ خلافت میں آمد و رفت کا شرف حاصل ہوگیا، اس دوران مجھے وہاں کا ماحول عجیب نظر آیا، رنگین و سنگین واقعات دیکھنے میں آئے، اپنی آنکھوں کے سامنے عصمتوں اور ناموس کو لٹتے ہوئے دیکھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔''

معروف صحافی زیڈ اے سلہری لکھتے ہیں کہ ''کلامِ اقبال نے میری کایا پلٹ دی۔''

وہ قادیان میں کافی عرصہ زیرِ تعلیم رہے، بعد میں مسلمان ہوگئے۔ قادیان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پس منظر میں کچھ جنسی سکینڈل منڈلاتے تھے''..... اسی طرح کی باتوں نے مجھے قادیانی مؤقف سے بیزار کیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اگر وہ اپنے عقیدے سے وابستہ ہیں تو دنیا میں لوگ طرح طرح کی بوالعجبیوں کو مانتے ہیں، انسانی ذہن ہر عقیدے کا جواز ڈھونڈ لیتا ہے۔''

اب اقبال کو ان باتوں کا اندازہ کیسے ہوتا۔ نہ کبھی وہ قادیان گئے، نہ انھیں قادیانیوں کے حلقوں میں قریبی اختلاط کا موقع ملا۔ کشمیر کمیٹی کے دوران جب انھوں نے قادیانیوں کو قدرے قریب سے دیکھا، تو فوراً ردِ عمل بھی ظاہر کیا۔

(مندرجہ بالا تمام واقعات ''قادیانیت ہماری نظر میں'' مؤلفہ محمد متین خالد صاحب سے لیے گئے ہیں)

نعیم آسی

قادیانیت اور اقبالؒ

قادیانی جماعت نے برصغیر پاک و ہند کے اندر اور باہر جس برطانوی ضرورت کو پورا کیا اور دنیائے اسلام کو جس قدر نقصان پہنچایا، اس کا حال کسی ذی شعور سے پوشیدہ نہیں۔ ظاہر ہے مسلمان اپنی حیاتِ اجتماعی پر کلہاڑا کیسے چلنے دیتے؟ ختم نبوت ایسے اصولِ اتحاد کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلنے کی اجازت دینے کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں نے اپنی موت کے پروانے پر دستخط کر دیے۔ یہ ناممکن تھا۔ چنانچہ انگریز کی ساختہ و پرداختہ اس جماعت کا تعاقب ہوا اور خوب ہوا۔

قادیانیت کے خط و خال واضح کرنے اور اس کے مضرات کی نشاندہی میں اگرچہ علامہ انور شاہ کاشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا ظفر علی خاںؒ، چودھری افضل حقؒ، سیّد ابوالحسن علی ندوی، الیاس برنی اور سر ظفر علی وغیرہ مشاہیر و اکابر نے بڑی قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں مگر قادیانیت کو نقد و نظر کے ترازو میں جس طرح شاعرِ مشرق، حکیم امت اور مصورِ پاکستان اقبالؒ نے تولا، واقعہ یہ ہے کہ یہ انھی کا حق تھا.......... یہ الگ بات کہ آج ان کی تصویر —— پاکستان —— میں یہ رنگ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

نظریۂ خاتمیت کو جدید رنگ میں پیش کرنے کا شرف سب سے پہلے حضرت علامہؒ ہی کو حاصل ہوا۔ انھوں نے قادیانیت کو نہ صرف ہندوستان میں بے نقاب کیا بلکہ یورپ میں بھی اس کے خلاف آواز سب سے پہلے حضرت علامہؒ ہی نے اٹھائی۔

ختم نبوت کا مسئلہ مسلمانوں کے دل و دماغ کا مسئلہ ہے اور اس کے لیے مسلمان شروع ہی سے بیدار احساس رہا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کی نسبت امام موفق بن احمد المکیؒ لکھتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں کسی شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنے سچا ہونے کی نشانیاں دکھلانے کی خاطر مہلت چاہی۔ امام صاحب نے سنا تو فرمایا، جس کسی نے اس متنبی سے کوئی علامت طلب کی، کافر ہو جائے گا، کیونکہ اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم (فداہ امی وابی) کے فرمان لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ (میرے بعد کوئی نبی نہیں) کی

تکذیب لازم آتی ہے۔[1] امام المورخین علامہ ابن خلدونؒ کے مطابق مسلمانوں میں سب سے پہلا اجماع اسی نظریہ کے تحفظ پر ہوا[2] اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ خلافت میں سینکڑوں صحابہؓ و تابعینؒ نے جن کی اکثریت حفاظِ قرآن پر مشتمل تھی، اپنے مقدس خون کا نذرانہ دے کر اس پردۂ ناموس دینِ مصطفیٰ اور سرِّ وحدتِ ملت' کی محافظت کا فرض ادا کیا۔[3]

ع یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

حضرت علامہؒ بلاشبہ اس دور کے ایک عظیم مسلمان مفکر و فلسفی تھے ------ تاریخ اسلام اور قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی اور وہ خوب جانتے تھے کہ قوموں کا شیرازہ کیسے مجتمع ہوتا اور کیونکر بکھر جاتا ہے؟ ان کے نزدیک اسلامی وحدت دو چیزوں سے عبارت تھی (الف) توحید (ب) ختم نبوت اور بقول ان کے:

> ''دراصل عقیدۂ ختم نبوت ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ اِمتیاز ہے اور اس امر کے لیے فیصلہ کن کہ (فلاں) فرد یا گروہ ملتِ اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں؟''[4]

چنانچہ جب ''فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں'' کا نغمہ الاپنے اور لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ کو 'حفظِ سرِّ وحدتِ ملت از و' بتانے والے نے قادیانیت کا بغور مطالعہ و تجزیہ کیا تو بے ساختہ پکار اٹھا:

I have no doubt in my mind that the Ahmadis are traitors both to Islam and to India.[5]

کہ میں اپنے ذہن میں اس امر کے متعلق کوئی شبہ نہیں پاتا کہ احمدی اسلام اور ہندوستان (تب ہندوستان ایک تھا) دونوں کے غدار ہیں اور ببانگِ دُہل یہ مطالبہ کر دیا کہ:

> ''حکومت قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرے یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان ان سے ویسی رواداری سے کام لے گا جیسی وہ باقی مذاہب کے معاملہ میں اختیار کرتا ہے۔''[6]

اور کہا:

> ''ملتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے۔''[7]

اگر اقتدار حضرت علامہؒ کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ قادیانیت کو آئینی احتساب کے شکنجے میں یوں

جکڑتے کہ وہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ جاتی اور یہ تو امر واقعہ ہے کہ جہاں تہاں ان کا بس چلا انھوں نے جکڑا بھی۔ انجمن حمایتِ اسلام کا ریکارڈ گواہ ہے کہ اس کے مرزائی ارکان کو جب تک بھرے اجلاس سے نکلوانہ دیا' کرسیِ صدارت پر تشریف فرما نہ ہوئے۔8 اور جب بقول عاشق حسین بٹالوی احرار کے اصرار پر مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ نے اپنے حلف نامے میں یہ شق رکھی کہ:

''میں اقرار صالح کرتا ہوں اگر میں آئندہ پنجاب اسمبلی میں نامزد ہو کر کامیاب ہو گیا تو اسلام اور ہندوستان کے مفاد کی خاطر مرزائیوں کو دوسرے مسلمانوں سے علیحدہ اقلیت قرار دیے جانے کے لیے انتہائی کوشش کروں گا۔9

تو حضرت علامہؒ نے بحیثیت صدر پنجاب مسلم لیگ اس کی توثیق فرما کر قادیانیت کو سیاسی سطح پر ایک اور ضربِ کاری لگائی۔10 سچ تو یہ ہے کہ حضرت علامہؒ قادیانیت سے اس درجہ نفرت کرنے لگ گئے تھے کہ ان کے نزدیک اس سے بڑا معاشرتی ناسور کوئی نہ تھا۔ یہ 1930ء یا اس سے کچھ پہلے کی بات ہے۔11 حضرت علامہؒ کے بڑے بھائی (شیخ عطا محمد صاحب) نے اپنی ایک لڑکی کی شادی کے سلسلہ میں ان سے ایک رشتہ کا ذکر کیا اور ان کی رائے دریافت کی۔ لڑکا اور اس کے والدین ختم نبوت کے منکرین میں سے تھے۔ آپ نے جواب دیا:

''بھائی صاحب! اگر میری اپنی بیٹی ہوتی تو میں ہرگز ہرگز یہاں شادی نہ کرتا۔''

یہ تھی حضرت علامہؒ کی دینی حمیت' ملی غیرت اور سیاسی بصیرت۔ حیرت ہے اس کے باوجود اقبال کے نام پر روٹیاں توڑنے والے بزرجمہر قادیانیت کے بارے میں مداہنت کرتے' سیاسی جماعتیں پہلو بچاتیں اور لیڈر کنی کتراتے ہیں۔ سچ کہا تھا اقبالؒ نے:

''علماء میں مداہنت آ گئی ہے۔ یہ گروہ حق کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیائے اسلام سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔''12

قادیانی اکثر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ پاکستان کا جنونی مسلمان مذہب کے پردے میں ان کے مال و جان اور آبرو کا درپے ہے لیکن یہ درست نہیں' قادیانیوں کا واویلا صرف اس لیے ہے کہ وہ احتساب سے بچے رہیں۔ مگر حضرت علامہؒ کے افکار و خیالات کی روشنی میں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ..... کوئی مسلمان بھی قادیانیوں کا بحیثیت انسان مخالف نہیں، نہ ان کی عزت و آبرو کا دشمن ہے۔ البتہ ان کی مضرت سے بچنا اپنا قدرتی حق خیال کرتا ہے۔ اگر جمہور مسلمانوں کے اس حق کا احترام

کرتے ہوئے قادیانیوں کو جداگانہ اقلیت قرار دے دیا جائے تو یہ ایک ایسا عمل ہوگا جو کئی ایک مفاسد کی روک تھام کرے گا۔ قادیانیوں کو حضرت علامہؒ کے اٹھائے ہوئے اس مطالبہ پر غور کرنا چاہیے۔ یہ ان کے فائدے کی بات ہے اور پھر جب ان کے پیغمبر اور اس کے جانشینوں کے نزدیک بھی وہ جمہور مسلمانوں سے ایک الگ امت ہی ہیں [13] تو پھر آئینی طور پر اس علیحدگی میں انھیں کیا قباحت نظر آتی ہے؟ مسلمانوں کا یہ مطالبہ ہر لحاظ سے نہایت معقول ہے کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی طور پر مسلمانوں سے الگ ہیں تو پھر سیاسی حیثیت میں بھی انھیں مسلمانوں سے علیحدہ ہو جانا چاہیے اور اگر وہ خود ایسا نہیں چاہتے تو پھر حکومت کو اپنی ذمہ داری اور معاملے کی نزاکت کا احساس کرنا چاہیے۔

اب میں حضرت علامہؒ کے اٹھائے ہوئے بعض نہایت اہم نکات کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔ اس ضمن میں بعض انتہائی تلخ حقائق اور کچھ افسوسناک واقعات کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ اگرچہ مجھے پتہ ہے کہ اس سے بعض جبینیں شکن آلود اور کچھ چہرے غضبناک ہوں گے مگر کیا کروں ان حقائق کو نظر انداز کرنا میرے بس میں نہیں۔ یہ قوم کی امانت تھی جو مجھے ودیعت ہوئی اور جو میں قوم کو لوٹا رہا ہوں...... چل میرے خامے بسم اللہ!

1- قادیانیت، یہودیت کی طرف رجوع ہے؟

حضرت علامہؒ نے آج سے اڑتیس برس پیشتر قادیانی تحریک کا تجزیہ کرتے ہوئے سب سے پہلے اس بات کی نشان دہی کی تھی کہ:

> ''اس کا حاسد خدا کا تصور کہ جس کے پاس دشمنوں کے لیے لاتعداد زلزلے اور بیماریاں ہوں' اس کا نبی کے متعلق نجومی کا تخیل اور اس کا روحِ مسیحؑ کے تسلسل کا عقیدہ وغیرہ یہ تمام چیزیں اپنے اندر یہودیت کے اتنے عناصر رکھتی ہیں گویا یہ تحریک ہی یہودیت کی طرف رجوع ہے۔'' [14]

مگر تب (1936ء میں) یہ محض ایک نظری بحث تھی' جس پر مزید رائے زنی اب بھی ممکن ہے مگر یہاں ایک بات نظر انداز نہیں کی جا سکتی اور وہ ہے فکر و خیال کے دائرے سے حرکت و عمل کے میدان تک قادیانیت کا یہودیت کے مماثل اور پھر ان دونوں کے مابین ایک خاص قسم کے روابط و تعلقات کا موجود ہونا۔

برطانوی وزیر خارجہ مسٹر بالفور کے 1917ء کے اعلان کے مطابق جب 1948ء میں بڑی ہوشیاری کے ساتھ فلسطین کی سرزمین پر قابلِ نفرین اسرائیل کا قیام عمل میں لایا گیا تو جن عربوں کی یہ سرزمین تھی وہ سب چن چن کر باہر نکال دیے گئے۔ یہ شرف صرف قادیانیوں ہی کو عطا ہوا کہ وہ بلاخوف و

خطر اور بصد تسلی و اطمینان وہاں رہیں۔ ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔ چنانچہ خود میرزا بشیر الدین محمود جنھیں قادیانی اپنے عقیدے کے مطابق مصلح موعود کا خطاب دیتے ہیں) نہایت فخریہ انداز میں اس کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''عربی ممالک میں بے شک ہمیں اس قسم کی اہمیت حاصل نہیں جیسی ان (یورپی اور افریقی) ممالک میں ہے۔ پھر بھی ایک طرح کی اہمیت ہمیں حاصل ہو گئی ہے اور وہ یہ کہ فلسطین کے عین مرکز میں اگر مسلمان رہے ہیں تو وہ صرف احمدی ہیں۔'' 15

اور تب سے اب تک قادیانیوں کے اسرائیلی یہودیوں کے ساتھ جو بین الاقوامی صیہونیت کے علمبردار ہیں' نہایت گہرے دوستانہ تعلقات چلے آتے ہیں اور اس میں سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ پاکستان اور پاکستانی عوام کے نزدیک اسرائیل کا وجود ہی غلط ہے۔ وہ اسے سازش اور جارحیت کی پیداوار قرار دیتے ہیں۔ پاکستان' اسرائیل کے مقابلہ میں عربوں کا سب سے بڑا حمائتی ہے اور اس نے اس عرب دوستی کی بھاری قیمت ادا کی ہے۔ اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان کا سب سے بڑا دشمن اسرائیل ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اسرائیل کے بانی ڈیوڈ بن گوریان کی وہ تقریر جو اس نے اگست 1967ء میں ساروبون یونیورسٹی پیرس میں کی' وہ اس کا بیّن ثبوت ہے۔ بن گوریان نے کہا:

''پاکستان دراصل ہمارا آئیڈیالوجیکل چیلنج ہے۔۔۔۔ بین الاقوامی صیہونی تحریک کو کسی طرح بھی پاکستان کے بارے میں غلط فہمی کا شکار نہیں رہنا چاہیے اور نہ ہی پاکستان کے خطرے سے غفلت کرنی چاہیے۔ پاکستانی عوام عربوں سے محبت کرتے ہیں اور یہودیوں سے نفرت اور عربوں سے یہ محبت خود عربوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ لہٰذا ہمیں پاکستان کے خلاف جلد سے جلد قدم اٹھانا چاہیے۔ پاکستان میں فکری سرمایہ اور جنگی قوت ہمارے لیے آگے چل کر سخت مصیبت کا باعث بن سکتا ہے لہٰذا ہندوستان سے گہری دوستی ضروری ہے بلکہ ہمیں اس تاریخی عناد و نفرت سے فائدہ اٹھانا چاہیے جو ہندوستان' پاکستان کے خلاف رکھتا ہے۔ یہ تاریخی عناد و نفرت ہمارا سرمایہ ہے۔ ہمیں پوری قوت سے بین الاقوامی دائروں کے ذریعے سے اور بڑی طاقتوں میں اپنے نفوذ و اثر سے کام لے کر ہندوستان کی مدد کرنی چاہیے اور پاکستان پر بھرپور ضرب لگانے کا انتظام کرنا چاہیے۔ یہ کام نہایت راز داری کے ساتھ اور خفیہ منصوبوں کے تحت انجام دینا چاہیے۔'' 16

احمدیہ تحریکِ جدید کے سالانہ بجٹ 67-1966ء کے صفحہ 25 کا عکس

تفصیل آمد خرچ مشنہائے بیرون

(۱۲) **حیفا** [illegible]

خرچ

عملہ

شمار	نام مدات	اصل اعداد ۶۴-۶۵	بجٹ ۶۵-۶۶	بجٹ ۶۶-۶۷
۱	مرکزی مبلغین ۱	۹۷۲	۹۷۲	۹۷۲
۲				
	میزان عملہ	۹۷۲	۹۷۲	۹۷۲

سائر

شمار	نام مدات	اصل اعداد ۶۴-۶۵	بجٹ ۶۵-۶۶	بجٹ ۶۶-۶۷
۱	اشاعت لٹریچر		۴۰	۴۰
۲	تبلیغی جلسہ وغیرہ		۶۰	۶۰
۳	دورہ سفر خرچ		۲۰	۲۰
۴	مہمان نوازی	-	۵۰	۵۰
۵	کرایہ مکان فرنیچر			
۶	بجلی، پانی، گیس وغیرہ	۱,۰۵۵	-	-
۷	سٹیشنری		۱۵	۱۵
۸	ڈاک تار و ٹیلیفون		۵۰	۵۰
۹	کتب اخبارات		۵۰	۵۰
۱۰	متفرق		۵۰	۵۰
۱۱	اخراجاتِ رسالہ البشریٰ		۷۰۰	۷۰۰
	میزان سائر	۱,۰۵۵	۱,۰۵۵	۱,۰۵۵
	کل خرچ عملہ و سائر	۲,۰۲۷	۲,۰۲۷	۲,۰۲۷
	زائد از مرکزی	۱,۲۷۳	۱,۲۷۳	۱,۲۷۳
	کل میزان	۳,۳۰۰	۳,۳۰۰	۳,۳۰۰

آمد

شمار	نام مدات	اصل اعداد ۶۴-۶۵	بجٹ ۶۵-۶۶	بجٹ ۶۶-۶۷
۱	چندہ تحریک جدید		۱,۳۰۰	۱,۳۵۰
۲	چندہ عام و حصہ آمد		۱,۶۰۰	۱,۶۰۰
۳	زکوٰۃ		۱۰۰	۱۰۰
۴	عید فنڈ	۳,۳۰۰		
۵	فطرانہ		۱۲۵	۱۲۵
۶	متفرق		۷۵	۷۵
	میزان آمد	۳,۳۰۰	۳,۳۰۰	۳,۳۰۰

خلاصہ

آمد	۳,۳۰۰
خرچ	۳,۳۰۰
خالص	—

اس پس منظر میں یہ بات اور زیادہ اہم اور تعجب خیز ہو جاتی ہے کہ اسی اسرائیل نے ایک ایسی جماعت کو آخر کیوں اپنے سینے سے لگا رکھا ہے جس کا ہیڈ کوارٹر ہی اس کے آئیڈیالوجیکل چیلنج...... پاکستان---- میں واقع ہے اور جس کا سربراہ اور دیگر منصبدار سب پاکستانی ہیں۔ آخر قادیانی دہاں کیا کرتے ہیں؟ قادیانیوں کا مفروضہ یہ ہے کہ وہ تبلیغ اسلام کے لیے وہاں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کس کو تبلیغ کرتے ہیں؟ کیا ان یہودیوں کو جو اپنی تمام عصبیتوں کے تحت وہاں اکٹھے ہیں اور اپنی مملکت کا استحکام اور اس کی توسیع چاہتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں' تو پھر کیا ان عربوں کو مسلمان بنانے کے لیے یہ مشن قائم ہے جو پہلے ہی رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حلقہ بگوش ہیں۔ عرب احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چھوڑ کر غلام احمد کے متبع بن جائیں گے؟ ناممکن! تو پھر معاملہ کیا ہے؟

ایک مشہور یہودی فوجی ماہر پروفیسر ہرٹز کا کہنا ہے:

> ''پاکستانی فوج اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے غیر معمولی عشق رکھتی ہے اور یہی وہ بنیاد ہے جس نے پاکستان اور عربوں کے باہمی رشتے مستحکم کر رکھے ہیں۔ یہ صورتِ حال عالمی یہودیت کے لیے شدید خطرہ رکھتی ہے اور اسرائیل کی توسیع میں حائل ہو رہی ہے۔ لہٰذا یہودیوں کو چاہیے کہ وہ ہر ممکن طریقے سے پاکستانیوں کے اندر سے حبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاتمہ کریں۔''[17]

اگر پروفیسر ہرٹز کی مذکورہ رائے ڈیوڈ بن گوریان کی تقریر **International Zionism** کے طرزِ عمل اور قادیانیت کے مخصوص تاریخی و سیاسی پس منظر کی روشنی میں دیکھا جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ قادیانی جماعت بین الاقوامی صیہونیوں کے ہاتھ میں کٹ پتلی ہے اور وہ اس سے اپنے حسبِ منشاء کام لیتے ہیں۔ بالخصوص دنیائے اسلام کے قلعہ ---- پاکستان---- کے خلاف اس کا کردار بڑا گھناؤنا دکھائی دیتا ہے اور اس تاثر کو موجودہ وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کے اس بیان سے اور زیادہ تقویت ملتی ہے جس میں انھوں نے یہ انکشاف کیا کہ پاکستان کے عام انتخابات (1970ء) میں اسرائیلی روپیہ پاکستان آیا اور انتخابی مہم میں اس کا استعمال ہوا تھا۔ آخر وہ روپیہ کس کے توسط سے پاکستان آیا؟ پاکستان کے وجود کے خلاف تل ابیب میں تیار کی گئی سازش (جس کا انکشاف خود وزیراعظم بھٹو نے ''الاہرام'' کے ایڈیٹر مسٹر حسنین ہیکل کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کیا)[18] کیسے پروان چڑھی؟ پاکستان میں بین الاقوامی صیہونیوں کی آلہ کاری کس نے کی؟ ان سب سوالات کا تمام تر جزئیات سمیت جواب تو جناب وزیراعظم بھٹو ہی دے سکتے ہیں لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ قادیانی جماعت کے ایک

مشہور چہرے اور پاکستان کی بیوروکریسی کے ایک رُکنِ رکین 19ے پر یہ الزام تو کئی ایک ذمہ دار حلقوں نے بارہا عائد کیا کہ اس نے ایوب خان کی گول میز کانفرنس کو ناکام بنانے اور مارشل لاء کا راستہ ہموار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا اور اس کے پس پردہ یہودی اثرات کارفرما تھے۔ پاکستان کے ایک مشہور اور قابلِ احترام سیاستدان مولوی فرید احمد نے اپنی کتاب ''The Sun behind the Clouds'' میں اس شخص کا نام لے کر لکھا ہے کہ ایوب خان کی ''گول میز کانفرنس'' کے دوران یہودیوں نے اسے استعمال کیا۔ 20ے حیرت ہے کہ آج تک پاکستان کی کسی حکومت نے بھی ان تعلقات کا نوٹس نہیں لیا بلکہ ستم تو یہ ہے کہ پاکستان کا لاکھوں روپے کا زرِ مبادلہ بیرونی ملکوں میں ''تبلیغِ اسلام'' کے نام پر قادیانیوں کے سپرد کر دیا جاتا رہا۔ کیا تصورِ پاکستان کے خالق کی رُوح اس پر ماتم نہ کرتی ہوگی؛ جنھوں نے فرمایا تھا کہ:

> ''ہمیں دنیائے اسلام سے متعلق قادیانیوں کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔'' 21ے

بہرحال میرا مقصد حضرت علامہؒ کے ایک اہم نکتے اور اس کی تشریح میں بعض ناقابلِ تردید حقائق کا بیان تھا جو میں نے کر دیا۔ اس سے آگے ذمہ داری میری نہیں، کسی اور کی ہے۔

2- قادیانی اور کمیونسٹ

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ کمیونسٹ تحریک سے ہمدردی رکھنے اور مذہب کو افیون قرار دینے والے عناصر قادیانی تحریک کے بارے میں زبان نہیں کھولتے، بلکہ ان کی اکثر کوشش یہی ہوتی ہے کہ قادیانیوں کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھے۔ وہ ہر مقام پر قادیانیوں کی مخالفت سے گریز کرتے اور اس ''ایماندارانہ مسئلہ'' کو فرقہ وارانہ جھگڑا کہہ کر ٹال جاتے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے آپ کو سوشلسٹ کہتے اور مذہباً دہریہ تھے۔ علامہ اقبالؒ نے قادیانیت کا پوسٹ مارٹم کرتے ہوئے اس کے خلاف اپنے بیانات چھپوائے تو پنڈت جواہر لال اپنی تمام تر ''دہریت مآبی'' کے باوجود قادیانیت کی حمایت پر اتر آئے اور ''ماڈرن ریویو'' کلکتہ میں ''مسلمان اور احمدِ زم'' کے عنوان سے یکے بعد دیگرے تین مضمون لکھ مارے۔ ایسا کیوں ہے؟ یا ایسا کیوں ہوا؟ میرے خیال میں حضرت علامہؒ نے اس ضمن میں جو کچھ لکھا وہی قادیانیوں اور کمیونسٹوں کے درمیان نقطۂ اتصال ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

> ''..........(ہندوستان میں) مذہبی مدعیوں کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ مذہب سے بالعموم بیزار ہونے لگتے اور بالآخر مذہب کے اہم عنصر کو اپنی زندگی سے علیحدہ کر دیتے ہیں۔'' 22ے

ظاہر ہے اس طرح ایک طرف مذہب پر زد پڑتی اور دوسری طرف کمیونزم کے فلسفہ کے لیے راستہ ہموار ہوتا ہے اور یہی مقصود ہے جس کے حصول کی خاطر ایک کمیونسٹ ایک نام نہاد ''نبی'' کی نبوت کو گوارا کرتا یا اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور ویسے بھی ایک فلسفہ رب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا باغی 'دوسرا خود محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا باغی' بھلا یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اپنے دل میں ''نرم گوشہ'' کیوں نہ رکھیں؟

حضرت علامہؒ نے اس حقیقت کی نشاندہی آج سے اڑتیس برس پیشتر کی۔ تب سے اب تک بالخصوص تقسیم کے بعد برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں پر جو بیتی اسے ''قادیانی کمیونسٹ ارتباط'' کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ اڑتیس برس اس کی تفسیر نظر آئیں گے۔ اے کاش! ہمارے دانشور اور ہمارے ''فرمانروا'' اس پر غور کریں۔

3- قادیانی مسلمان کہلانے پر اِصرار کیوں کرتے ہیں؟

حضرت علامہؒ نے اس بات پر بھی بڑی خوبی کے ساتھ بحث کی ہے کہ قادیانی مسلمانوں کا جزو بنے رہنے پر اِصرار کیوں کرتے ہیں؟ ان کے خیال میں ایسا صرف اس لیے ہے:

''...... کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام میں ہو تا کہ انھیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔''[23]

ان کے خیال میں اور اس خیال کی صداقت آج روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے:

''قادیانی حکومت سے کبھی علیحدگی کا مطالبہ کرنے میں پہل نہیں کریں گے۔''[24]

اور اس کی وجہ وہی سیاسی فوائد ہیں جن کی طرف میں نے ابھی حضرت علامہؒ کے حوالے سے اشارہ کیا اور میرے خیال میں حضرت علامہؒ کی یہ عبارت ان ''سیاسی فوائد'' کی بڑی اچھی تشریح کرتی ہے' جس میں وہ کہتے ہیں:

> ''اس امر کو سمجھنے کے لیے کسی خاص ذہانت یا غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں' پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں رہنے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟ علاوہ سرکاری ملازمتوں کے فوائد کے ان کی موجودہ آبادی جو 56,000 (چھپن ہزار) ہے انھیں کسی اسمبلی میں ایک نشست بھی نہیں دلا سکتی اور اس لیے انھیں سیاسی اقلیت کی حیثیت بھی نہیں مل سکتی۔ یہ واقعہ اس امر کا ثبوت ہے کہ قادیانیوں نے اپنی جداگانہ سیاسی حیثیت کا مطالبہ نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے ہیں

کہ مجالسِ قانون ساز میں ان کی نمائندگی نہیں ہوسکتی۔'' 25ے

مخلوط طریق انتخاب کے باوجود آج بھی پوزیشن قریب قریب وہی ہے جو آج سے اڑتیس برس پیشتر تھی۔ اگر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے تو ایک طرف ان کی وہ تمام کلیدی ملازمتیں خطرے میں پڑ جاتی ہیں جن کے سہارے قادیانیت کے بھیانک سائے تیزی کے ساتھ ارضِ پاک پر پھیل رہے ہیں۔ دوسری طرف اسمبلیوں میں انھیں بمشکل ایک آدھ نشست ملتی ہے جبکہ مسلمانوں میں شمولیت کا ڈھونگ رچا کر پنجاب اسمبلی سے سینٹ تک وہ کئی نشستوں پر قبضہ جما چکے اور پاکستان کی سیاست میں ایک اہم عنصر کی حیثیت سے بڑے مخصوص اور غیر محسوس انداز میں اپنا نقش جما رہے ہیں اور یقیناً یہی وہ سیاسی اغراض ہیں جن کی خاطر قادیانی نت نئی تاویلیں گھڑتے اور مسلمانوں کا جزو بنے رہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ میرزا ناصر احمد 'خلیفۂ ثالث' نے صدر اور وزیر اعظم کے حلف نامے میں عقیدۂ ختم نبوت کا اقرار ضروری قرار دیے جانے پر یونہی تو یہ بیان نہیں دیا تھا کہ:

> ''میں نے اس حلف نامہ کے الفاظ پر بڑا غور کیا ہے اور میں بالآخر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک احمدی کے راستہ میں اس حلف کے اٹھانے میں کوئی روک نہیں۔'' 26ے

ظاہر ہے حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخری نبی مان کر بھی قادیانیوں کے نزدیک حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں نبوت کا سلسلہ جاری رہ سکتا، میرزا غلام احمد کی نبوت ظل و بروز کا جامہ اوڑھ کر برقرار رہتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہوسِ اقتدار کا دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو کر قادیانی معتقدات کے مطابق ربوہ دنیوی لحاظ سے بھی ایک اہم مقام بن جاتا ہے۔ 27ے پھر بھلا یہ حلف نامہ ایک قادیانی کی راہ میں روک کیسے ہو؟ سچ فرمایا آپ نے میرزا صاحب سچ فرمایا۔

4- مذہب میں ''عدمِ مداخلت'' کی پالیسی اور ہم!

حضرت علامہؒ کے نزدیک ''ہندوستان میں انگریزوں کی یہ پالیسی کہ وہ کسی کے مذہب میں مداخلت نہ کریں گے'' ہندوستان میں بسنے والے تمام مذاہب کے لیے ضرر رساں تھی کیونکہ ان سب کی بقاء ان کے اندرونی استحکام کے ساتھ وابستہ تھی اور اگر اندرونی استحکام کو ٹھیس لگتی اور حکومت ''مذہبی معاملات میں عدم مداخلت'' کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے اس کے تحفظ کی خاطر کوئی قدم نہیں اٹھاتی تو ظاہر ہے اس جماعت کی سالمیت کو ضرور ضرر پہنچے گا۔ چنانچہ وہ اس امر پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس پالیسی نے ہندوستان ایسے ملک پر بدقسمتی سے بہت برا اثر ڈالا ہے۔

جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ مسلم جماعت کا استحکام اس سے کہیں کم ہے جتنا حضرت مسیح کے زمانہ میں یہودی جماعت کا رومن کے ماتحت تھا۔ 28؎ ہندوستان میں کوئی مذہبی سٹے باز اپنی اغراض کی خاطر ایک نئی جماعت کھڑی کر سکتا ہے اور یہ لبرل حکومت اصل جماعت کی وحدت کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتی بشرطیکہ یہ مدعی اسے اپنی اطاعت اور وفاداری کا یقین دلا دے 29؎ اور اس کے پیرو حکومت کے محصول ادا کرتے رہیں۔'' 30؎

آج بھی اگر کسی ملک کی حکومت اس نام نہاد عدم مداخلت کی پالیسی پر کاربند رہتی ہے تو ظاہر ہے اس کا یہ عمل اس ملک میں بسنے والے مذاہب کے لیے مہلک ہی ثابت ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ انگریز اگر اس پالیسی کو اختیار نہ کرتے تو کون سی پالیسی اختیار کرتے؟ ظاہر ہے اگر وہ اس کے برعکس مداخلت کی پالیسی اپناتے تو خود ان کے اقتدار کو دھچکا لگتا۔ لہٰذا انھوں نے وہ پالیسی اپنائی جس سے اس ملک میں بسنے والے مذاہب و اقوام کی وحدت پر زد پڑتی مگر اس کا اقتدار استحکام پکڑتا تھا اور یہ بھی اس نے اس حد تک ہی اپنائی جس حد تک کہ اس کو فائدہ پہنچا سکتی تھی۔

دراصل انگریز کی پالیسیاں کوئی سے اخلاقی سانچوں میں ڈھلی ہوئی نہ ہوتی تھیں، وہ تو اس کے مفاد کے تابع تھیں گویا ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔ اسی مذہب میں مداخلت نہ کرنے کا نعرہ لگانے والے انگریز نے جب دیکھا کہ ہندوستان کی مختلف قومیں آپس میں ایکا کر کے اس کے اقتدار کا تختہ اُلٹ دینا چاہتی ہیں تو اس نے مذہب میں مداخلت کرنے سے بھی گریز نہ کیا اور یہ حقیقت تو الم نشرح ہے کہ سکھ 1919ء تک ہندوؤں ہی کا ایک حصہ شمار ہوتے تھے۔ لاہور ہائی کورٹ نے بھی فیصلہ کیا تھا کہ سکھ ہندو ہیں، سکھوں کی طرف سے علیحدگی کا کوئی مطالبہ بھی نہیں کیا گیا تھا مگر انگریز نے اپنی مشہورِ زمانہ ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے ماتحت 1919ء میں سکھوں کو ہندوؤں سے جدا گانہ جماعت قرار دے دیا۔ 31؎ یہ دوسری بات کہ اس نے یہی فیصلہ ''مسلم قادیانی نزاع'' میں نہ کیا، اور یہ بھی Divide and Rule کے عین مطابق تھا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبال کے پاکستان میں کون سی پالیسی اختیار کی جانی چاہیے؟ ہمارے ہاں یوں تو مذہبی معاملات میں اکثر ٹانگ اڑائی جاتی ہے مگر جب بعض اندرونی و بیرونی اسلام دشمن تحریکوں کے انسداد یا ان کی مخصوص حرکات پر گرفت کی باری آتی ہے تو ہمارے مسلمان حکمران عجیب شانِ بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہیں بلکہ 1953ء میں تو ایسا بھی ہوا کہ حُبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جذبہ سے سرشار اور ناموسِ مصطفیٰ کا تحفظ چاہنے والے بے گناہ مسلمانوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیے

گئے۔ حالانکہ ایک مسلمان حکومت ہر لحاظ سے اس امر کی پابند ہے کہ وہ مسلمانوں کی ملی وحدت کا تحفظ کرے اور ظاہر ہے اس کے لیے سرِّ وحدت کی حفاظت شرطِ اوّلین ہے کہ:

ع حفظِ سرِّ وحدتِ ملت از و

اور میرے نزدیک تو معاملہ اب صرف جداگانہ اقلیت یا ملی وحدت کے تحفظ ہی کا نہیں رہا بلکہ اپنے مخصوص احوال وظروف کے ماتحت جن کی کسی قدر تشریح پیچھے ہو چکی ہے' خود ہمارے ملک کی بقاء و سلامتی سے جا کر مل گیا ہے---- گویا عقیدۂ ختم نبوت کا آئینی تحفظ اب صرف سرِ وحدتِ ملت' ہی کا تحفظ نہیں بلکہ وحدتِ ارضِ پاک' کی بقاء وسلامتی کا راز بھی یہی ہے!

5- ختم نبوت اور روادار مسلمان

بعض سمجھدار لوگ جان بوجھ کر یہ ناسمجھی کی بات کرتے ہیں کہ ملتِ اسلامیہ کی وحدت کا تحفظ چاہنا یا قادیانیوں کے احتساب کا مطالبہ کرنا ''فرقہ وارانہ منافرت'' پھیلاتا ہے اور کہ مسلمانوں کو ''فرقہ پرست'' نہیں ہونا چاہیے حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ ایک سچا مسلمان کبھی فرقہ پرست نہیں ہوتا' وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ہر وقت اس کے پیشِ نظر رہتا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ایک ایماندارانہ مسئلہ خواہ مخواہ فرقہ وارانہ قرار دے دیا جائے۔ شاید یہ لوگ اپنے آپ کو ''روادار'' ثابت کرنے کے لیے اس قسم کی باتیں ضروری سمجھتے ہیں۔ اگر حقیقت یہی ہے تو پھر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ وہ رواداری کا حقیقی مفہوم بالکل نہیں سمجھتے۔ ان کے لیے حضرت علامہؒ کی یہ عبارت سرمۂ بصیرت کی حیثیت رکھتی ہے:

> ''اس قسم کے معاملات میں جو لوگ رواداری کا نام لیتے ہیں وہ لفظ رواداری کے استعمال میں بے حد غیر محتاط ہیں.......... رواداری کی روح ذہنِ انسانی کے مختلف نقاطِ نظر سے پیدا ہوتی ہے۔ گبن کہتا ہے کہ ''ایک رواداری فلسفی کی ہوتی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح ہیں' ایک رواداری مورخ کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر غلط ہیں' ایک رواداری مدبر کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر مفید ہیں' ایک رواداری ایسے شخص کی ہے جو ہر قسم کے فکر وعمل کے طریقوں کو روا رکھتا ہے کیونکہ وہ ہر قسم کے فکر وعمل سے بے تعلق ہوتا ہے' ایک رواداری کمزور آدمی کی ہے جو محض کمزوری کی وجہ سے ہر قسم کی ذلت کو جو اس کی محبوب اشیاء یا اشخاص پر کی جاتی ہے

برداشت کر لیتا ہے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اس قسم کی رواداری اخلاقی قدر سے معرا ہوتی ہے۔اس کے برعکس اس سے اس شخص کے روحانی افلاس کا اظہار ہوتا ہے جو ایسی رواداری کا مرتکب ہوتا ہے۔ حقیقی رواداری عقلی اور روحانی وسعت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ رواداری ایسے شخص کی ہوتی ہے جو روحانی حیثیت سے قوی ہوتا ہے اور اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے دوسرے مذاہب کو روا رکھتا ہے اور ان کی قدر کر سکتا ہے۔ایک سچا مسلمان ہی اس قسم کی رواداری کی صلاحیت رکھتا ہے۔"[32]

حضرت علامہؒ کو اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا کہ ''قادیانی فتنہ'' کو سمجھنے کی تعلیم یافتہ مسلمانوں نے کوئی کوشش نہیں کی، بقول ان کے مغربیت کی ہوا نے ان لوگوں کو حفظ نفس کے جذبہ سے بھی عاری کر دیا ہے۔[33] اس کے مضرات کو اگر کسی نے سمجھا یا اس کے خلاف سرگرمی دکھائی تو بقول حضرت علامہؒ وہ عام مسلمانوں کا طبقہ تھا' جسے تعلیم یافتہ مسلمان 'مُلّا زدہ' کا خطاب دیتا ہے----اور اگر آج پڑھا لکھا طبقہ اس نئی امت اور اس کے مفاسد کو کچھ کچھ سمجھ رہا ہے تو یہ برس ہا برس کی جدوجہد اور بہت سے تلخ تجربات و مشاہدات کا ثمر ہے---- مگر اس کا کیا کیا جائے کہ یہ طبقہ عالمی استعمار کے اس ''مُہرے'' کے خلاف زبان کھولنے سے اب بھی ہچکچاتا اور منہ موڑتا ہے۔

بہر حال اگر ہمارے تعلیم یافتہ طبقے یا نام نہاد روادار مسلمان نے اپنا یہ طرزِ عمل تبدیل نہ کیا تو وقت انھیں خود ایسا کرنے پر مجبور کر دے گا۔

چند شبہات اور ان کا ازالہ

قادیانی ''میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو'' کے مصداق سادہ لوح مسلمانوں کو یہ کہہ کر اکثر دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ علامہ اقبال تو قادیانی تحریک کو ٹھیٹھ اسلامی تہذیب کا نمونہ سمجھتے تھے۔ دیکھو ان کا خطبہ علی گڑھ 1910ء فلاں صفحہ' فلاں سطر اور 29 ستمبر 1900ء کی فلاح تحریر میں انھوں نے مرزا غلام احمد کو جدید ہندی مسلمانوں کا سب سے بڑا دینی مفکر قرار دیا۔قادیانیوں کے پاس لے دے کر یہی دو حوالے ہیں جن کی مدد سے وہ حضرت علامہؒ کو قادیانی تحریک کا ہمنوا ثابت کرتے ہیں۔

اب سنیئے اس کی حقیقت کیا ہے؟ پہلی عبارت تو واقعتہً حضرت علامہؒ کی ایک ترجمہ شدہ کتاب ''ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر'' میں موجود ہے۔دوسری جو رسالہ انڈین اینٹی کویری کے حوالہ سے پیش کی جاتی ہے ابھی تک میری نظروں سے نہیں گزری اور قادیانیوں پر اس بارے میں زیادہ اعتماد نہیں کیا جا

سکتا۔ بہر حال عبارت پہلی ہو یا دوسری (قطع نظر اس بات کے کہ یہ صحیح ہے یا نہیں) اوّل تو ان میں مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا اثبات نہیں، دوسرا جب وہ خود ان کی نفی کر چکے ہیں تو پھر ان سے دلیل پکڑنا یا انھیں حجت ٹھہرانا کیسا؟ مثلاً وہ اپنی 1910ء کی عبارت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جہاں تک مجھے یاد ہے یہ تقریر میں نے 1911ء یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے رُبع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ اس تقریر سے بہت پہلے مولوی چراغ مرحوم نے جو مسلمانوں میں کافی سر برآوردہ تھے اور انگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے، بانیِ تحریک کے ساتھ تعاون کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کتاب موسومہ 'براہین احمدیہ' میں انھوں نے بیش قیمت مدد بہم پہنچائی لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل رُوح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہئیں۔ تحریک کے دو گروہوں [34] کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانیِ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی؟ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا، جب ایک نئی نبوت ----- بانیِ اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت ----- کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔'' [35]

دراصل حضرت علامہؒ کی پہلی رائے قادیانیت کے ظاہری خول اور اس کے پروپیگنڈے پر مبنی تھی اور اگر اس دور کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ کوئی ایسی تعجب خیز بات نہیں۔ یہ تو ایک عمومی تاثر تھا، جو آریوں اور عیسائیوں کے ساتھ مرزا غلام احمد کے اُس وقت کے نام نہاد [36] مناظروں اور مباحثوں سے پیدا ہو گیا اور ایک حضرت علامہؒ ہی پر کیا موقوف، تب پنجاب کے اکثر مسلمان اسی غلط فہمی کا شکار تھے۔ وہ ایک پُر جوش مبلغ و مناظر کی حیثیت سے مرزا غلام احمد کو اسلام کا مخلص اور مسلمانوں کا بہی خواہ خیال کرتے۔ خود حضرت علامہؒ کے گردو پیش حتیٰ کہ ان کے والد (شیخ نور محمد) اور بڑے بھائی (شیخ عطا

محمد) تک مرزا غلام احمد سے متاثر تھے بلکہ شیخ نور محمد صاحب نے تو مرزا صاحب کی بیعت بھی کی ہوئی تھی۔ مگر جب مرزا غلام احمد کے مخفی عزائم و دعاوی بے نقاب ہوئے تو مسلمانوں کا سوادِ اعظم ان سے الگ ہوگیا۔ نہ صرف الگ ہوگیا بلکہ قادیانی تحریک کو اپنی وحدتِ ملی کے خلاف ایک سازش سمجھتے ہوئے اس کی زبردست مزاحمت بھی کرنے لگا۔ ان حالات کا حضرت علامہؒ اور ان کے گرد وپیش پر اثر انداز ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ حضرت علامہؒ نے اپنی اس رائے سے جو محض قادیانی تحریک کے ظاہر سے متاثر ہو کر قائم کی گئی تھی رجوع کرلیا۔ ان کے والد شیخ نور محمد صاحب نے بھی قادیانی تحریک سے اپنی وابستگی ختم کر دی' بڑے بھائی بھی بیزار ہوگئے اور پھر وہ وقت بھی آیا جب حضرت علامہؒ نے قادیانیت کو ''برگِ حشیش'' غارت گرِ اقوام'' ''فتنہ ملتِ بیضا'' ''قوتِ فرعون کی در پردہ مرید'' ''یہودیت کا مثنیٰ'' [37] ''انتشار کا منبع'' فرنگی انتداب کے حق میں الہامی سند' مرزا غلام احمد کو ''چنگیز'' اور قادیانیوں کو اسلام اور ملک کا غدار قرار دے کر مسلمانوں سے الگ کر دینے کا پُر زور مطالبہ کیا اور یورپ تک اس فتنے کا تعاقب کیا۔ یہاں میں قارئین کی توجہ مرزا غلام احمد کے فرزند اور قادیانی تحریک کے ایک اہم ستون مرزا بشیر احمد ایم۔ اے کی اس تحریر کی جانب مبذول کرانا ضروری سمجھتا ہوں، جس میں وہ کہتے ہیں:

> ''ڈاکٹر سر محمد اقبال جو سیالکوٹ کے رہنے والے تھے' ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا...... شیخ نور محمد صاحب نے غالباً 1891ء یا 1892ء میں مولوی عبدالکریم صاحب مرحوم اور سیّد حامد شاہ صاحب مرحوم کی تحریک پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام (مرزا غلام احمد قادیانی) کی بیعت کی تھی۔ ان دنوں سر محمد اقبال سکول میں پڑھتے تھے اور اپنے باپ کی بیعت کے بعد وہ بھی اپنے آپ کو احمدیت میں شمار کرتے تھے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے معتقد تھے۔ چونکہ سر اقبال کو بچپن سے شعر و شاعری کا شوق تھا' اس لیے اُن دنوں میں انھوں نے سعد اللہ لدھیانوی کے خلاف حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی تائید میں ایک نظم بھی لکھی تھی مگر اس کے چند سال بعد جب سر اقبال کالج میں پہنچے تو ان کے خیالات میں تبدیلی آ گئی اور انھوں نے اپنے باپ کو سمجھا بجھا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔ چنانچہ شیخ نور محمد صاحب نے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں یہ تحریر کیا کہ...... آپ میرا نام اس جماعت سے الگ رکھیں۔ اس پر حضرت صاحب کا جواب میر حامد شاہ صاحب مرحوم کے نام گیا' جس میں لکھا تھا کہ شیخ نور محمد کو کہہ دیویں کہ وہ جماعت سے ہی الگ نہیں بلکہ اسلام سے بھی

الگ ہیں...... ڈاکٹر سر محمد اقبال اپنی زندگی کے آخری ایام میں (احمدیت کے)
شدید طور پر مخالف رہے اور ملک کے نو تعلیم یافتہ طبقہ میں احمدیت کے خلاف جو
زہر پھیلا ہوا ہے اس کی بڑی وجہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا مخالفانہ پراپیگنڈا تھا۔"38
فرمائیے اس کے بعد 1900ء کی کسی عبارت یا خطبۂ علیگڑھ کے سہارے قائم کیے گئے کسی
استدلال میں کیا وزن رہ جاتا ہے؟ حیرت ہے کہ جس دور کو حضرت علامہؒ اپنا دورِ جاہلیت قرار دیتے
رہے، اس کی ایک آدھ تحریر تو قادیانیوں کے لیے حجت اور سند کا درجہ رکھتی ہے مگر جس عمر میں وہ پختہ ہو کر
مسلمانوں کی محبوب فکری متاع بن چکے تھے اس عمر کی متاعِ فکر سے گریز و فرار اختیار کیا جاتا یا صریحاً انکار
کر دیا جاتا ہے۔ یاللعجب!

(2)

یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ اگر حضرت علامہؒ قادیانیوں کو مسلمان نہ سمجھتے تھے تو پھر خالصتاً
مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی خاطر اٹھنے والی تحریک ---- تحریکِ کشمیر 1931ء کی صدارت انھوں
نے 'حضرت امام جماعت احمدیہ "خلیفۃ المسیح الثانی مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب" کو کیوں پیش کی؟ اور
پھر اس جھوٹ پہ جھوٹ کھڑا کرتے ہوئے کہا جاتا ہے 'یہ بات علامہ کے ان گہرے روابط اور اس موانست
کو ظاہر کرتی ہے جو وہ جماعتِ احمدیہ سے رکھتے تھے۔

ع اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا؟

حالانکہ نہ حضرت علامہؒ نے مرزا محمود کا نام تجویز کیا اور نہ ہی وہ قادیانیوں سے کوئی ربط یا انس
رکھتے تھے۔ قادیانی جو چاہیں کہیں' حضرت علامہؒ نے قادیانیت پر جو ضربِ کاری لگائی' قادیانی آج تک
اسے نہیں بھلا سکے ہیں اور عبدالمجید سالک کو بھی اپنی تمام تر قادیاں نوازی کے باوجود یہ لکھنا پڑا ہے کہ رد
قادیانیت میں حضرت علامہؒ نے بعض ایسے نکات پیش کیے' جن کا جواب اب تک کسی سے نہیں ہو سکا۔ 39
واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت علامہؒ نے کشمیر کمیٹی میں شمولیت اختیار کی تو ان کے سامنے صرف
اور صرف مظلومینِ کشمیر کا مسئلہ تھا' جو برسہا برس سے ڈوگرا حکمرانوں کے ظلم وستم اور جبر و تشدد کا شکار تھے۔
وہ قادیانی نبوت یا خلافت پر مہر تصدیق ثبت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ حضرت علامہؒ کو چونکہ خطۂ کشمیر سے
قلبی لگاؤ تھا اور یہ ارضِ چناران کے آباء واجداد کا وطن تھی' اس لیے کشمیریوں کے ساتھ جذباتِ ہمدردی
کی شدت میں وہ مرزا بشیر الدین محمود کے سیاسی عزائم کو نہ بھانپ سکے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اور ان کی
طرح دیگر مسلمان عمائدین قادیانیوں کے انگریزوں کے ساتھ خصوصی تعلقات کے پیشِ نظر یہ امید بھی

کرتے ہوں کہ قادیانی خلیفہ اپنے آقاؤں سے کشمیری مسلمانوں کو بعض حقوق دلانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ مگر جب انھوں نے دیکھا کہ مرزا محمود نے اپنے لامحدود اختیارات---- ''لامحدود'' اس لیے کہ جب کمیٹی کی تشکیل ہوئی تو یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس کا قیام عارضی ہوگا سرے سے اس کا کوئی دستور ہی نہ بنایا گیا اور بقول حضرت علامہؒ صدر---- (مرزا محمود)---- کو آمرانہ اختیارات دے دیئے گئے۔ 40 مرزا محمود نے ان اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے کشمیر کمیٹی کو قادیانیوں کی ذیلی شاخ بنا کر رکھ دیا اور عام مسلمانوں کے چندے سے قادیانی مبلغ سارے کشمیر میں پھیلا دیئے (چنانچہ یہ اسی زمانے کی جدوجہد کا ثمر ہے کہ آج بھی کشمیر میں اس جماعت کے اچھے خاصے اثرات پائے جاتے ہیں) اور نہ صرف طول وعرضِ کشمیر بلکہ پوری دنیا میں یہ ڈھنڈورا پیٹا کہ تمام اسلامی ہند نے اسے اپنا لیڈر مان کر اس کے باپ مرزا غلام احمد کی نبوت کی تصدیق کر دی ہے اور اس کے ساتھ ہی جب یہ بات ان کے علم میں آئی کہ کشمیر کمیٹی کے صدر (مرزا محمود) اور سیکرٹری (عبدالرحیم) دونوں وائسرائے اور دیگر اعلیٰ برطانوی حکام کو خفیہ اطلاعات بہم پہنچانے کا ''نیک کام'' بھی کرتے ہیں۔ 41 تو انھوں نے اس کا انتہائی سختی سے نوٹس لیا اور مرزا محمود کو کمیٹی کی صدارت چھوڑ دینے پر مجبور کر دیا' قادیانیوں کی منافقت کے ہاتھوں عاجز آ کر خود استعفا دے دیا' کمیٹی تک توڑ ڈالی' اس موقع پر حضرت علامہؒ نے جو بیان جاری کیا اس کا یہ حصہ خاص طور پر بڑا دلچسپ اور اہم ہے:

> ''بدقسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقے کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ احمدی وکلاء میں سے ایک صاحب نے جو میر پور کے مقدمات کی پیروی کر رہے تھے' حال ہی میں اپنے ایک بیان میں واضح طور پر اس خیال کا اظہار کر دیا۔ انھوں نے صاف طور پر کہا کہ وہ کسی کشمیر کمیٹی کو نہیں مانتے اور جو کچھ انھوں نے یا ان کے ساتھیوں نے اس ضمن میں کیا وہ ان کے امیر کے حکم کی تعمیل تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ان کے اس بیان سے اندازہ لگایا کہ تمام احمدی حضرات کا یہی خیال ہوگا اور اس طرح میرے نزدیک کشمیر کمیٹی کا مستقبل مشکوک ہو گیا۔ میں کسی صاحب پر انگشت نمائی نہیں کرنا چاہتا۔ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ سے کام لے اور جو راستہ پسند ہو اسے اختیار کرے۔ حقیقت میں مجھے ایسے شخص سے ہمدردی ہے جو کسی روحانی سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی مقبرہ کا مجاور یا کسی زندہ نام نہاد پیر کا مرید بن جائے.......... ان حالات کے

پیش نظر مجھے اس امر کا یقین ہے کہ کمیٹی میں اب ہم آہنگی کے ساتھ کام نہیں ہو سکتا اور ہم سب کا مفاد اسی میں ہے کہ موجودہ کشمیر کمیٹی کو ختم کر دیا جائے۔" 42

قادیانیوں نے حضرت علامہؒ کی ایک تجویز جس میں کہا گیا تھا کہ "کشمیری بھائیوں کی مدد کے لیے ایک کھلے عام اجلاس میں ایک نئی کشمیر کمیٹی کی تشکیل کر لی جائے 43 کا سہارا لے کر "کشمیر کمیٹی" کے نام سے پھر دامِ ہمرنگِ زمین بچھانا چاہا' اس کی صدارت کی پیش کش کر کے حضرت علامہؒ کو پھانسنا چاہا' مگر انھوں نے نہایت سختی و حقارت سے اسے بھی مسترد کر دیا۔ فرمایا:

"مجھے صرف صدارت کے قبول کرنے ہی سے اصولی اختلاف نہیں' بلکہ میں تو ایسی پیشکش کے متعلق سوچنا ہی غلط سمجھتا ہوں اور میرے اس رویہ کی وجوہات وہی ہیں جن کی بناء پر میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی نئی تشکیل ہونی چاہیے...... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حالات کے پیش نظر ایک مسلمان کس طرح ایک ایسی تحریک میں شامل ہو سکتا ہے جس کا اصل مقصد غیر فرقہ واری کی ہلکی سی آڑ میں کسی مخصوص جماعت کا پروپیگنڈا کرنا ہے۔" 44

اور واقعہ یہ ہے کہ یہیں سے حضرت علامہؒ کی قادیانیت کے خلاف کھلی کھلی لڑائی کا آغاز ہوا۔

بقول محمد احمد خاں:

"علامہ اقبالؒ نے کشمیر کمیٹی کے دوران قادیانیوں کی سرگرمیوں کا گہری نظر سے جائزہ لیا تھا اور "کشمیر کمیٹی" کے یہ واقعات اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ ان ہی واقعات کے بعد ڈاکٹر صاحب نے قادیانی تحریک کی سختی سے مخالفت کرنی شروع کی۔" 45

ذرا سے گریز کے ساتھ میں یہ کہنے کی بھی اجازت چاہوں گا کہ آیا کبھی پاکستان کے مسلمانوں نے اس امر پر غور کیا ہے کہ ہر پاک بھارت جنگ کے دوران کشمیر و قادیان سے ملحق سرحدات کی کمان قادیانی جرنیلوں ہی کے ہاتھ میں کیوں رہی ہے؟ 1965ء کی جنگ سے پہلے سر ظفر اللہ خاں (پاکستان کے سابق وزیر خارجہ) نے حضرت علامہ اقبالؒ کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال (جو آج کل "پنجاب ہائی کورٹ" میں جسٹس کے عہدہ پر فائز ہیں) کی معرفت اس وقت کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں (مرحوم) کو یہ پیغام کیوں بھیجا کہ یہ وقت کشمیر پر چڑھائی کے لیے موزوں ہے۔ پاکستان کی فوج ضرور کامیاب ہوگی۔ جہاں تک ہندوستان کے ہاتھوں بین الاقوامی سرحد کے آلودہ ہونے کا تعلق ہے' ایسی کوئی چیز نہ ہوگی۔ 46 اور مشہور قادیانی جرنیل لیفٹیننٹ جنرل اختر حسین ملک (موجودہ لیفٹیننٹ

جنرل عبدالعلی ملک کے بڑے بھائی) جو انقرہ میں کسی حادثہ میں ہلاک ہو گئے اور جن کی نعش وہاں سے لا کر ربوہ ''دفن'' کی گئی تھی' یہ انتہائی خواہش وکوشش کس غرض سے تھی کہ اس وقت کے گورنر ملک امیر محمد خان صدر ایوب کو اس بات پر آمادہ کریں کہ یہ وقت کشمیر پر چڑھائی کے لیے بہترین ہے۔ یقین ہے کہ ہم کشمیر حاصل کر پائیں گے۔ 47۔۔۔۔ صرف یہی نہیں بلکہ قادیانی ''مصلح موعود'' کی یہ پیشنگوئی بھی ان دنوں نہایت اہتمام کے ساتھ آزاد کشمیر میں پھیلا دی گئی کہ ریاست جموں وکشمیر آزاد ہوگی اور اس کی فتح ونصرت احمدیت کے ہاتھوں ہوگی اور قادیانی اب بھی یہی پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ کشمیر قادیانی سورماؤں ہی کے ہاتھوں فتح ہوگا۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ ظاہر ہے قادیانی ایک وقت میں کئی کھیل کھیلتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی دائرے میں بہرحال سیاسی اقتدار چاہتے ہیں یا پھر انھیں سیکولر گورنمنٹ ہی برداشت کر سکتی ہے۔ بصورتِ دیگر وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قادیانی سیاست مذکورہ دوائر میں حرکت کرتی ہے۔ کشمیر پر قادیانیوں کی نظر اسی لیے ہے کہ اس طرح وہ کشمیر میں پہلے سے موجود ''قادیانی اثرات'' سے فائدہ اٹھا کر اپنا اقتدار قائم کر سکتے ہیں اور پھر کشمیر میں ان کے پیغمبر کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کی قبر بھی ہے' 48 جسے وہ اپنے تئیں مرزا غلام احمد کی صداقت کا ایک بڑا نشان سمجھتے ہیں۔ پھر اسی ریاست سے ہم آغوش ان کے پیغمبر کی جائے پیدائش ہے' جسے وہ ''دارالامان'' کہتے (بلدۃ الامین مکہ مکرمہ اور دارالہجرت مدینہ منورہ کا ہم پلہ بلکہ ان سے بھی افضل قرار دیتے) 49 اور اپنی جماعت کا خدا تعالیٰ کی طرف سے ٹھہرایا ہوا دائمی مرکز سمجھتے ہیں۔ 50 اور ان کا خیال ہے کہ مرزا غلام احمد کی پیش گوئی کے مطابق قادیان قادیانیوں کو ضرور ملے گا۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ذہنوں میں بھی یہی بات راسخ کرتے ہیں۔ چنانچہ راہِ ایمان کے نام سے ''احمدی بچوں کے لیے ابتدائی دینی معلومات کے مجموعہ'' کے صفحہ 98 پر قادیان سے ہجرت کی پیشگوئی کے زیرِ عنوان لکھا ہے:

> ''حضرت مسیح موعود علیہ السلام (مرزا غلام احمد قادیانی) کو خدا نے الہام اور خواب کے ذریعے بتایا تھا کہ کسی زمانے میں جماعت احمدیہ کو قادیان سے نکلنا پڑے گا اور خشک پہاڑیوں والے ایک اونچے علاقہ میں اسے اپنا دوسرا مرکز بنانا پڑے گا۔ یہ حالت عارضی ہوگی۔ آخر ایک وقت آئے گا کہ قادیان جماعت احمدیہ کو واپس مل جائے گا۔ پیشگوئی کا ایک حصہ 1947ء میں پورا ہو گیا۔۔۔۔ اور ہر احمدی کا ایمان ہے کہ پیشگوئی کا آخری حصہ بھی ضرور پورا ہوگا اور قادیان جماعتِ احمدیہ کو انشاء اللہ ضرور واپس ملے گا۔''

قارئین خود اندازہ فرمائیں کہ یہ کس طرح ممکن ہوگا؟ کیا حیدر آباد' جونا گڑھ' مناودر اور کشمیر کو

ہڑپ کرنے والا بھارت قادیان دے گا؟ قادیانی بزور بازو فتح کریں گے؟ یا بڑی طاقتوں کی معرفت یہ پیشگوئی پوری ہوگی؟ آخر قادیان قادیانیوں کو کس طرح ملے گا؟ بہرحال قادیانیوں کے یہی وہ سیاسی عزائم تھے جنھیں کشمیر موومنٹ نے بے نقاب کیا اور حضرت علامہؒ انھیں اسلام اور ملک کا غدار قرار دینے پر مجبور ہوگئے۔

(3)

قادیانی جب دلیل کے میدان میں عاجز آجاتے ہیں تو پھر یوں پینترا بدلتے ہیں:

"اپنی عمر کے آخری حصہ میں علامہ اقبال نے جماعتِ احمدیہ سے اختلاف کیا لیکن اہلِ بصیرت جانتے ہیں کہ اس کے وجوہ سیاسی تھے۔"51

وہ سیاسی وجوہ کیا تھے؟ "الفضل" لکھتا ہے:

"چودھری ظفر اللہ خان ایک خاص عہدے پر نہ لیے جاتے تو یہ تحریریں بھی ہرگز وجود میں نہ آتیں۔"52

حالانکہ جب حضرت علامہؒ حیات تھے تو کسی قادیانی کو اس کی جرأت نہ ہوئی' بلکہ تب قادیانی جماعت کے "مصلح موعود" مرزا بشیر الدین محمود یہ توجیہ کیا کرتے تھے:

"اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے ماتحت جماعت احمدیہ کے مخلصین کے اخلاص کو اور بھی زیادہ ظاہر کرنے کے ارادے سے نئے نئے لوگوں کو ہمارے مخالفوں کی صف میں لا کھڑا کر رہا ہے۔ پہلے احراری اٹھے...... پھر اُمراء...... پھر پیروں' گدی نشینوں اور اخبار نویسوں کی ایک جماعت...... ہندوستان کے سیاسی لیڈر ابھی تک خاموش تھے...... اسی طرح اعلیٰ عہدہ دار خاموش تھے یا کم از کم ظاہر میں خاموش تھے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ یہ طوفانِ مخالفت فرو ہونے میں نہیں آتا اور بڑھتا ہی چلا جاتا ہے تو انھوں نے کہا کہ ہم پیچھے کیوں رہیں؟ اس خیال کا آنا تھا کہ سر مرزا ظفر علی صاحب نے ایک بیان شائع کر دیا۔ پھر ڈاکٹر سر اقبال کو خیال آگیا کہ میں پیچھے کیوں رہوں؟"53

گویا اس وقت قادیانی جماعت یہ تاثر دینے کی کوشش کرتی تھی کہ حضرت علامہؒ کی مخالفت دوسروں کی دیکھا دیکھی محض "فیشن" کے طور پر ہے اور بس۔ حالانکہ یہ بات بھی درست نہیں۔ حضرت علامہؒ نے قادیانیت کے بارے میں جو کچھ لکھا اس میں ان کے ذاتی تجربے' مشاہدے' مطالعے اور

تجزیے کو دخل تھا۔ ''الفضل'' نے جو راگنی چھیڑی ہے اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ چودھری محمد ظفر اللہ خاں کو (ان کے اپنے بیان کے مطابق) 32ء میں چند ماہ کے لیے عارضی طور پر سر فضل حسین نے اپنی جگہ ایگزیکٹو کا ممبر نامزد کیا۔ مستقل تقرر 34ء کے اواخر میں ہوا۔ 54 جبکہ قادیانیت کی بابت حضرت علامہؒ کے خیالات میں تبدیلی اس سے بہت پیشتر آ چکی تھی اور وہ اس تحریک سے بیزاری کا اظہار کرنے لگ گئے تھے' خود قادیانیوں کے ''قمر الانبیاء'' مرزا بشیر احمد نے لکھا ہے کہ:

> ''1891-92ء...... کے چند سال بعد جب سر اقبال کالج میں پہنچے تو ان کے خیالات میں تبدیلی آ گئی اور انھوں نے اپنے باپ کو بھی سمجھا بجھا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔''55

33ء میں حضرت علامہؒ کی مخالفت میں اگر انتہائی شدت پیدا ہوئی تو اسے اُس دور کے پس منظر بالخصوص ''تحریکِ کشمیر'' کے حالات و واقعات کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ کشمیر کمیٹی کی آڑ میں قادیانیوں نے جو کچھ کیا وہ ایک حضرت علامہؒ کیا' سب مسلمان رہنماؤں کے لیے تشویش کا موجب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ''تحریکِ کشمیر'' کے بعد قادیانیوں کی مخالفت شدید سے شدید تر ہو گئی۔ اس میں مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور اپنے حقوق کے تحفظ کے احساس اور جذبے کو بھی دخل تھا۔ قادیانی جو چاہیں کہیں' حقیقت یہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ظفر اللہ خاں نہ تو حضرت علامہؒ کے کبھی حریف رہے' نہ رقیب۔ پھر حضرت علامہؒ ان باتوں سے ماوراء قسم کے انسان تھے۔ ایگزیکٹو کونسل کی رکنیت ظفر اللہ خاں کے لیے کوئی اعزاز ہو تو ہو حضرت علامہؒ کے نزدیک پرِ کاہ کے برابر حیثیت نہ رکھتی تھی۔ حضرت علامہؒ نے ''قادیانی فتنے'' کا احتساب 33ء سے اپنی وفات تک برابر جاری رکھا مگر اس دوران کی کسی ایک تحریر کے کسی ایک حرف سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ انھیں سر ظفر اللہ خاں سے کوئی ذاتی پرُخاش تھی یا وہ ان کے ایگزیکٹو کا ممبر بن جانے کے باعث قادیانیت کی مخالفت تک پہنچ گئے' بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے ایک مضمون ''قادیانی اور جمہور مسلمان'' (مطبوعہ 1935ء) میں لکھتے ہیں:

> ''اگر کوئی گروہ جو اصل جماعت کے نقطۂ نظر سے باغی ہے' حکومت کے لیے مفید ہے تو حکومت اس کی خدمات کا صلہ دینے کی پوری طرح مجاز ہے۔ دوسری جماعتوں کو اس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی لیکن یہ توقع رکھنی بیکار ہے کہ خود جماعت ایسی قوتوں کو نظر انداز کر دے جو اس کے اجتماعی وجود کے لیے خطرہ ہیں۔''

اور اگر بالفرض مسلمانوں کے حقوق پامال ہوتے دیکھ کر (کیونکہ سر ظفر اللہ خاں کو سر فضل

حسین کی جگہ ایگزیکٹو کا رُکن لیا گیا تھا جو ایگزیکٹو میں مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے شامل تھے) وہ اس تقرر پر احتجاج کرتے یا قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کرتے (تا کہ مسلمان کہلا کر وہ اسلامیانِ ہند کے حقوق سے متمتع نہ ہو سکیں) تو کیا یہ غلط ہوتا؟

بہر حال حضرت علامہؒ کی لڑائی اصولی تھی' ذاتی نہ تھی اور ویسے بھی وہ گھٹیا سیاسی مفاد کی خاطر مذہب کو آڑ بنانے کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے محض ملک وملت کے بہترین مفاد کو سامنے رکھ کر قادیانیت کی مخالفت کی' اور ایسا کرنا ان کے لیے ناگزیر تھا۔

حواشی

1. مناقب موفق ج1 ص161 'مطبوعہ حیدر آباد دکن۔
2. خاتم النبیین ص33 'علامہ انور شاہ کاشمیریؒ۔
3. تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تاریخ طبری' البدایہ والنہایہ' اور ''تاریخ ابنِ خلدون''۔
4. ''حرفِ اقبال'' ص127 'لطیف احمد شروانی۔
5. Thoughts and Reflections of Iqbal, Page 306 By Syed Abdul Wahid.
6. ''حرفِ اقبال'' ص119 'لطیف احمد شروانی ایم۔اے۔
7. ''حرفِ اقبال'' ص129 'لطیف احمد شروانی ایم۔اے۔
8. ''چٹان'' لاہور ص4۔24 جولائی 1967ء۔
9. ''اقبال کے آخری دو سال'' ص341 'عاشق حسین بٹالوی۔
10. اگرچہ اقبال کے آخری دو سال کے مؤلف نے اس تاریخی حقیقت کو مسخ کر کے قادیانیت کو سپورٹ (Support) کرنے کی بے حد کوشش کی ہے مگر بات بنی نہیں۔ عاشق حسین بٹالوی ہوں یا عبدالمجید سالک' حضرت م ش ہوں یا کوئی اور ل ن' کسی میں اتنا بوتا نہیں کہ قادیانیوں کو مسلمانوں میں شامل کر سکے۔ (ن۔آ)
11. 1930ء یا اس سے کچھ پہلے کی بات ہے------ یہ بات میرے استفسار پر جناب خالد نظیر صوفی صاحب

(مرتب: اقبال درونِ خانہ) نے اپنی والدہ مکرمہ سے پوچھ کر مجھے بتائی۔صوفی صاحب کی والدہ زید مجدہا' شیخ عطا محمد صاحب (برادر اکبر حضرت علامہ) کی سب سے چھوٹی دختر ہیں' اور جس لڑکی کی شادی کا ذکر ہے وہ موصوفہ سے کوئی دو تین برس بڑی تھیں۔مرتب۔

12 چودھری نیاز علی کے نام خط 20 جولائی 1937ء مندرج مکاتیب اقبال ج 1 ص 250 شیخ عطاءاللہ۔

13 حتیٰ کہ 1900ء میں بانیِ قادیانیت نے حکومت سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ مردم شماری کے وقت ان کی جماعت اور ان کے پیروؤں کا نام عام مسلمانوں سے الگ رجسٹر کیا جائے۔ملاحظہ ہو اشتہار واجب الاظہار' منجانب مرزا غلام احمد قادیانی مطبوعہ 4 نومبر 1900ء۔

14 ''حرف اقبال'' ص 115 'لطیف احمد شروانی ایم۔اے۔

15 روزنامہ الفضل' لاہور ص 5۔30 اگست 1950ء۔

16 ''یروشلم پوسٹ'' 9 اگست 1967ء بحوالہ روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور ص 1 مورخہ 22 مئی 1972ء و 3 ستمبر 1973ء۔

17 روزنامہ ''نوائے وقت'' ص 6۔22 مئی 1972ء۔

18 نوائے وقت لاہور ص 1' 7 اپریل 1973ء۔

19 یہ صاحب آج کل ''ورلڈ بنک'' کے ایک اونچے عہدہ پر فائز ہیں۔یہ بنک اقوام متحدہ کی ایک ذیلی شاخ کی حیثیت رکھتا اور اس پر بین الاقوامی صیہونیوں کا اثر غالب ہے۔(ن۔آ)

20 ''ابر آلود سورج'' از مولوی فرید احمد۔

21 ''حرف اقبالؒ '' ص 128 'لطیف احمد شروانی۔

22 ''حرف اقبالؒ '' ص 118 'لطیف احمد شروانی' ایم۔اے۔

23 ''حرف اقبال'' ص 128 'لطیف احمد شروانی' ایم۔اے۔

24 ''حرف اقبالؒ '' ص 129 'لطیف احمد شروانی' ایم۔اے۔

25 ''حرف اقبالؒ '' ص 128 'لطیف احمد شروانی' ایم۔اے۔

26 آزاد کشمیر اسمبلی کی ایک قرارداد پر تبصرہ ص 6۔مبصر مرزا ناصر احمد ''خلیفۂ ثالث'' شائع کردہ نظارت اشاعت لٹریچر و تصنیف صدر انجمنِ احمدیہ پاکستان ربوہ۔

27 قادیانیوں کا عقیدہ ہے کہ آسمانی نوشتوں میں لکھا ہے اور وہ پورا ہو کر رہے گا کہ یہ مقام (ربوہ) دنیوی لحاظ سے بھی ایک اہم مقام بن جاوے گا' اس عبارت کا ایک ایک لفظ الفضل نامی قادیانی روزنامے سے منقول ہے۔ملاحظہ ہو اشاعت بابت 7 فروری 1951ء تب یہ اخبار لاہور سے شائع ہوتا تھا۔

28 رومن کا بھی یہ دعویٰ تھا کہ وہ مذہب کے معاملہ میں غیر جانبدار ہے۔

29 جیسا کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیروؤں نے کیا۔(ن۔آ)

30 ''حرفِ اقبال'' ص 116 لطیف احمد شروانی ایم۔اے۔

31 ''حرفِ اقبال'' ص 129 لطیف احمد شروانی ایم۔اے۔

32 ''حرف اقبال'' ص 34-133 لطیف احمد شروانی ایم۔اے۔

33 ''حرفِ اقبال'' ص 116 لطیف احمد شروانی ایم۔اے۔

34 قادیانی اور لاہوری۔ اوّل الذکر مرزا غلام احمد کو ''نبی'' مانتا اور اس کے منکرین کو کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیتا ہے۔ ثانی الذکر مرزا غلام احمد کو ''مجدد'' تسلیم کرتا ہے۔

35 ''حرفِ اقبال'' ص 23-122 لطیف احمد شروانی ایم۔اے۔

36 نام نہاد مناظرے اور مباحثے اس لیے کہ مرزا غلام احمد نے جو کچھ بھی لکھایا کہا وہ سب انگریزی اقتدار کے استحکام کی غرض سے تھا۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں ''ہاں میں اس کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نیک نیتی سے دوسرے مذاہب کے لوگوں سے مباحثات بھی کیا کرتا ہوں اور ایسا ہی پادریوں کے مقابل پر بھی مباحثات کی کتابیں شائع کرتا رہا ہوں اور میں اس بات کا بھی اقراری ہوں کہ جبکہ بعض پادریوں اور عیسائی مشنریوں کی تحریر نہایت سخت ہو گئی...... تو یہ اندیشہ (میرے) دل میں پیدا ہوا کہ مبادا مسلمانوں کے دلوں پر جو ایک جوش رکھنے والی قوم ہے ان کلمات کا کوئی سخت اشتعال دینے والا اثر پیدا ہو تب میں نے ان جوشوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اپنی صحیح اور پاک نیت سے یہی مناسب سمجھا کہ اس عام جوش کے دبانے کے لیے حکمت عملی یہی ہے کہ ان تحریرات کا کسی قدر سختی سے جواب دیا جائے تاکہ سریع الغضب انسانوں کے جوش فرو ہو جائیں اور ملک میں کوئی بے امنی پیدا نہ ہو تب میں نے بمقابل ایسی کتابوں کے جن میں کمال سختی سے بدزبانی کی گئی تھی چند ایسی کتابیں لکھیں جن میں کسی قدر بالمقابل سختی تھی کیونکہ میرے کانشنس نے قطعی طور پر مجھے فتویٰ دیا کہ اسلام میں جو بہت سے وحشیانہ جوش والے آدمی موجود ہیں ان کے غیظ و غضب کی آگ بجھانے کے لیے یہ طریق کافی ہوگا کیونکہ عوض معاوضہ کے بعد کوئی گلہ باقی نہیں رہتا۔'' (تریاق القلوب ضمیمہ نمبر 3 ص ب مولفہ مرزا غلام احمد قادیانی۔ مطبوعہ 1902ء)

37 حضرت علامہؒ کے بڑے بھائی کا بیٹا (شیخ اعجاز احمد) آج بھی مرزائی ہے اور بڑا غالی اور کٹر قسم کا مرزائی اور ان کے اہلِ خاندان اس کے جو وجوہ بیان کرتے وہ ناگفتنی ہیں۔

38 ''سیرت المہدی'' ج 3 ص 249 مرزا بشیر احمد ایم اے طبع اول اپریل 1939ء۔

39 ''ذکرِ اقبال'' ص 211 عبدالمجید سالک۔

40 ''حرف اقبال'' ص202' لطیف احمد شروانی' ایم۔اے۔

41 ''پنجاب کی سیاسی تحریکیں'' ص210' عبداللہ ملک۔

42 ''حرف اقبال'' ص202' لطیف احمد شروانی' ایم۔اے۔

43 ''حرف اقبال'' ص203' لطیف احمد شروانی' ایم۔اے۔

44 ''حرفِ اقبال'' ص204' لطیف احمد شروانی' ایم۔اے۔

45 ''احرار اور تحریکِ کشمیر'' ص161 بحوالہ ''اقبال کا سیاسی کارنامہ'' از محمد احمد خاں۔

46 ''عجمی اسرائیل'' ص35' آغا شورش کاشمیری۔

47 ''عجمی اسرائیل'' ص34' آغا شورش کاشمیری۔

48 ''کشتی نوح'' ص33' مرزا غلام احمد قادیانی۔

49 ''الفضل'' 11 دسمبر 1932ء تقریر مرزا محمود ''حقیقت الرویاء'' ص46 مصنفہ مرزا محمود۔

50 ''انوارِ خلافت'' ص117 مرزا محمود ''راہِ ایمان'' ص92' شیخ خورشید احمد قادیانی۔

51 ''احمدیت علامہ اقبال کی نظر میں'' ص 14۔ عبدالمالک خاں شائع کردہ نظارتِ اشاعت لٹریچر و تصنیف صدر انجمنِ احمدیہ پاکستان ربوہ۔

52 ''الفضل'' ربوہ مورخہ 24 جون 1967ء۔

53 ''الفضل'' قادیان 30 مئی 1935ء بحوالہ ''پنجاب کی سیاسی تحریکیں'' ص218-217' عبداللہ ملک۔

54 ''تحدیثِ نعمت'' ص99-298 و ص347' چودھری سر محمد ظفر اللہ خان۔

55 ''سیرت المہدی'' ص249' مرزا بشیر احمد' ایم۔اے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

ضربِ کلیم اور احمدیت

ضربِ کلیم کی اشاعت پر اکثر اربابِ بینش کو یہ خیال ہوا تھا کہ احمدی حضرات اس کے بعض اشعار کو اپنی تعریض پر محمول کریں گے۔ چنانچہ 10 اکتوبر کے سن رائز میں جو ''ریویو'' اس کتاب پر شائع ہوا ہے اس نے اس خیال کی تصدیق کر دی۔ احمدی حضرات نے علامہ مدظلہ کے بعض اشعار کو ''سلسلۂ عالیہ'' کی طرف منسوب کر کے قادیانی خانہ ساز نبوت کا راز اس خوبصورتی کے ساتھ فاش کیا ہے اور اپنی تضحیک کا ایسا دلکش سامان بہم پہنچایا ہے کہ بے اختیار داد دینے کو دل چاہتا ہے۔ غالباً اسی لیے کسی دانا نے یہ کہا ہے کہ خدا انسان کو نادان دوستوں سے محفوظ رکھے۔

مدیر ''سن رائز'' کو کیا خبر کہ اس کتاب میں افراد و اشخاص سے بحث نہیں کی گئی بلکہ فلسفیانہ طریق پر عہدِ حاضر کا تجزیہ کیا گیا ہے اور اس کی غلط روش' غلط تعلیمات' غلط خیالات اور غلط منطق کی نہایت واضح الفاظ میں مذمت کی گئی ہے۔ افرنگ اور دانشِ افرنگ کے ساتھ ساتھ عرب و عجم اور ایران و ہندوستان پر بھی تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ کے مختلف شعبوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ الغرض ضربِ کلیم مغرب اور مشرق دونوں پر بے لاگ تبصرہ ہے جس کی نظیر اردو تو کیا اس وقت تمام ایشیائی لٹریچر میں بھی ڈھونڈے سے نہیں مل سکتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کے انحطاط خیز رجحانات اور ملوکیت پسند تاویلات کی تشریح کے آئینہ میں جو علامہ کے قلمِ معجز رقم نے کی ہے' قادیان اور اربابِ قادیان کو اپنی صورت نظر آ گئی وگرنہ' ہم مدیر ''سن رائز'' کو یقین دلاتے ہیں کہ قادیانیت اس درجہ اہم نہیں کہ علامہ اس کے تذکرہ سے ضربِ کلیم کے صفحات سیاہ فرماتے۔

اس ریویو کو پڑھنے کے بعد جو چیز نمایاں طور سے نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ لکھتے وقت مدیر ''سن رائز'' کا توازنِ دماغی قائم نہ رہ سکا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ریویو ضربِ کلیم پر تنقید کے بجائے احمدیت کی تائید کی شکل میں بدل گیا۔

مدیر مذکور نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال جہاد کے قدیم پارینہ اور خونی

تصور کے قائل ہیں۔ برطانی ملوکیت کے دشمن ہیں اور بے قوت نبوت کو برگِ حشیش سے تعبیر کرتے ہیں۔

لیکن جب ہم احمدیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریکِ جہاد کو منسوخ اور ناجائز قرار دیتی ہے۔ برطانوی ملوکیت کی ثناخواں ہے بلکہ اسے آیۂ رحمت سمجھتی ہے اور بے قوت نبوت پر ایمان رکھتی ہے۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مدیر مذکور ڈاکٹر صاحب سے اس قدر خفا کیوں ہیں؟ اور ان کی تنقید کو **Oblique Remarks** یعنی در پردہ تعریض کیوں سمجھتے ہیں۔ اس درجہ تفاوت ہے کہ بُعد المشرقین نظر آتا ہے تو مدیر کو شکایت کرنے کا کیا حق ہے؟ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے مسلک کی اشاعت میں آزاد اور مختار ہیں۔ اگر اس کی بنا پر تمھارے مسلک پر زد پڑتی ہے تو کوئی کیا کرے؟ کیا علامہ موصوف محض اس خیال سے اعلائے کلمۃ الحق سے باز رہیں کہ ان کے کلام معجز نظام کی ضرب سے احمدیت کے آبگینے چکنا چور ہو جائیں گے؟

اگر ہم چوری کی مذمت کریں اور کوئی چور اس مذمت کو سن کر یہ کہنے لگے کہ یہ مجھ پر در پردہ تعریض کی گئی ہے تو یہ اس کی اپنی سمجھ کا قصور ہے۔ اس معاملہ میں سوائے اُس کے کہ اس شخص کے ساتھ ہمدردی کی جائے اور چارہ کار ہی کیا ہے؟

قرآن مجید میں اس فعل کی بار بار مذمت کی گئی ہے۔ سُوءِ اتفاق سے ابولہب نے خانہ کعبہ سے سونے کا ایک ہرن چرایا تھا لہٰذا جب کبھی وہ ان آیات کو جن میں چوری کی مذمت کی گئی ہے' سنتا تھا' تو یہی کہتا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے در پردہ مجھ پر چوٹ کی ہے۔ بعینہٖ یہی حال قادیانیوں کا ہے حالانکہ بات بالکل صاف ہے۔ تم ان تینوں باتوں کے قائل ہو۔ ڈاکٹر صاحب ان تینوں باتوں کے سخت مخالف ہیں اور ان کو علیٰ وجہ البصیرت اسلام کی روح کے منافی خیال فرماتے ہیں۔ پھر تم ان کی تنقید کو پڑھ کر نعل در آتش کیوں ہوتے ہو اور ان سے وجہ شکایت کس لیے پیدا کرتے ہو؟ تمہارا مذہب اور ان کا مسلک اور وہ رہ نوردِ کعبہ' تم عازم ترکستان! جب فی مابین' کوئی وجہ اتحادِ خیال ہی نہیں تو اس واویلا کی کیا ضرورت ہے!

آیئے! اب نہایت سکونِ قلب کے ساتھ ان حقائق سہ گانہ کا مذہبی اور عقلی زاویہ نگاہ سے تجزیہ کر کے دیکھیں تاکہ ڈاکٹر صاحب کا مسلکِ زریں ہر شخص پر روزِ روشن کی طرح ہویدا ہو جائے۔

(1) اسلامی جہاد کی تعریف

اپنے مذہب یا اس شے کی حفاظت اور بقا کی خاطر' جسے انسان مقدس اور محترم سمجھتا ہو' اپنی زندگی

تک قربان کر دینا' یہ اسلامی جہاد کی تعریف ہے۔ عقل' تاریخ اور مشاہدہ تینوں اس کی تائید کرتے ہیں۔

(الف) اگر کوئی شخص اپنے مذہب' ثقافت (کلچر) یا مقدس روایات یا وطنِ عزیز کی حفاظت کے لیے بھی تلوار نہیں اٹھا سکتا تو پھر خدا جانے اس کی تلوار کس دن کام آئے گی؟ تلوار تو بنائی ہی اس لیے گئی تھی کہ اپنی جان و مال اور دین و ایمان کی حفاظت و حمایت میں بلند کی جائے اور یہی تعلیم اسلام کی ہے کہ اس کو اس وقت نیام سے باہر نکالا جائے جب دشمن تم پر یا تمھارے مذہب پر یا تمھارے ملک پر حملہ آور ہو۔

(ب) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرز عمل بھی اسی حقیقت پر شاہد ہے۔ آپ نے اسلام کی اشاعت کے لیے یا لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانے کے لیے یا دوسروں کو ان کے وطن سے محروم کرنے کے لیے کبھی ہرگز تلوار نہیں اٹھائی۔ آپ نے بلاشبہ جنگوں میں حصہ لیا لیکن وہ سب رفعِ فتنہ کے لیے تھیں۔

(ج) اپنے مذہب اور اپنے مقاماتِ مقدسہ مثلاً بہشتی مقبرہ اور منارۃ المسیح کی حفاظت کے لیے اپنا خون بہانے اور اپنی جانیں قربان کرنے کا اعلان خود قادیان کی سرزمین سے بھی کئی دفعہ ہو چکا ہے۔

الغرض جہاد کرنا انسانی فطرت کا تقاضا ہے' ہر شخص کو دنیا میں جینے اور آزادی کے ساتھ اپنی مذہبی روایاتِ پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے اور اگر کوئی طاقت اس معاملہ میں اس کی مزاحم ہو تو اس کا مقابلہ کرنا' حتیٰ یکون الدین کلمت اللہ' سراسر قرینِ عقل و صواب ہے۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ انسان جب تک اسے یقین نہ ہو جائے کہ میں کس مقصد کی تکمیل کر رہا ہوں' اس وقت تک اپنی تلوار نیام سے باہر نہیں نکال سکتا۔ انسان اس وقت جنگ کرتا ہے جب اپنے آپ کو برسرِ حق یقین کرتا ہے۔ حکومتیں انسانی فطرت کے اس پہلو سے آگاہ ہیں۔ اس لیے وہ' دنیاوی جنگوں کو بھی جن کا مقصد قتل و غارت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا' مقدس بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ صلیبی جنگوں کا مقصد دراصل یہ تھا کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکا جائے لیکن حکومتوں نے پادریوں کی وساطت سے ان جنگوں کو ''مقدس'' قرار دلوایا تا کہ لوگ آمادۂ پیکار ہو سکیں۔ حالانکہ صلیبی اقوام نے' ارضِ شام میں جس بربریت اور سفا کی کا مظاہرہ کیا اسے تقدس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ خود ہمارے زمانہ میں جو محاربہ عظیم یورپ میں برپا ہوا' برطانوی مدبرین نے اسے بھی پادریوں کے ''مقدس'' ہاتھوں سے تقدس و بپتسمہ دلوایا۔ چنانچہ کنٹربری کے اسقفِ اعظم نے اعلانات شائع کیے کہ شریکِ جنگ ہونے سے برطانیہ کو اپنا کوئی نفع مدنظر نہیں ہے۔ اس نے محض حق و صداقت کی حمایت میں تلوار اٹھائی ہے

اور کمزور کی حمایت کی غرض سے شریکِ جنگ ہوا ہے۔ حال ہی میں ایک انگریز مصنف نے جس کا نام Irene Cooper Wills ہے، جنگ عظیم کے متعلق ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے England's Holy War ''انگلستان کی جنگِ مقدس''۔ الغرض اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے تلوار چلانا، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں بھی ممنوع تھا (''لا اکراہ فی الدین'') اور آج بھی ممنوع ہے اور اسلام کی حمایت اور حفاظت کے لیے تلوار اٹھانا ابتدائے اسلام میں بھی جائز تھا اور آج بھی جائز ہے اور قیامت تک جائز رہے گا۔ مرزا صاحب سے جو غلطی دانستہ یا نادانستہ طور پر سرزد ہوئی، وہ یہ تھی کہ انھوں نے اسلامی جہاد کے غلط معنی دنیا کے سامنے پیش کیے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

اے دوستو جہاد کا اب چھوڑ دو خیال
دِیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال

ان دونوں مصرعوں میں جو لفظ ''اب'' آیا ہے اگرچہ ادبی زاویۂ نگاہ سے اس کی تکرار بہت مذموم ہے لیکن مرزا صاحب کی، اسلام سے ناواقفیت کا ثبوت دینے کے لیے بہت کافی ہے یعنی ان کا مطلب یہ ہے کہ دین کے لیے جنگ وقتال پہلے جائز تھا، اب جائز نہیں ہے۔ کس قدر عظیم الشان مغالطہ ہے جو انھوں نے دنیا کو دیا!

کاش انھیں تاریخ وفلسفۂ اسلام سے واقفیت ہوتی! بندۂ خدا! دین کی اشاعت کے لیے جہاد کرنا پہلے کب جائز تھا؟ جو تم آج ناجائز قرار دے رہے ہو؟ اسلام پہلے کب بزورِ شمشیر پھیلایا گیا جو آج تم ناصح مشفق بن کر اس کی ممانعت کر رہے ہو؟

اگر جوع الارض کو تسکین دینے کے لیے یا ملوکیت اور شہنشاہیت قائم کرنے کے لیے یا بے گناہ اقوام کو غلام بنانے کے لیے جہاد کیا جائے تو وہ جہاد ہی کب ہے؟ وہ تو غارت گری ہے۔ خود علامہ فرماتے ہیں:

جنگ شایانِ جہاں غارت گری است
جنگِ مومن سنتِ پیغمبری است [1]

تعجب ہوتا ہے تعلیم یافتہ احمدی حضرات پر کہ یہ لوگ کیونکر اس سفسطہ کا شکار ہو سکتے ہیں؟ کیا احمدیوں میں کوئی ایسا روشن خیال انسان نہیں جو اسلامی فلسفہ وتاریخ کا مطالعہ کر کے اس مغالطہ کی دلدل سے باہر نکل سکے؟ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو سکتی ہے کہ اسلام میں جہاد کا معنی اور مفہوم کیا ہے؟ جنگ اور قتال اگر اس کا محرک ہوسِ ملک گیری اور استعماری حکمتِ عملی ہو تو یہ بات اسلام میں کبھی بھی جائز نہ تھی۔ پھر مرزا صاحب اپنے اس ''الہامی شعر'' میں کس چیز کو حرام

قرار دے رہے ہیں؟ اسی بات کو نا' جو پہلے ہی سے حرام ہے تو حرام کو حرام قرار دینا یہ کون سی دانشمندی ہے؟ اور اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ خطرہ کے وقت بھی مسلمانوں کا اپنے مذہب کی حمایت میں تلوار اٹھانا حرام ہے' تو وہ مذہب اسلام سے اپنی ناواقفیت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں سے قادیانی حضرات جو صورت پسند کریں اختیار فرمالیں' مرزا صاحب کی علمی اور مذہبی پوزیشن بہر حال متزلزل ہو جائے گی۔ اگر پہلی صورت صحیح ہے تو مرزا صاحب مغالطہ کے مرتکب ثابت ہوتے اور دوسری صورت کو تسلیم کیا جائے تو اسلام کے اصولوں سے کورے نظر آتے ہیں۔

اسی لیے حکیم الامت علامہ اقبال مدظلہ نے مسلمانوں کو مرزا صاحب اور مرزائیت دونوں کی غلط تعلیمات سے محفوظ کر لینے کے لیے اسرارِ خودی میں اس حقیقت کو آشکار فرمادیا ہے کہ اسلام میں جہاد کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان کی زندگی کا مقصدِ وحید اعلائے کلمۃ اللہ ہے اور اگر کوئی طاقت مسلمان کو اس کے اس مذہبی فریضہ کی تکمیل سے باز رکھنا چاہے یا اس میں مزاحمت کرے تو وہ حق وصداقت کی حمایت میں تلوار اٹھا سکتا ہے۔ لیکن وہ جہاد جس کا مقصد جوع الارض ہو' تسخیرِ ممالک ہو یا قتل وغارت گری ہو' اسلام میں بالکل حرام ہے۔ چنانچہ علامہ فرماتے ہیں:

ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید
تیغ اُو در سینۂ او آرمید [2]

اب جو شخص بھی مرزا صاحب کے مذکورہ بالا شعر کو پڑھے گا وہ لامحالہ یہی سمجھے گا کہ دین کی اشاعت کے لیے پہلے اسلام میں جنگ وقتال جائز تھا یعنی نعوذ باللہ قرونِ اولیٰ میں اسلام کی اشاعت اس کے پاکیزہ اصولوں کی وجہ سے نہیں بلکہ تلوار کے زور سے ہوئی اور تیرہ سو سال کے بعد جا کر مرزا صاحب نے اس بات کو حرام قرار دیا ہے۔

معلوم نہیں مرزا صاحب نے جہاد کے متعلق یہ غلط خیال کیوں پھیلایا۔ شاید حکومت کی نظروں میں عزت حاصل کرنے کے لیے ورنہ یہ ایک حقیقت ہے کہ دین کی اشاعت کے لیے تلوار چلانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں بھی جائز نہ تھا اور نہ قرآن مجید کی اس صریح آیت کی موجودگی میں (لا اکراہ فی الدین) کسی کو بزورِ شمشیر مسلمان کرنا جائز ہو سکتا ہے اور اسلام تو سرتاپا معقولیت پسند مذہب ہے۔ وہ کب اس بات کو روا رکھ سکتا ہے کہ لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنایا جائے۔

اگر دین کے لیے جنگ وقتال مرزا صاحب سے پہلے حلال ہوتا تو ڈاکٹر آرنلڈ جو ایک سچا مسیحی تھا اور یقیناً مسلم نہ تھا کس طرح اپنی مشہور کتاب ''پریچنگ آف اسلام'' مرتب کر سکتا تھا؟ اس کتاب میں اس منصف مزاج انگریز نے اسلامی تاریخ کی بناء پر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچادی ہے کہ

اسلام اپنی ابتداء سے آج تک تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔[3]

(2) قادیان کے مسلکِ جاسوسی پر عمل کرنے کے لیے دوسرا اعتراض مدیر "سن رائز" نے یہ کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب اسلامی ممالک پر برطانی اقتدار کو ناپسند کرتے ہیں اور دولِ مغرب کی استعماری حکمتِ عملی کے خلاف ہیں۔

جہاں تک میں نے غور کیا اس باب میں بھی' مدیر مذکور کی ناراضگی کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تمہارا مسلک انگریزوں کی غلامی ہے۔ یہ تمھیں مبارک رہے۔ ڈاکٹر صاحب کا مسلک درسِ حریت و آزادی ہے وہ انھیں مبارک رہے' آخر تم کو ان پر اعتراض کرنے اور ان کی تعلیم پر ناک بھوں چڑھانے کا کیا حق حاصل ہے؟ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنے مسلک کی یا اس بات کی جسے وہ صحیح سمجھتا ہے تبلیغ کرے اور بلا خوف و خطر تبلیغ کرے۔ دیکھنا اگر ہے تو یہ' اور غور کے قابل اگر کوئی بات ہے تو یہ کہ کس کی تعلیم منشائے اسلام کے مطابق ہے؟

قادیانیوں کے مذہب میں مسلمانوں کو غلامی کا سبق پڑھانا جائز بلکہ فرضِ عین ہے۔ چنانچہ مرزا صاحب خود لکھتے ہیں کہ ہمارے مذہب کے دو خاص جزو ہیں: ایک خدا کی اطاعت دوسرا گورنمنٹ برطانیہ کی اطاعت۔ اور ان کی تمام عمر مسلمانوں کو درسِ غلامی دینے اور ان کے جذباتِ حریت کو فنا کرنے میں گزری اور کیوں نہ گزرتی؟ وہ اپنے قائم کردہ سلسلہ کو جسے وہ حقیقی اسلام کہتے تھے' سرکارِ انگلشیہ کا "خود کاشتہ پودا" قرار دیتے ہیں اور اس بات کو بڑے فخر و مباہات سے بیان کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو اسلام برطانیہ کے زیرِ حمایت سرسبز ہو وہ یقیناً اُس اسلام سے کوئی نسبت نہیں رکھتا جس کی صداقت کا آفتاب فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہوا تھا۔ وہ اسلام تو دنیا میں حریت اور آزادی کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ اس میں دُوئی کی مطلق گنجائش نہیں' وہ تو صرف ایک ذاتِ مطلق کی اطاعت کا حکم دیتا ہے اور وہ ذات اللہ ہے چنانچہ مسلمان صرف اللہ کا مطیع ہوسکتا ہے' غیر اللہ کے سامنے اس کی گردن قیامت تک نہیں جھک سکتی۔ شریعت کا مسئلہ ہے کہ دنیاوی حکومت کا کوئی حکم' خدا کے حکم کے خلاف ہو تو مسلمان کا فرضِ اوّلین یہ ہے کہ غیر اللہ کے حکم کو ٹھکرا دے۔ چنانچہ اسوۂ حسینی اس پر شاہد عادل ہے:

تا قیامت قطع استبداد کرد
موجِ خون او چمن ایجاد کرد[4]

تاریخ شاہد ہے کہ انبیاء اپنی قوم کو درسِ حریت دینے کے لیے مبعوث ہوا کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کو مصریوں کی غلامی سے نجات دلائی' حضرت داؤدؑ نے اپنی قوم کو حکومت اور طاقت عطا کی' حضرت عیسیٰؑ نے بھی یہود کو رومیوں کی غلامی سے نجات دلانے کی کوشش کی' حضرت ختم

المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنی قوم کو حکومت اور طاقت عطا کی لیکن چودھویں صدی ہجری میں جو ''نبی'' پیدا ہوا اس نے اپنی تمام عمر قوم کو غلامی کا درس دیا اور

گفت دیں را رونق از محکومی است
زندگانی از خودی محرومی است
دولتِ اغیار را رحمت شمرد
رقص ہا گردِ کلیسا کرد و مرد 5

اگر مرزا صاحب کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کا درد ہوتا تو وہ کبھی اپنی قوم کو اغیار کی غلامی کا درس نہ دیتے لیکن وہ تو تمام عمر منارۃ المسیح' بہشتی مقبرہ اور توسیع مکان کی تکمیل کی فکر میں سرگرداں رہے۔ قوم کی فکر تھی ہی کب اور ہوتی بھی تو کیونکر؟

اس کے برخلاف' علامہ کے دل میں اپنی قوم کا درد ہے! اور یہی درد تو انھیں مسلمانوں سے اس طرح خطاب کرنے پر مجبور کرتا ہے:

اے مسلماں! اندریں دیرِ کہن
تا کجا باشی اسیرِ اہرمن؟ 6
زیستن تا کے بہ بحر اندر چو خس
سخت شو چوں کوہ از ضبطِ نفس 7

پھر کہتے ہیں:

دانی از افرنگ و از کارِ فرنگ
تا کجا در قیدِ زنارِ فرنگ؟
زخم ازو نشتر ازو سوزن ازو
ما و جوئے خون و امید رفو؟ 8

یہی درد تو انھیں مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی قوم کے افراد کو بیداری' سخت کوشی اور جدوجہد کا پیغام دیتے ہیں:

شیخِ ملت با حدیثِ دل نشیں
بر مرادِ اُو کند تجدیدِ دیں 9

(3) تیسری بات جس پر مدیر مذکور ڈاکٹر صاحب سے خفا ہیں یہ ہے کہ وہ بے قوت وشوکت نبوت کو، برگ حشیش سے تعبیر کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تم خود تسلیم کرتے ہو کہ مرزا صاحب

قادیانی کی نبوت بے قوت تھی تو پھر ڈاکٹر صاحب نے اسے برگِ حشیش سے تعبیر کیا تو کیا برا کیا' کیا دو اور دو کو چار کہنا جرم ہے! بلاشبہ

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام [10]

ڈاکٹر صاحب نے اس شعر میں مرزا صاحب کا نام نہیں لیا۔ صرف ایک حقیقت بیان کی ہے لیکن تم نے اس شعر کو ان کی طرف منسوب کر کے خود پردۂ نبوت کو چاک چاک کر دیا۔

تم بے قوت نبوت کو آیۂ رحمت سمجھتے ہو۔ ڈاکٹر صاحب اسے برگِ حشیش تصور فرماتے ہیں پھر جب فی مابین اتحادِ خیال ہی نہیں تو ڈاکٹر صاحب سے شکوہ کس بات کا ہے؟

چونکہ ڈاکٹر صاحب ایسی نبوت کو برگِ حشیش سمجھتے ہیں اس لیے ان کا فرض تھا کہ مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیں کہ ایسی نبوت جو مسلمانوں کو غلامی کا سبق پڑھائے' ان کے حق میں برگِ حشیش سے کم نہیں۔ علامہ نے مسلمانوں کو اس فتنہ سے آگاہ کر کے اپنا وہ فرض ادا کیا ہے جو حکیم الامت' مصلحِ قوم اور دانائے راز ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتا تھا۔

خدارا ہمیں یہ تو بتایا جائے کہ مرزا صاحب کی اس نبوت اور ان کے لاتعداد الہامات سے مسلمانوں کو من حیث القوم کیا فائدہ پہنچا؟ نبوت بلاشبہ رحمتِ الٰہی ہے لیکن اس نبوت کو کس چیز سے تعبیر کیا جائے جو قوم کی غلامی کی زنجیروں کو اور زیادہ مضبوط کرے۔

اس وقت ہمارے سامنے یہ سوال نہیں کہ مرزا صاحب نے جو الہامات شائع کیے' وہ صحیح تھے یا غلط؟ سچے تھے یا جھوٹے؟ سوال تو یہ ہے کہ خدائے قدوس نے جو الہامات ان پر نازل فرمائے ہمارے لیے ان کی قیمت کیا ہے؟ کیا ان کی مدد سے یا ان پر عمل کرنے سے مسلمانوں کی موجودہ سیاسی' اقتصادی اور تمدنی مشکلات کا خاتمہ ہو سکتا ہے؟

آج مسلمان جن روح فرسا مصائب سے دوچار ہیں ان میں دو سب سے اہم ہیں اولاً استعمار پرستانِ مغرب کی دسیسہ کاریاں اور دست درازیاں' ثانیاً افلاس اور اقتصادی بدحالی۔ کیا مرزا صاحب کے الہامات میں مسلمانوں کی ان دو مصیبتوں کا کوئی علاج مل سکتا ہے؟ ایک دنیا اس حقیقت کا اعتراف کر رہی ہے کہ مسلمان رُو بزوال ہیں اور ان کے زوال کا اصلی سبب بے زری نہیں' بلکہ رگوں میں خون کا سرد ہو جانا' لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس سرد شدہ خون کو از سرِ نو گرمایا جائے۔ کیا مرزا صاحب کے الہامات مثلاً (1) ربنا العاج (2) بست روپیہ آنے والے ہیں (3) پیٹ پھٹ گیا (4) شاتان تذبحان و غیر ذالک کے وردِ زبان کرنے یا' ان پر عمل کرنے سے مسلمانوں میں شانِ

کراری پیدا ہو سکتی ہے؟ جہاں تک ہمیں معلوم ہو سکا ہے ان کے تمام الہامات' ارشادات' ملفوظات اور تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ غلامی پر قناعت کرو اور دن رات انگریزی حکومت کے گن گاتے رہو۔ محکوموں کے درد کا مداوا یہ نہیں کہ انھیں غلامی کا سبق پڑھایا جائے۔ آج ہمیں مفلوج اور مجہول بنانے والے الہام کی ضرورت نہیں بلکہ ایسے الہام کی جو مردہ رگوں میں حیات پیدا کر سکے:

دنیا کو ہے اس مہدئ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلہ عالمِ افکار [11]

جو نبوت قوم کے افراد کو آغوشِ غلامی میں سُلانے کی کوشش کرے وہ برگِ حشیش نہیں تو اور کیا ہے؟

الہامات شائع کرنے کے علاوہ دوسرا کارنامہ مرزا صاحب کا پیشگوئیاں شائع کرنا اور ان کو اپنی صداقت کا نشان ٹھہرانا ہے۔ کما قال:

ہاں! نہ کر جلدی سے انکار اے سفیہ ناشناس
اس پہ ہے میری سچائی کا سبھی دار و مدار

(مرزا قادیانی)

لیکن وہی سوال یہاں بھی درپیش ہے کہ ان متعدد پیشگوئیوں کے شائع کرنے سے جن میں اکثر و بیشتر پوری نہیں ہوئیں' مسلمانوں کو کیا دینی یا دنیاوی فائدہ پہنچا؟ ہاں مرزا صاحب کی جودتِ طبع کی داد ضرور دینی چاہیے کہ جب کسی پیشگوئی کے پورا نہ ہونے کے بعد مریدانِ باصفا' اس کی وجہ ان سے دریافت فرماتے تھے تو وہ نہایت تسلی بخش جواب دے دیا کرتے تھے۔ مثلاً آتھم والی پیشگوئی اور محمدی بیگم والی پیشگوئیاں پوری نہ ہوئیں تو انھوں نے متشککین کی یہ کہہ کر تسلی کر دی کہ میری پیش گوئیوں میں عموماً ایک پہلو مخفی ہوتا ہے۔ جس شخص کے متعلق کی جاتی ہے اگر وہ دل میں ڈر جائے تو پیشگوئی التواء کے دفتر میں منتقل ہو جاتی ہے۔

اس جواب کو منطقی پیرایہ میں یوں بیان کر سکتے ہیں:

سوال: آتھم کو سزا کیوں نہیں ملی؟

جواب: وہ دل میں ڈر گیا تھا۔

سوال: اس کے دل میں ڈرنے کا کیا ثبوت ہے؟

جواب: کیونکہ اسے سزا نہیں ملی۔

یہ ہے قادیانی منطق! جس پر یونانی سوفسطائیوں کی ارواح بھی وجد کر رہی ہوں گی لیکن تعجب تو یہ ہے کہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ احمدی بھی اس منطقی مغالطہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مرزا صاحب نے بہشتی مقبرہ کی تعمیر کا اعلان شائع کیا تو لامحالہ یہ اعتراض وارد ہوا کہ جناب! پھر تو ایمان اور اعمال صالحہ کی ضرورت ہی نہ رہی۔ جس کسی نے بہشتی مقبرہ میں مدفون ہونے کا انتظام کر لیا اسے نجات کا سرٹیفکیٹ بلکہ یوں کہیے کہ بہشت کا پاسپورٹ مل گیا' تو آپ کے تعمیر کردہ بہشتی مقبرہ میں اور پاپایان روم کے ''تذکرۃ الغفران'' میں کیا فرق باقی رہا؟ سوال معقول تھا لیکن قربان جایئے مرزا صاحب کے ذہنِ رسا کے، جواب بھی ترشا ترشایا رکھا تھا۔ فرماتے ہیں:

''میں یہ تو نہیں کہتا کہ جو شخص اس مقبرہ میں مدفون ہو گا وہ بہشتی ہو جائے گا لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ بہشتی لوگ ہی اس مقبرہ میں مدفون ہوں گے۔'' سارے مریدانِ باصفا کی اس معقول جواب سے تسلی ہوگئی اور آج ''شیخ کلیسا'' کی یہ زندہ یادگار' زبانِ حال سے جملہ احمدیانِ کرام کو مژدۂ بہشت سنا رہی ہے۔ چنانچہ جائدادیں وقف ہو رہی ہیں' کتبے لگائے جا رہے ہیں اور ان کو دیکھ دیکھ کر ایمان تازہ ہو رہا ہے۔ سچ کہا ہے کسی عقلمند نے کہ ''یہ دنیا کبھی سادہ لوحوں سے خالی ہوئی ہے' نہ آئندہ ہونے کی امید ہے۔''[12]

سچ پوچھا جائے تو ہمیں تو مرزا صاحب سے دلی ہمدردی ہے۔ نہ ان کو اسلامی تاریخ سے واسطہ تھا نہ مسیحیت کی تاریخ سے کوئی علاقہ۔ ان کی ساری عمر ''مثیلِ مسیح'' کا دعویٰ کرنے میں گزر گئی۔ لیکن انھیں آخر وقت تک یہ پتہ نہ چلا کہ میں کس مسیح کے مثیل ہونے کا دعویٰ کر رہا ہوں؟ آیئے مرزا صاحب کی معلومات کے اس پہلو کو بھی ذرا واضح کر دیں۔

جن لوگوں نے تاریخِ یورپ اور اسلام اور مسیحیت کی تاریخ کا غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ موجودہ اناجیل یعنی عہد جدید' کا مسیح اور قرآن مجید کا مسیح دو مختلف اشخاص ہیں جن کو ایک دوسرے سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جس مسیح کا مذکور ہے وہ اللہ کے برگزیدہ رسول تھے اور ان کی بعثت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یہود کو رومیوں کی غلامی سے نجات دلائیں جیسا کہ شروع سے تمام انبیاء کا مقصد رہا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے اپنی قوم کو درسِ حریت دیا۔

جس طرح تمام سلطنتوں کا قاعدہ ہوتا ہے کہ وہ اس بات کو روا نہیں رکھ سکتیں کہ کوئی شخص' محکوموں کو اس برگِ حشیش کا اُتار پلائے جو ازل سے شہنشاہیت کے دسترخوان سے رعایا کو مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔ رومی حکومت بھی اس بات کو برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ جناب مسیح علیہ السلام' قومِ یہود کو حریت کا سبق پڑھائیں' یا ان کے دل میں لیلائے آزادی سے ہمکنار ہونے کی تمنا پیدا کریں۔ پس حکومتِ وقت نے نہایت چابکدستی کے ساتھ علمائے یہود کو آلۂ کار بنایا اور ان کی مدد سے ''حکومت کے باغی'' کو کانٹوں کا

تاج پہنا کر اپنی راہ سے ہٹا دیا۔

جب حکومت کو جنابِ مسیح کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو اس نے دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ اصلی انجیل کو جو آرامی یا عبرانی زبان میں تھی اور جس میں یقیناً غیر اللہ کی غلامی سے نکلنے کی تاکید ہو گی' رفتہ رفتہ صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لیے نابود کر دیا' اور اس کی جگہ مختلف شہروں میں مختلف ''انجیلیں'' پیدا کر دیں' جن کی تعلیمات مذہبی حکومت کے منشاء کے مطابق تھیں۔ کلیسا کے مورخین نے اپنی کتابوں میں تقریباً 150 انجیلوں کا ذکر کیا ہے جو یہود میں تشتت اور افتراق پیدا کرنے کے لیے حکومت کے ایماء سے مختلف اوقات میں مختلف لوگوں نے مرتب کیں۔ جب قسطنطین سریر آرائے (سلطنت ہوا تو اس کی) حکومت میں تو صلیب پرستوں کو عروج حاصل ہوا اور انھوں نے اپنی منشاء کے مطابق چار انجیلیں اور شاگردوں کے خطوط منتخب کر کے ''عہدِ جدید'' مرتب کر دیا جو آج ہمارے سامنے موجود ہے' جس کا قدیم ترین نسخہ یونانی زبان میں پانچویں صدی عیسوی کا لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس سے پہلے کا حال پردۂ خفا میں مستور ہے لیکن اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ جناب مسیح نے اگر کوئی کتاب اپنی قوم کو دی ہو گی تو وہ یونانی میں نہیں بلکہ عبرانی یا آرامی زبان میں ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ مسیح کی انجیل کے اس رومن ایڈیشن میں آپ کو ایسی ایسی باتیں ملیں گی جو ہرگز ہرگز خدا کے کسی اولوالعزم نبی کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ مثلاً قیصر کا حق قیصر کو دو'یا میری بادشاہت اس دنیا کی نہیں ہے' وغیرہ وغیرہ۔ یہود کو رومی قوم سے سخت نفرت تھی لیکن اس انجیل کے مطالعہ سے یہ بات قطعاً ظاہر نہیں ہوتی۔ موجودہ انجیل دونوں کو یہود کی نظروں سے اوجھل کر کے ایک خود ساختہ مسیح اور خود پرداختہ انجیل قوم کو دی۔ موجودہ انجیلوں کا مسیح تو ایک ''صوفی مسیحا'' نظر آتا ہے جو ترکِ دنیا پر اور تجرد اور غلامی پر قناعت کرنے پر زور دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب باتیں رومی حکومت کے لیے مفید تھیں۔ اب مرزا صاحب کو دیکھیے۔ آپ نے بھی برطانی حکومت کی اطاعت کو جزوِ ایمان قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو برگِ حشیش پلانے کی سعیِ ناکام کی ہے۔ جس طرح موجودہ انجیل کا پیش کردہ مسیح رومی حکومت کا مطیع نظر آتا ہے اسی طرح موجودہ زمانہ کا ''مثیلِ مسیح'' برطانی حکومت کا مطیع نظر آتا ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ مرزا صاحب مثیلِ مسیح تو ہیں مگر نقلی مسیح کے مثیل ہیں' جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے نہ احادیث میں۔

واضح ہو کہ مرزا صاحب نے ایک مرتبہ ضلع گورداسپور کے ایسے افراد کی فہرست مرتب کی تھی جو اُن کی نظر میں ''وفادار'' نہ تھے اور حکومت کو ان کے متعلق معلومات بہم پہنچائی تھیں۔ مرزائیوں نے اکثر اوقات اپنے مرشد کی اس تعلیم پر عمل کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلامی ممالک میں احمدیت کے ان مبلغین کو ''برطانوی جاسوس'' سمجھا جاتا ہے۔ غالباً اسی اصولِ جاسوسی کے ماتحت مدیرِ سن رائز نے بھی حکومت کو

یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ علامہ اقبال مسلمانوں کو درسِ حریت دے رہے ہیں اور ممکن ہے کہ ان کے پیغام کو پڑھ کر مسلمانانِ ہند اُن کے ہم خیال ہو جائیں۔

مدیر مذکور کو معلوم ہونا چاہیے کہ علامہ موصوف خدا کے فضل و کرم سے' مرزائیوں کے اس فعل کو پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتے۔ انھیں اس کی مطلق پروا نہیں اگر حکومت کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ مسلمانوں کو بیدار کر رہے ہیں۔ یقیناً مسلمانوں کو بیدار کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ شاید مرزائیوں کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ مسلمانوں کو بیدار کرنا ہی علامہ موصوف کی زندگی کا واحد مقصد ہے۔ ''ولو کرہ الکافرون۔''

بیشک علامہ موصوف' اسلامی ممالک پر دولِ مغرب کے تسلط و اقتدار کو ناپسند کرتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ کوئی مسلمان جس کے دل میں اسلام کی محبت ہے ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتا کہ اسلامی ممالک' استعمار پرستانِ مغرب کی ہوس پرستی کا شکار ہو جائیں۔ ابھی چند روز کی بات ہے کہ بہت سے مسلمان ارکانِ اسمبلی کے وفد نے جو وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوا تھا صاف لفظوں میں حکومت کو بتا دیا کہ مسلمانانِ ہند حکومت برطانیہ کی اس حکمتِ عملی کو جو فلسطین کے متعلق کارفرما ہے' سخت ناپسند کرتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ خود حکومت برطانیہ بھی اس حقیقت سے آگاہ ہو چکی ہے کہ مسلمانانِ عالم اس کی استعماری پالیسی سے سخت بیزار ہو چکے ہیں' چنانچہ انگلستان کے بعض مدبرین اور امرائے سلطنت جن کے ناموں سے دنیا واقف ہے مسلمانوں سے دوستی پیدا کرنے کے لیے ایک انجمن بھی قائم کر چکے ہیں اور حکومت کو بہت سے سیاسی مبصر اکثر متنبہ کرتے رہتے ہیں کہ اسے مسلمانوں کے جذبات کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔ لہٰذا مدیر ''سن رائز'' کو مطمئن رہنا چاہیے کہ علامہ موصوف یا مسلمانانِ ہند پر اُن کی اِن گیدڑ بھبکیوں کا مطلق کوئی اثر مرتب نہ ہوگا۔

تبصرہ نگار نے اس ریویو میں یہ بھی لکھا ہے کہ اقبال کے کلام میں شعریت نہیں ہے۔ ہمیں یہ الفاظ پڑھ کر مطلق تعجب نہیں ہوا کیونکہ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست والا مضمون ہے۔ جو لوگ مرزا صاحب کو سلطان القلم کہتے ہیں اور ''درثمین'' کے اشعار کو مزے لے لے کر پڑھتے ہیں' وہ بالِ جبریل یا ضربِ کلیم کے اشعار کی قدر و منزلت کس طرح کر سکتے ہیں۔

مدیر مذکور کا یہ کہنا کہ ڈاکٹر صاحب کے کلام میں تلخی پائی جاتی ہے۔ سو اس کے متعلق گزارش ہے کہ تلخی اور تلخ کامی جو ناکامی کا نتیجہ ہے' وہ تو کچھ قادیان ہی کے حصے میں آئی ہے۔ پرانی باتوں کو جانے دیجیے۔ سیّدنا حضرت خلیفۃ المسیح اور سیّدنا حضرت امیر قوم کے خطبات و ارشادات ہی کو دیکھ لیجیے جو ہر ہفتے الفضل اور پیغام صلح میں شائع ہوتے ہیں اور جن میں ایک دوسرے کے خلاف کیا کیا زہر اگلا

جاتا ہے۔ کیا مدیر ''سن رائز'' چاہتے ہیں کہ ہم انھیں ''او بدذات فرقۂ مولویان'' اور ''ذریت البغایا'' جیسی نادر ترکیبیں از سرِ نو یاد دلائیں؟

اس بات کا تو دشمنوں کو بھی اعتراف ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے کلام میں بشارت ہے' امید ہے' جوش ہے' پاکیزگی ہے۔ مسرت ہے' مختصر یہ کہ نویدِ حیات ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اگر احمدیت کو بے نقاب کیا ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ اسے اسلام کی سیاسی طاقت کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں بلکہ وہ اسے اسلام کی وحدت کے لیے ضرور مضرت رساں خیال فرماتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مرزا صاحب نے بھولے بھالے مسلمانوں کو اسلام کے لباس میں جلوہ گر ہو کر راہِ راست سے ورغلایا۔ انھوں نے یہ کہہ کر ناواقف مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کی کہ میں کسرِ صلیب کے لیے مبعوث ہوں حالانکہ وہ خود مدۃ العمر صلیب پرستوں سے دادِ وفاداری طلب کرتے رہے اور اس مطلب کے چند الہام بھی شائع کیے۔ مگر افسوس کہ کچھ قدر دانی نہ ہوئی۔ صلیب کی مخالفت مگر صلیبی قوتوں کی حمایت کیسا عجیب فلسفہ ہے۔ گلگلے کھانا مگر تیل سے پرہیز کرنا غالباً ایسے ہی موقعوں کے لیے کہا گیا ہوگا۔ اگر انھیں یورپین تاریخ سے واقفیت ہوتی تو شاید اس قسم کا دعویٰ کرنے کی زحمت گوارا نہ فرماتے کیونکہ ظاہری اور معنوی دونوں پہلوؤں سے یہ کام خود یورپ ہی نے مرزا صاحب کی پیدائش سے پہلے سرانجام دے دیا تھا۔

معنوی رنگ میں کسر کا دور اٹھارویں صدی میں شروع ہوا جب خود عقلائے یورپ نے ریفارمیشن کے بعد مسیحیت کے خلاف عقل اور مشرکانہ عقائد کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ تثلیث' تجسم' کفارہ' ہبوط آدم' سرنوشت ازلی' معصومیتِ پوپ' استحالہ جوہری' عشائے ربانی' الوہیتِ مسیحی اور الہامِ انجیل سب کے پرخچے اڑا دیے اور انیسویں صدی میں تو سٹراؤس نے یسوع کی شخصیت ہی کو **(Myth)** ثابت کر دیا اور **Baur** نے تنقید بائبل کے اصول مدون کر کے اس ''الہامی مجموعہ'' کو بالکل پایۂ اعتبار سے ساقط کر دیا۔ آج یورپ اور امریکہ میں فی صدی ایک تعلیم یافتہ انسان بھی ان عقائد پر ایمان نہیں رکھتا اور خود کلیسائی عہدہ داروں کو اس تلخ حقیقت کا اعتراف ہے۔ ظاہری رنگ میں کسرِ صلیب کا نظارہ خود بیسویں صدی میں ہماری آنکھوں نے دیکھ لیا جبکہ بالشویکوں نے مسیحیت کو بہ یک بنی و دو گوش اور اس کے ساتھ ہی مذہب کو بھی اپنے ملک سے خارج کر دیا۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ
لا سلاطیں لا کلیسا لا الٰہ [13]

الغرض کسرِ صلیب تو جس حد تک کی' یورپ نے کی۔ ہمارے مرزا صاحب نے کیا کیا؟ ہماری دانست میں انھوں نے اگر کچھ کیا تو یہ کہ مسلمانوں کو جنابِ مسیح کی قبر کا پتہ بتا دیا۔ حالانکہ وہ قبر جناب مسیح

کی نہیں بلکہ یوز آسف کی ہے جو بدھ مذہب کا ایک سرگرم مبلغ تھا۔ مرزا صاحب نے یوز کو بیک جُنبشِ قلم ''یوز'' بنادیا اور ''یوز'' کا سلسلہ یسوع سے ملا دیا۔ 14

حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم پر غلامی مسلط ہو جاتی ہے تو اس کے افراد کی زندگی کے ہر شعبہ میں کاہلی' تن آسانی اور بزدلی پیدا ہو جاتی ہے' جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قوم زندگی کی کشمکش میں حصہ لینے اور اس کی مشکلات کا مقابلہ کرنے سے گریز کرتی ہے چنانچہ آپ مسلمانوں کے گزشتہ تین چار سو سالوں کے آرٹ' لٹریچر' مذہب اور تصوف کا مطالعہ کر لیجئے' یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکار ہو جائے گی۔

ہندی مسلمانوں کو شاعری وہ پسند آتی ہے جس میں خلافِ عقل باتیں بیان کی گئی ہوں' جن کو حقیقت اور واقعیت سے کوئی سروکار نہ ہو۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ اپنی شاعری میں حقائقِ کائنات بیان کرتا ہے یا انھیں حقائقِ زندگی کی طرف بلاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ شاعری تو نثر کی طرح روکھی پھیکی ہے شاعری ہی نہیں ہے۔

تصوف اور مذہب کی وہ تاویل پسند آتی ہے جو ان کے لیے ترکِ دنیا اور تن آسانی کا جواز پیدا کر سکے اور مسیح موعود اور مہدیِ معہود کے ظہور کے انتظار میں زندگی بسر کرنے کا موقع دے سکے۔

تحریکِ احمدیت' اسلامیانِ ہند کی اس غیر اسلامی ذہنیت کی پیداوار اور اُن کے انحطاط پر ایک روشن شہادت ہے۔ یہ ان کے زوال کی جیتی جاگتی تصویر ہے جو آج ہمیں نظر آ رہی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس تحریک کا تمامتر خلاصہ اور مقصد ہی یہ ہے کہ زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے سے گریز کیا جائے اور اغیار کی غلامی کو موجبِ رحمت سمجھا جائے۔

اس خاص قسم کی نبوت کی غرض و غایت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کو برگِ حشیش کے جام پلائے جائیں اور ان کو ایسی خواب آور گولیاں' مذہب کے ورق میں لپیٹ لپیٹ کر کھلائی جائیں کہ وہ اپنی ذلت اور نکبت' محکومی اور غلامی' پستی اور خواری کسی چیز کا احساس ہی نہ کر سکیں۔ اگر میرا یہ قول باور نہ ہو تو تحریکِ احمدیت کا مطالعہ کر کے دیکھ لیجئے۔ سوال یہ ہے کہ اس تحریک نے' مسلمانوں کو اپنی حالت کے سنوارنے کا' اپنی سیاسی' اقتصادی اور معاشرتی مشکلات کے دور کرنے کا اور دنیا میں عزت اور شرافت کی زندگی بسر کرنے کا کیا طریقہ سکھایا ہے؟

اگر آپ مرزا صاحب کی تعلیمات کے ساتھ علامہ اقبال کے کلام اور ان کے روح افروز پیغام کا مقابلہ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دنیائے اسلام کے اس عدیم المثال شاعر کے سامنے' سر زمین پنجاب کا یہ ''نبی'' ادعائے وحی والہام اور پچاس الماری کتابوں اور لایعنی پیشگوئیوں کے باوجود' کوئی

حقیقت نہیں رکھتا۔ ان دونوں میں موازنہ چہ معنی دارد؛ دور کی بھی نسبت نہیں ہے؛ ایک اپنی قوم کو آزادی اور سربلندی کا درس دے رہا ہے؛ دوسرا اسے غلامی اور رسوائی کے قعرِ مذلت کی طرف لے جا رہا ہے۔ 15

آج مسلمانوں کے لیے جو مسائل' موت و زیست کا حکم رکھتے ہیں وہ یہ نہیں کہ مسیح مر گئے یا زندہ ہیں؟ اور مرزا غلام احمد قادیانی مثیلِ مسیح ہیں یا نہیں بلکہ یہ کہ غلامی کی زنجیریں کیونکر کٹیں؟ اور استعمار پرستانِ مغرب کے چنگل سے رہائی کیونکر نصیب ہو۔ جو نبی اس غلامی کو رحمت قرار دیتا ہو' اس کی تعلیمات میں' مسلمانوں کی موجودہ مشکلات کا حل تلاش کرنا ایسا ہی ہے، جیسے ''چیل کے گھونسلے میں ماس'' تلاش کرنا۔

یہ پیشگوئی کہ تین سو سال کے بعد تمام دنیا احمدی ہو جائے گی مسلمانوں کے موجودہ مصائب کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔ پس میں تمام احمدیوں کو مخلصانہ طور پر نصیحت کرتا ہوں کہ اگر وہ اسلام کے دوست ہیں' جیسا کہ وہ بیان کرتے ہیں تو برائے خدا پنجاب کے بھولے بھالے مسلمانوں کی حالت پر رحم فرمائیں اور انھیں غلامی کا سبق پڑھانے سے باز آ جائیں۔

مسلمان بہت دنوں تک خوابِ غفلت میں سوتے رہے اور دشمنوں کو دوست سمجھتے رہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اقبال کے کلام میں حیاتِ تازہ کا سامان تلاش کریں۔ اقبال شاعر نہیں بلکہ مسیحا ہے۔ اس کا کلام مردہ دلوں کو زندگی بخشتا ہے اور اس کا پیغام فی الحقیقت اسلام ہی کا پیغام ہے۔ اسی لیے وہ کہتا ہے:

از تب و تابم نصیب خود بگیر
بعد ازین ناید چو من مردِ فقیر 16
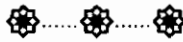
حواشی

1. کلیاتِ اقبال صفحہ 773۔
2. کلیاتِ اقبال صفحہ 64۔
3. خواجہ کمال الدین جو مرزا صاحب کے نہایت معتمد اور وفادار مریدوں میں سے تھے' اپنی کتاب ینابیع المسیحیت کے ضمیمہ موسومہ اسلامی اصولِ جنگ میں رقمطراز ہیں۔ بعض اوقات ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ انسان کے لیے اپنے دین کی حمایت میں تلوار اٹھانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ جنابِ مسیح کو اپنی قوم کی غلامی کا احساس تکلیف نہیں دیتا تھا؟ اور اگر انھیں موقع ملتا تو کیا وہ اپنی قوم کی بہبود کے لیے مدافعانہ جنگ کا اعلان

نہ کرتے؟

اسی کو دوسرے لفظوں میں جہاد کہتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ مرزا صاحب کے ایک قابل اور تعلیم یافتہ مرید جنھوں نے برسوں اپنے مرشد کی صحبت میں رہ کر فیض حاصل کیا تھا' بھی اسلامی جہاد کو جائز سمجھتے تھے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے مذہب کی حمایت میں تلوار اٹھا سکتا ہے۔

ہماری رائے میں مناسب ہے کہ قادیانی اور لاہوری فریق پہلے آپس میں تبادلۂ خیال کر کے یہ فیصلہ کر لیں کہ خواجہ صاحب کا نظریہ مسلکِ احمدیت کے مطابق ہے یا مخالف۔ (مصنف)

4 کلیاتِ اقبال صفحہ 110۔

5 کلیاتِ اقبال صفحہ 820۔

6 بعد میں اقبال نے یہ مصرع یوں بدل دیا: تا کجا باشی بہ بندِ اہرمن' کلیاتِ اقبال صفحہ 833۔

7 کلیاتِ اقبال صفحہ 833۔

8 کلیاتِ اقبال صفحہ 842۔

9 کلیاتِ اقبال صفحہ 811۔

10 کلیاتِ اقبال صفحہ 518۔

11 کلیاتِ اقبال صفحہ 506۔

12 لیکن اس قسم کی ایجاد کا سہرا بھی مرزا صاحب کے ایک پیشرو مختار کے سر پر ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے امام حسینؓ کے دشمنوں سے جنگ کی تھی اور اس طرح حامیانِ آلِ علی کی ہمدردی اسے حاصل ہو گئی تھی۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر اس نے ایک نئے فرقہ کی بنیاد ڈال دی جسے تاریخ میں کیسانیہ کا نام دیا گیا ہے۔ مختار نے مامور من اللہ اور ملہم ربانی ہونے کا دعویٰ کیا اور بہت سے سادہ لوح اس کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ آگے چل کر اس نے پیشگوئیوں کا سلسلہ بھی شروع کیا جن میں سے اکثر پوری نہیں ہوئیں۔ اس پر اس کے بعض منچلے مریدوں نے اس سے سوال کیا کہ حضرت! یہ کیا بات ہے کہ آپ کی فلاں پیشگوئی' جس کے متعلق آپ نے نہایت وثوق کے ساتھ کہا تھا کہ ضرور پوری ہو گی' پوری نہ ہوئی؟ مختار نے کہا میں دو دن کے بعد اس سوال کا جواب دوں گا۔ سوال مشکل تھا لیکن مختار کے جودتِ طبع دماغ نے عین وقت پر اس کی امداد کی اور جو جواب اس نے دیا وہ آج شیعہ علم کلام کا ایک اہم مسئلہ سمجھا جاتا ہے جسے بدا کہتے ہیں۔ وہ یہ تھا کہ خدا پہلے ایک کام کا ارادہ کرتا ہے اور اس سے اپنے مقربینِ بارگاہ کو مطلع کر دیتا ہے لیکن پھر کسی وجہ سے ارادہ بدل دیتا ہے' اس لیے وہ بات پوری نہیں ہوتی اور محدود الفہم انسانوں کو دھوکہ لگ جاتا ہے۔ (مصنف)

13 کلیاتِ اقبال صفحہ 815۔

14 اب رہا مرزا صاحب کا یہ فرمانا:

چوں مرا نورے پئے قوم مسیحی دادہ اند
مصلحت را ابن مریم نام من بنہادہ اند

یعنی آپ نے اپنے نزول کا دوسرا مقصد یہ قرار دیا ہے کہ آپ کی تعلیم سے مسیحی لوگ اسلام کی طرف مائل ہوں گے اور ہندوستان میں ''یدخلون فی دین اللّٰہ'' کا نظارہ دوبارہ دیکھنے میں آئے گا۔ تو اس کے متعلق عرض ہے کہ عیسائیوں کی تعداد میں کمی ہونے کے بجائے رات دن اضافہ ہی ہو رہا ہے، دُور جانے کی ضرورت نہیں، مرزا صاحب کے ضلع گورداسپور میں' گزشتہ 45 سال میں عیسائیوں کی مردم شماری میں جو اضافہ ہوا ہے' ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ چونکہ انھوں نے 1891ء میں مامور اور مجدد ہونے کا دعویٰ کیا تھا اس لیے اسی سنہ سے شروع کرتے ہیں۔

1891ء میں عیسائیوں کی تعداد 2400 تھی۔

1901ء میں آپ نے نبی ہونے کا اعلان کیا اور ''ایک غلطی کا ازالہ'' شائع فرمایا تو ان کی تعداد 4471 ہوگئی۔

1911ء میں آپ کی نبوت کے زمانہ میں ان کی تعداد ایک دم 13365 ہوگئی۔

1921ء میں غالباً فیضانِ نبوت کی بدولت 32832 اور 1931ء میں 43245 ہوگئی (مصنف)

15 اس جگہ اس امر کی صراحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ علامہ موصوف نے مخاطبہ و مکالمہ الٰہیہ کا کبھی دعویٰ نہیں کیا اور نہ انھوں نے یہ کہا کہ مجھے الہام ہوتا ہے۔ وہ صرف اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کرتے ہیں اور ان کی تصانیف کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہوگی کہ وہ کس قدر صداقت' صفائی' خلوص اور دیانت داری کے ساتھ اپنے ضمیر کی آواز پر عمل کرتے ہیں اور جس چیز کو وہ حق سمجھتے ہیں اسے لگی لپٹی رکھے بغیر اعلانیہ صاف صاف لفظوں میں بیان کر دیتے ہیں (مصنف)

16 کلیات اقبال صفحہ 821۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

علامہ اقبالؒ اور ان کے نقاد

ارباب علم سے پوشیدہ نہیں ہے کہ آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی نے 1891ء میں پنجاب کے ''زندہ دل'' مسلمانوں سے بیعت لینی شروع کی تھی اور اسی سال سے ''سلسلہ عالیہ احمدیہ'' کی بنیاد ہندوستان میں قائم ہوئی۔ مسلمان علماء اور صوفیاء نے اپنی فراستِ ایمانی کی بدولت اس حقیقت کا پتہ تو اسی وقت لگالیا تھا کہ مجددیت کا یہ دعویٰ ارتقائی منازل طے کرتا ہوا بالآخر نبوتِ مستقلہ پر منتج ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی بساط کے مطابق اس تحریک کا مقابلہ کیا اور جہاں تک منقولی بحثوں کا تعلق ہے' دعویٰ کے کسی پہلو کو تشنۂ تنقید نہیں چھوڑا۔ لیکن سیاسیاتِ ملکی اور ان عوامل سے جو استعمار پرستانِ مغرب کی پالیسی کے ماتحت درپردہ ہندوستان میں کارفرما تھے' نا آشنا ہونے کی وجہ سے ان کا ذہن اس تحریک کے حقیقی منبع اور ماخذ کی طرف منتقل نہ ہوسکا۔

واضح ہو کہ ایسا ہونا بعید از قیاس نہ تھا' کیونکہ دعویٰ کی بنیاد بظاہر احادیث اور بعد ازاں نصوصِ قرآنیہ اور بالآخر رموزِ صوفیا پر قائم کی گئی تھی' چونکہ علماء اپنے مخصوص اور دیرینہ طریقِ فکر، اور افتادِ طبع کے باعث' روایاتِ ملیہ اور عقائدِ اسلامیہ کے تحفظ کے لیے (جن پر 1857ء میں شدید ضرب لگ چکی تھی) سب سے زیادہ کوشاں اور ساعی تھے۔ اس لیے ان کی توجہ تمامتر اس طرف مبذول ہوگئی کہ جس طرح ہو سکے' احادیث اور نصوص کو بازیچۂ اطفال بن جانے سے بچایا جائے۔ مباد اجنسِ نبوت اس قدر ارزاں ہو جائے کہ ہرکس و ناکس' خدمت اسلام کی آڑ میں اپنی دکان چمکا سکے اور نصوصِ قرآنیہ کو اقتضائے حکومت کے سانچہ میں ڈھال کر پروانۂ خوشنودی حاصل کرسکے۔

فی الجملہ ان علماء کی مخلصانہ کوششوں کی بدولت' اگرچہ مسلمان' اس تحریک کے مضرت رساں نتائج سے خبردار ہوگئے' لیکن ان اسرار و رموز سے آشنا نہ ہوسکے' جو اس تحریک کو عالمِ وجود میں لانے کا باعث تھے اور اس کی تہ میں کام کررہے تھے۔

بانیِ تحریک نے علمائے اسلام کے قیاس کے مطابق' امامت' مجددیت' مسیحیت اور مہدویت کے

منازلِ عالیہ طے کرنے کے بعد اپنی وفات سے چند سال قبل دعوائے نبوت کر کے محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسلام کو منسوخ کر دیا اور اس کی جگہ ایک ایسا مذہب پیش کیا جس میں حکومتِ ارضی کے ساتھ غیر متزلزل وفاداری شرطِ ایمان قرار پائی' مسلمانوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کے لیے "تبلیغ واشاعت اسلام" کا ڈھول نہایت بلند آہنگی کے ساتھ پیٹنا شروع کر دیا گیا۔

جس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا' بھولے بھالے مسلمانوں کی اکثریت احمدیوں کی تبلیغی خدمات کی معترف ہو گئی اور اس جدید اسلام کی اشاعت کے لیے میدان صاف ہونے لگا۔

قریب تھا کہ اس "خود کاشتہ پودے" کے اثمارِ شیریں مسلمانوں کے کام و دہن کی ضیافت کا سامان بہم پہنچائیں، لیکن خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ خلافت اولیٰ کے بعد' جماعت احمدیہ خود دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ قادیانی گروہ نے غیر مبہم الفاظ میں مرزا قادیانی کی نبوت کا اعلان کیا' اور لاہوری گروہ نے آنجہانی کو صرف مجدد کے رنگ میں پیش کرنے پر اکتفا کیا۔ 1914ء سے لے کر 1934ء تک ان دونوں پارٹیوں نے' مسلسل قلمی جنگ کی بدولت غیر احمدیوں کی بصیرت افروزی کے لیے کافی لٹریچر مہیا کر دیا۔ چنانچہ پیغامِ صلح اور روزنامہ الفضل قادیان کی فائلوں کا موازنہ کرنے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مرزا قادیانی کی تصانیف میں' جو فریقین کا مستدل ہیں' اس قدر تناقض پایا جاتا ہے کہ ایک خالی الذہن محقق اور جویائے حقیقت دونوں کو رد کرنے پر مجبور ہے' اس بست سالہ مناقشہ کا خلاصہ یہ ہے کہ قادیانیوں نے لاہوریوں پر یہ الزام لگایا کہ تم حضرت صاحب کے مرتبہ کا استخفاف کر کے کتمانِ حق کرتے ہو اور لاہوریوں نے قادیانیوں پر یہ فردِ جرم عائد کی کہ تم حضرت صاحب کو نبی قرار دے کر غیر احمدیوں کو سلسلہ عالیہ میں داخل ہونے سے روک رہے ہو۔ تجربہ نے ثابت کر دیا کہ لاہوریوں کا خیال صحیح تھا۔ اگرچہ اس مناقشہ کی وجہ سے غیر احمدیوں کا حسنِ ظن شبہ اور نفرت کی شکل میں تبدیل ہونے لگا۔

لیکن اس تحریک کی اصلی حقیقت پر ہنوز پردہ پڑا ہوا تھا' بالآخر وہ وقت بھی آ گیا' جب قدرتِ خداوندی نے' حکیم الامت مفکر مشرق علامہ اقبال مدظلہ کو اس طرف مائل کیا کہ وہ اپنے اعجوبہ کار اور سحر نگار قلم کی چٹکی سے ناظورۂ حقیقت کے بندِ نقاب وا کر دیں۔ میری مراد اس معرکتہ الآراء مضمون سے ہے جو علامہ موصوف نے دنیائے اسلام کی سب سے بڑی ضرورت کا احساس کر کے جنوری 36ء میں سپردِ قلم فرمایا۔ یہ مضمون اولاً اخبار "ٹروتھ" لاہور میں شائع ہوا اور بعد ازیں اخبار "اسلام" لاہور نے اسے پمفلٹ کی شکل میں شائع کر کے' اسلامیانِ ہند کو ممنونِ احسان بنا دیا۔ اخبار "مجاہد" اور رسالہ "طلوعِ اسلام" میں اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہوا۔

''ٹروتھ'' کے فاضل ایڈیٹر نے 27 جنوری کے پرچہ میں اس مضمون کے متعلق ایک شذرہ لکھا جس کا ملخص حسب ذیل ہے۔

> ''ڈاکٹر محمد اقبال مدظلہ کا مضمون بعنوان 'اسلام اور احمدیت' نے تحریکِ احمدیت کی تنقید میں ایک اچھوتے باب کا اضافہ کیا ہے' جو اربابِ بینش کی آنکھوں کے لیے کحل الجواہر سے بھی بڑھ کر ثابت ہوگا۔
>
> علامہ موصوف کا شمار اس وقت دنیا کے چیدہ اور منتخب مفکرین میں ہے۔ اس لیے لازمی طور پر ان کی تحریر بغایت دقت آفریں اور بلحاظ بلندیٔ تخیل عامۃ الناس کی دسترس سے بالاتر ہے۔ یہ مضمون خالص فلسفیانہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس لیے جب تک اس کے مشکل مقامات کی تشریح و توضیح نہ کی جائے' اس وقت تک معمولی لیاقت کے لوگ اس کی گوناگوں ندرت آفرینیوں اور بوقلموں خوبیوں سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔''

اب اسے مسلمانوں کی بدقسمتی کہیے یا ''ٹروتھ'' کے ایڈیٹر کی بالغ نظری کہ ان کا یہ قیاس حرف بحرف صحیح نکلا۔ اس مضمون کا جو ترجمہ روزنامہ ''مجاہد'' میں شائع ہوا جسے بعد ازیں' سیکرٹری شعبۂ اشاعت انجمن اہلحدیث نے پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا، متعدد مقامات پر غلط اور ناقص ہے جو صاحب مضمون کے مفہوم کو بالکل ادا نہیں کرتا۔ جب اپنوں ہی نے صحیح نہ سمجھا تو غیروں سے کیا شکایت۔

''ٹروتھ'' کے ایڈیٹر کے قیاسِ مذکورہ کی صحت کا دوسرا ثبوت ایڈیٹر ''لائٹ'' کے اس مقالہ افتتاحیہ کو پڑھ کر ملے گا جو انھوں نے یکم فروری کو اس مضمون کے متعلق سپردِ قلم فرمایا۔

اگر ''لائٹ'' کا ایڈیٹر کوئی ایسا شخص ہوتا جو انگریزی زبان سے کماحقہ واقف نہ ہوتا تو مجھے کوئی شکایت نہ ہوتی لیکن صاحب موصوف الصدر انگریزی زبان پر کافی عبور رکھتے ہیں اور مجھے ذاتی طور پر بھی معلوم ہے کہ وہ نہایت قابل انشاء پرداز ہیں۔ اندریں حالات سخت حیرانی ہے کہ وہ علامہ اقبال کے مفہوم کو کیوں نہ سمجھ سکے۔

سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ علامہ موصوف کے ایک فقرہ کا مطلب بیان کرنے میں انھوں نے ایسی شدید غلطی کا ارتکاب کیا ہے جو ہرگز ان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ چونکہ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی اس تشریح سے سخت غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہے اس لیے اس فقرہ کا صحیح مفہوم ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے مضمون میں ایک جگہ پنڈت جواہر لال نہرو کی اس غلط فہمی کا ازالہ فرمایا

ہے کہ ترکوں نے اسلام کو خیر باد کہہ دیا ہے۔اس سلسلہ میں انھوں نے ان اصلاحات کا ذکر کیا ہے جو ترکوں نے نافذ کی ہیں اور جن کی بنا پر ہندوستان میں بعض لوگوں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ وہ اسلام سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ علامہ موصوف نے پنڈت جی اوران کے ہمخیالوں ۔ ے استفسار فرمایا ہے کہ کیا آپ اس وجہ سے ترکوں کو اسلام سے بیگانہ قرار دے رہے ہیں کہ انھوں نے تعددِ ازدواج کی اجازت کو منسوخ کر دیا ہے یا علماء کے لیے لائسنس (اجازت نامہ) حاصل کرنا لازمی قرار دے دیا ہے؟ پھر خود ہی جواب دیا ہے کہ یہ دونوں باتیں ترکوں کو اسلام سے خارج نہیں کر سکتیں کیونکہ تصریحاتِ فقہا کی رُو سے، اسلامی حکومت کے امیر کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ یہ دیکھے کہ لوگ شریعت کی عطا کردہ کسی ''اجازت'' کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں تو اس کو معطل کر دیں مثلاً اسلام نے بعض حالات میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت دی ہے' لیکن اگر حکمران یہ دیکھے کہ لوگ اس اجازت کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں جس کی وجہ سے نظامِ ملّی میں مفاسد پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہے تو مفادِ اسلام کی خاطر وہ عارضی طور پر یہ حکم نافذ کر سکتا ہے کہ لوگ اس اجازت سے متمتع نہ ہوں کیونکہ یہ فعل ان کے غلط طریقِ عمل کی وجہ سے ان کے حق میں سودمند ہونے کے بجائے مضرت رساں ہے۔

علامہ موصوف نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور سلف صالحین کے طریقہ اور فیصلہ کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ آج سے صدیوں پہلے علامہ ابن قیمؒ نے بھی یہی رائے ظاہر کی تھی، لیکن مقام صد حیرت و استعجاب ہے کہ ایسی واضح بات ''لائٹ'' کے فاضل ایڈیٹر کی سمجھ میں نہ آ سکی اور انھوں نے علامہ کے ارشاد کی تشریح اس انداز میں کی جس سے ایک طرف ان کی قلتِ تدبر کا راز فاش ہو گیا تو دوسری طرف علامہ موصوف کے متعلق مسلمانوں کے دلوں میں سخت بدظنی پیدا ہونے کا امکان ہے۔

مدیر ''لائٹ'' یکم فروری کے افتتاحیہ میں یوں رقمطراز ہیں' ''سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال اس سے بھی چار قدم آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ ایک مسلمان بعض احکام قرآنیہ کی علانیہ خلاف ورزی کرنے کے بعد بھی دائرہ اسلام میں رہ سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ موصوف یہ لکھتے ہیں کہ فقہ اسلامی کی رُو سے اسلامی حکومت کا امیر اس بات کا مجاز ہے کہ وہ شریعت کی ''رخصتوں'' کو معطل کر دے بشرطیکہ اسے اس بات کا یقین ہو کہ لوگ ان سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے'' پھر مدیر موصوف نے اس اقتباس پر یوں حاشیہ آرائی کی ہے۔

''ہم ذاتی طور پر' علامہ سے اس معاملہ میں متفق نہیں کیونکہ اگر کوئی مسلمان' احکام قرآنیہ کو پس پشت ڈال کر بھی مسلمان رہ سکتا ہے تو پھر ختمیتِ محمدی کا عقیدہ باطل ہو جائے گا۔'' انتہیٰ

اب.......سوال یہ ہے کہ علامہ موصوف نے کب اور کس جگہ یہ لکھا ہے کہ ایک مسلمان'

احکامِ قرآن کی خلاف ورزی کر کے بھی مسلمان رہ سکتا ہے؟ حکم (Injunction) اور اجازت (Permission) میں تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔ علامہ نے اپنے مضمون میں لفظ اجازت لکھا ہے اور فاضل ایڈیٹر نے اجازت کو حکم کا مترادف بنا کر' علامہ کے ارشاد کو مسخ کر دیا۔ ع بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است۔

بے شک مدیر "لائٹ" کا یہ قول صحیح ہے کہ احکامِ قرآنی کی خلاف ورزی کے بعد کوئی مسلمان' دائرہ اسلام میں نہیں رہ سکتا۔ مثلاً اسلام زکوٰۃ دینے کا حکم دیتا ہے اور اگر کوئی شخص اس حکم کا انکار کرے تو وہ بلاشبہ دائرہ اسلام سے خارج ہے لیکن تعددِ ازدواج کے متعلق قرآن مجید نے یہ حکم تو نہیں دیا ہے کہ ہر مسلمان پر چار نکاح فرض ہیں (جس طرح ہر صاحبِ نصاب پر زکوٰۃ فرض ہے) بلکہ حسبِ ضرورت چار تک اجازت دی ہے اور جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں' حکم اور اجازت میں بہت بڑا فرق ہے۔ مجھے حیرانی ہے کہ مدیر "لائٹ" نے (Permission of the law) کے معنی (Certain Quranic Injunctions) کس قاعدہ کی رو سے سمجھ لیے؟ متکلم کے منشا کے خلاف اس کے کسی قول کی تشریح کرنا' اصولِ دیانت کے بالکل خلاف ہے۔

ممکن ہے' علامہ موصوف کی شہرت کو نقصان پہنچانے کی یہ کوشش اس لیے کی گئی ہو کہ انھوں نے احمدیت کو بے نقاب کیوں کر دیا؟ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ علامہ موصوف نے یہ مضمون لکھ کر ایک بہت بڑے جرم کا ارتکاب کیا ہے' کیونکہ اس کو پڑھ لینے کے بعد اب کوئی تعلیمیافتہ مسلمان احمدی ہونا تو بڑی بات ہے' احمدیت سے حسنِ ظن بھی نہیں رکھ سکتا۔

آخیر میں ایک گلہ اپنوں سے بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ سیکرٹری شعبہ تبلیغ انجمن اہلحدیث نے جو ترجمہ شائع کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انگریزی سے ناواقف مسلمان علامہ کے صحیح مفہوم سے کما حقہ واقف نہیں ہو سکتے۔

مثلاً ترجمہ مذکور کے ص 33 پر لکھا ہے۔

> "پھر کیا یہ کثرتِ ازدواج یا علما سے نجات کا سوال ہے؟ شریعتِ اسلامی کے مطابق ایک اسلامی حکومت کے امیر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایسے قوانین کے نفاذ کو روک دے جن کی بنا پر جماعتی بدعنوانیوں کے ظہور کا اندیشہ ہو اور جہاں تک عیش پرست علماء کا تعلق ہے اگر مجھے اختیارات حاصل ہوں تو میں یقیناً ان قوانین کو ہندوستان میں بھی نافذ کر دوں۔ ایک متوسط درجہ کے مسلمان کی حماقت دراصل ملاؤں کی افسانہ طرازیوں پر مبنی ہے۔"

مجھے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ یہ ترجمہ بہت لاپروائی کے ساتھ کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اصل مطلب کئی جگہ بالکل فوت ہوگیا ہے۔ میں مترجم صاحب پر اعتراض نہیں کرتا لیکن اتنا ضرور کہتا ہوں کہ ترجمہ کرنے والے اور ترجمہ کرانے والے دونوں کو نفسِ مضمون کی اہمیت کا احساس کرنا ضروری تھا کیونکہ غلط ترجمہ کو دیکھ کر ایک صاحب مضمون کو روحانی تکلیف ہوتی ہوگی دوسرے اس ترجمہ کے پڑھنے والے اصل حقیقت اور مصنف کے حقیقی منشاء سے واقف نہیں ہو سکتے' تیسرے اس کی وجہ سے شماتتِ ہمسایہ کی صورت بھی پیدا ہوتی ہے۔

1- ''علما سے نجات'' جن الفاظ کا ترجمہ ہے وہ اصل مضمون میں موجود نہیں ہیں (Licentiate Ulama) کے معنی ہیں سند یافتہ علماء جنھوں نے دینیات کی باضابطہ تکمیل کی ہو یعنی جو ''نیم ملا خطرۂ ایمان'' نہ ہو۔

2- ''قوانین کے نفاذ'' بھی غلط ہے۔ علامہ نے رخصت یا اجازت کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ قوانین کے نفاذ کو روک دینا تو بالفاظِ دگر شریعتِ اسلامیہ کی بیخ کنی کرنا ہے اور مصنف کا ہرگز ہرگز یہ منشا نہیں ہوسکتا۔ میرا خیال ہے کہ بعض مسلمان اس عبارت کو پڑھ کر ضرور پریشان ہوئے ہوں گے کہ علامہ اقبال جیسے فاضلِ اسلامیات نے یہ بات کس طرح لکھ دی؟

3- ''عیش پرست علماء'' بھی غلط ترجمہ ہے جس لفظ کا ترجمہ عیش پرست ہوسکتا ہے وہ (Licentiate) نہیں بلکہ (Licentious) ہے لیکن یہ لفظ اصل مضمون میں کہیں مذکور نہیں ہوا۔

4- ''ان قوانین کو'' سوال یہ ہے کن قوانین کو؟

علامہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر مجھے وہی اختیارات حاصل ہوں جو غازی کمال پاشا کو حاصل ہیں تو میں بھی یہ قانون نافذ کر دوں کہ وعظ و نصیحت کا سلسلہ شروع کرنے سے پہلے ہندی علماء کو محکمہ شرعیہ سے اس بات کی سند حاصل کرنی لازمی ہوگی کہ حاملِ سند وعظ و ہدایت کی اہلیت رکھتا ہے۔

نوٹ: ہمارے ہاں ''نیم ملا خطرۂ ایمان'' کی قسم کے ''علماء'' بکثرت پائے جاتے ہیں جو دینیات سے مطلق واقف نہیں ہوتے اور غلط روایات بیان کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

5- ''ایک متوسط درجہ کے مسلمان'' یہ ترجمہ بھی مفہوم کو ظاہر نہیں کرتا' اس کی جگہ ''عامۃ المسلمین'' ہونا چاہیے۔

❁ ❁ ❁

ماسٹر محمد احسان

ایڈیٹر ماہنامہ ''حقیقتِ اسلام''

نہرو نے قادیانیت کی حمایت کیوں کی؟

واقفکار حضرات سے یہ امر مخفی نہ ہوگا کہ جب علامہ سر محمد اقبال مدظلہ نے قادیانیت کو بے نقاب کرنے کے لیے ایک معرکتہ الآ راء مضمون بعنوان ''احمدیت اور اسلام'' سپرد قلم فرمایا تھا' تو صدر کانگریس پنڈت جواہر لعل نہرو نے احمدیت کی حمایت میں چند مضامین لکھے تھے' جن کا مفہوم یہ تھا کہ احمدی حضرات دائرہ اسلام سے خارج نہیں ہیں۔ اکثر اصحاب نے پنڈت جی کی اس حمایت کو حیرت کی نظر سے دیکھا تھا کہ آخر پنڈت جی کو اس امر کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی کہ احمدیوں کی حمایت میں اپنے قلم کو جنبش دیں؟ علامہ موصوف نے پنڈت جی کو مخاطب کر کے لکھا تھا کہ احمدیوں کے عقائد اس قسم کے ہیں کہ ان کو تسلیم کرنے کے بعد وحدت اسلامیہ پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ مسلمان اس امر کو گوارا نہیں کر سکتے کہ رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں سے قطع و برید کر کے ہندوستانی ''نبی'' کے لیے ایک جدید امت تیار کی جائے، جس کا مذہبی مرکز مکہ معظمہ کی بجائے قادیان ہو۔ ہندوستان کی تاریخ کے اس نازک ترین دور میں مسلمانوں کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ ہر اس تحریک سے قطعی طور پر مجتنب اور محترز رہیں جو ان کے اندر افتراق و انشقاق پیدا کرنے کا باعث ہو۔

اگرچہ وہ جذبہ جس نے پنڈت جی کو احمدیوں کی حمایت پر کمر بستہ کیا' اربابِ دانش کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے' تاہم اتمامِ حجت کے طور پر ہم ڈاکٹر شنکر داس کے اس مضمون کا اقتباس ذیل میں درج کرتے ہیں، جو انھوں نے کچھ عرصہ ہوا ''بندے ماترم'' میں شائع کرایا تھا۔

> ''سب سے اہم سوال جو اس وقت ملک کے سامنے درپیش ہے' وہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے اندر کس طرح قومیت کا جذبہ پیدا کیا جائے ـــــ ہندوستانی مسلمان اپنے آپ کو ایک الگ قوم تصور کیے بیٹھے ہیں

اور وہ دن رات عرب ہی کے گیت گاتے ہیں' اگر ان کا بس چلے تو وہ ہندوستان کو بھی عرب کا نام دے دیں۔

اس تاریکی میں، اس مایوسی کے عالم میں، ہندوستانی قوم پرستوں اور محبانِ وطن کو ایک ہی امید کی شعاع دکھائی دیتی ہے اور وہ آشا کی جھلک احمدیوں کی تحریک ہے۔ جس قدر مسلمان احمدیت کی طرف راغب ہوں گے' وہ قادیان کو اپنا مکہ تصور کرنے لگیں گے اور آخر میں محبِّ ہند اور قوم پرست بن جائیں گے۔ مسلمانوں میں احمدیہ تحریک کی ترقی ہی عربی تہذیب اور پان اسلام ازم کا خاتمہ کر سکتی ہے۔

جس طرح ایک ہندو کے مسلمان ہو جانے پر اس کی شردھا اور عقیدت رام، کرشن' وید' گیتا اور رامائن سے اٹھ کر قرآن اور عرب کی بھوی میں منتقل ہو جاتی ہے' اسی طرح جب کوئی مسلمان احمدی بن جاتا ہے تو اس کا زاویہ نگاہ بدل جاتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس کی عقیدت کم ہوتی چلی جاتی ہے' مکہ' مدینہ اس کے لیے روایتی مقامات رہ جاتے ہیں' یہ بات عام مسلمانوں کے لیے' جو ہر وقت پان اسلام ازم اور پان عربی سنگٹن کے خواب دیکھتے ہیں' کتنی ہی مایوس کن ہو' مگر ایک قوم پرست کے لیے باعثِ مسرت ہے۔

ایک احمدی (مرزائی) چاہے عرب' ترکستان' ایران یا دنیا کے کسی بھی گوشہ میں بیٹھا ہو' وہ روحانی تسکین کے لیے قادیان کی طرف منہ کرتا ہے۔ قادیان کی سرزمین اس کے لیے سرزمینِ نجات ہے اور اس میں ہندوستان کی فضیلت کا راز پنہاں ہے۔ ہر احمدی کے دل میں ہندوستان کے لیے پریم ہوگا' کیونکہ قادیان ہندوستان میں ہے۔ مرزا قادیانی بھی ہندوستانی تھے اور اب تک جتنے خلیفے اس فرقے کی رہبری کر رہے ہیں، وہ سب ہندوستانی ہیں۔

اعتراض ہو سکتا ہے کہ جب مرزائی قرآن کو الہامی کتاب مانتے ہیں تو وہ اسلام سے الگ کیسے ہوئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سکھوں کی موجودہ ہندوؤں سے علیحدہ گرو گرنتھ صاحب میں رام، کرشن، اندر، وشنو، سب ہندو دیوی دیوتاؤں کا ذکر آتا ہے' مگر کیا سکھوں نے رام' کرشن کی مورتیوں کا کھنڈن نہیں کیا؟ گوردواروں سے رامائن اور گیتا کا پاٹھ نہیں اٹھایا؟ کیا سکھ اب ہندو کہلانے

سے انکار نہیں کرتے؟

اسی طرح وہ زمانہ دور نہیں جب قادیانی کہیں گے کہ ہم محمدی مسلمان نہیں' ہم تو احمدی مسلمان ہیں۔ کوئی ان سے سوال کرے گا کیا تم حضرت محمدؐ کی نبوت کو مانتے ہو؟ تو وہ جواب دیں گے کہ ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم 'عیسیٰؑ' رام' کرشن سب کو اپنے اپنے وقت کا نبی تصور کرتے ہیں' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ہندو' عیسائی یا محمدی ہو گئے۔ یہی ایک ہے کہ مسلمان احمدی تحریک کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ احمدیت ہی عربی تہذیب اور اسلام کی دشمن ہے۔ خلافت تحریک میں بھی احمدیوں نے مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیا' کیونکہ وہ خلافت کو بجائے ترکی یا عرب میں قائم کرنے کے قادیان میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔''

(اخبار بندے ماترم 22 اپریل 1935ء)

ہمیں یقین ہے کہ ڈاکٹر شنکر داس کے مضمون سے ان اقتباسات کو پڑھ کر مسلمانوں کے سامنے یہ حقیقت آئینہ ہو جائے گی' کہ پنڈت جواہر لعل نہرو نے احمدیت کی حمایت میں اپنے قلم کو کیوں جنبش دی تھی اور علامہ اقبال تحریکِ احمدیت کو اسلام کے حق میں کیوں مضرت رساں خیال کرتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ

فتنۂ قادیانیت اور پیامِ اقبالؒ

شاعرِ مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم اپنے بلند پایہ ملی افکار کی بناء پر ہمارے جدید حلقوں کا مرجع عقیدت ہیں' ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر لوگوں نے جس فراخ قلبی سے تحقیق و تفتیش کا معرکہ سر کیا ہے' وہ ہمارے ماضی قریب کے کسی لیڈر کے حصہ میں نہیں آیا' لیکن علامہ مرحوم کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو' جو ان کے آخری دورِ حیات میں گویا ان کی زندگی کا واحد مشن بن گیا تھا' مصلحت پسندوں نے اسے اجاگر کرنے سے پہلوتہی کی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ دیوبند کے ایک مردِ قلندر (علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ) کے فیضانِ صحبت نے فطرتِ اقبال کے اس پہلو کی مشاطگی کی تھی۔ مولانا کشمیریؒ کے سوزِ جگر نے اقبال مرحوم کو قادیانیت کے خلاف شعلۂ جوالہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ علامہ مرحوم جدید تعلیم یافتہ طبقے میں پہلے شخص تھے جن کو ''فتنہ قادیانیت'' کی سنگینی نے بے چین کر رکھا تھا۔ وہ اس فتنہ کو اسلام کے لیے مہلک اور وحدتِ ملت کے لیے مہیب خطرہ تصور کرتے تھے۔ ان کی تقریر و تحریر میں ''قادیانی ٹولے'' کو ''غدارانِ اسلام'' اور ''باغیانِ محمدؐ'' سے یاد کیا جاتا تھا' اس لیے کہ ان کے نزدیک اس فرقہ کے موقف کی ٹھیک ٹھیک تعبیر کے لیے اس سے زیادہ موزوں کوئی لفظ نہیں تھا' نہ ہوسکتا تھا۔ وہ اس فتنہ کے استیصال کو سب سے بڑا ملی فرض سمجھتے تھے اور وہ ایک شفیق اور صاحب بصیرت سرجن کی طرح مضطرب تھے کہ اس ''ناپاک ناسور'' کو جسدِ ملت سے کاٹ پھینکا جائے ورنہ یہ ساری امت کو لے ڈوبے گا۔ افسوس ہے کہ اقبال کے جانشینوں نے اقبال کی ''بانگ درا'' پر گوش برآواز ہونے کی ضرورت نہ سمجھی' ورنہ اگر نقاشِ پاکستان کے انتباہ پر توجہ کی جاتی تو اقبال کے پاکستان کی تاریخ 'شہیدِ ملت لیاقت علی خان کے قتل سے شروع ہوکر مشرقی پاکستان کے قتل تک رونما ہونے والے واقعات سے یقیناً پاک ہوتی-----
7 ستمبر 1974ء کا فیصلہ پیغامِ اقبال کا جواب نہیں' بلکہ اس کی بسم اللہ ہے۔ اقبال کا پیغام یہ ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی' سیاسی اور معاشرتی اداروں میں اس باغی گروہ کی شرکت امتِ مسلمہ کی موت ہے۔ آج صرف پاکستان نہیں بلکہ پورا عالم اسلام (خصوصاً خطۂ عرب اور مشرقِ وسطیٰ) ان باغیانِ اسلام کی

سازشوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ تل ابیب سے ربوہ کا رابطہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں' اور یہودی فوج میں قادیانی ٹولے کی ''خدمات'' عالم آشکارا ہو چکی ہیں۔ اس تقریب میں ہم عالم اسلام کی خدمت میں ''پیام اقبال'' پیش کرتے ہوئے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یا تو ملتِ اسلامیہ کو عالم اسلام میں پھیلے ہوئے قادیانی گروہ سے جرأت مردانہ کے ساتھ نبٹنا ہوگا' یا پھر اسے اپنی خودکشی پر دستخط کرنے کے لیے تیار رہنا ہوگا۔ قاضیِ وقت بڑی عجلت کے ساتھ اپنا آخری فیصلہ لکھنے کے لیے بیتاب ہے اور مستقبل کا پیش کار اس فیصلہ کا ریکارڈ ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے کے لیے مضطرب نظر آتا ہے----اب یہ سربراہانِ اسلام اور قائدینِ ملت کے تدبر پر منحصر ہے کہ یہ فیصلہ کس کے حق میں ہوتا ہے؟

اسلام کی بنیاد

اسلام کا سیدھا سادا مذہب دو قضایا پر مبنی ہے۔ خدا ایک ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سلسلۂ انبیاء کے آخری نبی ہیں' جو وقتاً فوقتاً ہر ملک اور ہر زمانے میں اس غرض سے مبعوث ہوتے تھے کہ نوعِ انسان کی رہنمائی صحیح طرزِ زندگی کی طرف کریں۔ (حرفِ اقبال)

ملحد دائرہ اسلام سے خارج

جن دو قضایا (عقیدوں) پر اسلام کی تعقلی عمارت قائم ہے وہ اس قدر سادہ ہیں کہ ان میں الحاد ناممکن ہے' جس سے ملحد دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ (حرفِ اقبال)

ختم نبوت کا تصور

ختم نبوت کے تصور کی تہذیبی قدر و قیمت کی توضیح میں نے کسی اور جگہ کر دی ہے۔ اس کے معنی بالکل سلیس ہیں---- محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔ قادیانیوں کا اعتقاد ہے کہ تحریکِ احمدیت کا بانی ایسے الہام کا حامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام عالم اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔ (حرفِ اقبال)

اسلام کی حد فاصل

اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں یعنی وحدتِ الوہیت پر ایمان' انبیاء علیہم السلام اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم رسالت پر ایمان' دراصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے اور اس امر کے لیے فیصلہ کن ہے کہ فرد یا گروہ ملتِ اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں۔ مثلاً برہمو خدا پر یقین رکھتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں' لیکن انھیں ملتِ اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ قادیانیوں کی طرح وہ انبیاء کے ذریعے وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت کو نہیں مانتے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی اسلامی فرقہ اس حدِ فاصل کو عبور کرنے کی جسارت نہیں کر سکا۔ ایران میں بہائیوں نے ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلایا لیکن ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ الگ جماعت ہیں اور مسلمانوں میں شامل نہیں۔

ختم نبوت کے معنی

ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعدِ اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزاء نبوت کے موجود ہیں۔ یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے' تو وہ شخص کاذب ہے اور واجب القتل۔ مسیلمہ کذاب کو اسی بناء پر قتل کیا گیا۔ حالانکہ جیسا طبری لکھتا ہے' وہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا مصدق تھا اور اس کی اذان میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی تصدیق تھی۔

(عکسِ تحریر علامہ اقبال بنام جناب نذیر نیازی صاحب' مندرجہ انوارِ اقبال' ص 44-45 مرتبہ جناب بشیر احمد ڈار صاحب، شائع کردہ: اقبال اکادمی' پاکستان' کراچی)

قادیانیوں کے لیے دو راستے

میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں۔ یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں یا پھر ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ قبول کر لیں۔ ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام میں ہو تاکہ انھیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔

(''حرفِ اقبال'' ص 137)

قادیانی علیحدہ امت

میرے خیال میں قادیانی حکومت سے کبھی علیحدگی کا مطالبہ کرنے میں پہل نہیں کریں گے۔ ملتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ منظور نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے کیونکہ وہ ابھی اس قابل نہیں کہ چوتھی جماعت کی حیثیت سے مسلمانوں کی برائے نام اکثریت کو ضرب پہنچا سکے۔ حکومت نے 1919ء میں سکھوں کی طرف سے علیحدگی کے مطالبہ کا انتظار نہ کیا۔ اب وہ قادیانیوں سے ایسے مطالبہ کے لیے کیوں انتظار کر رہی ہے۔ (''حرفِ اقبال'' ص 138)

قادیانیت اسلام کے لیے مہلک

میرے نزدیک ''بہائیت'' قادیانیت سے زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے لیکن موخر الذکر (قادیانیت) اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے لیکن باطنی طور پر اسلام کی روح اور مقاصد کے لیے مہلک ہے۔ (''حرف اقبال'' ص 123)

قادیانیت' یہودیت کا چربہ

اس (قادیانی فرقہ) کا حاسد خدا کا تصور کہ جس کے پاس دشمنوں کے لیے لاتعداد زلزلے اور بیماریاں ہوں' اس (قادیانی فرقہ) کے نبی کے متعلق نجومی کا تخیل اور اس کا روحِ مسیح کے تسلسل کا عقیدہ وغیرہ' یہ تمام چیزیں اپنے اندر یہودیت کے اتنے عناصر رکھتی ہیں' گویا یہ تحریک ہی یہودیت کی طرف رجوع ہے۔ (''حرف اقبال'' ص 123' مرتبہ لطیف احمد شروانی)

قادیانی گستاخ

(جب علامہ مرحوم پر ان کی کسی سابقہ تحریر کا حوالہ دے کر قادیانی اخبار ''سن رائز'' نے اعتراض کیا کہ پہلے تو علامہ اس تحریک کو اچھا سمجھتے تھے' اب خود ہی اس کے خلاف بیان دینے لگے تو اس کے جواب میں علامہ مرحوم نے حسب ذیل بیان دیا):

مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ اس تقریر سے بہت پہلے مولوی چراغ مرحوم نے جو مسلمانوں میں کافی سر برآوردہ تھے اور انگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے' بانیِ تحریک (مرزا غلام احمد) کے ساتھ تعاون کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کتاب موسومہ ''براہینِ احمدیہ'' میں انھوں نے بیش قیمت مدد بہم پہنچائی۔ لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہئیں۔ تحریک کے دو گروہوں (لاہوری' قادیانی) کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانیِ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے' معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستہ پر پڑ جائے گی۔ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا جب ایک نئی نبوت' بانیِ اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی' جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ (اور یہ قادیانیوں کی روزمرہ عادت ہے ---- ناقل) درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے' تو یہ بھی ایک زندہ اور

سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن ''صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔'' (''حرفِ اقبال'' ص 131-132)

قادیانی حکمتِ عملی

ہمیں قادیانیوں کی حکمت اور دنیائے اسلام سے متعلق ان کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بانیِ تحریک (مرزا غلام احمد) نے ملتِ اسلامیہ کو سڑے ہوئے (ان لوگوں (مسلمانوں) کو ان کی ایسی حالت کے ساتھ اپنی جماعت کے ساتھ ملانا' یا ان سے تعلق رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ عمدہ اور تازہ دودھ میں بگڑا ہوا دودھ ڈال دیں جو سڑ گیا ہے اور اس میں کیڑے پڑ گئے ہیں۔ اس وجہ سے ہماری جماعت کسی طرح ان سے تعلق نہیں رکھ سکتی اور نہ ہمیں تعلق کی حاجت ہے---- ارشاد مرزا غلام احمد قادیانی' مندرجہ رسالہ ''تشحیذ الاذہان'' قادیان' ج 6 'نمبر 2' ص 211 ناقل۔) دودھ سے تشبیہہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے اور اپنے مقلدین کو ملتِ اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں ان کا بنیادی اصولوں سے انکار' اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی) مسلمانوں کی قیام نماز سے قطع تعلق' نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دنیائے اسلام کافر ہے۔ یہ تمام امور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے اس سے کہیں دور ہیں' جتنے سکھ ہندوؤں سے۔ کیونکہ سکھ ہندوؤں سے باہمی شادیاں کرتے ہیں اگرچہ وہ ہندو مندروں میں پوجا نہیں کرتے۔ اس امر کو سمجھنے کے لیے کسی خاص ذہانت یا غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل رہنے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟ (''حرفِ اقبال'' ص 137-138)

قادیانی مذہبی سٹے باز

ہندوستان میں کوئی مذہبی سٹے باز اپنی اغراض کی خاطر ایک نئی جماعت کھڑی کر سکتا ہے اور یہ لبرل حکومت اصل جماعت کی وحدت کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتی، بشرطیکہ یہ مدعی اُسے اپنی اطاعت اور وفاداری کا یقین دلا دے اور اس کے پیرو حکومت کے محصول ادا کرتے رہیں۔ اسلام کے حق میں اس پالیسی کا مطلب ہمارے شاعرِ عظیم اکبر نے اچھی طرح بھانپ لیا تھا جب اس نے اپنے مذاحیہ انداز میں کہا۔

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

(''حرفِ اقبال'' ص 125)

قادیانی غدارانِ اسلام

"فتوحات" کی متعلقہ عبارتوں کو پڑھنے کے بعد میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہسپانیہ کا یہ عظیم الشان صوفی (شیخ محی الدین ابنِ عربی) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت پر اسی طرح مستحکم ایمان رکھتا ہے جس طرح کہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان رکھ سکتا ہے۔ اگر شیخ کو اپنے صوفیانہ کشف میں یہ نظر آ جاتا کہ ایک روز مشرق میں چند ہندوستانی' شیخ کی صوفیانہ نفسیات کی آڑ میں پیغمبرِ اسلام کی ختم نبوت کا انکار کر دیں گے تو یقیناً علمائے ہند سے پہلے مسلمانانِ عالم کو ایسے غدارانِ اسلام سے متنبہ کر دیتے۔" ("حرف اقبال")

قادیانی ڈرامہ

ان لوگوں کی قوتِ ارادی پر ذرا غور کرو جنھیں الہام کی بنیاد پر یہ تلقین کی جاتی ہے کہ اپنے سیاسی ماحول کو اٹل سمجھو۔ پس میرے خیال میں وہ تمام ایکٹر جنھوں نے احمدیت کے ڈرامہ میں حصہ لیا ہے' زوال وانحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ کٹ پتلی بنے ہوئے تھے۔ ("حرف اقبال")

قادیانی ملحدانہ اصطلاحات

اسلامی ایران میں ملحدانہ اثر کے ماتحت ملحدانہ تحریکیں اُٹھیں اور انھوں نے بروز' حلول' ظل وغیرہ (قادیانی) اصطلاحات وضع کیں تاکہ تناسخ کے اس تصور کو چھپا سکیں۔ ان اصطلاحات کا وضع کرنا اس لیے لازم تھا کہ وہ مسلم کے قلوب کو ناگوار نہ گزریں۔ حتیٰ کہ مسیحِ موعود کی (قادیانی) اصطلاح بھی اسلامی نہیں بلکہ اجنبی ہے اور اس کا آغاز بھی اس ملحدانہ تصور میں ملتا ہے۔ یہ اصطلاح ہمیں اسلام کے دورِ اوّل کی تاریخ اور مذہبی ادب میں نہیں ملتی۔ ("حرف اقبال" ص 123-124)

قادیانیت' اسلامی وحدت کے لیے خطرہ

مسلمان ان تحریکوں کے معاملہ میں زیادہ حساس ہے جو اس کی وحدت کے لیے خطرناک ہیں۔ چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بنا نئی نبوت پر رکھے اور بزعمِ خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر (کل مسلمان جو حضرت مسیحِ موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے خواہ انھوں نے حضرت مسیحِ موعود کا نام بھی نہیں سنا' وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں ---- بیان مرزا محمود احمد' خلیفہ قادیان' مندرجہ "آئینہ صداقت" ص 35) مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لیے ایک خطرہ تصور کرے گا اور یہ اس لیے کہ اسلامی وحدت نبوت سے ہی استوار ہوتی ہے۔

("حرف اقبال" ص 122' مرتبہ لطیف احمد شیروانی)

قادیانیت کے خلاف شدتِ احساس

ہندی مسلمانوں نے قادیانی تحریک کے خلاف جس شدتِ احساس کا ثبوت دیا ہے وہ جدید اجتماعات کے طالب علم پر بالکل واضح ہے۔ عام مسلمان جسے پچھلے دنوں سول اینڈ ملٹری گزٹ میں ایک صاحب نے ملازدہ کا خطاب دیا تھا' اس تحریک کے مقابلہ میں حفظِ نفس کا ثبوت دے رہا ہے، اگرچہ اسے ختم نبوت کے عقیدہ کی پوری سمجھ نہیں۔ نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ختم نبوت کے تمدنی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا اور مغربیت کی ہوا نے اسے حفظِ نفس کے جذبہ سے بھی عاری کر دیا ہے۔ (''حرفِ اقبال'' ص 124)

قادیانی 'تلعب بالدین

حکومت کو موجودہ صورتِ حالات پر غور کرنا چاہیے اور اس معاملہ میں جو قومی وحدت کے لیے اشد اہم ہے' عام مسلمانوں کی ذہنیت کا اندازہ لگانا چاہیے۔ اگر کسی قوم کی وحدت خطرے میں ہو تو اس کے لیے اس کے سوا چارہ کار نہیں رہتا کہ وہ معاندانہ قوتوں کے خلاف مدافعت کرے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مدافعت کا کیا طریقہ ہے؟ اور وہ طریقہ یہی ہے کہ اصل جماعت جس شخص کو تلعب بالدین کرتے پائے اس کے دعاوی کو تحریر و تقریر کے ذریعہ سے جھٹلایا جائے۔ پھر یہ کیا مناسب ہے کہ اصل جماعت کو رواداری کی تلقین کی جائے حالانکہ اس کی وحدت خطرہ میں ہو اور باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو' اگرچہ وہ تبلیغ جھوٹ اور دشنام سے لبریز ہو۔ (''حرفِ اقبال'' ص 126)

قادیانی خدمات کا صلہ

(علامہ اقبال' قادیانی تحریک کو انگریز کی آلۂ کار سمجھتے تھے' اس لیے انھوں نے انگریزی حکومت سے طنزاً فرمایا کہ):

''اگر کوئی گروہ (یعنی قادیانی) جو اصل جماعت کے نقطۂ نظر سے باغی ہے' حکومت کے لیے مفید ہو تو حکومت اس کی ''خدمات کا صلہ'' دینے کی پوری طرح مجاز ہے' دوسری جماعتوں کو اس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ توقع رکھنی بے کار ہے کہ خود (مسلمانوں کی) جماعت ایسی قوتوں کو نظر انداز کر دے جو اس کے اجتماعی وجود کے لیے خطرہ ہیں۔'' (''حرفِ اقبال'' ص 126)

قادیانی پالیسی

میں نے (سابقہ بیان میں) اس امر کی وضاحت کر دی تھی کہ مذہب میں عدم مداخلت کی پالیسی ہی ایک ایسا طریقہ ہے جسے ہندوستان کی موجودہ حکمران قوم اختیار کر سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی پالیسی ممکن ہی نہیں' البتہ مجھے یہ احساس ضرور ہے کہ یہ پالیسی مذہبی جماعتوں کے فوائد کے خلاف ہے،

اگر چہ اس سے بچنے کی راہ کوئی نہیں۔ جنھیں خطرہ محسوس ہو انھیں خود اپنی حفاظت کرنی پڑے گی۔ میری رائے میں حکومت کے لیے بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کر لے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا۔ (''حرف اقبال'' ص 128-129)

اسلام اور ملک دونوں کے غدار

''میں اپنے ذہن میں اس امر کے متعلق کوئی شبہ نہیں پاتا کہ احمدی' اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔ (اس وقت ہندوستان انگریزی سامراج کے زیر تسلط تھا' اور قادیانی انگریز سلطنت کی بقاء و استحکام کے لیے سر توڑ کوشش کر رہے تھے ----- ناقل۔'')

(پنڈت نہرو کے جواب میں ----- بحوالہ '' کچھ پرانے خطوط'' ص 293' ج 1 ---- مرتبہ جواہر لال نہرو ---- مطبوعہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی (انڈیا) مترجمہ عبدالمجید الحریری ایم۔ اے' ایل۔ ایل۔ بی)

قادیانیت کا وظیفہ

''مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرنا ہے۔'' (حرف اقبال)

قادیانی تفریق

''قادیانیوں کی تفریق کی پالیسی کے پیشِ نظر' جو انھوں نے مذہبی اور معاشرتی معاملات میں ایک نئی نبوت کا اعلان کر کے اختیار کی ہے' خود حکومت کا فرض ہے کہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی قدم اٹھائے۔'' (حرف اقبال)

قادیانی مقصد

''قادیانی جماعت کا مقصد پیغمبرِ عرب کی امت سے ہندوستانی پیغمبر کی امت تیار کرنا ہے۔''
(حرف اقبال)

قادیانی جرم

''قرآن کریم کے بعد نبوت و وحی کا دعویٰ تمام انبیائے کرام کی توہین ہے۔ یہ ایک ایسا جرم ہے جس کو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ ختمیت کی دیوار میں سوراخ کرنا دینیات کے تمام نظام کو درہم برہم کر دینے کے مترادف ہے۔ قادیانی فرقہ کا وجود عالم اسلامی' عقائد اسلام' شرافتِ انبیاء' خاتمیتِ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور کاملیتِ قرآن کے لیے قطعاً مضر و منافی ہے۔'' (''فیضانِ اقبال'' ص 435)

❁ ...... ❁ ...... ❁

میر شکیل الرحمٰن

چیف ایڈیٹر روزنامہ ''جنگ''

اقبالؒ اور قادیانیت

''خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!''

اقبال اپنی شاعرانہ عظمتوں کی بناء پر شاعرِ مشرق کے اعزاز کے حامل ہیں۔ سیاسی بصیرت اور قومی حمیت کی بنا پر وہ ''مصورِ پاکستان'' کی حیثیت سے معروف اور مقبول ہیں لیکن اقبال کا ایک امتیاز جو اب تک پس منظر میں ہے اور جسے ان سطور میں نمایاں کرنا مقصود ہے' وہ ان کی قادیانیت کے خلاف جدوجہد ہے۔ اقبال کو دینی امور میں گہری بصیرت اور قومی معاملات میں پیش بینی حاصل تھی۔ قادیانیت کی حقیقت کو نقد و نظر کی ترازو میں جس طرح اقبال نے پرکھا ہے کسی دوسرے نے نہیں پرکھا۔

قادیانیت جسدِ ملت کا ناسور

قادیانیت محض مذہبی مسئلہ نہیں جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں' یہ اپنے مخصوص احوال کے پیشِ نظر ایک اجتماعی قومی' ملی' تہذیبی' معاشرتی اور سیاسی مسئلہ ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اقبال وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے فتنۂ قادیانیت کی سنگینی کا صحیح ادراک اور احساس کیا۔ وہ فتنۂ قادیانیت کو جسدِ ملت کا ناسور اور وحدتِ ملی کے لیے زہرِ قاتل تصور کرتے تھے۔

بانیِ قادیانیت کی حکمتِ عملی شروع ہی سے یہ رہی ہے کہ ملتِ اسلامیہ میں انتشار پسند اور حریص عناصر کی حوصلہ افزائی کی جائے اور اس کے اتحاد کو کمزور کیا جائے۔ یورپی طاقتوں کو ہندوستان میں ایک ایسا دینی اور سیاسی قمار باز درکار تھا جو اپنی اور ان کی اغراض کی خاطر مسلم اتحاد کے خلاف ایک جدا مذہبی جماعت کی تشکیل کر سکتا ہو' مرزا غلام احمد قادیانی کی شخصیت میں ان کا مطلوبہ جھوٹا نبی مل گیا۔

ادھر ہندو سیاست اور ذہنیت نے قادیانی تحریک کو سیاسی اعتبار سے مفید پا کر اس کی زبردست

حمایت کی۔ان کے خیال میں قادیانیت کی تحریک ہی مسلمانوں کے اتحاد عالم عرب سے تعلق اور پان اسلام ازم کا خاتمہ کرسکتی تھی۔انگریز اور ہندو کی سرپرستی میں مرزا غلام احمد قادیانی کے دعویٰ نبوت اور تنسیخ جہاد کے اعلان نے ایک اہم برطانوی ضرورت کو پورا کردیا۔

قادیانی نبوت کا دعویٰ

قادیانیت کے اس کردار کا اعتراف خود اس کے بانی نے کیا مثلاً اپنی ایک کتاب میں کہتے ہیں:

''میں خدا کے حکم کے موافق نبی ہوا' اور اگر میں اس سے انکار کروں تو میرا گناہ ہوگا اور جس حالت میں خدا میرا نام نبی رکھتا ہے تو میں کیونکر انکار کرسکتا ہوں۔''

(مرزا قادیانی کا خط مورخہ 3 مئی 1908ء بنام اخبارِ عام لاہور)

''سچا خدا وہی خدا ہے' جس نے قادیان میں اپنا رسول بھیجا۔''

(دافع البلا' ص 10-11 مصنف مرزا قادیانی)

''میں خدا تعالیٰ کے ان تمام الہامات پر جو مجھ پر ہو رہے ہیں، ایسا ہی ایمان رکھتا ہوں جیسا کہ تورات اور انجیل اور قرآنِ مقدس پر ایمان رکھتا ہوں۔''

(ماخوذ تبلیغ رسالت جلد ہشتم 64ء اشتہار مورخہ 4 اکتوبر 1899ء)

خدا تعالیٰ نے مجھ پر ظاہر کیا ہے کہ ہر ایک شخص جس کو میری دعوت پہنچی ہے اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا' وہ مسلمان نہیں ہے۔(حقیقۃ الوحی از مرزا قادیانی' ص 163)

''میں ابتدائی عمر سے اس وقت تک جو ساٹھ برس کی عمر تک پہنچا ہوں، اپنی زبان اور قلم سے اس اہم کام میں مشغول ہوں تا کہ مسلمانوں کے دلوں کو گورنمنٹ انگلینڈ کی سچی محبت اور خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیروں' ان کے بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال جہاد وغیرہ کے دور کروں۔''

(درخواست بحضور نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر دام اقبالہ منجانب خاکسار مرزا قادیانی مورخہ 24 فروری 1898ء)

یہ ہے وہ فتنہ قادیانیت جس کی سنگینی کا اقبال نے بروقت احساس کیا اور اپنے طویل مکاتیب اور مضامین کے ذریعہ قادیانی فتنہ کی اصل حقیقت' اس کے دوررس اثرات اور نتائج کی وضاحت کی۔

اس سلسلہ میں اقبال نے اس دور کے علماء و اکابرین اسلام سے طویل خط و کتابت کی۔ پوری تحقیق اور توثیق کے بعد قادیانی مسئلہ کے ہر پہلو پر غور و خوض کیا اور نتائج اخذ کر کے مسلمانوں کی جماعت

کے مفادات کی مدافعت غیر معمولی کامیابی کے ساتھ انجام دی۔ اقبال نے جن علماء سے اس سلسلے میں رجوع کیا' ان میں مولانا سیّد سلیمان ندوی' انور شاہ کاشمیری' سیّد الیاس برنی' مولانا مسعود عالم ندوی' سیّد نعیم الحق ایڈووکیٹ پٹنہ' مولانا حسین احمد مدنی صاحب، قابلِ ذکر ہیں۔ عقیدوں کی یہ جنگ ایسی دشوار اور نازک تھی کہ ''اسلام میں الٰہی نظریات کی تشکیلِ نو کے فاضل مقالہ نگار (اقبال) نے ایک مسلمان اور عاشقِ رسول کے جذبے سے اسے کامیابی سے سرانجام دیا۔

قادیانیت سے بیزاری

تحریک کے اوائل میں اسے ایک مذہبی تحریک خیال کر کے اقبال نے اس کی حمایت کی تھی۔ اس حوالے سے قادیانی ہفت روزہ ''سن رائز'' لاہور نے ان پر متضاد رائے رکھنے کا الزام لگایا۔ جواباً اقبال نے فرمایا: کسی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہوتی' اسے پوری طرح نمایاں ہونے کے لیے برسوں درکار ہوتے ہیں۔ ابتداء میں مولوی چراغ علی مرحوم جیسے اکابرین کے تحریک میں شامل ہونے کی بناء پر میں تحریک کا مداح تھا۔

آج پچیس سال بعد میں قادیانی تحریک سے اس لیے بیزار ہوا کہ ایک نئی نبوت کا دعویٰ کیا گیا ہے اور ایسی نبوت جسے بانی اسلام کی اصل نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کہا گیا ہے اور میں نے ایک بڑے قادیانی کو حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان میں دشنام طرازی کرتے سنا۔

درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اقبال نے وضاحت کی کہ میرے رویے میں تناقض یا تضاد ایک زندہ صاحبِ فکر انسان کا حق ہے' وہ اپنی رائے بدل سکتا ہے۔ بقول ایمرسن ''صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔'' (حرفِ اقبال 123-122)

لاہوری جماعت کا قادیانی جماعت کے ساتھ اختلاف اور تنازعہ اس حقیقت پر شاہد ہے۔

اقبال کے مطابق قادیانیت کی اصل حقیقت قرونِ وسطیٰ کے غیر اسلامی تصوف اور دینیات میں پوشیدہ ہے۔ اس کا تصورِ خدا ایک ایسے خدا کا تصور ہے جو حاسد ہو اور جس کے پاس دشمنوں کے لیے لاتعداد زلزلے اور بیماریاں ہوں۔ اس فرقہ کا نبی کے متعلق نجومی کا تخیل اور اس کا روحِ مسیح کے تسلسل کا عقیدہ (جو دراصل مسیحِ موعود کا یہودی تصور ہے)۔

قادیانیت کی تحریک یہودیت کی تحریک

یہ چیزیں اپنے اندر یہودیت کے اتنے عناصر رکھتی ہیں۔ گویا یہ تحریک یہودیت کی طرف رجوع ہے۔ اسلامی ایران میں موبدانہ (یہودی نصرانی وغیرہ) اثر کے تحت کئی ملحدانہ تحریکیں اٹھیں اور

انھوں نے تناسخ کے یہودی تصور کو چھپانے کی غرض سے بروزی، ظلی نبی اور مسیح موعود وغیرہ کی اصطلاحیں وضع کیں، تاکہ وہ مسلم قلوب کو ناگوار نہ گزریں۔ اس نظریہ کے تحت جن دو جماعتوں نے حال ہی میں جنم لیا ہے ان میں میرے نزدیک 'بہائیت' قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے بندوں اسلام سے منحرف ہے لیکن قادیانیت اسلام کی چند اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے، لیکن اندرونی طور پر اسلام کی روح اور مقاصد کے لیے مہلک ہے۔ ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بناء نئی نبوت پر رکھے اور اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے، اسلام کی وحدت کے لیے خطرہ ہے۔ یہ اس لیے کہ اسلامی وحدت ختم نبوت سے استوار ہوتی ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے قادیانیت کی حمایت میں تین طویل مضامین چھپوائے جو ماڈرن ریویو کلکتہ میں جنوری 1936ء میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کا لب ولہجہ بڑا سخت اور تعصب آمیز تھا۔ اقبال نے جواب میں ان کے اعتراضات کی خاطر خواہ وضاحت کی، فرماتے ہیں: ہندوؤں کی طرح قادیانی بھی مسلمانانِ ہند کی سیاسی بیداری سے خائف ہیں کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی ترقی سے ان کا مقصد فوت ہو جائے گا کہ پیغمبر عرب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت سے ہندوستانی پیغمبر (مرزا قادیانی) کی ایک نئی امت تیار کریں! ایسے نبی کا تصور جس کا منکر، اسلام سے خارج اور جہنمی ہو جاتا ہے، قادیانیت کا ایک لازمی عنصر ہے۔

"جو شخص تیری پیروی نہ کرے گا اور تیری بیعت میں داخل نہ ہوگا اور صرف تیرا مخالف رہے گا، وہ خدا اور رسول کی نافرمانی کرنے والا جہنمی ہے۔"

(اشتہار معیار الاخیار ص 8 مطبوعہ ضیاء الاسلام پریس قادیان 25 مئی 1900ء)

"اب ظاہر ہے کہ ان الہامات میں میری نسبت بار بار بیان کیا گیا ہے کہ یہ خدا کا فرستادہ، خدا کا مامور، خدا کا امین اور خدا کی طرف سے آیا ہے، جو کچھ کہتا ہے اس پر ایمان لاؤ اور اس کا دشمن جہنمی ہے۔"

(انجام آتھم ص 62 مطبوعہ قادیان 1922ء)

اپنی ایک کتاب میں مرزا قادیانی کہتے ہیں: کل مسلمانوں نے مجھے مان لیا ہے اور تصدیق کی ہے مگر کنجریوں کی اولاد نے مجھے نہیں مانا۔

(آئینہ کمالات اسلام از مرزا قادیانی)

(صفحہ 547 تا 548)

قادیانی ملک وملت کے غدار

اقبال نے واضح کیا کہ ایسی مذہبی جماعت جو اسلام کے مسلمہ عقیدوں سے انحراف کرے دائرہ مذہب سے خارج کیے جانے کے قابل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ایران کا احساس بہائیوں کے خلاف اس قدر سخت تھا' اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کا احساس قادیانیوں کے خلاف اس قدر شدید ہے۔ اپنے جواب کی اس منطقی بناء پر اقبال نے پنڈت جواہر لال نہرو پر ایک چونکا دینے والا انکشاف کیا۔ اقبال فرماتے ہیں۔ ''میں اپنے ذہن میں اس امر کے متعلق کوئی شبہ نہیں پاتا کہ قادیانی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار (Tratiors) ہیں۔ قادیانیت کی حمایت میں لکھے گئے سٹیٹسمین 14 مئی 1935ء کے اداریہ کے جواب میں اقبال نے مسلمانانِ ہند کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ہمیں قادیانیوں کی حکمت عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق ان کے رویے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ بانی تحریک نے ملتِ اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے تشبیہ دی اور اپنے مقلدین کو ملتِ اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے منع کیا۔ علاوہ ازیں ان کا اسلام کے بنیادی اصولوں کے قیام نماز اور نکاح وغیرہ میں مسلمانوں کا مقاطعہ اور سب سے بڑھ کر یہ اعلان (جو رسالہ تشحیذ الاذہان) میں شائع ہوا کہ ملت اسلامیہ کافر ہے۔ یہ تمام باتیں قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں۔ ملت اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے کیونکہ وہ غدارانِ اسلام ہیں۔ میرے نزدیک قادیانیوں کے سامنے صرف دو راستے ہیں' یا وہ بہائیوں کی طرح ختم نبوت کو صریحاً جھٹلا دیں' یا پھر ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر ختم نبوت کو صدق دل سے قبول کر لیں' لیکن ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام میں ہوتا رہے اور وہ سیاسی فائدے (اعلیٰ ملازمتیں جو مسلمانوں کے لیے مختص ہوں) حاصل کرتے رہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی کے نام ایک خط میں جو روزنامہ احسان لاہور میں شائع ہوا' اقبال نے فرمایا'' قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوت محمدیہ کے کامل واکمل ہونے سے انکار کی راہ کھولتی ہے۔ چنانچہ قادیانی بجا طور پر ''باغیانِ محمدؐ'' کہلانے کے سزاوار ہیں۔ ختم نبوت کے معنی ہیں کہ کوئی شخص بعدِ اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزاء نبوت کے موجود ہیں' یعنی مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں نہ داخل ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے اور واجب القتل ہے۔ مسیلمہ کذاب کو اسی بنا پر قتل کیا گیا تھا۔ اقبال فرماتے ہیں کہ مسیلمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے اذان دیتا تھا کہ محمد اللہ کے رسول ہیں (مسیلمہ کے لیے) اذان عبداللہ بن النواحہ دیتا اور اقامت حجیر بن عمیر

کہتا اور جب تحیر شہادت کے قریب پہنچتا تو مسیلمہ کہتا اے تحیر خوب زور سے کہو (یعنی شہادت کو بلند آواز سے کہوتا کہ لوگوں کو اچھی طرح سنائی دے) پس تحیر آواز کو بلند کرتا اس طرح مسیلمہ اپنی تصدیق میں مبالغہ کرتا۔''

قادیانیوں کی مسلمانوں سے علیحدگی

اخبار سٹیٹسمین کے اداریے کے جواب میں اقبال نے فرمایا: اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں یعنی وحدتِ الٰہی پر ایمان' انبیاء کرام پر ایمان' رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم رسالت پر ایمان! دراصل یہ آخری عقیدہ ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان خطِ امتیاز کھینچتا ہے کہ فرد یا جماعت ملتِ اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں۔ قادیانی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت کو نہیں مانتے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے آج تک کوئی فرقہ اس حدِ فاصل کو عبور کرنے کی جسارت نہیں کر سکا۔ اقبال نے فرمایا: قادیانیوں کی تفریق کی پالیسی کے پیش نظر جو انھوں نے مذہبی اور معاشرتی معاملات میں ایک نئی نبوت کا اعلان کر کے اختیار کی ہے' خود حکومت کا فرض ہے کہ وہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی اقدام اٹھائے۔ ملتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔

جہاد کے خلاف فتویٰ

قادیانیت ایک ایسی تحریک ہے جس نے مسلمانوں سے جذبۂ جہاد سلب کرنے کی تگ و دو کی۔ شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ نے اس سلسلے میں سخت تنقید کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر؟

1935-37ء کے دوران قادیانی فتنہ اپنے عروج پر تھا' اسلام اور قادیانیت کا تنازعہ بحث کا خاص موضوع بن چکا تھا، چنانچہ اقبال کی تقریر و تحریر اور مضامین کے علاوہ ضرب کلیم کی اکثر غزلوں میں قادیانیت اور بانیِ قادیانیت کے معاندانہ رویے سے متعلق ناقدانہ اشارے ملتے ہیں۔ بانیِ تحریک اور اس کے مقلد انگریز آقاؤں کے حواری' آلۂ کار' وفادار اور خود کاشتہ تھے۔ اس کردار کا اعتراف خود اس کے بانی نے بڑے کھلے لفظوں میں فخر کے ساتھ کیا ہے۔ مثلاً اپنی ایک کتاب (تریاق القلوب) میں

ایک مقام پر لکھتا ہے:

میں نے ممانعتِ جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس ہزار الماریاں اُن سے بھر سکتی ہیں۔(تریاق القلوب ص 15 مرزا قادیانی مطبوعہ 1952ء)

اسی کتاب میں آگے چل کر فرماتے ہیں' ہر شخص جو میری بیعت کرتا ہے اور مجھ کو مسیحِ موعود یعنی رسول اللہ مانتا ہے اسی روز سے اس کو یہ عقیدہ رکھنا پڑتا ہے کہ اس زمانے میں جہاد قطعاً حرام ہے کیونکہ مسیح آ چکا' خاص کر میری تعلیم کے لحاظ سے اس گورنمنٹ انگریزی کا سچا خیر خواہ اسی کو بنا پڑتا ہے۔ (گورنمنٹ انگریزی اور جہاد ضمیمہ مرزا قادیانی) ایسا امام قوم کی صحیح امامت کا دعویٰ کیونکر کر سکتا ہے جو انگریز حکمرانوں کی اطاعت کو قوم کا مقدس دینی فریضہ قرار دے۔

قادیانیت اشعار کے آئینے میں

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے!

قادیانی نبوت اور الہام سے منکر ملت اسلامیہ کے خلاف کفر کے فتوے کے اعلان پر اقبال نے فرمایا:

پنجاب کے اربابِ نبوت کی شریعت
کہتی ہے کہ یہ مومنِ پارینہ ہے کافر

بانیِ قادیانیت کے وحی و الہام کے اعلان سے متعلق جو ملتِ اسلامیہ میں تفریق کا باعث بنا، اقبال کا ارشاد ہے:

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

قادیانی گروہ جس کے ماننے والے برطانیہ کے وظیفہ خوار ہیں، طرح طرح سے قادیانی نبوت کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں جس کا مقصد نبوت کے عقیدے پر ضرب لگانا اور نعوذ باللہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کامل و اکمل ہونے میں شبہ پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ مرزا غلام احمد کے حواری اس طرح کی خرافات کہتے رہتے تھے:

محمد پھر اتر آئے ہیں ہم میں
اور آگے سے بڑھ کر اپنی شان میں

محمد دیکھنے ہوں جس نے اکمل
غلام احمد کو دیکھے قادیان میں

(قاضی محمد ظہور الدین اکمل قادیانی منقول از اخبار پیغامِ صلح لاہور۔ مورخہ 14 مارچ 1916ء)

اقبال نے مسلمانوں کو اس فتنے سے بچانے کی زبردست کوشش کی، انھوں نے اپنی زبردست شاعرانہ صلاحیت کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا اور جگہ جگہ اپنے کلام میں مسلمانوں کو خاتم النبیین کی عظمت اور مرتبے سے واقف کرانے کی کوشش کی اور ختم نبوت پر ایمان اور عشقِ رسول کے تقاضے انھیں یاد دلائے۔ اقبال کا قادیانیوں کو علیحدہ جماعت تسلیم کرنے کا مطالبہ تصورِ پاکستان کی طرح کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ قادیانیت کے فتنہ کے طلسم کو باطل ثابت کرنے کے سلسلے میں یوں تو اقبال نے بہت پہلے ہی سے قدم اٹھا رکھا تھا مگر خاص کر 1935ء سے 1937ء کے عرصے میں، جب وہ خرابیِ صحت کی بناء پر اکثر علیل رہتے تھے، وہ ملتِ اسلامیہ خاص کر مسلمانانِ برصغیر کے لیے باعث فخر و مباہات ہیں۔ ان مساعی جمیلہ کی بناء پر جس کے نتیجہ میں آج قادیانی فرقہ آئینی اور دستوری طور پر مسلمانوں سے الگ ایک اقلیتی فرقہ تسلیم کرلیا گیا ہے یقیناً شاعرِ مشرق، مصورِ پاکستان، اقبالؒ نظریہ ختم نبوت کے محافظ اور فتنۂ قادیانیت کے استیصال کی کوشش میں نمایاں اور ممتاز ہوئے ہیں۔

قوم کی طرف سے اقبالؒ کو ان مساعیِ جمیلہ کا احترام اور اس عاشقِ رسول کی خدمت میں ہمارا نذرانۂ عقیدت بھی ہوسکتا ہے کہ ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر فتنۂ قادیانیت کے طلسم کے اندھیروں کو عشقِ رسول کے انوار سے دور کردیں اور ہر طرف ختم الرسل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور پھیلا دیں۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے!

ڈاکٹر وحید قریشی

علامہ اقبالؒ کے نظریات، تحریف اور تغیر کی زد میں

علامہ اقبالؒ کی حیثیت اہلِ پاکستان کے لیے شاعر سے زیادہ پاکستانی مفکر کی ہے، جس نے الگ وطن کا تصور دیا۔ اس لیے علامہ کے کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے نقاد اُن کی شاعری کی قدر و قیمت کے مقابلے میں ان کے خیالات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ہر سیاسی جماعت اپنے مسلک کی تائید میں علامہ اقبالؒ کے کلام سے ہی اشعار کا ورد کرتی ہے۔ اس طرح کثرتِ تعبیر سے کلام اقبالؒ عام قاری کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔ جاگیردار اپنی تائید کے لیے کلامِ اقبالؒ سے حوالہ لاتا ہے۔ مزدور بھی اپنی تائید کے لیے کلامِ اقبالؒ ہی سے کام چلاتا ہے۔ جمہوریت کا حامی بھی کلامِ اقبالؒ سے ہی اپنی تقریر کو سجاتا ہے اور فسطائیت کا حامی بھی کلام اقبالؒ ہی سے فال نکالتا ہے۔

یہ تو تصویر کا ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ مخالفینِ اقبال اس کی فکر کو مسخ کرنے کے لیے بھی ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ یہ کام پاکستان بننے سے پہلے ہی بہت زور و شور سے شروع ہو گیا تھا۔ مولانا صلاح الدین احمد مرحوم نے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی مرحوم کی موجودگی میں مجھے ایک واقعہ سنایا کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا اجلاس امرتسر میں ہوا۔ ہم دونوں اس جلسے میں گئے۔ وہاں علامہ اقبالؒ کے خیالات کی تردید میں مقالہ پڑھا گیا، جس کے خلاف دونوں نے احتجاج کیا اور جلسے سے اٹھ کر چلے آئے۔ اس ردِعمل کی وجہ سے علامہ کو رجعت پسند قرار دینے کا رجحان دھیما پڑ گیا اور انجمن کے اکابرین نے اس نازک مسئلے پر آئندہ اظہارِ خیال ترک کر دیا اور اقبال کو ترقی پسند کے طور پر قبول کرنے کی پالیسی اپنا لی گئی۔

علامہ اقبالؒ کو رجعت پسند قرار دینے کا آغاز علمی سطح پر سمتھ نے شروع کیا تھا جو اُن دنوں ایف سی کالج میں پڑھایا کرتے تھے۔ ان کی کتاب کے دو باب اہم ہیں، جن میں سے ایک کا عنوان **Iqbal the Progressive** اور دوسرے کا عنوان **Iqbal the Reactionary** ہے۔ اس دوسرے باب میں علامہ اقبال کی اسلام دوستی کو نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں حصولِ پاکستان

کے آس پاس بعض ہندو مصنفین کی تصانیف میں سب سے پہلی آواز 1946ء کے قریب سنہا نے اُٹھائی۔اپنی انگریزی کتاب میں علامہ اقبال کو فرقہ پرست مسلمانوں کا حامی اور محدود شاعر قرار دیا گیا۔ دونوں آوازیں ایک دوسرے کے متوازی چلتی رہیں۔ 1949ء کے بعد جب انجمن ترقی پسند مصنفین نے فیصلہ کیا کہ آئندہ سے علامہ اقبالؒ کو رجعت پسند قرار دیا جائے----تو علامہ اقبالؒ کو رجعت پسند قرار دینے کی آواز دوبارہ اہم ہوگئی۔ سنا ہے کہ اقبال کی حمایت میں علی سردار جعفری نے اقبال پر اپنی کتاب کا مسودہ تک نذر آتش کر دیا تھا۔

پاکستان میں اس سلسلے میں پہلا مقالہ زہیر صدیقی مرحوم کا تھا جو رسالہ ''جاوید'' میں شائع ہوا تھا۔اس میں اقبال کو رجعت پسند قرار دے کر رد کیا گیا تھا۔ یہ محاذ خاصا کمزور ثابت ہوا اور جلد ہی انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنا موقف تبدیل کر لیا۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد یہ انجمن سیاسی تحریک میں بدل کر جلد ہی ختم ہوگئی' لیکن بطور تحریک اپنے اثرات معاشرتی زندگی پر چھوڑ گئی۔اب فکرِ اقبال کی مخالفت کا زور اور فکری راستوں پر چل نکلا ہے۔ کراچی سے پہلی آواز محمد امین زبیری نے اٹھائی اور اقبال کے کردار کو نشانہ بنایا۔''اقبال کے خدوخال'' ان کی زندگی میں تو شائع نہ ہوسکی لیکن چند برس ہوئے اشاعت پذیر ہوئی۔ دوبارہ یہ کتاب رسالہ شاعر (بمبئی) کے اقبال نمبر کی زینت بنی ہے۔اس کا موضوع' اقبال کی ذات میں فکر و عمل کے تضادات کو قرار دیا گیا ہے۔اسی ذیل میں کتاب ''علامہ اقبال کی پہلی بیوی'' کو بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔اقبال کشی کی مہم نے نئے راستے اختیار کر لیے ہیں۔اقبال کے فلسفے کے اہم پہلوؤں اور ان کے خیالات کے تضادات کو ظاہر کرنے کے رجحان نے باقاعدہ مہم کی صورت اختیار کر لی ہے۔ سرکاری ادارے بھی اس کی زد میں آنے لگے۔اقبال اکیڈمی سے ایک کتاب ''خطباتِ اقبال نئے تناظر میں'' شائع ہوئی جس میں اقبال کی فکر کے بعض پہلوؤں کو نشانہ بنایا گیا تھا۔اس کا نوٹس لیا گیا اور ہم نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اس کتاب کو Ban کیا جائے۔ ہمارا موقف یہ تھا کہ سرکاری سرمائے سے یہ کام اس ملک میں نہیں ہونا چاہیے۔

اب حال ہی میں اس حوالے سے ایک نیا رجحان سامنے آیا ہے اور یہ اقبال کی عبارتوں کی تحریف کا ہے۔ چند برس سے بعض کتابوں میں علامہ اقبالؒ کو قادیانی ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ سمن آباد لاہور سے پچھلے چند برس میں اس موضوع پر دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔اس کا نوٹس اقبال اکیڈمی کے عہدیدار ڈاکٹر وحید عشرت نے بروقت لیا۔اس سال اقبال کشی کی مہم ایک نئے دور میں داخل ہوگئی ہے۔اقبال کی نثری تحریروں میں 1935ء کے قریب قادیانیوں کی مخالفت بہت بڑھ گئی تھی۔ خاص کر پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں علامہ کے بیانات بہت سخت تھے اور ان میں قادیانیوں کو ''غدار''

تک قرار دیا گیا تھا' جس کا جواب کسی سے بن نہیں پایا تھا' چنانچہ اس مشکل کا حل بھی مخالفینِ اقبال نے اب نکال لیا ہے۔ حال ہی میں لاہور سے نہرو کے نام اکابرین کے خطوط کے مجموعے **A Bunch of Old Letters** کا اردو ترجمہ بعنوان ''جدوجہد آزادی پر ایک نظر'' شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کے مترجم ملک اشفاق کے متعلق بھی کتاب کے فلیپ سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف ستیانہ فیصل آباد کے رہنے والے ہیں۔ 1986ء میں لاہور سے ایم اے اردو کیا۔ 1992ء میں بہاولپور سے ایم اے تاریخ میں کامیاب ہوئے۔ پھر 1998ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایل ایل بی کا امتحان بھی پاس کر لیا۔

موصوف کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ کیلاش کا سفرنامہ' خلیل جبران کے شاہکار افسانے' داستانِ نپولین اور دنیا کی نامور شخصیات ان کی تصانیف ہیں۔ نئی کتاب کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ نہرو کے نام ان خطوط کو وہ پہلی بار اردو میں ترجمہ کر رہے ہیں' حالانکہ یہ درست نہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ پہلے پہل جامعہ ملیہ دہلی سے 1942-1941ء میں شائع ہو چکا ہے۔ کمال یہ کیا گیا ہے کہ بعض خطوط کا ترجمہ نہیں' صرف خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ نہرو کے نام علامہ اقبالؒ نے 21 جون 1936ء کو جو خط لکھا ہے' اس میں علامہ نے پورے ایک صفحے میں اپنے موقف کا جواز پیش کیا ہے۔ ٹیپ کا جملہ یہ تھا:

"I have no doubt in my mind that the Ahmadis are traitors both to Islam and to India."

یہ خط پورے کا پورا اقبال اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب کے صفحہ 200 پر شائع ہو چکا ہے اور نہرو کی کتاب سے' جولندن سے 1960ء میں شائع ہوئی' ماخوذ ہے۔ اس جملے کا جو ترجمہ ملک اشفاق نے کیا ہے' وہ بھی ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں:

''احمدیوں اور مسلمانوں میں زیادہ اختلافات نہیں ہیں' نہ ہی احمدی اسلام اور نہ ہی ہندوستان کے لیے دہشت گرد ہیں۔ (جدوجہدِ آزادی پر ایک نظر' ترجمہ ملک اشفاق' ناشر فکشن ہاؤس 18 مزنگ لاہور' سال اشاعت 1999ء صفحہ 175)۔

میری رائے میں ایسے ترجموں یا خلاصوں کا سختی سے نوٹس لینا چاہیے اور انھیں **Ban** کر دینا چاہیے کیونکہ اس طرح کی تحریفات سے فکرِ اقبال کو مسخ کرنے کے رجحان کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

قادیانیت پر اقبال کی گرفت

بین الاقوامی سامراج کے سب سے بڑے نمائندے انگریزی استعمار نے امتِ مسلمہ کو مستقل طور پر انتشار و نفاق میں مبتلا کرنے کے لیے مختلف حربے اختیار کیے۔ ان میں ایک انتہائی خطرناک سازش ایک نئی نبوت کا اجراء تھا۔ اس کے لیے پنجاب کے ایک غیر متوازن ذہن کے ایک شخص غلام احمد قادیانی (1840-1908ء) کو آلۂ کار بنایا گیا جو بدقسمتی سے اردو عربی اور فارسی زبانوں کا ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم سے بھی آگاہ تھے' مگر شہرت و ناموری کے مرض میں بری طرح مبتلا اور صحیح معنوں میں نفسیاتی مریض تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے 1891ء میں مسیح موعود ہونے کا اور 1901ء میں باقاعدہ نبوت کا اعلان کیا اور انگریزوں نے ان کی ہر طرح سے حمایت کی۔ دراصل موصوف کا خاندان پشتوں سے انگریزوں کا نمک خوار تھا اور اس کا برملا اعتراف انھوں نے متعدد مقامات پر کیا ہے۔ اپنی ''کتاب البریہ'' کے آغاز میں ''اشتہار واجب الاظہار'' میں لکھتے ہیں:

> ''میں ایک ایسے خاندان سے ہوں جو اس گورنمنٹ کا پکا خیر خواہ ہے۔ میرا والد مرزا غلام مرتضیٰ گورنمنٹ کی نظر میں وفادار اور خیر خواہ آدمی تھا' جن کو دربارِ گورنری میں کرسی ملتی تھی اور جن کا ذکر مسٹر گریفن صاحب کی تاریخِ رئیسانِ پنجاب میں ہے اور 1857ء میں انھوں نے اپنی طاقت سے بڑھ کر سرکارِ انگریزی کو مدد دی تھی۔ یعنی پچاس سوار اور گھوڑے بہم پہنچا کر عین زمانۂ غدر کے وقت سرکارِ انگریزی کی امداد میں دیے تھے۔ ان خدمات کی وجہ سے جو چٹھیاتِ خوشنودی حکام سے ان کو ملی تھیں' مجھے افسوس ہے کہ بہت سی ان میں سے گم ہو گئیں' مگر تین چٹھیات جو مدت سے چھپ چکی ہیں' ان کی نقلیں حاشیہ میں درج کی گئی ہیں۔ پھر والد صاحب کی وفات کے بعد میرا بڑا بھائی مرزا غلام قادر خدماتِ سرکاری میں مصروف رہا اور جب تموں کے گزر پر مفسدوں کا سرکارِ

انگریزی کی فوج سے مقابلہ ہوا تو وہ سرکارِ انگریزی کی طرف سے لڑائی میں شریک تھا۔'' 1

دوسرے مقامات پر بھی مرزا صاحب کھلم کھلا اپنے آپ کو انگریزوں کا وفادار اور اطاعت گزار ثابت کرتے ہیں۔ متعلقہ اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنتِ انگریزی کی تائید و حمایت میں گزرا ہے اور میں نے ممانعتِ جہاد اور سرکارِ انگریزی کی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں کہ اگر وہ اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں۔ میں نے اپنی کتابوں کو تمام ممالکِ عرب، مصر اور شام اور روم تک پہنچا دیا ہے۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور مہدیٔ خونی اور مسیحِ خونی کی بے اصل روایتیں اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرتے ہیں، ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔'' (تریاق القلوب، ص15) 2

''شہادت القرآن'' کے آخر میں لکھتے ہیں:

''میرا مذہب جس کو میں بار بار ظاہر کرتا رہا ہوں، یہی ہے کہ اسلام کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کرے اور دوسرے اس سلطنت کی کہ جس نے امن قائم کیا ہو، جس نے ظالموں کے ہاتھ سے اپنے سایے میں پناہ دی ہو۔ سو وہ سلطنت حکومتِ برطانیہ ہے۔'' 3

لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کے نام ایک درخواست (24 فروری 1898ء) میں لکھتے ہیں:

''دوسرا امر قابلِ گذارش یہ ہے کہ میں ابتدائی عمر سے اس وقت تک جو قریباً ساٹھ برس کی عمر تک پہنچا ہوں، اپنی زبان اور قلم سے اس اہم کام میں مشغول ہوں تا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچی محبت اور خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیروں اور ان کے بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال جہاد وغیرہ کا دور کروں جو دلی صفائی اور مخلصانہ تعلقات سے روکتے ہیں۔'' 4

چونکہ انگریزوں کو سب سے زیادہ خطرہ مسلمانوں کے جذبۂ شہادت اور جوشِ جہاد سے تھا لہٰذا مرزا صاحب نے یہ جذبہ ختم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ فرماتے ہیں:

''میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے، ویسے ویسے مسئلہ

جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیونکہ مجھے مسیح اور مہدی مان لینا ہی مسئلہ جہاد کا انکار کرنا ہے۔" (تریاق القلوب' ص 335)[5]

غرض بے شمار تحریروں میں مرزا صاحب نے اپنے آپ کو انگریزی استعمار کا نہایت فرمانبردار' نیاز مند ثابت کیا ہے۔ اپنے آپ کو "انگریزوں کا خود کاشتہ پودا" اور اپنی جماعت کو انگریزوں کی "نمک پروردہ اور نیک نامی حاصل کردہ اور موردِ مراحمِ گورنمنٹ" کے الفاظ وتراکیب سے موسوم کیا ہے۔ وہ انگریزی استعمار کو "سایۂ الٰہیہ" اور "دولتِ دین پناہ" قرار دیتے ہیں اور مسلمانوں کو نہایت جوش وخلوص کے ساتھ اس کی محکومی وغلامی کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہی نہیں' بلکہ مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے صاحبزادے (اور جانشین) بشیر الدین محمود نے برملا اور دوٹوک انداز میں ہر اُس شخص کو کافر اور جہنمی قرار دیا جو مرزا صاحب پر ایمان نہیں لاتا (بحوالہ قادیانیت ص 90) امتِ محمدی کے خلاف ان کے بغض کا اندازہ بشیر الدین محمود کے اس فتوے سے کیا جا سکتا ہے کہ "غیر احمدی بچے کا بھی جنازہ پڑھنا درست نہیں۔" (ص 93)

غرض قادیانیت ایک ایک معاملے میں امتِ مسلمہ سے الگ اور متخالف امت کی حیثیت اختیار کر گئی اور مرزا بشیر الدین محمود نے 1931ء میں برملا اعلان کیا کہ ان کا امتِ مسلمہ سے ذاتِ خداوند' رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' قرآن' نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ یعنی ایک ایک جزو میں اختلاف ہے۔ یہی سبب ہے کہ قادیانیوں کو امتِ مسلمہ کے ہر نقصان پر خوشی ہوتی ہے اور ہر کامیابی پر وہ پریشان وملول ہوتے ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم میں ترکی کی شکست پر قادیان میں جشن منایا گیا (منیر انکوائری رپورٹ' ص 209 بحوالہ اقبال اور قادیانی' ص 34) اور عالمِ اسلام کے سب سے بڑے دشمن اسرائیل میں قادیانی مشن قائم ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتداء میں قادیانیت اور قادیانیوں کے بارے میں علامہ اقبال کا طرزِ عمل خاصا نرم تھا اور مسلمان سمجھ کر ہی ان سے معاملہ کرتے رہے' مگر جب قادیانیت کی حقیقت ان پر آشکار ہوگئی اور انھیں شرحِ صدر ہوگیا کہ یہ "نبوت" سرتاپا استعمار نواز ہے اور مسلمانوں میں نہ صرف افتراق ونفاق پیدا کر رہی ہے' بلکہ ان کی انقلابی روح کو ختم کرنے کی سازش میں مصروف ہے تو 1933ء میں انھوں نے اس کے خلاف علمِ جہاد بلند کر دیا اور 14 مئی 1935ء کو قادیانیت کے خلاف ایک بھرپور اور جامع بیان جاری فرمایا جو ہندوستان کے تقریباً سارے انگریزی اور اردو اخبارات نے شائع کیا۔ اس میں علامہ مرحوم نے مثالیں دے کر ثابت کیا کہ قادیانیت کے اندر یہودیت کے اتنے عناصر ہیں "گویا یہ تحریک ہی یہودیت کی طرف رجوع ہے۔"[6] اس بیان کے ضمیمے میں علامہ نے دوٹوک الفاظ

میں مطالبہ کیا ''میری رائے میں حکومت کے لیے بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان ان سے ویسی ہی رواداری سے کام لے گا جیسے وہ باقی مذاہب کے معاملے میں اختیار کرتا ہے۔''[7]

اس بیان پر مشہور انگریزی اخبار ''سٹیٹسمین'' نے اختلافی اداریہ لکھا تو علامہ نے ایک وضاحتی خط اسی اخبار میں شائع کرایا۔ اس خط میں رقم طراز ہیں:

''ہمیں قادیانیوں کی حکمتِ عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق ان کے رویے کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بانیِ تحریک نے ملتِ اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ اور اپنے مقلدین کو ملتِ اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں ان کا بنیادی اصولوں سے انکار، جماعت کا نیا نام (احمدی)، مسلمانوں کے قیامِ نماز سے قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ اور ان سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دنیائے اسلام کافر ہے، یہ تمام امور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے اس سے کہیں دور ہیں جتنے سکھ ہندوؤں سے۔ سکھ ہندوؤں سے شادیاں کرتے ہیں، اگرچہ وہ ہندو مندروں میں پوجا نہیں کرتے۔''[8]

اسی بیان میں وہ قادیانیوں کو غیر مسلم اور امتِ مسلمہ سے الگ قوم قرار دینے کا مطالبہ دہراتے ہیں۔

''ملتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے۔''[9]

علامہ اقبال کے متذکرہ بالا بیان اور جوابی وضاحت کا شائع ہونا تھا کہ گویا خلافِ اسلام حلقوں میں زلزلہ سا آ گیا اور قادیانیوں کے حامی لنگر لنگوٹ کس کر میدان میں آ گئے۔ انہی میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی تھے جنھوں نے بڑے ہی ناگوار لب و لہجے میں ''ماڈرن ریویو'' کلکتہ میں یکے بعد دیگرے تین مضامین لکھے۔ اقبال اُن دنوں بیمار تھے اور اطباء نے انھیں سختی سے آرام کا مشورہ دیا ہوا تھا، مگر وہ خاموش نہ رہ سکے اور ان مضامین کے جواب میں ایک بھرپور، مبسوط اور جامع بیان قلم بند فرمایا، جو 19 جنوری 1936ء کو طبع ہوا۔ یہ بیان ''حرفِ اقبال'' کے تیس صفحات پر مشتمل ہے۔ بقول نذیر نیازی علامہ مرحوم کو اس بیان اور اس کی اشاعت سے اتنی دلچسپی تھی کہ احباب کو خط لکھ لکھ کر دریافت فرماتے کہ

یہ ان تک پہنچا یا نہیں۔ یورپ تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے اپنے اس مضمون کا ایک الگ ایڈیشن بھی شائع کرایا۔

ان بیانات کے علاوہ بھی مختلف مواقع پر اور مکاتیب میں اقبال نے قادیانیت کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کھل کر کیا۔ لاہوری قادیانیوں کے انگریزی ہفت روزہ "Sun Rise" کے جواب میں جو خط لکھا، اس میں رقم طراز ہیں:

''ذاتی طور پر اس تحریک سے میں اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت---- بانیِ اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت---- کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی' جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔'' (حرفِ اقبال' ص 112)

پنڈت جواہر لال نہرو کے نام ایک خط میں دوٹوک انداز میں لکھتے ہیں:

''میرا ذہن اس بارے میں ہر شبہے سے پاک ہے کہ قادیانی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔'' [10]

''ملفوظاتِ اقبال'' (مرتبہ محمود نظامی) میں محمد حسین عرشی اپنی یادداشتوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''آخرِ عمر میں تقریباً ہر صحبت میں مرزا غلام احمد قادیانی کا ذکر آ جاتا تھا۔ ایک دفعہ فرمایا' سلطان ٹیپو کے جہادِ حریت سے انگریزوں نے اندازہ کیا کہ مسئلہ جہاد ان کی حکومت کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔ جب تک شریعتِ اسلام سے اس مسئلہ کو خارج نہ کیا جائے' ان کا مستقبل محفوظ نہیں۔ چنانچہ مختلف ممالک کے علمائے کرام کو آلۂ کار بنانا شروع کیا۔ اسی طرح ہندوستانی علماء سے بھی فتاویٰ حاصل کیے۔ لیکن تنسیخِ جہاد کے لیے ان علماء کو ناکافی سمجھ کر ایک جدید نبوت کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا بنیادی موقف ہی یہ تھا کہ اقوامِ اسلامیہ میں تنسیخِ جہاد کی تبلیغ کی جائے۔ احمدیت کا حقیقی سبب اسی ضرورت کا احساس تھا۔'' [11]

اقبال نے قادیانیت کو شعر و سخن کا موضوع بھی بنایا اور متعدد نظمیں اس کی مذمت و تردید میں لکھیں۔ مثنوی پس چہ باید کرد میں رقم طراز ہیں:

شیخ او لُردِ فرنگی را مرید
گرچہ گوید از مقامِ بایزید
گفت دیں را رونق از محکومی است
زندگانی از خودی محرومی است
دولتِ اغیار را رحمت شمرد
رقصہا گردِ کلیسا کرد و مرد 12

''یعنی اس مذہب کا بانی انگلستان کے لارڈوں کا آلۂ کار تھا' اگرچہ بزعمِ خویش وہ مقامِ بایزید سے بات کرتا تھا۔ اس نے فتویٰ دیا کہ انگریز کی غلامی میں رونق ہے اور غیرت کی زندگی بے کار ہے۔ وہ غیروں کی حکومت کو رحمت قرار دیتا رہا۔ وہ گرجے کے گرد ناچتا رہا اور اسی حالت میں مرگیا۔''

ضربِ کلیم میں ''ہندی مسلمان'' کے عنوان سے قادیانیت پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
تعلیم اس کو چاہیے ترکِ جہاد کی
دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر
باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر
ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبۂ یورپ سے درگزر 13

علامہ مرحوم مرزا قادیانی کی انگریز پرستی پر ایک اور جگہ تبصرہ کرتے ہیں ؎

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے 14

مرزا قادیانی نے اپنی نام نہاد نبوت سے امتِ مسلمہ میں جو افتراق پیدا کیا' اس پر یوں اظہارِ

خیال کرتے ہیں۔

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد 15

اسی بات کو ''نبوت'' کے عنوان سے ایک نظم میں یوں بیان فرماتے ہیں۔

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام 16

المختصر اقبال نے آخری دم تک قادیانیت کا بھرپور تعاقب کیا۔ اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ یہ مذہب یورپ کے تہذیبی اور سیاسی استعمار کو دوام بخشنے کی ایک سازش تھی۔ اور اقبال کو یہ بات کسی صورت منظور نہ تھی۔

حواشی

1. قادیانیت، ص 22۔
2. ایضاً ص 117۔
3. ایضاً ص 118۔
4. ایضاً ص 118۔
5. ایضاً ص 121۔
6. حرفِ اقبال، ص 104۔
7. ایضاً ص 109۔
8. ایضاً ص 118۔
9. ایضاً۔
10. روحِ مکاتیب اقبال، ص 609۔
11. ملفوظاتِ اقبال، ص 433۔
12. پس چہ باید کرد، ص 820۔
13. ضربِ کلیم، ص 490۔
14. ایضاً ص 512۔
15. ایضاً ص 497۔
16. ایضاً ص 518۔

ڈاکٹر وحید عشرت

اقبالؒ کے خطوط میں تحریف کی تازہ مثال

لاہور کے ایک اشاعتی ادارے فکشن ہاؤس نے جدوجہد آزادی پر ایک نظر کے عنوان سے پنڈت جواہر لعل نہرو کی کتاب **A Bunch of Old Letters** شائع کی ہے اور **Letters** کے ہجے **Latters** لکھے ہیں۔ ترجمہ ملک اشفاق کا ہے۔ اس کتاب کے صفحہ **175** پر پنڈت جواہر لعل نہرو کے نام اقبال کا ایک خط شائع کیا گیا ہے جس کی عبارت یوں ہے:

منجانب سر محمد اقبال

لاہور

21 جون **1936**ء

پیارے پنڈت جواہر لعل

آپ کا بہت بہت شکریہ! آپ نے جو خط لکھا تھا وہ مجھے کل مل گیا ہے۔ آپ نے جو آرٹیکل احمدیت اور ان کا سیاسی رویہ کے بارے میں لکھا ہے دراصل آپ احمدیوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔

احمدیوں اور مسلمانوں میں زیادہ اختلافات نہیں ہیں' نہ ہی احمدی اسلام اور نہ ہی ہندوستان کے لیے دہشت گرد ہیں۔

مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے موقع ضائع کر دیا اور آپ سے لاہور میں ملاقات نہ کر سکا میں ان دنوں بہت بیمار تھا اور اپنے کمرے سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ بیماری کی وجہ سے میں پچھلے دو سال سے ایک قسم کا ریٹائر ہو چکا ہوں۔ آپ مجھے بتائیں کہ آپ دوبارہ پنجاب کب آ رہے ہیں۔

کیا آپ کو میرا خط مل گیا تھا جس میں آزادی کے لیے سول یونین بنانے کا لکھا تھا؟ آپ مجھے اطلاع دیجئے' نہیں تو میں سمجھوں گا کہ آپ تک میرا خط نہیں پہنچا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

اس سے پیشتر کہ ہم اس خط کا تجزیہ کریں اور بتائیں کہ مترجم نے اس خط میں نہ صرف کہ کتر بیونت کی ہے بلکہ خط کا مفہوم ہی الٹ دیا ہے اقبال کہہ رہے ہیں کہ:

''میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقالہ اسلام اور ہندوستان کے لیے بہترین ارادوں کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ میرے ذہن میں اس بارے میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہند دونوں کے غدار ہیں۔''

جس کو ملک اشفاق نے یوں بدل دیا ہے:

''احمدیوں اور مسلمانوں میں زیادہ اختلافات نہیں، نہ ہی احمدی اسلام اور نہ ہی ہندوستان کے لیے دہشت گرد ہیں۔''

عبارت کا پورا مفہوم الٹ دینا نہ تو ترجمے کی غلطی ہے، نہ کمپوزنگ کی اور نہ ہی پروف خوانی کی۔ اشفاق احمد نے صفحہ 392 پر ویسٹ پنجاب کا ترجمہ مشرقی پنجاب کر دیا ہے اور ملک فیروز خان کے حوالے سے یوں ترجمہ کیا ہے ملک فیروز خاں نون نے کہا ''کہ دنیا کے کسی ملک نے ایسا عظیم انسان پیدا نہیں کیا جو مذہبی حوالے سے مہاتما گاندھی جیسا عظیم ہو'' جبکہ اصل عبارت میں یہ ہے کہ ''سوائے مذہبی رہنماؤں کے'' اشفاق احمد جاہلِ مطلق ہے یا بدنیت یا اس کے نام سے کسی اور جاہل نے یہ ترجمہ کیا ہے۔ صرف فکشن ہاؤس ہی یہ معمہ حل کر سکتا ہے۔ یہ واضح طور پر بددیانتی اور دانستہ کی گئی حرکت ہے۔ بعد میں جب یہ کتاب لوگوں کے اعتراضات کا باعث بنی تو اس کی اس عبارت پر کہ ''احمدیوں اور مسلمانوں میں زیادہ اختلافات نہیں ہیں پر ایک چیپی تصحیح کے لیے لگا دی گئی اور یہ خط یوں ہو گیا ہے:

منجانب سر محمد اقبال

لاہور

21 جون 1936ء

پیارے پنڈت جواہر لعل

آپ کا بہت بہت شکریہ! آپ نے جو خط لکھا تھا وہ مجھے کل مل گیا ہے۔ آپ نے جو آرٹیکل احمدیت اور ان کا سیاسی رویہ کے بارے میں لکھا ہے، دراصل آپ احمدیوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔

میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقالہ اسلام اور ہند کے لیے بہترین ارادوں کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ میرے ذہن میں اس بارے میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہند دونوں کے غدار ہیں۔

مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے موقع ضائع کر دیا اور آپ سے لاہور میں ملاقات نہ کر سکا۔

میں اُن دنوں بہت بیمار تھا اور اپنے کمرے سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ بیماری کی وجہ سے میں پچھلے دو سال سے ایک قسم کا ریٹائر ہو چکا ہوں۔ آپ مجھے بتائیں کہ آپ دوبارہ پنجاب کب آ رہے ہیں۔

کیا آپ کو میرا خط مل گیا تھا جس میں آزادی کے لیے سول یونین بنانے کا لکھا تھا؟ آپ مجھے اطلاع دیجئے۔ نہیں تو میں سمجھوں گا کہ آپ تک میرا خط نہیں پہنچا۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال

تاہم پورا خط پھر بھی تبدیل نہیں کیا گیا جس سے مصنف اور ادارے کی بد نیتی اور واضح ہو گئی ہے۔

جبکہ مرحوم لطیف احمد شیروانی کی مرتبہ کتاب Speeches, Writings and Statements of Iqbal کے ص 200 پر علامہ اقبال کے 21 جون 1936ء کے اسی خط کی انگریزی عبارت اس سے قطعی مختلف ہے، جس کا عکس دیا جا رہا ہے۔ یہی خط A Bunch of old Letters کے صفحہ 188-187 پر بھی موجود ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود اقبال اکادمی کے نئے ایڈیشن میں یہ خط صفحہ 240 پر آیا ہے جس میں سے پھر ایک فقرہ ادھورا رہ گیا ہے جو صفحہ 240 کے آخری حروف I کے بعد اور صفحہ 241 کے لفظ Ahmadies کے درمیان آنا تھا۔ یہ فقرہ یوں ہے جسے ان شاء اللہ اگلے ایڈیشن میں درست کر دیا جائے گا۔

Blieved that you had no idea of the political attitude of the

تاہم نیچے کے خط کے عکس میں یہ موجود ہے۔

Letter to Pandit Jawahar Lal Nehru about the Ahmadis, 21 June 1936

Thank you so much for your letter which 1 received yesterday. At the time I wrote in reply to your articles, I believed that you had no idea of the political attitude of the Ahmadis. Indeed the main reason why I wrote a reply was to show, especially to you how Muslim loyalty had originated and how eventually. It had found a revelational basis in Ahmadism. After the publication of my paper I discovered, to my great surprise, that even the educated Muslims had no

(۶) احمدیوں کے بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو کے نام مکتوب

۲۱ جون ۱۹۳۶ء

آپ کے مکتوب کا بہت بہت شکریہ جو مجھے کل موصول ہوا۔ جب میں نے آپ کے مضامین کا جواب دیا میں یہ سمجھتا تھا کہ آپ کو احمدیوں کے سیاسی رویئے کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ درحقیقت میرے جواب لکھنے کا بڑا سبب یہ دکھانا تھا' بالخصوص آپ کو' کہ کس طرح مسلمانوں کی وفاداری کی ابتداء ہوئی اور اس نے کس طرح احمدیت میں الہام کی اساس حاصل کی۔ میرے مقالے کی اشاعت کے بعد مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی ان تاریخی وجوہ کا کچھ علم نہیں جنہوں نے احمدیت کی تعلیمات کو تشکیل دیا۔ مزید برآں آپ کے مداح پنجاب میں اور دیگر مقامات پر آپ کے مضامین سے پریشان ہو گئے کیونکہ انہوں نے یہ محسوس کیا کہ شاید آپ کو تحریک احمدیہ سے ہمدردی ہے۔ احمدی پریس بڑی حد تک آپ کے بارے میں اس غلط فہمی کو پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ تاہم یہ معلوم کر کے مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ کے بارے میں میرا تاثر غلط تھا۔ مجھے خود دینیات میں کوئی دلچسپی نہیں لیکن مجھے اس میں تھوڑا سا حصہ اس لئے لینا پڑا تاکہ میں احمدیوں سے ان کے اپنے محاذ پر نمٹ سکوں۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقالہ اسلام اور ہند کے لئے بہترین ارادوں کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ میرے ذہن میں اس بارے میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہند دونوں کے غدار ہیں۔

مجھے آپ سے لاہور میں نہ مل سکنے کا بے حد افسوس ہے۔ میں ان دنوں میں بہت بیمار تھا اور اپنے گھر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ گزشتہ دو برس سے مسلسل علالت کے باعث عملاً" میں فارغ شدہ زندگی بسر کر رہا ہوں۔ آئندہ جب آپ پنجاب تشریف لائیں تو مجھے ضرور اطلاع دیں۔ آپ کی شہری آزادیوں کی مجوزہ یونین کے بارے میں آپ کو میرا خط ملا؟ چونکہ آپ نے اپنے خط میں اس کی وصولیابی کی کوئی اطلاع نہیں دی خدشہ ہے کہ وہ آپ تک نہیں پہنچا۔

(6)

Letter to Pandit Jawahar Lal Nehru about the Ahmadis, 21 June 1936*

Thank you so much for your letter which I received yesterday. At the time I wrote in reply to your articles I believed that you had no idea of the political attitude of the Ahmadis. Indeed the main reason why I wrote a reply was to show, especially to you, how Muslim loyalty had originated and how eventually it had found a revelational basis in Ahmadism. After the publication of my paper I discovered, to my great surprise, that even the educated Muslims had no idea of the historical causes which had shaped the teachings of Ahmadism. Moreover your Muslim admirers in the Punjab and elsewhere felt perturbed over your articles as they thought you were in sympathy with the Ahmadiyya movement. This was mainly due to the fact that the Ahmadis were jubilant over your articles. The Ahmadi Press was mainly responsible for this misunderstanding about you. However I am glad to know that my impression was erroneous. I myself have little interest in theology, but had to dabble in it a bit in order to meet the Ahmadis on their own ground. I assure you that my paper was written with the best of intentions for Islam and India. I have no doubt in my mind that the Ahmadis are traitors both to Islam and to India.

I was extremely sorry to miss the opportunity of meeting you in Lahore. I was very ill in those days and could not leave my rooms. For the last two years I have been living a life practically of retirement on account of continued illness. Do let me know when you come to the Punjab next. Did you receive my letter regarding your proposed Union for Civil Liberties? As you do not acknowledge it in your letter I fear it never reached you.

*Reproduced from Jawaharlal Nehru, *A Bunch of Old Letters* (London, 1960), pp. 187-88. (Ed.)

idea of the historical causes which had shaped the teachings of Ahmadism. Moreover your Muslim admirers in the Punjab and elsewhere felt perturbed over your articles as they thought you were in sympathy with the Ahmadiyya movement. This was mainly due to the fact that the Ahmadis were jubilant over your articles. The Ahmadi Press was mainly responsible for this misunderstanding about you. However I am glad to know that my impression was erroneous. I myself have little interest in theology, but had to dabble in it a bit in order to meet the Ahmadis on their own ground. I assure you that my paper was written with the best of intentions for Islam and India. I have no doubt in my mind that the Ahmadis are traitors both to Islam and to India.

I was extremely sorry to miss the opportunity of meeting you in Lahore. I was very ill in those days and could not leave my rooms. For the last two years I have been living a life practically of retirement on account of continued illness. Do let me know when you come to the Punjab next. Did you receive my letter regarding your proposed Union for Civil Liberties? As you do not acknowledge it in your letter I fear it never reached you.

Reproduced from Jawaharlal Nehru. A Bunch of old Letters (London, 1960) PP.187-88 (Ed)

اس خط کا ترجمہ ممتاز صحافی اقبال احمد صدیقی نے کیا ہے جو دراصل لطیف احمد شیروانی کی کتاب **Speeches, Writings and Statements of Iqbal** کے اردو ترجمے علامہ اقبال' تقریریں' تحریریں اور بیانات کی صورت میں اقبال اکادمی پاکستان لاہور نے **1990**ء میں شائع کیا ہے۔ اس خط کی بھی نقل یہاں دی جا رہی ہے' جو اس کتاب کے ص **269** اور **270** پر موجود ہے۔

احمدیوں کے بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو کے نام مکتوب

"**21** جون **1936**ء

آپ کے مکتوب کا بہت بہت شکریہ جو مجھے کل موصول ہوا۔ جب میں نے آپ کے مضامین

کا جواب دیا میں یہ سمجھتا تھا کہ آپ کو احمدیوں کے سیاسی رویے کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ درحقیقت میرے جواب لکھنے کا بڑا سبب یہ دکھانا تھا' بالخصوص آپ کو کہ کس طرح مسلمانوں کی وفاداری کی ابتداء ہوئی اور اس نے کس طرح احمدیت میں الہام کی اساس حاصل کی۔ میرے مقالے کی اشاعت کے بعد مجھے یہ جان کر بڑی حیرت ہوئی کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی اُن تاریخی وجوہ کا کچھ علم نہیں جنھوں نے احمدیت کی تعلیمات کو تشکیل دیا۔ مزید برآں آپ کے مداح پنجاب میں اور دیگر مقامات پر آپ کے مضامین سے پریشان ہوگئے کیونکہ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ شاید آپ کو تحریکِ احمدیہ سے ہمدردی ہے۔ احمدی پریس بڑی حد تک آپ کے بارے میں اس غلط فہمی کو پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ تاہم یہ معلوم کر کے مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ کے بارے میں میرا تاثر غلط تھا۔ مجھے خود دینیات میں کوئی دلچسپی نہیں لیکن مجھے اس میں تھوڑا سا حصہ اس لیے لینا پڑا تاکہ میں احمدیوں سے ان کے اپنے محاذ پر نمٹ سکوں۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقالہ اسلام اور ہند کے لیے بہترین ارادوں کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ میرے ذہن میں اس بارے میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہند دونوں کے غدار ہیں۔

مجھے آپ سے لاہور میں نہ مل سکنے کا بے حد افسوس ہے۔ میں ان دنوں میں بہت بیمار تھا اور اپنے گھر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ گذشتہ دو برس سے مسلسل علالت کے باعث عملاً میں فارغ شدہ زندگی بسر کر رہا ہوں۔ آئندہ جب آپ پنجاب تشریف لائیں تو مجھے ضرور اطلاع دیں۔ آپ کی شہری آزادیوں کی مجوزہ یونین کے بارے میں آپ کو میرا خط ملا؟ چونکہ آپ نے اپنے خط میں اس کی وصولیابی کی کوئی اطلاع نہیں دی' خدشہ ہے کہ وہ آپ تک نہیں پہنچا۔"

فکشن ہاؤس لاہور سے شائع ہونے والی کتاب **A Bunch of Old Letters** کا ترجمہ ہے جو ملک اشفاق نے کیا ہے اور لطیف احمد شیروانی نے بھی اسی پنڈت جواہر لعل نہرو کی کتاب سے یہ خط لیا ہے تو دونوں میں عبارت کا اس قدر تضاد کیوں ہے اس کا جواب اشفاق ملک اور فکشن ہاؤس لاہور کو دینا پڑے گا۔ ملک اشفاق کون ہے اور فکشن ہاؤس لاہور والے کون ہیں؟ انھوں نے اس خط میں بددیانتی کی حد تک تحریف کیوں کی ہے؟ جبکہ جدوجہد آزادی پر ایک نظر اور علامہ اقبال' تقریریں' تحریریں اور بیانات ایک ہی سال میں شائع ہوئی ہیں۔ تاہم لطیف احمد شیروانی کی کتاب **1977 , 1948 , 1944**ء سے مسلسل شائع ہو رہی ہے اور اقبال اکادمی پاکستان نے اس کا نیا ایڈیشن **1995**ء

میں شائع کیا ہے۔اس لیے فکشن ہاؤس والے اور اشفاق ملک یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے یہ کتاب نہیں دیکھی۔قرائن کہتے ہیں کہ اشفاق ملک نے اس خط کا ابتدائی حصہ اور آخری حصہ لے لیا ہے اور باقی حصہ چھوڑ کر جان بوجھ کر تحریف کر کے اسے اپنے یا قادیانی مسلک کے مطابق کر دیا ہے اور لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی ہے جبکہ علامہ کی عبارت میں یہ تحریف اخلاقی اور قانونی طور پر جرم ہے۔
اشفاق احمد ترجمہ کرتے ہیں:

''احمدیوں اور مسلمانوں میں زیادہ اختلافات نہیں ہیں' نہ ہی احمدی اسلام اور نہ ہی ہندوستان کے لیے دہشت گرد ہیں۔''

جبکہ اقبال اس خط میں لکھتے ہیں:

''مجھے اس میں تھوڑا سا حصہ اس لیے لینا پڑا کہ میں احمدیوں سے ان کے اپنے محاذ پر نمٹ سکوں۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرا مقالہ اسلام اور ہند کے لیے بہترین ارادوں کے ساتھ لکھا گیا تھا۔ میرے ذہن میں اس بارے میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہند کے غدار ہیں۔''

قادیانی' اقبال کی تحریروں اور خطوط کو کس بدنیتی اور بددیانتی سے توڑ مروڑ رہے ہیں اس کی مثال اقبال نامے کا ایک اور خط بھی ہے۔اقبال نامہ کے ایک ہی ایڈیشن میں دو مختلف عبارتوں میں اقبال کا ایک خط شائع کیا گیا ہے' جو علامہ اقبال نے 10 جون 1937ء کو سر راس مسعود کے نام اپنے بچوں کے گارڈین کے حوالے سے لکھا۔اس خط کی عبارت میں بھی شرم ناک تحریف کی گئی اور اس خط سے علامہ اقبال کے اپنے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کے قادیانی ہونے کی بنا پر گارڈین شپ سے محرومی کا سبب ہٹا کر اس کی عیال داری اور لاہور سے باہر رہنے کو جواز بنا دیا گیا ہے۔ایک ہی ایڈیشن کی دو مختلف عبارتوں کو کس کے ایما پر تبدیل کیا گیا ہے یہ کوئی سربستہ راز نہیں' یہ تفصیل اقبالیات مجلّہ اقبال اکادمی پاکستان اور بمبئے کے رسالے ''شاعر'' کے اقبال نمبر میں پوری طرح میرے مضمون ''قصہ ایک خط کا......'' میں مل جائے گی۔
پھر یہ کتر بیونت بھی اصل خط کے مطابق نہیں۔اصل خط میں نہ صرف تحریف کی گئی بلکہ اقبال کے قادیانی بھتیجے شیخ اعجاز احمد نے چیلنج کیا کہ یہ خط کہیں موجود نہیں۔ہم نے سر راس مسعود کے پرائیویٹ سیکرٹری مرحوم سیّد ممنون حسن خان اور ڈاکٹر اخلاق اثر سے بھوپال میں رابطہ کیا تو ڈاکٹر اخلاق اثر کی کتاب اقبال نامہ سے یہ خط مل گیا جو ہم ذیل میں دے رہے ہیں مگر پہلے شیخ عطاءاللہ کے اقبال نامے کے خطوط کا عکس ملاحظہ کریں۔

لاہور 10 جون 1937ء خط نمبر 2

ڈیئر مسعود

پرسوں میں نے تمھیں ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا جو اب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardian مقرر کیے تھے یہ Guardian ازروئے وصیت مقرر کیے گئے تھے جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے نام ان کے حسب ذیل ہیں:

(1) شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔ (2) چودھری محمد حسین ایم۔ اے۔ سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں اور نہایت مخلص مسلمان۔ (3) شیخ اعجاز احمد بی۔ اے ایل ایل بی سب جج دہلی۔ (4) عبدالغنی مرحوم۔

عبدالغنی بیچارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو Guardian مقرر کروں۔ مجھے امید ہے کہ تمھیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے گارڈین تمھارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کرے۔ نادرہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا کہتے ہیں کہ آیوڈیکس اس کے لیے بہت مفید ہے یہ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے۔ دوسری سیال صورت میں۔ موخر الذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام
محمد اقبال

لاہور 10 جون 1937ء خط نمبر 1

ڈیئر مسعود

پرسوں میں نے تمھیں ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا جو اب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardian مقرر کیے تھے یہ Guardian ازروئے وصیت مقرر کیے گئے تھے جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے نام ان کے حسب ذیل ہیں:

(1) شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔ (2) چودھری محمد حسین ایم۔ اے۔ سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں اور نہایت مخلص مسلمان۔ (3) شیخ اعجاز احمد بی۔ اے ایل ایل بی سب جج دہلی۔ (4) عبدالغنی مرحوم۔

عبدالغنی بیچارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اس کی جگہ خان صاحب میاں امیر الدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے نمبر (3) شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رُو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا Guardian ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ وہ خود بہت عیال دار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو Guardian مقرر کروں۔ مجھے امید ہے کہ تمھیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے گارڈین تمھارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کرے۔ نادرہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا کہتے ہیں کہ آیوڈیکس اس کے لیے بہت مفید ہے یہ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے دوسری سیال صورت میں۔ موخر الذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام
محمد اقبال

ڈیئر مسعود

پرسوں میں نے تمہیں ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس
خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا جو اب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardian مقرر کیے
تھے یہ Guardian ازروئے وصیت مقرر کیے گئے تھے جو سب
رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے نام ان کے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلارک ہیں جو قریباً بیس سال سے
میرے ساتھ ہیں مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔

۲۔ چودھری محمد حسین ایم۔ اے۔ سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ
لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں اور نہایت مخلص مسلمان۔

۳۔ شیخ اعجاز احمد بی۔ اے ایل ایل بی سب جج دہلی۔

۴۔ عبدالغنی مرحوم۔ عبدالغنی بیچارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے
چکا ہوں۔ اس کی جگہ خان صاحب میاں امیر الدین سب رجسٹرار
لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے نمبر (۳) شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے
نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی
ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان
کافر ہیں اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا

آدمی مسلمان بچوں کا Guardian ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے
علاوہ وہ خود بہت عیال دار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے
میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو Guardian مقرر کروں۔ مجھے
امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور
سے بہت دور ہو لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے
گارڈین تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت
ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کرے
نادرہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا
کہتے ہیں کہ کولاڈیکس اس کے لیے بہت مفید ہے یہ ایک تو مرہم
کی صورت میں ہوتی ہے۔ دوسری سیال صورت میں۔ موخر الذکر کے
استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام
محمد اقبال

(۲۲۹) —— (۲۲۴)

لاہور — خط نمبر ۱
۱۰ جون ۱۹۳۶ء

ڈیئر مسعود

پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا۔ جواب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار guardian مقرر کئے تھے۔ یہ guardians اندرونے وصیت مقرر کئے گئے تھے۔ جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں۔

(۱) شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلرک ہیں۔ جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے (۲) چودھری محمد حسین ایم اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں۔ اور نہایت مخلص مسلمان (۳) شیخ اعجاز احمد بی اے ایل ایل بی سب جج دہلی (۴) عبدالغنی مرحوم

عبدالغنی بیچارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اس کی جگہ خان صاحب میاں امیر الدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے۔ نمبر ۳ شیخ اعجاز احمد میرا بھتیجا ہے۔ نہایت صالح آدمی ہے۔ لیکن وہ خود بہت عیالدار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو guardian مقرر کردوں۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو۔ لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے guardians تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ نادرہ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ امید کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا۔ کہتے ہیں کہ Iodex اس کے لئے بہت مفید ہے۔ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے۔ دوسری سیال صورت میں۔ موخر الذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔ والسلام

محمد اقبال

(۲۲۹) —— (۲۲۴)

لاہور — خط نمبر ۲
۱۰ جون ۱۹۳۶ء

ڈیئر مسعود

پرسوں میں نے ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا۔ جواب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار guardian مقرر کئے تھے۔ یہ guardians اندرونے وصیت مقرر کئے گئے تھے جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے۔ نام ان کے حسب ذیل ہیں۔

(۱) شیخ طاہر الدین۔ یہ میرے کلرک ہیں۔ جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔ (۲) چودھری محمد حسین ایم اے سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں۔ اور نہایت مخلص مسلمان (۳) شیخ اعجاز احمد بی اے ایل ایل بی سب جج دہلی (۴) عبدالغنی مرحوم

عبدالغنی بیچارے کی بابت تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو guardian مقرر کردوں۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو۔ لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا پڑا تو لاہور میں رہنے والے guardians تمہارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہو گیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کریں۔ نادرہ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ امید کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا۔ کہتے ہیں کہ IODEX اس کے لئے بہت مفید ہے۔ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے۔ دوسری سیال صورت میں۔ موخر الذکر کے استعمال میں سہولت ہے

والسلام

محمد اقبال

اقبال نامہ کے ص386-387 کے ایک ہی ایڈیشن میں یہ دونوں خط موجود ہیں۔ خط نمبر 1 پہلے ایڈیشن میں شائع ہوا۔ مگر کسی کے توجہ دلانے پر یا گرفت پر اس کو فوری طور پر تبدیل کر دیا گیا مگر چند نسخے فروخت ہو چکے تھے لہٰذا یہ تحریف ایک ثبوت چھوڑ گئی جس طرح فکشن ہاؤس کی کتاب جدوجہد آزادی پر ایک نظر کے ایک ہی ایڈیشن کے ابتدائی فروخت ہونے والے نسخوں اور فوری طور پر چھپی والے نسخوں میں فرق ہے۔ اقبال نامہ کی طرح انھوں نے بھی محض چیپی لگائی ہے پورا خط پھر شائع نہیں کیا۔ دونوں کا طریقہ واردات ایک جیسا ہے دونوں کی بدنیتی ایک ہی طرز پر ظاہر ہوئی ہے۔ اوپر ملاحظہ کریں۔ اقبال نامہ حصہ اوّل میں شائع ہونے والا خط نمبر 1 اور نمبر 2 اور دونوں کی عبارت میں تضاد کو نوٹ کریں اور نیچے دیا ہوا اقبال کا اصل خط بھی دیکھیے۔ جس کے بارے میں اعجاز احمد نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ دستیاب نہیں۔

لاہور

10 جون 1937ء

جب ہم نے یہ خط شائع کیا تو شیخ اعجاز احمد قادیانی کی توسٹی گم ہوگئی اور انھوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا مگر بعد میں اقبال اور تحریک احمدیت کے قادیانی مشنری اور مصنف شیخ عبدالماجد نے تحریر کے ایک قادیانی ایکسپرٹ کے ذریعے انکشاف کیا کہ یہ خط اقبال کا نہیں حالانکہ یہ بھوپال سے شائع شدہ کتاب سے لیا گیا تھا جہاں کہ اقبال سر راس مسعود کو خط لکھا کرتے تھے۔ یہ خط اپنے موضوع اور مفہوم کے اعتبار سے بھی اور سیاق و سباق کے حوالے سے بھی درست تھا۔ اس خط میں شیخ اعجاز احمد قادیانی کو جاوید اقبال اور منیرہ کی گارڈین شپ سے اس لیے ہٹایا گیا کیونکہ بھتیجا' نہایت صالح آدمی ہونے کے باوجود ''افسوس کہ دینی عقائد کی رُو سے قادیانی ہے' تم کو معلوم ہے کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں، اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اقبال نامہ سے یہ عبارت حذف کر دی گئی۔ ملاحظہ کیجیے یہ خط اور پھر اوپر دیئے گئے اقبال نامہ جلد اوّل کے دونوں خطوں سے اس کا موازنہ کریں:

ڈیئر مسعود

پرسوں میں نے تمھیں ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ پہنچا ہوگا۔ اس خط میں ایک بات لکھنا بھول گیا جو اب لکھتا ہوں۔

میں نے جاوید اور منیرہ کے چار **Guardian** مقرر کیے تھے یہ **Guardian** از روئے وصیت مقرر کیے گئے تھے جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے نام ان کے حسبِ ذیل ہیں۔

(1) شیخ طاہرالدین۔ یہ میرے کلارک ہیں جو قریباً بیس سال سے میرے ساتھ ہیں۔ مجھ کو ان کے اخلاص پر کامل اعتماد ہے۔

(2) چودھری محمد حسین ایم۔اے۔ سپرنٹنڈنٹ پریس برانچ سول سیکرٹریٹ لاہور۔ یہ بھی میرے قدیم دوست ہیں اور نہایت مخلص مسلمان۔

(3) شیخ اعجاز احمد بی۔اے ایل ایل بی سب جج دہلی۔

(4) عبدالغنی مرحوم۔

عبدالغنی بیچارے کی بابت میں تم کو اطلاع دے چکا ہوں۔ اس کی جگہ خان صاحب میاں امیر الدین سب رجسٹرار لاہور کو مقرر کرنے کا ارادہ ہے نمبر (3) شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے نہایت صالح آدمی ہے مگر افسوس کہ دینی عقائد کی رُو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے کہ آیا ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا Guardian ہوسکتا ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ وہ خود بہت عیال دار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو Guardian مقرر کروں۔ مجھے امید ہے کہ تمھیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ یہ درست ہے کہ تم لاہور سے بہت دور ہو لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہوا تو لاہور میں رہنے والے گارڈین تمھارے ساتھ خط و کتابت کر سکتے ہیں۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ لاہور کا درجہ حرارت کسی قدر کم ہوگیا ہے۔ لیڈی مسعود سلام قبول کرے۔ نادرہ کے لیے دعا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ تم کو اب نقرس سے آرام ہوگا کہتے ہیں کہ آیوڈیکس اس کے لیے بہت مفید ہے۔ یہ ایک تو مرہم کی صورت میں ہوتی ہے دوسری سیال صورت میں۔ موخرالذکر کے استعمال میں سہولت ہے۔

والسلام

محمد اقبال

اقبال کے ان خطوں میں بار بار تحریف کیوں کی جاتی ہے اس لیے کہ ان میں قادیانیوں کے بارے میں اقبال کی آراء بڑی واضح ہیں کہ قادیانی مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں لہٰذا ''میرے ذہن میں اس بارے میں مطلق کوئی شبہ نہیں کہ احمدی اسلام اور ہندو دونوں کے غدار ہیں۔'' پنڈت نہرو اور سر راس مسعود کے نام دونوں خطوط سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اسی لیے ان خطوط میں قادیانی یا قادیانیوں کے ایما پر کتربیونت کی جاتی ہے۔ اقبال نامہ میں تحریف چونکہ چودھری محمد حسین نے کرائی تھی لہٰذا یہ امر اب مشتبہ اور تحقیق طلب ہے کہ چودھری محمد حسین کے اپنے عقائد کیا تھے، انھیں قادیانیوں سے اتنی ہمدردی کیوں

تھی یا وہ کسی مجبوری کے تحت قادیانیوں کے دباؤ میں تھے۔عبدالمجید سالک نے ذکر اقبال میں اقبال اور خاندان اقبال کو قادیانی بنایا۔اسی طرح کا کام چودھری محمد حسین نے کیا۔شیخ اعجاز احمد کے بارے میں اقبال کے ردعمل کو چھپایا اور خط ہی بدلوا دیا جس میں اقبال نے قادیانی عقائد کی بنا پر اسے جاوید اقبال کی گارڈین شپ سے محروم کیا تھا۔

قادیانی دوسری بات یہ مشہور کرتے ہیں کہ علامہ اقبال شروع میں قادیانیوں کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔بالخصوص اعجاز احمد قادیانی نے اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' میں یہی دعویٰ کیا ہے۔

قادیانیوں کا یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ علامہ اقبال 1935ء میں احراریوں کی ترغیب پر ان کے خلاف ہوئے جبکہ ان کی تحریریں ثابت کرتی ہیں کہ علامہ اقبال نے 1902ء کے بعد تواتر کے ساتھ قادیانیت کی مخالفت کی۔ذیل میں ہم اقبال کے قادیانیت کی مخالفت کے ثبوت سن وار پیش کرتے ہیں۔

1902ء۔علامہ اقبال نے 1902ء میں سب سے پہلے قادیانیت پر وار کیا۔1902ء میں انجمنِ حمایتِ اسلام کے جلسے میں انھوں نے مرزا قادیان کے دعویٰ نبوت کو جھٹلاتے ہوئے کہا کہ:

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نور شمع عرفان کردہ ای

مولانا غلام رسول مہر نے اپنی مرتبہ کتاب ''سرودِ رفتہ'' میں ص30 پر ایک نوٹ لکھا ہے کہ:

''یہ 1902ء کا کلام ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے لکھنے کی ضرورت مرزا غلام احمد قادیانی کے دعویٰ بروزیت کی بنا پر ہوئی یعنی کہتے ہیں کہ تیرے بعد نبوت کا دعویٰ ہر لحاظ سے شرک فی النبوت ہے خواہ اس کا مفہوم کوئی بھی ہو یعنی ظلی اور بروزی نبوت بھی اس سے باہر نہیں۔''

1902ء مئی میں مخزن لاہور اور 11 جون 1902ء کو محمد دین فوق کے رسالہ ''پنجۂ فولاد'' میں قادیانی مذہب کے نتائج کا تجزیہ یوں کیا۔یاد رہے کہ یہ قادیانیوں کی طرف سے بیعت کے جواب میں شعر لکھے۔

تو جدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
اس عبادت کو کیا سراہوں میں

مرگِ اغیار پر خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہوں میں

(باقیات ص113)

یاد رہے کہ مرزا قادیانی اپنے مخالفین کے لیے موت کی پیش گوئیاں کرتا رہتا تھا۔

1903 ء۔ انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے میں ''فریادِ امت'' کے نام سے اقبال نے مارچ **1903** ء میں ایک نظم پڑھی جس کا دوسرا عنوان ''ابرِ گہر بار'' تھا اس میں انھوں نے یہ شعر پڑھا۔

مجھ کو انکار نہیں آمدِ مہدی سے مگر
غیر ممکن ہے کوئی مثل ہو پیدا ترا

اقبال نے اس شعر کے ذریعے مرزا قادیانی کے اس دعویٰ کو رد کر دیا کہ وہ مثیلِ مسیح یا مثیلِ محمدؐ ہیں۔

1911 ء۔ اقبال نے اپنے ایک مقالے ''ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر'' میں قادیانیوں کو قادیانیوں کی داڑھی اور وضع قطع کے لحاظ سے ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ کہنے کے ساتھ ساتھ انھیں ''نام نہاد قادیانی فرقہ'' کہا۔ مولانا ظفر علی خان نے اس مقالے کے ترجمہ میں **So-Called** نام نہاد یا غلط طور پر منسوب کیا گیا کے الفاظ غلطی سے چھوڑ دیے جس کو قادیانیوں نے اپنے حق میں استعمال کیا کہ اقبال ہمیں ٹھیٹھ اسلامی سیرت والا فرقہ سمجھتے تھے حالانکہ اقبال انھیں غلط طور پر منسوب کیا گیا یا نام نہاد ٹھیٹھ اسلامی سیرت والا فرقہ لکھتے ہیں، جو بظاہر تو اسلامی سیرت و کردار کا ٹھیٹھ نمونہ نظر آتا ہے مگر بباطن کافر اور خارج از اسلام ہے۔ اگر آپ اصل انگریزی مضمون کو دیکھنے کی زحمت کریں تو آپ پر یہ غلطی واضح ہو جائے گی۔

1914 ء میں اقبال نے لکھا کہ

''قادیانی جماعت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نبوت کی قائل ہے تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔''

1915 ء۔ ''رموزِ بے خودی'' **1915** ء میں شائع ہوئی۔ اقبال نے اپنے عقیدۂ ختم نبوت کا واشگاف اعلان کیا۔

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
لا نبی بعدی ز احسان خداست

پردۂ ناموسِ دینِ مصطفیٰ است
حق تعالیٰ نقشِ ہر دعویٰ شکست
تا ابد اسلام را شیرازہ بست

1916ء۔ اقبال نے 1916ء میں ایک بیان میں کہا:

''جو شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد کسی ایسے نبی کا قائل ہو جس کا انکار مستلزم بہ کفر ہو تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہوگا۔ اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔'' (گفتارِ اقبال ص 22)

1933ء۔ اقبال نے کشمیر میں قادیانیوں کی سازشوں کے بارے میں بیان دیا کہ:

''آخر میں مَیں مسلمانانِ کشمیر سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ ان تحریکوں سے خبردار رہیں جو اُن کے خلاف کام کر رہی ہیں اور اپنے درمیان اتحاد و اتفاق پیدا کریں۔'' (اقبالنامہ جلد اوّل 6 جون 1933ء)

20 جون 1933ء کو اقبال نے کشمیر میں قادیانیوں کی ریشہ دوانیوں اور کشمیر کو قادیانی ریاست بنانے کی سازش کے پیش نظر کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ 2 اکتوبر 1933ء کو اقبال نے قادیانی اہلِ قلم ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کی سازشوں کے خلاف بیان دیا اور کشمیر کمیٹی کے عہدۂ صدارت کی پیش کش کو فریب قرار دیا اور کہا کہ:

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حالات کے پیش نظر ایک مسلمان کسی ایسی تحریک میں شامل ہو سکتا ہے جس کا مقصد غیر فرقہ واری کی ہلکی سی آڑ میں کسی مخصوص جماعت کا پراپیگنڈا کرنا ہے۔'' (حرفِ اقبال ص 204)

1934ء۔ 9 فروری 1934ء کو نعیم الحق وکیل پٹنہ کو لکھتے ہیں:

''جس مقدمے کی پیروی کے لیے میں نے آپ سے درخواست کی تھی، اس کی پیروی چودھری ظفر اللہ کریں گے...... چودھری ظفر اللہ خان کیونکر اور کس کی دعوت پر وہاں جا رہے ہیں، مجھے معلوم نہیں۔ شاید کشمیر کانفرنس کے بعض لوگ ابھی تک قادیانیوں سے خفیہ تعلقات رکھتے ہیں۔'' (اقبال نامہ جلد اوّل ص 435)

1935ء۔ اقبال نے اپنی کتاب ''ضربِ کلیم'' میں اپنی نظم ''جہاد'' میں قادیانیوں کے جہاد کے بارے میں تصورات پر تنقید کی:

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبۂ یورپ سے درگزر

یہاں ''شیخِ کلیسانواز'' سے مراد مرزا قادیانی ہے۔ایک دوسری نظم نبوت میں لکھتے ہیں:

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

ایک نظم امامت میں لکھتے ہیں:

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اُس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

انگریز کی چاکری پر قادیانیوں کے خلاف لکھتے ہیں:

ہو اگر قوتِ فرعون کی در پردہ مرید
قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم الٰہی
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

1936ء۔7اگست **1936**ءکوایک خط میں لکھتے ہیں:

''الحمدللہ کہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے.....''

پس چہ باید کرد **1936**ء میں شائع ہوئی۔اقبال لکھتے ہیں:

عصرِ من پیغمبرے ہم آفرید
آنکہ در قرآن بغیر از خود ندید
شیخ او مرد فرنگی را مرید
گرچہ گوید از مقام بایزید
گفت دیں را رونق ز محکوی است
زندگانی از خودی محرومی است

دولت اغیار را رحمت شمرد
رقص ہا گردِ کلیسا کرد و مُرد

غلام احمد قادیانی انگریز کو اپنے لیے رحمت کہا کرتا تھا اور اس کی غلامی کو اپنے لیے تائید خداوندی شمار کرتا اور برصغیر کے مسلمانوں کو انگریز کی غلامی قبول کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔

ضربِ کلیم میں تو جا بجا اقبال نے قادیانیوں کے خلاف مسلسل لکھا۔ ایسے لگتا ہے جیسے ضربِ کلیم پوری کی پوری اس کافر جماعت کے خلاف اقبال کی ضربِ مومن ہے۔

1937ء۔ 27 مئی **1937**ء کو پروفیسر الیاس برنی کی کتاب ''قادیانی مذہب'' موصول ہونے پر اقبال نے لکھا:

> ''قادیانی تحریک یا یوں کہیے کہ بانیِ تحریک کا دعویٰ مسئلۂ بروز پر مبنی ہے۔ مسئلہ بروز کی تحقیق تاریخی لحاظ سے ازبس ضروری ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ مسئلہ عجمی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اصل اس کی آرین ہے۔ نبوت کا سامی تخیل اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ میری ناقص رائے میں اس مسئلہ کی تاریخی تحقیق قادیانیت کا خاتمہ کردے گی۔''

ہماری اس تحریر سے واضح ہو گیا ہو گا کہ اقبال نے کسی اضطراری کیفیت میں قادیانیوں کے خلاف مہم جوئی نہیں کی تھی بلکہ ایک پورے تسلسل اور نہایت سنجیدگی کے ساتھ **1902**ء سے اپنی وفات تک قادیانیت کا تعاقب کیا اور ان کے اصل مقاصد، دینی حیثیت اور سیاسی عزائم کو واضح کرتے رہے۔ یہی نہیں اقبال نے قادیانیوں کو خارج از اسلام اقلیت قرار دینے کا مطالبہ بھی کیا تاکہ وہ مسلم لیگ کی صفوں میں گھس کر پاکستان کی تحریک کو سبوتاژ نہ کر سکیں اور خدا کا شکر ہے کہ اقبال کی تحریک پر ہی پاکستان میں آئینی طور پر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جا چکا ہے۔ اقبال سے اسی دکھ کی وجہ سے قادیانی اقبال کے خلاف مہم جوئی کے لیے کمربستہ رہتے ہیں جس کی دو مثالیں اوپر بیان کر دی گئی ہیں۔ حالانکہ وہ خود اقبال کو قادیانیوں کا دشمن تصور کرتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید عشرت

کیا اقبال احمدی تھے؟

(1)

حال ہی میں شیخ عبدالماجد کی کتاب ''اقبال اور احمدیت'' شائع ہوئی ہے جس میں ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب ''زندہ رود'' پر تبصرہ کرتے ہوئے قادیانیوں نے پھر ایک بار اپنا یہ موقف دہرانے کی کوشش کی ہے کہ اقبال اور ان کا خاندان قادیانی تھا۔ قادیانی اقبال سے یہ تمسخر کیوں کرتے ہیں جبکہ اقبال اور ان کے خاندان کے افراد اور متعدد دانشور اس بات کی بار بار تردید کر چکے ہیں کہ اقبال کے ایک بھتیجے شیخ اعجاز کے سوا خاندانِ اقبال میں کبھی کوئی قادیانی تھا، نہ رہا اور نہ ہوگا کیونکہ شیخ اعجاز کی اپنی اولاد بھی قادیانیت سے تائب ہو چکی ہے۔ شیخ اعجاز نے چودھری ظفر اللہ کی طرف سے سب ججی کے لالچ میں آ کر قادیانی بن کر اپنے خاندان کو قادیانی کے پیچھے رسوا کیا۔ اقبال، اُن کے بھائی، ان کے والد اور دوسرے عزیز و اقارب کے بارے میں قادیانیت کا الزام جھوٹ کا پلندہ اور قادیانیوں کا دجل و فریب ہے جو پاکستان میں خود کو معتبر، مظلوم اور طاقتور بنانے کے لیے وہ کرتے ہیں۔ اور علامہ اقبال نے چونکہ انھیں دائرہ اسلام سے خارج قرار دینے کی تحریک چلائی لہٰذا یہ ان کے خلاف انتقاماً وقتاً فوقتاً تشہیری مہم چلاتے ہیں تاکہ اقبال کے بارے میں لوگوں، ان کے عقیدت مندوں اور نظریۂ پاکستان کے حامیوں کے دل گندہ کیے جائیں مگر ہم بھی خدا کے فضل سے ہر بار ان کے فریب اور مکر و ریا کا پردہ چاک کرنے کے لیے زندہ ہیں اور ہمارے بعد بھی لوگ قادیانیوں کی کاذب نبوت اور جھوٹے پیغمبر کا اصلی روپ لوگوں کو دکھاتے رہیں گے اور یہ شخص جس نے بقول اقبال ''شرک فی النبوت'' کیا اور اپنے ماننے والوں کے لیے دوزخ کی آگ خریدی، کا چہرہ بے نقاب کرتے رہیں گے۔

شیخ عبدالماجد کی کتاب ''اقبال اور احمدیت'' سے قبل شیخ اعجاز احمد (اقبال کے قادیانی بھتیجے) کی کتاب ''مظلوم اقبال'' شائع ہوئی جس پر راقم نے ''اقبالیات'' میں دو اقساط میں تبصرہ کیا اور جو مئی

کے ماہنامہ ''شاعر'' کے اقبال نمبر میں بھی شائع ہوا۔ ان تبصروں میں' میں نے شیخ اعجاز کے اس جھوٹ کو بے نقاب کر دیا کہ

1- اقبال نے انھیں اپنے بچوں کے گارڈین ہونے سے نہیں ہٹایا تھا۔ میں نے وہ خط شائع کر دیا جو علامہ نے سر راس مسعود کو لکھا تھا خود علامہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا خط۔ اس خط کو اقبالنامہ سے غائب کرنے اور توڑنے مروڑنے کی سعی قادیانیوں کے ایماء پر کی گئی اور ظفر اللہ کے کہنے اور دباؤ پر چودھری محمد حسین نے ایسا کیا۔ اس خط سے شیخ اعجاز کی کتاب ''مظلوم اقبال'' کا یہ موقف جھوٹ کا پلندہ بن گیا کہ اقبال آخری وقت تک انھیں عزیز رکھتے تھے' حالانکہ صالح آدمی سمجھنے کے باوجود اقبال نے اپنے بھتیجے شیخ اعجاز کو اپنے بچوں کے گارڈین بنانے سے احتراز کیا۔

2- اس تبصرہ میں یہ بات میں نے کھل کر لکھی کہ اقبال 1901ء سے ہی غلام احمد قادیانی کو کاذب نبی تصور کرتے تھے اور اس نبوت کے دعویٰ کو شرک فی النبوت تصور کرتے تھے۔ 1902ء میں اقبال نے لکھا:

اے کہ بعد از نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نورِ شمعِ عرفان کردۂ

1902ء کے ''مخزن'' اور محمد دین فوق کے ''پنجۂ فولاد'' میں اقبال نے مندرجہ ذیل نظم شائع کرائی جو مرزا قادیانی کے بیعت کے جواب میں تھی۔ یہ قادیانی مذہب کا تجزیہ بھی تھا:

تو جدائی پر جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
اس عبادت کو کیا سراہوں میں
مرگِ اغیار پر خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہوں میں

مرزا قادیان نے جس طرح خاندانوں میں نفرت کا بیج بویا اور دوسروں کے لیے موت کی پیش گوئیاں کیں' اقبال نے اس کو غیر پیغمبرانہ فعل بتایا اور کہا کہ میں تو محبت اور صلح و امن کا داعی ہوں۔ تمہاری نفرت بونے والی نبوت پر لعنت بھیجتا ہوں۔

3- 1914ء میں اقبال نے قادیانیوں کو خارج از اسلام قرار دیا۔ فرمایا ''جو شخص نبی کریم صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی نبی کا قائل ہے جس کا انکار مستلزمِ کفر ہو وہ خارج از اسلام ہوگا۔ اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔"

"اقبال نے 1914ء میں ہی قادیانیوں کو خارج از اسلام قرار دے دیا تھا حالانکہ مرزا غلام احمد قادیانی جھوٹے ہونے کی وجہ سے ساری عمر پینترے بدلتے رہے، کبھی خود کو مصلح کبھی مسیح موعود، کبھی مہدی، کبھی ظلی نبی اور کبھی بروزی نبی کہتا رہا تا کہ کھل کر دعویٔ نبوت کرنے کی وجہ سے مسلمان کہیں اسے کیفرِ کردار تک نہ پہنچا دیں۔ خود حکیم نور الدین نے مرزا قادیانی کو نبوت کے واضح دعویٰ سے باز رکھا اور اپنے خلافت کے عہد میں اسے نبی تسلیم نہ کیا۔ غلام احمد قادیانی کی نبوت مشتہر کرنے اور منوانے کا گندا کام اس کے بیٹے بشیر الدین محمود نے کیا۔ لہٰذا بہت سے معصوم مسلمان جو اسے مصلح سمجھنے کی وجہ سے اس کے چنگل میں پھنس گئے تھے، اسے مجبوراً نبی ماننے لگے۔ اور یوں یہ عفریت مسلمانوں میں پھیل گیا۔

4- 1935ء میں اقبال نے قادیانیوں کو اسلام کے دائرہ سے خارج کر کے الگ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ اس لیے کیا کہ اقبال نے دیکھا کہ قادیانی مسلمانوں کی نشستوں پر انگریز اور ہندو کی آشیر باد سے قبضہ کر رہے ہیں۔ خود پریوی کونسل میں اقبال کے استحقاق پر ہندو اور انگریز کے تعاون سے ظفر اللہ نے قبضہ کر لیا۔ 1935ء کے دستور کے تحت ہونے والے انتخابات میں ہندو اور انگریز کی سازش سے خدشہ تھا کہ اسمبلیوں میں قادیانی مسلم نشستوں پر پہنچ کر مسلمانوں کے الگ وطن کی تحریک کو سبوتاژ کر کے مسلمانوں کو ہندو کی غلامی میں دے دیں گے۔ پھر قادیانیوں نے کشمیر، پنجاب اور بلوچستان کو قادیانی صوبہ اور مرکز بنانے کی در پردہ سازشیں کیں۔ سر فضل حسین کے ساتھ مل کر ظفر اللہ جمہور مسلمانوں کے خلاف جو سازش کر رہا تھا، اقبال اس کے عینی شاہد تھے۔ کشمیر کمیٹی میں بھی بشیر الدین محمود ہندو اور انگریز کا جاسوس تھا۔ لہٰذا اقبال نے قادیانیوں کی ان سازشوں کے مشاہدے کے بعد ہی انھیں مسلمانوں کے لیے مذہبی اور سیاسی ہر دو لحاظ سے خطرناک قرار دے کر ان کو الگ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا۔

5- خاندانِ اقبال کے قادیانی ہونے کے بارے میں جتنی بھی گواہیاں آج تک فراہم کی گئی ہیں اور جو بھی عدالتوں میں یا مختلف کتابوں میں تحریریں ہیں، ان کے تمام کے تمام راوی یکسر قادیانی ہیں۔ شیخ اعجاز، بشیر الدین محمود، شیخ عبدالماجد، روزنامہ الفضل، مولانا شیخ عبدالقادر، خواجہ نذیر احمد، خواجہ کمال الدین، مولوی محمد علی اور بعض دوسرے لوگ جو اقبال کو قادیانی بنانے پر تلے ہوئے ہیں، سب کے سب قادیانی ہیں لہٰذا اقبال کے قادیانی ہونے کی ان کی گواہی

غیر معتبر' یک طرفہ اور تعصب پر مبنی ہے اور ان کی گواہی کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔

-6 اقبال کے اعزاء ڈاکٹر جاوید اقبال' خالد نظیر صوفی صاحب ''اقبال درونِ خانہ'' جو عطا محمد کے داماد اور شیخ اعجاز کے بہنوئی ہیں اور خود مولوی سکندر جنھوں نے اقبال کے عزیزوں کے جنازے پڑھائے اور سیالکوٹ کا سنی قبرستان جہاں یہ لوگ دفن ہیں اس بات کی شہادت ہیں کہ وہ سب سنی تھے، غیر قادیانی تھے، اور مسلمان ہونے کے ناطے مسلمانوں کی طرح ان کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی' سنی قبرستان میں دفن ہوئے۔ شیخ اعجاز کے قادیانی ہونے کی وجہ سے بعض نے نماز جنازہ میں شرکت نہ کی اور بعض نے جنازے اپنے طور پر الگ پڑھے۔ شیخ عطا محمد کے داماد اور شیخ اعجاز کے بہنوئی خالد نظیر صوفی اپنی کتاب ''اقبال درونِ خانہ'' میں لکھتے ہیں:

''یہ کہنا کہ علامہ کے خاندان کے کئی افراد نے مرزائیت قبول کر لی تھی سراسر جھوٹ ہے۔ حضرت علامہ کے والد' والدہ' چچا' چچی' بہن بھائی اور ان کی اولادیں سب ہی سنی مسلمان تھے اور ہیں سوائے ایک بھتیجے کے جو جج میں ترقی کے لیے چوہدری ظفر اللہ کے زیر اثر چھ بہن بھائیوں میں ''اکلوتا'' قادیانی بن گیا۔''

وہ مزید لکھتے ہیں:

''علامہ کے برادرِ بزرگ 12 دسمبر 1940ء کو فوت ہوئے۔ ان کا جنازہ حسب وصیت سنی مسلمانوں نے اٹھایا۔ یہ وصیت انھوں نے دوران بیماری مجھے کی تھی...... ان کی نمازِ جنازہ بھی حنفی العقیدہ مولوی سکندر خان مرحوم امام مسجد جہانگیری نے پڑھائی اور وہ حضرت امام صاحب سے ملحقہ قبرستان میں سالوں پہلے خود بنائی ہوئی پختہ قبر میں دفن کیے گئے۔''

شیخ اعجاز کی والدہ اور اپنی ساس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''علامہ کے اس اکلوتے قادیانی بھتیجے نے حنفی العقیدہ مولوی سکندر خان مرحوم کے پیچھے مسلمانوں کے ساتھ اپنی والدہ کا جنازہ پڑھا۔ وہ اپنے والد مرحوم و مغفور کے جنازہ پر مسلمانوں سے علیحدہ کھڑے رہنے کا تلخ تجربہ کر چکے تھے۔ اس لیے قادیانی مسلک کو دہرانے کی ہمت نہ ہوئی۔''

لطف کی بات تو یہ ہے کہ شیخ اعجاز کی اولاد کا بھی قادیانیت سے کوئی تعلق نہیں' وہ بھی سنی مسلمان ہیں۔

-7 اصل بات یہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی شروع میں سیالکوٹ کی عدالت میں منشی تھا اور عرائض نویسی کا کام کرتا تھا۔ وہاں سے اسے تبلیغ اسلام کا شوق ہوا اور اس نے اسلام اور عیسائیت کا مطالعہ کیا اور عیسائیوں کے خلاف مناظرے کرنے لگا کیونکہ ہندوؤں اور

عیسائیوں نے مسلمانوں کوشدھی کرنے اور عیسائی بنانے کی مہم شروع کررکھی تھی۔عیسائیوں کے خلاف مناظروں میں اسے کامیابیاں ہوئیں اور لوگ اسے پسند کرنے لگے اس طرح اس کے گرد عقیدت مندوں کا ایک حلقہ قائم ہوگیا۔عیسائیوں کے خلاف کامیابیوں اور عقیدت مندوں کی تعریفوں نے اس کا دماغ خراب کردیا اور وہ خود کو مافوق البشر کوئی چیز سمجھنے لگا۔عیسائیوں کے خلاف مناظروں میں کامیابیوں سے ہی اس کے تعلقات مولوی میر حسن اور خاندانِ اقبال سے قائم ہوئے اور وہ لوگ اسے ایک نیک اور مصلح سمجھنے لگے۔تاہم جونہی اس نے مہدی، مسیح موعود اور نبوت کے دعوے شروع کیے، لوگ اس کے کفر وضلالت اور گمراہی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

-8 اقبال نے ان کے نماز پڑھنے، داڑھی رکھنے اور اسلامی اصولوں پر بظاہر عمل کی وجہ سے انھیں ''ٹھیٹھ اسلامی سیرت'' کا حامل کہا مگر جب انھوں نے دیکھا کہ اسلامی سیرت و کردار کے ٹھیٹھ پن کے پردے میں یہ شاتمِ رسولؐ اور گستاخِ رسولؐ امتِ مسلمہ میں نفاق کا بیج بونے والے اور ختمِ نبوت کے حوالے سے شرک فی النبوت کرنے والے یہودیوں، ہندوؤں اور انگریز کے یہ ٹوڈی ہیں، جہاد کے خلاف ہیں اور ملتِ اسلامیہ کے خلاف سازش کرتے والے ہیں تو انھوں نے انھیں دائرہ اسلام سے خارج قرار دینے کا مطالبہ کیا کیونکہ یہ 1935ء کی دستوری اور آئینی اقدامات کے بعد مسلمانوں کے نام پر تحریکِ پاکستان اور مسلمانوں کی آزادی کو سبوتاژ کرنے کی سازش میں مصروف تھے۔ پنڈت نہرو کی طرف سے قادیانیوں کی وکالت بھی اس کا ثبوت تھی۔اقبال کو جب ان کی چند ماضی کی تحریروں کا حوالہ دیا گیا تو اقبال نے واضح طور پر کہا کہ اگر ان کو درست بھی مان لیا جائے تو بھی مجھے نئے حقائق کی روشنی میں نئے نظریات اور رویے اپنانے کا حق ہے۔اقبال نے لکھا:

''مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس نہ وہ تقریر انگریزی میں محفوظ اور نہ اس کا اردو ترجمہ ہے جو مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ تقریر میں نے 1911ء یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے رُبع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔اس تقریر سے بہت پہلے مولوی چراغ علی مرحوم جو مسلمانوں میں کافی سربرآوردہ تھے اور انگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابوں کے مصنف تھے بانیِ تحریک کے ساتھ تعاون کرتے اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کتاب موسومہ ''براہینِ احمدیہ'' میں انھوں نے بیش قیمت مدد پہنچائی لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل

روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہیے۔ تحریک کے دو گروہوں کے باہمی نزاعات اس امر کے شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانیِ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے، معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستے پر پڑ جائے گی۔ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت...... بانیِ اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویے میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔"

اقبال کی یہ تحریر واضح کرتی ہے کہ وہ تبلیغِ دین کے حوالے سے مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریک کو شروع میں پسند کرتے تھے مگر جب یہ گستاخِ رسولؐ ہوئی اور اس کے ختم نبوت کے عقیدے میں نقب لگائی، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں بدتمیزی کا ذریعہ بنی اور مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعوی کیا اور مسلمانوں کو کافر کہنے لگا تو اقبال نے اسے دائرہ اسلام سے خارج قرار دینے کی تحریک پیش کی اور انھیں مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا۔

سوال یہ ہے کہ اگر اقبال یا اس کا خاندان قادیانی ہو تو بھی یہ کب حجت ہے کہ انھیں دائرہ اسلام سے خارج قرار نہ دیا جائے۔ پھر اگر اقبال خود کہتے ہیں کہ وہ بانیِ تحریک کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں تو اب قادیانی کیا ثابت کر کے دائرہ اسلام میں آ سکتے ہیں۔ اقبال کے خاندان کے ذمہ دار افراد جب خاندانِ اقبال اور اقبال کے بارے میں گواہی دیتے ہیں کہ ان کا قادیانیت سے کوئی تعلق نہیں تو چند قادیانیوں کی بار بار کی تکرار انھیں کس طرح قادیانی بنا سکتی ہے۔ یہ فتنہ جب تک ہے پاکستان کے لیے ایک سازش ہے اور مسلمانوں کو قادیانی نبوت کو سمجھ لینا چاہیے کہ اقبال نے یہ بات اپنے ان الفاظ پر ختم کر دی کہ

"جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی ایسے نبی کا قائل ہے جس کا انکار مستلزم کفر ہو وہ خارج از اسلام ہوگا۔ اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے" لہٰذا اقبال کے نزدیک قادیانی کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔"

(2)

شیخ عبدالماجد کی کتاب "اقبال اور احمدیت" اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ وہ خود ہی کہتے ہیں

کہ اقبال کا قادیانیت سے کوئی تعلق نہیں اور دوسری سانس میں خود ہی قادیانیت سے اقبال کا تعلق گانٹھے بھی جاتے ہیں۔ اقبال کو قادیانیت کے جال میں پھانسنے سے ان پر ڈورے ڈالنے کے ساتھ ساتھ قادیانیوں نے دوسری حکمت عملی اپنائی ہے۔ ایک طرف وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح ملک کے اس نظریہ ساز فلسفی اور علم وحکمت کے سرچشمہ اور عالم اسلام کے حیاتِ نو کے داعی کو کھینچ تان کر قادیانیت سے کسی نہ کسی کمزور تعلق کے واسطے سے ہی سہی' قادیانیت کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ثابت کر دیا جائے۔ چنانچہ اقبال نے خوش عقیدگی سے یا خوش فہمی سے ایک آدھ جملہ اگر اس تحریک کی حمایت میں کہہ دیا یا لکھ دیا ہے تو بس وہ اقبال کے سر ہو گئے ہیں کہ حضور آپ نے فلاں وقت یہ فرمایا تھا۔ اقبال نے فلاں مضمون میں ہمیں ''ٹھیٹھ اسلامی سیرت'' کا سرٹیفکیٹ دے دیا تھا۔ اقبال کی آپ کے بارے میں یہ غلط فہمی بھی ہو سکتی تھی' ان سے یہ بھی توقع ہو سکتی تھی کہ آپ لوگوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا اور آپ جھوٹی نبوت کے حصار سے نکل کر ختم الرسل صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی غلامی میں آ جائیں گے۔ لاہوری پارٹی کی صورت میں ایک بغاوت ہوئی تھی جنھوں نے بظاہر غلام احمد کو نبی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ اسے زیادہ سے زیادہ مصلح مانتے تھے۔ خواجہ کمال الدین اور اقبال کے بعض قادیانی واقف کاروں کا تعلق اسی لاہوری پارٹی سے تھا۔ اقبال بعد میں اس سے بھی بدظن ہو گئے جب انھیں احساس ہوا کہ لاہوری اور قادیانی دونوں ایک ہی کھوٹے سکے کے دو رخ ہیں۔ خواجہ کمال الدین کے بارے میں واقعہ ہے کہ ایک بار علامہ اقبال کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے خواجہ کمال الدین کو کہا کہ سورہ فاتحہ لکھو۔ خواجہ صاحب نے سورہ فاتحہ ایک کاغذ پر خوشخط لکھ دی۔ اقبال نے ان سے یہ کاغذ لے کر کہا سبحان اللہ کیا کلام ہے۔ پھر اس کاغذ کے دوسری طرف غلام احمد قادیانی کی الہامی خرافات لکھیں اور خواجہ صاحب کو دکھا کر کہا کہ یہ میرے نبی کے خدا کا کلام ہے اور یہ تمھارے نبی کے خدا کا کلام ہے۔ سورہ فاتحہ کے بارے میں سبحان اللہ اور غلام احمد قادیانی کی خرافات کے بارے میں موٹی سی پنجابی میں گالی دے کر کہا کہ کس الو کے پٹھے کے نزدیک یہ الہامی کلام ہو سکتا ہے۔ خواجہ کمال الدین کھسیانے سے ہو کر کہنے لگے ''چھڈ دعلامہ جی۔ مذاق نہ کرو کوئی ہور گل کرو'' (چھوڑیئے علامہ صاحب مذاق نہ کیجئے کوئی اور بات کیجئے۔) قادیانیت سے اقبال کی نفرت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے۔

قادیانی ایک طرف تو اقبال کے گرد منڈلاتے رہتے کہ کسی طرح انھیں اپنے دام میں پھانس لیں تو دوسری طرف ''روزنامہ الفضل'' اپنے دوسرے رسائل اور اپنی محفلوں میں اقبال کے خلاف پراپیگنڈا کرتے رہتے۔ کشمیر ایکشن کمیٹی جس کے بشیر الدین محمود صدر تھے اور اقبال سیکرٹری' لاہور کے اجلاس میں بشیر الدین محمود کی مخبری پر انگریز نے چھاپہ مارا۔ اقبال اور متعدد لوگوں کو بھاگ کر جانیں بچانا

پڑیں۔اس کے بعد بشیر الدین محمود کو کشمیر ایکشن کمیٹی سے نکالا گیا کیونکہ وہ کانگریس اور انگریز کا ٹاؤٹ اور جاسوس تھا۔

شیخ عبدالماجد کو علم ہونا چاہیے کہ اقبال کے کلام میں جو اسلامی رنگ جھلکتا ہے اس میں اس کے والدین اور اقبال کے اپنے مطالعہ کا عمل دخل تھا۔اقبال رازی اور غزالی کا بروز قادیانیوں کی تلقین سے نہیں، اپنے علم اور عمل سے بنے ورنہ خود قادیانیوں میں تو یہ بروز اب تک نہیں ہوا۔اقبال کے بارے میں قادیانی غلط فہمیاں پھیلانے اور بے پر کی اُڑانے میں بڑے مشاق رہے ہیں چنانچہ الحکم اخبار (قادیان) نے محض شرارت سے' بغیر تصدیق اور تحقیق کیے خبر چھاپ دی کہ اقبال نے قادیانی لڑکی سے شادی کرلی ہے۔حالانکہ الحکم اخبار لاہور سے اور اپنے قادیانی ذرائع سے تصدیق کرسکتا تھا۔اقبال کو اس سلسلے میں باقاعدہ تردید کرنا پڑی۔اب شیخ عبدالماجد کے بھولپن کا کیا جواب کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ سینکڑوں معصوم مسلمان لڑکوں کو ملازمتوں اور شادی کا لالچ اور جھانسہ دے کر قادیانی بنانے کا فن قادیانیوں سے زیادہ کوئی نہیں جانتا حتیٰ کہ فلسفے کے معروف استاد قاضی محمد اسلم بھی شعبہ فلسفہ جامعہ پنجاب میں غریب اور معصوم مسلمان طلباء کو وظائف اور مراعات کے نام پر پھانستے رہے۔ایسے ہی ایک غریب اور مفلس نوجوان کے قادیانی ہوجانے کا صدمہ مجھے بھی دیکھنا پڑا جو اب سول جج ہے۔یہ ہتھکنڈہ تو قادیانیوں کا مانا ہوا ہے۔راحت ملک کی کتاب ''ربوہ کا مذہبی آمر'' کسی نے پڑھی ہو تو وہ بتائے گا کہ ایک قادیانی کا اس جال سے نکلنا کتنا مشکل ہے اور وہ قادیانیت کے جھانسے اور دام میں لانے کے لیے کیا کیا کرگزرتے ہیں؟

شیخ عبدالماجد کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اقبال کو قادیانیوں کے سٹیج سے شہرت ملی۔جو واقعہ انھوں نے بتایا ہے وہ 1908ء کے بعد یعنی 1910ء کا ہے جبکہ اقبال اپنے انگلستان جانے سے پہلے ہی برصغیر میں ایک فلسفی' شاعر اور دانشور کے طور پر معروف ہوچکے تھے۔حامد شاہ بھی شیخ اعجاز کی طرح لالچ میں قادیانی ہوا بلکہ خود حامد شاہ کے ایماء اور تحریص پر ہی شیخ اعجاز قادیانی ہوئے اور چوہدری ظفر اللہ خاں کی وساطت سے نوازے گئے۔اب دو ہی واقعات رہ گئے ہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے۔آفتاب اقبال کو اقبال نے قادیان اس لیے بھیجا تھا کہ اقبال اسے کسی اعلیٰ تعلیمی ادارے میں داخل کرانا چاہتے تھے۔عیسائی مشنری اداروں سے اقبال کو سخت نفرت تھی اور اسلامی انگریزی مدرسوں میں تعلیم کا معیار اقبال کے خیال میں ناقص تھا۔قادیان میں تعلیم الاسلام کے نام سے قادیانیوں نے ایک معیاری مدرسہ قائم کیا، چنانچہ اقبال نے اس یقین کے ساتھ کہ آفتاب اقبال پر قادیانیت کا اثر نہیں ہوگا' عمدہ تعلیم کے لیے اسے قادیان بھیجا۔چنانچہ آفتاب اقبال نے قادیان میں رہ کر بھی قادیانیت کو نہیں اپنایا اور مسلمان رہے۔لہٰذا

قادیان میں بہتر تعلیم کے خیال سے اقبال کا آفتاب اقبال کو داخل کرانا قادیانیوں کے لیے بے حاصل رہا کہ آفتاب اقبال نے باپ سے شاکی ہونے کے باوجود قادیانیت سے نفرت کی۔

اب جہاں تک قادیان سے فتویٰ لینے کا تعلق ہے' وہ بھی غلط ہے۔ اقبال اور بعض بلند پایہ کے مسلمانوں کا یہ خیال رہا ہے کہ قادیانی ہونے کے باوجود حکیم نورالدین فقہ پر گہری نظر رکھنے والا انسان تھا۔ قادیانیت کے حوالے سے اس کی عقل پر پردہ پڑ گیا تھا۔ اقبال نے حکیم نورالدین کی علیت پر اعتماد کرتے ہوئے ایک خالص فنی اور فقہی معاملے پر ان سے مشورہ طلب کیا فتویٰ نہیں مانگا۔ اس ایک واقعے کے سوا اور کوئی واقعہ ہمارے علم میں نہیں کہ اقبال نے قادیان سے کبھی مشورہ کیا ہو یا فتویٰ لیا ہو۔ یہ رائے یا مشورہ اقبال نے قادیان سے نہیں بلکہ اپنے اعتماد اور بھروسے کی بناء پر حکیم نورالدین سے لیا تھا۔ اگرچہ یہ بھی مناسب نہ تھا مگر اس سے قادیانیت پر اقبال کے کسی یقین' اعتماد اور ایمان کا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

شیخ عبدالماجد نے قادیانیوں کی تکنیک اس کتاب ''اقبال اور احمدیت'' میں اختیار کی ہے کہ اقبال کو اگر قادیانی ثابت نہ کر سکو تو ان کے بارے میں اتنا کنفیوژن پھیلا دو کہ لوگ انتشارِ فکر کا شکار ہو جائیں۔ اس سے قبل شیخ اعجاز احمد (اقبال کے قادیانی بھتیجے) ''مظلوم اقبال'' لکھ کر یہ کاوش کر چکے ہیں کہ اقبال قادیانیت کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے مگر چونکہ بڑے بھولے تھے لہٰذا احراریوں کے چکر میں آ کر قادیانیوں کے مخالف ہو گئے۔ اب ہمیں نہیں معلوم کہ علامہ اقبال بھولے تھے کہ قادیانیت کے چنگل میں نہ آئے اور اپنا دین و ایمان بچا لے گئے یا شیخ اعجاز بھولے ہیں کہ سب جج کے ایک معمولی دنیاوی لالچ میں ایمان بیچ ڈالا اور چار زاں فروخت کر ڈالا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے تدریجی ارتقاء اور مسلسل غور و فکر کے بعد ''شرک فی النبوت'' کے مجرم غلام احمد قادیانی اور اس کی تحریک کو رد کیا اور مسلمانوں کو ان کی شر انگیزیوں سے بچانے کے لیے انھیں مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دینے کا عزم کیا اس لیے کہ قادیانی خود کو مسلمانوں سے الگ سمجھتے تھے۔ اب یہ کس قدر ستم ظریفی ہے کہ قادیانی خود تو مسلمانوں کو کافر سمجھیں' ان کی رسوم اور نمازِ جنازہ میں شریک نہ ہوں مگر چاہیں یہ کہ مسلمان انھیں کافر نہ سمجھیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ شیخ عبدالماجد یا کوئی بھی قادیانی اپنے اس کھلے ہوئے متضاد' منافقانہ اور شاطرانہ رویے کا جواز نہیں دے سکتا۔

(3)

شیخ عبدالماجد نے ''مہارت'' میں یہ جو کہا ہے کہ انھوں نے اقبال کی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلا 1893ء سے 1934ء تک کا دور جو تقریباً 40 سال تک پھیلا ہوا ہے' میں اقبال

قادیانیوں کو مسلمان سمجھتے تھے' کے حق میں کوئی دلیل پیش نہیں کر سکے جبکہ میں نے اپنے تبصرہ میں بتایا ہے کہ اقبال نے 1902ء اور 1911ء میں مسلسل اور تواتر کے ساتھ قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا اور غلام احمد کی نبوت کو شرک فی النبوت کہا۔ ماجد صاحب اس کا کوئی جواب کیوں نہیں دیتے۔ قادیانی منطق کے تحت ایک ہی رٹ کیوں لگائے جاتے ہیں۔ اقبال نے مولوی صاحب کی جو ہجو لکھی اس وقت غلام احمد قادیانی نے واضح طور پر دعویٰ نبوت نہیں کیا تھا بلکہ وہ تکسیر کرتا تھا کبھی خود کو مہدی، کبھی مسیح موعود، کبھی ظلی نبی، کبھی بروزی نبی کہتا تھا۔ اس بات کی ظفر اللہ خان نے بھی گواہی دی ہے کہ اقبال کو قادیانیت سے کبھی دلچسپی نہیں رہی' نہ ان کے عقائد سے اور نہ اس تحریک سے، اقبال کے والدین بھی غلام احمد قادیانی کو جب تک عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے خلاف مناظرِ اسلام سمجھتے رہے اس کے ساتھ تعلق رکھا کیونکہ غلام احمد قادیانی علامہ اقبال کے سیالکوٹ میں ہمسایہ تھا۔ ظاہر ہے ایک ہمسائے کے ناطے وہ ایک دوسرے سے ملتے تھے مگر جب غلام احمد کے جوہر کھلے اور اس نے ناموسِ نبوت کو چاک کرنا شروع کیا تو اقبال کے والدین بھی اس فتنہ گر سے الگ ہو گئے۔ عطا محمد کچھ عرصہ قادیانی سے متاثر رہا مگر بقول خالد نظیر صوفی کے وہ آخری عمر میں قادیانیت چھوڑ گیا تھا۔ صرف شیخ اعجاز جن کی ناک چھدی ہوئی ہے، کی ناک میں ہی یہ نکیل پڑی رہی' اور اب تک ہے۔ 1935ء سے 1938ء تک اقبال کی قادیانیت سے مخالفت ثقافتی' سیاسی اور سماجی تھی اور اس کی اساس تحریکِ پاکستان تھی کیونکہ بلوچستان' پنجاب اور کشمیر کو قادیان میں ناکامی کے بعد قادیانی مسلمانوں میں گھس کر مسلم لیگ کی نشستوں پر کھڑے ہو کر پاکستان کا یا تقسیم ملک کا منصوبہ ناکام بنانا چاہتے تھے۔ اقبال نے اس خطرے کو بھانتے ہوئے احراریوں کے صائب مشورے کو قبول کر کے انھیں مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ باقی شیخ صاحب کی یہ رٹ کہ اقبال نے آفتاب کو قادیان داخل کرایا تھا یوں بے معنی ہے کہ اگر کوئی مسلمان اعلیٰ اور اچھی تعلیم کے خیال سے اپنے بچے کو مشنری یا عیسائی سکول میں داخل کرا دے تو وہ عیسائی نہیں کہلا سکتا۔ پھر اگر اقبال نے قادیانیوں کی ظاہری اسلامی شکل وصورت سے دھوکہ کھا کر انھیں "ٹھیٹھ اسلامی سیرت" سے تعبیر کر دیا تو اقبال نے اس سے رجوع بھی تو کر لیا۔ اب اس ایک فقرے کو پکڑ کر یا اس دُم کو پکڑ کر وہ دریا تو عبور نہیں کر سکتے۔ شیخ صاحب کو اقبال کی زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کرنے کی بجائے غلام احمد قادیانی کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کر کے دیکھنا چاہیے۔ انھیں سمجھ آ جائے گی کہ اقبال نے پہلے دور میں بھی قادیانی کے ارتقائی عمل پر گہری نظر رکھی اور غلام احمد قادیانی کے بدلتے ہوئے پینتروں کو بغور دیکھا۔ غلام احمد قادیانی کا پہلا دور وہ ہے جب وہ عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے خلاف مناظر کے طور پر منظرِ عام پر آیا اور تمام مسلمانوں نے اس کی فتح مندیوں کے لیے دعا کی اور اس کی ان

کوششوں کی تعریف کی۔ یہی دور ہے جب مولانا ابوالکلام آزاد' عبدالماجد دریابادی' علامہ سلیمان ندوی اوران جیسے ممتاز علماء اور اقبال کے والدین نے بھی اس کی تعریف کی۔

غلام احمد قادیانی کا دوسرا دور وہ ہے جب وہ اوہام کا شکار ہوا اور اس نے اپنی کامیابیوں اور انگریزوں اور ہندوؤں کی درپردہ ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں خود کو مافوق البشر ایک الہامی شخصیت تصور کرتے ہوئے الٹے سیدھے دعوے کرنے شروع کر دیے۔ کبھی کوئی دعویٰ کرتا کبھی اس کی تردید کرتا کبھی دوسرا دعویٰ کرتا، یوں اس نے برصغیر کے مسلمانوں کو اپنے بارے میں کنفیوز کرنا شروع کر دیا اور جب کوئی کہتا کہ تم نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو وہ کہتا نہیں میں تو مہدی ہوں' کبھی کہتا نہیں میں تو مسیح موعود ہوں۔ جب تک مولوی نورالدین کا بس چلا اس نے غلام احمد قادیانی کو دعویٰ نبوت واضح طور پر کرنے سے باز رکھا۔ تیسرا دور اس کا آخری دور ہے جب اس نے واضح طور پر دعویٰ نبوت کر ڈالا مگر اسے عام لوگوں سے خفیہ رکھا گیا، اپنے حامیوں پر ظاہر کیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کو مکمل اور پکا نبی بنانے کی ٹکسال مرزا بشیر الدین محمود نے لگائی جو انتہائی بدکردار انسان تھا۔

اس کے قریبی ساتھی عبدالرحمان' ایف کے درانی' راحت ملک اور متعدد لوگوں نے اس کی نجی زندگی کی غلاظتیں بیان کی ہیں۔ اب اگر شیخ عبدالماجد صاحب اپنے گریبان میں منہ ڈال کر ''تاریخِ احمدیت'' کا مطالعہ فرمائیں تو انھیں نظر آئے گا کہ یہ تحریک شروع سے ہی جھوٹ پر پل کر جوان ہوئی۔ اس کا مقصد مسلمانوں میں ایک نئے فتنہ کی کاشت تھا۔ اس نے مسلمانوں کو دو گروہوں میں بانٹ دیا۔ جہاد اور حریت کے فلسفے پر زد لگائی اور اپنے الہام کی بنیاد پر غلام احمد قادیانی نے انگریز کی ثناخوانی کی۔ اپنی کتاب میں برصغیر کے جن لوگوں کا انھوں نے حوالہ دیا ہے وہ مصلح اور شاعر تھے' یا مولوی حضرات' انھیں مصلحت' یا حالات کے دباؤ کے تحت انگریز کی مدحت کرنا پڑی مگر مرزا غلام احمد کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے نبی کا مدعی ہوتے ہوئے اپنے الہام سے اس انگریز کو سایۂ رحمت کہا جسے وہ دوسری ہی سانس میں دجال کہتے ہیں۔ اب دجال کو سایۂ رحمت کہنے والا نبی ہوسکتا ہے یا دجالیت کا کل پرزہ؟ شیخ عبدالماجد قادیانیت کی پٹی آنکھوں سے اتار کر دیکھیں تو انھیں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی صاف نظر آئے گا۔ بہرحال اب اللہ نے شیخ ماجد کی رسی کو اور بڑھا رکھا ہو تو بندہ کیا کر سکتا ہے۔

(4)

علامہ اقبال نے اپنے خطبہ ''اسلامی ثقافت کی رُوح'' میں بھی پیغمبرِ اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کے حوالے سے چند اہم نتائج اخذ کیے ہیں۔ علامہ نے فرمایا کہ

"پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے۔ بہ اعتبار اپنے سرچشمۂ وحی کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن بہ اعتبار اس کی رُوح کے دنیائے جدید سے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہی وجود ہے کہ زندگی پر علم وحکمت کے دو تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رخ کے عین مطابق تھے۔ لہٰذا اسلام کا ظہور جیسا کہ آگے چل کر خاطر خواہ طریق پر ثابت کر دیا جائے گا' استقرائی عقل کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت چونکہ اپنے معراجِ کمال کو پہنچ گئی لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعور نبوت کی تکمیل ہو گی تو یونہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کو جائز نہیں رکھا یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا یا علم فطرت اور علم تاریخ کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس لیے کہ ان سب کے اندر یہی نکتہ مضمر ہے کیونکہ یہ سب تصور خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں لیکن یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حیاتِ انسانی اب وارداتِ باطن سے' جو بااعتبار نوعیت انبیاء کے احوال و واردات سے مختلف نہیں ہمیشہ کے لیے محروم ہو چکی ہے۔ قرآن مجید نے آفاق و انفس دونوں کو علم کا ذریعہ ٹھہرایا ہے' اور اس کا ارشاد ہے کہ آیاتِ الٰہیہ کا ظہور محسوسات اور محرکات نہیں خواہ اس کا تعلق خارج کی دنیا سے ہو یا داخل کی' ہر کہیں ہو رہا ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اس کے ہر پہلو کی قدر و قیمت کا کماحقہ اندازہ کریں اور دیکھیں کہ اس سے حصولِ علم میں کہاں تک مدد مل سکتی ہے۔ حاصلِ کلام یہ کہ تصورِ خاتمیت سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ زندگی میں اب صرف عقل ہی کا عمل دخل ہے جذبات کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں۔ یہ بات نہ کبھی ہو سکتی ہے نہ ہونی چاہیے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وارداتِ باطن کی کوئی بھی شکل ہو ہمیں بہر حال حق پہنچتا ہے کہ عقل وفکر سے کام لیتے ہوئے اس پر آزادی کے ساتھ تنقید کریں۔ اس لیے کہ اگر ہم نے ختم نبوت کو مان لیا تو گویا عقیدۃً یہ بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق نہیں پہنچتا کہ اس کے علم کا تعلق کسی مافوق الفطرت سرچشمے سے ہے لہٰذا ہمیں اس کی اطاعت لازم آتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو خاتمیت کا تصور ایک طرح کی نفسیاتی قوت ہے" (تشکیلِ جدید' صفحہ 195)

علامہ اقبال کے اس اقتباس سے اگرچہ متعدد مباحث کے دروازے کھلتے ہیں مگر ہمارے زیر بحث موضوع ختم نبوت پر اقبال کے ایمان اور اس پر عقلی طور پر یقین واعتماد کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اقبال وحی کے نزول کے حوالے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیائے قدیم یا انبیاء یا وحی کی دنیا سے وابستہ بہ ماضی کرتے ہیں تو ختم نبوت کے بعد وحی کے انقطاع کے اور قرآنی بصیرت پر عقل وخرد اور انسانی شعور' استقرائی سوچ اور سائنسی منہاج کے دور کا آغاز بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے

کرتے ہیں کہ انسان نے وحی کے خاتمہ کے بعد جس دور کا آغاز کرنا ہے یا جس کا آغاز ہوا اور مسلمانوں نے یونانی علم اور قرآنی بصیرت سے فطرت کے مطالعہ سے سائنسی تحقیق کا آغاز کیا جو یورپ اور مغرب نے انتہا تک پہنچایا۔ انہی معنوں میں اقبال مغربی تہذیب وثقافت کو اسلامی تہذیب کی توسیع کہا کرتے تھے۔ یوں دنیا میں جو جدید سائنسی، تمدنی اور تہذیبی انقلاب آیا اس کا آغاز بھی حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے ہوا۔ اقبال کے نزدیک ختم نبوت کے عقیدے سے اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے تاریخ انسانی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک سلسلۂ نبوت سے قبل کی دنیا اور ایک سلسلۂ نبوت کے اختتام کے بعد کی دنیا۔ دوسرے دور میں قرآن نوع انسانی کا منشور ٹھہرا اور قرآن کی صورت میں شعور انسانی کی تکمیل یا شعور نبوت کی تکمیل ہو گئی اور قرآن کی راہبری میں انسان نے خود اپنے وسائل سے کام لینے کا ہنر سیکھا۔ اقبال کے الفاظ میں علم فطرت تمام طبعی سائنسوں کا اور علم تاریخ تمام متوالی علوم کا سرچشمہ ٹھہرا اور ان دونوں کے لیے قرآن نے علمی اساس فراہم کی۔ اقبال کے نزدیک ختم نبوت کے تصور سے یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیے کہ اب عقل ہی فرماں روا ہو گی اور اب انسان وحی کی ضرورت سے تہی ہو گیا ہے جیسا کہ روزنامہ پاکستان لاہور کے ایک کالم میں قاضی جاوید نے اپنی طرف سے استخراج کیا تھا۔ یہ بہت بڑی گمراہی اور جہالت کی بات تھی۔ اب اگر انسان وحی کی خاتمیت سے خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے اور وہ سہاروں کی زندگی سے آزاد ہو گا تو اسی وقت جب وہ تکمیل شدہ شعور نبوت یعنی قرآن کو منشور حیات کے طور پر اپنائے گا۔ اقبال کے نزدیک وحی کے خاتمہ سے انسان کے لیے مادر پدر آزادی کا جواز تو پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن دراصل شعور انسانی کی ترقی اور فروغ کے لیے ایک انفراسٹرکچر یا فریم ورک فراہم کرتا ہے جس کی حدود میں انسانی عقل وشعور اپنے ارتقاء اور ترقی کے لیے آزاد ہے۔ ختم نبوت سے اگر مادر پدر آزادی مقصود ہوتی تو پھر قرآن وسنت اور ان کی قیامت تک حفاظت کا ذمہ لینے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر جو اصول ہمیں آزادی بخشتا ہے اس کی تو کسی اصول کے تحت تکذیب نہیں ہو سکتی، لہٰذا اقبال نے وحی کی خاتمیت سے انسان کے آزاد ہو جانے کا جو ذکر کیا تو اس سے مفہوم یہی ہے کہ انسان قرآن وسنت کے فریم ورک میں رہتے ہوئے آزاد ہے کہ قرآن وسنت سے اپنے عہد اور دور کے مسائل عقل وخرد سے استنباط کرے۔ قاضی جاوید نے اس بات کا ادراک نہ کرتے ہوئے اقبال کے اس تصور سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ غیر علمی اور خلاف دیانت تھا۔

اقبال کہتے ہیں کہ اگر ہم نے ختم نبوت کو مان لیا تو گویا عقیدۃً یہ بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعویٰ کا حق نہیں پہنچتا کہ اس کے علم کا تعلق چونکہ کسی مافوق الفطرت سرچشمے سے ہے لہٰذا ہمیں اس کی اطاعت لازم آتی ہے۔ اقبال کے ان جملوں سے قادیانی نبوت کی بھی نفی ہو جاتی ہے۔ اقبال جب کسی

اور کو یہ حق نہیں دیتے کہ وہ یہ دعویٰ کرے کہ اس کا تعلق کسی مافوق الفطرت سے ہے، اور اس کی اطاعت کو بھی قبول نہیں کرتے تو وہ قادیانی نبی غلام احمد قادیانی کی نبوت، ولایت یا الہام کو کس طرح قبول کر سکتے ہیں۔ لہٰذا غلام احمد قادیانی کی نبوت اقبال کے عقیدۂ ختم النبوت کے منافی ہے اور اقبال کے نزدیک ختم النبوت کے اس عقیدے کے بعد اگر نبی ظلی یا بروزی یا کسی بھی نوعیت میں ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ جھوٹا ہے اور اسلام کے عقیدۂ ختم النبوت سے انحراف کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ لہٰذا وہ کافر ہے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت سے باہر ہے۔ اب اس کے بعد بھی کوئی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ شرارت کرتا ہے اور شرک فی النبوت کرتا ہے اور اقبال کے اس واضح اعلان کے بعد اگر کوئی سمجھتا ہے کہ اقبال کو قادیانیت سے کوئی شمہ بھر بھی ہمدردی یا لگاؤ ہو سکتا ہے تو وہ اپنے جھوٹے نبی کی سنت پر عمل کرتے ہوئے ایک طرح سے اقبال سے شرارت کرتا ہے، اور وہ محض دوسروں کو دھوکہ دینے کی سازش کرتا ہے۔ قادیانی گروہ کو اقبال پر اس طرح کی پھبتیاں کس کر نجانے کیا مزا ملتا ہے کہ وہ علیحدگی میں اور اپنے گروہ میں تو اقبال سے نفرت کرتے ہیں مگر امتِ مسلمہ کو دھوکہ دیتے ہیں کہ دیکھو تمہارا اتنا بڑا دماغ بھی ہمارے ساتھ تھا حالانکہ اس بے سود تکرار سے انھیں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔

قادیانیت امتِ مسلمہ کے سینے کا کینسر ہے۔ یہودیت کے مرکز اسرائیل میں ان کے سنٹر کے قیام سے، ہندوؤں سے ان کے گٹھ جوڑ سے اور فرنگ کی اشیرباد کے حصول کا علم رکھنے کے بعد کوئی اندھا ہی ہوگا جو یہ نہ جان سکے کہ اس تنظیم کا سربراہ جو خود عیسائیت کے خلاف ایک مناظر کے طور پر ابھرا اور بعد میں سازش کا شکار ہو کر خود عیسائیت اور ہندومت کے چنگل میں گرفتار ہو گیا اور عیسائیت ادر ہندومت نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اسے خود اسلام کے اندر ہی نقب لگانے والا بنا ڈالا اور وہ جو عیسائیوں اور ہندوؤں کو اسلام کی حقانیت کا درس دینے نکلا تھا خود عیسائیوں، ہندوؤں اور یہودیوں کی شطرنج کا مُہرہ بن کر اسلام کے بنیادی عقائد ختم نبوت، جہاد اور وحدتِ امت کا رقیب بن گیا۔ ختم نبوت کا پردہ اس نے اپنی کذابت سے چاک کیا، جہاد کو موقوف قرار دیا، اسلامی عقائد کی تلبیس کی اور امت میں نفاق کا بیج بو کر ایک نئی امت کھڑی کر دی اور خوش عقیدہ مسلمانوں اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کو گمراہ کیا۔ اَن کے دین و ایمان کا سرقہ کیا۔ آج یہ سرطان، کینسر اور ناسور پوری دنیا میں ملتِ اسلامیہ کی رسوائی کا باعث ہے۔ اپنے لباس، اپنی صورتوں، اپنے اطوار سے یہ اسلام کا دم بھرتا ہے مگر اپنی روح میں یہ قرآن اور اسلام کی تعلیمات کو جھٹلانے والا ہے۔ اور جہاں جہاں قادیانی ہیں وہ استعماریت کے اغراض و مقاصد کے لیے کام کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے غدار اور مرتد ہیں۔ ان کے قرآن اور اسلام سے ارتداد کی وجہ سے ہی اقبال نے انھیں مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ لہٰذا ان قادیانیوں سے تعاون، ان

کے افکار کی تشہیر واشاعت اور ممتاز مسلمان زعماء سے ان کی اٹھکیلیوں اور چہلوں میں کسی کو معاونت نہ کرنی چاہیے کیونکہ اس سے گمراہی کو فروغ ہوتا ہے۔

(5)

شیخ عبدالماجد نے حالیہ ''مہارت'' میں اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ شیخ اعجاز احمد کی ملازمت کے لیے سفارشیں ظفر اللہ خان نے نہیں بلکہ علامہ اقبال نے کی تھیں۔ یہ بات بجا طور پر درست ہے کہ اپنے محسن اور بڑے بھائی کے بیٹے شیخ اعجاز احمد کے لیے علامہ اقبال نے سفارشیں کیں اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں بھی تامل نہیں کہ اقبال کی سفارش پر ہی شیخ اعجاز احمد کو ملازمت ملی ہوگی کیونکہ اقبال اپنے بڑے بھائی اور محسن شیخ عطا محمد کے احسانات کا بدلہ ہر طرح سے چکانا چاہتے تھے' مگر ہمارا ابھی یہ موقف غلط نہیں کہ شیخ اعجاز احمد نے ظفر اللہ خان سے اسی قادیانیت کے حوالے سے گہرے مراسم استوار کر لیے تھے اور اپنی شخصیت کو منوانے اور اپنی ملازمت میں ترقی کے لیے شیخ اعجاز احمد نے ظفر اللہ خان اور اس کی قادیانیت کو قبول کیا۔

ڈاکٹر صوفی نظیر علامہ اقبال کے بھانجے اور شیخ عطا محمد کے داماد تھے' جو اس لحاظ سے شیخ اعجاز احمد کے بہنوئی ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب ''حیات و پیام اقبال'' میں اور ان کے بیٹے خالد نظیر صوفی نے ''اقبال درون خانہ'' میں واضح طور پر شیخ اعجاز احمد کے موقف کی تردید کی ہے کہ شیخ اعجاز کے علاوہ کسی بھی فرد کا قادیانیت سے کوئی ناطہ تھا۔ انھوں نے ہی یہ حقیقت ظاہر کی کہ شیخ اعجاز احمد اور ظفر اللہ خان کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ ڈاکٹر نظیر صوفی اپنی کتاب ''حیات و پیام اقبال'' میں لکھتے ہیں:

''علامہ کے خویش واقارب میں سے صرف ایک بھتیجا اکلوتا قادیانی ہے۔ جن دنوں انھوں نے حکومتِ ہند سے مرزائیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا تھا، مرزا محمود قادیانی نے ان کے خلاف ایک جمعہ میں وعظ کرتے ہوئے کہا کہ انھیں اپنے برادرزادہ شیخ اعجاز احمد کی پاکیزہ جوانی سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ گلی حکیم حسام الدین کے مرزائیوں نے سمجھا کہ بیٹے کی تعریف سن کر بڑے شیخ صاحب (عطا محمد) خوش ہوں گے' انھیں الفضل پڑھانے کے لیے بڑے شیخ صاحب (عطا محمد) اقبال منزل کے باہر بازار کی طرف سیڑھیوں کے آگے کھڑے تھے' مرزائیوں نے انھیں مرزا محمود کے الفاظ سنائے تو اخبار دیکھنے دکھانے سے پہلے ہی شیخ صاحب (عطا محمد) نے قادیانی خلیفے اور اس کے ساتھیوں کو بہت برا بھلا کہا اور فرمایا کہ مرزا محمود کو گز اقبال خود پھیر لے گا البتہ میرے بیٹے میں اگر بصیرت ہوتی تو قادیانی خلیفے کی سیالکوٹ میں گزاری ہوئی ''پاکیزہ زندگی'' کے پیش نظر میر احمد شاہ بن سیّد حامد شاہ قادیانی

کی طرح قادیانی خلیفے اور اس کے مذہب پر دو حرف بھیجتا۔" (حیات و پیام اقبال' ص 93,92)

اس کتاب سے چند باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

(نمبر 1) شیخ عطا محمد قادیانیت کے سخت خلاف تھے جنھیں شیخ اعجاز اور قادیانی حضرات قادیانی ثابت کرنے پر تلے رہتے ہیں۔ اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ اقبال نے قادیانیت کو اقلیت اور خلافِ اسلام قرار دینے کی مہم چلا رکھی تھی۔ تیسرے شیخ اعجاز کے ساتھی سید حامد شاہ قادیانی کا بیٹا بھی قادیانیت سے تائب ہو گیا تھا۔ چوتھے اس زمانے میں بھی ثقہ لوگ مرزا قادیانی اور اس کے بیٹے مرزا محمود کے لچھن جانتے تھے کہ وہ کس قدر اخلاق باختہ لوگ ہیں۔

علامہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد' شیخ اعجاز احمد کو مرتد تصور کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کا بیوقوف بیٹا عقل کے ناخن لے اور قادیانیت سے تائب ہو جائے۔ علامہ اقبال اور شیخ عطا محمد شیخ اعجاز کو اچھا سمجھنے کے باوجود اس کی قادیانیت سے بیزار تھے۔ ڈاکٹر نظیر صوفی نے جو شیخ عطا محمد کے داماد اور شیخ اعجاز کے بہنوئی تھے لکھتے ہیں:

''یہ کہنا کہ علامہ کے خاندان کے کئی افراد نے مرزائیت قبول کر لی تھی سراسر جھوٹ ہے۔ حضرت علامہ کے والد' والدہ' چچا' چچی' بہنیں اور بھائی اور ان کی اولادیں سب ہی سنی مسلمان تھے اور ہیں' سوائے ایک بھتیجے کے جو کہ ججی میں ترقی کے لیے چودھری ظفر اللہ خان کے زیر اثر چھ بہن بھائیوں میں سے ''اکلوتا'' قادیانی بن گیا۔ (ص 91 حیات و پیام اقبال از ڈاکٹر صوفی نظیر)

اب میں نہیں کہہ سکتا کہ شیخ عبدالماجد زیادہ معتبر ہیں یا شیخ اعجاز احمد کے بہنوئی کہ شیخ اعجاز احمد کی قادیانیت کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ سیّد حامد شاہ قادیانی جو شیخ اعجاز کا دوست' مربی اور سرپرست تھا' شیخ اعجاز کی قادیانیت کا حقیقی سبب بنا اور یہی شخص پیر حامد شاہ قادیانی چوہدری ظفر اللہ کا رفیقِ خاص یا معتمدِ خاص تھا جو شیخ اعجاز اور چوہدری ظفر اللہ کے مابین باعثِ رابطہ تھا۔ چوہدری ظفر اللہ خان چونکہ انگریز کے دربار میں اور سیاست کے بازار میں قادیانیوں کا چلتا سکہ تھا' لہٰذا متعدد لوگوں کو ملازمت دلانے اور ترقی دلانے میں موثر ہوتا' اور عام لوگوں کو لالچ دیا جاتا کہ ملازمت اور ترقی کے لیے چوہدری ظفر اللہ خان ان کا سہارا بنے گا۔ چوہدری ظفر اللہ خان نے قادیانیت کی ایک بڑی خدمت لوگوں کو ملازمتیں دلا کر کی۔ انھیں قادیانی بنایا اور دوسرے سرکاری اداروں میں بے شمار قادیانی کھپا دیے۔ ان میں سے ایک شیخ اعجاز بھی تھا جو اپنی اولاد کے ترکِ قادیانیت کے باوجود نمک حلالی کے لیے قادیانی بنا ہوا ہے اور اپنی قادیانیت کو چھپانے کے لیے یہ تہمتیں بھی تراشتا ہے کہ اس کا خاندان قادیانی تھا۔ جھوٹ آخر جھوٹ ہے جو شیخ اعجاز اور شیخ ماجد کی ملمع کاری سے چھپ نہیں سکتا۔

❁......❁......❁
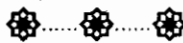
پروفیسر حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی علیگ ؒ

علامہ اقبالؒ کے حضور

مارچ 27ء کا وہ دن میری زندگی کا ایسا دن تھا جس کی یادوں کی چاندنی آج بھی میرے محسوسات کو جگمگائے ہوئے ہے۔ یہ وہ دن تھا جب مجھ ایسے ہیچمدان کو زندگی میں پہلی بار نابغۂ روزگار حکیم الامت علامہ اقبال کے حضور حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ راقم ان دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی طبیہ کالج میں زیر تعلیم تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملتِ اسلامیہ کے دلوں میں قادیانیوں کے دل آزار و خود ساختہ معتقدات اور ان کی ژاژ خائیوں کے باعث اشتعال و بیزاری کا ایک طوفان برپا تھا اور پورے برعظیم میں نفرت کی فضا تھی۔ پنجاب میں انجمن حمایتِ اسلام لاہور نے اپنے ایک اجلاس میں جو علامہ اقبالؒ کی صدارت میں ہوا باضابطہ اعلان کے ذریعے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے کر انجمن کے اداروں سے الگ کر دیا تھا۔ پنجاب کے بعد علی گڑھ میں بھی طلبہ نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے اور الگ کرنے کا مطالبہ کر رکھا تھا اور اس سلسلے میں مولانا ظفر علی خان اور سیّد عطا اللہ شاہ بخاری جیسی قوی شخصیات کی تقاریر یونیورسٹی میں گونج چکی تھیں۔ طلبہ میں زبردست ذہنی ہیجان برپا تھا کہ یکا یک یہ انکشاف برقِ خاطف بن کر گرا کہ ڈاکٹر سر ضیا الدین وائس چانسلر جامعہ علی گڑھ نے سر ظفر اللہ کو کانوکیشن ایڈریس پڑھنے کی دعوت دے دی ہے، جسے ظفر اللہ خان نے منظور کر لیا ہے۔ اُن دنوں ظفر اللہ خان وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن تھے اور بہت زیادہ اثر و رسوخ رکھتے تھے اور مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود مسلمانوں کا نمائندہ ہونے کے دعویدار تھے۔ یہ خبر ان طلبہ کے لیے برقِ خاطف سے کم نہ تھی جو قادیانیوں کے بحیثیت غیر مسلم اقلیت علیحدگی کے حامی تھے۔ چنانچہ طلبہ نے فیصلہ کیا کہ اس دعوت کو ہر حال میں منسوخ کیا جائے اور پُر زور مخالفت کی جائے چنانچہ راقم الحروف قاری انوار صمدانی، محمد شریف چشتی، وغیرہ نے مل کر طے کیا کہ اس کے لیے علامہ اقبال سے رجوع کیا جائے اور اخبارات کے ذریعے بھی احتجاج کیا جائے چنانچہ الجمعیۃ اور زمیندار نے اداریئے لکھے اور یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کے اس فعل کی مخالفت کی۔ طلبہ کے باہمی مشورے سے راقم علامہ اقبال سے رہنمائی حاصل کرنے

کے لیے لاہور روانہ ہوا۔ علامہ ان دنوں جاوید منزل میں مقیم تھے۔ سہ پہر کو علامہ کی خدمت میں پہنچا، ان دنوں صرف خاص لوگوں کو ملاقات کی اجازت تھی۔ جب راقم نے اطلاع دی کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے طلبہ کا پیغام لے کر حاضر ہوا ہوں تو فوراً اذن باریابی مل گیا۔ علامہ اقبال ایک بغلی کمرے میں چارپائی پر تشریف فرما تھے' سامنے چند کرسیاں رکھی تھیں' شلوار قمیض میں ملبوس تھے' ایک جانب بڑا تکیہ تھا۔ میں نے ساری صورتِ حال بیان کی اور اس سلسلے میں وہ استفتاء بھی دکھایا جو دہلی میں مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید سے قادیانیوں کی بابت حاصل کیا تھا اور جس پر مولانا سعید اور داؤد غزنوی اور مولانا احمد علی لاہوری کے دستخط بھی تھے۔ علامہ اقبال نے ساری صورت حال سننے کے بعد راقم کو ہدایت کی کہ فضل کریم درانی سے ملوں جو ہفتہ وار اخبار ''ٹرتھ'' کے ایڈیٹر تھے اور میمورنڈم تیار کر کے ٹائپ کے بعد لاؤں۔ راقم عرب ہوٹل گیا جہاں فضل کریم درانی مقیم تھے۔ میمورنڈم کا مسودہ تیار کرا کے ٹائپ کے بعد دوبارہ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ علامہ نے اس پر دستخط کرنے کے بعد حضرت مولانا ظفر علی خان سے دستخط کرانے کی ہدایت کی' چنانچہ مولانا اور دوسرے اکابر کے دستخط بھی حاصل کیے' اس طرح میمورنڈم کے ایک طرف علمائے ملت اور دوسری طرف اکابرینِ ملت کے دستخط تھے جو جملہ ممبرانِ یونیورسٹی کورٹ اور طلبہ میں تقسیم ہوا جس کے نتیجے میں ظفر اللہ خان کا کانووکیشن منسوخ ہو گیا۔ دورانِ گفتگو علامہ نے یونیورسٹی کی ساری صورتِ حال معلوم کی اور ہدایت کی کہ قادیانیت کے ساتھ اشتراکیت کی بھی مخالفت کی جائے۔ انھوں نے اس سلسلے میں سیّد ظفر الحسن صدر شعبہ اسلامیات کی خدمات کو سراہا اور پروفیسر ستار خیری اور پروفیسر عطا اللہ کا ذکر بڑے اچھے انداز میں فرمایا۔ اس میمورنڈم سے قادیانی یونیورسٹی میں اقلیت تو قرار نہ پائے مگر عملاً موت واقع ہو گئی اور عزائم خاک میں مل گئے۔ علامہ کے ولولہ انگیز بیانات سے غلغلہ برپا ہو گیا اس لیے کہ ان کی رائے ملت کی نگاہ میں انتہائی اہم تھی۔ علامہ مرحوم سے ایسی روشن ملاقات کے نقوش آج بھی میرے دل پر ہر طرح رقم ہیں۔

حواشی

○ حکیم عنایت اللہ نسیم صاحب کو طب کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ظفر علی خان نے ہی علی گڑھ بھجوایا تھا۔ مسلمانوں کی اس علمی درسگاہ پر 1934ء میں قادیانیوں نے یورش کر رکھی تھی۔ حکیم نور الدین کے دو صاحبزادے

عبدالسلام اور عبدالمنان علی گڑھ میں تبلیغِ قادیانیت کے لیے بھیجے گئے تھے۔ یونیورسٹی میں ہر سال 21 اکتوبر کو یوم تبلیغ منایا جاتا تھا۔ حکیم عنایت اللہ نسیم نے یہ صورتحال دیکھی تو برداشت نہ کر سکے۔ انھوں نے اپنے دوستوں میں سے حافظ صدیق احمد صدیقی' حافظ فضل الرحمٰن انصاری اور محمد شریف چشتی کو ساتھ ملا کر ایک مجلسِ عمل بنائی اور مولانا ظفر علی خان کو علی گڑھ آنے اور طلبہ سے خطاب کرنے کی دعوت دے دی۔

اس سے قبل قادیانی علی گڑھ کی لائل لائبریری میں سیرت کے نام پر ایک کانفرنس کا اعلان کر چکے تھے۔ عنایت اللہ سوہدروی اس کانفرنس کو رکوانے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ اور ان کا پیغامِ عالیہ صحیح تناظر میں اُبھارنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ انگریز پرو وائس چانسلر مسٹر باتھم گھبرا گیا لیکن مسلمان طلبہ مصمم ارادہ کر چکے تھے۔ انھیں آفتاب ہال دینے سے انکار کر دیا گیا لیکن مولانا نسیم سوہدروی اسی ہال میں ظفر علی خان کی تقریر کروانے کا اعلان کر چکے تھے۔ انھوں نے اجازت نامے کی پرواہ نہ کی اور مولانا ظفر علی خان کو طلبہ کے جلوس میں لے کر آئے اور ہال پر قبضہ کر لیا۔ مولانا کی تقریر نے علی گڑھ کی فضا تبدیل کر دی۔ آفتاب ہال میں بغیر اجازت جلسہ کرنے کا یہ دوسرا واقعہ تھا۔ اس سے قبل مولانا محمد علی جوہر نے بغیر اجازت تقریر کی تھی۔ علی گڑھ میں ہر طرف مسلمانوں کے نعرے گونج رہے تھے۔

اس کامیابی نے حکیم عنایت اللہ کے دینی جذبے کو بہت تقویت دی' مولانا ظفر علی خان کا ہاتھ ان کی پشت پر تھا۔ وہ ان کے فکری' دینی اور سیاسی رہنما تھے۔ 1937ء میں ایک دفعہ پھر قادیانیوں نے سر اٹھایا۔ اس دفعہ علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سیّد ضیاالدین نے کانووکیشن ایڈریس کے لیے وائسرائے کونسل کے رکن سر ظفر اللہ خان کو دعوت دے دی۔ حکیم نسیم سوہدروی ایک وفد لے کر علامہ اقبال کی خدمت میں لاہور پہنچے اور ان سے ایک میمورنڈم پر دستخط کرا لائے۔ یہ میمورنڈم کانووکیشن سے پہلے علی گڑھ میں وسیع پیمانے پر تقسیم کیا گیا۔ اس کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا' سر ظفر اللہ خان کا ایڈریس منسوخ کر دیا گیا۔ حکیم صاحب کی زندگی کے یہ دو واقعات ہمیشہ روشن رہیں گے۔ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی اب اس دنیا میں نہیں۔ وہ جتنی دیر زندہ رہے' ان کا قلم خدمتِ قوم اور خدمتِ وطن میں مصروف رہا۔ اسلام' پاکستان' اقبال' قائداعظم اور ظفر علی خان ان کے مستقل موضوعات تھے۔ ان کا آخری مقالہ دسمبر 94ء میں ان کے انتقال کے دو دن بعد شائع ہوا۔ حق مغفرت کرے' کیا عجب خدمت گزارِ قوم تھے۔ (ڈاکٹر انور سدید)

❁......❁......❁

عبدالمجید خان ساجد

علامہ اقبال اور قادیانیت

قادیانیت ایک عفریت ہے اور جھوٹ کی گود میں پرورش پانے والا کفر والحاد کا ایک ناجائز بچہ ہے جو انگریزوں اور یہودیوں نے امتِ مسلمہ کے وجود کو اندر سے کھوکھلا کرنے کے لیے جنم دیا۔ کفر ہمیشہ مسلمانوں کے جذبۂ جہاد سے برگشتہ رہا ہے اور اس نے مسلمانوں میں سے اس روح کو ختم کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا ہے۔ قادیانیت کی روح بھی ایک فاسق اور فاجر شخص کو پیغمبری کا لبادہ پہنا کر مسلمانوں کے اندر برگِ حشیش کی طرح کاشت کرنا تھا۔ اس قادیانی بچھڑے کو انگریز سامری نے برصغیر میں اپنے دورِ اقتدار میں پالا پوسا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی تمام تحریریں انگریز کی مداحی اور اپنے فسق و فجور کے اعتراف سے عبارت ہیں۔ وہ پیغمبر اور نبی بن تو گیا، ایک شریف انسان کے معیار پر بھی پورا نہیں اترتا۔ مرزا غلام احمد قادیانی سارقِ ختم نبوت ہے' گستاخِ رسول ہے اپنی نبوت میں جھوٹا ہے اور تاریخ کا سبق یہ ہے کہ مسیلمہ کذاب سے لے کر قادیانی کذاب تک کسی مدعی نبوت کو مسلمانوں میں سوائے ذلت و رسوائی کے کچھ نصیب نہیں ہوا۔

شیخ عبدالماجد قادیانی' قادیانیوں کا پالتو گماشتہ ہے۔ قادیانیوں کے پورے وسائل اس کے لیے فراواں ہیں اور وہ حضرت علامہ اقبال کی شخصیت کو مسمار کرنے کی مہم پر لگایا ہوا بلکہ سدھایا ہوا کذاب ہے۔ اس کی کتاب ''اقبال اور احمدیت'' کے مطالعے سے آپ پر واضح ہوگا کہ وہ حوالوں اور حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں ''قادیانہ مہارت'' رکھتا ہے۔ قادیانی جھوٹ کا شجر سب سے پہلے علامہ اقبال کے آبائی محلہ چوڑی گراں کی مسجد حسام الدین میں لگا اور قادیانی کذاب ایک مناظر کے طور پر عوام میں معروف تھا لہٰذا دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح اقبال کے قرب و جوار میں بھی یہ مقبول تھا مگر جب اس نے نبوت کا دعویٰ کیا تو آہستہ آہستہ یہ لوگ اس فتنے کے مخالف ہو گئے۔ اور جب اقبال نے دیکھا کہ فتنہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے سیاسی' عمرانی اور مذہبی خطرات سے بھرا پڑا ہے تو انھوں نے دوسرے علماء کی طرح اس کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دینے کی تحریک اٹھائی۔ یہ ہے اقبال کا قصور جس

کی بناپر قادیانی کذاب کی پوری امت ان کی شخصیت کومسمار کرنے پر تلی ہوئی ہے۔قادیانیوں کے ساتھ اقبال کے تعلقات کے تمام راوی قادیانی ہیں' مرزا جلال الدین' عبدالمجید سالک' غلام محی الدین قصوری ایڈووکیٹ' رسالہ الفرقان' الفضل شیخ اعجاز احمد سب قادیانی ذرائع ہیں لہٰذا یہ سب جھوٹے اور ساقط الاعتبار ہیں اور اقبال سے قادیانی روابط کی تمام روایات گھڑی ہوئی اور جھوٹ کا پلندہ ہیں۔

علامہ اقبال کی بیعت کا مسئلہ

''اقبال اور احمدیت'' کے مصنف شیخ عبدالماجد (قادیانی) نے علامہ اقبال کے متعلق لکھا کہ انھوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کی بیعت کی تھی اور وہ 1931ء تک اس جماعت سے منسلک رہے۔اس سلسلہ میں ''اقبال اور احمدیت'' مصنفہ شیخ عبدالماجد سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔''علامہ اقبال نے 1897ء میں مرزا غلام احمد کی بیعت کی جبکہ ان کا شعور پختہ نہ تھا اور اقبال نے چونکہ عملی رنگ میں جماعت کے ساتھ روابط نہیں رکھے اور اب لڑکپن کا دور بھی نہیں رہا' اب آپ کا ذہنی شعور پختہ ہو چکا ہے۔اب آپ کے والد صاحب کے جماعت میں روابط میں بھی سرد مہری آ رہی ہے۔اس صورتحال میں علامہ کو نئے سرے سے بیعت بھجوانا چاہیے۔راقم کا خیال ہے کہ اگر غلام محی الدین قصوری صاحب کو بھی اس دور میں جب وہ برصغیر کے ممتاز ایڈووکیٹ میں شمار ہونے لگے' بیعت کا پیغام بھیجا جاتا تو وہ بھی بیعت کرنے پر آمادگی کا اظہار نہ کرتے لیکن اس سے ان کے 1897ء والے بیعت کے واقعہ کو کالعدم قرار نہیں دیا جا سکتا۔'' (اقبال اور احمدیت' ص 43-42)

دوسرا اقتباس ''بہر حال 1902ء میں حالات بہت کچھ بدل چکے تھے۔علامہ اقبال ایم اے کر چکے تھے' اورینٹل کالج میں استاد مقرر ہو چکے تھے۔کچھ عرصہ پیشتر ملکہ وکٹوریہ کی وفات پر غایت درجہ پُردرد و پُراثر مرثیہ لکھ کر انگریزوں سے زبردست خراجِ تحسین حاصل کر کے شہرت پا چکے تھے۔اب آپ کے والد صاحب کی احمدیت سے وابستگی کا گراف نیچے گر چکا تھا۔'' (مظلوم اقبال' ص 186)

شیخ اعجاز احمد جو علامہ اقبال کے سگے بھتیجے ہیں' خود بیان کرتے ہیں ''1902ء میں جب ہماری منجھلی پھوپھی طالع بی بی کا انتقال ہوا تو سیالکوٹ کے احمدی حضرات ان کے جنازے میں شامل نہ ہوئے۔'' اس پر میاں جی نے حضرت میر حامد شاہ کی زبانی حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کو پیغام بھیجا کہ ''میں عمر رسیدہ ہوں تو آپ کے ساتھ اس قدر تیز نہیں چل سکتا......'' ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ احمدی نہ تھے نامکمل بات ہوگی۔ہاں یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ ابتداء میں جماعت میں شامل ہو گئے تھے۔لیکن 1902ء میں جماعت سے الگ ہو گئے۔

(مظلوم اقبال' ص 185)

پھر شیخ اعجاز احمد یہ بیان کرتے ہیں:

''میاں جی کے جماعتِ احمدیہ سے علیحدگی کے بعد ہوش سنبھالنے پر میں نے گھر میں احمدیت کا چرچا نہیں سنا۔'' (مظلوم اقبال' ص186)

''92-1891ء...... کے چند سال بعد جب سر اقبال کالج میں پہنچے تو ان کے خیالات میں تبدیلی آ گئی اور انھوں نے اپنے باپ کو بھی سمجھا بجھا کر احمدیت سے منکر کر دیا۔'' (سیرت المہدی۔ مرزا بشیر احمد ایم۔ اے' ص249)

مندرجہ بالا اقتباسات قادیانی حضرات کے ہیں جنھوں نے علامہ اقبال کی بیعت کا مسئلہ چھیڑا اور ایڑی سے چوٹی تک زور لگایا کہ علامہ اقبال 1931ء تک جماعت احمدیہ سے منسلک رہے لیکن ان کے اپنے بیانات خود ان کے خلاف گواہی دے رہے ہیں۔

مندرجہ بالا اقتباسات سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:

1- ناپختہ شعور کے لوگ قادیانیت کے پھندے میں آتے ہیں اور جب شعور پختہ ہو جاتا ہے تو لوگ بیعت توڑ دیتے ہیں۔

2- علامہ اقبال 1902ء میں ہی قادیانیت سے اختلاف کر گئے تھے۔ لہٰذا شیخ عبدالماجد کا یہ بیان کہ علامہ اقبال 1931ء تک جماعت احمدیہ سے منسلک رہے کس قدر مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔

3- بیعت کا قصہ صرف قادیانیوں نے گھڑا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور نے یہ بات نہیں لکھی۔ اس کے راوی مرزا جلال الدین' شیخ اعجاز احمد اور عبدالمجید سالک ہیں' جن میں سے پہلے دو قادیانی ہیں اور تیسرے کا باپ اور بھائی قادیانی ہیں۔

4- یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ قادیانیوں نے اقبال کو 1902ء میں بیعت کے لیے کہا اور اس نے اشعار کی زبانی جواب دے دیا کہ وہ بیعت نہیں کرے گا۔ معلوم ہوتا ہے علامہ اقبال نے 1902ء سے پہلے بیعت کی ہی نہیں۔ اگر کی ہوتی تو علامہ اقبال نے جو اشعار بیعت نہ کرنے کے متعلق لکھ کر بھیجے تو ان اشعار میں تجدید بیعت کا ذکر ملتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بیعت ہوئی ہی نہیں تھی۔ اس بارے میں شیخ اعجاز احمد کا بیان ساری قلعی کھول رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ اس سے پہلے اقبال نے بیعت نہیں کی ہوئی تھی، اگر کی ہوتی تو یہ پیغام کیوں بھیجا جاتا۔'' (مظلوم اقبال' ص190)

یہ بات بھی واضح ہو گئی ہے کہ علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد بھی بقول شیخ اعجاز احمد ''احمدیت

سے گریزاں نظر آتے ہیں کیونکہ ان کی احمدیت سے وابستگی کا گراف نیچے گر چکا تھا۔"

1897ء کے بعد علامہ اقبال 1938ء تک اکتالیس برس زندہ رہے لیکن کسی کو یہ ہمت نہ ہوئی کہ ان کے متعلق یہ بات لکھتا۔ آج علامہ اقبال کی وفات کی آدھی صدی گزرنے کے بعد یہ بے سروپا قصہ اچھالا جا رہا ہے۔ سوائے اقبال دشمنی کے اور کیا بات ہے کیونکہ انھوں نے قادیانیوں کے متعلق یہ کہا تھا کہ ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور 1974ء میں ان کو بھٹو حکومت نے "غیر مسلم اقلیت" قرار دے دیا۔

علامہ اقبال کو 1902ء میں مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے ایک مریدِ خاص سید حامد شاہ کے ذریعے کہلوایا۔ علامہ اقبال نے مندرجہ ذیل منظوم جواب دیا جو رسالہ "مخزن" مئی 1902ء میں چھپا۔

تنکے چن چن کے باغِ الفت کے
آشیانہ بنا رہا ہوں میں
ایک دانہ پہ ہے نظر تیری
اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں
تو جدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں

(اقبال اور احمدیت' ص 11-10 از بشیر احمد ڈار)

فروری 1902ء میں ہی علامہ اقبال نے انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں ایک نظم پڑھی جس کا عنوان تھا "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے"

اس نظم کے نویں بند کا ایک شعر غور طلب ہے۔

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نورِ شمعِ عرفاں کردہ ای

جو شخص نبوت میں کسی قسم کی پیوند کاری کو شرک فی النبوت تصور کرتا ہو کوئی نبوت خواہ ظلی اور بروزی کی اصطلاحات میں اپنے آپ کو ملفوف کر کے پیش کرے' اقبال اسے رد کرتا ہے۔ اقبال عاشقِ رسولؐ ہے پروانہ شمعِ رسالتؐ ہے۔ وہ کیسے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت کے بعد کسی اور کو نبی مان سکتا ہے۔ برخلاف اس کے غلام احمد قادیانی کا تو آخر میں دعویٰ ایک اعلیٰ اور برتر نبوت کا ہو گیا' جس کے بارے میں آگے بیان آئے گا اور قلعی کھل جائے گی کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی تدریجی نبوت ظلی' بروزی' حلولی یا محدث کی اصطلاحات محض ایک دھوکہ تھا۔ علامہ اقبال کا یقین کامل ہے:

بمصطفی برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بو لہبی است

اقبال ایسے شخص کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی سے عقیدت رکھتا تھا اور بیعت کی تھی کس قدر فریب کاری اور دجل ہے۔ اقبال کی بیعت کے متعلق ''مظلوم اقبال'' کے مصنف شیخ اعجاز احمد نے بہت بڑا ثبوت خود مہیا کر دیا ہے۔

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانہ سے

شیخ اعجاز احمد لکھتا ہے ''مجھے بھی احمدیہ لٹریچر میں علامہ کے کسی وقت حضرت صاحب کی بیعت کرنے کی کوئی معتبر شہادت نظر نہیں آئی۔ ماہنامہ ''الفرقان'' ربوہ (جولائی۔ اگست 1967ء) کے ایک مضمون میں مولوی غلام محی الدین قصوری ایڈووکیٹ (جو ابتداء میں جماعتِ احمدیہ میں شامل ہوئے لیکن بعد میں علیحدہ ہو گئے) کی روایت بیان کی گئی ہے کہ 97-1896ء میں جب ڈاکٹر اقبال بی اے کلاس میں پڑھتے تھے تو آپ بانیِ سلسلہ احمدیہ کی بیعت میں شامل ہو گئے تھے اس کے علاوہ ایک روایت خواجہ نذیر احمد ایڈووکیٹ کی ہے جو غیر مبائعین کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے اضطراباتِ پنجاب کے سلسلہ میں انکوائری کمیشن کے سامنے شہادت دیتے ہوئے کہا کہ اقبال نے 1893ء یا 1894ء میں بیعت کی تھی لیکن یہ بھی تسلیم کیا کہ انھیں اس کا ذاتی علم نہیں۔ میرے نزدیک علامہ کی بیعت ثابت کرنے کے لیے یہ شہادت جس میں بیعت کے سن کے متعلق بھی اختلاف ہے، کافی نہیں۔ مزید برآں حسب ذیل باتیں بیعت کی تردید کرتی ہیں:

مئی 1902ء کے ماہنامہ ''مخزن'' میں ایک نظم شائع ہوئی تھی' اس کا عنوان تھا ''منظوم خط پیغامِ بیعت کے جواب میں'' اس کے متعلق شیخ اعجاز احمد کا بیان ہے ''ظاہر ہے مئی 1902ء سے کچھ پہلے کسی نے چچا جان کو بیعت کے لیے لکھا ہوگا جس کے جواب میں انھوں نے یہ نظم شائع کروائی......اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ اس سے پہلے اقبال نے بیعت نہ کی ہوئی تھی۔ اگر کی ہوتی تو یہ پیغام کیوں بھیجا جاتا۔

(مظلوم اقبال' ص 190-189)

شیخ اعجاز احمد علامہ اقبال کا بھتیجا ہے اور وہ سارے خاندان میں واحد قادیانی ہے۔ یہ گھر کا فرد علامہ کے متعلق کتنا واضح بیان دے رہا ہے۔ اس کو گھر میں خبر نہ تھی کہ علامہ اقبال نے مرزا قادیانی کی بیعت کی ہے؟ اس نے اقبال کے متعلق ایک کتاب ''مظلوم اقبال'' کے نام سے لکھ دی اور کوشش کی کہ ثابت کرے کہ علامہ اقبال قادیانیوں کو اچھا خیال کرتے تھے۔ لیکن بیعت کے متعلق یہ شخص بھی انکاری ہے۔ لہٰذا علامہ اقبال نے کبھی بھی مرزا قادیانی کی بیعت کی تھی' کی کوئی روایت پایہ ثبوت تک نہیں پہنچ پائی۔

1910ء۔آگے ایک اور اقتباس ملاحظہ کریں۔

''الحکم'' قادیان (قادیانی اخبار) مورخہ 23 اگست 1910ء میں ایک خبر شائع ہوئی کہ شیخ یعقوب علی تراب کی نواسی کا نکاح بعد از نماز مغرب پانچ صد روپیہ حق مہر پر ڈاکٹر محمد اقبال سے ہوا۔ اقبال کے احباب و اعزہ کو تعجب ہوا کہ انھوں نے قادیان جا کر احمدیوں سے رشتہ جوڑ لیا جن کے عقائد کے وہ خلاف تھے۔اقبال کو اس بے سروپا خبر کی تردید چھپوانا پڑی جو ''پیسہ اخبار'' مورخہ 15 اگست میں شائع ہوئی۔فرمایا ''اس عبارت سے میرے اکثر احباب کو غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے مجھ سے زبانی اور بذریعہ خطوط استفسار کیا ہے۔سب حضرات کی آگاہی کے لیے بذریعہ آپ کے اخبار اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مجھے اس معاملہ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔جن ڈاکٹر محمد اقبال کا ذکر ایڈیٹر صاحب ''الحکم'' نے کیا ہے وہ کوئی اور صاحب ہوں گے۔''

(اقبال اور احمدیت' ص 55-54)

مندرجہ بالا اقتباس پر تبصرہ کرتے ہوئے ''اقبال اور احمدیت'' کے مصنف شیخ عبدالماجد نے دو غلطیوں کی نشاندہی کی کہ دلہن محترمہ امۃ الرحمٰن صاحبہ کو شیخ یعقوب علی تراب کی نواسی لکھنا درست نہیں یہ محترمہ خود حضرت مولوی حکیم نورالدین کی نواسی تھی اور دوسرا دولہا کا نام ڈاکٹر اقبال علی غنی تھا۔

(اقبال اور احمدیت' ص 55)

یہاں پر شیخ عبدالماجد نے دولہا اور دلہن کے ناموں کی غلطی تو درست کر دی لیکن اس تردیدی خبر پر جو علامہ اقبال کی طرف سے احمدیوں کے عقائد کے سراسر خلاف تھی' ایک لفظ بھی نہ لکھا کہ علامہ اقبال کو قادیانیت سے یکسر اختلاف تھا۔یہ واقعہ 1910ء کا ہے۔شیخ عبدالماجد کا خیال ہے کہ علامہ اقبال 1931ء تک احمدیہ جماعت کے عقائد کے خلاف نہ تھے لیکن دیکھ لیا ذرا سی غلط فہمی پر اقبال کس طرح برافروختہ نظر آتا ہے۔اصل بات یہ ہے کہ علامہ مرنجاں مرنج انسان تھے لیکن جب کوئی بات خلاف عقیدہ خیال کرتے فوری طور پر باز پرس کرتے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اقبال اور خطبۂ علی گڑھ

اقبال کی اعلیٰ ظرفی ملاحظہ ہو کہ انھوں نے 1910ء میں اپنے خطبہ علی گڑھ میں اس جماعت احمدیہ کو ''اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ'' قرار دیا جس پر یہ لوگ فخر کر رہے ہیں کہ علامہ کو ان سے عقیدت تھی۔دراصل علامہ اقبال ایک آفاقی شاعر ہے وہ جو اچھی بات کسی میں دیکھتا ہے اس کی تعریف کرتا

ہے۔ سامراجی قوتیں انسانوں کے حقوق غصب کر رہی تھیں۔ وہ دوسرے ملکوں کو اپنے زیر نگیں کرنے کے درپے تھیں۔ مزدوروں کے حقوق پر ڈاکے پڑ رہے تھے۔ ارتکازِ زر زوروں پر تھا۔ اسلام چونکہ ان تمام باتوں کے خلاف تھا لہٰذا اقبال نے سامراجیوں کی شدید مخالفت کی اور ان کے خلاف اشعار لکھے مثلاً

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

چونکہ اشتراکیت سامراجیوں کے خلاف ایک سیاسی جنگ تھی اور اقبال نے اسلامی اقدار کو سامنے رکھ کر سامراجیوں کی باز پرس کی لہٰذا اشتراکی لوگوں نے علامہ اقبال کو اشتراکی کہنا شروع کیا اور نیم خواندہ مولویوں نے اقبال کو سوشلسٹ سمجھنا شروع کر دیا۔ حالانکہ علامہ اقبال نے تو ایک اچھی بات کو سراہا تھا۔ اس کے سراہنے سے' ان کے عقیدے سے عقیدت نہیں ہو جاتی۔ اشتراکیت مادہ پرستی ہے اور خدا کی ہستی سے انکار۔ اقبال ان کے اس عقیدہ کے بالکل خلاف ہیں۔ کارل مارکس کے متعلق علامہ اقبال کہتا ہے:

صاحب سرمایہ از نسلِ خلیل
یعنی آں پیغمبرے بے جبرئیل
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است
قلبِ او مومن دماغش کافر ست
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس

میسولینی کے متعلق اس طرح لکھتا ہے کہ

''میسولینی بغیر بائبل کے لوتھر ہے۔''

اسی طرح مرزا غلام احمد قادیانی نے جب عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے خلاف تبلیغِ اسلام کے سلسلہ میں مناظرے کیے تو اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے علامہ اقبال نے اسے سراہا۔ علامہ اقبال نے قادیانیوں کے عقائد کو کبھی نہیں سراہا اور نہ ہی کبھی یہ کہا کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کی من گھڑت نبوت کو درست خیال کرتے ہیں۔ اقبال کی طرح بہت سے لوگوں نے جن میں مولانا ابو الکلام آزاد' عبدالماجد دریا بادی اور سیّد سلیمان ندوی جیسے علماء شامل ہیں، نے مرزا غلام احمد قادیانی کی اس بات کو سراہا۔ اصل میں ''براہینِ احمدیہ'' مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی کے چار حصے تو 1880ء تا 1884ء منظر عام پر آ چکے تھے لیکن پانچواں حصہ 1908ء میں شائع ہوا اور یہی وہ پانچواں حصہ ہے جس میں مرزا قادیانی

نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ ویسے اس کتاب کے اصل حقائق بہت دیر بعد مسلمانوں کو معلوم ہوئے لہٰذا علامہ اقبال کو اگر معلوم ہوتا کہ ان کے در پردہ عزائم اسلام کی بیخ کنی ہیں تو وہ اس کے خلاف ضرور آواز اٹھاتے۔ علامہ اقبال نے جو تعریفی جملہ خطبہ علی گڑھ 1910ء میں قادیانی جماعت سے کہا تھا وہ انگریزی زبان میں اس طرح ہے۔

In the Punjab the essentially Musilms Type of Charachter has found a powerful expression in the so-called Qadiani Sect.

اس کا اردو ترجمہ سب سے پہلے مولانا ظفر علی خان نے کیا جو یوں ہے۔ ''پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جسے قادیانی فرقہ کہتے ہیں۔'' (مظلوم اقبال' ص96)

ڈاکٹر ریاض احمد نے اپنی کتاب ''افکار اقبال'' میں اس کا ترجمہ یوں لکھا ''پنجاب میں بنیادی طور پر مسلم طرز کے کردار کا زوردار ظہور قادیانی نام کے فرقے میں ہے۔'' (افکارِ اقبال۔ ریاض احمد ص68)

So-Called Qadiani sect کا ترجمہ قابلِ غور تھا جو کسی نے درست نہیں کیا۔ اس کا اصل ترجمہ ''نام نہاد قادیانی ٹولہ'' بنتا ہے۔ بہر حال کسی صورت میں ''جماعت احمدیہ اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ ہے'' ترجمہ نہیں بنتا لیکن باایں ہمہ اس سے یہ بات تو ثابت نہیں ہوتی کہ علامہ محمد اقبال مرزا قادیانی کی بات کو درست تسلیم کر رہے ہیں۔

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

''چونکہ اس زمانہ میں جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ نہ کیا تھا اور وہ ایک مناظرِ اسلام کے روپ میں ظاہر ہوا تو اس زمانہ میں کئی لوگ شبلی نعمانی' مولانا ظفر علی خان اور علامہ اقبال اس بات سے متاثر ہوئے لیکن جب مرزا بشیر الدین محمود نے خلافت کو ایک سیاسی کاروبار کی شکل دی تو ایک ایک ورق کھل گیا۔ نتیجۃً جو لوگ ایک عام شہرت کے باعث مرزا کو مناظر و مبلغ خیال کرتے تھے ظلی اور بروزی نبی کی اصطلاحوں سے چوکنا ہو گئے اور ان پر وقت کے ساتھ ساتھ تمام حقیقتیں منکشف ہو گئیں کہ مرزا غلام احمد اور اس کے خلافتی جانشینوں کا مقام و منشا کیا ہے اور وہ مسلمانوں میں دینی ارتداد کی ایک سیاسی تحریک ہے۔''

(مرزائیل۔ شورش کاشمیری' ص95)

نہایت عجیب بات ہے کہ 1910ء کے خطبہ علی گڑھ کی تحریر کو جو قادیانیوں کے حق میں ہو

جواز بنالیا جائے لیکن جب علامہ اقبال کے ہاتھوں ان کی مکر وریاء کی دلق چاک ہوئی اور اصل حقیقت واضح ہونے پر یہاں تک فرمایا کہ اس جماعت کی طرف سے دعویٰ نبوت اسی طرح ہے جیسے مسیلمہ کذاب نے دعویٰ کیا تھا اور ایسا دعویٰ کرنے والا شخص اسلام کی رو سے واجب القتل ہے۔ علامہ اقبال کے اس خیال کی کیوں تشہیر نہیں کی گئی۔

علامہ اقبال کی احمد یہ جماعت کے متعلق یہ سوچ تھی۔ ایسے شخص کے متعلق لکھ دینا کہ وہ صرف طلب جاہ یا احراری حضرات کے ورغلانے سے قادیانیوں کے خلاف ہو گئے، بہت بڑا الزام ہے۔ اس پر آگے تفصیلی گفتگو کی جائے گی۔ اصل بات یہ ہے کہ علامہ اقبال اس وقت کسی شخص کی باز پرس کرتے ہیں جب ان کے عقائد اور خیالات کھل کر سامنے آ جاتے ہیں۔ اس لیے جب علامہ اقبال نے دیکھا کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی آڑ میں قادیانی اسلام کو نقصان پہنچانے کا باعث ہو رہے ہیں تو آپ نے پوری شد و مد سے مخالفت کی۔

جلسہ سیرت النبی ﷺ اور اقبال

''1909ء میں علامہ اقبال جماعت احمد یہ لاہور کے جلسۂ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقرروں میں نظر آتے ہیں۔'' (اقبال اور احمدیت' ص 43)

حیرانی کی بات ہے کہ شیخ عبدالماجد جلسۂ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اگر علامہ اقبال کو بطور مقرر دیکھتے ہیں تو اس میں کونسی برائی والی بات تھی۔ کوئی کافر اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اقدس کا بیان کرنے کے لیے اپنا پلیٹ فارم مہیا کرتا تو وہ عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس میں شرکت کر کے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پر عقیدت کے پھول نچھاور کرنے کے لیے ضرور حسبِ توفیق بات کرتا۔ اگر شیخ عبدالماجد یہ بیان دیتا کہ وہ جلسہ غلام احمد قادیانی کی سیرت کو بیان کرنے کا تھا' اور علامہ اقبال نے مرزا غلام احمد قادیانی کی بطور نبی تعریف کی تو اقبال قابلِ مواخذہ تھا' اور یہ لوگ فخر کر سکتے تھے کہ علامہ اقبال نے ان کے خیالات کی ترجمانی و تصدیق کی لیکن اگر آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم الانبیاء کی سیرت بیان کی گئی تو یہ ایک اچھی بات تھی کہ قادیانیوں کے پلیٹ فارم سے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ اقدس بیان ہو رہی تھی اور اس طرح اسلام کی حقانیت کا بول بالا ہو رہا تھا۔

جب مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کا اعلان کیا گیا اور اس کے ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ جو مسلمان مرزا صاحب کی نبوت کا قائل نہیں وہ کافر ہے، اس کا ردعمل فطری تھا۔ چنانچہ اقبال نے 1916ء میں اس کے جواب میں ایک بیان دیا:

''جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی ایسے نبی کا قائل ہو جس کا

انکار مستلزم کفر ہو وہ خارج از اسلام ہوگا۔ اگر قادیانی جماعت کا یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔" (گفتارِ اقبال۔ محمد رفیق، ص 22)

دیکھ لیا شیخ عبدالماجد کہتا ہے کہ اقبال 1931ء تک جماعت احمدیہ سے منسلک رہے، اب 1902ء سے 1916ء تک چار بار علامہ اقبال احمدیت کے عقیدے کے خلاف بیان دے رہے ہیں۔ معلوم نہیں ان واقعات کو کس طرح صرفِ نظر اور حذفِ تحریر کر کے جھوٹا الزام لگانے کی ناکام کوشش کی جا رہی ہے۔

علامہ اقبال کا طلاق کی شرعی حیثیت دریافت کرنا

قادیانی جماعت کی طرف سے ایک اور بڑا الزام جو علامہ اقبال کی ذات پر لگایا جاتا ہے یہ ہے۔ قادیانی اخبار "الفضل" نے مولانا عبدالمجید سالک کے حوالے سے علامہ اقبال کی مرزا غلام احمد قادیانی اور حکیم نورالدین سے عقیدت کا ذکر کیا اور لکھا ہے کہ حضرت علامہ اقبال نے طلاق کی شرعی حیثیت دریافت کرنے کے لیے مرزا جلال الدین بارایٹ لاء کو مولوی حکیم نورالدین (خلیفہ اوّل مرزا غلام احمد قادیانی) کے پاس قادیان بھیجا تھا۔

سالک صاحب نے "یارانِ کہن" میں ایک شوشہ مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق بھی چھوڑا تھا۔ مولانا آزاد نے سختی سے ڈانٹا تو سالک صاحب کو تردید و تصحیح کرنا پڑی۔ مولانا سالک نے "یاران کہن" (مطبوعہ مکتبۂ چٹان) میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ذکر کو بھی مرزائیت کی بالواسطہ مدافعت میں استعمال کیا۔ اپنے مختصر خاکے میں لکھا' مولانا آزاد مرزا غلام احمد سے ملنے قادیان گئے تھے اور ان کی رحلت پر امرتسر کے سہ روزہ اخبار "وکیل" میں تعزیتی شذرہ لکھا تھا۔ مولانا آزاد نے اس کی تردید میں اپنے سیکرٹری پروفیسر محمد اجمل خان سے راقم کو خط لکھوایا۔ ادھر مولانا عبدالمجید سالک کسی مشاعرہ میں شرکت کے لیے دہلی گئے تو اس خفگی میں مولانا نے ان سے ملاقات نہ کی۔ سالک نے لاہور پہنچ کر ہفتہ وار "چٹان" میں اس کی تصحیح کر دی۔

علامہ اقبال کے واضح خیالات جانتے ہوئے ان کی زندگی میں اوّل "کبھی ایسا الزام لگانے کا حوصلہ نہ کرتے" ثانیاً "اگر حوصلہ کرتے تو تردید کرنا پڑتی۔" ثالثاً "حضرت علامہ کی زندگی میں انھوں نے کبھی یہ نہ لکھا اور نہ کسی سے ذکر کیا۔" سالک صاحب کا یہ رویہ اکثر معمہ رہا کہ مختلف اکابر کے تذکرہ میں مرزا صاحب کو ضرور لاتے رہے جس میں مرزا صاحب کی صفائی یا بڑائی مقصود ہو۔ حالانکہ ان کے سوانح و افکار میں مرزا صاحب کا ذکر انمل بے جوڑ ہے۔" اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مولانا سالک کے والد قادیانی تھے اور مسلمانوں نے انھیں اپنے قبرستان میں دفن نہ ہونے دیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سالک

صاحب کے چھوٹے بھائی بھی قادیانی ہیں۔تیسرا سبب یہ ہے کہ مرزا بشیر الدین محمود کے ساتھ مولانا عبدالمجید سالک کے تعلقات کا ایک خاص سانچہ تھا۔خلیفہ صاحب اپنی تاریخ کا سروسامان بنانے کے لیے قلمِ سالک سے اس قسم کی روایتیں وضع کرا لیتے تھے۔'' (مرزائیل۔شورش کاشمیری' ص98)

عبدالمجید سالک قادیانیوں سے گہرے مراسم رکھتے تھے اس لیے انھوں نے اقبال دشمنی کے طور پر یہ واقعہ وضع کیا۔اس کے متعلق شورش کاشمیری کی کتاب (اقبالی مجرم) سے ایک اقتباس:

''مرزا بشیر الدین محمود سے مولانا سالک کا میل ملاپ تھا۔مولانا کے والد قادیانی تھے اور سگا بھائی بھی قادیانی تھا۔'' (اقبالی مجرم۔شورش کاشمیری' ص123)

مولانا سالک نے اقبال اور اس کے خاندان کے متعلق اس طرح کی غلط باتیں لکھی ہیں۔ علامہ اقبال کے حینِ حیات سالک صاحب نے کوئی بات نہ کی نہ لکھی لیکن وفات کے بعد ''ذکرِ اقبال'' کتاب لکھ کر بے سروپا جھوٹی روایتوں کا سہارا لے کر بے انصافی اور زیادتی کے مرتکب ہوئے۔

علامہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطاء محمد کے متعلق بھی انھوں نے اپنی کتاب ''ذکرِ اقبال'' کے صفحہ 10 پر لکھا کہ وہ قادیانی تھے لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ ''شیخ عطاء محمد نے 82 برس کی عمر میں وفات پائی اور امام صاحب (امام علی الحق) کے قبرستان میں دفن کیے گئے ہیں شیخ صاحب احمدی عقائد رکھتے تھے۔''

معلوم نہیں ''دروغ گورا حافظہ نباشد'' ایک طرف تو سالک صاحب شیخ عطاء محمد کو قادیانی عقائد رکھنے والا بتاتے ہیں اور ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ ان کو امام صاحب کے قبرستان میں دفن کیا گیا ہے۔ اگر وہ احمدی عقائد پر ہوتے تو ان کو کبھی بھی امام صاحب کے قبرستان میں دفن نہ ہونے دیا جاتا۔

سالک صاحب نے اقبال اور اقبال کے خاندان کے علاوہ مولوی میر حسن صاحب جو علامہ اقبال کے استاد تھے کو بھی نہیں بخشا۔''ذکرِ اقبال'' میں ان کا ذکر بھی اس حوالہ سے کیا کہ وہ اپنے داماد سیّد خورشید انور کو حکیم نور الدین خلیفہ اوّل مرزا غلام احمد قادیانی کے پاس علاج کے لیے قادیان لے گئے۔یہ ذکر اس لیے کیا گیا کہ علامہ اقبال اور ان کا خاندان تو در کنار ان کے استاد مولوی میر حسن بھی قادیانیوں سے محبت رکھتے تھے لیکن علامہ اقبال نے جو سخت قدم قادیانیوں کے خلاف اٹھائے' وہ سالک صاحب نے صرفِ نظر کر دیے اور ان کا کہیں بھی ذکر نہ کیا۔یہ اقبال دشمنی نہیں تو اور کیا ہے اور ایسے شخص کی روایت کا کیا اعتبار جو قادیانی گروپ سے وابستہ ہو۔لہٰذا ان کی کتاب ''ذکرِ اقبال'' علامہ اقبال کے خلاف ایک سازش ہے اور ایسے شخص کے بیانات درخورِ اعتنا نہیں ہوتے۔عبدالمجید سالک غیر ثقہ راوی اور دروغ گو بھی ہیں۔

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہے کہ عبدالمجید سالک کوئی ثقہ راوی نہیں ہیں اور دوسرا

وہ مرزا بشیر الدین محمود سے ذاتی تعلقات رکھتے تھے۔ تیسری بات یہ کہ سوائے ان کی طرف سے ایک روایت کے جو گھڑی ہوئی ہے کسی کتاب میں اس کا ذکر نہیں ملتا لہٰذا ایسی مجہول اور غیر مستند روایت پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جس شخص مرزا جلال الدین بارایٹ لاء کو مولوی نور الدین کے پاس بھیجے جانے کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی قادیانی اور الفضل اخبار بھی قادیانی جماعت کا اخبار۔ عام اخبار جھوٹی سچی خبریں شائع کر دیتے ہیں چہ جائے کہ وہ اخبار جو ایک قادیانی جماعت کا ہو وہ تو صرف اور صرف اپنی جماعت کی ترجمانی کرتا ہے لہٰذا ایسے شواہد روایت کی درایت میں قابلِ قبول نہیں ہوتے۔

مولانا عبدالمجید سالک نے یہ داستان گھڑتے وقت جو شخص طلاق کی شرعی حیثیت دریافت کرنے کے لیے مولوی حکیم نور الدین کے پاس قادیان بھیجا' وہ مرزا جلال الدین بارایٹ لاء قادیانی ہے اور پھر غیر ثقہ بھی۔ ثبوت مندرجہ ذیل ہے۔ ''چند یادیں چند تاثرات'' سنگ میل پبلیکیشنز 1992ء مصنف عاشق حسین بٹالوی میں ایک مضمون ڈاکٹر سیف الدین کچلو پر لکھا گیا۔ اس میں صفحہ 56 پر مرزا جلال الدین بارایٹ لاء پر چند سطور بطور سند پیش کی جاتی ہیں۔ مرزا جلال الدین مرحوم بارایٹ لاء یہ حکایت مشہور کرنے کے ذمہ دار ہیں کہ جب علامہ اقبال اکتوبر 1926ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی ممبری کے لیے شہر لاہور سے کھڑے ہوئے تھے اور ان کا مقابلہ ملک دین محمد سے ہوا تھا تو ڈاکٹر کچلو نے اقبال کی مخالفت اور ملک دین محمد کی حمایت کی تھی۔ پاکستان اور ہندوستان کے چند مصنفوں نے مرزا صاحب کی اس روایت کا ذکر اپنی کتابوں میں بھی کیا ہے۔ ''میرے نزدیک یہ کہانی سرے سے غلط ہے بلکہ حقیقت کے بالکل برعکس ہے کیونکہ ڈاکٹر کچلو نے علامہ اقبال کی جی بھر کر مدد کی تھی۔''

آگے عاشق حسین بٹالوی لکھتا ہے ''میں اس سلسلہ میں صرف ایک واقعہ کا ذکر کرنا کافی سمجھتا ہوں۔ لاہور کے مسلمانوں نے علامہ مرحوم کی الیکشن کی حمایت میں ایک بہت بڑا جلسہ ٹکسالی دروازے کے اندر کیا' خود علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ اس جلسے کی صدارت کے لیے ڈاکٹر کچلو کو امرتسر سے بلواؤ چنانچہ ڈاکٹر کچلو لاہور تشریف لائے' صدارتی تقریب فرمائی اور علامہ اقبال کی حمایت میں زوردار تقریر کی۔''

(چند یادیں چند تاثرات۔ عاشق حسین بٹالوی' ص 56)

مندرجہ بالا مضمون مرزا جلال الدین بارایٹ لاء کو ایک غیر ثقہ اور غیر ذمہ دار راوی ثابت کرتا ہے لہٰذا جہاں راوی اور گواہ دونوں غیر ثقہ ہوں اور قادیانی کا عقیدت مند اور گواہ قادیانی ہو ان کی یک طرفہ مخالفت بھری گواہی کس طرح علامہ اقبال کی شفاف زندگی کو داغدار کر سکتی ہے۔ یہ اقبال دشمن لوگ شروع ہی سے ایسی سازشیں کرتے رہے ہیں۔

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا
ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

انشاءاللہ تعالیٰ ایسے سازشی ٹولے کی ان حرکتوں سے علامہ اقبال کا اقبال اور بلند ہوگا اور یہ اپنے ناپاک عزائم میں خائب وخاسر ہوں گے۔

کیا اقبال 1931ء تک قادیانی عقیدہ سے دلچسپی رکھتے تھے؟

''اقبال اور احمدیت'' کے مصنف شیخ عبدالماجد نے صفحہ 61 پر یہ بات ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اس غلط فہمی کا بطلان انشاءاللہ تعالیٰ ان کے اپنے بیانات سے کیا جائے گا۔ سن وار ان کے بیانات ملاحظہ فرمائیں:

1- مرزا بشیر الدین محمود قادیانی نے اپنی کتاب ''سیرت المہدی'' میں صفحہ 249 پر یوں لکھا ہے۔
''1891ء اور 1892ء...... کے چند سال بعد سر اقبال کالج میں پہنچے تو ان کے خیالات میں تبدیلی آ گئی اور انھوں نے اپنے باپ کو بھی سمجھا بجھا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔''

مندرجہ بالا بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کو جب شعور آیا اور اس نے اندرونی حقیقت اور ان کے غلط عزائم کو سمجھ لیا کہ یہ ایک سیاسی مکروفریب ہے تو وہ متنفر ہو گئے اور اپنے والد کو بھی ''منحرف'' کر دیا۔

2- علامہ اقبال نے 1902ء میں ہر قسم کی نبوت آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت کے بعد پر نظم کے نویں شعر کے پہلے مصرعہ میں یہ بات ثابت کر دی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت کے بعد کسی قسم کی نبوت شرک فی النبوت ہے۔ یہ نظم علامہ اقبال نے 23 فروری 1902ء کو ''انجمن حمایتِ اسلام'' کے سالانہ جلسہ میں پڑھی۔ شعر ملاحظہ ہو:

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نورِ شمعِ عرفان کردہ ای

3- اسی سال 1902ء میں بیعت کے لیے علامہ کو کہا گیا تو آپ نے بیعت نہ کرنے کے متعلق منظوم جواب ارسال کیا اور بیعت کرنے سے انکاری ہوئے۔ یہ نظم رسالہ ''مخزن'' مئی 1902ء میں چھپی۔ اگر پہلے بیعت کی ہوتی تو تجدیدِ بیعت کی کیا ضرورت تھی۔

4- 28 اگست 1910ء کو قادیانیوں کی طرف سے علامہ اقبال کا دامن داغدار کرنے کے لیے ان

کے اخبار ''الحکم'' میں یہ خبر چھاپ دی گئی کہ ''شیخ یعقوب علی تراب کی نواسی کا نکاح بعد از نماز مغرب پانچ صد روپیہ حق مہر پر ڈاکٹر محمد اقبال سے ہوا'' علامہ اقبال نے فوری طور پر قادیانیوں سے مذہبی نفرت کی بناء پر تردیدی بیان شائع کیا جو ''پیسہ اخبار'' لاہور میں 15 دسمبر 1910ء کو چھپا۔

-5 1916ء میں جب قادیانیوں کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ جو مرزا صاحب کی نبوت کا قائل نہیں وہ کافر ہے۔ علامہ اقبال نے فوراً اس کا نوٹس لیا اور یہ بیان دیا۔ ''جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی ایسے نبی کا قائل ہو جس کا انکار مستلزم کفر ہو وہ اسلام سے خارج ہوگا۔ اگر قادیانی جماعت کا یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔'' (گفتارِ اقبال' ص 22)

-6 خلیفہ عبدالحکیم اپنی کتاب ''فکرِ اقبال'' میں علامہ کے متعلق ''توحید و رسالت کی اصل پر اسلام سے غیر متزلزل وابستگی'' کے عنوان کے تحت یوں رقم طراز ہے۔

''یہ گویا ان کے افکار کی مرکزی روح ہے۔ ان کے نزدیک اسلام ہی وہ سانچہ ہے جس میں فوق البشر ڈھلتے ہیں۔ وہ توحید اور ختم نبوت کو مسلمانوں کی وحدت کا اساسی محور قرار دیتے اور فرماتے ہیں کہ دونوں میں سے ایک کی نفی پوری عمارت کو ڈھا دیتی ہے۔'' (اقبالی مجرم۔ شورش کاشمیری' ص 63)

شیخ عبدالماجد کہتے ہیں کہ اقبال قادیانیوں کو اچھا سمجھتے تھے لیکن ناقدان ان پر الزام لگاتے ہیں کہ علامہ اقبال توحید و رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (ختم نبوت) پہ اسلام سے غیر متزلزل وابستگی رکھتے تھے۔

-7 علامہ اقبال سے جب پریس کے نمائندہ نے انٹرویو لیا اور دریافت کیا کہ 1935ء میں قادیانی جماعت کو غیر مسلم قرار دیے جانے کا مطالبہ کیوں کیا گیا جبکہ اس سے پیشتر آپ کی رائے مختلف تھی۔ علامہ اقبال نے جواباً فرمایا:

''یہ تقریر میں نے 1911ء یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ اب سے رُبع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی...... کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہئیں۔ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت بانیٔ اسلام کی نبوت سے بھی برتر نبوت کا حتمی طور پر دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی' جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق نازیبا

کلمات کہتے سنا...... درخت جڑ سے نہیں بلکہ پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقص ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔

(کتابچہ احمدیت اور اسلام۔ ختم نبوت ادارہ طلوع اسلام مطبوعہ 1952ء)

کیا شیخ عطاء محمد مرزائی تھے؟

قادیانی ٹولے نے یہ الزام بھی لگایا ہے کہ شیخ عطاء محمد برادر بزرگ علامہ اقبال آخری عمر تک قادیانی رہے۔ اس کے ثبوت میں 1929ء کا ایک تحریر کردہ شیخ عطاء محمد کے خط کا عکس بھی شیخ عبدالماجد نے اپنی کتاب ''اقبال اور احمدیت'' میں بطور ثبوت شائع کیا ہے۔ اب ذرا شیخ عطاء محمد اور اس کے خاندان کے متعلق سن لیں کہ کون کون لوگ قادیانی عقیدہ رکھتے تھے۔ راقم کی تحقیق کے مطابق سوائے شیخ اعجاز احمد کے جس نے سب ججی کے لالچ میں آ کر 1931ء میں قادیانی عقیدہ قبول کیا' باقی اس کے تمام بہن بھائی اور ان کے والد شیخ عطاء محمد اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سنی العقیدہ تھے۔ یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ماشاءاللہ شیخ اعجاز احمد کی اپنی اولاد بھی قادیانیت سے تائب ہو چکی ہے اور وہ سب مرزا غلام احمد قادیانی کی خود ساختہ اور جھوٹی نبوت کے خلاف ہیں۔

علامہ اقبال نے شیخ اعجاز احمد کی ہمشیرہ وسیمہ مبارک (بڑے بھائی شیخ عطاء محمد کی بیٹی) کو دو سال کی عمر میں گود لیا تھا۔ اس کی شادی کا معاملہ شیخ اعجاز احمد نے چلایا اور ایک قادیانی عقیدہ رکھنے والے لڑکے سے اپنی بہن کی شادی کی خواہش کا اظہار کیا۔ اسی کے بارے میں شیخ عطاء محمد کے تحریر کردہ پوسٹ کارڈ کی فوٹو کاپی پیش کی گئی اور خط میں یہ ظاہر کیا گیا کہ شیخ عطاء محمد اپنی بیٹی کا رشتہ ایک قادیانی لڑکے سے کرنے پر رضامند تھا کیونکہ وہ خود مرزائی تھا۔ جب ایک بڑا بھائی شیخ اعجاز احمد قادیانی ہو' باپ شیخ عطاء محمد بھی مرزائی ہو اور لڑکا بھی صاحب روزگار اور انہی کے عقیدہ کا ہو تو پھر نکاح کیوں نہ ہو گیا؟ آخر رکاوٹ کیا تھی؟ جھوٹ کے سر پیر نہیں ہوتے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ شیخ اعجاز احمد چاہتا تھا کہ اس کی ہمشیرہ کا نکاح ایک قادیانی سے ہو جائے لیکن شیخ عطاء محمد اور اس کا خاندان چونکہ سنی العقیدہ تھے اس لیے یہ کام نہ ہو سکا۔ اس بچی کی شادی ڈاکٹر نظیر صوفی سے ہوئی جو ایک سنی العقیدہ شخص تھا اور اسی کا بیٹا خالد نظیر صوفی ہے جس نے اقبال پر ایک عمدہ کتاب ''اقبال درونِ خانہ'' کے عنوان سے لکھی۔ ماشاءاللہ تمام بچے بچیوں کے نکاح سنی العقیدہ لوگوں سے ہوئے اور کوئی شخص خاندان میں قادیانی نہیں۔ اس بات کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں ایک بات اور بھی تھی کہ شیخ عطاء محمد نے اس سلسلے میں علامہ اقبال کی رائے لی اور علامہ اقبال نے کہا ''بھائی صاحب اگر یہ میری اپنی بیٹی ہوتی تو میں ہرگز ہرگز یہاں شادی نہ کرتا۔'' یہ

1930ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہے اور شیخ اعجاز احمد پر ان دنوں قادیانیت کا بھوت سوار تھا جو ظفر اللہ قادیانی نے بطور رشوت سب جج کے شیخ اعجاز احمد کو اپنے پھندے میں گرفتار کر لیا تھا اور شیخ اعجاز احمد نے 1931ء میں قادیانی بیعت کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا۔ بہر حال یہ نکاح نہ ہو سکا کیونکہ سارا خاندان سنی العقیدہ تھا اس لیے شیخ اعجاز احمد کا بس نہ چل سکا۔ ممکن ہے کچھ عرصہ شیخ عطاء محمد جماعت احمدیہ سے منسلک رہے ہوں لیکن اصل بات تو انجام ہوتا ہے' انجام کار سوائے شیخ اعجاز احمد کے اور کوئی شخص مثلاً اس کا باپ' والدہ' بھائی اور بہنیں حتیٰ کہ شیخ اعجاز احمد کی اپنی اولاد بھی قادیانی نہیں ہیں تو پھر کس برتے پر علامہ اقبال کو قادیانی عقیدہ کا حامی تصور کیا جا رہا ہے۔ خدارا عقل کے ناخن لو۔

چہ دلاور است دُزدے کہ بکف چراغ دارد

ڈاکٹر نظیر صوفی' علامہ اقبال کے بھانجے اور شیخ عطاء محمد کے داماد ہیں' انھوں نے اپنی کتاب ''حیات و پیام اقبال'' اور ان کے بیٹے خالد نظیر صوفی نے اپنی کتاب ''اقبال درونِ خانہ'' میں یہ بات واضح طور پر بیان کی ہے کہ شیخ اعجاز احمد کے علاوہ اور کوئی گھر کا فرد قادیانی نہ تھا۔ ڈاکٹر نظیر صوفی کی کتاب ''حیات و پیام اقبال'' میں انھوں نے بتایا کہ شیخ عطاء محمد قادیانیت کے سخت خلاف تھے۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے قادیانیت کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی مہم چلائی ہوئی تھی۔ شیخ اعجاز احمد کے قریبی ساتھی سیّد حامد شاہ قادیانی کا بیٹا بھی قادیانیت سے تائب ہو گیا تھا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کا بیٹا مرزا بشیر الدین محمود ایک اخلاق باختہ انسان تھا۔ شیخ عطاء محمد' شیخ اعجاز احمد (بیٹے) کو مرتد خیال کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ قادیانیت سے تائب ہو جائے۔ ڈاکٹر نظیر صوفی لکھتے ہیں۔ ''یہ کہنا کہ علامہ اقبال کے خاندان کے کئی افراد نے مرزائیت قبول کر لی تھی، سراسر جھوٹ ہے۔ حضرت علامہ کے والد اور والدہ' چچا' چچی' بہنیں اور ان کی اولادیں سب ہی سنی مسلمان تھے اور سوائے ایک بھتیجے کے جو جج میں ترقی کے لیے چوہدری ظفر اللہ خان کے زیر اثر چھ بہن بھائیوں میں سے ''اکلوتا'' قادیانی بن گیا۔ (''حیات و پیام اقبال'' ڈاکٹر نظیر صوفی ص 5)

مندرجہ بالا اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال اور احمدیت کے مصنف شیخ عبدالماجد کا بیان اندرونِ خانہ کے بیانات کے مقابلہ میں نہایت بودا ہے اور کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

شیخ عطاء محمد کا جنازہ

شیخ عطاء محمد کی وفات پر ان کا جنازہ سنی العقیدہ مولوی سکندر خان امام مسجد جہانگیری نے پڑھایا اور وہ حضرت امام صاحب سے ملحقہ قبرستان میں سالوں پہلے اپنی زندگی میں بنائی ہوئی پختہ قبر میں دفن کیے گئے۔ جو شخص آخری عمر تک قادیانی رہا ہو وہ سالوں پہلے اپنی قبر کیسے مسلمانوں کے قبرستان میں

بنوا سکتا ہے۔ عبدالمجید سالک کے والد قادیانی تھے اس بناء پر ان کو سنی لوگوں کے قبرستان میں دفن ہونے سے روک دیا گیا۔ شیخ اعجاز احمد نے اپنے باپ کا جنازہ سنیوں کے ساتھ نہ پڑھا بلکہ ایک اور جنازہ قادیانیوں کے ساتھ پڑھا' شیخ اعجاز احمد کی والدہ کا جنازہ بھی مولوی سکندر خان نے پڑھایا چونکہ اپنے باپ کے جنازہ کا حشر دیکھ چکا تھا لہٰذا شیخ اعجاز احمد سنیوں کی نماز جنازہ میں شریک ہوا۔

شیخ عبدالماجد تقریباً سو فیصد حوالہ جات قادیانی لوگوں کے دے رہا ہے اور ثبوت کے ثقہ ہونے کے لیے ایسے شواہد بیکار ہوتے ہیں کیونکہ پختہ حوالہ وہ ہوتا ہے جو الزام لگانے والوں کی اپنی کتب' رسائل اور اخبارات سے ان کو دیا جائے۔ علامہ اقبال کا سارا کلام' تحریریں' خطوط اور عملی زندگی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ اور اس کا خاندان راسخ العقیدہ سنی تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مانتے تھے اور کسی جھوٹے من گھڑت اور جعلی نبی کو نہ مانتے تھے۔

شیخ اعجاز احمد کی پیدائش

شیخ اعجاز احمد کی اپنی پیدائش کے بارے میں ان کا بیان ملاحظہ کریں"...... پھر بھی یہ ہمارے خاندان کی حضرت بانیِ سلسلہ احمدیہ سے عقیدت کا ہی اثر تھا کہ "بے جی" جن کو ابا جان کے ہاں اولادِ نرینہ کی بڑی خواہش تھی، نے ابا جان سے حضرت صاحب کی دعا کے لیے خط لکھوایا کہ اللہ تعالیٰ انھیں اولادِ نرینہ عطا کرے اور جب 1899ء کے شروع میں راقم الحروف (شیخ اعجاز احمد) پیدا ہوا تو چچا جان (علامہ اقبال) نے نومولود کا نام "اعجاز احمد" رکھا۔ (مظلوم اقبال ص185 مطبوعہ 1985ء)

پھر لکھتے ہیں" ظاہر ہے علامہ نومولود کو احمد کی دعاؤں کا اعجاز سمجھتے تھے۔

(اقبال اور احمدیت ص34)

ہر دو مندرجہ بالا اقتباسات پڑھنے والا بخوبی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ علامہ اقبال جیسا عاشقِ رسول تو اعجاز احمد کے نام میں "احمد" کے لفظ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خیال کر سکتا تھا کیونکہ احمد اور محمد آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسم شریف ہیں۔ مرزا کا نام تو غلام احمد تھا۔ اگر "اعجازِ غلام احمد" نام ہوتا تو یہ جھوٹا پراپیگنڈا کیا جا سکتا تھا۔ کہیں کسی مصنف نے علامہ اقبال کی زندگی کے حالات لکھتے ہوئے اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ انھوں نے اعجاز احمد نام مرزا غلام احمد قادیانی کی عقیدت میں رکھا۔ یہ بات کبھی علامہ اقبال کی زندگی میں قادیانی ٹولہ لکھتا تو پھر انھیں علامہ کی طرف سے زبردست تردید کا سامنا کرنا پڑتا بلکہ ایسا لکھنے کی جسارت ہی نہ ہوتی۔

شیخ اعجاز احمد کا یہ بیان اپنے متعلق بغیر کسی حوالہ کے ہے۔ یہ عجیب اور مضحکہ خیز بات ہے کہ اپنی پیدائش پر اپنا بیان؟ کوئی تو خاندان کے بزرگوں میں سے اس بات کی تصدیق کرتا۔ شیخ اعجاز احمد کے

دوسرے دو بھائیوں کے نام امتیاز احمد اور مختار احمد ہیں جو غیر احمدی تھے۔ان کے نام کے پیچھے بھی احمد ہے۔ان کے متعلق جناب کا کیا خیال ہے؟

بے ڈھنگا ثبوت ملاحظہ ہو۔دعا کے لیے خط تو اعجاز احمد کے والد شیخ عطاء محمد (برادر بزرگ علامہ اقبال) سے لکھوایا جا رہا ہے اور نام علامہ اقبال رکھ رہے ہیں۔کم از کم نام کی تجویز تو شیخ عطاء محمد کی طرف سے ہونی چاہیے تھی جنھوں نے دعا کے لیے خط لکھا۔''دروغ گو را حافظہ نباشد۔''

شیخ اعجاز احمد کی ایک تحریر کے مطابق جو ان کے پاس محفوظ ہے ''اکتوبر 1904ء میں جب حضور سیالکوٹ تشریف لائے تو سید حامد شاہ کے ہاں فروکش ہوئے تو باوجود اس کے کہ میاں جی (شیخ نور محمد والدِ شیخ عطاء محمد) جماعت سے علیحدگی اختیار کر چکے تھے' بے جی (امام بی بی والدۂ شیخ عطاء محمد) مجھے دعا کی غرض سے حضرت صاحب کے پاس لے گئیں۔''

خدا کی قدرت ملاحظہ ہو مندرجہ بالا اقتباس سے سچائی خود بخود ظاہر ہو گئی۔یہ تو دوسرا معاملہ ہے کہ بے جی اعجاز کو مرزا غلام احمد قادیانی کے پاس دعا کی غرض سے لے گئیں کیونکہ یہ اعجاز کا بیان بغیر ثبوت کے ہے لیکن یہ بات تو اس بیان سے صاف ظاہر ہو گئی کہ ''میاں جی جماعت سے علیحدگی اختیار کر چکے تھے۔دوسری بات یہ کہ اعجاز کے والد شیخ عطاء محمد کے گھر بھی فروکش نہ ہوئے۔اس سے یہ ثابت ہوا کہ وہ بھی قادیانی نہ تھے۔شیخ نور محمد قادیانی عقیدہ سے متنفر نظر آتے ہیں۔لہٰذا دعا کے لیے دادی کا سہارا لیا گیا کہ وہ چوری چھپے دعا کے لیے اعجاز کو لے گئیں۔

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی

دیکھیں کہ وہ کس طرح بدنام کرنے میں اپنی دادی کو داؤ پر لگا رہے ہیں۔بقول قادیانی روایت علامہ اقبال 1902ء میں بیعت نہیں کرتا۔میاں جی کی عقیدت کا گراف بھی گر گیا تھا اور میاں جی جماعت سے علیحدگی اختیار کر چکے تھے۔مرزا قادیانی کو علامہ اقبال کے خاندان کے کسی گھر پر اترنے کی ہمت نہیں ہوتی۔پھر بھی شیخ اعجاز مُصر ہے کہ دادی صاحبہ دعا کروانے کے لیے مرزا قادیانی کے پاس لائیں۔جب ایسے حالات ہوں تو پھر پردہ نشینوں کو میدان میں لایا جاتا ہے۔ان حالات کے ہوتے ہوئے بھی شیخ عبدالماجد لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال 1931ء تک احمدیہ جماعت سے منسلک رہے' حالانکہ جب مرزا غلام احمد قادیانی کی واضح نبوت کا دعویٰ سامنے آیا تو 1914ء میں خود ان کی جماعت انتشار کا شکار ہو گئی اور دو گروپوں (قادیانی گروپ اور لاہوری گروپ) میں تقسیم ہو گئی۔جب قادیانی لوگ بھی نبوت کے دعویٰ سے بدک گئے اور انھوں نے 1914ء میں لاہوری احمدی گروپ بنا لیا جو صرف غلام

احمد قادیانی کو مجدد مانتے ہیں تو علامہ اقبال جو عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے ان کو کس طرح 1931ء تک مرزا غلام احمد قادیانی کا عقیدت مند تصور کیا جا رہا ہے۔ افسوس صد افسوس ایسی ناقص عقل پہ ماتم کرنا چاہیے۔

شیخ اعجاز احمد کی گارڈین شپ

قادیانی گروپ بڑے فخریہ انداز میں یہ بات پیش کرتا ہے کہ علامہ اقبال نے شیخ اعجاز احمد (قادیانی) کو اپنے بچوں کا گارڈین بنایا اور اسے "صالح آدمی" بھی لکھا۔ "اقبال اور احمدیت" کے مصنف عبدالماجد نے لکھا ہے کہ علامہ اقبال نے سر راس مسعود کو 10 جون 1937ء کو ایک خط میں لکھا "شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے نہایت صالح آدمی ہے لیکن خود بہت عیال دار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو گارڈین مقرر کر دوں۔" (اقبال نامہ 1945ء ص 386)

لیکن سر راس مسعود نے لکھا کہ وہ لاہور سے دور بھوپال میں رہتا ہے لہٰذا اس کی معذدری پیش کرنے کی وجہ سے شیخ اعجاز احمد کی گارڈین شپ (ولایت) قائم رہی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کو آخر کیا ضرورت محسوس ہوئی کہ انھوں نے سر راس مسعود کو خط لکھا کہ وہ شیخ اعجاز احمد جو کہ ان کا بھتیجا تھا، کی جگہ گارڈین شپ قبول کرے۔ ایک طرف اسے صالح آدمی بھی کہا جا رہا ہے اور دوسری طرف چار مقرر کردہ گارڈین میں سے اپنے نہایت قریبی شخص کی ولایت کی تبدیلی کی خواہش بھی کی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ صرف اور صرف ان کا قادیانی ہونا ہو سکتا ہے کیونکہ قادیانیوں نے شدومد کے ساتھ عامۃ المسلمین کو کافر کہنا شروع کر دیا تھا۔

ادھر کشمیر میں تبلیغ کا سلسلہ جاری کر دیا گیا تھا' لہٰذا علامہ اقبال کے ذہن میں ان کے خلاف شدت پیدا ہوئی' پھر اپنی صحت سے بھی خاصے مایوس ہو چکے تھے اس لیے انھوں نے خیال کیا ہو گا کہ یہ مسئلہ بھی ان کی زندگی میں حل ہو جائے لیکن خرابی صحت اور سر راس مسعود کے انکار نے مسئلہ جوں کا توں رہنے دیا۔

علامہ اقبال نے اگر شیخ اعجاز کو صالح آدمی لکھا تو اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ اس کو بطور قادیانی کے سراہتے تھے۔ ایک شخص قادیانی ہوتے ہوئے بھی صالح ہو سکتا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت سے پہلے قریشِ مکہ نے امین اور صدیق کے القابات سے نواز رکھا تھا جو نبوت ملنے کے بعد بھی قائم رہے۔ اسی طرح ہجرت کے وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لوگوں کی امانتیں موجود تھیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بوقتِ ہجرت حضرت علیؓ کے سپرد کر دیں۔ کفار مکہ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر ایمان نہ لائے تھے لیکن ان کا یہ راسخ عقیدہ تھا کہ ان کی

امانتیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس محفوظ رہیں گی۔ ''سو عظیم انسان'' میں عیسائی مصنف نے درجہ بندی کرتے وقت آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام نامی نمبر ایک پر لکھا تو کیا اس طرح کرنے سے وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا قائل ہو گیا تھا؟

خود شیخ اعجاز احمد کے ماموں اہل حدیث تھے اور وہ ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ بہت نیک آدمی تھے تو کیا ایسا لکھنے سے شیخ اعجاز اہل حدیث ہو جاتے ہیں؟ اسی طرح علامہ اقبال شیخ اعجاز احمد کو ایک صالح آدمی تو خیال کرتے تھے لیکن دینی لحاظ سے متنفر تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ سر راس مسعود کو تبدیلی ولایت کے لیے خط نہ لکھتے۔ اگر علامہ اقبال کی زندگی وفا کرتی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی اور بندہ تلاش کرتے لیکن ایسا کرنے کی مہلت نہ ملی۔

گارڈین شپ کے انتخاب میں تبدیلی کا خیال

اقبال اور احمدیت کے مصنف شیخ عبدالماجد ص 48 پر لکھتے ہیں کہ ''سال ہا سال تک احمدیت کا مداح رہنے کے بعد علامہ اقبال کا احمدیت کے خلاف پہلا مضمون مئی 1935ء میں شائع ہوا۔ اس سے تقریباً 5 ماہ بعد علامہ نے اپنے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کو جو کچھ عرصہ قبل بیعت کر کے سلسلہ احمدیہ میں داخل ہو چکے تھے ایک وصیت نامہ کے ذریعے اپنے بچوں کے اولیاء (گارڈین) میں شامل کر لیا۔''

پہلی بات تو یہ ہے کہ علامہ اقبال کبھی بھی قادیانیت اور احمدیت کے مداح نہ تھے۔ 1902ء میں ہی علامہ اقبال نے انجمن حمایتِ اسلام کی روداد (1902ء) کے ص 32 پر ایک نظم لکھی جس کا یہ شعر قابلِ غور ہے:

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز شمع نور عرفاں کردہ ای

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ علامہ اقبال قادیانیوں کی نبوت کے کبھی بھی مداح نہ تھے۔ آپ نے ہر موقع پر قادیانیت کے خلاف بیانات دیے۔ کبھی کبھی اگر علامہ اقبال نے اس جماعت کی تعریف بھی کی تو صرف اور صرف مسلمان سمجھ کر۔ ان کے درپردہ عزائم کا علم نہ تھا۔ جب واشگاف الفاظ میں نبوت کا دعویٰ کر دیا گیا تو علامہ اقبال کھل کر سامنے آ گئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریا آبادی، سیّد سلیمان ندوی اور ان جیسے اور علماء اور اسی طرح علامہ اقبال اور ان کے والدین نے بھی مرزا غلام احمد قادیانی کی تعریف کی لیکن ایک مبلغ اسلام سمجھ کر نہ کہ ایک قادیانی نبی کی حیثیت سے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ہر مقام پر علامہ اقبال نے جو عاشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے کسی بھی جھوٹی اور جعلی نبوت کے خلاف اشعار و تحریروں میں شدید ردعمل کا اظہار کیا۔

اب اس سوال پر کہ علامہ اقبال نے جانتے ہوئے شیخ اعجاز احمد کو بچوں کا گارڈین کیوں مقرر کیا جبکہ وہ قادیانی تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ علامہ اقبال نے 13 اکتوبر 1935ء کو بچوں کے متعلق وصیت نامہ لکھوایا اور گارڈین مقرر کیے۔ علامہ اقبال پر بیماریوں نے حملہ کر دیا تھا۔ ضیق النفس میں مبتلا تھے اور آنکھوں کی بینائی سے محروم ہو رہے تھے۔ آپ نے مناسب خیال کیا کہ بچوں کی مناسب نگہداشت کے لیے گارڈین مقرر کیے جائیں۔ لہٰذا انھوں نے ان لوگوں کو گارڈین مقرر کیا جو بہت قریبی تھے اور جن پر علامہ اقبال کو بھروسہ تھا۔ پہلا گارڈین طاہر الدین کو مقرر کیا گیا جو علامہ اقبال کا کئی سالوں سے منشی تھا۔ نمبر 2 پر چوہدری محمد حسین کو منتخب کیا جو پریس برانچ کا سپرنٹنڈنٹ تھا اور علامہ اقبال کا پرانا شناسا اور دوست تھا۔ نمبر 3 پر شیخ اعجاز احمد کا نام آتا ہے جو رشتہ میں علامہ اقبال کا سگا بھتیجا تھا۔ نمبر 4 پر عبدالغنی تھا جو علامہ اقبال کے بچوں کے حقیقی ماموں تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے بڑے لوگوں کا انتخاب نہ کیا بلکہ ان لوگوں کا جن پر ان کو بھروسہ تھا۔

یہ خیال کہ علامہ اقبال نے قادیانیوں کے خلاف مہم 1935ء میں جا کر کی' درست نہیں ہے۔ علامہ اقبال مسلمانوں اور اسلام کے خلاف کوئی غلط اقدام برداشت نہ کرتے تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ جولائی 1931ء کو آل انڈیا کشمیر کمیٹی بنائی گئی جس کا پہلا صدر مرزا بشیر احمد محمود کو منتخب کیا گیا اور سیکرٹری عبدالرحیم درد بنے۔ دونوں اصحاب قادیانی تھے لیکن کمیٹی قائم کرتے وقت چونکہ خیال تھا کہ یہ ایک عارضی تنظیم ہے لہٰذا کوئی دستور اور قواعد و ضوابط وضع نہ کیے گئے۔ اس طرح صدر اور سیکرٹری کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ لہٰذا انھوں نے اس پلیٹ فارم کو اپنی تبلیغ کا مرکز بنایا اور کشمیر کمیٹی کی آڑ میں اپنے مبلغین کشمیر بھیجنے شروع کر دیے۔ جب علامہ اقبال کو اس بات کا علم ہوا تو انھوں نے اَور ارکان کے ساتھ مل کر آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے لیے قوانین و ضوابط وضع کرنے پر زور دیا۔ احمدی ارکان کو یہ تجویز منظور نہ تھی اور انھوں نے مرزا بشیر الدین کے اختیار پر کنٹرول کو ہتک محسوس کیا لہٰذا 17 مئی 1933ء کو مرزا بشیر الدین محمود نے کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد متفقہ طور پر علامہ اقبال کو آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا صدر منتخب کر لیا گیا۔

جب اقبال نے کشمیر کمیٹی کے دستور کا مسودہ تیار کر کے اجلاس میں پیش کیا تو احمدی ارکان نے ان کی مخالفت کی اور انھوں نے یہ تاثر بھی دیا کہ وہ مسلمانوں کی کسی تنظیم کو نہیں مانتے۔ وہ صرف اور صرف اپنے امیر کی پیروی کرتے ہیں۔ ان حالات میں علامہ اقبال نے 20 جون 1933ء کو کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اگر اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ایک الگ کشمیر کمیٹی بنائیں جن میں سارے ارکان مسلمان ہوں' انھوں نے 20 جون 1933ء کو

ایک بیان دیا۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''بدقسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقے (قادیانیت) کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں۔ مجھے ایسے شخص سے ہمدردی ہے جو کسی روحانی سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی مقبرے کا مجاور یا کسی نام نہاد پیر کا مرید بن جائے۔'' دوسرا بیان اسی سلسلے میں 2 اکتوبر 1933ء کو جاری کیا جس میں صدارت سے اپنی دست کشی کا سبب بیان کرتے ہوئے قادیانی امت کے پوشیدہ اغراض پر اشارات کیے کہ تحریکِ کشمیر کی آڑ میں اس نے اپنا دام تزویز بچھا کر مسلمانوں کو شکار کرنا چاہا۔اس کے بعد احمدیوں نے تحریکِ کشمیر کے نام سے ایک نئی جماعت قائم کی اور اقبال کو اس کی صدارت کی پیش کش کی لیکن اقبال نے قبول نہ کی اور اپنے ایک بیان مورخہ 2 اکتوبر 1933ء میں یوں فرمایا ''قادیانی'' ہیڈ کوارٹرز کی طرف سے ابھی کوئی واضح اعلان جاری نہیں ہوا کہ اگر قادیانی حضرات مسلمانوں کی سیاسی تنظیم میں شامل ہو گئے تو ان کی وفاداریاں منقسم نہیں ہوں گی۔دوسری طرف واقعاتی طور پر یہ ظاہر ہو گیا کہ جسے قادیانی پریس ''تحریکِ کشمیر'' کے نام سے پکارتا ہے اور جس میں بقول قادیانی اخبار ''الفضل'' مسلمانوں کو محض اخلاقی طور پر شامل ہونے کی اجازت دی گئی ہے، ایک ایسی تنظیم ہے جس کے مقاصد اور محرکات آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے مختلف ہیں۔''

1931ء کو جب سر ظفر اللہ خان کو مسلم لیگ کا صدر بنایا گیا تو بقول سیّد شمس الحسن دہلی کے مسلمانوں نے شدید احتجاج اور مظاہرہ کیا کیونکہ وہ سر ظفر اللہ کو احمدی ہونے کی وجہ سے غیر مسلم خیال کرتے تھے۔'' 1929-1930ء تک لاہوری احمدی انجمن حمایتِ اسلام کی مجلسِ انتظامیہ کے رکن رہے اور انجمن کے اجلاسوں میں بحیثیت مقرر مدعو کیے گئے۔سر ظفر اللہ خان ایک مسلم حلقہ سے منتخب ہو کر پنجاب کونسل کے ممبر بنے اور بعد میں مسلم لیگ کے صدر چنے گئے۔'' (زندہ رود' ص 585)

لیکن جب علامہ اقبال کو یہ بات معلوم ہوئی کہ تحریکِ آزادی کشمیر کی آڑ میں قادیانیوں نے اپنے مبلغین کے ذریعے پونچھ میں کافی بھولے بھالے کشمیریوں کو قادیانیت کے جال میں پھنسا لیا تھا تو انھوں نے زبردست ردعمل کا اظہار کیا۔اب وقت تھا کہ قادیانیوں کا محاسبہ کیا جائے۔لہٰذا علامہ اقبال نے ایک بیان ''قادیانی اور جمہور مسلمان'' کے عنوان سے ''سٹیٹس مین'' اخبار میں 14 مئی 1935ء کو دیا۔اس بیان کے بعد علامہ نے ایک اور وضاحتی بیان دیا اور اس میں یہ الفاظ کہے ''میری رائے میں حکومت کے لیے بہترین طریقہ کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرے۔یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان ان سے ویسی رواداری سے کام لے گا جیسے وہ باقی مذاہب کے معاملہ میں اختیار کرتا ہے۔'' (حرفِ اقبال۔لطیف احمد شیروانی ص 119)

اس مضمون پر سٹیٹس مین نے اداریہ لکھا جس کا جواب علامہ اقبال نے 10 جون 1935ء کو اخبار مذکورہ میں دیا۔

جواہر لال نہرو نے قادیانیوں کی حمایت میں ماڈرن ریویو کلکتہ میں تین مضمون لکھ مارے۔ علامہ اقبال نے علالت کے باوجود ایک طویل وضاحتی مضمون ''اقبال اور احمدیت'' کے عنوان سے لکھا جو 19 جنوری 1936ء کو طبع ہوا۔

ازیں بعد الیکشن کا زور آن پڑا۔ قائداعظم کو یونینسٹ مسلمانوں نے بڑا مشکل وقت دیا۔ قائداعظم یکم مئی 1936ء کو علامہ اقبال کی رہائش گاہ (جاوید منزل) لاہور تشریف لائے۔ علامہ اقبال سے تفصیلی گفتگو کے بعد دونوں لیڈر ''جداگانہ انتخاب'' کے نظریہ پر ہم آہنگ تھے۔ علامہ اقبال نے قائداعظم کی معاونت کی حامی بھر لی۔

قائداعظم نے علامہ اقبال کو 6 مئی 1936ء کو پہلا خط لکھا جس کے جواب میں علامہ اقبال نے 23 مئی 1936ء کو پہلا جوابی خط لکھا۔ اس طرح خطوط کے ذریعے علامہ اقبال قائداعظم کو مشورے فراہم کرتے رہے۔ علامہ اقبال نے قائداعظم کو 13 خطوط لکھے اور آخری خط 20 نومبر 1936ء کو لکھا گیا۔ مسلم لیگ کی ضلعی شاخیں حتیٰ کہ دیہاتوں تک ان کا پھیلاؤ خاصا کام تھا جو علامہ اقبال نے کیا۔ قائداعظم نے صوبہ پنجاب مسلم لیگ کی صدارت بھی علامہ اقبال کو سونپ دی۔ صحت خراب ہونے کے باوجود علامہ کا جذبہ کام کراتا رہا۔

مندرجہ بالا مصروفیات اور خرابی صحت کے دوران علامہ اقبال کو خیال پیدا ہوا کہ بچوں کے مستقبل کے بارے میں کچھ سوچا جائے۔ اسی دوران گارڈین نمبر 4 عبدالغنی جو بچوں کے حقیقی ماموں تھے ان کا انتقال بھی ہوگیا۔ لہٰذا علامہ اقبال نے خیال کیا کہ ان کی جگہ امیر الدین کو گارڈین مقرر کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ گارڈین شپ کا نئے سرے سے کام نپٹایا جائے لہٰذا انھوں نے سوچا کہ گارڈین نمبر 3 شیخ اعجاز احمد جو کہ ان کا بھتیجا تھا لیکن قادیانی تھا اور پھر قادیانیوں نے ''تحریکِ کشمیر'' کی آڑ میں جو گل کھلائے تھے، علامہ اقبال کے زخم تازہ تھے۔ ان حالات کے تحت علامہ اقبال نے 10 جون 1937ء کو سر راس مسعود کو ایک خط بھوپال بھیجا کہ وہ گارڈین شپ قبول کرے۔ اس نے 16 جون 1937ء کو خط کا جواب دیا اور گارڈین شپ قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ (نقل ہر دو خطوط دی جا رہی ہیں) ویسے سر راس مسعود نے یہ بھی لکھا کہ وہ بچوں کی دیکھ بھال اپنے بچوں کی طرح کریں گے اور اگر کوئی مالی مشکل پیش آئی تو اس کو اطلاع دی جائے وہ بچوں کے لیے وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں گے جو کوئی شخص اپنے بچوں کے لیے کرتا ہے۔ لیکن وہ دور ہونے کی وجہ سے گارڈین شپ کی ذمہ

داری نہ نبھا سکیں گے۔

چونکہ سرراس مسعود نے گارڈین شپ قبول کرنے سے معذرت کر لی تھی اور پھر علامہ اقبال ملکی مسائل میں آخری دم تک الجھے رہے اور ان کی زندگی نے بھی مہلت نہ دی کہ وہ اپنی اس خواہش کو پورا کرتے۔ سرراس مسعود کو خط لکھنے کے دس ماہ بعد علامہ اقبال اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے اور سرراس مسعود علامہ اقبال سے پہلے وفات پا گئے۔ باقی رہا یہ اعتراض کہ علامہ اقبال نے شیخ اعجاز احمد کو صالح بھی کہا اور گارڈین شپ سے فارغ بھی کرنا چاہا۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ علامہ اقبال نے شیخ اعجاز احمد کو صالح لکھا تھا مگر دین دار اور مسلمان تو نہ لکھا تھا۔

ایک اور شہادت ملاحظہ کریں:

جسٹس جاوید اقبال اور منیرہ کی آیا مس ڈورس احمد نے اپنی کتاب "**Iqbal as I Know**" میں لکھا ہے کہ "علامہ اقبال شیخ اعجاز احمد کو بہت عزیز رکھتے تھے مگر ان کے قادیانی ہو جانے کی وجہ سے ان سے سخت نالاں تھے اور وہ اپنے بچوں کے سرپرستوں میں سے بھی انھیں نکال کر کسی اور متبادل کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ علامہ نے ان سے متعدد بار اپنے اس کرب کا اظہار کیا اور شیخ اعجاز کے قادیانی ہو جانے کے عمل کو ہمیشہ مکمل طور پر ناپسند کیا۔

(Iqbal as I Know by Miss Doras Ahmad)

ان مندرجہ بالا بیانات سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ علامہ اقبال شیخ اعجاز احمد سے بدعقیدہ ہونے کی بناء پر خوش نہ تھے۔ اسی واسطے انھوں نے کوشش کی کہ اسے گارڈین شپ سے علیحدہ کر دیں لیکن ان کی صحت کی خرابی اور عدم دستیابی معقول شخص یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ علامہ اقبال نے مس ڈورس احمد کو عزیز جانا اس لیے کہ وہ ایک سچے نبیؐ کی پیروکار تھی اور اسے اپنے بچوں کی تربیت کے لیے پسند کیا لیکن شیخ اعجاز احمد کو اس لیے گارڈین شپ سے مسترد کر دینا چاہا کہ وہ ایک جھوٹے نبی کا پیروکار تھا۔ علامہ نے شیخ اعجاز کو ناپسندیدہ اس لیے قرار دیا کہ قادیانی ہونے کی بناء پر عقیدہ کے لحاظ سے اس کی حیثیت مشتبہ تھی۔

علامہ اقبال نے احمدیوں کے خلاف 1935ء سے پہلے شدت سے محاسبہ کیوں نہ کیا؟

شیخ عبدالماجد لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال نے 1935ء سے پہلے کیوں قادیانی جماعت کا محاسبہ نہ کیا؟ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، علامہ اقبال نے مختلف مواقع پر مثلاً 1902ء، 1904ء، 1910ء اور 1916ء میں جب بھی قادیانی عقائد کی بات سامنے آئی، اس جماعت سے شد و مد کے ساتھ اختلاف کیا۔ ویسے مسلمانوں کے مفادِ عامہ کا جہاں بھی موقع آیا علامہ نے بلاتفریق مذہب و عقیدہ اشتراکِ عمل

میں حصہ لیا۔ 3 مارچ 1927ء کو حبیبیہ ہال لاہور میں امام جماعتِ احمدیہ نے جو لیکچر دیا چونکہ وہ مسلمانوں کے حق میں تھا' اس کو سراہا۔ پھر برصغیر میں اسلامی مفادات کے تحفظ کے لیے ایک مسلم بورڈ کے قیام کی تجویز زیرِ غور تھی۔ اس کی صدارت کے لیے علامہ اقبال نے 5 ستمبر 1930ء کو ایک خط مرزا بشیر الدین محمود کے پرائیویٹ سیکرٹری کو لکھا کہ آپ کی جماعت چونکہ منظم ہے اس لیے مرزا صاحب کا نام اس مقصد کے لیے لیا گیا۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے علامہ اقبال جو اچھی بات دیکھتا تھا، اس کو سراہتا تھا۔ مذہب اور سائنس پر جو لیکچر دیا گیا اس میں مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ تھا تو علامہ کیوں اعتراض کرتے۔ اسی طرح اسلامی مفادات کے لیے مسلم بورڈ کے قیام میں بھی کوئی قباحت نہ تھی کیونکہ یہ مسلمانوں کے حقوق کے لیے ایک مشترکہ کوشش تھی۔

کیا میاں نور محمد احمدی تھے؟

اس بارے میں شیخ اعجاز احمد اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' کے صفحہ 185-184 پر یوں رقمطراز ہے:

''میاں جی کے متعلق ''زندہ رود'' میں لکھا ہے کہ یہ کہنا درست نہیں کہ اُن (علامہ اقبال) کے والد احمدی تھے'' شیخ اعجاز احمد لکھتے ہیں کہ ابا جان تو سلسلہ احمدیہ میں شامل ہونے والے ابتدائی حضرات میں سے تھے اور میاں جی جماعت میں شامل ہو گئے تھے۔ 1902ء میں جب ہماری منجھلی پھوپھی طالع بی بی کا انتقال ہوا تو احمدی حضرات ان کے جنازے میں شریک نہ ہوئے۔ اس لیے جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ احمدی نہ تھے نامکمل بات ہوگی۔ ہاں یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ ابتدا میں جماعت میں شامل ہو گئے تھے لیکن 1902ء میں جماعت سے الگ ہو گئے۔'' (مظلوم اقبال' ص 184-185)

شیخ اعجاز احمد کے بیان کے مطابق ''جنازے کے مسئلے پر اختلاف کی وجہ سے میاں نور محمد نے جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ایک تو یہ وجہ بھی تھی لیکن علامہ اقبال نے 1902ء میں ان سے بیعت لینے کے جواب میں جو اشعار لکھے وہ بھی تیر بہدف ثابت ہوئے اور قادیانیت کا علامہ اقبال کے گھر میں قلع قمع ہو گیا۔''

مندرجہ بالا بیانات شیخ اعجاز احمد کے ہیں جو اقبال کے تمام خاندان میں واحد قادیانی تھا وہ گھر کا بھیدی بھی ہے اور قادیانی بھی۔ اس کے مندرجہ بالا بیانات کے بعد کسی اور ثبوت کی گنجائش نہیں رہتی۔

❁......❁......❁

کلیم اختر

قادیانی اور کلامِ اقبال میں تحریف

واہ سعدی دیکھ لی گندہ دہانی آپ کی
خوب ہو گی مہتروں میں قدر دانی آپ کی

جماعت احمدیہ کے بعض مصنفین یہ کہتے ہیں، کہ متذکرہ صدر شعر اس نظم کا ہے جو حضرت علامہ اقبال نے اس دور کے ایک مسلمان مبلغ مولوی سعد اللہ لدھیانوی (نو مسلم) کے اس مضمون کے جواب میں لکھی تھی جو اس نے مرزا غلام احمد قادیانی کے دعویٰ نبوت کے خلاف لکھا تھا۔ احمدی حضرات اس نظم کو علامہ اقبال کی مرزا غلام احمد قادیانی سے عقیدت کی سند کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ نظم علامہ اقبال کے کسی بھی مجموعہ کلام میں شامل نہیں ہے۔ البتہ وہ اشعار درج ہیں جو مرزا قادیانی کی نبوت کے خلاف ہیں۔

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

یا۔

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

یا پھر۔

پنجاب کے اربابِ نبوت کی شریعت
کہتی ہے کہ یہ مومنِ پارینہ ہے کافر

....

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

بہر حال اب اس نظم کے نزول ہونے کی سچی کہانی سنیے جو علامہ اقبال کے ایک ہم عصر اور ہم عمر بزرگ شاہ صاحب مرحوم نے راقم الحروف کو چند برس پیشتر اپنے ہاتھ سے لکھ کر ارسال کی تھی۔ اس واقعہ کی تصدیق ڈاکٹر جمشید علی راٹھور ایم اے ایم او ایل پی ایچ ڈی سابق صدر شعبہ علوم شرقیہ مرے کالج سیالکوٹ نے بھی کی تھی حالانکہ ڈاکٹر جمشید علی راٹھور مرحوم تا مرگ حضرت علامہ سے رقیبانہ جذبات رکھتے تھے۔ دونوں مولوی میر حسن کے شاگرد تھے اور سکول اور کالج میں ہم جماعت بھی تھے' اور دونوں کشمیری برادری سے تعلق رکھتے تھے...... خیر آمدم بر سر مطلب...... شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

''علامہ اقبال پرلے درجے کے حاضر جواب تھے۔ ایک صاحب شیخ محمد الدین نہایت محدود تعلیم یافتہ اکثر اپنی عاشق مزاجی کا مظاہرہ بڑے فخر سے کیا کرتے تھے اور غلط ملط شعر پڑھا کرتے تھے۔ اقبال صاحب ان سے اکثر مذاق کیا کرتے تھے اور شیخ محمد الدین کے برا بھلا کہنے پر محض ہنس دیا کرتے تھے۔ شیخ محمد الدین ایک آنکھ سے کانے تھے۔ ایک دفعہ چند دوستوں میں دونوں صاحبان بیٹھے ہوئے ادھر ادھر کے شعر پڑھ رہے تھے۔ شیخ محمد الدین اقبال صاحب کے بارے میں کہنے لگے۔

سن تو لی ہم نے بہت گندہ دہانی آپ کی
مہتروں میں خوب ہوگی قدر دانی آپ کی

اقبال صاحب ہنس دیے اور معاً فرمایا:

کانا بڑا دوزخی مانیو تم بالیقین
لکھا ہے قرآن میں کان من الکافرین

حقیقت یہ ہے کہ وہ دور علامہ اقبال کے بچپن اور شوخی کا تھا اور اس عمر میں کالج کے اکثر طلبا شعر خوانی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی ہجو اور قدح میں شعر کہتے ہیں۔ شعروں پر گرہ لگاتے ہیں اور اچھے خاصے اشعار کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ مقصد شعر و ادب کی تضحیک نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی کی توہین مقصود ہوتی ہے البتہ یہ شغل اور محض ظرافت ہوتی ہے۔

اسی طرح علامہ اقبال نے جب ایف اے کے طالب علم تھے تو وہ چند شعر کہے اور وہ بھی محض ظریفانہ انداز میں۔ علامہ اقبال کی ایسی شعری نوک جھونک جلوہ سیالکوٹی سے بھی رہتی تھی۔ جلوہ کو اس وقت کا استاد امام دین گجراتی یا یاسین خاکی' جموی ثم سیالکوٹی کہہ سکتے ہیں...... جلوہ کون تھا؟ اس کے بارے میں شاہ صاحب نے لکھا......

''..........سیالکوٹ میں ایک صاحب میراں بخش اپیل نویس تھے جو شاعر تھے اور جلوہ تخلص کرتے تھے۔ان کی عادت تھی کہ خواہ مخواہ ہر مجلس میں شریک ہو جاتے اور سب سے پہلے خود بخود سٹیج پر چڑھ جاتے خواہ کوئی پسند کرے یا نہ کرے، اپنی نظم سنانے لگ جاتے۔ان دنوں اقبال بالکل نوخیز تھے۔ شعر کہنے کا شوق تھا۔کسی بات پر جلوہ نے انھیں ٹوکا۔لڑکپن تھا اور جلوہ صاحب کی ہجو لکھ دی۔لیکن شعر تو کئی تھے مگر ایک دو یاد رہ گئے ہیں۔واضح ہو کہ جلوہ اچھے خاصے افیون کا پارسل تھے یعنی کچھ کالی رنگت کے تھے۔ایک پاؤں سے کچھ لنگڑے تھے۔(یعنی مرزا قادیانی جیسی شباہت خصوصیات۔مرتب) بچپن کا زمانہ تھا جلوہ صاحب کی شان میں شعر کہہ دیا۔

آ نہ جانا نزدِ انجن جلوہ صاحب دیکھنا
ڈال لیں انجن میں نہ پتھر کا کوئلہ جان کر

ایک اور موقع پر جلوہ صاحب کے متعلق فرمایا:

ہے بوٹ لُک کیا ہوا چہرہ حضور کا
جیسے نکل رہا ہے جی دھواں تنور کا

چنانچہ جماعت احمدیہ کے مصنفین نے علامہ اقبال کے بچپن کے ظریفانہ اشعار کو مرزا غلام احمد قادیانی کی عقیدت سے تعبیر کیا ہے حالانکہ انھیں احمدیہ تحریک کے بارے میں ان اشعار کو پیش نظر رکھنا چاہیے جو کثرت سے ان کے مجموعہ ہائے کلام میں ملتے ہیں۔

نقاش

قادیانیت اور اقبالؒ

(1)

''یاد رہے کہ یہ حوا کا گناہ تھا کہ براہِ راست شیطان کی بات کو مانا اور خدا کے حکم کو توڑا اور سچ تو یہ ہے کہ حوا کا نہ ایک گناہ بلکہ چار گناہ تھے۔ ایک یہ کہ خدا کے حکم کی بے عزتی کی اور اس کو جھوٹا سمجھا۔ دوسرا یہ کہ خدا کے دشمن ابدی لعنت کے مستحق اور جھوٹ کے پتلے شیطان کو سچا سمجھ لیا۔ تیسرا یہ کہ اس نافرمانی کو صرف عقیدہ تک محدود نہ رکھا بلکہ خدا کے حکم کو توڑ کر عملی طور پر ارتکابِ معصیت کیا۔ چوتھا یہ کہ حوا نے نہ صرف آپ ہی خدا کا حکم توڑا بلکہ شیطان کا قائم مقام بن کر آدم کو بھی دھوکا دیا۔ تب آدم نے محض اس کی دھوکا دہی سے وہ پھل کھایا جس کی ممانعت تھی۔ اسی واسطے حوا خدا کے نزدیک سخت گناہگار ٹھہری مگر آدم معذور سمجھا گیا۔''

(تحفہ گولڑویہ' ص174)

مولانا عبدالحنان نائب ناظم جمعیۃ العلماء پنجاب کی نظر سے جب وہ مرصع قصیدہ گزرا جو مرزا قادیانی آنجہانی نے ابوالبشر حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی رفیقہ حیات کی شان میں بہ صفتِ غیر منقوط تصنیف فرمایا ہے تو بے اختیار پکار اٹھے کہ الٰہی تیری غیرت کو کیا ہوا۔ لوگ تجھ پر بہتان باندھتے ہیں۔ جو تو نے نہیں کہا' وہ تجھ سے منسوب کرتے ہیں اور تو ہے کہ ان کو اور ان کے لگے بندھوں کو اپنی بخششِ شدید کی آتشیں زنجیروں میں نہیں جکڑتا۔ آدم و حوا علیہما السلام کا قصہ اپنی کلک قدرت سے سپردِ لوحِ محفوظ کرتے وقت تو یہ لکھتا ہے کہ **فازلهما الشيطان عنها فاخرجهما مما كانا فيه.** (البقرہ:36)

(پس شیطان نے ان دونوں کو پھسلا کر جنت سے نکال دیا)

مگر مرزائے قادیان تجھے یہ کہہ کر جھٹلاتا ہے کہ آدم کو تیری جنت سے نکالنے والا ابلیس لعین نہ

تھا بلکہ اس مردودِ ازلی کی قائم مقام حوا تھی۔ پھر اے رب کعبہ تو ہی بتا کہ ہم تیرے کلام کو سچ سمجھیں یا غلام احمد قادیانی کے فرمودہ کو۔

مرزائے قادیانی کی امت بڑے فخر سے کہا کرتی ہے کہ ہمارے نبی نے قرآن کی جو تفسیر کی ہے وہ طبری اور رازی کے فرشتوں کو بھی نہ سوجھی ہو گی لیکن جناب کی وسعت نظر ملاحظہ ہو کہ حضرت حوا علیہا السلام کو اپنی عادت کے مطابق گالیاں دیتے وقت کلام مجید کی اس آیت کو آپ نے نظری فرما دیا کہ:

فتلقی ادم من ربه کلمات فتاب علیه انه هو التواب الرحیم.

(البقرہ:37)

(پس آدم نے اپنے پروردگار سے ایک دعا سیکھی جو مقبول ہوئی اس لیے کہ پروردگارِ عالم توبہ کا قبول کرنے والا اور اپنے بندوں پر رحم کرنے والا ہے۔)

وہ دعا بھی ملاحظہ ہو:

ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفرلنا و ترحمنا لنکونن من الخسرین.

(الاعراف:23)

(ہمارے پروردگار۔ ہم نے (یعنی آدم و حوا دونوں نے) اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ پس اگر تو ہمیں نہ بخشے گا اور ہم پر رحم نہ کرے گا تو ہم ٹوٹے میں رہیں گے۔)

یہ دعا جب قبول ہو چکی' جیسا کہ خود خداوند عالم و عالمیان ارشاد فرماتا ہے' تو ظاہر ہے کہ آدم و حوا کی لغزشوں پر بارگاہ خداوندی سے قلم عفو کھینچ دیا گیا۔ اور دونوں کا شمار اس کے بعد سے اور اپنے آئندہ صالحانہ طرز عمل کے لحاظ سے' **صلحا و اتقیا** میں ہو گیا۔ ایسی حالت میں حضرت حوا کو شیطان کا قائم مقام قرار دینا اور دنیا جہان کے گناہوں کی گٹھڑی ان کے سر اقدس پر لاد دینا مرزا غلام احمد قادیانی جیسے منہ پھٹ شخص ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ خدا کلام کرتا ہے اور جبریئل کو ہمارے پاس بھیجتا ہے اور ہم اس مقام پر جا پہنچے ہیں کہ محمد مصطفیٰ کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ **نعوذ باللّٰہ من تلک الھفوات و الخرافات.**

علامہ اقبال کے سامنے جب اگلے دن حضرت حوا علیہا السلام کے باب میں قادیانیوں کے قبلہ و کعبہ کا یہ عقیدہ پیش کیا گیا تو علامہ ممدوح نے چمک کر کہا کہ یہ وہی حوا ہے جس کی ایک نواسی محمدی بیگم کی خاطر آپ نے کئی ایک شکم زاد الہام سپرد کاغذ کیے۔ جب الہام پورے نہ ہوئے تو ان کی بیسیوں خندہ آفریں تاویلیں کیں اور بالآخر خسر الدنیا والآخرہ ہو کر راہ گرائے دار البوار ہو گئے اور پھر یہ وہی حوا ہے جس کی بیٹیوں نے آپ کے خلف الصدق مرزا بشیر الدین محمود سے فلسفہ مشی فی النوم کے اسرار و خفایا

پر ان گنت رنگیلی شرحیں لکھوائیں۔ شیطان کی قائم مقامی کا فرض تو انجام دیں مرزائی اور الزام اس شیطنت کا چپکا دیں تمام انسانوں کی ماں کے سر۔ معلوم نہیں قادیانی کس قسم کے انسان ہیں اور کس حوا کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں؟

(2)

حضرت حوا اور متنبی قادیان

ابوالبشر آدم صفی اللہ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی رفیقہ حیات حضرت حوا علیہا السلام کے باب میں مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی کا گھناؤنا عقیدہ زمیندار کی کسی گزشتہ اشاعت میں قارئین کرام کی طبیعت کے لیے تنغض کا سامان بہم پہنچا چکا ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ علامہ اقبال نے اس ناپاک عقیدہ سے اپنی بیزاری کا اظہار سختی سے کیا تھا جسے راقم الحروف نے اپنے الفاظ میں درج کر دیا۔ جن صاحب کی روایت کی بنا پر یہ سارا واقعہ سپرد قلم کیا گیا انھیں راقم کے قلم سے شکوہ ہے کہ وہ شاید موضوع کی رنگینی کی سفارش پر کسی قدر شوخ ہو گیا۔ ان کی خواہش ہے کہ علامہ اقبال کے اصل الفاظ کو علامہ ممدوح ہی کی خشک حکیمانہ متانت کے لباس میں دنیا والوں کے کانوں تک پہنچا دیا جائے۔ مجھے امتثال امر میں کوئی عذر نہیں۔

راوی کا بیان ہے کہ جب علامہ اقبال کو ''تحفہ گولڑویہ'' مصنفہ متنبی قادیان کی وہ عبارت پڑھ کر سنائی گئی جس میں اس مفتری علی اللہ نے قرآن کریم کی آیات کو جھٹلاتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حوا نے شیطان کی قائم مقام بن کر آدم کو جنت سے نکال دیا اور علامہ ممدوح سے استفسار کیا گیا کہ ایسا عقیدہ رکھنے والے شخص کے حق میں آپ کی کیا رائے ہے تو انھوں نے فرمایا:

> ''یہ عقیدہ مسلمانوں کا تو نہیں البتہ عیسائی ضرور ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ رہے مرزا غلام احمد قادیانی' سو تعجب ہے کہ عورت ذات کے ساتھ ان کے تعلقات کی عمر بھر کی نوعیت نے کس طرح گوارا کیا کہ حضرت حوا کو ایسے نازیبا الفاظ سے یاد کیا جائے۔ اور یوں بھی کسی شریف النفس انسان کا جذبۂ مروت و فتوت صنف نازک پر ایسے رکیک حملہ کی تاب نہیں لا سکتا۔''

اسی انداز میں چند باتیں علامہ اقبال کی زبان سے جناب مرزائے قادیانی آنجہانی کے صاحب زادہ بلند اقبال کی نسبت بھی صادر ہوئیں جو اس وقت ذہن سے اتر گئی ہیں۔ بہرحال یہ بات تو محقق ہو گئی کہ متنبی قادیان کے عقائد کو مسلمانوں کے عقائد سے دور کا انتساب بھی نہیں۔ نصرانیت کی ترجمانی کا ڈھنگ البتہ انھیں خوب آتا ہے۔

ہمارے علماء نے قادیانیوں کوان کے باطل عقائد کی بنا پر دائرہ اسلام سے خارج کرنے میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیا لیکن **بو العجبی** ملاحظہ ہو کہ کسی سر برآوردہ قادیانی کا ذکر جب ناموسِ مصطفوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان پاسبانوں کے حلقہ میں آتا ہے تو وہ بلا تکلف اسے ''مولوی'' یا ''مولانا'' کے لقب سے ملقب فرما دیتے ہیں مثلاً اگر وہ اندلسی قادیانیوں کے امام مسٹر محمد علی کا نام لیں گے جو مسلمانوں کو ''ذریۃ البغایا'' قرار دینے میں اور علمائے امت پر گالیوں کا جھاڑ باندھنے میں اپنے کسی بڑے سے بڑے دمشقی خواجہ تاش سے کم نہیں، تو انھیں ''مولانا محمد علی'' کہہ کر یاد کریں گے۔ جب ان لوگوں کے عقائد بقول علامہ اقبال عیسائیوں کے سے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ علمائے کرام اور عامۃ المسلمین ان کو مولوی کہہ کر پکاریں جو صرف ذی علم مسلمانوں کا امتیازی وصف ہے۔ یہ تو ویسا ہی ہے جیسا کوئی کہہ دے کہ حضرت مولانا لائڈ جارج نے یوں فرمایا اور حضرت مولوی سیموئل ہور کا یہ ارشاد ہے۔ بہتر ہوگا کہ آئندہ سے ہر قابل ذکر قادیانی کو عام اس سے کہ وہ اندلسی ہو یا دمشقی، مسٹر کہہ کر مخاطب کیا جائے اور جو ان کے امام ہوں انھیں پادری کے معزز لقب سے یاد کیا جائے اور موسیو کا لقب تو موسیو مرزا بشیر الدین محمود کے لیے وقف ہو ہی چکا ہے۔ (زمیندار 6 جولائی 1932ء)

نوٹ: مولانا ظفر علی خاں نے قادیانیوں کے دو معروف فرقوں کے لیے دمشقی اور اندلسی قادیانی کی بدیع اصطلاحات وضع فرمائی تھیں۔ دمشقی قادیانیوں سے مراد وہ قادیانی ہیں جو مرزا غلام احمد کو مستقل نبی مانتے ہیں۔ اس فرقے کے امام مرزا بشیر الدین محمود تھے۔ اندلسی قادیانیوں سے مراد وہ قادیانی ہیں جو متنبی قادیان کو مجدد کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس طائفہ کے امام مسٹر محمد علی تھے۔ مولانا ظفر علی خاں نے لکھا ہے کہ دونوں فرقوں کا یہ فرض صرف لفظی ہیر پھیر ہے حقیقت میں دمشقی اور اندلسی قادیانی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ (جعفر بلوچ)

پروفیسر محمد مسعود احمد

مرزا قادیانی' اقبالؒ کی نظر میں

فکرِ انسانی مختلف مراحل سے گزرتی ہے اور اس میں بہت سے نشیب و فراز آتے ہیں۔ خود بانی احمدیہ کی فکر بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں سمجھی جا سکتی۔ اقبال کے افکار و خیالات میں بھی نشیب و فراز آئے۔ 1 لیکن آخری ایام میں ان کے خیالات میں پختگی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر اقبال کے تجزیہ کے دورِ آخر کے ان خیالات کو پیشِ نظر رکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیالات کسی شخصیت کو سمجھنے اور پرکھنے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔

جو شخص حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصلِ دین سمجھتا ہو وہ کسی اور کی طرف نظر بھر کے کیسے دیکھ سکتا ہے۔

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باؤ نرسیدی تمام بولہبی است

حقیقت یہ ہے کہ چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آج بھی اسی طرح ہمارے سامنے ہے جس طرح صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے سامنے تھی۔ ایسی جامع کامل شخصیت کے بعد پھر کسی نبی کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے----؟ آسمانی صحیفے اور کتابیں جو قرآن کریم سے پہلے نازل کیے گئے یا تو نابود ہو چکے یا ان میں اس حد تک ترمیم و تحریف کر دی گئی کہ ان کی اصلیت معدوم ہو کر رہ گئی لیکن قرآن حکیم زندہ و پائندہ ہے۔ دنیا کی کسی کتاب کو یہ زندگی نہ ملی۔ قرآن کریم کا یہ اہتمامِ حفاظت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت پر حجت قاطع ہے۔ ایسی جامع سیرت کے بعد کسی سیرت کی ضرورت نہیں رہی۔ ایسی سچی کتاب کے بعد کسی کتاب کی ضرورت نہیں۔ لیکن وہ نفوسِ قدسیہ اور وہ کتبِ دینیہ دل لگانے کے قابل ہیں جو کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مستفیض ہو گئے۔

ڈاکٹر اقبال نے اپنے متعدد بیانات میں فرقۂ احمدیہ کے خلاف اظہار خیال فرمایا ہے۔ بعض

بیانات میں انھوں نے حکومت برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ فرقۂ احمدیہ کے خلاف کارروائی کرے اور ان کو غیر مسلم قرار دے۔ چنانچہ 1935ء میں احمدیوں کے خلاف اقبال کا ایک بیان شائع ہوا جو بعد میں Islam and Qadianism ''اسلام اور قادیانیت'' کے عنوان سے کتابچہ کی صورت میں شائع ہوا۔ غالباً اسی کتابچہ کے جواب میں لاہوری احمدیوں کے امام محمد علی نے ایک کتابچہ شائع کیا۔ اس کا عنوان تھا:

Mohammad Iqbal's Statement Regarding the Qadiani

''قادیانیوں کے متعلق سر محمد اقبال کا بیان''...... یہ کتابچہ احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام لاہور کی طرف سے شائع ہوا۔

1935ء میں اخبار سٹیٹسمین میں بھی احمدیوں کے متعلق اقبال اور نہرو کے درمیان خط و کتابت شائع ہوئی۔ اسی زمانے میں کلکتہ کے ''ماڈرن ریویو'' میں نہرو کے تین مضامین شائع ہوئے۔ ان مضامین کا ردِعمل یہ ہوا کہ مختلف مکاتبِ فکر کے مسلمانوں نے اقبال سے بعض سوالات کیے اور بعض باتوں کی وضاحت چاہی۔ چنانچہ اقبال نے انگریزی میں ایک مضمون لکھا۔ جس کا عنوان تھا:

Islam and Ahmadism

اسلام اور احمدیت

اس مضمون کو تین حصوں پر تقسیم کیا۔ پہلے دو حصوں میں فرقہ احمدیہ اور اس کے پیروؤں کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے اور تیسرے حصہ میں جواہر لال نہرو کے بیان کا تجزیہ کیا ہے۔

اقبال کا یہ مضمون جناب خواجہ عبدالوحید صاحب[2] (مقیم کراچی) نے ٹائپ کیا تھا۔ جب اقبال کے سامنے یہ ٹائپ شدہ مسودہ پیش کیا تو انھوں نے خواجہ صاحب کے قلم سے ہر صفحہ پر کاٹ چھانٹ کی۔ پھر آخر میں انجمنِ خدام الدین لاہور کو طباعت کی تحریری اجازت دیتے ہوئے مع سنہ و تاریخ اپنے دستخط ثبت کر دیے...... یہ مسودہ عرصۂ دراز تک خواجہ عبدالوحید کے پاس محفوظ رہا اور اب قومی عجائب گھر کراچی میں موجود ہے۔

بیس پچیس سال بعد رسالہ الفضل (ربوہ) میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ اقبال کا مضمون ''اسلام اور احمدیت'' جعلی ہے۔ اس کے جواب میں خواجہ صاحب ممدوح نے اپنے انگریزی اخبار ''الاسلام'' کراچی میں حقائق واضح کیے اور مسودے کے آخری صفحہ کا عکس بھی دیا جس پر اقبال کے دستخط موجود ہیں۔

ڈاکٹر اقبال کا یہ معرکتہ الآراء مضمون انجمن خدام الدین لاہور کے جریدے ''اسلام''[3] کے

ایک خصوصی شمارے (26 شوال 1354ھ 22 جنوری 1936ء جلد اوّل' شمارہ نمبر 16) میں خواجہ عبدالوحید مدیر ''اسلام'' نے ڈاکٹر اقبال کی خصوصی اجازت حاصل کر کے شائع کرایا۔ حسن اتفاق سے ہم کو ''اسلام'' کا یہ خصوصی شمارہ جواب نایاب ہے خواجہ عبدالوحید کی عنایت سے مل گیا ہے۔ اس کے علاوہ موصوف نے بعض اور چیزیں بھی عنایت کی ہیں جن کے لیے ہم ان کے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

پیشِ نظر مضمون ڈاکٹر اقبال کے اسی مضمون کے پہلے دو حصوں کے مندرجات سے اخذ کر کے مرتب کیا گیا ہے اور جہاں جہاں استفادہ کیا گیا ہے' قوسین میں صفحات کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے۔

اسلام میں تصورِ ختم نبوت بڑی اہمیت کا حامل ہے' اس کی تمدنی حیثیت پر میں نے کسی مقام پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس تصور کا سیدھا سا مفہوم یہ ہے:

> ''حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی انسان کے آگے روحانی طور پر سر تسلیم خم نہ کرنا۔'' (ص 14)

اسلام مکمل اور سرمدی و ازلی ہے' حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی انسان پر ایسی وحی نازل نہ ہوئی جس سے انکار' الحاد و زندقہ سمجھا جائے۔ جو شخص اس قسم کی وحی کا دعویٰ کرے وہ اسلام کا باغی اور غدار ہے۔ چونکہ قادیانیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ فرقہ احمدیہ کے بانی پر اس قسم کی وحی نازل ہوتی تھی' اس لیے یہ لوگ ان کی اجازتِ دینی اجابت نہ کرنے کی وجہ سے پورے عالم اسلام کو کافر و زندیق سمجھتے ہیں۔[4] ان حالات میں اگر ہندوستان کے مسلمان قادیانی تحریک کو اسلام کی اجتماعی زندگی کے لیے ہندوستان میں خطرناک سمجھتے ہیں تو ان کا یہ سمجھنا بجا و درست ہے۔ (ص 14,5)

اسلام میں الحاد و بے دینی کی ایسی صورتیں شاذ و نادر ہی پیش آتی ہیں جو اسلام کی معتقداتی حدود پر اثر انداز ہوئی ہوں۔ اس لیے جب کبھی اس قسم کی باغیانہ صورت سامنے آتی ہے تو خاص طور پر مسلمانوں کے احساسات میں شدت ہو جاتی ہے اور شدید ردِعمل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہائیوں کے خلاف ایرانیوں کے احساسات کتنے شدید تھے' اور یہی وجہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کے احساسات بھی قادیانیوں کے خلاف بیحد شدید ہیں۔ (ص 11)

الحادِ عظیم کا سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے' جب ایک مفکر و مصلح کی تعلیمات اسلامی معتقدات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ بدقسمتی سے قادیانیت کی تعلیمات کے سلسلے میں یہ سوال سامنے آتا ہے۔ (ص 13)

بانیِ فرقہ احمدیہ کا اپنی نبوت کے بارے میں پہلا استدلال یہ ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا روحانی فیضان کسی امتی کو منصبِ نبوت پر فائز نہ کر سکے تو یہ اس فیضان کے نقص کی دلیل ہے۔ لیکن اگر اس استدلال کو قبول کرتے ہوئے یہ پوچھا جائے کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیضِ روحانی

ایک سے زیادہ امتیوں کو منصب نبوت پر سرفراز کرسکتا ہے؟ تو جواب ملے گا "نہیں"!......اس کا تو یہی مطلب ہوانا' کہ

"محمد خاتم النبیین نہیں' میں خاتم النبیین ہوں۔"

اس طرح یہ مدعی نبوت اپنے اس محسن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی "خاتمیت" کو خاموشی کے ساتھ چرالے جاتا ہے جس کے متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ اس کے کرم خاص سے ہی وہ نبی بنا ہے۔ (ص 15)

بانی فرقہ احمدیہ دوسرا استدلال یہ پیش کرتے ہیں کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا "بروز" ہیں۔ ان کی خاتمیت درحقیقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت ہے لیکن اس استدلال سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ سرے سے "خاتمیت" کے مفہوم ومعنی سے ہی بے خبر تھے۔ (ص 16)

تیسرا استدلال ہسپانوی صوفی شیخ محی الدین ابن عربیؒ کے حوالے سے پیش کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ شیخِ عربی کے نزدیک ایک مسلمان امتی پیغمبرانہ مشاہدات وتجربات سے گزرے' تو یہ خیال میرے نزدیک نفسیاتی طور پر ناپختہ ہے لیکن اگر صحیح تسلیم بھی کرلیا جائے تو اس سے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ روحانی تجربات میں اس حد تک ترفع وبلندی صوفی کی شخصی کامیابی ہے جس کو حاصل کرنے کے بعد ہرگز ہرگز وہ یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ جو مجھے نہ مانے دائرہ اسلام سے خارج اور مردود وجہنمی ہے۔" اس کو یہ بھی حق نہیں کہ امت محمدیہ میں ایک نئی امت کی داغ بیل ڈالے۔ ایک بات تو یہ واضح ہوئی۔ دوسری بات یہ بھی واضح ہو جاتی ہے کہ شیخِ عربی کے نزدیک ایک سے زیادہ امتی پیغمبرانہ روحانی تجربات سے گزر سکتے ہیں' اور یہ دونوں باتیں بانی فرقہ احمدیہ کے مسلک کے خلاف ہیں۔ (ص 17)

شیخ عربی کی فتوحاتِ مکیہ کے متعلقہ حصہ کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ختم نبوت کے اسی شدت کے ساتھ قائل تھے جیسے کوئی صحیح العقیدہ سنی ہوسکتا ہے۔ میرے خیال میں اگر شیخِ عربی کو کشف کے ذریعہ یہ معلوم ہو جاتا کہ مشرق کے ایک ملک ہندوستان میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاتمیت کو تباہ وبرباد کرنے کی کوشش کی جائے گی تو یقیناً وہ ہندوستانی علماء کو متنبہ فرمادیتے کہ وہ اس قسم کے باغیوں سے مسلمانانِ عالم کو خبردار کریں۔ (ص 18)

بعض لوگ اس اہم معاملے میں رواداری کی بات کرتے ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت رواداری کے حقیقی معنی ومفہوم سے ناآشنا ہیں اور اس لفظ کے استعمال میں نہایت ہی غیر محتاط ہیں۔ ان کو نہیں معلوم کہ حقیقی اور سچی رواداری ذہنی وسعت اور روحانی بالیدگی سے حاصل ہوتی ہے۔ ویسے کہنے کو روادار تو فلسفی بھی ہے جو سارے مذاہب عالم کو سچا سمجھتا ہے۔ مورخ بھی روادار ہے جو یکساں طور پر سب کو جھوٹا سمجھتا ہے۔ سیاست دان بھی روادار ہے جو یکساں طور پر سب کو اپنے لیے مفید سمجھتا ہے اور ایک خالی

الذہن انسان جو ہر فکر وخیال سے مبرا ہے وہ بھی روادار ہے کہ ہر کسی کے افکار وخیالات کو سن لیتا ہے۔ وہ کمزور انسان بھی روادار ہے جو اپنی بے حد کمزوری کی وجہ سے اس ذات کی جناب میں گستاخیاں بھی برداشت کر لیتا ہے جس سے اس کو کمالِ تعلق خاطر ہے۔ مگر یہ ساری رواداریاں کوئی اخلاقی اہمیت نہیں رکھتیں۔ (ص 6)

بات یہ ہے کہ برطانوی حکومت کو ہندوستان پر اپنا تسلط جمانا تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کے عقائد کو متزلزل کیا جائے اور ان کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالا جائے جو حکومتِ برطانیہ کی مطلب براری میں ممد ومعاون ہوں۔ عقائد کو متزلزل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ایک ایسی اساس دریافت کی جائے جس کا تعلق وحی والہام سے ہو۔ سو یہ اساس بانیِ فرقہ احمدیہ نے مہیا کر دی۔ احمدی حضرات خود دعویٰ کرتے ہیں کہ حکومتِ برطانیہ کی انھوں نے یہ سب سے بڑی خدمت کی ہے۔ واقعی بڑی خدمت کی کہ اپنے اکتشافاتِ روحانی کے ذریعے مسلمانانِ ہند کی نظر میں انگریزوں کی غلامی کو خوش نظر بنایا اور اس طرح مسلمانوں کے لیے مصائب وآلام کی راہ ہموار کی۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کی سیاسی بیداری سے انگریزوں، ہندوستانی قوم پرستوں اور قادیانیوں کو فکر لاحق ہوگئی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر مسلمان بیدار ہو گئے تو وہ اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ وہ کبھی بھی محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی امت میں سے ایک نئی امت کی تشکیل نہ کر سکیں گے۔ (ص 24,22,3)

ہمارے علماء نے اس تحریک کا مقابلہ کیا۔ مگر میرے نزدیک اس کے لیے مذہبی دلائل وبراہین کافی نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بانیِ فرقہ احمدیہ کے ''اکتشافاتِ روحانی'' کا بڑے محتاط طریقہ سے نفسیاتی تجزیہ کیا جائے جس سے بانی کی شخصیت کے بطون کو سمجھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اس سلسلے میں مولوی منظور الٰہی کے اس مجموعے کی طرف توجہ دلاؤں گا جس میں انھوں نے بانی تحریک کے ''اکتشافاتِ روحانی'' کو جمع کیا ہے۔ اس مجموعے میں نفسیاتی تحقیق کے لیے بہت سا مختلف النوع مسالہ مل سکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ جدید نفسیات کا کوئی طالب علم ایک نہ ایک دن ان اکتشافات کا مطالعہ کر کے بانی فرقۂ احمدیہ کا نفسیاتی تجزیہ پیش کرے گا۔ (ص 19)

بانیِ تحریک کو سمجھنے کا دوسرا طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کم از کم 1799ء سے مسلمانانِ ہند کے افکار وخیالات کے پس منظر میں ان کے افعال واقوال کا جائزہ لیا جائے کیونکہ اس سال ٹیپو سلطان شہید ہوئے۔ ان کی شہادت گویا ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی امنگوں کی موت تھی، اسی سال جنگ (Nanarnes) لڑی گئی جس میں ترکی بحری بیڑہ تباہ ہوا۔ اس طرح 1799ء میں ایشیا کے اندر مسلمانوں کا سیاسی انحطاط اپنے شباب پر پہنچ گیا تھا اور ظاہر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس سال مسلمانوں کی

سیاسی ذلت وخواری نے جدید اسلام اور اس کے مسائل کو جنم دیا اور مسلمانوں کے ذہنوں میں نئے نئے سوالات پیدا ہونے لگے مثلاً ہندوستان میں یہ سوالات سامنے آئے:

1- کیا اسلام میں تصورِ خلافت کوئی دستوری حیثیت رکھتا ہے؟

2- خلافتِ ترکیہ سے مسلمانانِ ہند اور مسلمانانِ عالم کہاں تک وابستہ ہیں؟

3- کیا ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟

4- اسلام میں جہاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟

5- اس آیت قرآنی میں ''منکم'' (تم میں سے) سے کیا مراد ہے؟

''اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور جو تم میں سے اولی الامر ہو۔''

6- مہدی کے متعلق جو احادیث وارد ہوئی ہیں ان کی حیثیت کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

ان سوالات نے مسلمانانِ ہند میں جو اختلافِ آرا پیدا کیا' وہ ہندوستان میں تاریخ اسلام کا ایک اہم باب ہے۔(ص21,20)

اقوام عالم کی تاریخ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب کسی قوم میں آثارِ حیات معدوم ہونے لگتے ہیں تو تنزل وانحطاط بجائے خود سرچشمۂ فکر وخیال بن جاتا ہے اور پھر اس کے شعراء' فلاسفہ' صوفیاء' سیاست داں سب ہی ایک ایسی جماعت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو ہر قبیح چیز کو جمیل بنا کر پیش کرتی ہے اور رفتہ رفتہ شادابیِ حیات ختم کر دیتی ہے' اور قوم کی روحانیت پژمردہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ (ص35)

اس لیے میرے خیال میں وہ تمام کردار جنھوں نے احمدیت کے ڈرامے میں حصہ لیا تھا' اسی دورانحطاط کے معصوم شکار تھے۔ ایران میں یہی سیاسی ڈرامہ کھیلا گیا۔ چنانچہ روس نے ''بابیت'' کے ساتھ رواداری برتی اور بابیوں کو عشق آباد میں پہلا تبلیغی مرکز قائم کرنے کی دعوت دی۔ اسی طرح انگلستان میں احمدیوں کے ساتھ یہی رواداری برتی گئی اور ان کو ووکنگ میں پہلا تبلیغی مرکز قائم کرنے کی اجازت دی گئی۔ یہ دعوت واجازت مخلصانہ تھی یا نہیں' اس کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ نظر آتا ہے کہ اس رواداری نے ایشیا میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے مختلف مسائل پیدا کر دیے۔(ص26)

بہر کیف زمانہ بدل رہا ہے۔ ہندوستان میں حالات نے نئی کروٹ لی ہے' جمہوریت کی ایک نئی رو جو کہ ہندوستان میں آ رہی ہے' یقیناً احمدیوں کا پردۂ فریب چاک کر دے گی اور ان کو یہ یقین ہو جائے گا کہ ان کی مذہبی اختراعات بالکل مہمل اور لایعنی تھیں۔(ص27)

اوپر جو کچھ عرض کیا گیا وہ ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کے افکار وخیالات کا خلاصہ تھا۔ اس سے

اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال عقیدۂ ختم نبوت پر بڑی سختی سے قائم تھے اور اس عقیدے کے منکر کو دائرہ اسلام سے خارج، باغی اور غدار تصور فرماتے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ عقیدۂ ختم نبوت کی حفاظت جزوِ ایمان ہے' اس کے لیے جاں سپاری اور جاں بازی عین ایمان ہے۔ تحریک ختم نبوت کے زمانے میں سرفروشانِ لاہور نے یہ بھی کر دکھایا—— پہلے عقل، عشق کے تابع تھی اب عشق تابعِ عقل ہے۔ بلکہ عشق کے چراغ بجھ رہے ہیں کہ خرد کی بجلیوں نے نگاہیں خیرہ کر دیں—— پہلے جاگے ہوئے تھے' اب جبھی جاگتے ہیں جب جگائے جاتے ہیں حالانکہ اسلام نام ہے بیداری کا' ہشیاری کا۔ وہ اس رب کریم کا عطا کردہ دین ہے جس کی صفتِ خاص یہ ہے کہ **لا تاخذہ سنۃ ولا نوم**...... پہلے ناموسِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حفاظت کے لیے مر مٹنے کا حوصلہ تھا' اب وہ جذبہ ہی نہ رہا۔ نوجوانوں کی بات کر رہا ہوں' ادھیڑوں اور بوڑھوں میں تو اب بھی یہ جذبہ موجود ہے۔ رفتہ رفتہ جاگنے والے اونگھنے لگے' اونگھنے والے سونے لگے' سونے والے موت کی نیند سو گئے—— اغیار کے فکر و خیال میں ایسے گم ہوئے کہ آج یہ حدیث پاک اپنی پوری معنویت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ **من تشبہ بقوم فھو منھم۔**

ناموسِ مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حفاظت تقریروں اور تحریروں سے نہیں ہو سکتی' اس کے لیے عزم صمیم کی ضرورت ہے۔ فکر و نظر میں انقلاب کی ضرورت ہے۔ دورِ جدید نے ہم کو جو کچھ دیا ہے نگاہِ مصطفےٰ سے اس کو پرکھنے کی ضرورت ہے' اور پھر خس و خاشاک پھینک دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارا حال اس مخبوط الحواس انسان کی مانند ہے جو کسی کی محبت کا دم بھرتا ہے مگر جو بات کہتا ہے' جو کام کرتا ہے اس میں محبت کی ذرہ برابر بو نہیں آتی۔ غرور و سرکشی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔

اللہ اللہ! یہ وہ ملک ہے جس کے لیے ہم نے پروردگار عالم سے جھولیاں پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگی تھیں۔ اور ایک عہد کیا تھا—— یاد ہے! کیا دعاء مانگی تھی۔ کیا عہد کیا تھا؟...... یہ دعا مانگی تھی کہ خدایا اغیار کی غلامی سے ہم کو نجات دے' اور ایک زمین عطا فرما جہاں ہم سکون و چین کی زندگی بسر کر سکیں—— اور عہد کیا تھا کہ اس زمین پر ہم تیرا اور تیرے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام روشن کریں گے۔ تیری حکومت قائم کریں گے' تیرے اور صرف تیرے غلام رہیں گے۔ کسی کی غلامی قبول نہ کریں گے۔ صرف تیرا کہا مانیں گے—— طویل عرصہ گزر چکا لیکن جو کچھ ہو چکا' یوں معلوم ہوتا ہے کہ سامنے ہو رہا ہو۔ جامع مسجد دہلی کے مشرقی دروازے کے سامنے ایک جلسہ ہو رہا ہے۔ قائداعظمؒ ہاتھ میں قرآن لیے کھڑے ہیں اور زور دے دے کر بار بار یہ فرما رہے ہیں:

''پاکستان میں قرآن کی حکومت ہوگی' قرآن کی حکومت ہوگی۔''

اللہ اللہ! کانوں نے کیا سنا تھا اور آنکھوں نے کیا دیکھا — نہ معلوم کیا کیا دیکھنا باقی ہے۔ خدا نہ دکھائے! عطائے نعمت کا یوں شکر ادا کیا کہ ہر وہ کام کیا جس سے منعم ناراض ہو غضبناک ہو اور قہرناک ہو۔ حکومت کے معاملات ارباب حکومت جانیں — اپنے گھروں میں ہم نے کیا کچھ کیا۔ حکومتِ الٰہی کا آغاز تو گھر ہی سے ہوتا ہے — اپنی ثقافت کو اپنے ہاتھوں سے دفن کیا۔ اپنے عشق وجنوں کو اپنے ہاتھوں برباد کیا' مذہبی اور قومی غیرت وحمیت کو اپنے ہاتھوں نیست و نابود کیا اور اس طرح اپنی روح کو اپنے ہاتھوں ختم کیا۔ پھر ایک جسم بے جان رہ گیا ۔

زندگی کیا ہے؟ عناصر کا ظہور ترکیب
موت کیا ہے؟ انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

مسلمانوں کی قومی زندگی کے چند عناصر ہیں، انہی کی متوازن ترکیب سے قومی زندگی بنتی ہے۔ ان عناصر میں دو عنصر سب پر فوقیت رکھتے ہیں۔ محبتِ الٰہی اور محبتِ رسول (علیہ التحیۃ والتسلیم) — لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ہمیں سب کی پرواہ ہے۔ نہیں تو محبت کی پرواہ نہیں ہے۔ ڈوبتے انسان کی طرح ادھر ادھر ہاتھ مارتے ہیں' خس و خاشاک کو مشکل کشا سمجھتے ہیں...... ناخدا کو بھلا دیا' خدا کو فراموش کر دیا۔ ہماری نجات' ہماری عزت' ہماری عظمت' ہماری شوکت' ہماری ہیبت' خداوند تعالیٰ کی بندگی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی میں ہے۔ پیش نظر مضمون میں ہم نے اسی کی ایک جھلک دکھائی ہے اور اس کے افکار وخیالات پیش کیے ہیں' جس نے کہا تھا ۔

بمصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست

حواشی

1 قادیانی حضرات نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ڈاکٹر اقبال احمدیت سے متاثر تھے' اس سلسلے میں وہ ابتدائی دور کی بعض باتیں بیان کرتے ہیں چنانچہ عبدالمالک خان نے اپنی تالیف ''احمدیت اقبال کی نظر میں'' میں یہ تاویل کی ہے۔ یہ تالیف نظارت اشاعت لٹریچر وتصنیف' ربوہ نے شائع کی ہے۔ (مسعود)

2 لاہور کے ایک محلہ میں' (اندرون بھاٹی گیٹ) ''للی لاج'' کے نام سے ایک مکان تھا جو خواجہ کریم بخش

(والد بزرگوار خواجہ عبدالوحید) اور ان کے دو بھائیوں کی مشترکہ ملکیت تھا۔ اس مکان میں اہل علم کی محفل جما کرتی تھی۔ 1908ء میں ڈاکٹر اقبال بھی ان محفلوں میں شامل ہونے لگے۔ حکیم احمد شجاع نے لکھا ہے کہ خواجہ کریم بخش اور ان کے دو بھائیوں امیر بخش ورحیم بخش کو جب تک اقبال اپنا کلام نہیں سنالیا کرتے تھے' مجلس میں نہیں پڑھتے تھے۔ یہ بزرگ بڑے سخن سنج وسخن شناس تھے۔ اس مکان میں آمد ورفت کا یہ سلسلہ 1908ء سے 1918ء تک دس سال رہا۔ اس طویل عرصہ میں خواجہ عبدالوحید کو اقبال کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اس لیے ان کی شخصیت اقبالیات کے سلسلے میں اہمیت کی حامل ہے۔ (مسعود)

(اقبال ریویو (کراچی) جنوری 1969ء میری ذاتی ڈائری۔ از خواجہ عبدالوحید ص 45-46 نقوش لاہور 1966ء۔ ''لاہور کا چیلسی'' از حکیم احمد شجاع' ص 29)

3 انجمن خدام الدین (لاہور) کا یہ ترجمان 7 جون 1934ء کو جاری ہوا اور مارچ 1940ء کو بند ہو گیا۔ (اقبال ریویو (کراچی) جنوری 1969ء ص 48)

4 مولانا محمد علی لاہوری کے جوابی بیان کا خلاصہ یہ ہے:

سر محمد اقبال کو اچھی طرح معلوم ہے کہ بیس سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا کہ ہم لوگ مسئلہ ختم نبوت تکفیر اور اس سے پیدا ہونے والی صورت حال کی وجہ سے قادیانیوں کے ساتھ آمادۂ پیکار ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ چنانچہ 1904ء میں میاں سر فضل حسین اور سر محمد اقبال سے ملاقات کے وقت مرزا غلام احمد قادیانی نے واضح الفاظ میں یہ کہا تھا کہ وہ ان مسلمانوں کو کافر نہیں سمجھتے جو ان پر ایمان نہیں لائے۔ مرزا صاحب کی تحریروں سے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی دعوت کے منکر کو کافر نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ اکتوبر 1902ء میں تریاق القلوب کے صفحہ 30 پر انھوں نے اس امر کا اظہار کیا ہے۔ احادیث نبوی سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو شخص کلمہ طیبہ پر یقین رکھتا ہے اور قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتا ہے' مسلمان ہے۔ مرزا صاحب تمام مسلمانوں کو مسلمان ہی سمجھتے تھے چنانچہ انھوں نے اور ان کے متبعین نے عملی طور پر بھی اس کا مظاہرہ کیا لیکن قادیانی گروپ کے موجودہ پیشوا (غالباً مرزا بشیر الدین محمود) نے یہ سلسلہ ختم کر دیا۔

بانی فرقہ احمدیہ نے یہ اعلان کر کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کوئی نبی آئے گا نہ نیا نہ پرانا، عقیدہ ختم نبوت کو ایک مستحکم بنیاد پر قائم کیا ہے۔ مرزا صاحب ختم نبوت کے قائل تھے' جس کا اظہار انھوں نے ان مقامات پر کیا ہے۔ نشان آسمانی ص 28 شہادت القرآن ص 27 اور انجام آتھم ص 27۔ ہاں انھوں نے اپنے لیے لفظ نبی کو مجازاً استعمال کیا۔ مثلاً ان مقامات پر۔ ازالۂ اوہام ص 349 'حقیقۃ الوحی ص 65 وغیرہ لیکن مجاز وحقیقت میں بڑا فرق ہے۔ قرآن کریم کا واضح ارشاد موجود ہے کہ پیغام محمدی کے ساتھ ساتھ دین اسلام

کو مکمل کر دیا گیا ہے۔اب کسی نبی کی ضرورت نہیں۔ بلاشبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم النبین ہیں۔

مرزا غلام احمد قادیانی' مسیح موعود کی جسمانی بعثت کے مخالف تھے۔ ان کے نزدیک روحِ مسیح ایک محدث و مجدد کے روپ میں آ سکتی ہے۔ چنانچہ وہ سمجھتے تھے کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تیرہ سو سال بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے۔ اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تیرہ سو سال بعد وہ تشریف لائے۔

اس میں شک نہیں کہ حدیث وقرآن کی رو سے یہ ثابت ہے کہ سلسلۂ وحی بند ہو چکا ہے لیکن اس پیغمبرانہ وحی کا سلسلہ ضرور بند ہو گیا جس کو جبریل علیہ السلام لایا کرتے تھے اور جس کی ایک شرعی حیثیت تھی۔ لیکن دوسری وحی کا سلسلہ جاری ہے جس پر وہ نازل ہوتی ہے اس کو اسلام میں محدث کہا جاتا ہے اور مجدد بھی جس کا ہر صدی کے شروع میں وعدہ کیا گیا ہے۔

(محمد علی لاہوری "قادیانیوں کے بارے میں سر محمد اقبال کا بیان"
(انگریزی) مطبوعہ لاہور 1935ء۔ ترجمہ اردو ملخصاً)

نوٹ: پروفیسر سلیم چشتی نے اپنی تالیف "شناختِ مجدد" مطبوعہ لاہور 1936ء میں مرزا غلام احمد کی "مجددیت" کا پوست کندہ تجزیہ کیا ہے۔ محققین کے لیے اس کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ (مسعود)

پروفیسر خالد شبیر احمد

علامہ اقبالؒ اور قادیانیت

یہ بات تو اپنی جگہ درست ہے کہ جب ایک مصنف کسی کتاب کے تحریر کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو ایک مؤقف اپنے ذہن میں بنالیتا ہے اور اسے صحیح اور درست ثابت کرنے کے لیے مختلف حوالوں کی تلاش میں نکلتا ہے تو جہاں کہیں سے اسے اپنے مؤقف کی تائید میں حوالے ملتے ہیں انھیں اپنی کتاب کے صفحات پر سجالیتا ہے۔ لیکن جہاں اسے اپنے مؤقف کے خلاف حوالے ملتے ہیں انھیں ارادتاً مسترد کر دیتا ہے۔ اس حقیقت کے ساتھ یہ بات بھی درست ہے کہ ایک سچے اور کھرے مصنف کے لیے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ وہ اپنے مؤقف کی صداقت میں جو حوالے بھی دے وہ کم از کم حوالوں کی حد تک تو درست ہوں۔ جہاں یہ بات بھی ملحوظ خاطر نہ رکھی جائے بلکہ جھوٹے اور غیر معتبر حوالوں کے ذریعے اپنے مؤقف کو صحیح ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی جائے تو بات بنتی نہیں، بگڑتی ہے بلکہ اس سے بھی اگلی بات جس سے ایک سچے مؤقف کی صداقت ابھر کر سامنے آ جاتی ہے اور قاری کو اصل حقائق تک پہنچنے پر مدد ملتی ہے یہ ہے کہ مصنف اپنے مؤقف کے حق میں فریقِ مخالف کی کتابوں سے حوالے پیش کرے۔ میں نے اپنی کتاب ''تاریخ محاسبۂ قادیانیت'' جلد اوّل میں اسی اصول اور طریقہ کار کو پیش نظر رکھتے ہوئے کام کیا ہے۔ اپنے مؤقف کے حق میں قادیانی کتب سے حوالے پیش کیے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میری اس کتاب کو منصۂ شہود پر آئے کئی برس ہو گئے ہیں لیکن ابھی تک قادیانیوں کو اس کتاب کا جواب دینے کی جرأت نہیں ہوئی۔

ہمارا مؤقف ہے کہ مرزا غلام احمد اپنے مخالفین کو گالیاں دیتا تھا ہم نے اس مؤقف کی تائید میں قادیانی کتابوں سے حوالے پیش کیے۔ ہمارا مؤقف ہے کہ مرزا بشیر الدین محمود اپنے وقت کا راسپوٹین تھا۔ ہم نے اس مؤقف کو قادیانی کتب اور قادیانی حوالوں سے ثابت کیا۔ ہمارا مؤقف ہے کہ قادیانی تحریک انگریزوں کی ایما پر مسلمانوں کے دلوں سے جذبۂ حریت اور جذبۂ جہاد ختم کرنے کے لیے برپا کی گئی۔ اس مؤقف کی تائید میں خود قادیانی حوالے بکثرت موجود ہیں، جن سے قادیانی انکار کی

جرأت نہیں کر سکے۔ ہمارا مؤقف ہے کہ قادیانی تحریک مذہبی لبادے میں ایک سیاسی تحریک ہے جو یہود و نصاریٰ کے اشارے پر ہمیشہ ناچتی چلی آ رہی ہے۔ ہم نے اپنے اس مؤقف کو قادیانی کتب کے حوالے سے ثابت کر کے دکھایا ہے۔ اس کے برعکس تاریخِ احمدیت' اعجاز قادیانی کی کتاب ''مظلوم اقبال'' یا پھر شیخ عبدالماجد قادیانی کی کتابوں میں علامہ اقبالؒ کے خلاف جو کچھ پیش کیا گیا ہے ان سب کا ماخذ قادیانیوں کی اپنی کتابیں ہیں۔ مثلاً قادیانی کہتے ہیں کہ اقبال شراب پیتا تھا۔ اب اس کی تائید میں حوالے یا تو قادیانی کتب سے لیے گئے ہیں یا پھر عبدالمجید سالک کی کتاب' ذکرِ اقبال سے پیش کیے گئے ہیں۔ عبدالمجید سالک کے بارے میں پڑھی لکھی دنیا اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ سالک مسلمان ہوتے ہوئے بھی قادیانیوں کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ ان کے والد قادیانی تھے جن کی میت کو مسلمانوں نے اپنے قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیا۔ اس بات کا قلق ان کے دل میں ہمیشہ رہا۔ انھوں نے بڑی کوشش کی کہ علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کا خصوصی تعلق قادیانیت سے ثابت کر سکیں لیکن اُنہیں اس کوشش میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

جہاں تک علامہ اقبالؒ پر شراب پینے کے قادیانی بہتان کا تعلق ہے' اس کا مسکت اور مدلل جواب جاوید اقبال نے اپنی معروف کتاب ''زندہ رود'' میں دے دیا ہے۔ قادیانی لٹریچر میں علامہ اقبالؒ کے خلاف سب سے زیادہ گند شیخ عبدالماجد قادیانی نے اچھالا ہے۔ شیخ صاحب موصوف نے اپنی ان تحریروں کے ذریعے دوسروں کو بے وقوف بنانے کی ناکام کوشش کی ہے۔ انھیں اقبال دشمنی میں یہ خیال ہی نہ رہا کہ اصل بے وقوف تو وہ خود ہوتا ہے جو دوسروں کو بے وقوف بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اقبال کے بارے میں شیخ صاحب لکھتے ہیں کہ اقبال انگریزوں کا خوشامدی تھا۔ عمر بھر انگریزوں کے قصیدے لکھتا رہا۔ ملکہ وکٹوریہ پر قصیدہ' جنرل ڈائر پر قصیدہ' انگریز سے سر کا خطاب لیا وغیرہ وغیرہ' ان تحریروں سے انھوں نے قارئین کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ عام مسلمان جنھیں شاعرِ اسلام اور شاعرِ مشرق، حکیم الامت کہتے ہیں یا سمجھتے ہیں' وہ دراصل انگریزوں کا گماشتہ تھا۔ جو پذیرائی دنیائے اسلام کی جانب سے اقبال کو حاصل ہوئی ہے' اقبال اس کا کسی طور بھی مستحق نہیں۔ یہ ہے ان کی تین کتابوں کا خلاصہ جس پر وہ اتراتے پھرتے ہیں۔ اب اگر ان سے کوئی یہ بات پوچھ لے کہ اقبال اپنے فکری ارتقاء کے دورِ اوّل میں انگریزوں کے حق میں قصیدے لکھنے کی وجہ سے قابلِ مذمت ہے تو پھر مرزا غلام احمد انگریزوں کے قصیدے لکھنے کی وجہ سے وقت کا پیغمبر اور قابلِ عزت کس طرح ہو گیا۔ اگر ایک کام کسی کی مذمت کرنے پر انسان کو مجبور کرتا ہے تو وہی کام دوسرے کی عزت کا باعث کس طرح ہو سکتا ہے۔ اگر شراب اقبال پیتا ہے تو وہ قابلِ مذمت ہے اور اگر شراب مرزا غلام احمد اور مرزا بشیر الدین پیتا ہے تو وہ اس کے باوجود قابلِ

احترام بلکہ ان میں سے ایک وقت کا پیغمبر اور دوسرا اس کا خلیفہ ہے۔ اقبال نے انگریزوں کے قصیدے لکھے ہیں تو اس نے ان قصیدوں سے رجوع بھی کر لیا تھا۔ ان قصائد کو اقبال نے اپنے کلام میں شامل نہیں کیا بلکہ مسترد کر دیا۔ قادیانیوں کے مرزا غلام احمد نے اگر کسی انگریز نواز تحریر سے رجوع کیا ہے تو قادیانی پیش کریں۔

مسٹر ظفر اللہ خان نے ''سر'' کا خطاب انگریزوں سے ہی وصول کیا تھا جو اس نے قائدِ اعظمؒ کے کہنے پر بھی واپس نہیں کیا تھا۔ یہ بات تو قادیانی بھول گئے لیکن اقبال کے ''سر'' کا خطاب ان کے اعصاب پر مسلط ہے۔ اگر اقبال سر کا خطاب وصول کرنے کی بناء پر گردن زدنی ہے تو پھر ظفر اللہ خان کیوں گردن زدنی نہیں۔

تمہاری زلف میں آئی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو میرے نامۂ اعمال میں ہے

حیرت کی بات ہے کہ اقبال کو انگریز کا خوشامدی ہونے کے طعنے قادیانی دے رہے ہیں جن کے مذہبی اور سیاسی عقائد کا مرکزی نقطہ ہی انگریزوں سے وفاداری اور اطاعت ہے اور یہ بات بھی اپنی جگہ یکسر غلط ہے کہ اقبال نے صرف انگریزوں کے قصیدے ہی لکھے۔ اقبال نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس میں انگریزوں کی مخالفت کا حصہ وافر ہے۔ اقبال انگریزوں کی غلامی کے خلاف مسلمانوں کو درسِ حریت دیتے رہے ہیں۔ اقبال انگریزی فکر و دانش پر تابڑ توڑ حملے کرتے رہے۔ اقبال انگریزی تہذیب و تمدن کو عیاری اور مکاری کا کرشمہ قرار دے کر اسے اسلام کے خلاف فکری سازش سے تعبیر کرتے رہے۔ اقبال اسلام کی عظمت کے راستے پر انگریزوں کی سازشوں سے نقاب کشائی کا اہم ترین فریضہ ادا کرتے رہے اور یہ سب کچھ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے دنیا کا کوئی ذی شعور انکار نہیں کر سکتا بلکہ اصل بات جو حقیقت بن کر ہر کس و ناکس کے دل و دماغ پر نقش ہو چکی ہے، وہ یہ ہے کہ اقبال نے فکری محاذ پر انگریزوں کے خلاف جو کچھ لکھ دیا ہے ان کے مقابلے میں کوئی دوسرا شخص پیش ہی نہیں کیا جا سکتا۔

انگریز ایک طرف اقبال کو سر کا خطاب دے کر عام مسلمانوں کو اقبال کے بارے میں یہ تاثر دے رہے تھے کہ اقبال جیسے مفکر کو انگریز دل و دماغ سے پسند کرتے ہیں لیکن در پردہ انگریز جانتا تھا کہ اقبال کیا ہے اور کیا کر رہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں اس وقت کی سی آئی ڈی کی رپورٹوں میں اقبال کو ہندوستان میں ''خاموش بدمعاش'' **(Quietest Rouge in India)** قرار دیا گیا۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کھلا

قادیانی لٹریچر میں یہ بات بھی بڑی شدت کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ اقبال تو ہمارے ساتھ اچھلے بھلے تھے' احراریوں نے انھیں ورغلا کر ہمارے خلاف کر دیا۔ اعجاز قادیانی نے اپنی کتاب ''مظلوم اقبال'' میں اس بات کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ ان کے بقول چوہدری افضل حق' سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ' انور شاہ کشمیریؒ آئے دن اقبال کے ہاں چلے آتے اور انھیں اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ بالآخر وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گئے اور اقبال احراریوں کے ہتھے چڑھ کے ان کے ہمنوا ہو گئے۔ میں نے قادیانیوں کی اس کذب بیانی کا جواب اپنی اس کتاب میں دے دیا ہے کہ اقبال کو ورغلانا یا گمراہ کرنا تو خود اقبال کی توہین کے مترادف ہے جس کے قادیانی خواہش مند ہیں۔ ہاں البتہ یہ بات درست ہے کہ اقبال اور ان بزرگوں کے درمیان اکثر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان ملاقاتوں میں ظاہر ہے ختم نبوت کے موضوع پر بھی ان کے درمیان بات چیت ہو جاتی ہو گی کیونکہ اقبال کی زندگی میں یہ ایک نمایاں بات ہے کہ اقبال دین کے بارے میں جہاں کہیں ابہام یا تشکیک کا کوئی پہلو ہوتا' علمائے کرام سے رابطہ قائم کر کے ان سے مشاورت کر لیتے تھے۔ اس ضمن میں خصوصی طور پر حضرت انور شاہ کاشمیریؒ اور سیّد سلیمان ندویؒ کا نام مختلف کتابوں میں اکثر آیا ہے کہ ان حضرات سے اقبال کے خصوصی تعلقات تھے۔ اور یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ ختم نبوت کے مسئلے پر اقبال نے انور شاہ کاشمیریؒ سے کسب فیض کیا ہے لیکن جہاں تک اقبال کو گمراہ کرنے کا معاملہ ہے یہ قادیانیوں کی اپنی ذہنی اختراع ہے جس پر کسی طرح بھی یقین نہیں کیا جا سکتا۔ قادیانی حضرات کی فطرت میں یہ بات داخل ہو چکی ہے کہ وہ سچ میں جھوٹ کی آمیزش کر کے اپنے مطلب کی بات بنا لیتے ہیں اور دیکھا جائے تو اسی حرکت کا نام دجل ہے کہ پانی کے پاک وصاف گلاس میں مٹھی بھر مٹی ملا دو تاکہ وہ کسی کام کا نہ رہے۔ قادیانیوں کی یہ جسارت کہ انھوں نے اسلام کے نام پر قادیانیت کا پرچار کر کے پوری دنیا کو دام فریب میں پھنسانے کی جو کوششیں دنیا بھر میں کر رکھی ہیں' یہ اسی دجل کے دائرے میں آتی ہیں۔ لہٰذا یہاں بھی انھوں نے اسی دجل سے کام لیا ہے۔ اقبال اور انور شاہ کاشمیریؒ' اقبال اور امیر شریعت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ' اقبال اور مفکر احرار چوہدری افضل حقؒ کی ملاقاتیں تو فی الحقیقت ہوتی رہی ہیں لیکن اقبال کو قادیانیوں کے خلاف ورغلا لینے کی بات کہہ کر ان ملاقاتوں سے اپنا فائدہ اٹھا لیا تاکہ لوگوں کو باور کرایا جا سکے کہ اصل مسئلہ اقبال کا نہیں احراریوں کا ہے۔ اس جسارت پر سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

قادیانی عمر بھر یونہی خیال خام میں
خواہشیں بنتے رہے اور وسوسے چنتے رہے

(مصنف)

غرضیکہ علامہ اقبالؒ نے قادیانی عقائد اور قادیانی لٹریچر کا جو تنقیدی جائزہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس سے قادیانیت کے اصل خدوخال ابھر کر ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ قادیانی اسی بات کی آج تک جرأت نہیں کر سکے کہ اس کا جواب دیں' لہٰذا انھوں نے اصل معاملہ سے لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے علامہ اقبالؒ کی شخصیت کو مسخ کرنے کی ناپاک جسارت کی ہے۔ وقتاً فوقتاً ان کی ذات کو نشانہ بنا کر مسلمانوں کے دلوں میں ان کے احترام کو کم کرنے کی بے سود کوشش میں وہ حد سے تجاوز کر گئے ہیں۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قادیانیوں نے جتنا بھی مواد اقبالؒ کے خلاف اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے وہ علامہ اقبال کی وفات کے بعد تیار کیا گیا ہے۔ خصوصاً عبدالمجید سالک' اور ان کی موت کے بعد ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اور م۔ش نے اس مواد کی تیاری میں قادیانیوں کا پورا پورا ساتھ دیا ہے۔ ہفت روزہ ''چٹان'' کی فائلیں اس بات کی گواہ ہیں جو بوقتِ ضرورت قادیانیوں کی خدمت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔

جعفر بلوچ

اقبالؒ اور قادیانیت

قادیانیت یا مرزائیت کے لیے بعض مسلم اکابر نے جن میں خود حضرت علامہ اقبال بھی شامل ہیں' احمدیت کی اصطلاح سہواً استعمال کی ہے اور یہ بات غلامانِ احمد مختارؐ کے لیے دل آزاری کا باعث بنتی رہی ہے۔ محمدزم یا محمدیت کی طرح احمدزم یا احمدیت کی اصطلاح بھی اسلام کی متبادل قرار نہیں دی جا سکتی۔ مستشرقین کی وضع کردہ ان اصطلاحات سے کسی وضعی مذہب کا تصور ابھرتا ہے لیکن ان اصطلاحات کو مجبوراً استعمال کرنا بھی پڑے تو پھر محمدی یا احمدی کا اطلاق رسولِ ہاشمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان رکھنے والوں ہی پر ہو گا۔ عقیدۂ ختم نبوت اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ہے لہٰذا کوئی ایسا شخص احمدی یا محمدی کہلانے کا حق نہیں رکھتا جو ''لا نبی بعدی'' پر ایمان نہ رکھتا ہو اور شرک فی النبوۃ کا مرتکب ہو۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی خاتم النبیین رسولِ ہاشمی کا اسم ذاتی ہے اور غلامانِ رسولِ ہاشمی احمدی کہلانے میں فخر و شرف محسوس کرتے ہیں جبکہ متنبّی قادیان کا اصل نام غلام احمد تھا اور اس نے غلامیِ احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے لیے ناکافی اور ناشایانِ شان سمجھتے ہوئے کمال عیاری اور غداری سے خود احمد بن جانے کا دعویٰ کیا۔ غلام احمد کی امت و ذریت کو ''غلام احمدی'' کہلانا چاہیے نہ کہ احمدی۔ حضرت اسد ملتانی نے کیا پتے کی بات کہی تھی۔

نسبت ہمیں ہے احمدِ مختار سے اسد
ہم احمدی تو ہیں پر غلام احمدی نہیں

متنبّی قادیان نے اواخرِ عمر میں اپنی نبوت کا اعلان ایسے مبہم اور ملفوف انداز میں کیا کہ عوام تو کیا خواص اہلِ اسلام بھی ایک مدت تک اس کے خبثِ نیت سے پوری طرح باخبر نہ ہو سکے۔ جہاں تک حضرت علامہ اقبال کا تعلق ہے وہ بھی متعدد دیگر اکابرِ اسلام کی طرح ایک مدت تک مرزا غلام احمد قادیانی کی علمی اور معاشرتی خدمات کے معترف رہے لیکن اس کے دعوائے نبوت سے کاملاً آگاہ ہونے میں انھیں شاید کچھ دیر لگی۔ تاہم یہ بھی ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ حضرت علامہ ختم نبوت کے ہمیشہ قائل بلکہ

مبلغ رہے اور خاتم النبیین کے بعد کسی نبوت کو خواہ وہ ظلی یا بروزی ہی کیوں نہ ہو،ماننے کے بارے میں تو وہ سوچ ہی نہ سکتے تھے۔ چنانچہ آپ نے 23 فروری 1902ء کو انجمن حمایتِ اسلام کے سترہویں سالانہ جلسہ میں نظم بعنوان "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے" پڑھی اس کے بند نہم کا ایک شعر یہ تھا:

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نورِ شمعِ عرفاں کردہ ای

اس شعر کے پہلے مصرع کا پس منظر بیان کرتے ہوئے مولانا مہر لکھتے ہیں:

"یہ 1902ء کا کلام ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے لکھنے کی ضرورت مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوائے بروزیت کی بنا پر ہوئی۔ یعنی کہتے ہیں کہ تیرے بعد نبوت کا دعویٰ ہر لحاظ سے شرک فی النبوت ہے۔ خواہ اس کا مفہوم کوئی ہو یعنی ظلی اور بروزی نبوت بھی اس سے باہر نہیں۔"[1]

جناب اعجاز احمد نے "مظلوم اقبال" (مطبوعہ 1985ء) میں اور جناب شیخ عبدالماجد نے "اقبال اور احمدیت" (مطبوعہ اپریل 1991ء) میں اقبال اور قادیانیت کے بارے میں سنگین مغالطے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ سارا غصہ اس بات پر ہے کہ اقبال ایک عرصہ تک مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی جماعت سے حسنِ ظن رکھنے کے باوجود مسلمان کیوں رہے اور خود قادیانی کیوں نہ ہو گئے اور بیسویں صدی کے تیسرے عشرے میں قادیان شکنی کے مرتکب کیوں ہوئے۔ معترضینِ جدید کو خوب معلوم ہے کہ اقبال ان اعتراضات کا مسکت جواب پہلے ہی دے چکے ہیں۔ حضرت علامہ نے قادیانیوں کی تحریک کے بارے میں لکھا تھا:

"I have no hesitation in admitting that about a quarter of a century ago, I had hopes of good results following from this movement. I become suspicious of the movement when the claim of a new prophethood, superior even to the prophethood of the founder of Islam, was definitely put forward and the Muslim world was declared Kafir.[2]

حضرت علامہ کے اس بیان کا ترجمہ درجِ ذیل ہے:

"مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی----- ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس

وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت---- بانی اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت---- کا حتمی طور پر دعویٰ کیا گیا اور تمام عالم اسلام کو کافر قرار دیا گیا۔"

حضرت علامہ اقبال متنبی قادیاں کے دعویٰ نبوت ہی کو باطل سمجھتے تھے۔"بانی اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت" کا جملہ تو محض ایک جملہ معترضہ تھا اور اس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ قادیانی نبوت کا کریلا نیم چڑھا بھی ہے لیکن جناب اعجاز احمد بحث کو غلط رخ دینے کے لیے اسی جملہ معترضہ کو ہی بنیاد بنا کر یوں رواں ہوئے ہیں:

> "بانیِ سلسلہ احمدیہ نے کبھی حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت سے برتر نبوت کا دعویٰ نہیں کیا نہ کوئی احمدی بانیِ سلسلہ احمدیہ کو سرکارِ دو عالم سے برتر یقین کرتا ہے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن کریم میں خاتم النبیین کہا گیا ہے اور انھیں خاتم النبیین تسلیم کرنا ہر احمدی کا جزوِ ایمان ہے۔"[3]

گویا جناب اعجاز احمد اور شیخ عبدالماجد صاحبان کے نزدیک مرزائے قادیان نبی تو ہے لیکن خاتم النبیین سے برتر نبی نہیں ہے۔ حضرت علامہ اقبال حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے بعد کسی نبوت کے قائل نہ تھے اور انھوں نے ظلی اور بروزی نبوت اور ختم نبوت کی قادیانی تاویلوں کو بھی اپنے مضامین اور بیانات میں بہ دلائل رد کیا۔ علامہ اقبال کی یہ تحریریں جناب لطیف احمد شیروانی کی مرتب کردہ کتابوں "حرفِ اقبال" اور "سپیچز، رائٹنگز اینڈ سٹیٹ منٹس آف اقبال" اور دیگر کتب میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔

قادیانیوں کے بارے میں حضرت علامہ کو ابتداءً یقیناً کچھ غلط فہمیاں تھیں لیکن بعد میں وہ دور ہو گئیں۔ اس بات کا اعتراف خود حضرت علامہ نے بھی فرمایا ہے:

> "اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔"[4]

تاہم حضرت علامہ نے مرزائے قادیان کے دعویٰ نبوت کی کبھی تائید و تصدیق نہیں کی۔ اس سلسلے میں 23 فروری 1902ء کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے۔ مئی 1902ء کے "مخزن" میں حضرت علامہ کی ایک نظم بعنوان "خطِ منظوم---- پیغام بیعت کے جواب میں" شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کے چالیس اشعار تھے، جن میں سے صرف تیرہ اشعار "عقل و دل" کے عنوان سے بانگ درا میں شامل ہیں۔ باقی اشعار

''عقل ودل'' ہی کے زیرِ عنوان مولانا غلام رسول مہر کی مرتب کردہ ''سرودِ رفتہ'' میں شامل ہیں۔اس نظم پر مولانا مہر نے ذیل کا نوٹ دیا ہے:

''یقینی طور پر معلوم نہیں کہ یہ پیغام کس طرف سے آیا تھا لیکن قرینہ یہ ہے کہ یہ پیغام قادیانی جماعت کی طرف سے ملا تھا۔اس کی جانب کچھ اشارے خود نظم میں ہیں۔ایک قابلِ غور امر یہ ہے کہ اس خط کے جواب میں اسی بحر اور اسی زمین میں ایک نظم سیّد حامد شاہ نے لکھی تھی جو قادیانی جماعت کے ممتاز رکن تھے۔اس کا آخری شعر یہ تھا۔

کیوں نہ ہو خاکِ پا مرا اقبال
حامد نائبِ خدا ہوں میں'' 5

حضرت علامہ کی اس نظم اور اس پر مولانا مہر کے نوٹ کے بارے میں جناب بشیر احمد ڈار اپنی مرتب کردہ کتاب ''اقبال اور احمدیت'' میں فرماتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ (مولانا مہر کا اخذ کردہ) یہ نتیجہ بالکل قطعی ہے کہ یہ پیغام (بیعت کا) اسی جماعت کی طرف سے تھا۔اس نظم میں اقبالؒ نے جماعتِ احمدیہ کے متعلق مجمل طور پر وہی بات کہی جو انھوں نے ان کے خلاف اپنے پہلے بیان ''قادیانی اور جمہور مسلمان'' (1934ء) میں تفصیل سے کہی تھی۔یعنی اس جماعت نے مسلمانوں میں تفریق پیدا کر کے بھائی کو بھائی سے جدا کر دیا ہے۔
کہتے ہیں:

تو جدائی پہ جان دیتا ہے
وصل کی راہ سوچتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے
اس عبادت کو کیا سراہوں میں

پھر امیر جماعت کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ مخالفین کی موت کی پیش گوئی کرتے ہیں اور جب وہ مر جاتے ہیں تو ان پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔

مرگِ اغیار پر خوشی ہے تجھے
اور آنسو بہا رہا ہوں میں'' 6

13 نومبر 1915ء کو حضرت علامہ نے ایک قادیانی ہفت روزہ ''پیغام صلح'' کے ایڈیٹر کے نام

خط لکھا اور ان کلمات کی تردید کی جو کسی قادیانی نے قادیانیوں کی حمایت میں حضرت علامہ سے منسوب کیے تھے۔ حضرت علامہ نے لکھا:

''اس کے علاوہ یہ بات بدیہی ہے کہ ایک غیر احمدی مسلمان جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد کسی نبی کے آنے کا قائل نہ ہو وہ کس طرح یہ بات کہہ سکتا ہے کہ عقائد کے لحاظ سے قادیان والے سچے ہیں۔''

مدیر پیغامِ صلح کے نام حضرت علامہ کا متذکرہ بالا خط کلیات مکاتیب اقبال جلد اوّل مرتبہ سیّد مظفر حسین برنی کے صفحات 429 تا 431 پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ 1916ء میں قادیانی جماعت کے بارے میں حضرت علامہ کا موقف یہ تھا:

''جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد کسی ایسے نبی کا قائل ہو جس کا انکار مستلزم کفر ہو وہ خارج از اسلام ہوگا۔ اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔''[7]

7 اپریل 1932ء کو حضرت علامہ نے مرزائے قادیان اور اس کی جماعت کے بارے میں چودھری محمد احسن صاحب کو ایک خط میں لکھا:

''میرے نزدیک مہدی، مسیحیت اور مجددیت کے متعلق جو احادیث ہیں وہ ایرانی اور عجمی تخیلات کا نتیجہ ہیں۔ عربی تخیلات اور قرآن کی صحیح سپرٹ سے ان کو کوئی تعلق نہیں...... اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے کئی طریق ہیں۔ میرے عقیدۂ ناقص میں جو طریق مرزا صاحب نے اختیار کیا ہے وہ زمانۂ حال کی طبائع کے لیے موزوں نہیں۔''[8]

مادرِ انسانیت حضرت حوا کے بارے میں متنبی قادیان کا کیا عقیدہ تھا اور اس عقیدے کے بارے میں حضرت علامہ اقبال کی کیا رائے تھی، یہ حکایت مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

''راوی کا بیان ہے کہ جب علامہ اقبال کو ''تحفہ گولڑویہ'' مصنفہ متنبی قادیان کی وہ عبارت پڑھ کر سنائی گئی جس میں اس مفتری علی اللہ نے قرآن کریم کی آیات کو جھٹلاتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حوا نے شیطان کی قائم مقام بن کر آدم کو جنت سے نکال دیا اور علامہ ممدوح سے استفسار کیا گیا کہ ایسے عقیدہ رکھنے والے شخص کے حق میں آپ کی کیا رائے ہے؟ تو انھوں نے فرمایا:

''یہ عقیدہ مسلمانوں کا تو نہیں البتہ عیسائی ضرور ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ رہے مرزا غلام احمد قادیانی سو تعجب ہے کہ عورت ذات کے ساتھ ان کے تعلقات کی عمر بھر

کی نوعیت نے کس طرح گوارا کیا کہ حضرت حوا کو ایسے نازیبا الفاظ سے یاد کیا جائے اور یوں بھی کسی شریف النفس انسان کا جذبہ مروت وفتوت صنف نازک پر ایسے رکیک حملہ کی تاب نہیں لاسکتا۔''

اسی انداز میں چند باتیں علامہ اقبال کی زبان سے جناب مرزائے قادیانی آنجہانی کے صاحبزادہ بلند اقبال کی نسبت بھی صادر ہوئیں جو اس وقت ذہن سے اتر گئی ہیں۔ 9؎

بعض قادیانی تُک بند موقع بہ موقع حضرت علامہ اقبال کے خلاف دریدہ دہنی کا مظاہرہ بھی کرتے رہتے تھے۔ ایک ایسے ہی صاحب نے جو بقول مولانا ظفر علی خاں ''میر قاسم علی کی دو ورقی کی رعایت سے'' فاروق تخلص کرتے تھے' حضرت علامہ کی تخفیف اور تضحیک اور اپنے مردود عقائد کی اشاعت کی غرض سے ایک ہزل کہی۔ اس غزل کے دو شعر یہ تھے:

دیکھنی ہو عہد نو میں گر وہی شان و شکوہ
قادیاں میں' پھر مسلمانوں کی' بیداری بھی دیکھ
چھوڑ دے شکوے' مسیحِ پاک کو اقبال مان
اک نظر فاروق کی یہ گرم گفتاری بھی دیکھ

مولانا ظفر علی خاں کو یہ غزل جناب احمد ندیم قاسمی نے (جو اس زمانے میں پیرزادہ احمد شاہ ندیم قاسمی کہلاتے تھے اور بہاولپور میں کالج کے طالب علم تھے) بہاولپور سے اطلاعاً ارسال کی تھی۔ مولانا نے اپنے اخبارات میں اس پر فکاہات کا زعفران زار سجایا۔ پہلے تو نثر میں اس ہرزہ سرا کی خبر لی اور لکھا ''علامہ اقبال نے اگر اردو سے تعلق توڑ کر فارسی سے رشتہ جوڑ نہ لیا ہوتا اور قادیاں کے ماعروں کی پھکوڑیات کا جواب دینا ان کے لیے باعثِ عار وننگ نہ ہوتا وہ یقیناً اس نظم کا جواب یوں دیتے۔'' اس کے بعد آٹھ اشعار کی ایک نظم کہی ہے جس کے تین شعر یہاں درج کیے جاتے ہیں:

کاٹنا مقصود ہے اسلام کا جس سے شجر
قادیاں کے لندنی ہاتھوں میں وہ آری بھی دیکھ
مشی فی النوم اور اس کے فلسفہ پر کر نظر
قادیاں کے نازنینوں کی طرحداری بھی دیکھ
سن لے اپنے کان سے ''الفضل'' کی گالی گلوچ
لکھنؤ شرما گیا جس سے وہ بھٹیاری بھی دیکھ 10؎

2 جولائی 1933ء کی رات کو باغ بیرون دہلی دروازہ لاہور میں کشمیر کمیٹی کے سلسلہ میں تقریر کرتے ہوئے حضرت علامہ نے فرمایا:

''مجھے سیاسی انجمنوں میں قادیانیوں کی شمولیت پر مذہبی حیثیت سے کوئی اعتراض نہیں اگرچہ میں ان کے عقائد کو غلط سمجھتا ہوں۔''[11]

کشمیر کمیٹی سے مرزا بشیر الدین محمود کے مستعفی ہونے کے بعد قادیانیوں نے ''تحریکِ کشمیر'' کے نام سے ایک متوازی ادارہ قائم کیا اور حضرت علامہ کو اس کی صدارت کی پیش کش کی تو حضرت علامہ نے 2 اکتوبر 1933ء کو اس پیشکش کو قبول کرنے سے معذرت کرتے ہوئے فرمایا:

''میرے خط سے اخبارات کے بعض اہل قلم اصحاب نے جو غالباً قادیانی ہیں، یہ غلط مطلب اخذ کیا ہے کہ اصولی طور پر مجھے پیش کردہ صدارت کے قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ لہٰذا میں جلد از جلد یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ مجھے صرف صدارت کے قبول کرنے ہی سے اصولی اختلاف نہیں بلکہ میں تو ایسی پیشکش کے متعلق سوچنا ہی غلط سمجھتا ہوں...... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حالات کے پیش نظر ایک مسلمان کس طرح ایک ایسی تحریک میں شامل ہو سکتا ہے جس کا اصل مقصد غیر فرقہ داری کی ہلکی سی آڑ میں کسی مخصوص جماعت کا پروپیگنڈہ کرنا ہے۔''[11]

اور 1935ء اور اس کے بعد تو حضرت علامہ نے میرزائیت کے خلاف نظم و نثر میں بھرپور انداز میں قلم اٹھایا۔ شیخ عبدالماجد مصنف ''اقبال اور احمدیت'' کو اصرار ہے کہ اقبال 1935ء کے بعد قادیانی جماعت کے خلاف ہوئے جب انھیں چودھری سر ظفر اللہ خاں کے مقابلے میں وائسرائے ہند کی کونسل میں رکنیت حاصل نہ ہو سکی۔ حالانکہ مندرجہ بالا شواہد سے ثابت ہے کہ اقبال اپنے عقیدۂ ختم نبوت کا اعلان موقع بہ موقع عمر بھر کرتے رہے اور وہ قادیانی نبوت کے کبھی قائل نہیں رہے۔

اختصار کی غرض سے میں نے اقبال اور قادیانیت کی بحث کو 1935ء سے قبل تک محدود رکھا ہے۔ 1935ء اور اس کے بعد جو کچھ حضرت علامہ نے قادیانیت کے خلاف لکھا یا فرمایا' اس سے آگاہی کے لیے درج ذیل کتب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

i- حرفِ اقبال مرتبہ شاملو (لطیف احمد شیروانی)

ii- انوارِ اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار۔

iii- سپیچز' رائٹنگز اینڈ سٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ لطیف احمد شیروانی۔

-iv ڈسکورسز آف اقبال مرتبہ شاہد حسین رزاقی۔

-v تھاٹس اینڈ ریفلیکشنز آف اقبال مرتبہ سیّد عبدالواحد۔

-vi اقبال اوراحمدیت مرتبہ بشیر احمد ڈار۔

قادیانیت کے بارے میں حضرت علامہ کی بعض نظمیں بھی بہت اہم اورچشم کشا ہیں۔قادیانی شریعت میں جہاد وقتال کی تعلیمات پر خط تنسیخ پھیر دیا گیا۔اس ضمن میں حضرت علامہ ایک نظم بعنوان ''جہاد''(مشمولہ ضربِ کلیم)میں فرماتے ہیں:

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر
ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبۂ یورپ سے درگزر؟

اسی طرح ذیل کے اشعار میں بھی قادیانیت ہی کوموضوع سخن بنایا گیا ہے۔

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام
ہے کس کی یہ جرأت کہ مسلمان کو ٹوکے
حریتِ افکار کی نعمت ہے خداداد
چاہے تو کرے کعبے کو آتش کدہ پارس
چاہے تو کرے اس میں فرنگی صنم آباد
قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد
ہے مملکتِ ہند میں اک طرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس مسلمان ہے آزاد

ہندی مسلمان

غدارِ وطن اس کو بتاتے ہیں برہمن
انگریز سمجھتا ہے مسلماں کو گداگر
پنجاب کے اربابِ نبوت کی شریعت
کہتی ہے کہ یہ مومنِ پارینہ ہے کافر
آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر

مولانا ظفر علی خاں' جیسا کہ پہلے گزارش کی گئی' فتنۂ قادیان کے استیصال کے لیے پیش پیش رہنے والے مسلم اکابر میں سے تھے۔ ''ارمغانِ قادیان'' کے ایک مضمون بعنوان ''علامہ اقبال اور مسئلہ ختم نبوت'' میں وہ خود فرماتے ہیں:

''میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے' قادیانیت کا یہ خطرہ میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوا اور میری ساری عمر اس ہولناک فتنہ کا مقابلہ کرنے میں گزری ہے۔ مسلمانوں نے اوّل اوّل قادیانی خطرہ کو کچھ بہت زیادہ اہمیت نہ دی۔ علمائے امت نے اتنا ضرور کیا کہ جس طرح غلام احمد قادیانی نے ان کو اور باقی تمام مسلمانوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا' اسی طرح انھوں نے بھی اس پر اور اس کی امت قلیل الانفار پر کفر کا فتویٰ لگا دیا یا اس کے مایہ ناز مسئلہ مماتِ مسیح پر اس کے ساتھ اور اس کے اتباع واعوان کے ساتھ ہنگامہ خیز مناظرے کر لیے لیکن زہر کا یہ تریاق کچھ بہت زیادہ سود مند ثابت نہ ہوا اور میرزائیوں کا پروپیگنڈا اس مذہبی رواداری کے سایہ میں جس کا حکومت وقت کو ادعا ہے' پروان چڑھتا رہا۔

آخر میرے شور وغل اور میرے رفقاء کی ہائے وہو نے عام مسلمانوں کی آنکھیں کھولیں اور جب حکومت نے میرزائیت کی پیٹھ پر علی الاعلان تھپکیاں دینی شروع کیں تو ان کو صاف نظر آنے لگا کہ جس فتنہ سے انھیں پالا پڑا ہے' وہ کس قدر ہولناک ہے۔ میں پہلے دن سے پکار رہا ہوں کہ فرقہ ضالہ مرزائیہ جو اسلام کے نام پر مسلمانوں کی جڑیں کاٹنے میں شب وروز مصروف ہے' ہرگز یہ حق نہیں رکھتا کہ اس کا شمار مسلمانوں میں ہو بلکہ سکھوں' پارسیوں' عیسائیوں اور دوسری

اقلیتوں کی طرح اس فرقہ کا شمار بھی سرکاری کاغذوں میں ایک جداگانہ اقلیت کے طور پر ہونا چاہیے۔''

مولانا نے اپنے اس مضمون کے آخر میں تاریخِ تحریر 9 مئی 1935ء درج کی ہے۔ اسی مضمون میں انھوں نے حضرت علامہ کے قادیاں شکن بیان کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے' حضرت علامہ کو ان الفاظ میں خراجِ تہنیت پیش کیا:

''خدا بھلا کرے علامہ اقبال کا جن کے حکیمانہ بیان نے ان ساری حقیقتوں کو بہ کمال شرح وبسط الم نشرح کر کے مسلمانانِ ہند کی ایک ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی جس کا صلہ انھیں حضور سرورِ کون ومکاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم المرسلینی ہی کی بارگاہ سے مل سکتا ہے۔'' (ارمغانِ قادیان' طبع اوّل)

اور اب ارمغانِ قادیاں کی ایک مختصر نظم بھی نذرِ قارئین کرام ہے:

حقیقت قادیاں کی پوچھ لیجئے ابن جوزی سے
نکوکاری کے پردے میں سیہ کاری کا حیلا ہے
یہ وہ تلبیس ہے ابلیس کو خود ناز ہے جس پر
مسلمانوں کو اس رندے نے اچھی طرح چھیلا ہے
پلی ہے مغربی تہذیب کے آغوشِ عشرت میں
نبوت بھی رسیلی ہے پیمبر بھی رسیلا ہے
نصاریٰ کی رضا جوئی ہے مقصد اس نبوت کا
اور ابطالِ جہاد انجاح مقصد کا وسیلا ہے
بیاس اور اس کی موجیں آئے دن کرتی ہیں غمازی
کہ پوتا قادیاں کے رب اکبر کا رنگیلا ہے

''ارمغانِ قادیان'' کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ کارواں لاہور نے جناب نظیر لودھیانوی مرحوم سے مرتب کرا کے شائع کیا تھا۔ افسوس ہے اس ایڈیشن میں نثر کے وہ آٹھ مضامین شامل نہیں کیے گئے جو پہلے ایڈیشن میں شامل تھے۔ پھر موضوع زیرِ بحث کے بارے میں مولانا کی متعدد تحریریں ایسی ہیں جو اس کتاب کے پہلے ایڈیشن میں بھی شامل نہیں کی جا سکیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کتاب کا نیا ایڈیشن حسنِ تکمیل کے ساتھ پیش کیا جائے۔

❀ ❀ ❀

پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد

(صدر شعبہ اردو و اقبالیات' اسلامیہ یونیورسٹی۔ بہاولپور)

اقبال اور قادیانیت

یہ عجیب اور حیرت انگیز اتفاق ہے کہ بیسویں صدی کے نصف اوّل میں برعظیم پاک و ہند کے میدانِ ادبیات و سیاست کے افق پر تین عظیم شخصیات نمایاں ہوئیں اور تینوں کے بڑے بھائی قادیانی تھے۔ لیکن مولانا محمد علی جوہر اس اعتبار سے خوش قسمت ثابت ہوئے کہ ان کا انتقال 1931ء میں ہو گیا۔ پھر ان کا انتقال انگلستان اور تدفین فلسطین میں ہوئی، نیز مسلمانانِ برعظیم پر ان کے اثرات تحریکِ خلافت کے استثناء کے ساتھ کچھ زیادہ گہرے نہیں پڑے۔ اسی طرح ابوالکلام آزاد ایک زمانے میں مسلمانان پاک و ہند کی آنکھوں کا تارا ضرور بنے رہے لیکن آل انڈیا کانگرس سے وابستگی اور مسلم لیگ کی مخالفت و تحریکِ پاکستان کے خلاف سرگرمیوں کے سبب قبولِ عام حاصل کرنے کی بجائے ناپسندیدگی کا نشان بن گئے۔ یوں ان دونوں شخصیات کو کسی خاص جماعت یا گروہ سے وابستہ ظاہر کرنے میں کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ غالباً اسی لیے اس طرح کی کوششیں بھی نہیں کی گئیں۔ لیکن علامہ اقبالؒ اپنے شعری' فکری اور سیاسی کارناموں کے باعث جتنے مقبول اپنی زندگی میں تھے' وفات کے بعد اس سے کہیں زیادہ ہو گئے۔ پھر یہی نہیں بلکہ وہ پاکستان و ہند کی تحدیدات سے نکل کر ممدوحِ عالم کے مرتبے پر فائز ہو گئے اور جیسے جیسے وقت گزر رہا ہے ویسے ویسے اقبال کے قدر دانوں کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن اقبال کے لیے یہ قبولِ عام جس قدر باعث اعزاز ہو سکتا ہے' اس سے کہیں زیادہ مصیبت خیز ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ یار لوگ ان کی فکر کو سمجھے بغیر اور ان کے پیغام کی طرف سے آنکھیں بند کر کے ان کے استحصال میں لگ گئے۔

ہمارے ملک میں ہر طبقہ' ہر جماعت اور ہر گروہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اقبال کو ذریعہ بنانے میں لگا ہوا ہے۔ اکثر اوقات دیکھا گیا ہے کہ متصادم نظریات و خیالات کے حامل لوگ بھی

اپنے اپنے نقطۂ نظر کے لیے سند کے طور پر اقبال ہی کو تختۂ مشق بناتے ہیں۔ مثلاً ایک زمانے میں سرمایہ داری نظام کے حامی

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

کا حوالہ دے کر اقبال کو اشتراکیت کا مخالف قرار دینے کی کوشش کرتے تھے جبکہ اشتراکیت کے حامی ''اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو'' والے مصرع سے اقبال کو کارل مارکس کے بعد دنیا کا سب سے بڑا اشتراکی ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس لیے کہ اس طرح سادہ لوح لوگوں کو بہکانے میں مدد مل سکتی تھی۔ چنانچہ قادیانیوں نے بھی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اقبال کے نام کو استعمال کرنے کی کوششیں کیں اور ایسی کوششیں اب تک جاری ہیں۔

قادیانیوں کی اس نوع کی کوششوں کے لیے جو حقائق یا مفروضے بنیاد بن رہے ہیں ان میں علامہ اقبال کے والد شیخ نور محمد اور بڑے بھائی شیخ عطا محمد' بھتیجے شیخ اعجاز احمد اور استاد مولوی میر حسن کی قادیانیت یا قادیانیت کی طرف میلان' قادیان میں آفتاب اقبال کی تعلیم' اقبال کے کچھ مضامین بطور خاص ''ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر'' میں قادیانی فرقے کی تعریف' والدۂ جاوید کی رخصتی سے پہلے قادیانیوں کے خلیفہ اوّل حکیم نور الدین سے از سر نو نکاح کرنے یا نہ کرنے سے متعلق استفسار اور کشمیر کمیٹی کی صدارت کے لیے مرزا بشیر الدین محمود کی صدارت پر اتفاق' نیز خود علامہ اقبال کی مرزا صاحب سے بیعت وغیرہ شامل ہیں۔ اور بظاہر یہ اتنے مضبوط حوالے ہیں کہ اگر یہ حوالے کسی بھی شخص سے متعلق کر دیے جائیں تو پھر اسے قادیانی ہونے سے نہیں بچایا جا سکتا۔ لیکن ہماری مشکل یہ ہے کہ ہمارا موضوع کوئی عام شخص نہیں بلکہ اقبال ہے جو ایک ہی سانس میں اشتراکیت کی تحسین بھی کرتا ہے اور تنقیص بھی۔ جو جمہوریت کو بہترین سیاسی نظام بھی سمجھتا ہے اور اس کی خرابیاں بھی گنواتا ہے۔ جو مسولینی اور مصطفےٰ کمال پاشا کی تعریف کرتے بھی نہیں تھکتا لیکن ان کی خبر بھی خوب لیتا ہے۔ اس اقبال پر نہ تو کوئی فتویٰ لگانا آسان ہے اور نہ اسے اپنی پسند کے کسی خاص اور محدود دائرے میں مقید کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک قادیانیت اور اقبال سے متعلق حقائق اور مفروضوں کا تعلق ہے' ان کا جائزہ لینے سے قبل یہ جان لینا چاہیے کہ بعض صنعتوں میں صفِ اوّل کا شہر ہونے کے باوجود آج بھی سیالکوٹ پاکستان کے بڑے شہروں میں شمار نہیں ہوتا اور اقبال کی پیدائش سے بھی تیرہ سال پہلے 1864ء میں جب مرزا صاحب یہاں بہ سلسلہ ملازمت مقیم رہے ہوں' تو تصور کیا جا سکتا ہے کہ سیالکوٹ کیا اور کتنا بڑا شہر ہو گا؟ ایسے میں ایک سرکاری ملازم اور وہ بھی کچہری میں اہل مد سے کس کس کے تعلقات اور شناسائی

نہ ہوگی۔ یقین کرنا چاہیے کہ انہی تعلقات کے باعث محدث اور مجدد کے دعووں کے وقت بہت سے لوگوں نے ان کا ساتھ دیا ہوگا۔ انہی میں شیخ نور محمد بھی شامل رہے ہوں گے۔ چنانچہ کسی موقع پر انھوں نے بیعت بھی کر لی ہوگی لیکن طبع سلیم کے شیخ نور محمد بہت عرصے تک ساتھ نہ نبھا سکے اور جلد ہی مرزا صاحب کے اثر سے نکل آئے۔ اس سلسلے میں شیخ عطا محمد کے بیٹے شیخ اعجاز احمد، مرزا غلام احمد قادیانی اور حکیم نورالدین سے شیخ نور محمد کے تعلقات، عقیدت اور بیعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

1902ء میں جب ہماری منجھلی پھوپھی ''طالع بی'' کا انتقال ہوا تو سیالکوٹ کے احمدی حضرات ان کے جنازے میں شامل نہ ہوئے۔ اس پر میاں جی نے حضرت میر حامد شاہ...... کی زبانی حضرت بانی سلسلہ احمدیہ کو پیغام بھیجا کہ ''میں عمر رسیدہ ہوں۔ آپ کے ساتھ اس قدر تیز نہیں چل سکتا۔ ''......ان کے متعلق صرف یہ کہنا کہ وہ احمدی نہ تھے نامکمل بات ہوگی۔ ہاں یہ کہنا درست ہوگا کہ وہ ابتداء میں جماعت میں شامل ہو گئے تھے لیکن 1902ء میں جماعت سے الگ ہو گئے۔''[1]

گویا شیخ نور محمد کے بارے میں یہ طے ہے کہ وہ قادیانی جماعت میں شامل ہوئے بھی تھے تو فوراً اس سے الگ بھی ہو گئے لیکن شیخ عطا محمد کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اعجاز احمد کے بقول ان کے والد احمدی تھے جبکہ شیخ عطا محمد کے ایک دوسرے صاحبزادے اور ایک دختر کے نزدیک شیخ عطا محمد بھی مرزائیت سے تائب ہو گئے تھے۔ غالباً اس لیے ان کی جنازے کی نمازیں بھی دو ہوئیں۔ اس کے علاوہ خود شیخ اعجاز احمد لکھتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ جاوید کے راویوں نے 1914ء کے بعد ابا جان کے احمدیوں کے کسی ایک فریق کے ساتھ شامل نہ ہونے سے یہ نتیجہ نکالا ہوگا۔''[2]

ہم جانتے ہیں کہ احمدیوں (مرزائیوں) کے دو ہی گروہ ہیں یعنی قادیانی اور لاہوری۔ لیکن شیخ اعجاز احمد خود تسلیم کرتے ہیں کہ شیخ عطا محمد نہ لاہوری تھے اور نہ قادیانی گروپ میں شامل ہوئے پھر معلوم نہیں کہ وہ کیسے مرزائی تھے۔ اسی طرح شیخ اعجاز احمد اپنی کتاب میں شیخ عطا محمد کے ایک خط کا اقتباس نقل کرتے ہیں، جس میں شیخ عطا محمد اپنی مرزائیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں خود بھی تو مرزائی ہوں لیکن مجھ میں اُن میں صرف جنازے کے فرق کا سوال ہے۔''[3]

یعنی شیخ عطا محمد ایسے قادیانی تھے جن کا تعلق نہ لاہوری گروپ سے تھا اور نہ قادیانی گروپ سے، نیز جنازے کے سوال پر بھی اُن کا اختلاف تھا۔ اس کے باوجود اگر شیخ عطا محمد کو بقول شیخ اعجاز احمد احمدی مان لیا جائے تو بھی اس سے علامہ اقبال کا قادیانی ہونا لازم نہیں آتا۔ اس لیے کہ خود اقبال جیسے

چچا کے خیالات اعجاز احمد پر اپنا اثر نہ ڈال سکے اور نہ انھیں ان کے ماموں متاثر کر سکے جن کے بارے میں وہ خود لکھتے ہیں:

> ''میرے ماموں شیخ غلام نبی بڑے نیک اور شریف النفس بزرگ تھے' لیکن عقیدۃً کٹر وہابی اور احمدیت کے مخالف۔''4

اگر چچا اور ماموں شیخ اعجاز احمد کو متاثر نہ کر سکے تو یہ کیوں فرض کر لیا جائے کہ محض بھائی کی احمدیت کے باعث علامہ اقبال بھی احمدی ہو گئے ہوں گے۔

اپنے خاندان کے بزرگوں کے برعکس شیخ اعجاز احمد البتہ آخر تک مرزائیت پر قائم رہے اور اس کا علم اقبال کو بھی تھا۔ اس حوالے سے شیخ عبدالماجد سوال اٹھاتے ہیں کہ جب اقبال کو اعجاز کی قادیانیت کا علم تھا تو وہ اسے ایک نیک اور صالح نوجوان کیوں لکھتے ہیں۔5 اس کا بڑا سیدھا سا جواب ہے کہ شیخ اعجاز احمد بھی تو اپنے ''کٹر وہابی اور احمدیت کے مخالف'' ماموں کو نیک اور شریف النفس لکھتے ہیں۔ یعنی اکثر اوقات ذاتی نیکی اور شرافت کا عقائد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اعجاز احمد تو ایک طرف میں تو حضرت ابوسفیان کے کردار کے اس پہلو کا معترف ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بدترین دشمنی کے باوجود انھوں نے اپنے زمانۂ کفر میں بھی دربارِ قیصر روم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف و تحسین کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا اور یہ بات خود علامہ اقبال کے کریڈٹ میں جاتی ہے کہ وہ اپنے بھائی اور بھتیجے کے عقائد سے واقفیت کے باوجود ان کی کردار کشی کرنے کی بجائے ان کی شخصی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ اقبال کے اس خاندان کی احمدیت اور اس کے باعث اقبال کو احمدی ثابت کرتے ہوئے یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ خود بقول شیخ اعجاز احمد ان کے خاندان میں شیخ نور محمد کی طرف سے احمدی گروہ سے الگ ہو جانے کے بعد گھر میں کبھی احمدیت کا تذکرہ نہیں سنا گیا۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''میاں جی کے جماعت احمدیہ سے علیحدگی کے بعد ہوش سنبھالنے پر میں نے گھر میں احمدیت کا چرچا نہیں سنا۔''6

اسی طرح بقول پروفیسر محمد اسلم 3 فروری 1954ء کو شیخ اعجاز احمد کے انتقال کے بعد شیخ نور محمد کے اخلاف میں سے کوئی بھی قادیانی نہیں رہا۔7

رہے علامہ اقبال کے استاد مولوی میر حسن تو بلاشبہ اقبال کو ان سے آخر وقت تک بے حد عقیدت رہی۔ لیکن اوّل تو مولوی میر حسن کے بارے میں بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کیسے عقائد رکھتے تھے! مثلاً بعض لوگ انھیں قادیانی کہتے ہیں تو بعض کے نزدیک وہ صحیح العقیدہ حنفی مسلمان تھے جیسا

کہ معروف اقبال شناس ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی مولوی میر حسن کے مسلک اور آزاد خیالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دراصل بات یہ ہے کہ اگرچہ شاہ جی عملاً حنفی مسلک کے پیرو تھے۔ لیکن مذہبی معاملات میں رواداری اور فراخ دلی برتتے تھے۔''[8]

اس کے باوجود جو لوگ مولوی میر حسن کو قادیانی ثابت کرنا چاہتے ہیں' انھیں یہ بات ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ مولوی صاحب کے سر سیّد احمد خان کے ساتھ بڑے مخلصانہ روابط تھے۔ نیز ان لوگوں کو مولانا عبدالمجید سالک کی تصنیف ضرور دیکھنا چاہیے جس میں مولانا میر حسن سے مرزا صاحب اور حکیم نور الدین کے تعلقات کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ ان عبارتوں سے یوں لگتا ہے کہ جیسے مسیح ومہدی مرزا صاحب نہیں بلکہ میر حسن تھے۔[9] اور حکیم نور الدین خلیفہ اوّل نہیں بلکہ میر حسن کے بے تکلف دوست تھے' جن سے چھلیں بھی جائز تھیں اور جملے بازی بھی۔[10] لیکن اگر مولوی میر حسن کو قادیانی بھی مان لیا جائے تو بھی یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے اثر سے علامہ اقبال بھی قادیانی ہو گئے ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ تو بعد ازاں ایسے اساتذہ سے بھی پڑھے تھے جو عیسائی تھے اور اقبال کو ان سے عقیدت مندانہ تعلق بھی تھا مثلاً پروفیسر ٹامس آرنلڈ۔ تو کیا یہ سمجھنا چاہیے کہ علامہ اقبال خدانخواستہ ایک استاد کی وجہ سے قادیانی اور دوسرے کی وجہ سے عیسائی ہو گئے ہوں گے۔ حالانکہ ہم سب خود اپنے اپنے زمانہ طالب علمی میں مختلف عقائد رکھنے والے اساتذہ سے پڑھتے ہیں لیکن ان اساتذہ کی پیروی میں اپنا مسلک نہیں بدلتے۔

جہاں تک علامہ اقبال کی ذاتی زندگی اور ان کے بیانات کا تعلق ہے تو اس میں بظاہر بعض چیزیں تعجب خیز ہیں۔ کچھ چیزیں اقبال پر قادیانیت کا الزام لگانے والوں کے لیے اور کچھ ہمارے لیے۔ مثلاً ہمارے لیے یہ امر باعثِ تعجب ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے فرزند آفتاب اقبال کو قادیان بھیج کر وہاں کے تعلیم الاسلام سکول میں داخل کرایا تھا۔[11] لیکن غور کیا جائے تو یہ اس زمانے کی بات ہے جب علامہ اقبال پر قادیانیت کی حقیقت نہیں کھلی تھی اور یہ اسے بھی مسلمانوں کے بہت سے دوسرے فرقوں کی طرح کا ایک فرقہ تصور کرتے تھے۔ جب حقیقت کھلی تو اقبال بیزار ہو گئے اور بیزاری بغاوت تک جا پہنچی جیسا کہ اقبال خود لکھتے ہیں:

''کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہیے۔[12] تحریک کے دو گروہوں کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانیِ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے' معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کس راستے پر پڑ جائے گی۔ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا' جب ایک نئی نبوت...... بانیِ اسلام کی

نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔[13]

حضرت علامہ کا یہ اقتباس ان لوگوں کے لیے بھی کافی ہونا چاہیے جو ان کے بعض مضامین مثلاً 1900ء میں انڈین اینٹی کویری میں چھپنے والے مضمون اور 1911ء میں علی گڑھ میں پڑھے گئے مضامین کا حوالہ دیتے ہیں، جن میں بالترتیب علامہ اقبال نے مرزا صاحب کو "موجودہ دور کے ہندی مسلمانوں میں غالباً سب سے بڑا دینی مفکر"[14] اور قادیانیوں کے طرزِ حیات کو اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ قرار دیا ہے۔[15] ان باتوں کا ذکر ذرا آگے بھی آئے گا لیکن ہمارے لیے باعثِ تعجب امر یہ بھی ہے کہ علامہ اقبال نے 1902ء میں بعض فقہی مسائل کے لیے حکیم نورالدین سے رجوع کیا۔[16] یا ایک ذاتی معاملے میں فتویٰ کی ضرورت پڑی تو بھی حکیم نورالدین سے رجوع کیا گیا۔[17] اسی طرح علامہ اقبال نے بشیر الدین محمود کی علمیت کی تعریف کی۔[18] اور پھر انھیں کشمیر کمیٹی کا صدر بنوایا۔[19] دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر لندن کی مسجد احمدیہ میں گئے اور وہاں قرآن سنانے پر انعام دیا۔[20] یہ اور اسی طرح کی دوسری بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں یقیناً حیرت انگیز ہیں۔

لیکن ذرا سا غور کیا جائے اور شخصیات و تحریکات کے بارے میں اقبال کے طریقِ کار سے متعلق قدرے آگہی ہو تو یہ سب باتیں تعجب خیز نہیں رہتیں۔ ہم جانتے ہیں کہ اقبال شخصیات و تحریکات کے بارے میں اپنی آراء بے کم و کاست اور بلا مصلحت و تعصب دینے کے عادی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ عام لوگوں کی روش یعنی اپنی رائے پر آنکھیں بند کر کے ڈٹ جانے اور نظرِ ثانی نہ کرنے کے بھی عادی نہیں مثلاً ایک زمانے میں انھوں نے مسولینی کے بارے میں لکھا:

ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
رومۃ الکبریٰ! دگرگوں ہو گیا تیرا ضمیر
اینکہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب
فیض یہ کس کی نظر کا ہے؟ کرامت کس کی ہے
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب[21]

لیکن صرف چار سال بعد علامہ اقبال نے اسی عنوان سے ایک اور نظم لکھی جس میں مسولینی اپنے مظالم کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومانِ مغرب کا مزاج
میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار! تو چھلنی میں چھاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
آلِ سیزر چوبِ نے کی آبیاری میں رہے
اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج
پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج 22

یعنی جب مسولینی اطالیہ کی بیداری کے لیے جدوجہد کرتا ہے تو اقبال اس کی تعریف کرتے ہیں لیکن جب مسولینی ہوسِ ملک گیری کا شکار ہو کر دیگر یورپی استعمار کی طرح اپنے کمزور ہمسایوں کو نشانہ بناتا ہے تو اقبال اپنی پرانی رائے کا لحاظ کیے بغیر اس کی مذمت کرتے ہیں۔ بانگِ درا کی نظم خضرِ راہ اور پیامِ مشرق میں اقبال نے انقلابِ روس اور وہاں کے اشتراکی نظام کو جس طرح سراہا ہے اس کے ساتھ جاوید نامہ اور ارمغانِ حجاز کی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' کو پڑھ کر اوپر دی گئی رائے کی توثیق ہوتی ہے۔ پیامِ مشرق میں اقبال نے مصطفےٰ کمال پاشا کو 'ایداللہ' 23 تک کہہ دیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جب اتاترک نے اسلامی شعائر کا مذاق اڑانا چاہا تو اقبال نے جاوید نامہ میں اسے خوب لتاڑا اور ایک دوسری جگہ یہاں تک کہہ دیا:

نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ روحِ مشرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

کارل مارکس اور نطشے کے بارے میں اقبال کا یہ مصرع ''قلب او مومن دماغش کافر است'' اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ اقبال کی آراء یک رخی اور متعصّبانہ نہیں ہوتیں۔ یہی حال قادیانیت اور قادیانی گروہ کا بھی ہے۔ اقبال نے اس تحریک اور تحریک کے افراد میں جو خوبیاں دیکھیں ان کا اعتراف نہایت خوش دلی سے کیا لیکن جس طرح مغربی تمدن کے بعض اوصاف کے اعتراف کے باعث اقبال کو عیسائی قرار نہیں دیا جاسکتا، اسی طرح قادیانی گروہ کی بعض خوبیوں کا اعتراف بھی اقبال کو قادیانی ثابت نہیں کرسکتا جبکہ بعض امور میں وقت کا اقتضاء بھی پیشِ نظر ہو۔ مثلاً کشمیر کمیٹی کے لیے مرزا بشیر الدین محمود

کی صدارت وغیرہ۔اس سلسلے میں خود شیخ اعجاز احمد کو اعتراف ہے۔وہ کہتے ہیں:

''علامہ اقبال نے تجویز کیا کہ جماعت احمدیہ کے امام اس کمیٹی کے صدر ہوں۔
ان کے پاس مخلص اور کام کرنے والے کارکن بھی ہیں اور وسائل بھی۔''[24]

یعنی اگر مخلص کارکن اور ضروری وسائل کسی اور کے پاس ہوتے تو بشیر الدین محمود کو کشمیر کمیٹی کا صدر بنانا ضروری نہیں تھا۔

جہاں تک بعض فقہی مسائل کے بارے میں مرزا صاحب سے استفسار اور اپنے ذاتی شرعی مسئلے میں حکیم نور الدین سے فتویٰ کے حصول کا تعلق ہے تو ان قصوں کے راوی مرزا جلال الدین 'عبدالمجید سالک [25] اور شیخ اعجاز احمد [26] یعنی سب کے سب یا تو قادیانی ہیں یا پھر قادیانیوں میں گھرے ہوئے ہیں' جو ہر صورت میں علامہ اقبال کو بھی اپنے گروہ میں کھینچ لانے کی کوششیں کرتے رہے ہیں' لیکن فقہی اور ذاتی مسائل میں قادیان سے استمداد کی کہانی کو رد کرنے کی وجہ صرف یہی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ علامہ اقبال 1902ء میں نہ سہی' والدۂ جاوید کی رخصتی کے اہتمام کے وقت فقہ اسلامی سے اس قدر ضرور واقف ہو چکے تھے کہ روزمرہ مسائل کے بارے میں از خود کوئی رائے قائم کر سکیں مثلاً والدۂ جاوید سے ازسرنو نکاح کا معاملہ تو مجھ ایسا دین کی مبادیات تک سے ناواقف آدمی بھی بخوبی سمجھتا ہے۔ مثلاً میں کہہ سکتا ہوں کہ پیش آمدہ صورتِ حال میں یا تو طلاق ہوگئی تھی یا نہیں ہوئی تھی۔اگر نہیں ہوئی تھی تو ازسرنو نکاح کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور اگر طلاق ہوگئی تھی تو شرعاً ازسرنو نکاح کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ معلوم نہیں کہ اقبال جیسے مفکر اسلام کو اس واضح معاملے کے لیے استفسار کی ضرورت کیوں پیش آئی۔غور کیجئے تو یہی باتیں معاملے کو الجھانے کا باعث بنتی ہیں۔لیکن ذرا سے غور اور تدبر سے حقیقتِ حال سامنے آجاتی ہے۔اگر مفروضے کے طور پر اس واقعے کو حقیقت مان لیا جائے تو بھی حکیم نور الدین صاحب کی دینی معلومات کا حال کھل جاتا ہے۔یہی نہیں بلکہ اقبال کو قادیانی اور احمدی ثابت کرنے کے لیے 1897ء میں بعض تعلیم یافتہ دوستوں کے ساتھ قادیان جا کر اقبال کی بیعت تک کے واقعات گھڑ لیے گئے ہیں۔مثلاً شیخ عبدالماجد' مولانا شیخ عبدالقادر' بشیر احمد ڈار' خواجہ کمال الدین اور مولانا محی الدین قصوری کی روایات کے ذریعے سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اقبال نے بانیٔ سلسلہ احمدیہ سے بیعت کی تھی۔وہ مولانا شیخ عبدالقادر کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''مارچ 1897ء میں............مولوی محمد علی صاحب' چودھری سر شہاب الدین صاحب' ڈاکٹر محمد اقبال صاحب اور مولوی غلام محی الدین صاحب قصوری اور خاکسار نے بیعت کر لی۔''[27]

فرض کیا ایسا ہے، اقبال اس بیعت کے سبب 1931ء تک قادیانی رہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ 1902ء میں انھیں بیعت کی دعوت کیوں دی گئی؟ اور اس دعوت کے جواب میں اقبال نے یہ کیوں نہ کہا کہ وہ پہلے ہی بیعت کر چکے ہیں یا یہ کہ وہ تو بیعت کر چکے تھے، لیکن اب ان کے خیالات بدل چکے ہیں وغیرہ۔ یہ سب کچھ کہنے کی بجائے اقبال نے ایک نظم 28 کیوں لکھ بھیجی جس کے ردِعمل میں پیغام بیعت بھیجنے والے نے بھی جوابی نظم لکھی۔ لیکن اس کے باوجود اقبال کو بیعت یا ازسرِنو بیعت پر آمادہ نہ کیا جا سکا۔ اس سلسلے میں شیخ اعجاز احمد کا بیان حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اقبال کی نظم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس سے اتنا تو معلوم ہوا کہ اس سے پہلے اقبال نے بیعت نہیں کی ہوئی تھی۔
اگر کی ہوتی تو یہ پیغام کیوں بھیجا جاتا۔''29

اس سے پہلے ہی نہیں بلکہ اقبال نے اس کے بعد بھی کبھی بیعت نہیں کی۔ کی ہوتی تو اقبال کی طرف سے قادیانیت کے خلاف دیے گئے بیانات کے بعد اس سلسلے میں ڈھنڈورا پیٹ دیا جاتا۔ مثلاً لاہور میں پنڈت نہرو کے استقبال کے سلسلے میں میاں محمود احمد خلیفۂ قادیان نے اپنے ایک خطبے میں معترضین کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا:

''اگر پنڈت جواہر لال نہرو اعلان کر دیتے کہ احمدیت کو مٹانے کے لیے وہ اپنی تمام طاقت خرچ کر دیں گے جیسا کہ احرار نے کیا ہوا ہے تو اس قسم کا استقبال بے غیرتی ہوتا لیکن اگر اس کے برخلاف یہ مثال موجود ہو کہ قریب کے زمانہ ہی میں پنڈت صاحب نے ڈاکٹر اقبال صاحب کے ان مضامین کا رد لکھا ہے جو انھوں نے احمدیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ قرار دیے جانے کے لیے لکھے تھے اور نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے احمدیت پر اعتراض اور احمدیوں کو علیحدہ کرنے کا سوال بالکل نامعقول ہے اور خود ان کے گزشتہ رویہ کے خلاف ہے..........''30

غور کیجیے کہ اگر اقبال نے کسی زمانے میں بیعت کی ہوتی تو پھر صرف ان کے گزشتہ رویے کا ذکر نہ کیا جاتا بلکہ ان کی گزشتہ بیعت کا ذکر کیا جاتا۔ جملہ معترضہ کے طور پر یہ بات بھی کہہ دینا چاہیے کہ اس زمانے تک اقبال اسی لیے تو احمدیت کے شدت سے مخالف ہو گئے تھے کہ احمدیت کے تحفظ کے لیے پنڈت نہرو جیسے دشمنانِ ملت اسلامیہ برسرِ کار آ چکے تھے۔ ویسے قادیانیت کے بارے میں علامہ اقبال کی گزشتہ تحریروں کو بھی بڑے غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے اور وہ یوں کہ علامہ اقبال اپنے اصل مضامین میں وہ کچھ کہتے نظر نہیں آتے جو ان کے مضامین کے تراجم میں نظر آتا ہے۔ اس کے لیے صرف ایک مثال کافی ہوگی اور وہ یہ کہ علامہ اقبال نے 1911ء میں ایک مضمون The Muslim

Community___ A Sociological Study لکھا ہے۔ اس کا سب سے پہلا ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے کیا۔ یہ ترجمہ تو فوری طور پر میرے پاس موجود نہیں البتہ شیخ اعجاز احمد نے اپنی کتاب "مظلوم اقبال" میں موضوع جملے کا ترجمہ درجِ ذیل الفاظ میں مولانا ظفر علی خان کے حوالے سے یوں لکھا:

''پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے، جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں۔'' 31

افکارِ اقبال میں ڈاکٹر ریاض احمد نے یہ ترجمہ یوں کر دیا:

''پنجاب میں بنیادی طور پر مسلم طرز کے کردار کا زوردار ظہور قادیانی نام کے فرقے میں ہے۔'' 32

جبکہ مقالاتِ اقبال مرتبہ سیّد عبدالواحد میں اس جملے کے ترجمے کو سرے سے حذف کر دیا گیا ہے۔ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ محض اتفاقات ہیں یا ان تحریفات کے پیچھے کوئی خاص سوچ کارفرما ہے کہ اقبال نے تو اپنے اصل مضمون میں قادیانی فرقے کی تعریف کرتے ہوئے کچھ اور الفاظ استعمال کیے تھے۔ انھوں نے لکھا تھا:

"In the Punjab the essentially Muslim type of character has found a powerful expression in the So-called Qadiani Sect" 33

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ علامہ اقبال کے اس جملے میں موجود لفظ ''So-called'' کا ترجمہ کسی بھی مترجم نے نہیں کیا۔ یہی حال ''سب سے بڑے دینی مفکر'' والے جملے کا بھی ہے۔ اقبال نے یہاں بھی ''Probably'' 34 کا لفظ استعمال کیا ہے' جسے اکثر مترجمین حذف کر جاتے ہیں۔ اس کے باوجود گزشتہ اور موجودہ رویے کے سلسلے میں حرفِ اقبال میں شامل اقبال کے یہ جملے قابلِ غور ہیں:

''اگر میرے موجودہ رویہ میں تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔'' 35

- اقبال کے اعتقادات وعقائد دیکھ کر بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انھیں قادیانی مذہب سے کس قدر ہمدردی ہو سکتی تھی۔ مثلاً مرزا صاحب جس جوش وخروش کے ساتھ ردِ جہاد کرتے نظر آتے ہیں' اس کے پیشِ نظر اقبال کو قادیانیت سے ویسی ہی دلچسپی ہو سکتی ہے' جتنی نطشے کو مساکین کے مذہب عیسائیت سے تھی اور یہ حقیقت تو اپنی جگہ ہے کہ موجودہ دور میں اقبال کو کسی نبی' رسول اور پیغمبر تو در کنا کسی عیسیٰ اور

مہدی کا بھی انتظار نہیں۔[36] جبکہ عقیدۂ ختم نبوت پر ان کا ایمان ان کے اشعار سے بھی ثابت ہے:

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہ ہو قوت و شوکت کا پیام

پھر یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مرزا صاحب کے تو تمام ابتدائی دعوؤں کو نظر انداز کر کے انھیں ان کے آخری دعوے کے مطابق نبی مان لیا جائے لیکن اقبال کے ابتدائی جملوں میں بھی تحریف کر کے انھیں قادیانی قرار دیا جائے اور ان کے فکری پختگی کے زمانے کے مضامین و مقالات کو احرار کی سازش کہہ کر رد کرنے کی سعی کی جائے۔ بالفرض یہ درست بھی ہو تو احرار کا یہ کارنامہ میرے نزدیک ان کی تمام لغزشوں اور کوتاہیوں کے باوجود ان کے لیے نجاتِ اخروی کا سبب بن جائے گا۔ خدا انھیں جزائے خیر دے۔
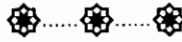
حواشی

1. مظلوم اقبال از شیخ اعجاز احمد صفحہ نمبر 185 مطبوعہ شیخ شوکت علی پرنٹرز اشاعت اوّل 1985ء۔
2. مظلوم اقبال صفحہ نمبر 189۔
3. مظلوم اقبال صفحہ نمبر 188۔
4. مظلوم اقبال صفحہ نمبر 188۔
5. اقبال اور احمدیت از شیخ عبدالماجد صفحہ نمبر 46,47,48,49۔ مطبوعہ لاہور آرٹ پریس انارکلی لاہور 1991ء۔
6. مظلوم اقبال صفحہ نمبر 186۔
7. پروفیسر محمد اسلم سابق صدر شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایک گفتگو بتاریخ 6 فروری 1994ء۔
8. عروجِ اقبال از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی صفحہ نمبر 28۔ بزم اقبال لاہور طبع اوّل جون 1987ء۔
9. ذکرِ اقبال از عبدالمجید سالک صفحہ نمبر 278۔ بزم اقبال لاہور۔
10. ذکرِ اقبال از عبدالمجید سالک صفحہ نمبر 283۔ بزم اقبال لاہور۔
11. مظلوم اقبال صفحہ نمبر 196۔

12 جیسا کہ متن میں ہے۔

13 حرفِ اقبال۔مؤلفہ لطیف احمد شروانی صفحہ نمبر 132-131 المنار اکادمی لاہور۔جولائی 1947ء۔

14 مظلوم اقبال صفحہ نمبر 195۔

15 مظلوم اقبال صفحہ نمبر 196۔

16 مظلوم اقبال صفحہ نمبر 195۔

17 مظلوم اقبال صفحہ نمبر 196 'ذکرِ اقبال از عبدالمجید سالک صفحہ نمبر 70۔

18 مظلوم اقبال صفحہ نمبر 196 'ذکرِ اقبال از عبدالمجید سالک صفحہ نمبر 70۔

19 مظلوم اقبال صفحہ نمبر 197۔

20 مظلوم اقبال صفحہ نمبر 198۔

21 کلیاتِ اقبال اردو صفحہ نمبر 442,443 شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور 1973ء۔

22 کلیاتِ اقبال اردو صفحہ نمبر 612-611۔

23 کلیاتِ اقبال فارسی صفحہ نمبر 308۔شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور 1973ء۔

24 مظلوم اقبال صفحہ نمبر 197۔

25 مظلوم اقبال صفحہ نمبر 70۔

26 مظلوم اقبال صفحہ نمبر 196۔

27 اقبال اور احمدیت از شیخ عبدالماجد صفحہ نمبر 39۔

28 یہ نظم بانگ درا میں عقل و دل کے عنوان سے موجود ہے۔

29 مظلوم اقبال۔شیخ اعجاز احمد صفحہ نمبر 190۔

30 میاں محمود احمد خلیفہ قادیان کا خطبہ مندرجہ الفضل بحوالہ قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ از پروفیسر محمد الیاس برنی۔ اشاعتِ نہم۔اشرف پریس لاہور۔

31 مظلوم اقبال۔صفحہ نمبر 196۔بحوالہ ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر مطبوعہ 1919۔مرغوب ایجنسی لاہور۔

32 افکارِ اقبال ترجمہ ڈاکٹر ریاض احمد۔صفحہ نمبر 68۔مکتبہ تعمیر انسانیت اردو بازار لاہور۔

33 The Muslim Community, A Sociological Study by Dr.Iqbal edited by Dr.Muzaffar Abbas, Maktaba-e-Aliya, Urdu Bazar, Lahore.

34 Thoughts and Reflections of Iqbal, edited by Syed Abdul Wahid, Sh.Muhammad Ashraf, Lahore,1973.

35 حرفِ اقبال صفحہ نمبر 132۔

36 بانگِ درا حصہ اوّل 'غزلیات۔

ایم ایس ناز

کیا اقبال، قادیانی تھے؟

مے نوشی' رنگ رلیاں اور طوائف کا قتل' دراصل اس نوع کے تمام بے سروپا اور فرسودہ الزامات تراشنے میں ایک مخصوص مذہبی فرقے کے افراد کا ہاتھ کارفرما رہا ہے اور یہ صورتِ حال اس وقت پیدا ہوئی' جب اقبال نے قادیانیوں کے خلاف کھل کر اپنے نظریات اور عقیدے کا اظہار کیا۔ برصغیر پاک و ہند میں اقبال ہی وہ اوّلین رہنما تھے' جنھوں نے سب سے پہلے قادیانیوں اور مرزائیوں کے مذموم ارادوں کو بے نقاب کیا اور برملا کہا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے پیروکار مذہب کی آڑ میں مسلمانوں میں انتشار پھیلا رہے ہیں' ان کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور انھیں جتنی جلد ممکن ہو' غیر مسلم اقلیت قرار دے دینا چاہیے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ 1935ء میں مولانا ظفر علی خاں اور مجلس احرار نے احمدیت اور احمدیوں کے خلاف ایک عام تحریک کا آغاز کیا' صوبے کے مختلف حصوں میں بڑے بڑے عالیشان جلسے منعقد ہوئے' جلوس نکالے گئے' اخباروں نے بالخصوص ''زمیندار'' نے اپنے صفحوں کے صفحے احمدیت کی مخالفت میں سیاہ کر دیے۔ عامۃ المسلمین کا قول یہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد مدعی نبوت کافرِ مطلق ہے اور جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد کسی کو نبی مانتے ہیں، وہ رسالتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے منکر ہیں، لہٰذا ملتِ اسلامیہ سے خارج ہیں۔ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ احمدیوں کو مسلمانوں کی فہرستِ رائے دہندگان سے حذف کر دیا جائے اور ان کو ہندوؤں' اچھوتوں اور عیسائیوں کی طرح ایک علیحدہ اقلیت قرار دیا جائے۔[1] سالک مرحوم نے مزید لکھا ہے۔ خدا جانے علامہ اقبال نے کس عقیدت مند کی درخواست پر ایک مضمون لکھ دیا' جس میں بتایا کہ اس فرقے کی بنیاد ہی غلطی پر ہے۔ اس کے علاوہ بعض اور علمی نکات بیان کیے اور آخر میں حکومت کو مشورہ دیا کہ اس فرقے کو ایک علیحدہ جماعت تسلیم کرے' سن رائز' اور ''لائٹ'' انگریزی کے دو ہفتہ وار پرچے احمدیوں کے زیر ادارت نکلتے تھے۔ انھوں نے کچھ لکھا تو علامہ نے ان کا بھی جواب دیا' پھر سٹیٹسمین مورخہ 10 جون 1935ء میں اس مسئلے کے متعلق ایک مفصل جوابی مضمون لکھا۔[2]

یہ انداز بیان کہ علامہ اقبال نے ''خدا جانے کس عقیدت مند کی درخواست پر'' احمدیت کے خلاف بیان دیا اور مضامین لکھے' یہ شک ظاہر کرتا ہے کہ خدانخواستہ حضرت علامہ اقبال بھی قادیانی تھے' بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے' بلکہ سالک ایسے مصنف ومورخ نے علامہ پر یہ تہمت لگا کر کہ کسی عقیدت مند کی درخواست پر انھوں نے ایسا کیا' خود مصنف ومورخ کے بارے میں یہ شک وشبہ ظاہر کرتا ہے کہ۔

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

بعض معتبر اصحاب' مولانا عبدالمجید سالک پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ خود احمدیت کے طرفداروں میں سے تھے۔ اس لیے ممکن ہے کہ انھیں اپنے اس ممدوح کی یہ ادا پسند نہ آئی ہو' لیکن علامہ جیسے صحیح العقیدہ مسلمان اور سچے عاشق رسول سے یہی توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ کھل کر اپنے عقیدے کا اظہار کریں۔ اس زمانے ہی میں دراصل یہ چہ میگوئیاں شروع ہوگئی تھیں کہ اقبال قادیانی ہیں۔ یہ شوشہ بھی احمدیوں کی طرف سے چھوڑا گیا' کیونکہ قادیانی ایک مدت سے علامہ کی شخصیت کا مطالعہ کر رہے تھے۔ علامہ کے نظریات ان کے بارے میں بڑے واضح تھے۔ انھوں نے احمدیت کا بڑی گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا اور ان کے سیاسی عزائم کو بھی بھانپتے رہے اسی لیے انھوں نے جون 1935ء میں احمدیوں کے خلاف اپنے نظریات کا دوٹوک اعلان کر کے ان نادان نکتہ چینوں کی امیدوں پر بھی پانی پھیر دیا' جو اسی فرقہ کی آڑ لے کر حضرت علامہ اقبال کو عامۃ المسلمین کی اکثریت کی نظروں سے گرانا چاہتے تھے مگر جب علامہ نے احمدیوں ہی کو رنگے ہاتھوں لیا اور مطالبہ کیا کہ اس فرقے کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ تو احمدیوں ہی نے علامہ کے خلاف ان کے قادیانی ہونے کا پروپیگنڈہ شروع کر دیا اور نہ صرف حضرت علامہ کے دینِ حنیف پر کاری وار کیا' بلکہ ان پر مے نوشی' رنگ رلیاں منانے اور طوائف کو قتل کرنے کے علاوہ اور نہ جانے کیا کیا الزامات لگا ڈالے۔

اقبال کے ذہن میں مسئلہ ختم نبوت بہت واضح تھا' انھوں نے جب قادیانی تحریک کے خلاف بیان دیا تو اس پر مختلف حلقوں کی طرف سے اعتراضات شائع ہوئے۔ ان اعتراضات کی روشنی میں اقبال نے اپنا نقطہ نظر واضح کرنے کی کوشش کی اور سید نذیر نیازی [3] کے نام دو خط لکھے۔ انہی خطوط کو بمعہ عکس ''انوارِ اقبال'' میں ممتاز حسن صاحب نے شامل اشاعت کیا' مگر افسوس کہ اس میں بھی انھوں نے قصداً یا سہواً اقبال کے نظریہ ختم نبوت کو مزید الجھا دیا' کیونکہ اصل خطوط' جو اسی کتاب میں شامل کیے گئے ہیں' ان میں اقبال نے واضح طور پر لکھا ہے کہ حضور کو خاتم النبیین نہ ماننے والا کاذب ہے اور واجب القتل۔ مگر ان خطوط سے اصل متن لکھتے ہوئے یہ عبارات حذف کر دی گئیں۔ [4] اب ان خطوط کا متن ملاحظہ ہو:

''راجہ صاحب [5] کا مضمون میں نے نہیں دیکھا۔ دیکھا تو تھا' پڑھا نہیں۔ آپ اپنے

مضمون میں اپنے خیالات کا اظہار کیجئے۔ان کے خیالات کی تردید ضروری نہیں۔
نبوت کے دو اجزا ہیں۔ (1) خاص حالات و واردات جن کے اعتبار سے نبوت روحانیت کا ایک مقام خاص تصور کی جاتی ہے (مقام تصوف اسلام میں ایک اصطلاح ہے)

(2) ایک Socio-political Institution قائم کرنے کا عمل یا اس کا قیام۔اس Institution کا قیام گو ایک نئی اخلاقی فضا کی تخلیق ہے، جس میں پرورش پا کر فرد اپنے کمالات تک پہنچتا ہے اور جو فرد اس نظام کا ممبر نہ ہو یا اس کا انکار کرے، وہ ان کمالات سے محروم ہو جاتا ہے۔اس محرومی کو مذہبی اصطلاح میں کفر کہتے ہیں۔گویا اس دوسرے جزو کے اعتبار سے نبی کا منکر کافر ہے۔
دونوں اجزاء موجود ہوں تو نبوت ہے صرف پہلا جزو موجود ہو، تو تصوف اسلام میں اس کو نبوت نہیں کہتے۔اس کا نام ولایت ہے۔ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعدِ اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزا نبوت کے موجود ہیں۔یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے، تو وہ شخص کاذب ہے (اور واجب القتل، مسیلمہ کذاب کو اسی بنا پر قتل کیا گیا، حالانکہ طبری لکھتا ہے کہ وہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا مصدق تھا اور اس کی اذان میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی تصدیق تھی۔)[6]
لیڈنگ سٹرنگز (Leading Strings) سے مراد لیڈنگ سٹرنگز آف ریلجن، نہیں بلکہ لیڈنگ سٹرنگز آف فیوچر پرافٹس آف اسلام ہے، یا یوں کہیے کہ ایک کامل الہام و وحی کی غلامی قبول کر لینے کے بعد کسی اور الہام و وحی کی غلامی حرام ہے۔بڑا اچھا سودا ہے کہ ایک کی غلامی سے باقی سب غلامیوں سے نجات ہو جائے اور لطف یہ کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی، غلامی نہیں، بلکہ آزادی ہے، کیونکہ اس کی نبوت کے احکام دمانِ فطرت ہیں، یعنی فطرتِ صحیحہ ان کو خود بخود قبول کرتی ہے۔فطرتِ صحیحہ کا انھیں خود بخود قبول کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ احکام زندگی کی گہرائیوں سے پیدا ہوتے ہیں۔اس واسطے عین فطرت ہے، ایسے احکام نہیں، جن کو ایک مطلق العنان حکومت نے ہم پر عائد

کر دیا ہے اور جن پر ہم محض خوف سے عمل کرنے پر مجبور ہوں۔ اسلام کو دینِ فطرت کے طور پر Realise کرنے کا نام تصوف ہے اور ایک اخلاص مند مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس کیفیت کو اپنے اندر پیدا کرے۔ اس کیفیت کو میں نے Comancipation سے تعبیر کیا ہے۔"7

اپنے دوسرے خط میں اقبال یوں رقمطراز ہیں۔(1) عقل اور وحی کا مقابلہ یہ فرض کر کے کہ دونوں علوم کے مواخذ ہیں' درست نہیں ہے۔ علوم کے مواخذ انسان کے حواس اندرونی اور بیرونی ہیں۔ عقل ان حواس ظاہری و معنوی کے انکشاف کی تنقید کرتی ہے اور یہی تنقید اس کا حقیقی Function ہے اور بس۔ مثلاً آفتاب مشرق سے طلوع کرتا ہے اور مغرب کی طرف حرکت کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ حواس ظاہری کا انکشاف ہے۔ عقل کی تنقید کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حواس کا انکشاف درست نہ تھا۔

(2) وحی کا Function حقائق کا انکشاف ہے یا یوں کہیے کہ وحی تھوڑے وقت میں ایسے حقائق کا انکشاف کر دیتی ہے' جن کا مشاہدہ برسوں میں بھی نہیں ہو سکتا۔ گویا وحی حصول علم میں جو Time کا عنصر ہے، اس کو خارج کرنے کی ایک ترکیب ہے۔ انسان کی ترقی کے ابتدائی مراحل میں اس ذریعہ علم کی بے انتہا ضرورت تھی' کیونکہ ان مراحل میں انسان کو ان مقامات کے لیے تیار کیا جا رہا تھا' جن پر پہنچ کر وہ قوائے عقلیہ کی تنقید سے خود اپنی محنت سے علم حاصل کرے۔ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش انسانی ارتقاء کے اس مرحلے پر ہوئی' جب کہ انسان کو استقرائی علم سے روشناس کرنا مقصود تھا۔ میرے عقیدہ کی رُو سے بعدِ وحی محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الہام کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ سلسلہ تو الہام کا جاری ہے مگر الہام بعدِ وحی محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حجت نہیں ہے، سوائے اس کے کہ ہر شخص کے لیے جس کو الہام ہوا ہو۔ بالفاظ دیگر بعدِ وحی محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الہام ایک پرائیویٹ Fact ہے اس کا کوئی سوشل مفہوم یا وقعت نہیں ہے۔ میں نے پچھلے خط میں لکھا تھا کہ نبوت کی دوسری حیثیت ایک Socio-political Institution کی ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ بعدِ وحی محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کا الہام یا وحی ایسے Institution کی بنا پر قرار نہیں پا سکتا۔ تمام صوفیہ اسلام کا یہی مذہب ہے۔ محی الدین ابن عربی تو الہام پانے والے کو نبی کہتے ہی نہیں' اس کا نام ولی رکھتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسلام سے پہلے بنی نوع انسان میں شعور ذات کی تکمیل نہ ہوئی تھی۔ اسلام نے انسان کی توجہ علوم استقرائی کی طرف مبذول کی تا کہ انسانی فطرت فی کل الوجود کامل ہو اور اپنی ذاتی محنت سے حاصل کردہ علم کے ذریعہ سے انسان میں اعتماد علی النفس پیدا ہو۔ غرضیکہ بعدِ وحی محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے عقیدہ کی رو سے الہام کی حیثیت محض ثانوی ہے۔ جس شخص کو ہوتا ہے' اس کے لیے حجت ہو تو ہو' اوروں

کے لیے نہیں ہے۔ اگر آج کوئی شخص کہے کہ میں نے بالمشافہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مل کر دریافت کیا ہے کہ فلاں ارشاد جو محدثین آپ کی طرف منسوب کرتے ہیں' آپ کا ہے یا نہیں اور مجھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا ہے کہ نہیں' تو ایسا مکاشفہ اس شخص کے لیے حجت ہوگا۔ عالم اسلام کے لیے نہیں۔ اگر اس قسم کے مکاشفات کو تمام عالم اسلام کے لیے حجت قرار دیا جائے' تو تمام تنقیدی تاریخ کا خاتمہ ہو جاتا ہے یا بالفاظ دیگر روایت ودرایت واستقراء کا خاتمہ ہو جاتا ہے شعر[8] میں لفظ حیا (شرم) ہے۔[9]

اقبال کی بیشتر تحریریں' بیانات اور ان کا کلام اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت کے صدق دل سے خواہاں تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبی آخر الزمان نہ ماننے والوں کو کاذب اور واجب القتل سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے احمدیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا۔ اگر وہ خود قادیانی ہوتے' تو ہرگز یہ مطالبہ نہ کرتے۔ یہ ان کے اسی مطالبہ کا ردعمل تھا کہ احمدیوں نے اقبال کی ذات پر طرح طرح کے الزامات لگانے شروع کر دیے۔ اب وقت کے ساتھ ساتھ یہ الزامات خود بخود غلط ثابت ہو رہے ہیں۔
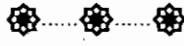
حواشی

1. ذکرِ اقبال ص210۔
2. ذکرِ اقبال ص210۔
3. آپ ان دنوں طلوع اسلام کے مدیر تھے۔
4. انوارِ اقبال ص44 عکسی خطوط۔
5. غالباً راجہ حسن اختر۔
6. انوارِ اقبال سے یہ عبارت حذف کر دی گئی ہے۔
7. ماہنامہ طلوع اسلام اکتوبر1935ء ص102-103۔
8. اشارہ اس طرف ہے کہ اقبال نے نبوت کے متعلق جو تحریریں بھیجیں تو اسی کاغذ پر ایک طرف مدنیت اسلام' کے نام سے ایک نظم بھی لکھ بھیجی' جو طلوع اسلام بابت اکتوبر 1935ء میں شائع ہوئی' اس کا ایک مصرعہ تھا۔ ''نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری۔'' اس مصرعہ میں شاید لفظ حیا پر خیال نہیں گیا تھا۔ یہ نظم بعد میں ضرب کلیم ص45 پر شائع ہوئی۔ (حاشیہ انوارِ اقبال ص49)
9. طلوع اسلام' اکتوبر1935ء ص103-104۔

علیم ناصری

فکرِ اقبال اور قادیانی تحریک

ہندوستان میں 1857ء کی جنگ آزادی میں انگریز، فاتح کی حیثیت سے مختارِ کل بن گیا۔ اس نے مغل سلطنت کے تار و پود بکھیر دیے اور ہندو ریاستوں کو اپنا ہمنوا بنالیا۔ اس کو مسلمان قوم سے بہر حال خطرہ درپیش تھا کیونکہ اس قوم میں جذبۂ جہاد کسی بھی وقت اُبھر آنے کی توقع تھی۔ اس لیے اس نے اس کے فکری محاذ اور دینی عقائد پر ضربِ کاری لگانے کی ڈپلومیسی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا، اور انگلستان اور دیگر یورپی ممالک سے عیسائی مشنری (مبلغین اور دانشور) یہاں درآمد کرنے شروع کیے۔ یہی وہ صورتِ حال تھی جس پر اکبرالٰہ آبادی مرحوم نے کہا تھا ؎

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے اب بسولا ہٹا تو رندا ہے

یعنی حرب وضرب (توپ تفنگ) کے سامان کے بعد تعلیم و تبلیغ کے ہتھیار سے کام لینے کا وقت آ گیا۔ بسولا یعنی تیشہ کو سامانِ حرب سے تشبیہ دی ہے اور رندا کو تعلیم و تبلیغ کے ذریعے ہموار کرنے کے عمل کے لیے بطورِ استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔

ان مشنریوں کے مقابلے میں مقامی علمائے اسلام بھی میدان میں اُترے جن میں سُوئے اتفاق سے اس وقت مرزا غلام احمد قادیانی بھی شامل تھا۔ اس شخص نے یقیناً اس میدانِ مناظرہ میں خاصی سرگرمی دکھائی، اور اسلام کے دفاع میں (منافقانہ انداز میں) بھرپور کردار ادا کیا، جس کو اس دور کے اکابرین نے داد و تحسین کی نظر سے دیکھا اور اس کی ہمنوائی بھی کی۔ ان مداحین میں علامہ اقبال کا خاندان یعنی ان کے والد گرامی اور بھائی عطا محمد بھی تھے۔ وہ خود بھی مرزا غلام احمد کو اسلام کا خادم قرار دیتے تھے۔ یہ ان کی طالب علمی کا دور تھا اور ان کی عمر بھی 16-17 سال سے زیادہ نہ تھی۔ اسی دور میں یعنی انیسویں صدی کی آخری دہائی میں مرزا کے ذہن میں دینی بلند نظری آفاق گیر نظر آنے لگی اور اس نے مہدی دوراں اور پھر مسیحِ موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اس کی زندگی کا یہی موڑ تھا جہاں سے اس نے ملتِ اسلامیہ سے الگ راستہ اختیار کیا اور جلد ہی نبی ہونے کا مدعی بھی بن بیٹھا۔ علمائے وقت نے اس پر

گرفت شروع کر دی اور اس کے دعوے کو ''ختم نبوت'' کے منافی قرار دیا۔ اس نے پینترا بدلا اور اپنی نبوت کو ''بروزی نبوت'' کے بہروپ میں پیش کرنا شروع کر دیا اور اس کے متبعین نے طرح طرح کی تاویلوں سے اس کو اس منصب کا اہل، صاحبِ الہام ووحی اور بشیر ونذیر بنانا شروع کر دیا۔ لاہور میں اس کے حواریوں نے نبی کی بجائے اس کو عہدِ حاضر کا مجدد بنایا اور ایک باقاعدہ تحریک نے اٹھ کر ''احمدیت'' کا مذہب ایجاد کر لیا، اور دوسرے مسلمانوں کو ''کافر'' قرار دے دیا۔ علمائے وقت نے اس ''نبوتِ کاذبہ'' کے خلاف پوری شدت سے مزاحمتی تحریکیں چلائیں۔ مناظرے ہوئے، اخبارات ورسائل میں تحریری مباحثے بھی چلنے لگے، اور علامہ اقبال بھی اس پر توجہ دینے پر مجبور ہوئے۔ جب ان پر ''ختم نبوت'' کی عظمت پوری طرح اجاگر ہوگئی، اور وہ خود بھی اس وقت تک ملتِ اسلامیہ ہند میں ایک نامور مفکر کے طور پر اُبھرے تو انھوں نے اس کے خلاف مضامین لکھے اور مرزائی نبوت کے خلاف اپنا فیصلہ دے دیا۔

بشیر احمد ڈار اپنی کتاب ''اقبال اور احمدیت'' کے صفحہ نمبر 17 پر لکھتے ہیں...... چنانچہ اقبال نے 1916ء میں اس (کسی مرزائی کے مضمون) کے جواب میں ایک بیان دیا۔ ''جو شخص نبیؐ کے بعد کسی ایسے نبی کا قائل ہو جس کا انکار مستلزمِ کفر ہو، وہ خارج از اسلام ہوگا۔ اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی اسلام سے خارج ہے۔''

اسی کتاب کے ص 59 پر علامہ نے مزید وضاحت کی ہے۔ ''ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اُس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت...... بانی اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت...... کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی، جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرتؐ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔''

قادیانی مصنف شیخ عبدالماجد نے علامہ اقبال پر ان کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب ''زندہ رود'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک کتاب ''اقبال اور احمدیت'' کے عنوان سے مرتب کی اور بزعم خویش اپنے حقائق بلکہ انکشافات کا جواب طلب کیا۔ اقبال اکیڈمی کے فاضل رکن ڈاکٹر وحید عشرت نے شیخ عبدالماجد مذکور کے ''انکشافات'' کا جواب ماہنامہ ''مہارت'' کے صفحات میں لکھنا شروع کیا، جہاں شیخ مذکور کے مضامین چھپتے تھے۔ انھوں نے پوری ذمہ داری اور تحقیق وکاوش کا مظاہرہ کیا مگر عبدالماجد مذکور کی تشفی نہیں ہو سکی، اور نہ ہو سکتی تھی کیونکہ وہ داستان کو جاری رکھنے کے خواہش مند تھے کہ قادیانیت پر شہرت کے دروازے یوں بھی کھلتے ہیں۔ یہ سلسلہ کئی اقساط میں چلا اور آخر عشرت صاحب نے اسے ''شوقِ فضول'' سمجھ کر بند کر دیا۔ مگر قادیانیت کی فطرت میں دور از کار مباحث میں اُلجھانا شامل

ہے۔اس لیے اب انھوں نے اپنا تمام اثاثہ اس کتاب میں جھونک دیا ہے۔اس کا ہدف صرف اقبال ہے اور اقبال کو ہمہ پہلو جھوٹا ثابت کر کے وہ لوگ مرزا کی سچائی ثابت کرنا چاہتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ جب اقبال جھوٹا ثابت ہو گیا تو ہمیں جو غیر مسلم قرار دیا گیا ہے وہ بھی منسوخ ہو جائے گا اور ہمارے اسلام ہی کو اصل اسلام سمجھا جائے گا۔اس طرح دیگر تمام امت اسلامیہ از خود ''کافر'' قرار پائے گی۔

کتاب کے ٹائٹل پر ملکہ وکٹوریہ (برطانیہ) کی تصویر دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اقبال کے تین شعر درج ہیں جو اقبال کی اس نظم کا حصہ ہیں جو انھوں نے ملکہ کی وفات (1901ء) پر لکھی تھی۔اور اس کتاب کے صفحہ 121 تا 127 پر درج ہے۔اس کا مقصود یہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان مرزا کی نبوت کو انگریز کا ''خود کاشتہ پودا'' قرار دیتے ہیں اور مرزا صاحب پر معترض ہیں کہ انھوں نے انگریز حکومت کی حمایت اور اپنی جماعت کے لیے اس حکومت کو سائبان قرار دیا تھا۔اسی کی شہ پر مرزا صاحب نے اسلامی جہاد کو منسوخ قرار دیا تھا اور مسلمانوں کو ''نظریاتی افلاس'' کی طرف دھکیلنے کی جسارت کی تھی۔اس کتاب میں مصنف نے علامہ اقبالؒ کی ''عہد شباب'' کی شاعری کو خاص طور پر ہدفِ تنقید بنایا ہے، تاکہ اس کے دینی کردار کو مسخ کیا جائے۔مصنف کو یہ معلوم رہنا چاہیے کہ ملت اسلامیہ پاکستان اب اُس اقبال کی مداح نہیں ہے جو آپ پیش کر رہے ہیں بلکہ ہمارے سامنے صرف وہ اقبال ہے جو بانگِ درا کے بعد بالِ جبریل، ضربِ کلیم، پیامِ مشرق، مثنوی اسرار و رموز، زبورِ عجم اور ارمغانِ حجاز میں نظر آتا ہے۔نیز ملت اسلامیہٗ پاکستان نے قادیانیت کو اقبال کے کہنے پر غیر مسلم قرار نہیں دیا بلکہ ان نصوصِ قرآن وسنت کے تحت فیصلہ کیا ہے جو عالمِ اسلام کی مشترکہ متاعِ عزیز ہے۔ہم خوب جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں ''آزادیٔ رائے'' کے منافقانہ نظریہ کی بہت مانگ ہے اور اسلامی نظریات سے تہی دامن دانشوروں کو آپ ہی نہیں بہائی اور عیسائی بھی بہت اپیل کر رہے ہیں۔

اس کتاب میں بھی جگہ جگہ ڈاکٹر جاوید اقبال کو جواب لکھنے کا چیلنج کیا گیا ہے اور ممکن ہے وہ یا ڈاکٹر وحید عشرت اس کے لیے تیار بھی ہوں مگر ہم ''الاعتصام'' میں ایسی ''فضول'' بحث کے روادار نہیں ہیں۔نہ کبھی مرزا کو ہم ''سچا نبی'' مان سکتے ہیں اور نہ اس کی ذریت کے لیے کوئی نرم گوشہ اپنے دل میں رکھتے ہیں۔محمد رسول اللہ کی ختم نبوت کا منکر ہماری نظر میں غیر مسلم ہے اور کسی رواداری کا مستحق نہیں!!

آخر میں ہم اقبال اکیڈمی اور دوسرے مسلم دانشوروں سے گزارش کریں گے کہ وہ جب اس موضوع پر کچھ لکھیں تو اس جماعت کے لیے ''احمدی یا احمدیت'' کا لفظ استعمال نہ کریں بلکہ ''قادیانی یا قادیانیت'' لکھا کریں۔یہ بھی احمد (محمدؐ) کے ساتھ اشتباہ کا پہلو رکھتا ہے۔سرکاری فارموں میں بھی اس کا نوٹس لینا چاہیے۔

❁ ❁ ❁

مولانا مشتاق احمد

شورشؒ، اقبالؒ اور قادیانیت

علامہ اقبالؒ کے نام پر جھوٹ

ہم سے ایک ذمہ دار دوست نے بعض ایسے کتابچوں کا ذکر کیا ہے، جو قادیانی مشن لندن کی طرف سے شائع ہوئے ہیں، اور جن میں یہ درج ہے کہ علامہ اقبال نے مرزا غلام احمد قادیانی کے علم و فضیلت پر صاد کیا تھا۔ وہ ان سے بیعت ہوئے، آخر احراریوں کے ورغلانے سے منحرف ہو گئے تھے، وغیرہ......

نیاز صاحب کے تاثرات کا ایک خاص پس منظر ہے، جسے ہم یہاں چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتے۔ لیکن جو کچھ انھوں نے لکھا ہے، وہ اتنا سطحی ہے، کہ ایک ادبی شخصیت کا سماعی روایات پر اس طرح انحصار کرنا کسی طرح بھی ایک سانحہ سے کم نہیں۔ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان سے جو خطوط انھیں لکھے گئے، وہ لازماً ان کی ممدوح جماعت ہی نے لکھے یا لکھوائے ہوں گے، تاکہ اپنے حق میں بیرونی شہادتیں حاصل کی جاسکیں۔ بہرحال یہ ایک دوسری بحث ہے اور اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ احرار کا سوال بھی ہمارے سامنے نہیں، جو جماعت حکماً کالعدم قرار دی جا چکی ہو اور ملک کی دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح اس کا وجود بھی غائب ہو، اس کے بارے میں کسی گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارا سوال خالص علمی ہے، یا پھر دینی، کہ جب قادیانی جماعت کی مزاحمت یا مدافعت کرنے والوں کی مجالس اپنے سیاسی کردار کے باعث معطل پڑی ہیں، تو قادیانی جماعت کو یہ حق کیونکر پہنچتا ہے کہ اپنے ''مذہبی وجود'' کی آڑ میں ان سیاسی حربوں کو استعمال کرے، جن کا استعمال دوسروں کے لیے ممنوع ہو چکا ہے۔ کیا وہ اپنے نفس کو دھوکا دے رہی ہے یا مسلمانوں کو مغالطے میں رکھنا چاہتی ہے۔ یا پھر اس کے دماغ میں یہ واہمہ سما گیا ہے کہ حکومت کی احتسابی مصروفیتوں کا راستہ دوسرا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ منیر انکوائری کمیشن کے روبرو قادیانی وکلاء نے علامہ اقبال سے متعلق اسی قسم کا الزام عائد کیا تھا، تو مرکزیہ مجلس اقبال

نے فوراً ہی تردید کر دی تھی۔ بعض موانعات کے باعث تردید کا مضمون عام نہ ہو سکا۔ مگر جوابی تصریحات، کمیشن کے ریکارڈ پر موجود ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اب پھر اقبال کا نام استعمال کرنے اور ملک سے باہر اس مطلب کے کتابچے چھاپنے کی ضرورت محسوس کی گئی؟ ہم اس پس منظر کو زیر بحث لانا نہیں چاہتے لیکن اگر ہم یہ عرض کریں، تو ملکی استحکام کی منشا کے عین مطابق ہوگا کہ قادیانی جماعت کے مبلغوں کو اس امر کا قطعاً حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ میدان خالی پا کر علامہ اقبال سے متعلق بین الاقوامی دنیا کو تاثر دیں کہ اقبال ان سے متاثر تھے، اور جب انھوں نے قادیانی جماعت کا جائزہ لیا، تو خدانخواستہ احرار کے دام تزویر کا شکار ہو گئے تھے۔ جس کا مطلب ہے کہ پاکستان کے فکری موسس کی معرفت وہ اپنا نام اور کام بیرونی دنیا کے سامنے لانا چاہتے، اور اس طرح عہد حاضر کی تعلیم یافتہ نسل پر ثابت یہ کرنا چاہتے ہیں، کہ اقبال جیسا نابغہ عصر بھی ان کے بانی کی عقیدت کا طوق گلے میں باندھے ہوئے تھا، پھر وہ احرار کے داؤں میں آ گیا۔ گویا وہ متزلزل عقائد کا انسان تھا اور اس کے اپنے مطالعہ ومشاہدہ اور نظر وفکر کی عمارتیں کمزور تھیں۔

احرار کا نام لینا محض ذہنی عیاری ہے، تا کہ احرار سے متعلق اونچے طبقے کا ماضی مرحوم میں جو سیاسی ذہن رہا ہے، وہ ان کے لیے حفاظتی قلعہ ثابت ہو، اور احرار کے خلاف خفیہ رپورٹوں کا جو انبار لگا ہوا ہے، وہ ان کی حفاظت کے کام آتا رہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ تبلیغ اسلام کے لیے باہر گئے ہوئے ہیں، یا مرزا غلام احمد قادیانی کی ''صداقتوں'' کا ناد پھونکنے کے لیے۔ ہمیں یقین ہے کہ انھیں زر مبادلہ اس مقصد کے لیے نہیں ملتا کہ وہ اپنی جماعت کا چرچا کریں، اور اس واسطے سے بیرونی دنیا میں اپنی جماعت کے نام کا نقش بٹھا کر داخلی طور پر اپنی مختصر سی جماعت کے لیے بین الاقوامی تحفظ حاصل کریں۔ یہ صریحاً سیاسی ہتھکنڈا ہے، اور ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ قادیانی اپنے فن میں بڑے منفرد ہیں۔ اندرون ملک جہاں بیٹھے ہیں، اپنی تنظیم اور مخالفوں کی تنقیص سے ایک لحظہ بھی غافل نہیں رہتے۔ ان کی مشین کا ایک ایک پرزہ صحیح صحیح کام کرتا ہے۔ ہمارے سامنے بعض دلچسپ اور سنگین مثالیں موجود ہیں، لیکن ہم زیر نظر سوال کو طول دینا نہیں چاہتے۔ ہماری استدعا یہ ہے کہ ان حالات میں جب تمام سیاسی جماعتیں ختم ہو چکی ہیں، انھیں بھی لازم ہے کہ اپنا سیاسی مزاج بدلیں اور ان افراد وعقائد کے بارے میں محتاط رہیں، جنھیں جمہور المسلمین بہ طور خاص عزیز رکھتے ہیں۔ کیا وہ چاہتے ہیں کہ علامہ اقبال ان کے بارے میں جو نظریات رکھتے تھے ان کا جوابی چرچا ہو؟ اگر وہ یہ نہیں چاہتے، تو پھر اس صورتحال سے فائدہ کیوں اٹھاتے ہیں؟ (ہفت روزہ چٹان۔ 1 اکتوبر 1961ء)

ختم نبوت زندہ باد

مسلم لیگ اوّل یا ثانی (اس کا فیصلہ وقت کرے گا) کا جلسۂ عام چوہدری خلیق الزماں صاحب کی تشریف آوری پر موچی دروازہ کے باغ پر ہوا، لیکن گڑبڑ کی نذر ہو گیا۔ اخبارات نے لکھا نہیں اور ہمارے روزناموں کی اکثریت کا یہ وتیرہ ہو گیا ہے کہ عوام کی نبض پر ہاتھ رکھنے کی بجائے وہ اپنی خواہشات کا عکس پیش کرتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مغربی پاکستان کے پنجابی اضلاع میں ختم نبوت کا مسئلہ ایک زندہ حقیقت ہے اور لاہور کے لوگ خصوصیت کے ساتھ مارشل لاء کی اس یاد کو بھولے نہیں، جب انھیں ختم نبوت کے سلسلے میں گولیوں کا نشانہ بننا پڑا، اور لاہور کی سب سے بڑی سڑک مال روڈ پر محمد رسول اللہؐ کی ختم المرسلینی کا اعلان کرنے پر اس وقت کے سیاست دانوں نے حلقہ بگوشانِ رسالت کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور کے ہر عوامی جلسہ میں ختم نبوت زندہ باد کا نعرہ حاضرین کی پوری طاقت کے ساتھ ہمیشہ گونجا ہے، اور بڑے سے بڑا مقرر اس کی ہمنوائی کے بغیر آگے نہیں چل سکتا ہے۔ مسٹر منظر عالم نے جو کنونشن کے معتمد ہیں، لاہور کے جلسہ عام میں اس ختم نبوت ہی کا سہارا لیا اور جب انھوں نے یہ کہا کہ لیگ کونسل والے ہی تھے جنھوں نے تحریک ختم نبوت میں گولیاں چلائیں۔ تو لوگ چلا اٹھے کہ آپ بھی ان میں شریک تھے، وغیرہ۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ سرکاری اطلاعات اس بارے میں کیا ہیں، اور حکومت کیونکر سوچتی ہے؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ختم نبوت کا مسئلہ مسلمانوں کے دل و دماغ کا مسئلہ ہے، وہ مسلمانوں کے لیے روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمان سب کچھ گوارا کر سکتے ہیں، لیکن رسول اللہؐ کی ختم المرسلینی اور خاتم النبیینی میں مداخلت یا سرقہ نہیں گوارا کر سکتے۔ وہ ایک ساعت کے لیے بھی یہ چوٹ نہیں سہہ سکتے ہیں، اور یہ عظیم ترین حادثہ ہے کہ پاکستان میں ختم نبوت کے سارقین موجود ہیں۔ ان کے بعض افراد کو مسلمانوں کے حقوق میں سے حقوق ملتے ہیں اور وہ بین الاقوامی اداروں میں بھی مسلمانوں کے نمائندہ کہلاتے ہیں۔

منیر انکوائری رپورٹ بڑے ہی فاضل ججوں نے لکھی ہے، لیکن اس رپورٹ پر دشمنانِ اسلام و نبوت کے سوا کسی نے صاد نہیں کیا۔ حقیقت یہی ہے اور جیسا کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک دفعہ کہا تھا کہ یہ رپورٹ تیرہ سو برس میں مسلمانوں کے خلاف مسلمانوں ہی کے قلم سے سب سے بڑی دستاویز لکھی گئی ہے۔ علامہ اقبالؒ کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال بار ایٹ لاء نے اپنی ایک تالیف میں اس رپورٹ کی اشاعت روک دینے کا مطالبہ کیا ہے، اور ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس رپورٹ نے کوئی سا مقصد بھی حل نہیں کیا ہے۔

دماغی بددیانتیوں کی حد ہے کہ جو لوگ علامہ اقبالؒ کے نام سے مختلف قسم کی روایتیں بیان کرتے ہیں، اور جن کی زبان انھیں ترجمانِ اسلام کہتے ہوئے بھی نہیں تھکتی ہے، وہ علامہ اقبال نور اللہ مرقدہٗ سے فرضی خطوط اور خانہ ساز بیان منسوب کرتے ہوئے بزعم خویش بڑے کروفر کا اظہار کرتے ہیں، لیکن جن چیزوں کو حضرت علامہ قدس سرہ العزیز نے اسلام اور نفس اسلام کے لیے خطرہ قرار دیا ہے، ان سے نہ صرف علامہ اقبالؒ کے یہ ''ترجمان'' چشم پوشی کرتے ہیں بلکہ ان کی کوشش یہ رہی ہے کہ علامہ اقبال کی ان تحریروں اور افکار ہی کو ختم کر دیا جائے اور یا ان کی ایسی تعبیر کی جائے کہ مطالب کا اصل چہرہ مسخ ہو جائے۔

علامہ اقبالؒ نے 10 جون 1935ء کے سٹیٹسمین میں لکھا تھا کہ ملت اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے۔ افسوس کہ جس محمد عربیؐ کے نام پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا، وہاں قادیانیوں کی علیحدگی کا سوال تو شدت سے موجود ہے، لیکن جواب انگریزوں کی حکومت سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری لیڈرشپ نے اس مسئلہ پر غور ہی نہیں کیا، وہ لوگ جو انگریزوں کے وقت سے سول سروس کے ستون تھے، ملک کی آزادی کے ستون ہی نہ رہے، بلکہ پوری بنیاد اور عمارت ہو گئے، اور بہمہ وجوہ انھوں نے قادیانی مسئلہ کو غتر بود کر دیا، بلکہ اس مسئلہ کے نام لیواؤں کو جنونی سے لے کر غدار تک کہا، حالانکہ وہ ان الفاظ کے مفہوم سے بھی آشنا نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک ہر وہ بات حق ہے، جو انگریزی حکومت کے نزدیک حق رہی ہے، اور ہر وہ بات باطل ہے، جسے وہ باطل کہہ گئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمان رسول عربیؐ (فداہ ای وابی) کے ننگ و ناموس کی حفاظت کے معاملہ میں جنونی ہے اور جنون ہی وہ دولت ہے جو مؤقف یا نصب العین کو پروان چڑھاتی ہے یا جس سے عشق و مذہب کی دولت ہاتھ آتی ہے۔ رہا غدار کا لفظ تو جب اس کا استعمال انگریزی عہد کے ستون کرتے ہیں، تو اس وقت تاریخ کی شرافت کا چہرہ داغدار ہو جاتا ہے۔

حال ہی میں پنڈت جواہر لال نہرو نے ان خطوط کا مجموعہ شائع کیا ہے جو دنیا کے بعض بڑے آدمیوں نے ان کے نام وقتاً فوقتاً لکھے ہیں، اس میں 21 جون 1936ء کا ایک خط ہے، اس میں حضرت علامہ لکھتے ہیں:

''(قادیانی مذہب کے خلاف) میں نے یہ مقالہ اسلام اور ہندوستان کے ساتھ بہترین نیتوں اور نیک ترین ارادوں میں ڈوب کر لکھا تھا، میں اس باب میں کوئی شک وشبہ اپنے دل میں نہیں

رکھتا کہ یہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔''

کسی دعویدار پاکستانی محب الوطن کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اس خط کو حضرت علامہ کے مجموعۂ مکاتیب میں شامل کرتا۔ تاہم اقبال کے الفاظ میں

''یہ حکایتِ دراز ایک طاقتور قلم کی منتظر ہے''

(ہفت روزہ چٹان۔ 21 جنوری 1963ء)

پانچ ہزار روپیہ

علامہ اقبال نور اللہ مرقدہ نے فرمایا تھا کہ قادیانی مذہب کا تجزیہ د تاریخ ایک طاقت ور قلم کے منتظر ہیں۔ 1799ء سے ہندوستان میں اسلامی دینیات کی جو تاریخ رہی ہے اس کی روشنی ہی میں قادیانیت کے اصل مظروف تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ یہ سال وہ تھا جب ٹیپو کو شکست ہوئی اور ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی نفوذ کی آخری امید منقطع ہوگئی۔ علامہ اقبال نے اپنے پہلے بیان میں اس امر کی ضرورت کو محسوس کر کے اظہار کیا تھا کہ قادیانیت سے مذہبی بحث میں الجھنا عبث ہے۔ اصلی چیز تحریک قادیانیت کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ ان کے نزدیک یہ تمام تر سیاسی تحریک تھی۔ اس تحریک نے مسلمانوں کے لیے نبوت کے نام پر برطانوی غلامی کے طوق مہیا کیے اور الہام کی بنیاد پر مسلمانوں میں فسخ جہاد کا نظریہ رائج کرنا چاہا...... جب تک ہم اس عہد کے سیاسی حالات پر نگاہ نہ رکھیں اور ان احوال وظروف کو معلوم نہ کرلیں جو اس وقت کے ہندوستانی مسلمانوں کی ملی زندگی کا جزو غیر منفک ہو رہے تھے، اس وقت تک ہم قادیانی جماعت کی تاریخ اور اس کا تجزیہ نہیں کر سکتے ہیں۔ قادیانی جماعت پیدا ہوئی یا پیدا کی گئی، یہ سوال بھی کسی طاقت ور قلم کے تجزیہ و تحلیل کا منتظر ہے اور انشاء اللہ کسی دور میں یہ نقاب اٹھ کے رہے گا۔ تاہم یہ امور یا نکات اب ڈھکے چھپے نہیں رہے کہ قادیانی جماعت نے انگریزوں کے بہترین خدمت گزار پیدا کیے۔ اس فرقے نے نہ صرف انگریزوں کے وثیقۂ غلامی کا جواز پیدا کیا بلکہ اپنی جماعت سے باہر کے مسلمانوں کو کافر قرار دے کر اخوتِ اسلام کے اس تصور کو ہلاک کرنا چاہا جو محمد عربیؐ کے کاشانۂ نبوت سے پیدا ہوا تھا۔ اس امر کے شواہد و نظائر بھی موجود ہیں کہ قادیانی جماعت کے ارکان غیر ملکوں میں جاسوسی فرائض انجام دیتے رہے اور مسلمانوں کی بعض قومی تحریکوں کو داخلی طور پر ختم کرنے یا رسوا کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

ایسا شخص جو مسلمانوں کی سیاسی تاریخ کا طالب علم ہو اور اس کی نگاہ انگریزوں کی ہندوستان میں آمد سے لے کر ان کے اخراج تک کے حالات پر ہو، نیز اس کو اس امر کی تحقیق کا بھی شوق ہو کہ اس

عرصہ میں انگریزوں کے ہاتھوں اسلام پر کیا گزری...... غرض علامہ اقبال کی مہیا کردہ بنیادوں پر قادیانیت کے سیاسی تجزیہ و تاریخ کو مرتب کرنے والا شخص نہ صرف اپنے اس عظیم کارنامہ کے لیے تمام مسلمانوں کے شکریہ کا مستحق ہوگا بلکہ اس کے لیے اللہ اور اس کے حضور کی بارگاہ میں بڑا اجر ہے۔ اس کی یہ کتاب تاریخ کا ایک یادگار کارنامہ ہوگی۔ ایڈیٹر چٹان کی طرف سے اعلان کیا جاتا ہے کہ وہ اس کتاب کے مرتب و مصنف کو کتاب کے معیاری و مستند ہونے پر اپنی جیب سے پانچ ہزار روپیہ نقد دیں گے۔ ہم چندہ فراہم کرنے کے عادی نہیں اور نہ ہم اس عنوان سے عطیات کے قائل ہیں، ورنہ اس رقم میں دوگنا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک کتاب کے انتخاب کا تعلق ہے یہ کتاب چار مختلف ججوں کے پاس بھیجی جائے گی اور وہ اس امر کا فیصلہ کریں گے کہ کتاب واقعی تاریخ و تجزیہ کے اس معیار پر پوری اترتی ہے، جس کی نشان دہی حضرت علامہ اقبال نے کی ہے۔ ان چاروں ججوں کے بارے میں ہمارا خیال یہ ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور شیخ حسام الدین یہ فرض انجام دیں گے تو ہر لحاظ سے وہ اس منصب کے اہل ہیں۔ ایڈیٹر چٹان کتاب کا فیصلہ ہوتے ہی یہ رقم ان کے حوالہ کر دے گا۔ اس غرض سے دو سال کی مدت کافی ہوگی۔ اواخر اپریل 1967ء تک جو صاحب قلم اٹھائیں اپنے رشحات و کاوشات ایڈیٹر چٹان کی وساطت سے ان ججوں کو پیش کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان ججوں کو عذر و انکار نہ ہو، عذر و انکار کی صورت میں کسی دوسرے بزرگ کا انتخاب ہو جائے گا۔ اللہ کرے یہ تاریخ تیار ہو جائے۔

(ہفت روزہ چٹان۔ 12 اپریل 1965ء)

دانش گاہِ پنجاب میں مسندِ اقبال

یہ خبر آئی اور نکل گئی کہ پنجاب یونیورسٹی کے ''دانش مندوں'' نے علامہ اقبال کے نام پر جو Chair قائم کی ہے، اس کو شعبہ فلسفہ کے رئیس پروفیسر قاضی محمد اسلم کی تحویل میں دے دیا گیا ہے۔ پروفیسر موصوف ظاہر و باطن قادیانی ہیں۔ ان میں وہ تمام عصبیتیں بہ درجہ آخر موجود ہیں، جو ایک قادیانی کے رگ و ریشہ میں خون کی طرح گردش کرتی ہیں۔ قاضی صاحب قادیانی + ربوہ کی نبوت اور مرزا بشیر الدین محمود کی خلافت پر حاضر و غائب ایمان رکھتے ہیں، بلکہ ان کے فکر و نظر کا تار و پود بھی اس سے تیار ہوا ہے۔ اپنے اس عقیدہ کو وہ چھپاتے نہیں ہیں، انھیں اس کا اقرار و اعتراف ہے۔ اس کے باوجود مسندِ اقبال کو ان کے حوالے کر دیا گیا۔

کیا یہ بے خبری میں ہوا ہے؟ یا جن لوگوں نے یہ فیصلہ کیا ہے وہ اس سے بھی آگاہ تھے کہ

علامہ اقبال کے نظریات اور قاضی محمد اسلم کے معتقدات میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور دونوں ایک دوسرے کی مخالف سمتوں کے راہرو ہیں۔

اگر یہ فیصلہ بے خبری میں ہوا ہے تو اس سے زیادہ افسوسناک بات کوئی نہیں ہوسکتی کہ مغربی پاکستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی کے کار پرداز ملک کے سب سے بڑے مفکر کے افکار و نظریات سے اتنے بے خبر ہیں یا جس شخص کے حوالہ اس کے افکار و نظریات کی تعلیم و تدریس کی جا رہی ہے، یونیورسٹی اس کے دینی حدود اربعہ سے ناواقف ہے۔

اور اگر ان کار پردازوں کے علم میں تھا کہ علامہ اقبال اور قاضی محمد اسلم کے معتقدات میں کوئی میل نہیں، صبح و شام کا فاصلہ ہے، تو انھوں نے یہ مذاق کیوں روا رکھا ہے؟ مقصد فکر اقبال کو سبوتاژ کرنا ہے یا اسے عام کرنا ہے۔ کیا یونیورسٹی کے ارباب بست و کشاد کو قاضی محمد اسلم سے بڑھ کر پورے ملک میں ایک شخص بھی اقبال کا اداشناس نظر نہیں آیا؟ قاضی محمد اسلم کی نگرانی میں فکر اقبال کا مطلب ہے، حسینؓ کی شہ رگ پر یزید کا خنجر۔ قاضی محمد اسلم ہی سے دریافت کر لیا ہوتا کہ وہ اقبال کی تعلیمات سے بکمال و تمام متفق ہیں؟ حضرت علامہ کو فکری اعتبار سے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا رہنما تسلیم کرتے ہیں؟ ان کے نزدیک اقبال کے فکر و نظر کا مقام کیا ہے؟ اقبال کے خطبات بہ عنوان تشکیلِ جدید الٰہیات کے مندرجات کی ردح سے انھیں کس حد تک اتفاق ہے؟ مرزائیوں کے بارے میں حضرت علامہ نے جو بیانات دیے تھے، اور جن مقالات کو حوالۂ قلم کیا، قاضی صاحب محترم کی ان کے بارے میں کیا رائے ہے؟ قاضی صاحب کے نزدیک شاہراہِ اسلام پر اقبال کا درجہ کیا ہے؟ ''احمدیوں'' کو اقلیت قرار دینے کے مطالبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے قاضی صاحب کا اقبال کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ اقبال کو مسلمان بھی سمجھتے ہیں یا نہیں؟ ان کے نزدیک اقبال اور غلام احمد میں سے کونسی شخصیت اس صدی میں اسلام کی راہنما ہے؟ اس قسم کے بیسیوں سوالات موجود ہیں، اور ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ قاضی صاحب مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت اور مرزا البشیر الدین محمود کی خلافت کو خارج کر کے ان سوالات پر سوچ ہی نہیں سکتے ہیں۔ جب اتنی واضح اور واشگاف صورت حال موجود ہو، تو اقبال کی فکر کو ان کے حوالے کرنا حادثہ نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ ایک ایسا حادثہ ہے جیسا کہ انگریزی میں ضرب المثل ہے کہ ''شیطان بائبل کا حافظ ہو گیا ہے؟'' ہم نہیں کہہ سکتے کہ قاضی صاحب نے یہ منصب کیونکر قبول کیا؟ اور اس کے تہہ منظر کون سے مقاصد کارفرما ہیں۔ کل کلاں کوئی شخص یہ تجویز کرے، اور علم و دانش کے وہ پتلے جو اس ملک میں عام پائے جاتے ہیں، اس پر صاد کر دیں کہ قائداعظم کی سوانح عمری، مولانا مظہر علی اظہر لکھیں، یا انجمن ترقی اردو کی باگ ڈور بھارت کی ہندی پرچارنی سبھا کے حوالے کر دی جائے، یا اسلام کی تعبیر و تفسیر کا کام پرشوتم داس ٹنڈن کی نگرانی

میں ہو، یا کعبہ اور اس کی عظمت پر ماسٹر تارا سنگھ مقالہ (Thesis) لکھیں، تو کیا عقل سلیم کے نزدیک یہ صحیح ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ہر شخص جو حواسِ خمسہ سے بہرہ یاب ہے اس کو مضحک المیہ قرار دے گا۔

معلوم ہوتا ہے یونیورسٹی کے کار پردازوں کی اکثریت حسیاتِ دین اور روحِ اسلام سے نابلد ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک اسلام صرف ان کے اسلامی ناموں اور معاشرتی رواجوں کے اظہار و اقرار کا نام ہے، اور دین و دانش کا جوہر، فہم و فراست کے اس مغز کا نام ہے جو اس کھیپ کی کھوپڑیوں میں اپنا ایک خاص طول و عرض رکھتا ہے۔

علامہ اقبال نے عمر بھر یورپی دانش و علم کی کارفرمائیوں کا ماتم کیا، اور جو لوگ اسی کے ہو گئے ہیں، یعنی جن کا پیکرِ خاکی یورپی عمارت گروں کا تیار کردہ ہے، ان کے خلاف ہمیشہ نالۂ احتجاج بلند کیا۔ ان کی نظمیں، ان کی تحریریں، ان کے بیان، ان کے خطوط آخر دم تک یورپی تصویروں اور مصوروں کا ماتم کرتے رہے۔ سید سلیمان ندوی کو انھوں نے 17 ستمبر 1933ء کے ایک خط میں لکھا کہ مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے۔ (''اقبال نامہ'' صفحہ 168) یہی نہیں بلکہ ان کے بیشمار خطوط میں بار بار یہ اضطراب موجود ہے کہ مسلمانوں کے وہ ''دانشورانِ بے دین'' جن کی تربیت یورپی دانش و حکمت کے گہوارہ میں ہوئی ہے اور جن کے علم و نظر کی معراج یورپی فلسفہ و فکر پر ہے، نہ صرف روح اسلام سے بے بہرہ ہیں، بلکہ عملاً اسلام سے صرف سیاسی فوائد حاصل کرتے ہیں۔ اس کے دینی فرائض کو پورا نہیں کرتے۔ ایک دوسری جگہ علامہ اقبال نے اس طبقہ کو بے حمیت اور بے غیرت لکھا ہے کیونکہ یورپی عقل و دانش سے مرعوب ہو کر یہ اسلام کے معاملہ میں ہر نئی تعبیر سے سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار رہتے، اور اس کے مقابلہ میں سپر انداز ہونے میں لذت محسوس کرتے ہیں۔

یہ ستم ظریفی ہے کہ اقبال کی بعض چیزوں کو تو اپنے حسب حال پا کر قومی تقاضوں کا جزو قرار دیا گیا ہے، اور بعض ایسی چیزیں جو اقبال کے نزدیک اسلام کی حیاتِ تازہ اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے لازم و ملزوم تھیں، انھیں طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا ہے۔ اقبال کی بدنصیبی ہے یا مسلمانوں یا پھر اسلام کے دورِ انحطاط کے برگ و بار کہ اقبال کی فکر عنقا ہے۔ پوست موجود ہے، مغز غائب ہے۔ ہڈیوں سے رشتہ باندھا جا رہا ہے۔ یہ لوگ اقبال اور اس کی فکر سے نہیں بلکہ اپنے کسی خلا کو پورا کرنے کے لیے اقبال کا نام لے رہے ہیں۔

قادیانیوں کے بارے میں اقبال نے جو کچھ کہا، وہ کسی اہم دینی مسئلہ پر ان کی سب سے بڑی تحریر ہے۔ یہ تحریر اس وقت قلمبند ہوئی اور سامنے آئی، جب وہ اپنی عمر عزیز گزار چکے تھے، بڑے غور و خوض کے بعد انھوں نے اس مسئلہ پر قلم اٹھایا تھا۔ ان کی یہ تحریر ہمہ جہت مکمل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت

یہ ملک غلام تھا، اور پاکستان بھی معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا۔ پاکستان کا تصور وہ پیش کر چکے تھے، لیکن ابھی مسلم لیگ نے بھی اس کو اپنا نصب العین قرار نہیں دیا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ چودھری ظفر اللہ خان نے گول میز کانفرنس کے ضمنی اجلاس میں اس تصور کو احمقانہ تخیل قرار دیا تھا۔

جواہر لال نہرو قادیانی جماعت کی حمایت میں کمر بستہ ہو کر سامنے آئے، تو علامہ نے بصیرت افروز مقالہ میں قادیانی جماعت کا تار و پود بکھیر دیا، اور اس حقیقت کو اچھی طرح افشاء کیا کہ اس جماعت کو مسلمانوں سے الگ رکھنا کیوں ضروری ہے۔ یہ تحریریں ڈھکی چھپی نہیں، عام ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی زندگی کے آخری سالوں میں ان خطوط کا مجموعہ شائع کیا، جو ان کے نام بعض اکابر نے لکھے تھے۔ ان خطوط میں علامہ اقبال کا بھی ایک خط ہے، جس میں انھوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ قادیانی اسلام ہی کے نہیں بلکہ ہندوستان کے بھی غدار ہیں۔ یہ خط ان کے مرض الموت میں مبتلا ہونے سے کچھ ہی دن پہلے کا ہے۔

اقبال نے جب اس فرقۂ ضالہ کے احوال وظروف معلوم کر لیے، تو سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ انھیں خارج از اسلام قرار دے کر انجمن حمایت اسلام سے نکلوا ڈالا۔ اس ضمن میں انھوں نے لاہوری اور قادیانی گروہوں کی تفریق کو بھی تسلیم نہ کیا۔ دونوں کو ایک ہی ٹہنی کا پتہ سمجھا۔

20 جون 1933ء کو انھوں نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا، اور ایک زبردست بیان میں قادیانی جماعت کے اغراض و مقاصد کا پردہ چاک کیا۔ پھر 2 اکتوبر 1933ء کے بیان میں قادیانیوں کی دوذہنی اور دوعملی کی چھاڑ کی۔ 1935ء میں قادیانی جماعت کے چہرے سے ہر نقاب اٹھا دی اور کھلے بندوں اعلان کیا کہ دینی اور سیاسی دونوں بنیادیں اس امر کی مقتضی ہیں کہ قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ ایک اقلیت قرار دیا جائے۔ علامہ نے جو کچھ سپردِ قلم کیا، وہ علم و فکر کی بنیاد پر تھا، اور آج تک کسی اسلامی گوشے سے بھی اس کے خلاف کوئی کلمہ نہیں نکلا ہے۔ حضرت علامہ فرماتے ہیں:

1- ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بنیاد نئی نبوت پر رکھے اور بزعم خود ان تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے، جو اس کے الہامات پر اعتقاد نہ رکھتے ہوں، ایسی جماعت کو مسلمان اسلام کی وحدت کے لیے ایک خطرہ تصور کریں گے، کیونکہ اسلامی وحدت ختم نبوت ہی سے استوار ہوتی ہے۔

2- مسیحِ موعود کی اصطلاح بھی اسلامی نہیں بلکہ اجنبی ہے اور نہ یہ اصطلاح ہمیں اسلام کے دورِ اوّل کے تاریخی اور مذہبی ادب میں ملتی ہے۔ بہائیت، قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے لیکن قادیانیت اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو

ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے لیکن باطنی طور پر اسلام کی روح اور مقاصد کے لیے مہلک ہے۔

3- نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ختم نبوت کے تمدنی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا۔ مغربیت کی ہوا نے انھیں حفظ نفس کے جذبے سے عاری کر دیا ہے۔

4- ہندوستان میں کوئی سا مذہبی سٹے باز اپنی اغراض کی خاطر اس طرح ایک نئی جماعت کھڑی کر سکتا ہے۔

5- جو لوگ مسلمانوں کو اس معاملے میں رواداری کا سبق دیتے ہیں ان کے بارے میں حضرت علامہ کا ارشاد ہے کہ یہ کیونکر مناسب ہے کہ اصلی جماعت کو تو رواداری کی تلقین کی جائے، حالانکہ اس کی وحدت خطرئے میں ہو، باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو، اگر چہ وہ تبلیغ جھوٹ اور دشنام سے لبریز ہو۔ جس قوم کی وحدت خطرے میں ہو تو اس کے لیے اور کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ معاند قوتوں کے خلاف اپنی مدافعت کرے۔

6- میری رائے میں حکومت کے لیے بہترین طریقہ کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان اس سے ویسی ہی رواداری سے کام لے گا جیسی وہ باقی مذاہب کے معاملے میں اختیار کرتا ہے۔

(ماخوذ از قادیانی اور جمہور مسلمان صفحہ 121 تا 134 حرف اقبال مطبوعہ المنار اکادمی۔ لاہور)

حضرت علامہ کے اس بیان پر "سٹیٹسمین" کے انگریز ایڈیٹر نے اپنے اداریے میں تنقید کی۔

اس تنقید پر حضرت علامہ نے ایڈیٹر کے نام ایک خط لکھا جو 10 جون 1935ء کی اشاعت میں طبع ہوا۔ اس خط میں حضرت علامہ نے اپنے مطالبہ کا اعادہ کیا۔

فرمایا کہ.........

1- حکومت کا فرض ہے کہ وہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی اقدام اٹھائے، اور اس امر کا انتظار نہ کرے کہ مسلمان کب یہ مطالبہ کرتے ہیں۔

2- ختم نبوت کے مفہوم کی تاویلیں اور تعبیریں قادیانی اس غرض سے کرتے ہیں کہ ان کا شمار حلقہ اسلام میں ہو تا کہ انھیں اس طرح سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں، تو پھر سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل رہنے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟

3- ملت اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا، تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب

کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے۔

اس تحریک میں قادیانیوں کو سب سے پہلے اس وقت کے انگریز گورنر سر ہربرٹ ایمرسن کی حمایت حاصل ہوئی، پھر ''سٹیٹسمین'' کے انگریز ایڈیٹر نے پشت پناہی کی۔ آخر میں پنڈت جواہر لال نہرو مدافع کے طور پر سامنے آئے۔ انھوں نے ماڈرن ریویو کلکتہ میں تین مضامین لکھے، جن میں بزعم خود مسلمانوں کے مذہبی افکار کا تجزیہ کرنا چاہا اور اس تجزیے میں اس اصل کے پیش نظر قادیانی جماعت کی مدافعت کی کہ پیغمبر عرب کے مقابلے میں غلام احمد بہر حال ایک ہندوستانی پیغمبر ہے۔ حضرت علامہ نے جواب میں ایک طویل مقالہ لکھا ہے، جس کے بعض ضروری اجزاء حسب ذیل ہیں:

1- پنڈت جی اور قادیانی دونوں پریشان ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف وجوہ کی بناء پر دونوں اپنے دل میں مسلمانانِ ہندوستان کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے ہیں۔

2- قادیانی جماعت کا مقصد یہ ہے کہ وہ پیغمبر عرب کی امت سے ہندوستانی پیغمبر کی ایک نئی امت تیار کرنا چاہتی ہے۔

3- جب کوئی شخص ایسے ملحدانہ نظریات کو رواج دیتا ہے جن سے نظام اجتماعی خطرے میں پڑ جاتا ہو تو ایک آزادانہ اسلامی ریاست یقیناً اس کا انسداد کرے گی۔ یہ اس کا فرض ہو جاتا ہے۔

4- آج کل کے تعلیم یافتہ مسلمان جو مسلمان کے دینیاتی مناقشات کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں، لفظ کفر کے غیر محتاط استعمال کو ملت اسلامیہ کے اجتماعی و سیاسی انتشار کی علامت تصور کرتے ہیں۔ یہ ایک بالکل غلط تصور ہے۔ اسلامی دینیات کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فروعی مسائل کے اختلاف میں ایک دوسرے پر الحاد کا الزام باعث انتشار ہونے کی بجائے دینیاتی تفکر کو متحد کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔

5- وہ اجتماعی اور سیاسی تنظیم جسے اسلام کہتے ہیں، مکمل اور ابدی ہے۔ محمدؐ کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں ہے، جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے، وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔

6- 1799ء سے ہندوستان میں اسلامی دینیات کی جو تاریخ رہی ہے، اس کی روشنی میں احمدیت کے اصل مظروف کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ یہ حکایت دراز ہے اور ایک طاقتور قلم کی منتظر ہے۔

7- مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرنا ہے۔

-8 وہ تمام ایکٹر جنھوں نے احمدیت کے ڈرامے میں حصہ لیا ہے زوال اور انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔

-9 یہ تحریک اسلام کے ضوابط کو برقرار رکھتی ہے۔لیکن اس قوت ارادی کو فنا کر دیتی ہے، جو اسلام کو مضبوط کرنا چاہتی ہے۔

-10 اسلامی وحدت مذہبی نقطہ نظر سے اس وقت متزلزل ہوتی ہے، جب مسلمان بنیادی عقائد یا ارکانِ شریعت کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔ اس ابدی وحدت کی خاطر اسلام اپنے دائرے میں کسی باغی جماعت کو روا نہیں رکھتا۔ (ماخوذ از حرفِ اقبال صفحہ 138، مطبوعہ المنار اکادمی۔لاہور)

پروفیسر قاضی محمد اسلم کا تقرر ان ثقہ حوالوں اور واضح نظریوں کے بعد بالکل ہی بے محل ہو جاتا ہے۔ادھر شروع میں جو سوال ہم نے قائم کیے تھے، ایک ایک کر کے جواب کے خواہاں ہیں۔ظاہر ہے کہ قاضی صاحب جس جماعت کے صحابی یا تابعی ہیں اس کی نفی نہیں کر سکتے اور نہ اس کے خلاف کسی ایسے شخص کے ساتھ مخلص ہو سکتے ہیں، جو ان کے مذہب، نبی، گروہ اور عقیدہ پر مندرجہ بالا الفاظ میں تجزیہ کر چکا ہو اور آخری وقت تک مُصر رہا ہو کہ اس جماعت کو اسلام کا باغی سمجھا جائے اور اس بغاوت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے ایک علیحدہ ملت قرار دیا جائے اور اگر انگریزی حکومت کو یہ تسلیم کرنے میں بہ مصلحت ہچکچاہٹ ہو تو آنے والی اسلامی ریاست مجبور ہو گی کہ اس فرض سے عہدہ برآ ہو کیونکہ اسلام اپنے دائرے میں ایسے کسی باغی کو تسلیم نہیں کرتا ہے، جو اس کے گھر میں نقب زنی کا مرتکب ہو۔

اس ضمن میں کچھ نئے سوالات بھی پیدا ہوئے ہیں:

-1 قاضی صاحب کے ایک خلافتی عزیز مرزا بشیر الدین محمود کے پوتے اور مرزا ناصر محمود کے بیٹے یونیورسٹی میں فلسفہ کی تکمیل کر رہے ہیں۔انھوں نے کچھ دن ہوئے ہیں اپنی ساتھی طلبہ سے گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا کہ اقبال کا شہرہ 70ء، 71ء تک ہے۔اس کے بعد اقبال کے لیے زوال ہے اور جو، ان کے نزدیک شروع ہو چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے قاضی محمد اسلم نے شاید اسی مفروضہ پر یہ فرض اپنے فرائض میں شامل کیا ہے۔ ہمارے اپنے علم وآگاہی کے مطابق قاضی محمد اسلم صاحب اقبال کے نظر وفکر سے مطلقاً آشنا نہیں۔انھیں اقبال کے اشعار بھی صحیح پڑھنے نہیں آتے ہیں، نہ وہ ان صداقتوں اور نزاکتوں سے آگاہ ہیں جو اقبال کے کلام کی روح ہیں اور ان کی تحریروں کے مطالب کی پیشانی کا جھومر ہیں۔ان کی نظر سے شاید اقبال کے کلام و پیام کا پورا حصہ نہیں گزرا۔وہ اقبال کی مصطلحات کے مفہوم ہی سے بے بہرہ ہیں۔

اپنے عقائد کی بوقلمونی (اور ہمارے نزدیک خرابی) کے باعث اقبال کے ذوق وشوق کو سمجھنے کی استطاعت سے محروم ہیں۔ وہ یورپی فلسفہ کے پروفیسر ہیں۔ انھیں اس کا احساس ہی نہیں کہ اقبال مغربی فلسفہ کا نقاد ہے۔ اقبال نے اپنے خطبات میں جن اسلامی شخصیتوں اور دینی مصطلحات کو بے تکلف استعمال کیا ہے اور اس سے جن نتائج کا استخراج کیا ہے، قاضی صاحب اپنے عقیدہ کی رو سے اس کے مخالف ہیں اور اپنے دماغی نشو کی وجہ سے اس کا فہم نہیں رکھتے۔ پھر جس عقیدہ وفکر کو اقبال جس ایمان وآگہی سے مانتا ہے، قاضی صاحب اس عقیدہ وفکر کو اس انداز واسلوب سے نہیں مانتے۔ یہ اختلاف وتضاد بنیادی ہے۔ قاضی صاحب کا ضمیر تو اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوگا، لیکن یونیورسٹی کے جن دانشوروں نے انھیں اس خدمت پر مامور کیا ہے، افسوس ہے کہ وہ اوّلاً اس کے فہم ہی سے قاصر ہیں۔ ثانیاً اس کی نزاکت واہمیت کو نہیں سمجھتے۔ ثالثاً اپنی ذات کے سوا ہر معاملہ میں رواداروا قع ہوئے ہیں۔ ان لوگوں نے جب اسلام کیمبرج اور آکسفورڈ کی یونیورسٹیوں سے سیکھا ہے تو اقبال کو ایک قادیانی کیوں نہیں پڑھا سکتا۔ انھیں مطلقاً خبر نہیں کہ مصیبت کی طرح گمراہی بھی تنہا نہیں آتی اور آتی ہے تو ہمہ گیر ہو جاتی ہے۔ ہمارے یہ دانشور اسی گمراہی کا شکار ہیں۔

"ایک رواداری فلسفی کی ہوتی ہے، جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح ہیں۔ ایک رواداری اشتراکی کی ہے، جس کے نزدیک تمام یکساں طور پر غلط ہیں۔ ایک رواداری مدبر کی ہے، جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر مفید ہیں۔ ایک رواداری ایسے شخص کی ہے، جو ہر قسم کے فکر وعمل کے طریقوں کو روا رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ ہر قسم کے فکر وعمل سے بے تعلق ہوتا ہے...... (معلوم ہوتا ہے، دانش گاہ پنجاب کے بیشتر کار پرداز اسی قبیلہ کے فرد ہیں) ایک رواداری کمزور آدمی کی ہے جو محض کمزوری کی وجہ سے ہر قسم کی ذلت جو اس کی محبوب اشیا، یا اشخاص پر روا رکھی جاتی ہے "برداشت کر لیتا ہے" (گبن)

اس آخری رواداری کا ہدف ان دنوں مسلمانوں کا سوادِ اعظم ہے۔ فی الجملہ اس تقریر پر ہم کسے مخاطب کریں۔ یونیورسٹی کے ان کار پردازوں کو جو اس تقریر کا باعث ہوئے ہیں۔ مولانا ظفر علی خان کے بھائی پروفیسر حمید احمد خان کو جو اقبال سے معنوی اور ظفر علی خان سے خونی رشتہ رکھنے کے باوجود اس فتنہ پر غور نہیں کر سکے ہیں، یا پھر ہم صوبہ کے راسخ العقیدہ مسلمان گورنر ملک امیر محمد خان سے درخواست کریں کہ وہ بحیثیت چانسلر اسلام اور اقبال کو یونیورسٹی کے ان بردہ فروشوں سے بچائیں، جن کی نیام میں کوئی تلوار نہیں ہے مگر اسلام کو اپنے اللّلے تللّوں کی میراث سمجھتے ہیں، جن کی فکرِ مستعار پر پچرنگی مصلحتوں کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

(ہفت روزہ چٹان۔ 19 اپریل 1965ء)

جب علامہ اقبالؒ نے مرزائیوں کو انجمن حمایت اسلام سے نکالا

علامہ اقبال نور اللہ مرقدہ نے مرزائیوں کی دونوں شاخوں کو خارج از اسلام قرار دے کر انجمن حمایتِ اسلام کے دروازے ان پر بند کر دیے تھے۔ مرزائی لاہوری ہو، یا قادیانی، انجمن کا ممبر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس واقعہ کی پوری تفصیلات انجمن کے تحریری ریکارڈ میں موجود ہیں۔ اس کے ایک عینی گواہ لاہور کے سب سے بڑے شہری میاں امیر الدین بفضل تعالیٰ بقید حیات ہیں۔ یونیورسٹی کی ہیئت انتظامیہ کے بھی رکن ہیں۔ ان سے یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ علامہ اقبالؒ انجمن کی جنرل کونسل کے اجلاسِ عام کی صدارت فرمانے لگے تو آپ نے سب سے پہلے کھڑے ہو کر اعلان فرمایا کہ مسلمانوں کی اس انجمن کا کوئی مرزائی (لاہوری یا قادیانی) ممبر نہیں ہو سکتا ہے۔ مرزا غلام احمد کے متبعین کی یہ دونوں جماعتیں خارج از اسلام ہیں۔

اس وقت ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کرسی صدارت کے عین سامنے بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ ہی میاں امیر الدین فروکش تھے۔ حضرت علامہ نے ڈاکٹر صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ مجھے صدر رکھنا ہے تو اس شخص کو نکال دو...... مرزا صاحب لاہوری جماعت کے پیرو تھے۔ حضرت علامہؒ کے اس اعلان سے تھرا گئے، کانپ اٹھے، جز بز ہوئے، کچھ کہنا چاہا حتیٰ کہ ان کا رنگ فق ہو گیا۔ حضرت علامہؒ مصر رہے کہ اس شخص کو یہاں سے جانا ہوگا۔ چنانچہ ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ، بیک بنی دو گوش نکال دیے گئے۔ ان کی طبیعت پر اس اخراج کا یہ اثر ہوا کہ بے حواس ہو گئے، دو چار دن ہی میں مرض الموت نے آلیا اور اس صدمہ کی تاب نہ لا کر انتقال کر گئے......!

پنجاب یونیورسٹی کے دانشور (؟) بتا سکتے ہیں کہ انھوں نے مسندِ اقبال کس بناء پر ایک قادیانی کے حوالے کی ہے۔ علامہ اقبال کی عظمت مقصود ہے یا اہانت؟ جس انسان نے اپنی صدارت میں ایک مرزائی کا وجود گوارا نہ کیا ہو اس کے فکر کی صدارت کسی قادیانی کے حوالے کر دینا ہمارے نزدیک ایک خوفناک جسارت سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے۔ (ہفت روزہ چٹان۔ **19 اپریل 1965ء**)

قاضی محمد اسلم اور مسندِ اقبالؒ

روزنامہ ''نوائے وقت'' کا اداریہ، بہ عنوان ''غلط بخشی'' مورخہ **16 اپریل 1965ء**۔

پنجاب یونیورسٹی میں مسندِ اقبال کے اہتمام کا فیصلہ مبارکباد کا مستحق ہے۔ علامہ اقبالؒ نظریۂ پاکستان کے خالق اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے راہ نما ہیں۔ چنانچہ فکری افلاس کے اس دور میں ان کے پیغام اور افکار کو عام کرنے کا عزم وقت کی اہم ترین ضرورت ہی نہیں ملک و قوم اور اسلام کی بہت بڑی

خدمت بھی ہے۔ہمیں یہ حسن ظن تھا کہ جن ارباب اختیار نے ایک انتہائی مستحسن فیصلہ کرنے کا لازوال اعزاز حاصل کیا ہے، وہ نئے منصب پر کسی موزوں شخصیت کو فائز کرنے کی سعادت بھی حاصل کریں گے۔ یہ کام چنداں دشوار بھی نہیں تھا کیونکہ اس گئے گزرے دور میں بھی ہمارے ہاں ایسے بزرگوں کی کوئی کمی نہیں تھی جو نہ صرف تعلیمات اقبال کی حقیقی روح سے پوری طرح آگاہ ہیں بلکہ انھیں خود بھی اسلام کے فلسفی شاعر کی صحبتوں سے استفادہ کے مواقع حاصل ہوئے۔لیکن اس انکشاف نے اقبال کے ہر شیدائی اور دردمند مسلمان کو اذیت ناک مایوسی اور اضطراب میں مبتلا کر دیا کہ حکیم الامت کے پیغام اور فلسفہ کو فروغ دینے کی ذمہ داری جن صاحب کو تفویض کی گئی ہے انھوں نے یونیورسٹی میں یورپی فلسفہ پر تو سینکڑوں لیکچر دیے ہوں گے اور بیسیوں کتابوں کا مطالعہ بھی کیا ہوگا،لیکن وہ عقیدتاً اسلام کے اس فلسفہ سے یقیناً بے بہرہ ہوں گے جو پیغام اقبال کی روح اور اساس ہے۔ یہ انتخاب ایسا ہی ہے جیسا کہ یورپ کے کسی مستشرق کو سیرت وقرآن کی تعبیرات اور توضیحات کے کام پر مامور کر کے مؤثر نتائج کی توقع کی جائے بلکہ ہمیں تو یقین ہے کہ مسندِ اقبال سنبھالنے والے پروفیسر قاضی محمد اسلم سے بھی اگر یہ دریافت کیا جائے کہ آیا کوئی مستشرق قادیانیت کے اسرار ورموز کی نقاب کشائی کر سکتا ہے؟ تو ان کا جواب بھی نفی میں ہوگا۔قاضی صاحب کے فرقہ کے متعلق حکیم الامت کا جو موقف رہا، کیا اس کے پیش نظر آپ کے لیے یہ ممکن ہوگا کہ اپنے نئے منصب سے انصاف کر سکیں؟ اقبالؒ سب مسلمانوں کی طرح حضرت محمد مصطفیٰؐ کو خاتم النبیین خیال کرتے تھے۔ان کے نزدیک نبوت کی کوئی نوع نہیں۔چنانچہ انھوں نے فرمایا......

اے ترا حق زبدۂ اقوام کرد
ختم بر تو دورۂ ایام کرد

اس طرزِ انتخاب سے تو اس شبہ کو تقویت ملتی ہے کہ یونیورسٹی کے حل وعقد نے ایک قومی تقاضہ پورا کرنے کی بجائے محض ایک آسامی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یونیورسٹی حکام سے کوئی اپیل اب عبث معلوم ہوتی ہے البتہ ہم قاضی صاحب سے یہ کہیں گے کہ انھوں نے مسند اقبال کی سربراہی قبول کر کے اپنے آپ کو بھی بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے۔لہٰذا مناسب یہی ہوگا کہ وہ خود ہی اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں۔

(ہفت روزہ چٹان۔19 اپریل 1965ء)

یونیورسٹی کی شاہکار معذرت

پنجاب یونیورسٹی میں مسند اقبال کو ایک قادیانی پروفیسر کے حوالے کرنے پر ہم نے جو کچھ عرض کیا تھا،''نوائے وقت'' نے اپنے الفاظ میں ہمنوائی کی، یونیورسٹی کے دانشوروں نے دوسرے ہی

دن ایک وضاحتی بیان ارسال کیا، جو روزناموں میں چھپ چکا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بیان عذرِ گناہ بدتر از گناہ کے رنگ و روغن کی ایک اچھوتی بانکی ہے۔ آج ''کوہستان'' اور ''امروز'' نے بھی ہمارے خیال کی توثیق کی ہے۔

اگر مسندِ اقبال قائم کرنے کا مقصد فلسفہ کے نگارخانے میں محض ان کے نام کی عظمت کا اقرار واعتراف ہے اور تعلیماتِ اقبال کی تعلیم و تشریح سے اس کا کوئی تعلق نہیں، تو یہ امر اور بھی افسوسناک ہے۔ اقبال اس اقرار واعتراف کے محتاج نہیں۔ کوئی سا شخص اس عنوان سے اشکبار نہ تھا، کہ یونیورسٹی اس انداز میں اشک شوئی کرتی ہے۔ اقبال کے نام پر مسند محض کا قیام کوئی چیز نہیں ۔

جہانِ تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

یونیورسٹی کے اربابِ انتظام نے وضاحتی بیان دے کر خود اپنے چہرے سے نقاب اٹھادی ہے کہ مسندِ اقبال صرف مسندِ اقبال ہے، فکرِ اقبال نہیں اور ظاہر ہے کہ عوام وخواص میں سے کوئی فرد بھی اس سے مطمئن نہیں۔

اور اگر مسندِ اقبال قائم کرنے کا مقصد واقعی اقبال کے افکار و سوانح اور تعلیمات و نظریات کی تعلیم و تدریس ہے تو پھر یونیورسٹی کا وضاحتی بیان خود اپنے مطالب کی رو سے اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ جو شخص حکمت اقبال کی نگرانی پر مامور ہوا ہے، وہ اس منصب کے لیے سب سے زیادہ ناموزوں شخص ہے۔ ہم نے قادیانی جماعت کے بارے میں علامہ اقبال کے جو نظریات پیش کیے ہیں، سوال یہ ہے کہ یونیورسٹی کے کارپردازوں اور قاضی محمد اسلم کے اعوان وانصار کا اس بارے میں مسلک کیا ہے؟

کیا یونیورسٹی علامہ اقبال نور اللہ مرقدہٗ کے ان افکار کو غلط سمجھتی ہے، ظاہر ہے کہ وہ یہ حوصلہ نہیں کرسکتی اور اگر صحیح سمجھتی ہے، تو اس نے ایک قادیانی پروفیسر کو اس منصب پر فائز کیوں کیا؟ اور اگر اس نے مداہنت کی ہے تو یہ اقبال و اسلام کی روح کے ساتھ بزدلانہ مذاق ہے۔ آخر قاضی محمد اسلم خود ہی مستعفی کیوں نہیں ہو جاتے، جبکہ وہ اس بات سے کماحقہ واقف ہیں کہ علامہ اقبال ان کے نبی کو متنبی اور ان کی جماعت کو خارج از اسلام سمجھتے تھے۔

(ہفت روزہ چٹان۔26اپریل1965ء)

''الفضل'' کی اچھوتی بانکی

ہم نے گذشتہ سے پیوستہ شمارے میں اعلان کیا تھا جو اہل قلم علامہ اقبالؒ کے فرمودات کی روشنی میں قادیانی جماعت کے احوال و ظروف پر مقالہ (Thesis) تیار کرے گا جس سے اس جماعت

کی ایجاد کے اسباب ووجوہ معلوم ہوں اور اس امر کی تصدیق ہوتی ہو کہ اس جماعت کو خاص مقاصد و مصالح کے تحت برطانوی سرکار نے پروان چڑھایا تھا، ایڈیٹر ''چٹان'' بہترین مقالہ کے مصنف کو مقررہ ججوں کے فیصلہ پر اپنی جیب سے پانچ ہزار روپیہ نقد انعام دیں گے۔ ''الفضل'' کے لیے ''چٹان'' کا نام سوہان روح ہے چونکہ ''چٹان'' کے اسی شمارے میں قادیانی پروفیسر کے تقرر پر بھی احتجاج کیا گیا تھا۔ اس لیے ''الفضل'' مضطرب تھا کہ پنجہ آزما ہو، چنانچہ بھیگی بلی کی طرح اس نے غرانا چاہا ہے۔ لیکن اب کے تنہا نہیں آیا اپنا پورا قبیلہ ساتھ لایا ہے۔ ''پیغام صلح'' چیخا ہے، ''الفرقان'' چلایا ہے۔ لاہور کا ایک ادبی ہفت روزہ بھی اس لشکر کے ہراول دستہ میں ہے۔ ہم ان میں سے کسی کو قابل التفات نہیں سمجھتے، یہ مسئلہ ان کے حدود سے باہر ہے، البتہ ''الفضل'' نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا جواب دینا ضروری ہو گیا ہے۔

''الفضل'' کی تجویز یہ ہے کہ

''احمدیوں اور مخالفین کے درمیان متنازعہ فیہ مسائل کے متعلق ایک تحریری مباحثہ برپا کیا جائے۔ سات سات پرچے دونوں طرف سے ہوں۔ پھر ان جواب اور جواب الجوابوں کو تین زبانوں اردو، عربی انگریزی مشترکہ خرچ سے چھپوا کر لائبریریوں اور خاص افراد کو مفت بھیجا جائے۔ اس طرح ایک دفعہ فیصلہ ہو جائے گا۔''

دیکھا آپ نے، اسے کہتے ہیں ''ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ'' سوال گندم جواب ریسماں، یہ کمال صرف قادیانی نبوت کو حاصل ہے کہ وہ ہر معاملہ میں جوا اور سٹہ کھیلتی ہے اور اس کی نبوت کا دارومدار قمار بازی پر ہے۔

قادیانی مسئلہ پر علامہ اقبال کے بیانات موجود ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور ان کے علاوہ کئی اکابر کی تحریریں موجود ہیں۔ ان کا جواب کہاں ہے؟ کہ فرار و گریز کی نئی راہیں تیار کی جارہی ہیں۔

''الفضل'' نے اپنے اس اداریہ میں مولانا ابوالکلام آزاد سے ایڈیٹر ''چٹان'' کی ارادت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مرحوم مولانا نور اللہ مرقدہٗ کو سخت قسم کی گالی دی ہے۔ یہ صرف مدیر ''الفضل'' نے پاکستان کی سیاسی فضا سے فائدہ اٹھانا چاہا ہے، ورنہ وہ خود بھی سمجھتا ہے کہ مرزا غلام احمد کی تمام تحریریں مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک آوارہ جملہ کی سی قدر و قیمت بھی نہیں رکھتی ہیں اور ایک نہیں ہزاروں خانہ ساز نبی، مولانا ابوالکلام آزاد کی جوتی پر قربان کیے جاسکتے ہیں۔ (ہفت روزہ چٹان۔ 26 اپریل 1965ء)

اقبال کے بگلا بھگت

علامہ اقبال نے عمر بھر شاہینوں کی آرزو کی، اور نوجوانوں کو مرد کامل کے اوصاف پیدا کرنے

کی دعوت دیتے رہے۔ انھیں عقاب اس لیے عزیز رہا کہ آزاد فضا میں اُڑتا ہے، بلند پرواز ہوتا ہے، مردہ شکار نہیں کھاتا، آشیاں نہیں بناتا اور پرندوں میں سب سے زیادہ غیرت مند ہے، لیکن اقبال کے نام پر جن لوگوں نے اکیڈیمیاں بنالی ہیں، ان میں بگلا بھگت زیادہ ہیں...... بلکہ یوں کہیے کہ اقبال ان بگلا بھگتوں کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔ ہمارے سامنے کراچی کی مجلس اقبال کا وہ مطبوعہ کتابچہ ہے، جس میں تین چوتھائی اشتہارات، باقی رطب ویابس ہے۔ یا پھر خاص دوستوں کا چرچا کرنے کے لیے اقبال کے ملفوظات، دو تین پرانے خطوط اور ایک کتاب سے اقتباس۔ اس میں ہے کیا؟

علامہ اقبال کھاتے کیا تھے؟ پہنتے کیا تھے؟ انھوں نے ساری زندگی میں تین دفعہ کوٹ پہنا۔ علی بخش ان کے لیے موٹا جھوٹا خرید لاتا تھا وغیرہ۔ علامہ اقبال کے حقیقی دوستوں کا بیان ہے کہ اس کا نوے فیصد حصہ غلط ہے اور جن صاحب نے علامہ اقبال کے کوٹ کی روایت بیان کی ہے، وہ علامہ اقبال کے ہاں جا ہی نہیں سکتے تھے۔ کبھی ایک آدھ پھیرا ڈالا ہو تو الگ بات ہے اور اگر یہ درست بھی ہو تو رطب ویابس پر روپیہ ضائع کرنے سے فائدہ؟ آرٹ پیپر کا بے ڈھنگا مصرف ہے۔ صحیح مصرف تو اقبال کے افکار کی ترویج واشاعت ہے، جس سے بگلا بھگت بھاگتے ہیں۔ کیا ان لوگوں کو علم ہے کہ مرزائی امت کی دونوں شاخیں علامہ اقبال کے خلاف یاوہ گوئی میں منہمک ہیں اور بگلا بھگت اپنے گریز وفرار سے ان کی تقویت کا باعث ہو رہے ہیں۔

لاہوری پارٹی کے ایک ماہنامہ ''روح اسلام'' نے مئی کے شمارے میں مرزا غلام احمد قادیانی کے دفاع میں علامہ اقبال کے زمانہ طالب علمی کی ایک نظم شائع کی ہے۔ یہ نظم خودساختہ ہی نہیں بلکہ پھسپھسی ہونے کے علاوہ لغو بھی ہے۔ اس قسم کے شوشے چھوڑنا...... مرزائیوں نے اپنا وظیفۂ حیات بنا لیا ہے۔ لیکن بگلا بھگتوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ کوئی صاحب دل اس پر روشنی ڈالیں گے کہ اس گریز وفرار اور اعراض واجتناب کی وجہ کیا ہے؟ (ہفت روزہ چٹان۔ 29 مئی 1967ء)

قلم برداشتہ

مدیر چٹان نے چنیوٹ میں جو تقریر کی ہے، معلوم ہوا ہے اس سے مرزا کی امت حد درجہ پریشان ہے۔ سب سے پہلے لاہور کا ایک ہفتہ وار قادیانی، مسلم ٹاؤن کے عبدالسلام خورشید کی شہ پر سامنے آیا۔ اس نے مغلظات بکنا شروع کیں، اصل بحث سے گریز کیا اور ٹاپنے لگا۔ چونکہ اس سے ہمکلامی ہمارے منصب سے فروتر ہے، لہٰذا ہم نے پہلے دن ہی سے اس کو مخاطب کرنا یا اس کی ژاژ خائی کا جواب دینا اپنی توہین سمجھا۔ الفضل نے دیکھا کہ اس کالاہوری پٹھا لائق اعتنا ہی نہیں تو عجمی اسرائیل کا یہ ٹینک فوراً میدان میں آ گیا۔ اس نے اپنے اشکول مرزا ناصر کے خوانِ استدلال کی خوشہ چینی کرتے

ہوئے چار دن تک اپنی نبوت کے حق میں وہی کھڑاگ رچایا جو استعماری طاقتوں نے اسرائیل کے حق میں رچا رکھا ہے۔ اس کی ہم نوائی کو تل ابیب یعنی ربوہ کا الفرقان دیان بن کر نکلا ہے۔ جناب ابوالعطاء جالندھری نے آٹھ صفحات میں زہر فشانی کی ہے۔

مدیر چٹان نے جو کچھ کہا، اس کی اساس علامہ اقبالؒ کے افکار پر تھی بلکہ جن حوالوں کو ان تینوں نے اپنے ''جوابی حملے'' کی اساس بنایا ہے، وہ تمام تر علامہ اقبال کی تحریروں سے ماخوذ ہیں، لیکن خانہ ساز نبوت کے ان خوشہ چینوں کی بد دیانتی کا شاہکار ہے کہ علامہ اقبال کا نام نہیں لیتے اس لیے کہ مسلمانوں کے احتساب سے ڈرتے ہیں لیکن ان کی بنیاد پر شورش کاشمیری پر گالی گفتار کرتے ہیں؟ کیا اس کا نام دیانت ہے؟

شورش کاشمیری نے جو کچھ کہا، وہ تمام علامہ اقبال کے ارشادات ہیں۔ مثلاً:

1- قادیانی، برطانیہ کے جاسوس اور اسلام کے غدار ہیں۔
2- ان کی تحریک اسلام کے خلاف بغاوت ہی نہیں بلکہ ان کا وجود یہودیت کا مثنیٰ ہے۔
3- مسلمانوں میں سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لیے شریک ہوتے ہیں لیکن مذہباً ان سے الگ رہتے اور تمام دنیائے اسلام کو مرزا غلام احمد کے انکار کی بنیاد پر کافر سمجھتے ہیں۔
4- حکومت کا فرض ہے کہ انھیں مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دے۔

شورش کاشمیری نے علامہ کے ان نکات کی وضاحت میں تقریر کی، کوئی ایسا لفظ نہیں کہا جو محض یادشنام ہو۔ لیکن سارا قادیانی پریس اس پر چلا اٹھا اور لگا تار چلا رہا ہے کہ

''ان دنوں گزرے ہوئے احرار کی نمائندگی ہفت روزہ چٹان کے ایڈیٹر شورش کاشمیری کر رہے ہیں۔''

ابوالفضل نے ایڈیٹر چٹان کو پسماندگان احرار کا سرخیل لکھا ہے۔ لاہوری ہفتہ وار کے توشہ خانے میں بھی بول و براز ہے۔

سوال گندم جواب ریسماں۔ ایڈیٹر چٹان کو پسماندگانِ احرار ہونے پر فخر ہے۔ سوال یہ ہے کہ مرزائی پسماندگانِ انگریز میں سے ہیں یا نہیں؟ مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریریں اس پر شاہد ہیں؟ پھر مرزائی اس کا اعتراف کیوں نہیں کرتے؟

پہلے اپنے ''پیغمبر'' کے فرمودات کی تردید کریں پھر احرار پر تعریضاً قلم اٹھائیں۔ اپنے عیب کو چھپانے کی انوکھی منطق ہے کہ دوسروں کو گالی دی جائے۔ کیا اس نبوت اور اس خلافت پر مرزائی امت کا دارومدار ہے؟

علامہ اقبال کے بارے میں فرمایئے کہ ان کے ارشادات پر آپ کے جوابات کیا ہیں؟

شورش کاشمیری اس وقت احرار کی نہیں، اقبال کی نمائندگی کر رہا ہے۔

جواب مرحمت فرمایئے! جواب میں گالی دینا شیوۂ شرفا نہیں۔ ذرا تاریخ محمودیت پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجئے۔ پھر سوچئے کہ آپ میں کسی شخص کو گالی دینے کا حوصلہ ہے؟

ابوالعطاء صاحب نے جو کچھ لکھا ہے ہم اس کا مکمل جواب تو شمارہ آئندہ پر اٹھا رکھتے ہیں کیونکہ اس شمارے میں عربوں پر فتنہ اسرائیل کی یلغار کا تذکرہ تفصیل سے ہوگیا ہے لیکن دو چار باتیں زیر قلم تحریر میں عرض کرنی ضرور ہیں۔

اولاً۔ مرزائی قلمکار جو سلطان القلم کے تلامذہ ارشد ہیں، تحریر میں شرافت پیدا کریں، ورنہ جس لہجہ میں انھوں نے گفتگو شروع کی ہے، اس کا جواب دیا گیا تو بہشتی مقبرے کی ہڈیاں چٹخنی شروع ہو جائیں گی اور چوہدری ظفر اللہ خان کی سیرت سے گلستان کا باب پنجم نکال کر شیزان ہوٹل کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔

عزت کے خواہاں ہو تو عزت کرنا سیکھو

ثانیاً۔ عاجزی ان لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جن میں انکسار ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا غلام احمد کی دینی بصیرت ایک خود ساختہ عمارت ہے جس میں نہ فہم قرآن کی گہرائی ہے اور نہ ادب و انشاء کی گیرائی۔ ان کا مجموعۂ شعر ''درثمین'' شاعرانہ عیوب کا مرقع ہے۔ جو شخص شاعرانہ محاسن نہیں رکھتا اس میں ''پیغمبرانہ محاسن'' کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں۔ آج تک ایک مرزائی بھی ایسا نہیں جس کو قدرت نے شاعری کا صحیح ذوق دیا ہو یا جس کو انشاء پر قدرت ہو یا جو اردو، عربی، فارسی کی چند سطریں صحیح لکھ سکتا ہو۔ بفضلہٖ تعالیٰ ایڈیٹر چٹان ہر مرزائی مصنف، شاعر اور مبلغ کی تحریر و تقریر میں زبان و بیان کے اعتبار سے کئی پشتوں تک اصلاح دے سکتا ہے۔

ثالثاً۔ ہمیں معلوم ہے کہ مرزائی افسروں کی لادین کھیپ سے رابطہ پیدا کر کے خفی و جلی بنیادوں پر جھوٹی رپورٹیں اور بے مقصد تبصرے کرانے کے عادی ہیں۔ نیز انکوائری رپورٹ میں سی آئی ڈی کے مراسلے اس امر کا بین ثبوت ہیں۔ ہماری گرفتاری میں بھی بروایت ان مرزائی افسروں کی ذریت کا ہاتھ تھا۔ اب بھی ان کی تگ و دو کا سارا انحصار اس پر ہے کہ اپنے مذہبی پاکھنڈ کو سیاسی ہتھکنڈوں سے جاری رکھیں اور ان عناصر کے خلاف ژاژ خائی کر کے پہلو بچاتے رہیں جو ان کی طرح برطانوی سرکار کے گماشتے نہیں تھے جنھوں نے سامراج سے ٹکر لی اور آزادی کی جدوجہد میں قربانی اور استقامت کی شمعیں جلاتے رہے۔ مرزائیوں کا شعار ان شمعوں کو گل کرنا اور برطانوی سامراج کی خدمت بجالانا

تھا۔ انھیں اب یہ ہتھکنڈے جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔

رابعاً۔ مرزائی اصل سے انحراف کر کے نقل پر اتر آئے ہیں۔ انھیں کذب و افتراء سے عار نہیں۔ احرار کے معاملہ میں لاہوری لے پالک اور اس کے چچیرے وخلیرے بھائی اس ڈھٹائی سے اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ جھوٹ کا جواب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جھوٹوں پر لعنت بھیجی ہے اور فی زمانہ اس کا صحیح اطلاق مرزا قادیانی کی امت پر ہوتا ہے۔

خامساً۔ ابو العطاء صاحب نے اپنے دیا کھیان کے آخر میں ہمیں تحریری مناظرہ کا چیلنج دیا ہے۔ اوّل تو یہ تحریری مناظرہ خوب ہے۔ آمنے سامنے کیوں نہیں؟ کھل کر آیئے مسلمانوں کے شہروں میں نہیں تو ہم ربوہ میں آنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن شرط یہ ہوگی کہ عام مسلمانوں کو بھی اس میں شریک ہونے کی اجازت ہو۔ اس کے باوجود ہم تحریری مناظرہ کے لیے بھی تیار ہیں اور جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس کی صحت پر اصرار کرتے ہیں۔ اصل مسئلہ چند نکات کا نہیں پوری مرزائیت اور اس کے خدوخال کا ہے۔ بحث اس پر ہونی چاہیے کہ

1- مرزا غلام احمد برطانوی حکومت کے خود کاشتہ تھے یا نہیں؟
2- انھوں نے برطانوی حکومت کی وفاداری پر مذہباً صاد کیا اور چاپلوسی کی حد تک چلے گئے۔
3- مرزائیت کے مشن صرف ان علاقوں میں قائم ہیں، جہاں برطانوی نوآبادیاں رہی ہیں یا برطانوی اثرات موجود ہیں۔
4- مرزائیت نے اصل اسلام سے بغاوت کر کے مسلمانوں کی دینی وحدت کو تاراج کیا۔
5- مرزائی ایک مدت سے اپنی الگ ریاست قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔
6- مرزائیت مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے خارج ہے۔

اب ایک اور بات بھی سن لیجئے۔ یہ دو چار سوال ہیں، فرمایئے! کیا جواب ہے؟

1- اسرائیل کی عربوں سے جنگ میں آپ کا کردار کیا رہا؟
2- آپ کا جو مشن اسرائیل میں تھا اسلام کی اس مصیبت عظمیٰ پر اس کا ردّ عمل کیا تھا؟
3- کیا یہ صحیح ہے کہ آپ کے مشن نے اسرائیل کی فتح پر اسرائیل کے صدر کو مبارک باد دی؟
4- کیا آپ اس سے انکار کرتے ہیں کہ بیت المقدس میں اسرائیل کے داخلہ پر اس مشن نے عربوں کی اذیت میں اضافہ کیا اور انھیں گمراہ کرنا چاہا؟
5- کیا سبب ہے کہ صرف آپ کے مشن کو اسرائیل میں رہنے کی اجازت ہے؟ یہ مسلمانوں سے انقطاع کا باعث ہے یا مغلوب مسلمانوں میں برطانوی مقاصد اور اسرائیلی اغراض کی

آبیاری کا حیلہ ہے؟

6- اس سے آپ انکار کر سکتے ہیں کہ آپ مسلمانوں کی شکلیں بنا کر مسلمان ملکوں میں استعماری قوتوں کے لیے جاسوسی کرتے ہیں؟ (ہفت روزہ چٹان۔19 جون 1967ء)

سالک اور ابنِ سالک

سیاسی اختلاف کے باوجود مولانا عبدالمجید سالک سے ہمارے تعلقات نہ صرف مخلصانہ تھے بلکہ نیازمندی کا رشتہ ان کی وفات تک قائم رہا۔ اب وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں لیکن ہمارا دل ان کی محبت و اخلاص سے معمور ہے۔ اس کا بین ثبوت ایڈیٹر چٹان کی زیر طبع کتاب ''نورتن'' ہے جس میں لاہور کے نو صحافیوں کے سوانح و افکار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پہلا خاکہ سالک صاحب کے متعلق ہے۔ اتنی خوبصورت تصویر کسی اور اہل قلم نے اب تک پیش نہیں کی ہے۔

افسوس یہ ہے کہ ان جامع صفات سالک کے فرزند ارجمند جناب عبدالسلام خورشید یا تو اپنی کسی بیماری کے باعث اچھال چھکا واقع ہوئے ہیں، یا پھر ان کی فطرت ہی کچھ ایسی ڈھلی ہوئی ہے کہ قلم سے شوشے چھوڑنا ان کی طبیعت کا جزو لاینفک ہو چکا ہے۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے قسم کھالی ہے کہ ہر وہ شخص جو ان کے والد مرحوم کا دوست تھا یا جن سے ان کے والد مرحوم کے نیازمندانہ تعلقات تھے، یا جن اکابر کو سالک مرحوم اپنا بزرگ سمجھتے تھے، خورشید صاحب ان کے معاملہ میں کوئی نہ کوئی بات اپنے قلم سے ایسی ضرور نکالیں گے جو مخفی زہر رکھتی ہو۔ ان کے قلم سے مولانا ظفر علی خاں بچے نہ مولانا ابوالکلام، نہ حمید نظامی حتیٰ کہ اب علامہ اقبال کی تربت پر بھی ''پھول'' بکھیر رہے ہیں۔

حمید نظامی کے متعلق جو کچھ لکھا وہ ان کی نیش زنی کا نمونہ تھا۔ علامہ اقبال پر توجہ فرمائی تو ان کی سیرت پر رنگ رلیوں کا غلاف چڑھا دیا۔ نوائے وقت نے اس کا نوٹس لیا۔ معاملہ معمولی تھا۔ خورشید صاحب اپنے جی میں عہد کر لیتے کہ آئندہ قلم کو احتیاط سکھائیں گے مگر انھوں نے لاہور کے ایک ہفتہ وار کا دامن تھاما ہے۔ اس ہفتہ وار کے قادیانی مدیر نے بھی اس مضمون کو غنیمت سمجھا اور قادیانیت کے متعلق اقبال کے محاسبہ کا انتقام بزعم خویش اس مضمون کی مکرر اشاعت کے ساتھ اپنے اس نوٹ سے لیا ہے۔ یہ نوٹ ملاحظہ فرمائیے:

''ہماری شروع ہی سے یہ رائے رہی ہے کہ جذباتیت پرست علامہ اقبال کو ایک عظیم ملت پرست شاعر کے علاوہ کچھ اور بنانے یا ثابت کرنے کی فکر میں ہیں۔ وہ تاریخ ہی سے نہیں خود علامہ موصوف سے بھی دشمنی فرما رہے ہیں کہ اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ کر جب ان کا یہ مفروضہ حقائق کی کسوٹی پر بادن تولے پورا نہ اترے گا، قلب و ذہن علامہ کے اصل اوصاف و خصائل کے بارے میں بھی شک میں

پڑ جائیں گے۔اس حقیقت سے انکار کب ممکن ہے کہ علامہ کی زندگی کا ایک بڑا حصہ بڑا رنگین گزرا،اور ایک عمر تک گانا سننا، ستار بجانا اور پینا پلانا آپ کے شب و روز کے معمولات کا حصہ رہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے تو اپنے اس مقالہ میں (جو پچھلے دنوں روزنامہ مشرق میں شائع ہوااور جس پر انہی جذباتیت پرستوں نے ایک حد تک لے دے بھی کی) صرف یہ لکھا ہے کہ ''مرحوم کی زندگی کے اواخر میں ایک ایسا موڑ آیا، جس کے بعد انھوں نے کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور ساری رنگ رلیاں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں۔'' اس پر لے دے کا مطلب؟ اور حاصل؟ یہ یقیناً اس غیر موثر لے دے ہی کا ردعمل ہے کہ ہم اس حقیقت آفریں مقالہ کو روزنامہ ''مشرق'' کے شکریے کے ساتھ ''لاہور'' کی اشاعت (زیر مطالعہ) میں شامل کر رہے ہیں۔(ایڈیٹر لاہور۔15 مئی)

خط کشیدہ الفاظ کو دوبارہ پڑھ لیجئے۔مدیر ہفتہ وار کی خدمت میں تو یہ التماس ہے کہ اقبال کو کوئی شخص بھی یہاں کچھ اور بنانے یا ثابت کرنے کی فکر میں نہیں۔نہ وہ ظلی و بروزی نبی تھے نہ کوئی انھیں پیغمبر بنانے کی فکر میں ہے۔ان سے مسلمانوں کی عقیدت کا ایک ہی سبب ہے کہ وہ سرور کائناتؐ کے حلقہ بگوش تھے۔جن لوگوں نے نبوت کا سرقہ کرنا چاہا، اقبال نے ان کا سختی سے محاسبہ کیا۔آپ اگر اقبال کے دامن میں الزامات کی یہ خاک ڈالیں اور عیب بینی کا شوق آپ کو یہاں تک پہنچا دے تو عقیدۃً آپ کو اس کا حق پہنچتا ہے کیونکہ علامہ اقبال قادیانیت کے اس دور میں سب سے بڑے محاسب تھے۔انھوں نے ''احمدیت'' کو خاک نامرادی میں سُلا کر دم لیا۔لیکن خورشید صاحب کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس انداز میں ژاژ خائی کریں۔سیرت نگاری کا یہ انداز یورپ کی نقالی ضرور ہے لیکن بھونڈی نقالی۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ خورشید صاحب اپنی فطرت کو روک نہیں سکتے تو اپنے والد محترم مولانا عبدالمجید سالک صاحب کے گورو کفن پر رحم کریں۔

کیا انھیں معلوم نہیں کہ ان کے اس مضمون نے اقبالئین کو نعل در آتش کر رکھا ہے۔مرکزیہ مجلس اقبال کی مجلس عاملہ میں اس غصہ کو روکنے کا باعث ہم ہوئے ہیں۔خورشید صاحب شاید اس سے بے خبر ہیں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کو جواب ملا تو ان کے لیے قلم کی سرزمین میں ٹھہرنا مشکل ہو جائے گا۔

(ہفت روزہ چٹان۔22 مئی 1967ء)

اقبال سے بغض کی بناء پر نہرو کا استقبال

قادیانیت کا ایک لاہوری متنبّی آج کل ہمارے خلاف خانہ ساز نبوت کی ٹکسالی زبان کا مظاہرہ کر رہا ہے۔بزعم خویش اس نے ہمیں نہرو کا پیشہ ور ایجنٹ لکھ کر مصلح موعود کی قبر پر فاتحہ پڑھی ہے۔

حقیقت حال کیا ہے.........؟

روزنامہ الفضل کا اقتباس ذیل میں ملاحظہ فرمایئے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ علامہ اقبال سے عناد انھیں کہاں کہاں نہیں لے گیا۔ اور ان کے شوقِ جبہ سائی پر کس آستانہ کی خاک نہیں ہے۔ اگر یہ حوالہ غلط ثابت ہو تو ہم ہر سزا و صعوبت کے حقدار ہیں۔ بلکہ جناب ابوالعطاء جالندھری کو دس ہزار نقد چہرہ شاہی پیش کرنے کے لیے تیار۔

فخرِ وطن پنڈت جواہر لال نہرو کا لاہور میں شاندار استقبال

آل انڈیا نیشنل لیگ کورز کی طرف سے

(الفضل کے خاص رپورٹر کے قلم سے)

لاہور۔ 29 اپریل۔ آج حسب پروگرام پنڈت جواہر لال صاحب نہرو لاہور تشریف لائے۔ پنجاب پراونشنل کانگرس کمیٹی کی خواہش پر (قادیانی جماعت کی) آل انڈیا نیشنل لیگ کورز کی طرف سے آپ کے استقبال کا انتظام کیا گیا تھا۔ چونکہ کانگرس نے صرف پانصد والنٹیروں کی خواہش کی تھی، اس لیے قادیان نے تین صد اور سیالکوٹ سے دوصد کے قریب والنٹیر 28 مئی کو لاہور پہنچ گئے۔ قادیان کی کوردس بجے پہنچی۔ گاڑی کے آنے پر جناب صدر آل انڈیا نیشنل لیگ اور قائد اعظم آل انڈیا نیشنل لیگ کورز موجود تھے۔ پولیس کا بھی زبردست مظاہرہ تھا۔ کانسٹیبلوں کی بہت بڑی تعداد کے علاوہ پولیس کے بڑے بڑے افسر بھی موجود تھے۔ قادیان سے کارِ خاص کے سپاہی ساتھ آئے اور عصر تک ساتھ رہے۔ احمدیہ ہوسٹل میں جہاں قیام کا انتظام تھا، جناب شیخ بشیر احمد صاحب (قادیانی) ایڈووکیٹ لاہور صدر آل انڈیا نیشنل لیگ نے ایک مختصر مگر برمحل اور برجستہ تقریر کی جس میں بتایا کہ آج ہم اپنے عمل سے یہ ثابت کرنے کے لیے آئے ہیں کہ آزادی وطن کی خواہش میں ہم کسی سے پیچھے نہیں ہیں، اور ہم نے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا سے ظلم و ناانصافی کو مٹانا ہے اور صحیح سیاسیات کی بنیاد رکھنی ہے۔ آپ لوگ اس موقع پر کسی صورت میں کوئی ایسی حرکت نہ کریں جو سلسلہ کے لیے کسی طرح بدنامی کا موجب ہو۔

علی الصباح چھ بجے تمام باوردی والنٹیر باقاعدہ مارچ کرتے ہوئے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ یہ نظارہ حد درجہ جاذب توجہ اور روح پرور تھا۔ ہر شخص کی آنکھیں اس طرف اٹھ رہی تھیں۔ استقبال کا تقریباً تمام انتظام کور ہی کر رہی تھی اور کوئی آرگنائزیشن اس موقع پر نہ تھی، سوائے کانگریس کے ڈیڑھ دو درجن والنٹیروں کے۔ سٹیشن سے لے کر جلسہ گاہ تک اور پلیٹ فارم پر انتظام کے لیے ہمارے والنٹیرز موجود رہے۔ پلیٹ فارم پر جناب چودھری اسد اللہ خان صاحب (قادیانی) بیرسٹر ایم ایل سی قائد اعظم آل انڈیا نیشنل لیگ کورز بہ نفس نفیس موجود تھے اور باہر جہاں آکر پنڈت جی نے کھڑا ہونا تھا، شیخ صاحب

موجود تھے۔ ہجوم میں بے حد اضافہ ہو گیا اور لوگوں نے صفوں کو توڑنے کی کوشش کی۔ مگر ہمارے والنٹیروں نے قابلِ تعریف ضبط و نظم سے کام لیا اور حلقہ کو قائم رکھا۔ پنڈت جی کے سٹیشن سے باہر آنے پر جناب شیخ بشیر احمد صاحب (قادیانی) ایڈووکیٹ صدر آل انڈیا نیشنل لیگ نے لیگ کی طرف سے آپ کے گلے میں ہار ڈالا۔ کور کی طرف سے حسب ذیل موٹو جھنڈیوں پر خوبصورتی سے آویزاں تھے۔

Beloved of the nation, Welcome you.

محبوبِ قوم خوش آمدید

We join in Civil Liberties Union.

ہم شہری آزادیوں کی انجمن میں شامل ہوتے ہیں۔

Long Live Jawaher Lal.

جواہر لال نہرو زندہ باد

کور کا مظاہرہ ایسا شاندار تھا کہ ہر شخص اس کی تعریف میں رطب اللسان تھا اور لوگ کہہ رہے تھے کہ ایسا شاندار نظارہ لاہور میں کم دیکھنے میں آیا ہے۔ کانگریسی لیڈر، کور کے ضبط و ڈسپلن سے حد درجہ متاثر تھے اور بار بار اس کا اظہار کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ ایک لیڈر نے جناب شیخ صاحب سے کہا کہ اگر آپ لوگ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں تو یقیناً ہماری فتح ہوگی۔ پنڈت جی کے قیام گاہ کی طرف تشریف لے جانے پر کورز باقاعدہ مارچ کرتے ہوئے احمدیہ ہوسٹل میں آئیں اور وہاں جناب شیخ صاحب نے پھر ایک تقریر کی، جس میں کور والوں کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کیا اور بتایا کہ آپ لوگ ہمیشہ اس بات کو پیش نظر رکھیں کہ دنیا میں انصاف قائم کرنے اور ظلم و ناانصافی کو مٹانے کے لیے ہر قربانی کرنا آپ کا فرض ہے۔

احمدیہ ہوسٹل میں کھانے کا بہت اچھا انتظام تھا، جس کے مہتمم بابو غلام محمد صاحب تھے۔ ماسٹر نذیر احمد صاحب سپرنٹنڈنٹ احمدیہ ہوسٹل نے بھی مہمانوں کی آسائش کے لیے بہت کوشش کی۔ قادیان کی کورز 29 کو 9 بجے کی گاڑی سے واپس پہنچ گئیں۔ (اخبار الفضل قادیان جلد نمبر 23 شمارہ نمبر 278۔ مورخہ 31 مئی 1936ء)

استقبال کی وجہ

اگر پنڈت جواہر لال صاحب نہرو اعلان کر دیتے کہ احمدیت کو مٹانے کے لیے وہ اپنی تمام طاقت خرچ کر دیں گے، جیسا کہ احرار نے کیا ہوا ہے تو اس قسم کا استقبال بے غیرتی ہوتا لیکن اگر اس کے برخلاف یہ مثال موجود ہو کہ قریب کے زمانہ میں ہی پنڈت صاحب نے ڈاکٹر اقبال صاحب کے ان

مضامین کا رد لکھا ہے جو انھوں نے احمدیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ قرار دیے جانے کے لیے لکھے تھے اور نہایت عمدگی سے ثابت کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے احمدیت پر اعتراض اور احمدیوں کو علیحدہ کرنے کا سوال بالکل نامعقول اور خود ان کے گذشتہ رویہ کے خلاف ہے۔ تو ایسے شخص کا جب کہ وہ صوبے میں مہمان کی حیثیت سے آ رہا ہو ایک سیاسی انجمن کی طرف سے استقبال بہت اچھی بات ہے۔ (میاں محمود احمد صاحب خلیفہ قادیان کا خطبہ مندرجہ اخبار الفضل قادیان جلد نمبر 24 شمارہ 287 مورخہ 11 جون 1936ء) (ہفت روزہ چٹان۔ 26 جون 1967ء)

سلطان القلم کے جانشین

پچھلے پانچ چھ ہفتوں میں قادیانی دانشوروں کے بحث ونظر کا انداز و معیار معلوم ہوا ہے۔ سنا کرتے تھے بلکہ تجربہ بھی ہو چکا تھا کہ اس جماعت کے مبلغ و مدیر ڈھٹائی میں لاجواب ہیں۔ لیکن چنیوٹ میں مدیر چٹان کی تقریر کے بعد............ یا پھر چٹان نے جو سوالات اٹھائے ہیں ان کی گرفت سے عاجز آ کر قادیانی امت کے اہل قلم نے جو استدلال اختیار کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ''سوال گندم جواب ریسماں'' کی بدترین خصوصیتیں ان کے دماغ میں جمع ہو گئی ہیں۔ قادیانی اہل قلم کا طرز استدلال ہی انھیں جھٹلانے کے لیے کافی ہے۔

ہم پوچھتے ہیں فرمایئے علامہ اقبال نے جو کچھ آپ کے بارے میں تسلسل وتواتر سے کہا وہ درست ہے کہ غلط؟ غلط ہے تو آپ کے پاس اس کا جواب کیا ہے؟ الفضل ربوہ لکھتا ہے کہ شورش صاحب کو خدا جانے کس نے علامہ اقبال کا نمائندہ بنا دیا ہے۔

''ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو''

یہ جواب ہے علامہ اقبال کے ان مقالات وخیالات کا جو قادیانی تابوت میں میخ کا کام دے گئے ہیں۔ کیا علامہ اقبال نے اپنے ان خیالات پر خط تنسیخ کھینچ دیا تھا؟ کیا ان کی موت کے بعد یہ حصہ منسوخ ہو گیا؟ منسوخ ہوا تو کس نے کیا؟ اور اس کا مجاز کون ہے؟ پھر یہ ممکن ہے کہ صاحب تصنیف کی رحلت کے بعد ورثاء اس کی تصنیف کو منسوخ یا متروک کریں اور ان کا یہ فعل صاحب تصنیف کا فعل سمجھا جائے۔ یہ تو صحیح ہے کہ جائداد کی وارث اولاد ہوتی ہے۔ لیکن اس کا جواز آج تک قائم نہیں ہوا کہ اولاد میں سے کوئی فرد، والد کے ان فرمودات پر قلم کھینچ دے جو علم کی میراث ہو کر قرطاس وقلم کو منتقل ہو چکے ہیں۔ صرف دو تحریفیں ساری تاریخ تحریر میں پائی جاتی ہیں۔

ایک عیسائی علماء کی تحریف، جس سے بائبل مجروح ہوئی ہے۔

دوسری مرزا بشیر الدین محمود کی تحریف، کہ اپنے والد کی تحریروں کے عیب چھپانے کے لیے انھوں نے عجیب وغریب جسارتیں کی ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے قادیانی نبوت اور قادیانی امت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کے اسلامی فکر اور دینی شغف کی معراج ہے اور اس سے انکار کیسے ہوسکتا ہے کہ یہ ان کی زندگی کے آخری چند برسوں کا حاصل تھا۔

علامہ اقبال نے عمر بھر کے غور وفکر اور مطالعہ ومشاہدہ کے بعد قادیانی نبوت کا جس کمال علم سے محاسبہ کیا، اسی کا نتیجہ ہے کہ اس امت کو انھوں نے نہ صرف ہندوستان کا غدار کہا بلکہ اسلام کا غدار بھی لکھا اور اس کو اپنی بصیرت کا حاصل قرار دیا (ملاحظہ ہو پنڈت جواہر لال نہرو کے نام علامہ اقبال کا خط) جواب علامہ اقبال کے ارشاد کا مرحمت فرمائیے۔کوس آپ ایڈیٹر چٹان کو رہے ہیں......... کیا موت کے بعد کسی شخص کی تحریریں ساقط ہو جاتی ہیں۔ان کا حوالہ دینا اور اس پر بحث ونظر کی عمارت قائم کرنا غلط ہے؟ اگر یہ معیار ہے تو پھر آپ نے مرزا غلام احمد قادیانی کی تحریریں کیوں منسوخ نہیں کی ہیں، آج تک کیوں نقل ہو رہی یا چھاپی جارہی ہیں۔سیدھا سادا سوال ہے کہ علامہ اقبال نے جو کچھ فرمایا اس کا جواب کیا ہے؟ آپ چونکہ مسلمانوں سے ڈرتے ہیں اس لیے اقبال کا جواب نہیں دیتے لیکن ایڈیٹر چٹان کے خلاف غرار ہے ہیں۔اصل سوال یہ ہے۔

1- علامہ اقبال نے آپ کو مسلمانوں میں سے خارج کردینے کا مطالبہ کیا یا نہیں؟
2- انھوں نے آپ کو یہودیت کا مثنیٰ قرار دیا۔
3- انھوں نے آپ کو اسلام اور ہندوستان کا غدار لکھا اور اس کی صحت پر اصرار کیا۔
4- انھوں نے آپ کو ایک سیاسی جماعت قرار دے کر مسلمانوں کی دینی وحدت میں نقب لگانے کا مجرم گردانا۔
5- انھوں نے آپ کو شاتم رسول قرار دیا۔

ان کا جواب دیجئے یا فرمائیے کہ علامہ اقبال نے ان مطالبات کو واپس لے لیا تھا، اس سے مراجعت کرلی تھی۔کسی خط، کسی تحریر، کسی بیان میں اپنے ان خیالات پر نظر ثانی فرمائی تھی۔اگر یہ نہیں ہے اور بلاشبہ نہیں ہے تو پھر ان کے خیالات پر ایڈیٹر چٹان کے خلاف سب وشتم کے معنی کیا ہیں؟

حد ہوگئی کہ ان سوالات کے جواب میں علامہ اقبال کی 1910ء کی ایک تقریر کا حوالہ دیا جارہا ہے۔جب بھی مرزائی علامہ اقبال کے ارشادات سے عاجز اور محصور ہوتے ہیں، اسی تقریر کو پیش کرتے ہیں۔ہم تسلیم کرتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اسٹریچی ہال علی گڑھ میں جو خطبہ دیا تھا، اس میں یہ الفاظ

موجود تھے کہ

''پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں۔''

اوّل تو اس میں مرزا صاحب کی نبوت اور ان کے جانشینوں کی خلافت کا جواز نہیں۔

دوم یہ اس زمانے کی بات ہے جب مرزا غلام احمد نے مناظرِ اسلام کی حیثیت سے جماعت سازی کی تھی اور ان کے باطنی دعاوی سامنے نہیں آئے تھے۔

اس زمانہ میں بہت سے لوگ ظاہری وجوہ سے ان کے معترف تھے۔ جب ان کی حقیقت کھلی اور مرزا بشیر الدین محمود نے خلافت کو ایک سیاسی کاروبار کی شکل دی تو ایک ایک ورق کھل گیا۔ نتیجتاً جو لوگ ایک عام شہرت کے باعث مرزا کو مناظر و مبلغ خیال کرتے تھے، ظلی اور بروزی نبی کی اصطلاحوں سے چوکنا ہو گئے اور ان پر وقت کے ساتھ تمام حقیقتیں منکشف ہو گئیں کہ مرزا غلام احمد اور اس کے خلافتی جانشینوں کا مقام ومنشا کیا ہے اور وہ مسلمانوں میں دینی ارتداد کی ایک سیاسی تحریک ہیں۔

یہ ایک شوخ چشمانہ استدلال ہے کہ 1910ء کی تحریر کو جواز بنالیا جائے اور 1933ء سے 1937ء تک کی تحریریں منسوخ قرار دی جائیں۔ آخری بات پہلی ہوئی ہے یا آخری؟

قرآن مجید میں کئی آیتیں ہیں جنھیں بعد کی آیتوں نے منسوخ کیا مثلاً حرمت شراب، حکم ہوا کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔ پھر شراب حرام ہو گئی اور ہر حالت میں حرام ہو گئی۔ اب اگر یہ اصرار کیا جائے کہ شراب صرف نماز میں حرام ہے اور قرآن پاک میں لکھا ہے تو اس کو صرف قادیانی منطق ہی کہا جا سکتا ہے۔ ایک ہی چیز کے بارے میں کسی شخص کی آخری رائے ہی قطعی رائے ہوتی ہے۔

اسی طرح کا ایک اور اقتباس 29 ستمبر 1900ء کی تحریر سے کیا گیا ہے۔ یہ علامہ اقبال کے ایک مضمون صوفی حضرت عبدالکریم جیلانی سے ماخوذ ہے۔ ہمارے سامنے وہ مضمون نہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ قادیانی حوالوں میں تلبیس کر جاتے ہیں تاہم ایک لحظہ کے لیے ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ علامہ اقبال ہی کے الفاظ ہیں یعنی انھوں نے اس بحث میں ''مرزا غلام احمد قادیانی کو جدید ہندی مسلمانوں کا اغلباً سب سے بڑا دینی مفکر لکھا ہے۔''

تو اس سے بھی یہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا کہ وہ مرزا غلام احمد کو مسیح موعود یا ظلی و بروزی نبی مانتے تھے۔ یہ تو ایک عمومی تاثر تھا جو اس وقت کے مباحث سے پیدا ہو گیا تھا۔ جب مرزا صاحب مارِ آستین نکلے یا اس وقت کی صورتحال سے ان کا دماغ خراب ہو گیا تو معترفین نے اپنی رائیں تبدیل کر لیں.........

لطف کی بات یہ ہے کہ جس زمانہ کی یہ تحریریں پیش کی جارہی ہیں، اولاً تو ان تحریروں کو علامہ اقبال نے اپنے فکری ونظری ارتقاء کے بعد لائقِ اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ یہ ان کی ابتدائی تحریری مشقیں تھیں۔ جب ان کا اسلامی شعور اور دینی تبحر پختہ ہوگیا تو ان کے خیالات روشن ہوکر قوم کے لیے سنگ میل ہوگئے اور یہی افکار ونظریات ہیں جن کی صداقت پر انھیں حکیم الامت، شاعر مشرق اور ترجمان اسلام کہا جاتا ہے اور جس کی اساس پر ان کے حکیمانہ وجود کا شہرہ ہے۔

1899ء میں حضرت علامہ نے ایم اے کیا۔ 1900ء میں ان کی عمر صرف 23 برس کی تھی۔ 1900ء تک وہ ایک شاعر تھے اور ان کی فکر کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ اس عہد کی تحریروں کے اقتباس تو قادیانی امت اپنی ''روائتی سچائی'' کے لیے بطور سند استعمال کرتی ہے، لیکن جس عمر میں وہ پختہ ہوکر مسلمانوں کی محبوب فکری متاع بن چکے، اس عمر کی متاعِ فکر سے فرار غایت درجہ کی بوالعجبی ہے۔ کوئی ساطر زِ استدلال بھی اس کی تصدیق نہیں کرسکتا ہے!

اقبال کبھی طالب علم بھی تھے تو کیا اس عمر کے اقوال کو حجت قرار دیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے مشقِ سخن کے ابتدائی دور میں بہت سے اشعار لکھے جنھیں خیالات کی تبدیلی اور نظریات کی صحت کے بعد حذف کردیا تو کیا ہم اس کلام کو بھی ان کے مستند کلام پر فوقیت دے سکتے ہیں۔

مرزائیوں کی منطق عجیب وغریب ہے کہ ایک طرف تو انھیں اپنے ''ربانی مشن'' ہونے پر اصرار ہے، دوسری طرف وہ اپنی...... نبوت وخلافت کے جواز میں انہی لوگوں کی ابتدائی تحریریں لاتے ہیں جو ان کے سب سے بڑے محاسب ہیں اور جن کے سن شعور کی تحریروں نے ان کی عمارت کو بیخ وبن سے ہلا دیا ہے...... اگر قادیانی نبوت اور اس کی خلافت کے سچا ہونے پر اصرار ہے تو اقبال کی انگلی تھام کر کھڑا ہونے کی کوشش بے معنی ہے۔ اس انگوٹھے کے متعلق فرمایئے جو اقبال نے آپ کی شہ رگ پر رکھا ہے۔

الفضل نے مولانا عبدالمجید سالک کے حوالے سے علامہ اقبال کی مرزا غلام احمد اور حکیم نور الدین سے ''والہانہ محبت'' کا ذکر کیا اور لکھا ہے کہ حضرت علامہ نے طلاق کی شرعی حیثیت دریافت کرنے کے لیے مرزا جلال الدین (بارایٹ لاء) کو مولوی حکیم نورالدین کے پاس قادیان بھیجا تھا۔

سالک صاحب نے یارانِ کہن میں ایک شوشہ مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق بھی چھوڑا تھا۔ مولانا نے سختی سے ڈانٹا تو سالک صاحب کو تردید وتصحیح کرنی پڑی۔ علامہ اقبال زندہ ہوتے تو سالک صاحب علامہ اقبال کے واضح خیالات جانتے ہوئے اولاً کبھی یہ حوصلہ نہ کرتے، ثانیاً حوصلہ کرتے تو تردید کرنی پڑتی، ثالثاً حضرت علامہ کی زندگی میں انھوں نے کبھی یہ نہیں لکھا اور نہ کسی سے ذکر کیا۔

سالک صاحب کا یہ رویہ اکثر معمہ رہا کہ مختلف اکابر کے تذکرے میں وہ مرزا صاحب کو ضرور

لاتے رہے جس سے مرزا صاحب کی صفائی یا بڑائی مقصود ہو، حالانکہ سوانح وافکار میں مرزا صاحب کا ذکر اَنمل بے جوڑ ہے۔ ایک وجہ تو اس کی یہ ہے کہ مولانا سالک کے والد قادیانی تھے اور مسلمانوں نے انھیں اپنے قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سالک صاحب کے چھوٹے بھائی آج تک قادیانی ہیں۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ مرزا البشیر الدین محمود کے ساتھ مولانا عبدالمجید سالک کے تعلقات کا ایک خاص سانچہ تھا۔ خلیفہ صاحب اپنی تاریخ کا سروسامان بنانے کے لیے قلمِ سالک سے اس قسم کی روایتیں وضع کروالیتے تھے۔ اس کے باوجود قادیانی امت کی سنگدلی ملاحظہ ہو کہ مولانا سالک کے انتقال پر ان کے سگے چھوٹے بھائی نے ان کا جنازہ نہیں پڑھا تھا اور یہ تماشہ مسلم ٹاؤن کے قبرستان میں راقم الحروف نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ نبوت کی روایتیں ہمیشہ ثقہ راویوں سے چلتی ہیں۔ کیا مرزا غلام احمد کے پیرو سالک صاحب کو ثقہ راوی سمجھتے ہیں؟ اس حد تک جس حد تک کہ ان کے متعلق تصدیقی پہلو نکلتا ہو، یا اس کے علاوہ دوسرے افکار و عقائد میں بھی۔ آدمی کے ثقہ ہونے کا معیار ہمیشہ اس کی ساری زندگی کے اعمال واقوال ہوتے ہیں نہ کہ ان اعمال واقوال کا کوئی ایسا جزو جو حسب حال ہو۔

الفضل نے 24 جون کے زیر بحث اداریہ میں علامہ اقبال کے متذکرہ حوالوں سے اپنی نبوت کا جواز پیدا کرنے کی احمقانہ جسارت کے بعد لکھا ہے کہ.........

ہم علامہ مرحوم کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ اس لیے صرف اشارہ پر اکتفا کیا جاتا ہے ورنہ.........

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

اور وہ اشارہ کیا ہے؟

چوہدری ظفر اللہ خان ایک خاص عہدہ پر نہ لیے جاتے تو یہ تحریریں بھی ہرگز وجود میں نہ آتیں۔

(الفضل صفحہ 2 مورخہ 24 جون 1967ء)

انا للہ و انا الیہ راجعون. بغض سامنے آ گیا۔ اس سے بڑھ کر خود ساختہ نبوت کی مداہنت اور خود کاشتہ خلافت کی خیانت اور کیا ہو سکتی ہے؟ بہر حال الفضل نے اعتراف کر لیا کہ اس کے دل میں کھوٹ ہے اور اس کا نام اس نے احترام رکھا ہے۔

ہم بھی جانتے ہیں کہ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں، ذرا کھل کر بولیے۔

ربانی مشن ہونے کا دعویٰ اور مصلحتوں کی مینا کاری؟ اعتراف کیجیے کہ آپ کی جماعت

اسرائیل کا عجمی پودا ہے اور آپ ربوہ کے تل ابیب میں بیٹھ کر مسلمانوں کی معنوی قوت پر اپنی حکومت قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ علامہ اقبال کے فرمودات کو آپ ذاتیات میں نہیں لا سکتے کہ انھیں چوہدری ظفر اللہ خان کا عہدہ خاص ہونے کا صدمہ تھا۔ سوال تو وہ ہیں جو حضرت علامہ نے اپنے مقالات میں اٹھائے ہیں۔ جوابات یہ نہیں جو آپ کے نہاں خانہ دماغ سے نکلے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آپ کا مذہب برطانوی حکومت کے استعماری مقاصد کی پیداوار ہے یا نہیں؟

آپ فرماتے ہیں کہ علامہ اقبال کو چوہدری ظفر اللہ خان کے خاص عہدے پر مقرر ہونے کا صدمہ تھا؟ آخر فہم و فراست کی کونسی شکل ہے جو اس جواب کو صحیح قرار دے سکتی ہے؟

ٹامک ٹوئیاں مارنا چھوڑیئے اور اس کا جواب عنایت فرمایئے۔ (ہفت روزہ چٹان 3 جولائی 1967ء)

روحِ اقبال بنام ممتاز حسن

روز نامہ امروز لاہور کی اطلاع کے مطابق مرزائیوں نے ربوہ میں دو روزہ کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کانفرنس وسط اکتوبر میں منعقد ہوگی۔ خبر میں کہا گیا ہے کہ اس کانفرنس کا افتتاح نیشنل بنک کے مینجنگ ڈائریکٹر ممتاز حسن جو اقبال اکادمی کراچی کے چیئرمین بھی ہیں، فرمائیں گے۔ جو مقالات پڑھے جائیں گے ''ذکر اردو'' کے نام سے شائع ہوں گے۔ دو سو مندوبین کی شرکت کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ محکمہ ریلوے نے اس کانفرنس میں شرکت کرنے والوں کے لیے رعائتی ٹکٹ جاری کرنے کا اعلان کیا ہے۔

اعلان کے مطابق زبان اور اس کے مسائل کے لیے دو اجلاس، ادب اور اس کے مسائل کے لیے تین اجلاس، اردو کے محسنین کے لیے دو اجلاس منعقد ہوں گے۔ اردو صحافت کی مشکلات پر ایک مجلس مذاکرہ ہوگی۔ آخر میں ایک مشاعرہ ہوگا وغیرہ۔ (امروز 18 جولائی صفحہ 6 کالم 4)

غور کیجئے.........

1- ہم نے کئی ماہ پہلے لکھا تھا کہ مرزائی اپنے مقاصد مشؤمہ کے لیے ادبی اور لسانی محاذ قائم کر رہے ہیں۔ یہ گویا ادیبوں، شاعروں کو کرپٹ (Corrupt) کرنے کی ایک حرکت ہے۔ ورنہ جس ربوہ میں کوئی غیر مرزائی آباد نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ وہاں کسی غیر مرزائی سب انسپکٹر اور سٹیشن ماسٹر کو بھی لگنے نہیں دیا جاتا، وہاں اردو کانفرنس کا انعقاد؟.........خوب می شناسم۔

2- اس کانفرنس میں نوٹ کر لیجئے کہ مرزا غلام احمد کو سلطان القلم اور مرزا بشیر الدین محمود کو محسنِ

اردو کے طور پر پیش کیا جائے گا کہ تاریخ اردو میں ان کا ذکر لا کر اس کے حوالوں کو اپنی نبوت کے جواز میں پیش کیا جائے گا۔

3- ہم اردو کے اہل قلم سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس فتنہ سے خبردار ہو جائیں۔

4- اسلام پسند مصنفین کو ابھی سے اس کا تدارک کرنا چاہیے۔

5- ریلوے نے کس مفروضہ پر رعایتی ٹکٹ جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے؟ اس کا یہ برتاؤ آج تک کسی ادبی اور لسانی کانفرنس کے ساتھ ہوا؟ آخر اس رعایت کی دلیل کیا ہے؟

6- مسٹر ممتاز حسن کو مفکر ادیب، نقاد بننے کا بیحد شوق سہی، سبکدوشی سے پہلے بعض افسروں کا یہ رجحان اب عام ہو چکا ہے۔

لیکن ممتاز حسن صاحب اس کانفرنس میں شریک ہونے سے پہلے علامہ اقبالؒ کی روح سے استخارہ کرلیں۔ مبادا انہیں اذیت ہو۔

انجمن حمایت اسلام کی کارروائی پڑھ لیجئے۔ علامہ اقبال نے مرزائی ارکان کو جب تک اجلاس سے نکلوا نہیں دیا تھا وہ خود صدارت کی کرسی پر تشریف فرما نہیں ہوئے تھے۔ (ہفت روزہ چٹان 24 جولائی 1967ء)

ظفر اللہ اور علامہ اقبال

مجلس انتظامیہ یوم اقبال کراچی نے یوم اقبال 1967ء کے مقالات اور تصویریں بڑے تزک و احتشام سے شائع کی ہیں۔ آدھی تصویریں، آدھے مقالات، نصف انگریزی، نصف اردو، صدر ایوب کا پیغام سب سے زیادہ فکر انگیز ہے۔ ناقص مقالہ پاکستان کے معمر دانشور جناب ممتاز حسن کا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ممتاز صاحب اقبال کی روح ہی سے آشنا نہیں۔ وہ چھلکے سے زیادہ اور مغز سے کم محبت کرتے ہیں۔

اصل اعتراض ہمیں اس پیغام پر ہے جو چودھری سر ظفر اللہ خان سے حاصل کیا گیا ہے، چند سطری پیغام ہے ان کا آخری نکتہ یہ ہے کہ "اقبال کی یاد ان لوگوں سے زیادہ عمر پائے گی جو سیاست اور قانون میں ان کے معاصر تھے۔"

اوّل: تو کراچی کے ان بزرگوں کو معلوم نہیں اور اگر معلوم ہے تو تجاہلِ عارفانہ اختیار کیے ہوئے ہیں کہ علامہ اس جماعت کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے تھے، جس جماعت کے چودھری ظفر اللہ خان روح القدس ہیں۔

دوم: ان بزرگوں کو احساس ہونا چاہیے تھا کہ پاکستان کے مسلمانوں نے ظفر اللہ خان کے وجود کی

ماضی مرحوم میں کیا قیمت ادا کی ہے۔

انجمن حمایت اسلام لاہور کے ریکارڈ میں یہ بات موجود ہے اور موجودہ صدر میاں امیر الدین اس کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ حضرت علامہ نے اپنے زمانہ صدارت میں اپنے پرانے دوست ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ کو اس بنا پر انجمن کے اجلاس سے نکلوا دیا تھا کہ وہ مرزا غلام احمد کے متبع ہیں حالانکہ وہ لاہوری جماعت کے رکن تھے۔

ان واضح شواہد کے ہوتے ہوئے یوم اقبال پر سر ظفر اللہ خان سے پیغام لینا حضرت علامہ کی روح کو دکھی کرنا ہے...... ان لوگوں کو حضرت علامہ کی لحد پر حاضر ہو کر معافی مانگنی چاہیے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان کی نیت میں کھوٹ نہیں تھا۔ یہ لغزش ان کے ادھورے علم کی وجہ سے ہوئی ہے۔ چودھری ظفر اللہ خان کا یہ ارشاد کہ اقبال کا نام سیاست اور قانون میں ان لوگوں کی بہ نسبت زیادہ عرصہ رہے گا، جو ان کے معاصر تھے۔ تو ان کی خدمت میں عرض ہے اقبال کا نام مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے اس دور میں سب پر فائق رہے گا اور یہ سہرا بھی اقبال کے سر بندھے گا کہ انھوں نے وقت کے ایک سب سے بڑے فتنہ کا محاسبہ کیا تھا۔ (ہفت روزہ چٹان 15 اپریل 1968ء)

اقبال کے پیرو جواب دیں

ہم اقبالؒ کے عقیدت مندوں، مفسروں اور پیروؤں کی اس روش کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ اقبالؒ کی اجارہ داری تو اپنی غیر منقولہ جائداد سمجھتے ہیں، لیکن اقبالؒ کے حقیقی ارشادات سے انھیں اتنا تعلق بھی نہیں جتنی ماش کے دانے پر سفیدی ہوتی ہے۔ ہم مسئلہ کو طول نہ دیتے ہوئے یہ پوچھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ مرزائیوں سے متعلق جو کچھ اقبالؒ نے کہا، وہ غلط ہے یا صحیح؟ اگر غلط ہے تو پھر انھیں اقبالؒ کی وراثت سے دستبردار ہو جانا چاہیے۔ اقبال سے بڑھ کر نہ ان کی فراست ہے، نہ ان کی عقل اور نہ تدبر۔ اقبالؒ نے مرزائیوں کو ملک و قوم اور دین و مذہب کا غدار لکھا ہے۔ وہ حکومت سے مطالبہ کرتے رہے کہ انھیں مسلمانوں سے الگ اقلیت قرار دیا جائے۔ ہم بھی یہی مطالبہ کرتے ہیں۔ ہمیں مرزائیوں کے دین سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ دین ہی نہیں، صرف مسخرہ پن ہے۔ جو لوگ اس مسخرے پن پر قائم رہنا چاہتے ہیں، شوق سے رہیں۔ علماء کا فرض ہے کہ وہ دینی طور پر ان کا تعاقب کریں۔ ہمارا سوال اقبال کے مدرسہ فکر سے ہے کہ وہ قادیانی امت کے متعلق مداہنت یا مصلحت اختیار کر کے نہ صرف اسلام کو ضعف پہنچا رہا ہے بلکہ خود اسلام سے غافل ہے۔ اس قسم کے عناصر ہمارے نزدیک قلم کے میدان میں اس آوارہ عصمت کی طرح ہیں جو آبرو کے سودے پر روپیہ کماتی ہے۔

❁.....❁.....❁

خواجہ عبدالحمید آف قادیان

مرزائیت اور علامہ اقبالؒ

برطانوی دورِ حکومت میں مرزائی یا احمدی جماعت کے بانی نے اسلام اور مسلمانانِ عالم کے خلاف جس طرح اور جس طریق سے نمک پاشی کی' اور انگریزی حکومت سے ذاتی مفاد حاصل کرنے کے لیے اغیار کی دولت کو رحمت شمار کیا' قرآنِ کریم کے حکمِ جہاد کو حرام قرار دینا' مہدی علیہ السلام کو خونی مہدی کہہ کر پچاس ہزار الماریوں کا بھر دینا اور برطانوی حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جماعت احمدیہ کو جاسوسی کے لیے مخصوص ٹریننگ دینا اور برطانوی فن پروپیگنڈہ کے فن میں تعلیم حاصل کر کے اسلامی عقائد کی من گھڑت تاویلات کرنا' بزرگانِ اسلام کے قول وفعل پر حملے کرنا' مسلمانانِ عالم کی مرکزیت کو فنا کرنے اور ان کے باہمی اختلافات کو ہوا دے کر اس کی آڑ میں خود کو نمایاں کرنا' الزام تراشیاں اور جھوٹے بہتانات عائد کرنا' منشی غلام احمد منکیِ قادیان کا بائیں ہاتھ کا کرتب ہے اور اس جماعت کا یہ طریق ان کا طرۂ امتیاز ہے۔

کچھ عرصہ سے مرزائی جماعت کے مبلغوں کی طرف سے اپنے گرو کی سنت پر عمل کرتے ہوئے' مختلف پمفلٹوں کے ذریعہ حقائق کو توڑ مروڑ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ علامہ اقبال مرزائیت کے حامی اور مداح تھے اور صرف احرار کے ورغلانے پر مرزائیت کے خلاف ہوئے اور اس مخالفت کی وجوہات اصولی اور مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تھیں۔ ملاحظہ ہو:

> ''علامہ اقبال نے 1931ء میں جب کشمیر کمیٹی کا آغاز ہوا' شملہ میں زور دے کر حضرت امام جماعتِ احمدیہ خلیفۃ المسیح الثانی میرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب کو اس کمیٹی کا صدر مقرر کیا اور اس پر پوراز ور دیا اور عرصہ تک آپ کی صدارت میں کام کرتے رہے۔ مذکورہ حوالہ جات ان کے گہرے روابط اور موانست کو ظاہر کرتے ہیں جو وہ جماعتِ احمدیہ سے رکھتے تھے۔ البتہ اپنی عمر کے آخری حصہ میں انھوں نے جماعتِ احمدیہ سے اختلاف کیا۔ لیکن اہلِ بصیرت جانتے ہیں

کہ ان کے وجوہ سیاسی تھے؟ (بیان عبدالمالک خان' ناظر اصلاح وارشاد' صدر انجمن احمدیہ پاکستان' ربوہ' شائع شدہ 1974ء' ص 14)

اسی ٹریکٹ کے ابتدائی حصہ میں عبدالمالک خاں نے دیدہ دانستہ غلط بیانیوں کا انبار لگا دیا ہے' ملاحظہ ہو:

''چنانچہ ان کے کئی افراد نے احمدیت کو قبول کیا۔ ان کے والد مرحوم احمدی تھے' ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد احمدی تھے اور ان کے اکلوتے بھتیجے احمدی ہیں۔''
(ٹریکٹ احمدیت' علامہ اقبال کی نظر میں ص 1)

الجواب:

ابتدائی دور میں جب کہ مرزا نے ابھی دعوائے نبوت نہیں کیا تھا' اگر کوئی شخص مرزا کی نسبت اچھے تعریفی کلمات کہہ دیتا تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ لیکن جب مرزا غلام احمد نے اسلام کے بنیادی عقائد سے ارتداد اختیار کیا تو بہت سے مرزائی تائب ہوئے جن میں سے میر غلام عباس لدھیانوی اور بہت سے دیگر حضرات تھے۔ علامہ اقبال کے والد بھی ابتدا میں غلام احمد قادیانی کے مرید ہو گئے اور جب بعد میں ان کو غلام احمد کے عقائد' اسلام کے خلاف معلوم ہوئے تو انھوں نے توبہ کر لی' تو اس میں علامہ اقبال تو کجا' ان کے والد پر بھی کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

مرزا غلام احمد کا ابتدائی عقیدہ

''میں ان تمام امور کا قائل ہوں جو اسلامی عقائد ہیں...... اور سیّدنا و مولانا محمد مصطفیٰؐ کے بعد کسی دوسرے مدعی نبوت و رسالت کو کاذب اور کافر جانتا ہوں۔ میرا الیقین ہے کہ وحی رسالت آدم صفی اللہ سے شروع ہوئی اور جناب رسول اللہؐ پر ختم ہو گئی...... اس میری تقریر پر ہر ایک شخص گواہ ہے۔'' (اعلان غلام احمد قادیانی' 2 اکتوبر 1891ء مندرجہ تبلیغِ رسالت جلد دوم' مجموعہ اشتہارات)

تبدیلی

1- یہ ثابت ہے کہ 1901ء سے پہلے وہ حوالے' جن میں آپ نے نبی ہونے سے انکار کیا ہے' اب منسوخ ہیں اور ان سے حجت پکڑنی غلط ہے۔'' (حقیقۃ النبوت ص 121 مصنفہ محمود احمد)

2- ''وحی الٰہی میں میرا نام محمد بھی ہے اور رسول بھی۔'' (براہین احمدیہ ص 498 مصنفہ مرزا غلام احمد)

3- ''مسیح موعود خود محمد رسول ہے جو اشاعتِ اسلام کے لیے دوبارہ دنیا میں تشریف لائے۔''
(مرزا بشیر احمد' ریویو آف ریلیجنز جلد 4' 16 اکتوبر 1932ء)

4- پہلی بعثت میں محمد ہے' تو اب احمد ہے
تجھ پہ اُترا ہے قرآن' رسولِ قدنی
سرمۂ چشم تیری خاکِ قدم ہوا نے
غوث اعظم' شاہِ جیلاں' رسولِ قدنی!
(اخبار ''الفضل قادیان'' 16 اکتوبر 1923ء)

5- ''ہم پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر نبی کے بعد مرزا صاحب ایسے نبی ہیں کہ ان کا ماننا ضروری ہے تو پھر حضرت مرزا صاحب کا کلمہ کیوں نہیں پڑھا جاتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا وعدہ کہ وہ ایک دفعہ اور خاتم النبیین کو دنیا میں مبعوث کرے گا (یہ تناسخ کا عقیدہ نہیں تو اور کیا ہے؟ ناقل) پس جب بروزی رنگ میں مسیح موعود خود محمد رسول اللہؐ ہی ہیں جو دوبارہ دنیا میں تشریف لائے تو ہم کو نئے کلمہ کی ضرورت نہیں' ہاں' اگر محمد رسول اللہ کی جگہ کوئی اور آتا تو پھر سوال اٹھ سکتا تھا۔'' (کلمۃ الفضل ص 101 'مصنفہ بشیر احمد' پسر متنبی غلام احمد متنبی قادیان)

6- ''حضرت مسیح موعود (غلام احمد) کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے ہیں' آپ نے فرمایا:
(1) اللہ تعالیٰ کی ذات۔ (2) رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (3) نماز (4) روزہ (5) حج (6) زکوٰۃ غرضیکہ آپ نے تفصیل سے بتایا' ایک ایک چیز میں ان مسلمانوں سے اختلاف ہے۔''
(اخبار ''الفضل'' قادیان جلد 19 'نمبر 14 '30 جولائی 1931ء)

7- ''آپ حسب حکم الٰہی اپنے منکروں کو مسلمان نہ سمجھتے تھے' یہ کہ مسیح موعود کے منکروں کو مسلمان کہنے کا عقیدہ ایک خبیث عقیدہ ہے' مسیح موعود کے منکروں کو خدا مسلمان نہیں مانتا تو ہم کون ہیں کہ اس کا انکار کریں؟'' (رسالہ ریویو آف ریلیجنز قادیان ص 126 'ج 14 'نمبر 3)

مریدوں کے ایمان کا نمونہ

مرزا غلام احمد کے مرید جن کو عرفِ عام میں احمدی یا مرزائی کہتے ہیں' ان کا مرزا پر جو ایمان و اعتقاد ہے' وہ بھی ملاحظہ ہو:

مرزا غلام احمد کے ایک مرید نے ان کے بیٹے محمود احمد خلیفہ المسیح الثانی کو خط لکھا جو خلیفۃ المسیح

نے خطبہ جمعہ میں بیان کیا:

''اس قدر اعتراضات کرنے کے باوجود ہر خط میں بڑا اخلاص بھی ظاہر کیا ہوا ہوتا ہے اور لکھا ہوتا ہے کہ ہم سلسلہ کے خادم ہیں مگر اس سلسلہ سے محبت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک خط میں جس کے متعلق اس نے تسلیم کیا ہے کہ وہ اسی کا لکھا ہوا ہے' اس پر یہ تحریر کیا ہے کہ حضرت مسیح موعود ولی اللہ تھے اور ولی اللہ بھی کبھی کبھی زنا کرلیا کرتے ہیں' اگر انھوں نے کبھی کبھار زنا کرلیا تو اس میں ہرج کیا ہوا' ہمیں حضرت مسیح موعود پر اعتراض نہیں کیونکہ وہ کبھی کبھی زنا کیا کرتے تھے' ہمیں اعتراض موجودہ خلیفہ پر ہے کیونکہ وہ ہر وقت زنا کرتا رہتا ہے۔''

(خطبہ جمعہ میاں محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانی' مندرجہ اخبار الفضل قادیان' جلد 26' نمبر 20' 21 اگست 1938ء)

ناظرین' آپ نے مرزا غلام احمد کی زندگی کے دونوں رخ دیکھ لیے۔ پہلی حالت میں جب کہ اس نے دعویٰ نبوت نہیں کیا تھا' کسی شخص کا اس سے متاثر ہوکر اس کی مریدی اختیار کرنا کوئی بڑی بات نہیں اور دوسری حالت میں جبکہ انھوں نے دعویٰ نبوت کیا اور کبھی کبھار زنا بھی فرمالیا کرتے تھے' کسی کا ان سے متنفر ہوکر ان پر اور ان کی نبوت پر تین حرف بھیج دینا عین خوش نصیبی ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال کے والد انہی خوش نصیبوں میں تھے جو آپ کی مریدی سے کنارہ کش ہوکر اسلام میں داخل ہوگئے جس کا ذکر مرزا بشیر احمد پسر مرزا غلام احمد نے اپنی کتاب سیرت المہدی میں بھی کیا ہے' اب اگر عبدالمالک نے یا تو یہ کتاب نہیں پڑھی اور وہ جاہل مطلق ہے' یا دیدہ ودانستہ جھوٹ بول کر احمدیت کی خدمت کررہا ہے۔

رہی یہ بات کہ علامہ اقبال کا بھتیجا مرزائی ہے تو اس کا اعتراض علامہ پر کیوں؟ گویا بھتیجا جس مذہب پر ہوجاوے اور چچا وہ مذہب اختیار نہ کرے تو چچا کا مذہب غلط! بیٹا گمراہ ہوجاوے تو باپ کا مذہب غلط! اچھی دلیل ہے' قاعدہ کلیہ بنالیجئے تاکہ بعد میں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ منشی غلام احمد متقی قادیان کا بیٹا فضل احمد خدا کے فضل سے مسلمان تھا اور مرزا کی جھوٹی نبوت کو اس نے ماننے سے انکار کردیا تھا' تو اسی قاعدہ کلیہ کی رو سے بیٹا سچا ہوا اور منشی غلام احمد غلط! کہیے آپ کو اس پر کوئی اعتراض تو نہیں؟

اگر مرزا امام الدین اور مرزا نظام الدین کا بھتیجا منشی غلام احمد گمراہ ہوجائے تو مرزا نظام الدین اور امام الدین پر اعتراض آسکتا ہے؟

اگر مولانا محمد علی' شوکت علی کے بھائی کا لڑکا عبدالمالک عرف تفی گمراہ ہوجاوے اور اسلام قبول نہ کرے تو علی برادران پر اعتراض آسکتا ہے؟

باقی رہا علامہ کا زور دے کر خلیفہ مسیح الثانی کو کشمیر کمیٹی کا صدر بنانا تو یہ بھی ان دنوں کی بات ہے جب مرزا صاحب کو نبوت کا دورہ نہیں پڑا تھا اور نہ ہی میاں محمود احمد صاحب خلیفہ مسیح الثانی بنے تھے...... اور ابھی ان کا مندرجہ ذیل کردار بھی منظرِ عام پر نہیں آیا تھا:

''موجودہ خلیفہ (میاں محمود احمد۔ناقل) سخت بدچلن ہے۔ یہ تقدس کے پردے میں عورتوں کا شکار کھیلتا ہے۔ اس کام کے لیے اس نے بعض مردوں اور عورتوں کو ایجنٹ رکھا ہوا ہے۔ ان کے ذریعہ یہ معصوم لڑکیوں اور لڑکوں کو قابو میں رکھتا ہے۔ اس نے ایک سوسائٹی بنائی ہوئی ہے جس میں مرد اور عورتیں شامل ہیں اور اس سوسائٹی میں زنا ہوتا ہے۔'' (بحوالہ شیخ عبدالرحمٰن مصری بی۔اے سابق ہیڈ ماسٹر احمدیہ سکول قادیان' فیصلہ عدالت العالیہ ہائی کورٹ' لاہور' شائع کردہ مولوی محمد علی ایم۔اے امیر جماعت احمدیہ لاہور 9 دسمبر 1938ء)

علامہ اقبال کے تاثرات

''ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا جب ایک نئی نبوت بانی اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی جب میں نے تحریک (قادیانیت) کے ایک رکن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔'' (حرفِ اقبال ص 132)

ڈاکٹر اقبال کا عقیدہ

''لمعات'' (رسالہ کا نام۔ناقل) میں ڈاکٹر محمد اقبال پی۔ایچ۔ڈی بیرسٹر ایٹ لاء کا ایک مضمون چھپا ہے' جس میں وہ لکھتے ہیں کہ جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی ایسے نبی کے آنے کا قائل ہے جس کا انکار مستلزم کفر ہو وہ خارج از دائرہ اسلام ہے۔ اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔'' (اخبار ''الفضل'' قادیان' جلد 3' نمبر 105' مورخہ 11 اپریل 1916ء)

علامہ اقبال پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ انھوں نے احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کا غلط

مطالبہ کیا تھا جب پہلے احمدیوں کو اچھا کہتے رہے۔

اصولی طور پر یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ متنبی قادیان منشی غلام احمد اپنے دعویٰ نبوت سے پہلے مسلمانوں سے مل کر نماز پڑھتے تھے۔ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دعویٰ نبوت کرنے والے کو کذاب' دجال کہتے تھے۔ بعد میں جب خود دعویٰ کر کے دجال' کذاب بنے تو مسلمانوں سے نمازیں' جنازے' رشتے الگ کر لیے اور عامۃ المسلمین کو کافر کہنے لگ گئے اور مرزائی جماعت نے اپنے جلسے کو ظلی حج قرار دے دیا اور مسلمانوں سے ہر طرح علیحدہ ہو کر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابل آ گئے اور متنبی قادیان خود کو محمد رسول کہنے لگ گئے ؏

منم محمد واحمد کہ مجتبیٰ باشد

علامہ اقبال کا باطل شکن مطالبہ

''ہمیں قادیانیوں کی حکمتِ عملی' ان کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بانی تحریکِ احمدیہ نے اپنے مقلدوں کو ملتِ اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا ہے۔ علاوہ بریں ان کا دین کے اصولوں سے انکار' اپنی جماعت کا نیا نام' مسلمانوں سے نماز میں قطع تعلق' نکاح وغیرہ کے معاملہ میں مسلمانوں کا بائیکاٹ اور ان سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دنیائے اسلام کافر ہے۔ یہ تمام امور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں۔ اس امر کو سمجھنے کے لیے کسی خاص غور وفکر کی ضرورت نہیں۔ جب قادیانی (مرزائی) مذہبی' معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں تو پھر وہ سیاسی طور پر مسلمانوں میں رہنے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟ علاوہ ازیں سرکاری ملازمتوں کے لیے ان کی آبادی' انھیں کسی اسمبلی میں ایک نشست بھی نہیں دلا سکتی۔ ملتِ اسلامیہ کو پورا حق ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔'' (حرف اقبال ص 136)

خلیفۂ قادیان کی طرف سے علامہ کے مطالبہ کی تائید

چنانچہ مسلمانوں کی سیاسی جماعت مسلم لیگ نے جب قادیانیوں کو ساتھ نہ ملایا تو خلیفہ قادیان نے لکھا کہ مسلم لیگ نے اپنے ممبروں سے یہ حلف لیا ہے کہ میں اسمبلی میں جا کر احمدیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ اقلیت منظور کروانے کی کوشش کروں گا۔ (پیغام صلح لاہور 9 دسمبر 1936ء)

''مسلم لیگ 1946ء کے الیکشن جیت چکی تو خلیفہ نے خود اقلیت بننے کا مطالبہ کر دیا' ملاحظہ ہو:

''میں نے اپنے ایک نمائندہ (سر ظفر اللہ کا نام نہیں لیا۔ناقل) کی معرفت ایک بڑے ذمہ دار آفیسر کو (جو غالباً لارڈ مونٹ بیٹن تھا۔ ناقل) کہلوا بھیجا کہ پارسیوں اور عیسائیوں (یعنی ہر دو اقلیتوں) کی طرح ہمارے حقوق بھی تسلیم کیے جاویں، جس پر اس آفیسر نے کہا کہ وہ تو اقلیت ہیں اور تم ایک مذہبی فرقہ۔اس پر میں نے کہا کہ پارسی اور عیسائی بھی تو مذہبی فرقہ ہیں۔جس طرح ان کے حقوق تسلیم کیے گئے ہیں، اسی طرح ہمارے بھی کیے جائیں۔تم ایک پارسی پیش کرو، میں اس کے مقابلہ میں دو دو احمدی پیش کروں گا۔'' (اخبار ''الفضل'' قادیان، 13 نومبر 1936ء)

میاں دولتانہ کی طرف سے خلیفۂ قادیان کے مطالبہ کی تائید

میاں ممتاز محمد دولتانہ صدر پنجاب مسلم لیگ نے (جو اس وقت پاکستان کی طرف سے برطانیہ میں سفیر مقرر ہیں) قادیانیوں کے مطالبہ کی تائید کی:

''میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہماری حکومت میں آفیسروں نے اپنی قادیانی قوم کے اکثر افراد کو ناجائز الاٹمنٹیں بھی عطا کر رکھی ہیں۔ (تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا) بات دراصل یوں ہے کہ ہم مسلمان تو قادیانیوں کو اقلیت نہیں بناتے بلکہ انھوں نے ہی ہمیں اپنے آپ سے علیحدہ کر رکھا ہے۔لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ ان کی اس علیحدگی اور خواہش کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے آپ کو ان سے اور ان کو اپنے آپ سے الگ کر لیں۔ یقیناً یہ نکتہ درست اور جائز ہے اور سوچنے کے قابل ہے۔'' (رپورٹ جلسہ مسلم لیگ مندرجہ اخبار زمیندار یکم ستمبر 1952ء)

مرزائیوں کا دیرینہ اپنا مطالبہ پورا ہوا

اب اگر پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے مرزائیوں کو ان کے مطالبہ کے پیش نظر غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا ہے تو ان کو خوش ہونا چاہیے کہ ان کا دیرینہ مطالبہ پورا کر دیا گیا اور اس سلسلہ میں انھیں علامہ صاحب کا ممنون ہونا چاہیے، نہ کہ ان کے خلاف بغض و عناد کا اظہار کرنا چاہیے—— مرزائیوں کو ہم نے علامہ اقبال کی اپنی تحریروں سے مرزائیوں کے بارے میں ان کے خیالات سے آگاہ کر دیا ہے۔اب یہ اندازہ کرنا آپ کا کام ہے کہ علامہ اقبال کہاں تک مرزائیوں کے حامی اور مداح تھے!

❀......❀......❀

خضر تمیمی ایم۔اے ایل ایل بی

اقبالؒ کے ہاں

حضرت علامہ اقبالؒ کی ذاتِ گرامی کے متعلق ایک ہیچمدان کا کچھ کہنا' چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ لیکن ایک صحبت کی یاد میرے دل سے محو نہ ہوگی۔

1936ء قادیانیت کی شدید مخالفت کا زمانہ تھا۔ ایک طرف تو مجلسِ احرار اور دوسرے علمائے اسلام اپنی تحریروں اور تقریروں سے ''قصرِ خلافتِ قادیان' کی بنیادیں متزلزل'' کر رہے تھے اور دوسری طرف مرزائی صاحبان اپنی طویل اور قاطع دلیلوں سے ''سعید روحوں'' کو راہِ راست پر لا رہے تھے۔ ان ایام میں حضرت ممدوح علیل تھے۔ لیکن طرفین کی وزنی دلیلیں' سیدھے سادھے نوجوانوں کو سوچنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھیں، اس لیے کئی ایک تشنگانِ ہدایت' رہنمائی حاصل کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ نوجوان بڑی بیتابی کے ساتھ' آپ کے ارشاداتِ عالیہ کے منتظر ہیں، آپ نے اپنا شہرہ آفاق مضمون ''اسلام اور قادیانیت'' شائع فرمایا، جس سے کئی ایک گتھیاں سلجھ گئیں اور وہ دلائل جو سیاق وسباق کا لحاظ رکھے بغیر' سادہ دل نوجوانوں کو گمراہ کر سکتی تھیں، تارِ عنکبوت کی طرح کمزور نظر آنے لگیں اور نوجوانوں کی متوقعہ بے راہ روی کا مکمل سدِ باب ہوگیا۔

پنڈت جواہر لال صاحب نہرو کو اس مضمون کے بعض حصے سمجھ میں نہ آئے تھے، جس کی وجہ یہ تھی کہ انھیں اسلامی تعلیمات اور ماحول سے واقفیت نہ تھی۔ چنانچہ انھوں نے ''ماڈرن ریویو'' (کلکتہ) میں مذکورہ مضمون پر تنقید لکھی جس کا جواب حضرت علامہؒ نے ''اسلام اور احمدیت'' کے عنوان سے تحریر فرمایا۔ اس کی اشاعت سے دلوں کے رہے سہے شکوک بھی رفع ہوگئے۔

قصہ کوتاہ ہر طرف قادیانیت کے موافق یا مخالف تذکرے شروع تھے، جن سے مساجد اور عام جلسہ گاہوں کے علاوہ مکلف کوٹھیوں کے خلوت کدے بھی خالی نہ تھے، ان ایام میں یہی معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں صرف دو ہی فریق رہ گئے ہیں۔ ایک وہ جو قادیانیت کا مخالف ہے اور دوسرا وہ جو اس کے موافق۔ میں نے اس سال پنجاب یونیورسٹی کے ایم۔اے (فارسی) کا امتحان دیا۔ حضرت ممدوح ہمارے ایک

پرچے کے ممتحنِ اعلیٰ تھے اور اس میں ممدوح نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں خلافتِ الٰہیہ اور مجدد کے نظریے کے متعلق ایک سوال پوچھا تھا، جس میں ضمنی طور پر قادیانیت بھی زیرِ بحث آ جاتی تھی۔

اپنے دوست' صوفی غلام مصطفیٰ صاحب تبسم کے ساتھ "جاوید منزل" میں' مجھے حضرت ممدوح کی زیارت نصیب ہوئی۔ ہمارے جانے سے پیشتر' قائداعظم مسٹر محمد علی جناح' کسبِ فیض کے بعد موٹر میں سوار کوٹھی سے نکل رہے تھے۔ آپ نے دروازہ تک ان کی مشائعت کی اور پھر ہماری طرف توجہ فرمائی۔ صوفی صاحب کو دیکھ کر تو آپ بس نہال ہی ہو گئے۔

ڈیوڑھی میں' ایک کھری چارپائی بچھی تھی، جس کے سرہانے چھوٹا سا تکیہ دھرا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، پائنتی کی طرف کوئی کپڑا نہ تھا۔ اس پر ایک کتاب کھلی ہوئی پڑی تھی، جس کے ایک خاص مقام پر پنسل دھری تھی۔ ایک کاپی شاید مختصر یادداشتوں کے لیے پاس تھی۔ حضرت ممدوح صرف سادہ سے کُرتے اور شلوار میں ملبوس تھے۔ آخرالذکر پنجاب کی پانچ گزی شلوار اور پائجامے کے بین بین تھی۔ اللہ اللہ مشرق و مغرب کے جملہ علوم کا ماہر خرابیٔ صحت اور زیادتیٔ عمر کے باوجود اب بھی اس شان سے ہمہ تن مطالعہ تھا!

علی بخش چائے لایا اور آپ نے میٹھی چائے پر نمکین کو ترجیح دی۔ چائے کے ساتھ ساتھ بات چیت کا دور شروع ہوا۔ میں نے "جاوید نامہ" کی ان تصریحات کے متعلق استصواب کیا۔

آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد

آپ نے جواب میں قادیانیت اور اس کے بانی کی مختلف تحریروں اور دعاوی کے پیشِ نظر ظاہر فرمایا کہ ثانی الذکر کی شخصیت نفسیاتی مطالعہ کے لیے بہت موزوں ہے۔ صوفی صاحب بولے کہ آپ سے بڑھ کر موصوف کا تجزیہ نفسی کون کر سکے گا۔ ارشاد ہوا کہ موضوع واقعی بہت دلچسپ ہے لیکن صحت کی خرابی مانع ہے۔ کوئی نوجوان اس کام کے لیے اُٹھے تو اس کی ہر ممکن امداد اور رہبری کروں گا۔ اس کے بعد آپ نے ان نقصانات کو گنایا جو قادیانیت کو صحیح تسلیم کرنے کی صورت میں مذاہبِ عالم کو برداشت کرنے پڑے۔ پھر مختلف مذاہب سے اسلام کے امتیازات کو بشرحِ تمام واضح کر کے ارشاد فرمایا کہ اسلام نہ صرف دنیا کے مذاہب میں سے کامل ترین مذہب ہے بلکہ اس سلسلے میں جو ارتقائی بلندیاں انسان کو ودیعت کی گئی ہیں، ان کی بھی آخری کڑی ہے۔ آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ قادیانیت کی تعلیم' اسلام کی تیرہ سو سال کی علمی اور مذہبی ترقی کے کس طرح منافی ہے۔ سب سے زیادہ افسوس اس بات پر آپ نے ظاہر فرمایا کہ قادیانیت کے ارکانِ اعلیٰ' اسلافِ صالحین کی تحریروں کو محرف کر دیتے ہیں اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انھیں ایک خاص موضوع پر کی مسلمہ کتب کا علم تک بھی نہیں ہوتا۔ میں نے عرض کیا

کہ فریقین کی آراء کوایک طرف رکھتے ہوئے آپ مسئلہ ''ختم نبوت'' کے متعلق کچھ ارشادفرمائیں۔آپ نے فرمایا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ الخ کی صریح نص قرآنی کے بعد اجرائے نبوت کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ میں نے عرض کیا کہ آخر اسلام میں اور فرقے بھی تو ہیں، صرف قادیانی صاحبان کی مخالفت ہی کیوں کی جائے۔اس پر ارشاد ہوا کہ ان کا اختلاف بنیادی نہیں بلکہ فروعی ہے اور حقیقت میں یہ اسلامی فرقے مختلف گروہ ہائے خیال (Schools of thoughts) ہیں جن کے اختلافات فقہ پر مبنی ہیں۔ ہر ایک فرقہ اسلام کے مسلمات پر ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ایمان رکھتا ہے۔لیکن قانونِ اسلامی کے بعض حصوں کی تشریح میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتا ہے۔فقیہوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ تعجب ہوتا ہے کہ یہ اصحاب ''خشک'' ہونے کے باوجود حضور سرور کائناتؐ کے معاملے میں کس قدر حساس واقع ہوئے ہیں۔ایک صاحب اُٹھتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے فلاں کام اس طرح کیا۔اس دعوے کی تائید میں وہ ہر ممکن ثبوت (قرآن، حدیث یا دیگر مآخذ سے) بہم پہنچاتے ہیں۔ دوسرے صاحب اس کی تردید میں فرماتے ہیں کہ نہیں یہ کام حضور نے یوں سرانجام دیا۔وہ اپنے دلائل الگ پیش کرتے ہیں، جس سے مستفسیر کو حضورؐ کی مبارک زندگی کے ایک خاص پہلو کے متعلق موثق معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔سب سے زیادہ حیرت انگیز یہ امر ہے کہ جہاں کہیں حضورؐ کا ذکر آیا، ان جذبات سے عاری متقشفین کے دلوں میں محبت کے سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگ گئے۔ان حضرات کی زندگی کا محبوب سرمایہ حضورؐ کا اسوۂ حسنہ ہے، جس کے ہر پہلو کو اس قدر حزم واحتیاط سے محفوظ وملحوظ رکھتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔یہاں آپ نے Gealously Guard کرتے ہیں کا فقرہ ارشاد فرمایا تھا۔ اب تم خود اندازہ کرلو کہ ایسی محبوب ومفتخر ہستی کے جملہ اعزازات کے لیے کسی اور صاحب کو چن لینا' اسلامی علوم کی فلک رفعت عمارت کے انہدام سے مترادف نہ ہوگا؟ بانی مرزائیت کے کوائف زندگی اور انہی حالات میں حضورؐ کے مبارک افعال کے تفاوت کی وضاحت کرتے ہوئے آپ آبدیدہ ہوگئے اور نبی کریمؐ کی محبت میں بہتے ہوئے آنسوؤں سے ہم شکوک کے داغوں کو دھوتے اور دلوں کو روشن کرتے' صوفی صاحب کے دولت کدے پر لوٹ آئے۔سچ ہے۔

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

محمد نوید شاہین (ایڈووکیٹ)

اقبالؒ اور فتنۂ قادیانیت

حضرت علامہ اقبالؒ کی ایمان افروز شاعری محبتِ رسول کا وہ سمندر ہے جس کی موجیں آسمان کو چھوتی ہیں۔ وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہی نہیں بلکہ سچے عاشق رسول بھی تھے۔ انھوں نے فلسفے کی اعلیٰ تعلیم یورپ میں حاصل کی۔ دانشِ افرنگ کا سحر ان کے ایمان وایقان میں شکوک وتذبذب کا زہر پیدا نہ کر سکا بلکہ یورپ کی لادینی اور بے لگام تہذیب وثقافت نے اقبالؒ کے اسلامی عقائد اور ایمان وایقان کو مزید استقامت کا موقع فراہم کیا۔

مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم لکھتے ہیں:

''اور لوگ یورپ جا کر اسلام اور اسلامی عقائد سے برگشتہ ہو جاتے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب یورپ جا کر ٹھیٹھ مسلمان ہو گئے۔'' (اقبال کامل ص 61)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے کس قدر سچ لکھا ہے کہ

''مغربی تعلیم وتہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ (ڈاکٹر اقبالؒ) جتنا مسلمان تھا' اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اس کی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا' اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی نہیں رہا۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا' قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا اور جو کچھ دیکھتا' قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا۔'' (جواہرِ اقبال' ص 37)

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اقبال کی شخصیت کے تشکیلی عناصر کے زیر عنوان رقم طراز ہیں:

''......اقبال' اسلام اور اس کے پیغام کے بارے میں نہایت راسخ الایمان تھے اور رسول اللہؐ کے ساتھ ان کی محبت' شغف اور ان کا اخلاص انتہا درجہ کا تھا' اس لیے ان کے نزدیک اسلام ہی ایک ایسا زندہ و جاوید دین ہے کہ اس کے بغیر

انسانیت فلاح وسعادت کے بامِ عروج تک پہنچ ہی نہیں سکتی' نبیؐ رشد و ہدایت کے آخری مینار' نبوت و رسالت کے خاتم اور مولائے کل ہیں۔'' (نقوشِ اقبال ازسید ابوالحسن ندویؒ' ص 55)

خود اقبالؒ فرماتے ہیں:

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

فتنہ قادیانیت سے پوری طرح باخبر ہونے کے بعد جب علامہ اقبال نے اس تحریک سے اپنی بیزاری کا اعلان کیا تو ایک قادیانی اخبار سن رائز (Sunrise) نے علامہ پر تناقض کا الزام عائد کیا۔ تناقض کے الزام پر علامہ اقبالؒ نے ارشاد فرمایا:

''مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس نہ تو وہ تقریر اصل انگریزی میں محفوظ ہے' اور نہ اس کا اردو ترجمہ جو مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے' یہ تقریر میں نے 1911ء میں یا اس سے قبل کی تھی' مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ رُبع صدی قبل مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ اس تقریر سے بہت پہلے مولوی چراغ علی مرحوم نے بھی جو مسلمانوں میں کافی سربرآوردہ تھے اور جنھوں نے انگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں' بانی تحریک سے تعاون کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے انھوں نے کتاب ''براہینِ احمدیہ'' کی تدوین و ترتیب میں بیش قیمت مدد بہم پہنچائی' لیکن کسی تحریک کے اصل مضمرات اور اس کی حقیقی روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی' اس کے لیے برسوں چاہئیں' تحریک کے دو گروہوں کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانی تحریک سے ذاتی روابط رکھتے تھے' معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کیا رنگ اختیار کرتی ہے۔ میں ذاتی طور پر اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا جب ایک نئی نبوت سے متعلق بانی اسلام کی نبوت سے اعلیٰ تر نبوت کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ اس کے بعد میرے شکوک و شبہات' بیزاری سے بغاوت کی حد تک پہنچ گئے' جب میں نے تحریک کے ایک

رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرتؐ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا' درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ سوچنے والے انسان ہی کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے کو بدل سکے۔ بہ قول ایمرسن "صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔"

مزید فرمایا:

"میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں۔ یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں یا پھر ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ قبول کرلیں۔ ان کی جدید تاویلیں محض اسی غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام میں ہو' تاکہ انھیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔"

قادیانی خود کو مسلمان اور مسلمانوں کو کافر سمجھتے تھے۔ آنجہانی مرزا قادیانی اپنے پیرو کاروں کو نس طرح کے احکامات دیتا تھا، وہ مسلم معاشرت کے لیے سم قاتل تھے۔ علامہ کی تحریر میں مرزائی حکامات و انداز کی ایک جھلک دیکھیے:

"بانی تحریک نے ملتِ اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے' اور اپنے مقلدین کو ملتِ اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں ان کا بنیادی اصول سے انکار' اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی)' مسلمانوں کی قیام نماز سے قطع تعلق' نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دنیائے اسلام کافر ہے۔ یہ تمام امور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں۔"

مرزا غلام احمد نے اپنی تحریروں میں مسلمانوں کو پھٹے ہوئے دودھ کے نام سے پکارا ہے اور کہا ہے کہ اس کے حواری شیر تازہ کے مانند ہیں۔ مراد یہ ہے کہ تازہ دودھ اگر پھٹے دودھ میں ملے گا تو وہ بھی کارہ ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے حواریوں کے لیے مسلمان نہیں بلکہ احمدی کا نام انتخاب کیا اور ن کی مسلمانوں سے علیحدہ شخصیت قائم کی۔ قادیانی غیر قادیانی کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے کیونکہ ہر مسلمان ن کے نزدیک کافر ہے' اس سے شادی بیاہ نہیں کرتے' اس کے جنازے میں شامل نہیں ہوتے۔ مذہبی ماجی اور ملی امور میں تو وہ مسلمانوں سے الگ تھلگ رہے مگر سیاسی معاملوں میں مسلمانوں کا حصہ بنے ا کہ وہ تمام حقوق و مراعات سے فائدہ اٹھا سکیں جو مسلمانوں کا حق تھا یعنی اپنی معمولی تعداد کے باوجود ہندوستان میں مسلمانوں کا حصہ خورد برد کرتے رہے اور حکومت کے دائرہ اختیار میں شامل رہے۔ انگریز

حکومت نے ہر ممکن امداد کی۔ چنانچہ سر ظفر اللہ خان (مرزائی) کو مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے وائسرائے کی کونسل میں نامزد کیا گیا۔ مسلمان ہزار چیخے چلائے مگر انگریز حکومت کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

ہندوؤں کو اقبال کا یہ تجزیہ پسند نہ آیا چنانچہ پنڈت جواہر لعل نہرو نے کلکتہ کے ماڈرن ریویو میں اقبال کے مضمون کو رد کرنے کے لیے تین مقالے لکھے۔ ظاہر ہے کہ قادیانیت جو مسلمانوں کا قبلہ بدل کر ہندوستان (قادیان) کی طرف اس کا رخ پھیرنے پر تلی ہوئی تھی، وہ نہ صرف انگریز بلکہ ہندو کو بھی بھلی لگتی تھی اور دونوں مل کر اس کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔

نہرو کے تین مقالوں کے جواب میں اقبال نے ایک اور مضمون قادیانیت کے مسئلہ پر لکھا اور اپنا موقف پہلے سے بھی زیادہ زور سے دہرایا۔ انھوں نے کہا کہ ہندی مسلمان حق بجانب ہیں کہ وہ ایک ایسی تحریک کو جو تمام عالم اسلام کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتی ہے' اسے اسلام کی مجموعی حیات کے لیے اتنا ہی مہلک اور مضر سمجھیں جتنا کہ یہودی اپنے لیے سپنوزا کے فلسفہ کو مہلک سمجھتے ہیں۔ ہر ہندی مسلمان منطق کے ذریعے نہیں بلکہ اضطراری طور پر اس خطرے کو محسوس کر رہا ہے کہ اس کی رگِ جان پر حملہ ہو رہا ہے۔ اسے اپنی زندگی کے تحفظ کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ وہ لوگ اس سلسلہ میں رواداری کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ معاملہ کی اصلیت سنجیدگی اور نزاکت کو نہیں جانتے۔ اقبال نے لکھا کہ معروف مورخ گبن کے قول کے مطابق فلسفی کی رواداری کا ثبوت یہ ہے کہ وہ تمام مذاہب کو یکساں طور پر سچا سمجھتا ہے۔ مورخ کی رواداری یہ ہے کہ وہ ہر ایک کو باطل سمجھتا ہے' اور سیاست وان کی رواداری یہ ہے کہ وہ سب ہی کو مفیدِ مطلب قرار دیتا ہے اور انھیں اپنی مقصد برآری کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اگر مسلمان کی رواداری سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی کمزوری' ذلت اور رسوائی کو برداشت کرتا چلا جائے تو اقبال نے نہرو کو بتایا کہ ایسی رواداری مہمل اور بے معنی ہے۔ معاملہ مسلمان کی موت اور زندگی کا ہے۔ ان دشمنوں کو یہ کیسے اجازت دی جاسکتی ہے جو اسلام کے نام پر ہمارے گھروں میں گھس کر اسلام کی بنیادوں کو ہلا دیں اور ہم کھڑے تماشا دیکھا کریں۔ رواداری البتہ غیر مسلموں کے لیے صحیح ہے۔ اسلام نے یہود' نصاریٰ' زرتشتیوں وغیرہ کے ساتھ مثالی رواداری کا سلوک کیا ہے۔ یہودی جب بھی یورپ کی کسی سلطنت سے نکالے گئے، مسلمانوں نے انھیں پناہ دی ہے مگر یہ رواداری کا سلوک غداروں کے ساتھ کیسے روا رکھا جا سکتا ہے۔ اقبال نے نہرو کو واضح الفاظ میں سمجھایا کہ کسی مسلمان کو رسول اکرمؐ کے بعد کوئی نبی قبول نہیں۔ جب دین ہی مکمل ہو گیا تو پھر کسی نبی کا کیا جواز باقی رہ جاتا ہے۔ رموز خودی میں لکھتے ہیں:۔

لا نبی بعدی ز احسان خدا است
پردۂ ناموسِ دین مصطفےٰ است
قوم را سرمایہ قوت ازو
حفظ سر وحدت ملت ازو

علامہ اقبالؒ کا احمدیت سے بیزاری کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کے نام اپنے 21 جون 1936ء کے مکتوب میں قادیانیوں کو اسلام اور ہندوستان' دونوں کا غدار قرار دیا۔ اقبال رقم طراز ہیں:

"1 have no doubt in my mind that the Ahmadis are traitors both to Islam and to India."

(میرے ذہن میں اس کے متعلق کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ احمدی (مرزائی) اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں)

حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا
تو ہے' تجھے جو کچھ نظر آتا ہے' نہیں ہے

پہلے قادیانیوں کے تحفظ میں پنڈت نہرو کے سوالات شائع ہوئے تھے تو قادیانیوں نے ان کی خوب پذیرائی کی۔ ان کا لاہور زبردست استقبال کیا۔ مگر اقبال کے جواب کے بعد وہ قلم چھوڑ کر بیٹھ گئے تو اب قادیانیوں نے ان کو ذرا نہ پوچھا اور لاہور میں ان کا کوئی استقبال نہ کیا۔ اقبال نے دراصل پنڈت نہرو کو باور کرا دیا تھا کہ سیاسی لحاظ سے "احمدیوں" کا وجود مسلم معاشرے کے لیے ہندوستان میں مضر تو ہے ہی' خود حکومت اور ہندوستان کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔

اقبال نے جس تدبر سے پنڈت نہرو کو سمجھایا تھا' اس سے وہ واقعی حقیقت کو سمجھ گئے' چنانچہ مرزا بشیر الدین محمود کا یہ بیان اس پر شاہد ہے:

"ڈاکٹر سیّد محمود جو اس وقت کانگریس کے سیکرٹری ہیں' ایک دفعہ قادیاں آئے۔ انھوں نے بتایا کہ پنڈت جواہر لال نہرو جب یورپ کے سفر سے واپس آئے تو انھوں نے سٹیشن پر اُتر کر جو باتیں سب سے پہلے کیں' ان میں سے ایک یہ تھی کہ میں نے سفرِ یورپ میں یہ سبق حاصل کیا ہے کہ اگر انگریزی حکومت کو ہم کمزور کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ اس سے پہلے احمدیہ جماعت کو کمزور کیا جائے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کا یہ خیال تھا کہ احمدی جماعت انگریزوں

کی نمائندہ اور ان کی ایجنٹ ہے۔'' (خطبہ جمعہ مرزا بشیر الدین محمود مندرجہ روزنامہ الفضل قادیان 6 اگست 1935ء)

علامہ اقبال فارسی کی ایک نعت میں کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے عرفانِ الٰہی کی شمع سے کائنات کو اس طرح پُرنور کر دیا ہے کہ آپ کے بعد اگر کوئی شخص خواہ کسی بھی مفہوم (ظلی یا بروزی، تشریعی یا غیر تشریعی) میں نبوت کا دعویٰ کرے گا تو وہ مسلمان نہیں بلکہ مشرک ہے:

اے کہ بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک
بزم را روشن ز نور شمع عرفاں کردہ ای

ڈاکٹر اقبال کی یہ فارسی نعت ان کے کسی بھی مجموعۂ کلام میں شامل نہیں کی جاسکی اور بقول شورش کاشمیریؒ اقبال کی یہ نظم قادیانی مصلحتوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔

(اوراقِ گم گشتہ از رحیم بخش شاہین، ص 336)

آغا شورش کاشمیری مرحوم نے لکھا ہے آخر عمر میں قریباً اقبالؒ کی ہر صحبت میں آنجہانی غلام احمد قادیانی کا ذکر آجاتا تھا۔

ایک روز علامہؒ نے ارشاد فرمایا:

''قرآن کے بعد نبوت و وحی کا دعویٰ تمام انبیائے کرام کی توہین ہے۔ یہ ایک ایسا جرم ہے جو کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا، ختمیت کی دیوار میں سوراخ کرنا تمام نظامِ دیانت کو درہم برہم کر دینے کا مترادف ہے۔ قادیانی فرقہ کا وجود عالم اسلامی، عقائدِ اسلامی، شرافتِ انبیاء، خاتمیتِ محمدؐ اور کاملیتِ قرآن کے لیے قطعاً مضر و منافی ہے۔''

(نظریاتِ اقبال و مدنی از شورش، ماہنامہ الرشید، اقبال نمبر، ص 404,403)

علامہ اقبال کی رائے میں اگر مرزا قادیانی نبوت کا دعویٰ نہ بھی کرتا اور صرف جہاد کی مخالفت ہی پر اکتفا کرتا تو تب بھی وہ امتِ محمدیہ میں شامل نہیں رہ سکتا تھا کیونکہ فرضیتِ جہاد کا حکم قرآنِ حکیم میں موجود ہے اور قرآن حکیم کی کسی نص کا انکار ہی دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔ علامہ کے نزدیک ایسی نبوت ''برگِ حشیش'' کی مانند ہے جس کے عناصر میں قوت و شوکت (یعنی جہاد) کا پیام نہ ہو۔

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

علامہؒ نے 1936ء میں پنجاب مسلم لیگ کی کونسل میں قادیانیوں کو ایک غیر مسلم اقلیت قرار

دیے جانے کی تجویز بھی پاس کرائی اور صوبائی اور مرکزی اسمبلی کے لیگی امیدواروں سے حلفیہ تحریری اقرار نامہ لکھوایا کہ وہ کامیاب ہو کر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیے جانے کے لیے آئینی اداروں میں مہم چلائیں گے۔ افسوس کہ اس کاروائی کا ریکارڈ قادیانی نواز لوگوں نے علامہؒ کے انتقال کے بعد تلف کروا دیا۔

علامہ اقبال کو قادیانیت کے بہتر مطالعے کا موقع 1931ء میں ملا جب ان کو کشمیر کمیٹی میں کام کرنا پڑا۔ آئندہ کے پانچ سالوں میں ان کو قادیانیوں کی سیاسی سرگرمیوں اور تحریک کے مزاج سے زیادہ شناسائی حاصل ہوئی۔ 9 مئی 1932ء کو سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور میں خبر شائع ہوئی کہ علامہ اقبالؒ، خان بہادر حاجی رحیم بخش اور سیّد محسن شاہ وغیرہ بارہ آدمیوں نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی کو لکھ بھیجا ہے کہ آئندہ کشمیر کمیٹی کا صدر غیر احمدی شخص کو بنایا جائے۔ نیز علامہ اقبالؒ اور دوسرے ارکان نے اس بات پر بھی زور دیا کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے لیے کوئی دستور العمل وضع کیا جائے۔ احمدی ارکان کو یہ تجویز منظور نہ تھی۔ انھوں نے اس مطالبہ کو مرزا بشیر الدین محمود کے اختیارات کو محدود کرنے کی کوشش قرار دیا اور اس کے ساتھ ساتھ دستوری پابندی کو جماعت احمدیہ کی ذلت تصور کیا۔ ان حالات میں مجبور ہو کر مرزا بشیر الدین محمود نے اپنی اور جماعتِ احمدیہ کی دلی خواہش کے برعکس 17 مئی 1933ء کو کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ لاہور کے ''سیسل ہوٹل'' میں منعقد ہونے والے اس ہنگامی اجلاس میں مرزا بشیر الدین محمود کے مستعفی ہوتے ہی علامہ اقبالؒ کو صدر اور ملک برکت علی کو سیکرٹری منتخب کر لیا گیا۔

زیادہ تلخ تجربہ اس وقت ہوا جب علامہ اقبالؒ نے کشمیر کمیٹی کے دستور کا مسودہ تیار کر کے اجلاس میں پیش کیا تو احمدی ارکان مخالفت پر اتر آئے اور یہ تاثر دیا کہ وہ مسلمانوں کی کسی تنظیم کو نہیں مانتے، وہ صرف اپنے امیر کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ تھا احمدیوں کا طرزِ عمل کشمیر میں جس سے علامہ اقبالؒ پوری طرح سے آگاہ تھے اور یہی وہ بنیادی وجہ تھی جس سے بیزار ہو کر اقبالؒ نے کشمیر کمیٹی کے حوالے سے احمدیوں کی شدید مخالفت کی، نہ کہ احرار سے متاثر ہو کر انھوں نے مخالفت کی ابتداء کی تھی۔

یوں قادیانیوں کی طرف سے عدم تعاون کا سلسلہ شروع ہو گیا اور انھیں ناکام بنانے کے لیے مختلف حربے اختیار کیے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ نے 20 جون 1933ء کو اس حوالے سے ایک بیان میں کہا کہ:

> ''بدقسمتی سے کمیٹی میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقے (قادیانیت) کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں۔''

اسی حوالہ سے علامہ اقبالؒ کا دوسرا بیان 2 اکتوبر 1933ء کو جاری ہوا، جس میں صدارت سے

دست کشی کا سبب بیان کرتے ہوئے قادیانیوں کے پوشیدہ اغراض ومقاصد کی وضاحت کی کہ:

''تحریکِ کشمیر کی آڑ میں احمدی حضرات اپنا دام تزویر بچھا کر مسلمانوں کو شکار کرنا چاہتے ہیں۔''

علامہ اقبالؒ کو اس بات کا شدید دُکھ تھا کہ تحریک آزادیٔ کشمیر کی آڑ میں قادیانیوں نے اپنے مبلغین کے ذریعے پونچھ میں بھولے بھالے کشمیریوں کو قادیانیت کے جال میں پھنسا لیا۔ ان کا شدید ردِعمل اسی بناء پر تھا۔ یہی وہ موقع تھا جب اقبالؒ نے قادیانی یلغار کا راستے روکنے کا دل و جان سے تہیہ کر لیا۔ علامہ اقبالؒ کے علاوہ اور دوسرے مسلم اکابرین جو کشمیر کے حالات سے واقف تھے'ان کا خیال یہ بھی تھا کہ جماعتِ احمدیہ انگریز کی وفادار ہے اور کشمیر کمیٹی کے تمام راز ہائے سربستہ انگریز حکمرانوں تک پہنچاتی ہے۔ اس مخصوص حوالے سے علامہ اختر فتح پوری لکھتے ہیں کہ:

''ایک رات پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے دو آدمی علامہ اقبالؒ کے مکان پر آئے۔ انھوں نے علی بخش سے پوچھا کہ علامہ صاحب کہاں ہیں؟ ہم ان سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ علی بخش نے کہا: ''وہ سو رہے ہیں۔'' انھوں نے کہا کہ انھیں فوراً جگا دیں۔ ہمیں ان سے ایک ضروری کام ہے اور اسی وقت ہمیں واپس بھی جانا ہے۔ قریب ہی علامہ بھی سوئے ہوئے تھے۔ ان کی آوازیں سن کر بیدار ہو گئے تو انھوں نے علامہ اقبالؒ کے سامنے وہ تمام ریکارڈ رکھ دیا جو مرزا محمود (بشیر الدین محمود) نے گورنمنٹ کو بھیجا تھا۔ نیز انھوں نے کہا کہ اگر ہمارے متعلق یہ پتا چل جائے کہ ہم یہ فائلیں اٹھا کر یہاں آئے ہیں تو ہماری سزا موت کے سوا کچھ نہیں مگر ہمیں اس بات پر حیرت ہے کہ آپ نے ایک ایسے آدمی کو کشمیر کمیٹی کا صدر بنا دیا ہے جو گورنمنٹ کا جاسوس ہے۔''

(قادیانی تحریک کا سیاسی پس منظر ص 30-31 از علامہ اختر فتح پوری)

جہاں میں بندہ حُر کے مشاہدات ہیں کیا
تری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیے

ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ

علامہ اقبالؒ اور سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

طاقت کے نشے میں مخمور فرنگی کے ایوانوں میں اپنی آتش بیانی اور حریتِ ایمانی سے لرزہ پیدا کرنے والا برصغیر کا عظیم مقرر سیّد عطا اللہ شاہ بخاریؒ گجرات کا سپوت تھا۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے بزرگوں میں سے سیّد عبدالغفار بخارا سے کشمیر آئے اور **1848**ء میں جب مہاراجہ گلاب سنگھ نے کشمیر کا سودا کیا تو سیّد عطاء اللہ کے دادا سیّد نور شاہ کشمیر سے ہجرت کر کے گجرات کے گاؤں ناگڑیاں میں آ کر آباد ہو گئے۔ سیّد عطاء اللہ کے والد سیّد ضیاء الدین گجرات سے پشمینے کی سوداگری کے لیے پٹنہ جایا کرتے تھے۔ وہیں ان کی شادی حافظ سیّد احمد اندرابی کی صاحبزادی حافظہ سیّدہ فاطمہ سے ہوئی اور اسی سرزمین کو شاہ جی کی جائے پیدائش ہونے کا فخر حاصل ہے۔ جہاں آپ **1891**ء میں پیدا ہوئے۔

آپ کا بچپن زیادہ تر ننھیال میں گزرا۔ چار سال کی عمر میں والدہ داغِ مفارقت دے گئیں۔ 22 سال کی عمر تک آپ حفظِ قرآن کے علاوہ قرأت اور دیگر مروجہ اسلامی علوم میں دسترس حاصل کر چکے تھے۔ **1914**ء میں آپ کی شادی ناگڑیاں میں سیّد میر مرتضیٰ کی صاحبزادی سے انجام پائی۔ شادی کے بعد دوبارہ امرتسر گئے اور تفسیر و حدیث کا عمیق مطالعہ کیا۔ یہیں سے آپ کی خطابت کا آغاز ہوا۔ جلیانوالہ باغ کا واقعہ (13 اپریل **1919**ء) آپ کو سیاست کی طرف لے آیا۔ دسمبر **1919**ء میں منعقدہ خلافت کانفرنس امرتسر میں مولانا شوکت علی (**1873-1938**ء) کی صدارت میں آپ نے پہلی سیاسی تقریر کی جسے بہت سراہا گیا۔

1920ء میں لاہور میں علامہ اقبال کی صدارت میں پہلی خلافت کمیٹی قائم کی گئی مگر اگلے روز ہی اسے سر مائیکل اڈوائر کے اشارے پر توڑ دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد شاہ صاحب لاہور آئے، ایک بڑے جلسے سے خطاب کیا اور علی الاعلان نئی خلافت کمیٹی تشکیل دی جس کا صدر سیّد حبیب مدیر ''سیاست'' کو مقرر کیا گیا۔ پوری تحریکِ خلافت میں شاہ صاحب صف اوّل میں رہے۔ ترکِ موالات کے نتیجے میں

بچوں کو سرکاری سکولوں سے ہٹالیا گیا تو ان کی تعلیم کے لیے جامعہ ملیہ کے تحت ملک بھر میں درسگاہیں قائم کی گئیں۔ شاہ جی نے گجرات میں آزاد مسلم ہائی سکول کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے ضلع گجرات میں 1300 (تیرہ سو) خلافت کمیٹیاں قائم کیں اور لوگوں نے دل کھول کر چندہ دیا۔ مردوں نے عمر بھر کی جمع پونجی اور عورتوں نے اپنے زیور تک شاہ جی کے قدموں میں ڈھیر کر دیے۔ گجرات اس دور میں شاہ جی کی سرگرمیوں کا مرکز تھا' پھر ان کی خطابت اور بے باکی کا ڈنکا پورے ہندوستان میں بجنے لگا۔

تحریک خلافت کے علاوہ تحریکِ ختم نبوت اور تحریکِ شاتمِ رسول میں شاہ جی نے مرکزی کردار ادا کیا۔ غازی علم الدین شہید (1908-1929ء) نے آپ کی تقریریں کر ہی شاتمِ رسول کو کیفرِ کردار تک پہنچایا تھا۔ ان تحریکوں میں آپ کئی مرتبہ گرفتار ہوئے اور قید و بند میں رکھے گئے۔ شاردا ایکٹ کی بھی آپ نے دھجیاں اُڑا دی تھیں۔

دسمبر 1929ء میں ''مجلسِ احرار'' کی بنیاد رکھی گئی تو شاہ صاحب کو اس کا پہلا صدر منتخب کیا گیا۔ مارچ 1930ء کے ''انجمنِ خدام الدین'' کے سالانہ اجلاس میں شیخ الحدیث علامہ انور شاہ کاشمیری نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر کے آپ کو ''امیرِ شریعت'' کا خطاب دیا۔ ان کے بعد تقریباً پانچ سو علماء نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی جن میں مولانا احمد علی لاہوری (1886-1962ء) مولانا ظفر علی خان (1873-1956ء) اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی (1896-1956ء) شامل تھے۔

آپ کی زندگی انگریز کے خلاف لڑتے ہوئے گزری۔ آپ کی للکار ان پر ہیبت طاری کر دیتی تھی۔ تحریکِ ختم نبوت ہو' تحریکِ مسجد شہید گنج ہو یا تحریکِ کشمیر آپ کی جرأت و بے باکی ہر میدان میں قابلِ دید رہی۔ ان کی زندگی کے بیشتر لمحات سٹیج پر گزرے، ریل میں صرف ہوئے یا جیل میں کٹے۔

آپ کی خطابت میں بلا کا جوش تھا۔ قوتِ ایمانی اور جذبہ حریت سے بھرپور یہ تقاریر سننے کے لیے لوگ دور دور سے آتے اور موسم و ماحول سے بے نیاز گھنٹوں آپ کی ایمان افروز باتیں سنتے۔ تقریر سے قبل آپ نہایت پرسوز آواز میں تلاوتِ قرآن حکیم فرماتے جس سے سننے والوں پر وجد طاری ہو جاتا۔ آپ کو متعدد بار قتل کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ انگریز سرکار آئے دن آپ پر طرح طرح کے مقدمات بنائے رکھتی مگر آپ نے جھکنا سیکھا ہی نہ تھا۔ شاہ جی کی تمام تر توانیاں ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کی بہتری کے لیے صرف ہوئیں۔ اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوست ان کا دوست اور دشمن ان کا دشمن تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد اپنے وطن میں بھی قید رہے کیونکہ وہ جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے سے کبھی باز نہ آئے۔ قیام پاکستان کے بعد ان کی سرگرمیاں مدھم پڑتی گئیں اور صحت بھی کمزور ہوتی

گئی' تاہم ختم نبوت کے سلسلے میں ہمیشہ سرگرم رہے۔ آخر ایک بھرپور مجاہدانہ زندگی گزار کر یہ فقید المثال خطیب اور سراپا حریت خادم اسلام 21 اگست 1961ء کو ملتان میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور ملتان میں ہی دفن ہوئے۔ [1]

''اقبال اور بخاری'' کے عنوان سے آغا شورش کاشمیری لکھتے ہیں:

''اج اوہ ہوندا تے انہاں کرگساں نوں دسدا کہ بخاری غدار اے کہ فداکار۔ میں کنوں کہواں' میرے تے ساتھی ای میرے کولوں وچھڑ گئے تے یاں پچھڑ گئے نیں۔''

علامہ کا ذکر ہو رہا تھا' شاہ جی نے ایک سرد آہ بھری اور کہا آج وہ (اقبال) زندہ ہوتا تو ان کرگسوں کو بتاتا کہ بخاری غدار ہے یا فداکار۔ میں کس سے کہوں کہ میرے تو ساتھی ہی مجھ سے بچھڑ گئے یا پچھڑ (پیچھے رہ) گئے ہیں۔

شاہ جی فرماتے تھے:

''جب کبھی میں ان (اقبال) کے ہاں حاضر ہوتا وہ چارپائی پر گاؤ تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھے ہوتے' حقہ سامنے ہوتا' دو چار کرسیاں بچھی ہوتیں۔ صدا دیتا ''یا مرشد'' فرماتے ''آ بھئی پیرا'' بہت دناں بعد آیاں اے'' علی بخش سے کہتے حقہ لے جاؤ اور کلی کے لیے پانی لاؤ۔ کلی فرماتے' پھر ارشاد ہوتا ''ایک رکوع سناؤ'' میں پوچھتا حضرت کوئی تازہ کلام۔ فرماتے۔ ہوتا ہی رہتا ہے۔ عرض کرتا ''لایئے'' کاپی منگواتے۔ پہلے رکوع سنتے پھر وہ اشعار جو حضور سے وابستہ ہوتے۔ قرآن پاک سنتے وقت کانپنے لگتے تھے۔ لیکن جب حضور کا ذکر ہوتا یا ان کے متعلق کلام پڑھا جاتا تو چہرہ اشکبار ہو جاتا۔ حضور کا ذکر ہمیشہ باوضو شخص سے سنتے اور خود ان کا نام بھی باوضو ہو کر لیتے تھے۔ حضور کے ذکر پر اس طرح روتے جس طرح ایک معصوم بچہ ماں کے بغیر روتا ہے۔''

افراد و اشخاص اور واقعات و حالات کے بارے میں ان کا (اقبال کا) تجزیہ حیرت انگیز طور پر درست ہوتا تھا۔ شاہ جی کا بیان ہے۔ ''مجھ سے اکثر لوگوں کے بارے میں گفتگو فرمایا کرتے اور ان کی میرتوں کا اجمالی خاکہ پیش فرماتے۔ سرکار کی بیشتر باتیں انہی کی وساطت سے ہم تک پہنچتی تھیں۔ پہلے خود ہی طرح دیتے پھر احتراز فرماتے ''بھئی دلی دروازے کے باغ میں لوگوں کو بتا دو گے۔''

پھر بتا بھی دیتے۔ فرماتے ''اپنی ذات تک محدود رکھنا'' لطف یہ تھا اپنے سبھی معتمدین کو بتاتے چلے جاتے اور سبھی کو یہ مشورہ دیتے کہ اپنے تک محدود رکھنا اور جب بات بکھر جاتی تو فرماتے ''تم لوگ راز نہیں رکھ سکتے ہو'' عرض کی جاتی' آپ نے ہی تو فلاں فلاں کو بتایا ہے۔ پھر مسکراتے ''اچھا تو عام ہو جانے دو' اس میں راز کی کونسی بات ہے۔''

ایک دفعہ (بروایت شاہ جی) جلسوں کی رونق پر گفتگو کرتے رہے' کہنے لگے ''عامۃ المسلمین میں بڑی جان ہے'' اس قوم کا مزاج حرارت سے بنا ہے' یہ بجھنے کے لیے پیدا نہیں کی گئی۔ ساری خرابی لیڈر شپ کی ہے۔ خواص تو خیر عضوِ معطل ہیں' انھیں اپنے جسم کا عیش چاہیے۔ لیڈر گم کردہ راہ ہیں' لوگوں کو صحیح راستہ پر نہیں لاتے۔'' عرض کیا ''حضرت یہ بھی آپ نے مفروضہ قائم کر لیا ہے قوم خود ہی صحیح راہ پر نہیں آتی۔ آپ کے لیے عامۃ المسلمین کس طرح تڑپ رہے ہیں لیکن آپ مجمع میں آتے ہی نہیں۔'' (کہنے لگے) ''نہیں پیر جی۔ یہ بات نہیں میرا مجمع میری کتابیں ہیں۔ میں ہجومِ افکار میں اس طرح کھڑا رہتا ہوں کہ بسا اوقات فرصت کے اوقات ہی عنقا ہو جاتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے مرشد! میں نے تو کبھی اپنی کتابوں کی گرد بھی نہیں جھاڑی۔''

''او شاہ جی تساں تے دلاں تے دماغاں دیاں مٹیاں جھاڑ دے او''

(ارے شاہ جی آپ تو دلوں اور دماغوں کی گرد جھاڑتے ہیں)

شاہ جی نے یہ بیان کیا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فرمایا

''ہائے کیا انسان تھا۔ جدید دانش اور قدیم حکمت کا نقطہ معراج! چونکہ میاں سے محبت کرتے تھے' اس لیے اللہ نے ان پر علم و دانش اور فکر و نظر کی بھی راہیں کھول دی تھیں۔ وہ اس میدان کا کھلاڑی نہیں تھا لیکن علم اس کا خانہ زاد تھا۔

''آج جو پشیتنی وفادار.........شاہ جی نے فرمایا'' اس کا نام لے لے کر اس کے ہم نشینوں کی فہرست میں اپنا نام لکھوا رہے ہیں، کسی علمی مسئلے پر اقبال نے کبھی ان سے مخاطبت کی؟ کبھی ان سے کوئی دینی سوال کیا؟ کبھی ملی امور پر ان سے خود گفتگو کی؟ کبھی مسلمانوں کے مستقبل کا سوال ان سے زیر بحث لاتے رہے؟ ان کے ساتھ تو ان کے زیادہ سے زیادہ لاغر قسم کے مجلسی روابط تھے۔''

شاہ جی نے کہا۔

''یہی وہ لوگ ہیں جو اقبال کی راہ میں ہمیشہ مزاحم ہوتے رہے۔ انہی لوگوں نے اقبال کے خلاف مخبریاں کی تھیں اور انھیں کسی منصب پر فائز نہیں ہونے دیتے تھے۔ اقبال نے مجھ سے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا تھا۔ شاہ جی نے بتایا۔ یہ بیان کرتے ہی ان کا بدن کانپنے لگا کہ انسان مخالفت اور مخاصمت میں کس حد تک سنگدل' سیہ رو اور گندہ ضمیر ہو جاتا ہے۔

شاہ جی کی روایت ہے کہ فرنگی کی دشمنی سے ان کے خون کا قطرہ قطرہ انگاروں میں ڈھلا ہوا تھا۔ وہ یورپی تہذیب' یورپی دانش' یورپی سیاست اور یورپی سج دھج کے سخت دشمن تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ہمارا مغرب زدہ طبقہ اپنے خصائص کھو چکا ہے۔ اس کے اندر مشرق کی روح بالکل نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ

قوم کی خودی اپنی قیمت کھو بیٹھی ہے۔لوگ علم کی سنجیدگی سے ہاتھ اٹھا کر نٹوں کا تماشا دیکھنے میں غلطاں ہیں۔

کاسہ لیس خاندانوں کا ذکر بڑی حقارت سے کرتے ۔ یہ طنطنہ میں نے صرف انہی میں دیکھا کہ جن سے نفرت کرتے انھیں اپنے گھر میں بھی گھسنے نہیں دیتے تھے اور اگر کوئی کسی بہانے چلا آتا تو اسے دھتکار کر نکال دیتے۔ ورنہ منہ نہیں لگاتے تھے۔

ایک دفعہ فرمایا ''شاہ جی میں مطمئن ہوں کہ میرا کلام لوگوں کے رگ و پے میں اتر رہا ہے لیکن ابھی کارواں تیار ہو رہا ہے۔ابھی کاروان بنا نہیں۔ سفر، رستہ اور منزل تو دور کی چیزیں ہیں۔ جب تک مشرق، مغرب کی ذہانت کو للکارے گا نہیں اس وقت تک مشرق کی عظمت کا سورج نہ کبھی ابھر سکتا ہے اور نہ اس کے نصف النہار پر پہنچنے کا سوال ہی زیرِ غور آ سکتا ہے۔

شاہ جی عموماً یہ فرماتے:

''کاش اقبال آج زندہ ہوتے۔ ان کا دماغ ایک عظیم الشان تنہائی کا عظیم الشان کتب خانہ تھا۔ جب کبھی ان کی ہم نشینی کا موقع ملتا، معلوم ہوتا تھا کہ لالہ زار کھل گیا ہے۔''[3]

پہلی ملاقات

اقبال اور بخاری کی پہلی ملاقات دسمبر 1919ء میں امرتسر میں خلافت کانفرنس کے جلسے میں ہوئی، جہاں شاہ جی نے زندگی کی پہلی سیاسی تقریر کی اور ان کی عظیم خطابت کا آغاز ہوا اور خواص و عام ان کی خطابت دیبا کی کے گرویدہ ہو گئے۔ اس ملاقات کے بعد دونوں میں سیاسی میدان میں فکری ہم آہنگی مد و جزر سے گزرتی رہی لیکن ذاتی مراسم خلوص اور عقیدت سے ہمیشہ بھرپور رہے۔

اقبال سیاسی میدان میں اختلاف کے باوجود احرار کے ایثار، دینی حمیت اور جذبۂ حریت کے قائل تھے۔

ازل سے فطرتِ احرار میں ہے دوش بدوش
قلندری و قبا پوشی و کلہ داری

نظم ''اسیری''

اقبال کی نظم ''اسیری'' (بانگِ درا) کے بارے میں عام روایت[4] یہ ہے کہ اقبال نے یہ نظم دسمبر 1919ء میں امرتسر میں مسلم لیگ، کانگریس اور خلافت کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں اس وقت پڑھی تھی جب مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جیل سے رہا ہو کر جلسے میں پہنچے تھے۔ تاہم دوسری روایت[5] کے مطابق اقبال نے یہ نظم اس وقت کہی تھی جب تحریکِ خلافت کے دور میں سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کو

گرفتار کر کے تین سال کے لیے قید فرنگ میں ڈال دیا گیا۔ خود شاہ جی کی روایت تھی کہ یہ نظم اقبال نے انھیں خود سنائی تھی۔ 6 ممکن ہے اقبال نے نظم کے مضمون اور تاثر کی وجہ سے اسے دونوں موقعوں پر سنایا ہو کیونکہ اس کے اشعار شاہ جی کی ذات پر بہت موزوں نظر آتے ہیں۔ ذیل میں یہ نظم درج کی جاتی ہے: 7

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشکِ اذفر چیز کیا ہے' اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت' مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
''شہپرِ زاغ و زغن دربندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند''

تحریکِ ختمِ نبوت

تحریکِ ختمِ نبوت (ناموسِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دوران جب مجلسِ خلافت کے ارکان نے اپنی گرفتاری پیش کی تو اقبال نے فرمایا:

''مجھے مجلسِ خلافت کے ان ارکان سے ہمدردی ہے جو اپنی مجلس کی تجویز کے مطابق نیک نیتی سے یہ سمجھتے ہوئے گرفتار ہوئے کہ وہ ایک پاک مقصد کی خاطر ایثار کر رہے ہیں' خاص کر مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اور خواجہ عبدالرحمٰن غازی ایسے مشہور کارکنوں کے ساتھ ہمدردی ہے۔ ہمیں ان کی بعض رایوں سے اختلاف بھی ہو لیکن عقل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی خوبیوں کا بھی اعتراف کیا جائے۔ وہ قومی کاموں میں بہت حصہ لیتے ہیں اور ضرورت کے وقت بڑا ایثار دکھاتے ہیں۔'' 8

تبادلۂ خیال

شاہ جی کے بہت سے دوست اقبال کے قریبی احباب میں شامل تھے جیسے حکیم فیروز طغرائی' احمد دین امرتسری' عبدالمجید سالک' غلام رسول مہر' محمد دین تاثیر' مولانا گرامی' شیخ عبدالقادر' شیخ حسام الدین امرتسری اور چوہدری افضل حق۔ اس ضمن میں مولانا انور شاہ کشمیری (1875-1933ء) کا ذکر

خصوصیت کا حامل ہے، جن سے اقبال کو بہت عقیدت تھی۔ مارچ 1925ء میں انجمن خدام الدین کے زیرِ اہتمام ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں خصوصیت سے علمائے دیوبند نے شرکت کی تھی جن میں سید انور شاہ کشمیری، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی (م۔ 1929ء)، مولانا شبیر احمد عثمانی (1885-1949ء)، مفتی عزیز الرحمٰن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ علامہ نے اپنے ہاں ایک خاص دعوت رات کے وقت کی تھی جس میں یہ حضرات خصوصی طور پر مدعو تھے اور سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کو بھی بلایا گیا تھا۔ ضیافت سے قبل اور بعد میں بہت سے علمی اور دینی مسائل زیرِ بحث آئے جن میں سود کا مسئلہ بھی شامل تھا۔[10]

حمایت

1926ء میں اقبال نے جب لیجسلیٹو کونسل کے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو اکثر زعماء نے ان کی بھرپور حمایت کی۔ اسی سلسلے میں 23 اکتوبر 1926ء کو شام سات بجے بیرون دہلی دروازہ میونسپل پارک لاہور میں پنجاب الیکشن خلافت بورڈ کے زیرِ اہتمام مسلمانانِ لاہور کا ایک عظیم الشان اجتماع علامہ اقبال کی حمایت اور تائید کے لیے منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں علامہ کے علاوہ جن شخصیات نے شرکت کی اور علامہ کی حمایت میں تقاریر کیں، ان میں مولانا ظفر علی خاں، خواجہ عبدالرحمٰن غازی وغیرہم کے ساتھ سیّد عطا اللہ شاہ بخاری بھی شامل تھے[11] اور علامہ کی واضح اکثریت میں شاہ جی کی جادوئی خطابت کا سحر بھی شامل تھا۔

فتنہ شاتمِ رسول

اقبال کی باقی تمام حیثیتیں ایک طرف اور عشقِ رسول ایک طرف! اور شاہ صاحب کی زندگی جس جہدِ مسلسل سے عبارت تھی اس کا سب سے بڑا مقصد ناموسِ رسالت تھا۔ 1923ء سے 1929ء تک علامہ اور سیّد صاحب نے مل کر ناموسِ رسالت کے لیے اپنے اپنے نقطہ نظر کے مطابق کام کیا۔ شاتمِ رسول راج پال کے ہائی کورٹ سے بری ہونے سے لے کر غازی علم دین کی پھانسی تک دونوں نے اس تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔ اگرچہ شاہ جی سول نافرمانی پر زور دیتے تھے جبکہ اقبال گفت وشنید کا رستہ اپنانے کے حق میں تھے۔ اس سلسلے میں کئی ملاقاتیں ہوئیں اور شاہ جی کو متعدد بار گرفتار کیا گیا۔ ایک مرتبہ انھیں علامہ کی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کے باہر سے گرفتار کیا گیا۔

تحریکِ کشمیر اور قادیانیت

قادیانیت کے بارے میں اقبال کے رویہ اور قادیانیت کے خلاف ان کا علمی اور عملی جہاد،

اقبال اور بخاری کے تعلقات میں توسیع اور تقویت کا باعث بھی تھا اور ثمر بھی۔ آج تک قادیانی بلبلا رہے ہیں کہ اقبال کو محاسبۂ قادیانیت پر ''احراری بہکاووں'' نے اکسایا۔ اس سلسلے میں مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا احمد علی لاہوری اور سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری سے اقبال کے روابط کی تفاصیل منظر عام پر آ چکی ہیں۔

تحریک کشمیر ایک اور محاذ تھا جہاں اقبال اور شاہ جی دوش بدوش جہاد کرتے نظر آتے ہیں۔ جولائی 1931ء میں شملہ میں کشمیر کمیٹی قائم کی گئی۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد (1889-1965ء) کو اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس اجلاس میں اقبال بھی شامل تھے۔ مگر جلد ہی کشمیر کمیٹی کے ارکان نے محسوس کیا کہ قادیانی صدر کے زیر سرپرستی قادیانی اس تحریک کی آڑ میں دراصل قادیانیت کی تبلیغ و اشاعت میں لگے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں اقبال اور شاہ جی کی کئی ملاقاتیں ہوئیں جن کے نتیجے میں قادیانیت کے بارے میں اقبال کے خیالات میں نہایت واضح اور بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی، جس کا اقبال نے برملا اظہار کیا اور اسی دور سے اقبال کے خیالات میں وہ صراحت پیدا ہوئی جس کی بنا پر ان پر قادیانیت سے متاثر ہونے کا الزام غلط ثابت ہوتا ہے۔ انہی ملاقاتوں کے نتیجے میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ کشمیر کے بتیس لاکھ مسلمانوں کو کفر و ارتداد (قادیانیت) سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ مرزا بشیر الدین محمود کو کشمیر کمیٹی کی صدارت اور عبدالرحیم درد کو سیکرٹری شپ کے عہدے سے ہٹایا جائے اور کشمیر کی آزادی کی باگ ڈور مجلسِ احرار کے سپرد کی جائے۔ چنانچہ 7 مئی 1933ء کو بشیر الدین نے استعفیٰ دے دیا۔

اسی تحریکِ کشمیر کے سلسلے میں موچی دروازہ لاہور کے باغ میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت علامہ اقبال نے کی۔ شاہ جی نے ہمیشہ کی طرح معرکۃ الآراء تقریر کی۔ لوگ والہانہ انداز میں نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتے رہے۔ آخر میں لوگوں نے اصرار کیا کہ علامہ بھی کچھ ارشاد فرمائیں۔ شاہ صاحب نے علامہ کی علالت کا جواز پیش کیا، مگر مجمع کا اصرار اعتذار پر غالب آ گیا اور علامہ نے مٹھی ہوا میں بلند کرتے ہوئے یہ شعر پڑھا۔ 13

لا الٰہ گوئی بگو از روئے جاں
لا الٰہ ضرب است و ضربِ کاری است

سورۂ مزمل سنانے کی فرمائش

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کے صاحبزادے سیّد عطاء المحسن بیان کرتے ہیں 14 کہ شاہ جی نے بارہا اقبال سے وابستہ یادیں، باتیں اور ملاقاتیں تازہ کیں۔ وہ بتایا کرتے تھے کہ اقبال ان سے اکثر ملاقاتوں میں سورہ مزمل سنانے کی فرمائش کرتے تھے اور خود بھی شاہ جی کی فرمائش پر اپنا تازہ کلام سناتے

تھے۔انھوں نے ایک مرتبہ ''مرگ'' کے زیرِ عنوان نظم سنائی تھی۔

1931ء میں باری علیگ نے ''اقبال اور بخاری'' کے عنوان سے ''زمیندار'' میں ایک مضمون لکھا جس سے اس دور کی ہندوستانی سیاست میں اقبال اور بخاری کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔اقبال اور بخاری سیاست میں جن رجحانات کے نقیب تھے اور مسلم زعماء میں دونوں کا جس قدر طوطی بولتا تھا اس کی کامیاب تصویر کشی کی گئی ہے۔نیز اس ذہنی فضا کا سراغ لگایا گیا ہے جس میں دونوں قوم کے ملی شعور کی پرورش کرنا چاہتے تھے۔15

شیخ حسام الدین امرتسری نے شاہ جی اور اقبال کی صحبتوں کا ذکر کیا ہے جسے سلیم تابانی نے ماہنامہ ''تبصرہ'' لاہور نومبر' دسمبر 1966ء میں شائع کیا۔عبداللہ چغتائی نے بھی دونوں کے دوستانہ روابط کا ذکر کیا ہے(''بینات'' کا بنوری نمبر۔''المعارف'' کا اقبال نمبر)16

ایک تعزیتی فقرہ

اقبال کی وفات پر مسجد خیر الدین امرتسر میں تعزیتی جلسے میں شاہ جی کا خطاب ان کے جذبات کا مظہر تھا۔آپ کا ایک فقرہ تھا:

> ''اقبال کو نہ انگریز نے سمجھا نہ قوم نے۔اگر انگریز سمجھتا تو اقبال بستر پر نہ مرتے بلکہ پھانسی کے تختے پر لٹکائے جاتے اور اگر قوم سمجھ لیتی تو آج تک غلام نہ رہتی۔''17

حواشی

1. شاہ صاحب کے حالات، جانباز مرزا کی کتاب ''حیاتِ امیرِ شریعت'' سے اخذ کیے گئے ہیں۔
2. ہفت روزہ ''چٹان'' لاہور۔سالنامہ 1962ء ص 17۔
3. اقبال کے ممدوح علماء از قاضی افضل حق قرشی بحوالہ ماہنامہ لاہور سالنامہ 1962ء۔
4. ذکرِ اقبال از عبدالمجید سالک ص 106 اور دیگر کتب مثلاً ''خدوخالِ اقبال'' از امین زبیری۔
5. اس نظم ''اسیری'' کو امیرِ شریعت سے منسوب کرنے والوں میں سب سے قدیم حوالہ خان کابلی کی کتاب

''سوانح حیات سید عطاء اللہ شاہ بخاری'' لاہور 1940ء کا ہے۔ اس کو نذیر مجیدی نے اپنی کتاب ''شاہ جی'' لاہور 1965ء ص 396 پر درج کیا ہے اور پھر قاضی افضل حق قرشی نے ''اقبال کے ممدوح علماء'' کے ص 141 پر یہی حوالہ دُہرایا ہے۔

6. مکتوب سیّد ذوالکفل بخاری ' ملتان بنام راقم مورخہ 4 اگست 1994ء۔
7. بانگِ دراء حصہ سوم نظم نمبر 66۔
8. گفتارِ اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل ص 41-40۔
9. ملفوظاتِ اقبال مرتبہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ص 78۔
10. اقبال کے ممدوح علماء از قاضی افضل حق قرشی ' لاہور 1977ء ص 37۔
11. اقبال اور پنجاب کونسل از محمد حنیف شاہد۔ مکتبہ زرین ' رستم پارک لاہور ' 1977ء۔
12. زندہ رود جلد 3۔ از ڈاکٹر جاوید اقبال ص 579-580۔
13. مجلہ مہک ''بیا بمجلسِ مجلس اقبال'' گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ 1974-75ء ص 190۔
14. بحوالہ مکتوب سیّد ذوالکفل بخاری ' ملتان بنام راقم مورخہ 4 اگست 1994ء۔
15. ایضاً۔
16. ایضاً۔
17. ہمارے دور کے چند علمائے حق از سیّد امین گیلانی ' مکتبہ احباب شیخوپورہ۔ 1963ء۔

❀......❀......❀

محمد متین خالد

اقبال نے کہا!

عقیدۂ ختم نبوت

''ختم نبوت اسلام کا ایک نہایت اہم اور بنیادی تصور ہے۔ اسلام میں نبوت چونکہ اپنے معراجِ کمال کو پہنچ گئی' لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان سیاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعورِ ذات کی تکمیل ہو گی تو یوں ہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کو جائز نہیں رکھا یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا' عالم فطرت اور عالم تاریخ کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس لیے کہ ان سب کے اندر یہی نکتہ مضمر ہے۔ یہ سب تصورات خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں۔ ہم نے ختم نبوت کو مان لیا تو گویا یہ عقیدہ بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق نہیں پہنچتا کہ اس کے علم کا تعلق چونکہ کسی مافوق سرچشمہ سے ہے' لہٰذا ہمیں اس کی اطاعت لازم آتی ہے۔ خاتمیت کا تصور ایک طرح کی نفسیاتی قوت ہے' جس سے اس قسم کے دعووں کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔''

(پانچواں خطبہ' تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ' صفحہ 95-193)

ختم نبوت

''اور باتوں کے علاوہ ختم نبوت کا مطلب یہ ہے کہ روحانی زندگی میں جس کے انکار کی سزا جہنم ہے' ذاتی سند ختم ہو چکی ہے۔'' (لائٹ کے جواب میں)

ختم نبوت کا تخیل

''انسانیت کی تمدنی تاریخ میں غالباً ختم نبوت کا تخیل سب سے انوکھا ہے۔ اس کا صحیح اندازہ مغرب اور ایشیا کے موبدانہ تمدن کی تاریخ کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ موبدانہ تمدن میں زرتشتی' یہودی' نصرانی اور صابی تمام مذاہب شامل ہیں۔'' (قادیانیت اور اسلام' بہ جوابِ نہرو)

اسلام کا غدار

''دینیاتی نقطہ نظر سے اس نظریے کو ہم یوں بیان کر سکتے ہیں۔ اسلام کی اجتماعی اور سیاسی تنظیم میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی ایسے الہام کا امکان ہی نہیں، جس سے انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے الہام کا دعویٰ کرتا ہے وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔'' (ایضاً)

قادیانیت کا مقابلہ

''علمائے ہند نے قادیانیت کو ایک دینی تحریک تصور کیا اور دینیاتی حربوں سے اس کا مقابلہ کرنے نکل آئے۔ میرا خیال ہے اس تحریک کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ طریقہ موزوں نہیں۔ 1799ء سے ہندوستان میں اسلامی دینیات کی جو تاریخ رہی ہے، اس کی روشنی میں احمدیت کے اصل محرکات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ دنیائے اسلام کی تاریخ میں 1799ء کا سال بے حد اہم سال ہے۔ اسی سال ٹیپو سلطان کو شکست ہوئی۔ اسی سال جنگِ نورینو ہوئی جس میں ترکی کا بیڑا تباہ ہو گیا اور ایشیا میں اسلام کا انحطاط انتہا کو پہنچ گیا۔''

(بہ جوابِ نہرو)

شہنشاہیت کے پیدا کردہ مسائل

''اسلام میں خلافت کا تصور ایک مذہبی ادارے کو مستلزم ہے۔ ہندوستانی مسلمان اور وہ مسلمان جو ترکی سلطنت سے باہر ہیں، ترکی خلافت سے کیا تعلق رکھتے ہیں؟ ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام؟ اسلام میں نظریۂ جہاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ اولی الامر سے مراد کیا ہے؟ مہدی کی آمد سے متعلقہ احادیث کی معنوی نوعیت کیا ہے؟ یہ اور اس قبیل کے دوسرے سوالات جو بعد میں پیدا ہوئے، ان کا تعلق بداہتہً مسلمانانِ ہندوستان سے تھا۔ مغربی شہنشاہیت کو، جو اس وقت اسلامی دنیا پر تسلط حاصل کر رہی تھی، ان سوالات سے گہری دل چسپی تھی۔ ان سوالات سے جو مناقشات پیدا ہوئے وہ اسلامی ہند کی تاریخ کا ایک باب ہیں۔ یہ حکایت دراز ہے اور ایک طاقت ور قلم کی منتظر ہے۔''

(قادیانیت اور اسلام)

قادیانیت

''مسلمان عوام کو صرف ایک چیز قطعی طور پر متاثر کر سکتی ہے اور وہ ربانی سند ہے۔ احمدیت نے اس الہامی بنیاد کو فراہم کیا اور اس طرح جیسا کہ اس کا دعویٰ ہے، برطانوی شہنشائیت کی سب سے بڑی خدمت ہے، جو اس نے سرانجام دی ہے۔'' (ایضاً)

استدلال اور سند

''جو ممالک تمدن کی ابتدائی منزلوں میں ہوں' وہاں استدلال سے زیادہ سند کا اثر ہوتا ہے۔ پنجاب میں مبہم دینیاتی عقائد کا فرسودہ جال اس سادہ لوح دہقان کو آسانی سے مسخر کر لیتا ہے جو صدیوں سے ظلم وستم کا شکار ہے۔ مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے۔'' (بہ جوابِ نہرو)

قادیانی

''فرمایا: ''قادیانی تحریک نے مسلمانوں کے ملی استحکام کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔ اگر استیصال نہ کیا گیا تو آئندہ شدید نقصان پہنچے گا۔'' (عبدالرشید طارق' ملفوظات)

احمدیت کے اداکار

''تمام ایکٹر جنھوں نے احمدیت کے ڈرامے میں حصہ لیا ہے' وہ زوال اور انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔'' (بہ جوابِ نہرو)

سیاسی بول چال

''ہمیں قادیانیوں کے رویہ اور دنیائے اسلام سے متعلق ان کی حکمت عملیوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی اختیار کرتے ہیں' تو پھر سیاسی طور پر مسلمانوں میں شامل ہونے کے لیے کیوں مضطرب ہیں؟''

علیحدگی کا مطالبہ

''ملتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے۔ کیونکہ ابھی وہ (قادیانی) اس قابل نہیں کہ چوتھی جماعت کی حیثیت سے مسلمانوں کی برائے نام اکثریت کو ضرب پہنچا سکے۔''

(سٹیٹس مین کے نام خط' 10 جون 1935ء)

یک رنگی

''پنڈت نہرو اور قادیانی دونوں مختلف وجوہ کی بنا پر مسلمانانِ ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے ہیں۔'' (پنڈت جواہر لعل کے مضامین مطبوعہ ''ماڈرن ریویو'' کا جواب)

ہندوستانی پیغمبر

''قادیانی جماعت کا مقصد پیغمبرِ عرب کی امت سے ہندوستانی پیغمبر کی امت تیار کرنا ہے۔''

(پنڈت جواہر لعل کے مضامین مطبوعہ ''ماڈرن ریویو'' کا جواب)

رواداری

''الحاد کم زوری اور رواداری بسا اوقات خودکشی کے مترادف ہو جاتے ہیں۔ بہ قولِ گبن ایک رواداری فلسفی کی ہوتی ہے، جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح ہیں۔ ایک رواداری مورخ کی ہے، جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر غلط ہیں۔ ایک رواداری مدبر کی ہے، جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر مفید ہیں۔ ایک رواداری ایسے شخص کی ہے، جو ہر قسم کے فکر و عمل سے بے تعلق ہوتا ہے۔ ایک رواداری کمزور آدمی کی ہے جو محض کمزوری کی وجہ سے ہر قسم کی ذلت اپنی محبوب اشیا و اشخاص کے متعلق سہتا ہے۔''

(پنڈت جواہر لعل کے مضامین مطبوعہ ''ماڈرن ریویو'' کا جواب)

عجمی اصطلاحیں

''اسلامی ایران میں موبدانہ اثر کے تحت ملحدانہ تحریکیں اٹھیں۔ انھوں نے بروز، حلول، ظل وغیرہ اصطلاحات وضع کیں، تاکہ تناسخ کے تصور کو چھپا سکیں۔ ان اصطلاحات کا وضع کرنا اس لیے بھی لازم تھا کہ مسلمانوں کے قلوب کو ناگوار نہ ہو۔ مسیح موعود کی اصطلاح بھی اسلامی نہیں، اجنبی ہے۔ یہ اصطلاح ہمیں دورِ اوّل کے تاریخی اور مذہبی ادب میں نہیں ملتی۔'' (ایضاً)

قادیانیت اور بہائیت

''بہائیت، قادیانیت سے کہیں زیادہ مخلص ہے، کیونکہ وہ کھلے طور پر اسلام سے باغی ہے لیکن موخر الذکر (قادیانیت) اسلام کی چند نہایت اہم صورتوں کو ظاہری طور پر قائم رکھتی ہے، لیکن باطنی طور پر اسلام کی روح اور مقاصد کے لیے مہلک ہے۔

اس کے ضمیر میں یہودیت کے عناصر ہیں، گویا یہ تحریک ہی یہودیت کی طرف راجع ہے۔''

(قادیانیت اور اسلام)

قادیانیت

''قادیانیوں کے لیے صرف دو ہی راہیں ہیں۔ یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں اور الگ ہو جائیں،

یا ختمِ نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اصلِ اصول کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ قبول کر لیں۔ ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقہ اسلام میں ہو تا کہ انھیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔" (ایضاً)

مرزا غلام احمد قادیانی

"آخر عمر میں قریباً ہر صحبت میں مرزا غلام احمد قادیانی کا ذکر آ جاتا تھا۔ ایک دفعہ فرمایا: سلطان ٹیپو کے جہادِ حریت سے انگریزوں نے اندازہ کیا کہ مسئلہ جہاد ان کی حکومت کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔ جب تک شریعتِ اسلام سے اس مسئلہ کو خارج نہ کیا جائے' ان کا مستقبل محفوظ نہیں۔ چنانچہ مختلف ممالک کے علماء کو آلۂ کار بنانا شروع کیا۔ اسی طرح ہندوستانی علماء سے بھی فتاویٰ حاصل کیے لیکن تنسیخِ جہاد کے لیے ان علماء کو ناکافی سمجھ کر ایک جدید نبوت کی ضرورت محسوس ہوئی' جس کا بنیادی موقف ہی یہ ہو کہ اقوام اسلامیہ میں تنسیخِ جہاد کی تبلیغ کی جائے۔ احمدیت کا حقیقی سبب اسی ضرورت کا احساس تھا۔" ایک روز فرمایا: "ایسے فتاویٰ کی نقول تلاش کرو' ممکن ہے مولوی ثناء اللہ امرتسری سے ان کا سراغ مل جائے۔" مولوی صاحب سے ذکر آیا تو انھوں نے سرسیّد کے کتب خانہ علی گڑھ کی طرف راہنمائی کی۔ حضرت علامہ نے سیّد ریاست علی ندوی کو لکھا اور اس کام کے لیے آمادہ کیا۔ فرمایا: "قرآن کے بعد نبوت اور وحی کا دعویٰ تمام انبیاء کرام کی توہین ہے۔ یہ ایک ایسا جرم ہے جو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ ختمیت کی دیوار میں سوراخ کرنا تمام نظامِ دینیات کو درہم برہم کر دینے کے مترادف ہے۔ قادیانی فرقہ کا وجود عالمِ اسلامی' عقائدِ اسلام' شرافتِ انبیاء خاتمیتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کاملیتِ قرآن کے لیے قطعاً مضر و منافی ہے۔" (عرشی' ملفوظات)

سٹے باز

"ہندوستان میں کوئی مذہبی سٹے باز اپنی اغراض کی خاطر ایک نئی جماعت کھڑی کر سکتا ہے۔"

(بہ جوابِ نہرو)

غلط رواداری

"کسی قوم کی وحدت خطرے میں ہو تو اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ معاندانہ قوتوں کے خلاف اپنی مدافعت کرے (اس ضمن میں رواداری ایک مہمل اصطلاح ہے) اصل جماعت کو رواداری کی تلقین کی جائے اور باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو' خواہ وہ تبلیغ جھوٹ اور دشنام سے لبریز ہو؟"

(قادیانیت اور اسلام' بہ جوابِ نہرو)

اجتماعی خطرہ

''اگر حکومت کے لیے یہ گروہ مفید ہے' تو وہ اس کی خدمات کا صلہ دینے کی پوری طرح مجاز ہے۔ لیکن اس جماعت کے لیے اسے نظر انداز کرنا مشکل ہے' جس کا اجتماعی وجود اس کے باعث خطرہ میں ہے۔''

(ایضاً)

دوسرے فرقے

''مسلمانوں کے دوسرے فرقے کوئی الگ بنیاد قائم نہیں کرتے۔ وہ بنیادی مسائل میں متفق ہیں۔ ایک دوسرے پر الحاد کا فتویٰ جڑنے کے باوجود وہ اساسات پر ایک رائے ہیں۔'' (ایضاً)

مذہب سے بیزاری

''(اس قماش کے) مذہبی مدعیوں کی حوصلہ افزائی کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ لوگ مذہب سے بیزار ہونے لگتے ہیں اور بالآخر مذہب کے اہم عنصر کو اپنی زندگی سے خارج کر دیتے ہیں۔'' (ایضاً)

علیحدہ جماعت

''حکومت کے لیے بہترین طریقِ کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرے۔ یہ قادیانیوں کی پالیسی کے بھی عین مطابق ہوگا۔ مسلمان ان سے ویسی ہی رواداری برتیں گے' جیسی باقی مذاہب کے معاملہ میں اختیار کرتے ہیں۔'' (ایضاً)

نام نہاد تعلیم یافتہ

''نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ختمِ نبوت کے تمدنی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا۔ مغربیت کی ہوا نے انھیں حفظِ نفس کے جذبہ سے عاری کر دیا ہے لیکن عام مسلمان جوان کے نزدیک ملازدہ ہے' اس تحریک کے مقابلہ میں حفظِ نفس کا ثبوت دے رہا ہے۔'' (ایضاً)

قادیانی

''یہ تحریک (قادیانی) اسلام کے ضوابط کو برقرار رکھتی ہے لیکن اس قوتِ ارادی کو فنا کر دیتی ہے' جس کو اسلام مضبوط کرنا چاہتا ہے۔'' (بہ جوابِ نہرو)

مذہبی سرحدوں کی حفاظت

''رواداری کی تلقین کرنے والے اس شخص پر عدم رواداری کا الزام لگانے میں غلطی کرتے

ہیں، جو اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتا ہے۔" (ایضاً)

افتراق

"اسلام ایسی کسی تحریک کے ساتھ ہمدردی نہیں رکھتا، جو اس کی موجودہ وحدت کے لیے خطرہ اور مستقبل میں انسانی سوسائٹی کے لیے مزید افتراق کا باعث ہو۔" (ایضاً)

خطرہ

"مسلمان ان تحریکوں کے معاملہ میں زیادہ حساس ہیں جو ان کی وحدت کے لیے خطرناک ہوں۔ چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بناء نئی نبوت پر رکھے اور اس کے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو بزعم خود کافر قرار دے، مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لیے ایک خطرہ تصور کرتے ہیں۔ اسلامی وحدت ختمِ نبوت ہی سے استوار ہوتی ہے۔" (ایضاً)

رواداری

"کمزور آدمی کی رواداری، اخلاقی قدروں سے معّرا ہوتی ہے۔" (پنڈت نہرو کے جواب میں)

اسلامی ریاست کا فرض

"جب کوئی شخص ایسے ملحدانہ نظریوں کو رواج دیتا ہے، جس سے نظامِ اجتماعی خطرہ میں پڑ جاتا ہے تو ایک آزاد اسلامی ریاست پر اس کا انسداد لازم ہو جاتا ہے۔" (پنڈت نہرو کے جواب میں)

لفظ کفر کے استعمال

"لفظ کفر کے غیر محتاط استعمال کو آج کل کے مسلمان جو مسلمانوں کے دینیاتی مناقشات کی تاریخ سے بالکل ناواقف ہیں، ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی و سیاسی انتشار کی علامت تصور کرتے ہیں۔ یہ ایک بالکل غلط تصور ہے۔ اسلامی دنیا کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ فروعی مسائل کے اختلاف میں ایک دوسرے پر الحاد کا الزام لگانا، انتشار کا باعث ہونے کی بجائے دینیاتی تفکر کو متحد کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔"
(پنڈت نہرو کے جواب میں)

محی الدین ابن عربی

"اگر شیخ محی الدین ابن عربی کو اپنے کشف میں نظر آ جاتا کہ صوفیانہ نفسیات کی آڑ میں کوئی

ہندوستانی ختم نبوت سے انکار کر دے گا تو یقیناً وہ علمائے ہند سے پہلے مسلمانانِ عالم کو ایسے غدارِ اسلام سے متنبہ کر دیتے۔" (بہ جوابِ نہرو)

کٹھ پتلیاں

"ان لوگوں کی قوتِ ارادی پر ذرا غور کرو' جنھیں الہام کی بنیاد پر تلقین کی جاتی ہے کہ اپنے سیاسی ماحول کو اٹل سمجھو۔ پس میرے خیال میں وہ تمام ایکٹر جنھوں نے احمدیت کے ڈرامے میں حصہ لیا ہے' زوال اور انحطاط کے ہاتھوں میں محض سادہ لوح کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے۔ ایران میں بھی اسی قسم کا ایک ڈراما کھیلا گیا تھا لیکن اس سے نہ تو وہ سیاسی اور مذہبی الجھاؤ پیدا ہوئے جو احمدیت نے اسلام کے لیے ہندوستان میں پیدا کیے ہیں اور نہ ان کا امکان تھا۔" (بہ جوابِ نہرو)

بروز کا مسئلہ

"جہاں تک مجھے معلوم ہے' بروز کا مسئلہ عجمی مسلمانوں کی ایجاد ہے اور اصل اس کی آرین ہے۔ میری رائے میں اس مسئلہ کی تاریخی تحقیق قادیانیت کا خاتمہ کرنے کے لیے کافی ہے۔" (پروفیسر الیاس برنی کے نام)

قادیانی

"علامہ موسیٰ جاراللہ نے اس مصرع کی وضاحت چاہی:

این ز حج بیگانہ کرد آں از جہاد

فرمایا: بہاء اللہ ایرانی اور غلام احمد قادیانی۔

میرزا غلام احمد کے مخترع مذہب' اس کے اسباب و علل اور نتائج بد کی تفصیل بیان کی۔ اسی سال قادیانیت کے متعلق پہلا بیان دیا' پیر کا دن تھا اور مئی کی چھ تاریخ۔" (عبدالرشید طارق' ملفوظات)

ختم نبوت

"ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعدِ اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزا نبوت کے موجود ہیں یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے اور واجب القتل۔ مسیلمہ کذاب کو اسی بنا پر قتل کیا گیا تھا۔"

(علامہ اقبال کا خط بنام نذیر نیازی' مطبوعہ طلوعِ اسلام' اکتوبر 1935ء
انوارِ اقبال' مرتبہ بشیر احمد ڈار' صفحہ 45-46 اصل عکس)

قادیانی

''خضر تمیمی اور غلام مصطفیٰ تبسم حاضر ہوئے۔ علامہ نے آں ز ایراں بود و ایں ہندی نژاد......
کی شرح کرتے ہوئے غلام احمد قادیانی کا ذکر کیا اور فرمایا: ''اس کی شخصیت نفسیاتی مطالعہ کے لیے بہت موزوں ہے۔'' عرض کیا، آپ سے بڑھ کر کون تجزیہ نفسی کر سکتا ہے۔

فرمایا: ''خرابیٔ صحت مانع ہے۔ کوئی نوجوان آمادہ ہو تو میں راہنمائی کر سکتا ہوں۔''

پھر ان نقصانات کو گنوایا جو قادیانیت کو صحیح تسلیم کرنے کی صورت میں برداشت کرنے پڑے ہیں۔

فرمایا: ''قادیانیت اسلام کی تیرہ سو سال کی علمی اور دینی ترقی کے منافی ہے۔'' (ملفوظات)

ختم نبوت

فرمایا: ''الیوم اکملت لکم دینکم'' کے بعد اجرائے نبوت کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ قادیانی اسلاف کی تحریروں کو محرف کر دیتے ہیں۔'' (خضر تمیمی، ملفوظات)

قادیانیت

''قادیانی نظریہ ایک جدید نبوت کے اختراع سے قادیانی افکار کو ایک ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس سے نبوتِ محمدیہ کے کامل و اکمل ہونے کے انکار کی راہ کھلتی ہے۔'' (مولانا مدنی کے جواب میں)

وطنیت و قادیانیت

''بظاہر نظریہ وطنیت سیاسی نظریہ ہے اور انکارِ خاتمیت الٰہیات کا مسئلہ ہے لیکن ان دونوں میں ایک گہرا معنوی تعلق ہے، جس کی توضیح اس وقت ہوگی جب کوئی دقیق النظر مسلمان مورخ ہندی مسلمانوں بالخصوص ان کے بعض، بہ ظاہر مستعد فرقوں کے دینی افکار کی تاریخ مرتب کرے گا۔''

(مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں، 9 مارچ 1938ء)

قادیانیت

''قادیانیوں کی تفریق کی پالیسی کے پیش نظر جو انھوں نے مذہبی اور معاشرتی معاملات میں ایک نئی نبوت کا اعلان کر کے اختیار کی ہے، خود حکومت کا فرض ہے کہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی قدم اٹھائے (یعنی مسلمانوں سے انھیں الگ کر دے) اور اس کا

انتظار نہ کرے کہ مسلمان کب مطالبہ کرتے ہیں۔''(سٹیٹس مین کے نام خط' مطبوعہ 10 جون 1935ء)

اسلام کے غدار

لاہور

21 جون 1935ء

میرے محترم پنڈت جواہر لعل!

''آپ کے خط کا جو مجھے کل ملا' بہت بہت شکریہ! جب میں نے آپ کے مقالات کا جواب لکھا تب مجھے اس بات کا یقین تھا کہ احمدیوں کی سیاسی روش کا آپ کو کوئی اندازہ نہیں ہے۔ دراصل جس خیال نے خاص طور پر مجھے آپ کے مقالات کا جواب لکھنے پر آمادہ کیا وہ یہ تھا کہ میں دکھاؤں' علی الخصوص آپ کو کہ مسلمانوں کی یہ وفاداری کیونکر پیدا ہوئی اور بالآخر کیونکر اس نے اپنے لیے احمدیت میں ایک الہامی بنیاد پائی۔ جب میرا مقالہ شائع ہو چکا' تب بڑی حیرت واستعجاب کے ساتھ مجھے یہ معلوم ہوا کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی ان تاریخی اسباب کا کوئی تصور نہیں ہے' جنھوں نے احمدیت کی تعلیمات کو ایک خاص قالب میں ڈھالا۔ مزید برآں پنجاب اور دوسری جگہوں میں آپ کے مقالات پڑھ کر آپ کے مسلمان عقیدت مند خاصے پریشان ہوئے۔ ان کو یہ خیال گزرا کہ احمدی تحریک سے آپ کو ہمدردی ہے اور یہ اس سبب سے ہوا کہ آپ کے مقالات نے احمدیوں میں مسرت وانبساط کی ایک لہر سی دوڑا دی۔ آپ کی نسبت اس غلط فہمی کے پھیلانے کا ذمہ دار بڑی حد تک احمدی پریس تھا۔ بہر حال مجھے خوشی ہے کہ میرا تاثر غلط ثابت ہوا۔ مجھ کو خود ''دینیات'' سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں ہے' مگر احمدیوں سے خود انھی کے دائرہ فکر میں نپٹنے کی غرض سے مجھے بھی ''دینیات'' سے کسی قدر جی بہلانا پڑا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے یہ مقالہ اسلام اور ہندوستان کے ساتھ بہترین نیتوں اور نیک ترین ارادوں میں ڈوب کر لکھا۔ میں اس باب میں کوئی شک وشبہ اپنے دل میں نہیں رکھتا کہ یہ احمدی' اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔

لاہور میں آپ سے ملنے کا جو موقع میں نے کھویا' اس کا سخت افسوس ہے۔ میں ان دنوں بہت بیمار تھا اور اپنے کمرے سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ مسلسل اور پیہم علالت کے سبب میں عملاً عزلت گزیں ہوں اور تنہائی کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ آپ مجھے ضرور مطلع فرمائیں کہ آپ پھر کب پنجاب تشریف لا رہے ہیں؟ شہری آزادیوں کی انجمن کے بارے میں آپ کی جو تجویز ہے' اس سے متعلق میرا خط آپ کو ملا یا نہیں؟ چونکہ آپ اپنے خط میں اس خط کی رسید نہیں لکھتے' اس لیے مجھے اندیشہ ہو رہا ہے کہ

یہ خط آپ کو ملا ہی نہیں۔''

آپ کا مخلص محمد اقبال

(مندرجہ بالا خط مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی کی کتاب ''کچھ پرانے خط'' حصہ اوّل، مرتبہ جواہر لعل نہرو، مترجمہ عبدالمجید الحریری ایم اے، ایل ایل بی، صفحہ 293 سے نقل کیا گیا۔)

قادیانی اتحاد

''چودھری صاحب جب کبھی موقع پاتے قادیانی سیاست پر کوئی نہ کوئی فقرہ چست کر دیتے۔ حضرت علامہ کی طبیعت پر بھی بیان کے رد و کد سے جو بار پڑا تھا دور ہو چکا تھا۔ ایک مرتبہ چودھری صاحب کہنے لگے: ''مزے کی بات تو یہ ہے کہ اہل قادیان اگرچہ عقیدۃً ہمیں کافر سمجھتے ہیں مگر اس کے باوجود اتحاد کے بھی خواہش مند ہیں۔ وہ کہتے ہیں ہم سب کو ایک ہو جانا چاہیے، اس لیے کہ ہندو بہرحال ہم سب کو ایک سمجھتے ہیں۔''

حضرت علامہ نے فرمایا ''یہ خوب منطق ہے۔ اسلام کی بنا پر تو ہم ایک ہیں، نہ ایک ہو سکتے ہیں، البتہ ایک ہیں اور ہو سکتے ہیں تو ہندوؤں کے اس کہنے پر کہ ہم سب مسلمان ہیں۔''!!

ارشاد ہوا ''دراصل ان کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو قادیانیوں کا مسلمان ہونا تسلیم کر لیں، البتہ وہ ہمیں برابر کافر سمجھتے رہیں۔ یہ کیا خوب بنائے اتحاد ہے۔'' اس پر ہم سب کو ہنسی آ گئی۔''

(اقبال کے حضور از سیّد نذیر نیازی)

عجیب و غریب ملغوبہ

''قادیانیت امت سے کٹ چکی ہے جس کا شاید اسے خود بھی شعور نہیں، اور ہے بھی تو بابیت اور بہائیت کے پیشِ نظر اس کے نزدیک مصلحت اسی میں ہے کہ امت سے اپنا رشتہ قائم رکھے۔''

پھر فرمایا: ''فرض کیجئے قادیانیت کی سوادِ اعظم سے علیحدگی امت کی سیاسی اجتماعی نصب العین سے بے خبری کا نتیجہ ہے، یعنی بطور ایک نظام اجتماع و عمران اسے اسلام کے ماضی و حال کا کوئی فہم ہے، نہ مستقبل کا۔ اس کی مثال ایک انتہائی فرقہ بندی کی ہے، جب بھی اسلامی تعلیمات کے بارے میں اس کے عقائد ایک عجیب و غریب ملغوبہ ہیں اسرائیلی اور مجوسی تصورات کا، جو بوجوہ طرح طرح کے چور دروازوں سے اسلام میں در آئے ہیں۔''

فرمایا: ''قادیانیت کا دامن بہرحال ان حقائق سے خالی ہے جو اصولِ توحید و رسالت میں کئی

ایک پہلوؤں سے مضمر ہیں۔'' (اقبال کے حضور از سیّد نذیر نیازی)

علامہ اقبال اور فلسفہ ختم نبوت

''قرآن مجید دل کے راستے سے شعور میں داخل ہوتا ہے۔ یہ حقیقت یوں سمجھ میں آئے گی کہ کالج میں میری تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا۔ میرا معمول تھا کہ ہر روز نماز فجر کے بعد قرآن مجید تلاوت کرتا۔ اس دوران والد ماجد بھی مسجد سے تشریف لے آتے اور مجھے تلاوت کرتا دیکھ کر اپنے کمرے میں چلے جاتے۔ میں کبھی ایک منزل ختم کر چکا ہوتا کبھی کم۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ والد صاحب حسب معمول مسجد سے واپس آئے، میں تلاوت میں مصروف تھا مگر وہ جیسے کسی خیال سے میرے پاس بیٹھ گئے۔ میں تلاوت کرتے کرتے رک گیا اور منتظر تھا کہ مجھ سے کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

کہنے لگے ''تم کیا پڑھا کرتے ہو؟'' مجھے ان کے اس سوال پر نہایت تعجب ہوا بلکہ ملال بھی۔ انھیں معلوم تھا کہ میں قرآن پاک کی تلاوت کر رہا ہوں۔ بہر حال میں نے مودبانہ عرض کیا ''قرآن پاک'' کہنے لگے ''تم جو کچھ پڑھتے ہو سمجھتے بھی ہو؟'' میں نے کہا ''کیوں نہیں؟ تھوڑی بہت عربی جانتا ہوں، کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہوں'' انھوں نے میرا جواب خاموشی سے سنا اور اٹھ کر چلے گئے۔ میں حیران تھا آخر اس سوال سے ان کا کیا مطلب ہے؟

کچھ دن گزر گئے اور یہ بات جیسے آئی گئی ہوگئی۔ لیکن اس واقعہ کو چھٹا روز تھا کہ صبح سویرے میں حسب معمول قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا، والد ماجد مسجد سے واپس آئے اور میں نے تلاوت ختم کی تو انھوں نے مجھے بلایا اور اپنے پاس بٹھا کر بڑی نرمی سے کہنے لگے ''بیٹا قرآن مجید وہی سمجھ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو'' مجھے تعجب ہے کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد قرآن پاک کیسے کسی پر نازل ہوسکتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے وہ میرے دل کی بات سمجھ گئے ہوں گے، کہنے لگے ''تمھیں کیسے یہ خیال گزرا کہ اب قرآن مجید کسی پر نازل نہیں ہوگا۔ کیوں نہ تم اس کی تلاوت اس طرح کرو جیسے تم پر یہ نازل ہو رہا ہے، ایسا کرو گے تو یہ تمہاری رگ و پے میں سرایت کر جائے گا'' میں ہمہ تن گوش والد ماجد کی بات سنتا رہا بلکہ اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا کہ قرآن مجید کی ایسے ہی تلاوت کروں جیسے ان کا ارشاد ہے کہ انھوں نے کہا ''سنو اللہ تعالیٰ کا ارادہ عالم انسانیت کو جس معراج تک پہنچانے کا تھا، اس کا آخری اور کامل و مکمل نمونہ ہمارے نبی اکرم محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ ستودہ صفات میں ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ لہٰذا ہم کہیں گے کہ آدم علیہ السلام سے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں، جتنے بھی نبیؑ مبعوث ہوئے، ان میں سے ہر ایک کا گزر مدارج

محمد یہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی سے ہو رہا تھا۔ وہ گویا ایک سلسلہ تھا جس کا خاتمہ ذاتِ محمد یہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تشکیل پر ہوا۔''

حضرت علامہ کہنے لگے'' والد ماجد نے پھر خود ہی اپنے اس ارشاد کی تصحیح کی' انھوں نے کہا ''شعورِ انسانی کی تکمیل کے ساتھ بالآخر جب وہ مرحلہ بھی آ گیا کہ زندگی اپنے مقصود کو پالے تو وہ ذاتِ محمد یہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تشریف لائے' بابِ نبوت بند ہوا' انسانیت اپنے معراجِ کمال کو پہنچی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اسوۂ حسنہ د کاملہ ہی ہر اعتبار سے ہمارے لیے حجت' مثال اور نمونہ ٹھہرا۔ اب جتنا بھی کوئی اس رنگ میں رنگتا چلا جائے گا' اتنا ہی قرآن مجید اس پر نازل ہوتا رہے گا۔ یہ مطلب تھا میرے اس کہنے کا کہ قرآن مجید اس کی سمجھ میں آ سکتا ہے جس پر اس کا نزول ہو۔''

(اقبال کے حضور میں......از سیّد نذیر نیازی)

ختمِ نبوت اور قادیانیت

''ختم نبوت اور قادیانیت'' ڈاکٹر اقبال کا ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جو پنڈت جواہر لال نہرو کے ''شاطرانہ'' مغالطوں کو دور کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ یہ قادیانیت پر ایک ضربِ کاری ہے۔

قادیانیت کی روح پر غور کرنے کے سلسلے میں اقبال کہتے ہیں:

''مولوی منظور الٰہی نے بانیٔ احمدیت کے الہامات کا جو مجموعہ شائع کیا ہے اس میں نفسیاتی تحقیق کے لیے متنوع اور مختلف مواد موجود ہے۔ میری رائے میں یہ کتاب بانیٔ احمدیت کی سیرت اور شخصیت کی کنجی ہے اور مجھے اُمید ہے کہ کسی دن نفسیاتِ جدید کا کوئی متعلم اس کا سنجیدگی سے مطالعہ کرے گا۔ اگر وہ قرآن کو اپنا معیار قرار دے (اور چند وجوہ سے اس کو ایسا ہی کرنا پڑے گا جن کی تشریح یہاں نہیں کی جا سکتی) اور اپنے مطالعہ کو بانیٔ احمدیت اور اس کے ہمعصر غیر مسلم صوفیاء جیسے رام کرشنا بنگالی کے تجربوں تک پھیلائے تو اس کو اس تجربہ کی اصل ماہیت کے متعلق بڑی حیرت ہوگی جس کی بناء پر بانیٔ احمدیت نبوت کا دعویدار ہے۔''

(قرآن اور اقبال از ابو محمد مصلح)

حکیم نور الدین کی حکمت

''سر سیّد نے شائد مولوی نور الدین کی کوئی تحریر نہ دیکھی ہو مگر میر حسن کے پاس ایک پوسٹ کارڈ موجود تھا جو مولوی نور الدین صاحب نے غالباً جموں سے بھیجا تھا۔ اگلی مرتبہ وہ سیالکوٹ آئے اور مرزا صاحب کی بات چھیڑی تو میر حسن نے کہہ دیا۔ ''وہ قرآن کی غلط تاویلیں پیش کرتے ہیں' حالانکہ یہ

کوئی اصولی چیز نہیں۔ دوسرے معاملات میں کیسے ان کا اعتبار ہوسکتا ہے۔ دیگر' مرزا صاحب کو لکھنا نہیں آتا۔ جس کتاب کو اٹھاؤ حاشیہ در حاشیہ چلی جاتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ان کے دماغ میں کوئی مطلب صاف نہیں۔"

مولوی نور الدین نے اپنی تحریروں کے بارے میں دریافت کیا تو میر حسن نے جیب سے پوسٹ کارڈ نکال لیا۔ "آپ تو سوال کا پورا جواب بھی نہیں دے سکتے۔ تشنہ چھوڑ جاتے ہیں...... میں نے آپ سے دوا پوچھی تھی۔ آپ نے دوا لکھ تو بھیجی لیکن یہ نہ بتایا کہ اسے کھاؤں' سونگھوں' گھس کر لگاؤں یا گھوٹ کر پیوں۔ نہ وزن لکھا کہ ماشہ کھاؤں' تولہ کھاؤں یا من کھاؤں۔" یہ سن کر مولوی نور الدین خاموش ہوگئے۔"

(عبداللہ چغتائی)

مجھے بھی الہام ہوتا ہے

"ایک دلچسپ روایت ملفوظاتِ اقبال میں اقبال کی زبانی بیان کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مرزا غلام احمد نے جب نیا نیا الہام کا دعویٰ کیا تو وہ سیالکوٹ کی مسجد میں اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ ایک روز اقبال بھی پہنچ گئے اور کہا کہ مجھے بھی الہام ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے سننے پر رضامندی ظاہر کی تو انھوں نے عربی میں احمدیت کے خلاف کچھ فقرے جوڑ کر پیش کر دیے جس پر وہ ساری جماعت ان کے خلاف ہوگئی اور انھیں جان بچا کر بھاگنا پڑا۔"

(دمادم رواں ہے یم زندگی از خرم علی شفیق)

اقبال کا مطالبہ

"ہمیں قادیانیوں کی حکمتِ عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق ان کے رویہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ بانیِ تحریک نے ملتِ اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے، اور اپنے مقلدین کو ملتِ اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے اجتناب کا حکم دیا تھا۔ علاوہ بریں ان کا بنیادی اصولوں سے انکار' اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی)' مسلمانوں کی قیامِ نماز سے قطع تعلق' نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ اور ان سب سے بڑھ کر یہ اعلان کہ دنیائے اسلام کافر ہے۔ یہ تمام اُمور قادیانیوں کی علیحدگی پر دال ہیں...... ملتِ اسلامیہ کو اس مطالبہ کا پورا حق حاصل ہے کہ قادیانیوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ اگر حکومت نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو مسلمانوں کو شک گزرے گا کہ حکومت اس نئے مذہب کی علیحدگی میں دیر کر رہی ہے۔"

("سٹیٹسمین" کے جواب میں سے ایک اقتباس)

واجب القتل کون؟

''ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعدِ اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کاذب ہے اور واجب القتل۔ مسیلمہ کذاب کو اسی بناء پر قتل کیا گیا' حالانکہ جیسا طبری لکھتا ہے وہ حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کا مصدق تھا اور اس کی اذان میں حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی تصدیق تھی۔''

اقبالؒ کا فتویٰ

''جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی ایسے نبی کے آنے کا قائل ہے جس کا انکار مستلزم بکفر ہو' وہ خارج از دائرہ اسلام ہے۔ اگر قادیانی جماعت کا بھی یہی عقیدہ ہے تو وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔''

(گفتارِ اقبال از محمد رفیق صفحہ 22)

عقیدۂ ختم نبوت

''ختم نبوت کے عقیدے پر گفتگو میں علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ ''ختم نبوت کے عقیدے کی ثقافتی قدر و قیمت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیشہ کے لیے اعلان فرما دیا کہ آئندہ کسی انسان کے ذہن پر کسی انسان کی حکومت نہیں ہوگی۔ میرے بعد کوئی شخص دوسروں سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری بات کو بلا چون و چرا تسلیم کرلو۔ ختم نبوت ایسا عقیدہ ہے جس کی بدولت انسانی علم کے دائرے کو وسعت نصیب ہوگئی۔

''علی محمد باب کی دریافت یہ ہے کہ (1) جہاد منسوخ ہوگیا (2) صاحب الہام کے لیے کسی گرامر (صرف ونحو) کی پابندی لازمی نہیں ہے' یعنی الہام ایسی عبارت میں بھی ہوسکتا ہے جو گرامر کے لحاظ سے غلط ہو۔''

(روایت میاں عطاالرحمٰن' اقبال ریویو۔ جولائی 1964ء)

اصل ایمان

علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ عرض کی کہ مذہب کا دارومدار عقل پر ہے یا جذبات پر؟ یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ چند روز پہلے ایک جرمن عالمِ الٰہیات شلائرمیخر کی کتاب میں پڑھا تھا کہ مذہب کی بنیاد عقل کے بجائے جذبے (فیلنگ) پر ہے۔ یہ سن کر علامہ نے فرمایا:

''یہ سوال ہی غلط ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ جب ایغو (خودی) اپنے گردوپیش کی دنیا کا جائزہ لیتی ہے تو اس میں جذبہ' شعور اور ارادہ' تینوں کارفرما ہوتے ہیں۔ مذہب کا تعلق انسان سے ان تینوں پہلوؤں سے ہے۔ کوئی جذبہ ایسا نہیں ہے جس میں خودی کے دوسرے پہلو (شعور اور ارادہ) شامل نہ ہوں۔ انسان خالص جذبات یا خالص شعور یا خالص ارادے سے نا آشنا ہے۔ مثلاً علم الدین شہید[2] کا جذبہ اس کی مکمل شخصیت کی گہرائی سے اُبھرا تھا۔ اس میں شعور اور ارادہ بھی شامل تھا۔

''ایمان دراصل عمل کی استعداد کا نام ہے۔ اسلام ایسے ایمان کو پسند نہیں کرتا جو انسان کو عمل پر آمادہ نہ کر سکے۔''

(روایت میاں عطاء الرحمٰن' اقبال ریویو جولائی 1964ء)

قادیانی جھوٹ

''1934ء ہی میں انجمن خدام الدین لاہور نے پندرہ روزہ انگریزی اخبار ''اسلام'' جاری کیا جس کا پہلا شمارہ 7 جون کو شائع ہوا۔ انجمن کے بانی حضرت مولانا احمد علیؒ کے ارشاد پر اس کی ادارتی ذمہ داریاں میں نے سنبھالیں۔ اس اخبار میں حضرت علامہ بے حد دلچسپی لیتے تھے۔ وہ اسے باقاعدگی سے پڑھتے تھے اور اپنے مشوروں سے نوازتے تھے۔ میں جو اداریے اور شذرات لکھتا تھا' اکثر چھپنے سے پہلے حضرت علامہ کو سنا دیتا تھا۔ وہ جو ترمیم و اصلاح تجویز فرماتے' میں اس کے مطابق اپنی تحریروں میں تبدیلی کر دیتا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ انھوں نے اداریے کے لیے موضوع کا تعین فرمایا اور میں نے ان کے ارشاد کی تعمیل کی۔

اس سلسلے میں ایک عجیب صورتِ حال کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ چودھری محمد حسین حکومت پنجاب کے پریس ایڈوائزر تھے۔ وہ علامہ اقبال کے مستقل حاضر باشوں اور قریبی احباب میں سے تھے۔ میں جب کبھی اخبار ''اسلام'' کے سلسلے میں مشورہ کرنے کے لیے جاتا تو چودھری صاحب عموماً موجود ہوتے تھے۔ وہ گفتگو میں حصہ لیتے نہ کوئی مشورہ دیتے تھے لیکن جو باتیں ہوتی تھیں' انھیں بہت غور سے سنتے تھے۔ ان کی موجودگی میں بارہا حضرت علامہ نے کسی خاص مسئلے پر اداریہ لکھنے کی ہدایت فرمائی۔ کبھی کبھی وہ حکومت کی کسی پالیسی کے خلاف لکھنے کے لیے بھی فرماتے تھے۔ چودھری صاحب اس وقت تو کچھ نہ کہتے' لیکن جب اداریہ شائع ہو جاتا تو حکومت کی طرف سے خط آ جاتا کہ ایڈیٹر ''اسلام'' پریس ایڈوائزر سے ملے۔ چودھری صاحب کے علم میں تھا کہ میں سرکاری ملازم ہوں اور اخبار پر بہ حیثیت ایڈیٹر ایک دوسرے شخص کا نام طبع ہوتا ہے۔ اس کے باوجود میں ہی ان سے ان کے دفتر میں

جا کر ملتا۔ چودھری صاحب فرماتے:

''دیکھیے آپ نے اپنے اخبار میں فلاں بات حکومت کے خلاف لکھی ہے۔ آئندہ ایسا نہ ہو۔'' میں جواب میں ''بہت اچھا'' کہہ کر چلا آتا۔ چودھری صاحب یہ ظاہر کرتے تھے کہ جب وہ علامہ اقبال کی صحبت میں ہوتے ہیں تو وہ اپنی سرکاری حیثیت بھول جاتے ہیں اور جب پریس ایڈوائزر کی کرسی پر بیٹھتے ہیں تو انھیں یہ یاد نہیں رہتا کہ علامہ اقبال کے ہاں انھوں نے کیا دیکھا اور کیا سنا تھا۔ چودھری صاحب گویا اس طرح یہ ثابت کرتے تھے کہ وہ بیک وقت حکومت اور علامہ اقبال دونوں کے وفادار ہیں؛ اور ان متضاد وفاداریوں کو نبھانا خوب جانتے ہیں!

''اسلام کے سلسلے میں علامہ اقبال صرف مشوروں ہی سے نہیں نوازتے تھے بلکہ قلمی اور عملی تعاون بھی فرماتے تھے۔ مئی 1935ء میں جب انھوں نے قادیانیوں کے خلاف ایک بیان جاری کیا تو اخبار ''سٹیٹسمین'' دہلی نے ایک اداریے میں اس بیان پر تنقید کی۔ اس پر علامہ اقبال نے اخبار مذکور کے ایڈیٹر کے نام ایک خط لکھا، اور اس کی نقل مجھے عنایت فرمائی تاکہ میں اسے ''اسلام'' میں شائع کر دوں۔ میں نے اس خط کو ''اسلام'' کے دوسرے شمارے (بابت 22 جون 1935ء) میں شائع کیا اور اس پر ایک ادارتی شذرہ بھی لکھا۔ اسلام کے اسی شمارے میں میں نے علامہ اقبال کا ایک اور بیان بھی شائع کیا، جو میرے علم کے مطابق اب تک ان کی تحریروں کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوا۔ اس بیان کی شان نزول یہ ہے کہ علامہ اقبال کے مئی 1935ء کے بیان پر مرزا بشیر الدین محمود نے اپنے ایک خطبے میں تنقید کرتے ہوئے علامہ اقبال سے ایک غلط بات منسوب کی۔ قادیانی اخبار ''سن رائیز'' میں مرزا محمود کا جو خطبہ شائع ہوا، اس میں علامہ اقبال کے بارے میں یہ کہا گیا تھا:

He has a grievance against the Government when he says the British have not been even as wise as were the Romans in the days of Jesus, for the Romans after all crucified Jesus. This is nothing but approving the action of the Romans when they capitulated their own authority and made over Jesus to the Jews, having been influenced by the fanatical clamour of the latter.

میں نے حضرت علامہ سے اس بیان کے بارے میں خصوصاً **Approving the action of Romans** کے الفاظ کے بارے میں ان کے تاثرات معلوم کرنا چاہے تو انھوں نے مرزا بشیر الدین محمود کے اس بیان کو ''قادیانیوں کی غلط بیانیوں کے فن کا مخصوص نمونہ'' قرار دیتے ہوئے

ایک تردیدی بیان مجھے لکھوایا جو میں نے ''اسلام'' میں شائع کیا۔

اسی دوران میں علامہ کے مئی 1935ء والے بیان کے جواب میں پنڈت جواہر لال نہرو نے ''ماڈرن ریویو'' کلکتہ میں پے در پے تین مضمون لکھے۔ ان مضامین سے بعض غلط فہمیوں کے پھیلنے کا اندیشہ تھا جن کے سدباب کے لیے ضروری ہو گیا کہ حضرت علامہ قادیانیوں کے مسئلے پر تفصیل سے اظہار خیال فرمائیں۔ دسمبر 1935ء کے آخری اور جنوری 1936ء کے ابتدائی چند دنوں میں انھوں نے ایک مفصل مضمون لکھا۔ اس کا مسودہ انھوں نے میرے حوالے کیا کہ میں اسے ٹائپ کرا دوں۔ میں نے مضمون کی اہمیت کے پیش نظر اُسے کسی اور سے ٹائپ کرانا مناسب نہ سمجھا' اور خود ہی ٹائپ کیا۔ ٹائپ شدہ مسودہ لے کر میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے اسی وقت اس کا مطالعہ کرنا شروع کیا اور ساتھ ہی ساتھ ترمیم و اصلاح بھی فرمانے لگے۔ اس کام کے لیے انھوں نے میرا قلم استعمال کیا۔ میں اس زمانے میں سبز رنگ کی روشنائی استعمال کرتا تھا۔ چنانچہ اس مضمون کی ساری کاٹ چھانٹ اسی رنگ میں ہوئی ہے۔ علامہ نے مسودے کے ہر صفحے پر ترمیم و اصلاح کی اور متعدد عبارتیں حاشیے پر اضافہ کیں۔ کہیں کہیں پورا صفحہ قلمزد کر کے نئی عبارت اسی صفحہ کی پشت پر تحریر فرمائی۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو پھر اس کی اشاعت کا سوال پیدا ہوا۔ میں نے تجویز پیش کی کہ اس مضمون کو ''اسلام'' میں شائع کیا جائے۔ حضرت علامہ نے میری اس تجویز کو منظور فرمایا اور مسودے کے آخر میں یہ الفاظ اضافہ کر دیے۔

انجمن خدام الدین

I authorise to publish the above in the form of a pamphlet for free circulation.

اس عبارت کے نیچے انھوں نے دستخط کیے اور 7 جنوری 1936ء کی تاریخ ثبت کر دی۔ اخبار ''اسلام'' کے 12 جنوری 1936ء کے شمارے میں یہ مضمون ''اسلام اینڈ احمد ازم'' کے عنوان کے تحت شائع کیا گیا۔ اس کے آخری پروفوں کی تصحیح خود حضرت علامہ نے کی۔ اخبار ''اسلام'' 20×30/x پر چھپتا تھا لیکن جس شمارے میں یہ مضمون چھپا' اس کا سائز 20×30/16 یعنی عام کتابی سائز تھا۔ سرورق پر اخبار کا نام جلی طور پر درج تھا۔ اس مضمون کو مطبوعہ صورت میں دیکھ کر حضرت علامہ بہت خوش ہوئے لیکن چودھری محمد حسین صاحب نے کہا کہ ٹائٹل پر اخبار کا نام جلی طور پر درج ہونے کی وجہ سے مضمون کی حیثیت ثانوی ہو گئی ہے۔ علامہ نے اس خیال سے اتفاق کیا' اور مجھے اس کے لیے الگ سرورق چھپوانا پڑا۔ بعد میں یہ پمفلٹ انجمن خدام الدین کی طرف سے بارہا شائع ہوا۔

اس مضمون کا مسودہ تاریخی حیثیت رکھتا تھا' اس لیے میں نے اسے اپنے پاس محفوظ کر لیا۔

متعدد احباب اسے دیکھنے کے لیے آتے رہے۔ آخری مرتبہ مشہور احراری رہنما قاضی احسان احمد شجاع آبادی اسے لے گئے اور دو تین سال اپنے پاس رکھنے کے بعد میری عدم موجودگی میں میرے مکان پر چھوڑ گئے۔ 1950ء کے لگ بھگ اخبار ''الفضل'' (ربوہ) میں ایک سلسلۂ مضامین شائع ہوا جس میں یہ ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی گئی کہ یہ مضمون علامہ اقبال کا لکھا ہوا نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے نے لکھ کر ان کے نام سے شائع کر دیا تھا۔ میں اس زمانے میں کراچی کے پندرہ روزہ انگریزی اخبار ''الاسلام'' کا ایڈیٹر تھا۔ میں نے اس اخبار میں ایک مضمون لکھا جس میں یہ بتایا کہ مضمون کا اصل مسودہ جس پر حضرت علامہ کے قلم سے اصلاحیں اور اضافے ہیں' میرے پاس محفوظ ہے۔ میں نے اپنے مضمون کے ساتھ مذکورہ مسودہ کے آخری صفحے کا عکس بھی شائع کر دیا جس پر علامہ اقبال کے دستخط تھے۔ اس مسودے کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر میں نے اسے اقبال اکیڈمی کے حوالے کر دیا' اور اب یہ اقبال اکیڈمی کے دیگر نوادر کے ساتھ نیشنل میوزیم کراچی میں محفوظ ہے' اور اسے وہاں دیکھا جا سکتا ہے۔''

(اقبال کے حضور میں از خواجہ عبدالوحید' نقوش لاہور' اقبال نمبر 2 دسمبر 1977ء)

سر ظفر اللہ کا وجود؟

''چودھری ظفر اللہ خاں صاحب (قادیانی) کا ذکر آ گیا تو آپ (علامہ اقبالؒ) نے فرمایا کہ چودھری صاحب اور سر فضل حسین صاحب کے ذریعے حکومتِ برطانیہ نے پراونشل آٹانومی کی روح نکال لی۔ موخر الذکر کے متعلق آپ نے فرمایا کہ ان کا وجود ہمیشہ مسلمانوں کے لیے باعث مضرت رہا ہے' اور وقت آ رہا ہے کہ ان کی مزعومہ اسلام دوستی اور مسلم نوازی کے بے حقیقت راز سے پردہ اُٹھ جائے۔''

(اقبال کے حضور میں از خواجہ عبدالوحید' نقوش لاہور' اقبال نمبر حصہ دوئم دسمبر 1977ء)

قادیان تباہ ہو جائے گا

15 جون 1935ء کل شام کو (محمد شریف) پنی صاحب کے ہمراہ سیر کے لیے نکلا۔ (ہم) علامہ سر اقبال کے مکان (کے سامنے) سے گزر رہے تھے کہ وہاں سے راجہ حسن اختر صاحب نے آواز دی' ان کے پاس ٹھہر گئے۔ تھوڑی دیر میں حضرت علامہ باہر تشریف لے آئے' اس کے بعد حضرات (عبدالمجید) سالک و (چراغ حسن) حسرت آ نکلے۔ پھر مولوی غلام محی الدین خاں قصوری تشریف لے آئے اور پھر حضرت علامہ محمود شیرانی مع پروفیسر (محمد فضل الدین) قریشی و مولوی عبداللہ چغتائی آ گئے۔ رات کے نو بجے تک بڑی پُرلطف صحبت رہی۔ حضرت علامہ کے پاس جتنا عرصہ ہم لوگ ٹھہرے' بہت دلچسپ گفتگو ہوئی۔ زیادہ تر قادیانیوں کا ذکر رہا۔ آپ نے فرمایا مرزا صاحب وحی و الہام اور مہدی و مسیح میں

تمیز نہیں کر سکے۔

(حضرت علامہ نے ازرہِ ظرافت چراغ حسن) حسرت صاحب کو مشورہ دیا کہ فوراً (روزنامہ) احسان میں موٹے موٹے الفاظ میں اعلان کر دیں کہ سترہ یوم کے بعد قادیان تباہ ہو جائے گا اور ہر روز اس اعلان کو شائع کرتے رہیں۔ سترہ روز گزر جانے پر اعتراض ہو تو کہہ دیا جائے کہ ''یوم'' قرآنی اصطلاح ہے نہ کہ چوبیس گھنٹے کا وقفہ۔

(اقبال کے حضور میں از خواجہ عبدالوحید' نقوش لاہور' اقبال نمبر حصہ دوئم دسمبر 1977ء)

قادیانی خلیفہ بشیر الدین کے جواب میں

16 جون 1935ء کل دفتر میں (عبدالحمید) عارف صاحب[3] نے مجھے ایک رسالہ دیا جو دراصل مرزا بشیر الدین محمود کا وہ خطبہ ہے جو انھوں نے علامہ اقبال کے حالیہ بیانات کے خلاف دیا تھا۔ آج میں گھر سے دفتر ''اسلام'' جاتے ہوئے راستے میں حضرت علامہ سے ملا تا کہ وہ رسالہ آپ کو دکھاؤں۔ وہاں جو ٹھہرا تو ساڑھے بارہ بج گئے۔ حضرت علامہ نے گفتگو کے دوران میں مجھ سے پوچھا کہ تمہارا پرچہ (''اسلام'')[4] آئندہ کب چھپے گا۔ میں نے عرض کیا کہ اس کا دوسرا شمارہ پریس جا رہا ہے' تو انھوں نے فرمایا کہ مرزا صاحب کے جواب میں میرا ایک بیان اس میں شائع کر دو۔ چنانچہ آپ نے یہ بیان مجھے لکھوایا۔ پھر خاصی دیر تک اس میں کاٹ چھانٹ ہوئی۔ اس دوران میں چودھری (محمد حسین) صاحب اور (نذیر) نیازی صاحب بھی آ گئے۔ ان سے بھی مشورہ ہوتا رہا۔ اس بیان کے علاوہ حضرت علامہ نے مجھے اپنی اس چٹھی کی ایک نقل بھی دی جو حال ہی میں ''سٹیٹس مین'' میں شائع ہوئی تھی تا کہ اسے بھی ''اسلام'' میں بطور مضمون شائع کر دیا جائے۔

(اقبال کے حضور میں از خواجہ عبدالوحید' نقوش لاہور' اقبال نمبر حصہ دوئم دسمبر 1977ء)

اسلام اور احمدیت

''19 جنوری 1936ء گزشتہ دو ہفتے سے میں اس کوشش میں تھا کہ حضرت علامہ کا وہ انگریزی بیان جو پنڈت جواہر لال نہرو کے مضامین مطبوعہ ''ماڈرن ریویو'' کے لیے لکھا گیا تھا' انجمن خدام الدین کی طرف سے شائع ہو۔ الحمدللہ یہ کوشش کامیاب ہوئی اور یہ بیان **Islam and Ahmadism** (اسلام اور احمدیت) کے عنوان سے ''اسلام'' کے پرچے بابت 22 جنوری 1936ء میں چھوٹی تقطیع کے باون (52) صفحات پر شائع ہو گیا ہے۔ اس شمارے میں تمام تر وہی مضمون چھپا ہے' دوسری کوئی چیز نہیں۔ اس مضمون میں احمدیت کے متعلق بہت سے اہم حقائق واضح کیے گئے ہیں۔ بلا مبالغہ یہ دعویٰ کیا

جاسکتا ہے کہ آج تک احمدیت پر جو کچھ لکھا گیا ہے' اس کے مقابلے میں اس مضمون سے احمدیت پر بڑی زبردست ضرب لگی ہے۔ اس مضمون کی اشاعت نے واقعی احمدیوں کو بوکھلا دیا ہے۔''

(اقبال کے حضور میں از خواجہ عبدالوحید' نقوش لاہور' اقبال نمبر حصہ دوئم دسمبر 1977ء)

ضربِ کلیم

''4 نومبر 1936ء: حضرت علامہ کی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' شائع ہو گئی ہے۔ میں نے اسلام کے آئندہ پرچے کے لیے اس پر ریویو لکھا ہے جس میں قریباً چالیس اشعار نقل کیے ہیں۔ قادیانیوں کے اردو رسالے ''ریویو آف ریلیجنز'' میں حضرت علامہ کی کتاب ''ضربِ کلیم'' پر پچھلے دنوں ریویو کیا گیا تھا' جس میں کہا گیا تھا کہ ''کتاب بالِ جبریل سے بھی گری ہوئی ہے'' میں نے وہ پرچہ (چراغ حسن) حسرت صاحب کو دیا۔ انھوں نے ''مطائبات'' میں اس تنقید کا خوب مذاق اڑایا۔ (عبدالرشید) طارق صاحب نے ''ریویو آف ریلیجنز'' کے جواب میں ایک مضمون لکھا جسے لے کر وہ میرے پاس آئے تا کہ میں اسے اپنے پندرہ روزہ انگریزی پرچے ''اسلام'' میں شائع کر دوں۔''

(اقبال کے حضور میں از خواجہ عبدالوحید' نقوش لاہور' اقبال نمبر حصہ دوئم دسمبر 1977ء)

قادیانی اسلام سے خارج

''میں نے حضرت علامہ سے سوال کیا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق آپ کا کیا عقیدہ ہے......؟'' آپ نے فرمایا: ''قادیانی لوگ اسلام سے خارج ہیں۔ انھوں نے ختم نبوت کے متفقہ اسلامی اصول توڑ کر امتِ اسلامیہ کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی ہے۔''

میں نے عرض کیا کہ مرزا غلام احمد کے اشد ترین مخالف مثلاً مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا ظفر علی خان وغیرہ سنجیدگی کے ساتھ بارہا یہ اعلان کر چکے ہیں کہ مرزا غلام احمد کا دماغ ٹھیک نہیں تھا اور اس کو مالیخولیا کا عارضہ لاحق تھا۔ پس جب کہ ایک شخص دماغی توازن کھو بیٹھا ہو اور مالیخولیا میں مبتلا ہو' شرعی نقطہ نگاہ سے وہ کس طرح ماخوذ ہو سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا ''تو پھر مالیخولیا کا ایک مریض نبی کس طرح ہو سکتا ہے......؟

میں نے عرض کیا' میں اس کی نبوت کے حق میں نہیں ہوں۔ نہ اس کو نبی سمجھتا ہوں اور نہ اس کی نبوت کے جواز میں کوئی دلیل پیش کرنی چاہتا ہوں۔ میرا سوال صرف یہ ہے کہ شرعی نقطہ نگاہ سے ان لوگوں کا کوئی احتساب اور مواخذہ نہیں ہو سکتا' جن کا دماغ ٹھیک نہ ہو' وہ کسی قسم کے جرم کا ارتکاب ہی کیوں نہ کریں۔ اس اصول کے مطابق جب مرزا غلام احمد کے متعلق اس کے مخالف صاف اعلان کر چکے

ہیں کہ اس کا دماغ ٹھیک نہیں تھا' تو اس کو کافر کہنا اور مواخذہ میں لانا شرعاً کہاں تک جائز ہوسکتا ہے......؟

یہاں حضرت علامہ سر نیچا کر کے گہری سوچ میں پڑ گئے اور تھوڑی دیر کے بعد سر اوپر کو اٹھا کر فرمایا کہ ''سوال صرف مرزا کی نبوت کا ہے اور یہ طے شدہ بات ہے کہ نبوت ختم ہو چکی ہے۔ اور ایک ایسا آدمی کسی طرح بھی نبی نہیں ہوسکتا' جس کا دماغ ٹھیک نہ ہو......!''

(روایت میر عبدالعزیز کرد (مستونگ) روزنامہ احسان' لاہور بابت 30 مئی 1938ء)

جھوٹا

''ایک شخص جس نے کچھ عرصہ ہوا پنجاب کے کسی گاؤں میں نبوت کا دعویٰ کر رکھا تھا' اقبال کے پاس آیا اور انھیں اپنی طرف رجوع کرنے کے لیے کہا کہ کل رات میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دربار میں حاضر تھا۔ وہاں آپ کا ذکر آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کے حق میں بڑے اچھے کلمے کہے۔ چنانچہ میں آپ کو اس کی بشارت دینے آیا ہوں۔ اقبال نے سر جھکا لیا اور کچھ سوچ کر بولے کہ صاحب آپ کا شکریہ۔ لیکن مجھے اس معاملہ میں کچھ تعجب سا ہے۔ نبوت کے مدعی صاحب نے پوچھا کیا بات ہے؟ اقبال بولے کہ صاحب حیران میں اس لیے ہوں کہ کل رات رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دربار میں مَیں خود بھی موجود تھا' مگر میں نے وہاں آپ کو نہیں دیکھا۔''

(روایت ممتاز حسین' کیا خوب آدمی تھا' حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر' دہلی)

منکرین ختم نبوت سے نفرت

مظاہر العلوم سہارنپور کے استاد مولانا محمد اللہ شاہ فرماتے ہیں کہ سہارنپور محلہ میر کوٹ میں مشہور شیعہ خاندان اور سادات بارہہ کے ایک ممتاز نمایاں فرد جناب سید جعفر عباس مرحوم تھے۔ انھوں نے یہ واقعہ میرے والد ماجد حضرت مولانا الشاہ محمد اسعد اللہ رحمتہ اللہ علیہ ناظم اعلیٰ مظاہر العلوم کو حضرت موصوف کے حجرے میں سنایا کہ ہمارے چچا سیّد آغا حیدر چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ نے لاہور کے عمائد اور مشاہیر کو کھانے پر مدعو کیا۔ حضرت علامہ اقبالؒ بھی مدعو تھے۔ اتفاق سے بلا دعوت حکیم نور الدین قادیانی آ گئے۔ کچھ دیر کے بعد حضرت علامہ پہنچے تو حکیم نور الدین قادیانی کو دیکھ کر حضرت علامہ مرحوم اتنے سخت برہم ہوئے کہ یہ بھول گئے یہ دوسرے کا مکان ہے اور داعی کو حق ہے کہ جس کو چاہے مدعو کرے۔ چنانچہ حضرت علامہ نے فرمایا: آغا صاحب یہ کیا غضب ہے کہ آپ نے ختم نبوت کا انکار کرنے والے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد دوسرے کو نبی ماننے والے کافر کو بھی مدعو کیا ہے اور

فرمایا کہ میں جانتا ہوں میں ایسی مجلس میں ایک لحہ بھی نہیں بیٹھ سکتا ہوں، اس وقت حکیم نورالدین فوراً ہی سخت نادم ہوکر چلے گئے۔ اور آغا صاحب نے معذرت کے ساتھ فرمایا کہ میں نے مدعو نہیں کیا تھا حکیم صاحب اتفاقاً آ گئے تھے، اس کے بعد ہی حضرت علامہ مرحوم وہاں بیٹھے۔

(تذکرہ مجاہدین ختم نبوت از حضرت مولانا اللہ وسایا ص 33,32)

''اگر میری بیٹی ہوتی تو میں ہرگز ہرگز یہاں شادی نہ کرتا!''

''حضرت علامہ اقبال قادیانیت سے اس درجہ نفرت کرنے لگے تھے کہ ان کے نزدیک اس سے بڑا معاشرتی ناسور اور کوئی نہ تھا۔ یہ 1938ء سے پہلے کی بات ہے کہ علامہ اقبال کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد صاحب نے اپنی ایک لڑکی کی شادی کے سلسلے میں ان سے ایک رشتہ کا ذکر کیا اور اُن کی رائے دریافت کی۔ لڑکا اور اس کے والدین ختم نبوت کے منکرین میں سے تھے۔ آپ نے جواب دیا۔

بھائی صاحب اگر میری اپنی بیٹی ہوتی تو میں ہرگز ہرگز یہاں شادی نہ کرتا۔

یہ تھی حضرت علامہ اقبال کی دینی حمیت' ملی غیرت اور سیاسی بصیرت۔''

(اقبال درونِ خانہ از خالد نظیر صوفی)

جہاد اور قادیانیت

آخری عمر میں قریباً ہر صحبت میں مرزا غلام احمد قادیانی کا ذکر آ جاتا تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ:

> ''سلطان ٹیپو'' کے جہادِ حریت سے انگریز نے اندازہ کیا کہ مسئلہ جہاد اس کی حکومت کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔ جب تک شریعتِ اسلامیہ سے اس مسئلہ کو خارج نہ کیا جائے' انگریز کا مستقبل مطمئن نہیں' چنانچہ اسی زمانہ سے مختلف ممالک کے علماء کو آلہ کار بنانا شروع کیا۔ ہندوستانی علماء سے بھی ایسے فتاویٰ حاصل کیے' لیکن ایک منصوص قرآنی مسئلہ کو مٹانے کے لیے علماء کو ناکافی سمجھ کر ایک جدید نبوت کی ضرورت محسوس ہوئی' جس کا بنیادی مسئلہ یہی ہو کہ اقوام اسلامیہ میں نسخِ جہاد کی تبلیغ کی جائے۔ احمدیت کے اسبابِ وجود پر آج تک جو کچھ لکھا گیا' اس کی وقعت سطحیت سے زیادہ نہیں۔ اس کا حقیقی سبب اسی ضرورت کا احساس تھا۔''

اس کے بعد علامہ نے مجھے خاص طور پر کہا:

''تم ایسے فتاویٰ کی نقول تلاش کرو ممکن ہے کہ مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری سے اس کا کچھ سراغ نکلے۔ میں نے امرت سر پہنچ کر مولوی صاحب موصوف سے دریافت کیا' تو انھوں نے سر سیّد مرحوم کے کتب خانہ علی گڑھ کی طرف رہنمائی کی۔ میں نے علامہ کو اس مطلب کا ایک خط لکھ دیا۔ پھر معلوم نہیں ہوسکا کہ آپ نے اس بارہ میں کوئی قدم اٹھایا یا نہیں۔ ایک دفعہ میری موجودگی میں آپ نے سیّد ریاست علی صاحب ندوی کو بھی اس کام کے لیے آمادہ کیا تھا۔ اصل یہ ہے کہ یہ کام اسی وقت کرنے کا ہے۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا ہم اس کی سہولتوں سے دور ہوتے جائیں گے اور اس ''ملتِ جدید'' پر تقدس کے غلاف چڑھتے جائیں گے۔

علامہ کے برادرِ اکبر احمدیت سے دلچسپی رکھتے تھے' علامہ ان کا ادب ملحوظ رکھتے اور اس بارے میں ان سے گفتگو کرنے سے اجتناب فرماتے تھے' یہاں تک کہ ایک مرتبہ میری موجودگی میں احمدیت پر گفتگو ہو رہی تھی' وہ درمیان میں آ گئے تو علامہ خاموش ہو گئے۔ عمر کے آخری برسوں میں جب انھوں نے کھلم کھلا اس مذہب کی تردید شروع کی' تو برادرِ بزرگ کو ناگوار گزرا۔ فرماتے تھے ''ایک دن جوش میں آ کر انھوں نے میرے ساتھ بحث شروع کر دی۔ بات یہاں تک پہنچی کہ حدیث علی راس کل مائۃ کا اقتضا یہ ہے کہ ہر صدی کے شروع میں ایک مجدد مبعوث ہو۔ تمام گذشتہ صدیوں کے مجدد تو پائے جاتے ہیں' اس صدی کے مجدد اگر مرزا صاحب نہیں تو کون ہے؟ میں نے کہا' یہ حدیث موضوع ہے۔ کہنے لگے' تم یہ نئی بات کر رہے ہو' جو آج تک نہیں سنی گئی' میں نے اسی وقت کتاب منگوائی اور اس میں تلاش کر کے دکھلا دی۔ بھائی صاحب خاموش ہو کر رہ گئے۔''

علامہ مرحوم ان لوگوں سے تھے جو پورے خلوص اور کامل بصیرت سے اس فرقہ کو تمام عالم اسلامی' عقائدِ اسلامی' شرافتِ انبیاء' خاتمیتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کاملیتِ قرآن کے لیے قطعاً مضر و منافی سمجھتے ہیں۔ وہ فرماتے تھے کہ:

> ''قرآن کے بعد نبوت و وحی کا دعویٰ تمام انبیائے کرام کی توہین ہے۔ یہ ایک ایسا جرم ہے جو کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔ ختمیت کی دیوار میں سوراخ کرنا تمام نظامِ دیانت کو درہم و برہم کر دینے کے مترادف ہے۔''

(علامہ اقبال کی صحبت میں از محمد حسین عرشی' ملفوظاتِ اقبال مع حواشی و تعلیقات از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

نبوت

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: میرے والد صاحب کی دکان پر ابن عربی کی فصوص الحکم باقاعدہ پڑھی جایا کرتی تھی۔ مولوی عبدالکریم قادیانی کہ ان کی آواز بلند تھی' یہ خدمت سرانجام دیا کرتے تھے۔

مرزا غلام احمد قادیانی بھی اس صحبت میں شریک ہوا کرتے تھے۔ مجاز اور حقیقت کی داستان وہ ابن عربی سے سنتے رہے۔ یہی فلسفہ بعد میں انھوں نے حقیقی اور مجازی نبوت کی شکل میں پیش کیا۔ اس طرح گویا مرزا صاحب نے ابن عربی سے فیض حاصل کیا اور ابن عربی نے افلاطون سے۔ ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے' پھر فرمایا' ابن عربی' بیدل اور ہیگل کے جال میں جو ایک دفعہ پھنس جاتا ہے' اس کی رہائی مشکل سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد خاموش ہو گئے' پھر فرمایا: سیالکوٹ کا ذکر ہے' میں شام کے قریب گھر سے نکلا تو دیکھا کہ ایک جگہ بہت سے احمدی جمع ہیں۔ بعض میرے واقف تھے۔ میں گیا اور ان سے دریافت کیا کہ کیا بات ہے؟ ایک صاحب نے کہا حضرت مرزا صاحب نے عبداللہ آتھم کے بارے میں جو پیش گوئی کی تھی کہ اگر وہ توبہ نہ کرے گا تو چار برس کے اندر مر جائے گا' آج ان چار سالوں کا آخری دن ہے' ہم تار کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے رندانہ طریق سے کہا کہ خدا کی بات کو اس طرح نہ مان لیا کرو' اس کا کیا اعتبار ہے۔ انھوں نے کہا کہ خدا کی بات ہے پوری ہو کر رہے گی۔ میں نے کہا' وہ پیش گوئی مشروط تھی۔ اگر عبداللہ آتھم نے چپکے سے توبہ کر لی ہو تو پیش گوئی پوری نہیں ہو گی۔ اگر ایسی صورت پیش آ گئی تو پھر تم کیا کرو گے؟ وہ دن گزر گیا' عبداللہ آتھم نہ مرا۔ دوسرے ہی دن قادیان سے اشتہار نکلا۔ جو صورتِ حال میں نے احمدی دوست سے بیان کی تھی وہی پیش آئی۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے غیر مشروط طور پر عبداللہ آتھم کی موت کی دوبارہ پیش گوئی کی جو پوری ہوئی۔

میں نے پوچھا' کیا پیش گوئیاں اور معجزات نبوت کی دلیل قرار دیے جا سکتے ہیں؟ فرمایا نہیں؟ اکثر رمل جفر والے بھی پیش گوئیاں کرتے ہیں' کچھ پوری ہو جاتی ہیں کچھ غلط۔ یہ اتفاقی بات ہے۔ نبی کی تعلیم اور اس کی زندگی ہی نبوت کے لیے حجت ہو سکتی ہے۔"

(اقبال کے ہاں ایک شام از ڈاکٹر سعید اللہ' ملفوظاتِ اقبال مع حواشی و تعلیقات ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

قادیانی Tender

میں نے سوال کیا: مرزا محمود صاحب قادیانی سیاسیات میں شامل ہونا چاہتے ہیں اور کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے گفت و شنید فرما رہے ہیں۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟ علامہ اقبالؒ نے فرمایا: ہاں' میں نے بھی اخباروں میں یہ خبر پڑھی ہے۔ انھوں نے کانگریس اور مسلم لیگ سے Tender مانگے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ انگریز سے کہہ رہے ہیں کہ میں تم سے خفا ہوں' جلدی کرو اور مجھے مناؤ۔

(اقبال کے ہاں ایک شام از ڈاکٹر سعید اللہ' ملفوظاتِ اقبال مع حواشی و تعلیقات ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

نوک جھونک

گفتگو کا رخ مرزا غلام احمد قادیانی اور بہاء اللہ کی تعلیمات کی طرف پلٹا' فرمایا: ''پچھلے دنوں ایک امریکن خاتون جس نے بہائی مذہب اختیار کر رکھا تھا' میرے پاس آئی اور بہاء اللہ کی بابت باتیں کرتی رہی۔ میں نے قرآن پاک کی چند آیات پڑھ کر سنائیں اور جب اسے ان کے مطالب اور معانی سے آگاہ کیا تو اچھل پڑی کہ ہیں یہ تعلیمات تو ہمارے آقا بہاء اللہ کی ہیں۔ میں نے ہنس کر کہا نہیں یہ احکام تو خدا کے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم ہے۔ بہاء اللہ نے صرف ان میں تھوڑا سا تغیر کر کے اپنائی ہیں۔ اس کا دعویٰ درحقیقت سراسر باطل ہے۔ تم دونوں کی تعلیمات میں بے حد مشابہت اور مماثلت پاؤ گی' یا اگر سچ پوچھو تو بہاء اللہ کی تعلیمات علوم قرآنیہ کی فرع ہے۔ اس سے اس کی تشفی ہو گئی مگر جاتے ہوئے بہاء اللہ کی تعلیمات کا ایک مختصر سا رسالہ چھوڑ گئی۔''

پھر مرزا غلام احمد قادیانی کی تعلیمات پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ اس تحریک نے مسلمانوں کے ملی استحکام کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے اور آئندہ پہنچائے گی اگر اس کا استیصال نہ کیا گیا۔ اس ضمن میں کہنے لگے: ''سیالکوٹ کی ایک مسجد میں مرزا صاحب دعویٰ مسیحیت کے ابتدائی ایام میں صبح صبح اپنے عقیدت مندوں کے حلقہ میں تازہ الہامات سنایا کرتے تھے' ایک روز مجھے جو دل لگی سوجھی تو میں بھی وہاں جا پہنچا اور کہا کہ مجھے بھی الہامات ہوئے ہیں' سنیے۔ میں نے عربی کے چند جملے جن میں احمدیوں اور ان کے مذہب کی بابت مزاحیہ رنگ میں نوک جھونک تھی سنائے جس سے وہ طائفہ سخت برہم ہوا اور مجھے بھاگنا پڑا۔''

(مئے شبانہ از عبدالرشید طارق' ملفوظات اقبال مع حواشی و تعلیقات از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

جہاد

جنوری 1935ء میں مَیں' صوفی صاحب اور میرے دوست سیّد الطاف حسین ان کی بارگاہ میں بیٹھے تھے کہ ایک پست قامت سپید رنگ' کہنہ سال اجنبی حاضر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمارا تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ نو وارد کا نام موسیٰ جار اللہ ہے اور وہ روسی عالم اور جید ہیں۔ ادھر ادھر کی بہت سی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر اس بزرگ نے ''جاوید نامہ'' نکالا' تعریفیں ہونے لگیں اور کہنے لگا کہ دو باتیں آپ سے سمجھنے آیا ہوں۔ اس کے بعد دین اور سیاست اور نظریۂ لادینی کی بابت استفسار کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مسئلے پر کافی روشنی ڈالی۔ مغربی سیاست اور وطنیت کے زہر آلود نظریے کو وضاحت سے بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلام جغرافیائی حد بندیوں سے بالاتر ہے۔ اس میں رنگ' نسل اور قومیت کی تمیز نہیں۔ اسلام میں دین اور سیاست کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

دوسری چیز جس کی بابت روسی عالم نے وضاحت چاہی وہ یہ شعر تھا:

ایں زجج بیگانہ کرد آں از جہاد

جس پر ڈاکٹر صاحب نے بہاء اللہ ایرانی اور مرزا غلام احمد قادیانی کے مخترع مذاہب' ان کے اسباب و علل' اثرات و نتائجِ بد پوری تفصیل سے بیان فرمائے۔

اسی سال انھوں نے قادیانی مذہب کے خلاف اپنا پہلا بیان دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے' پیر کا دن تھا اور مئی کی چھ تاریخ۔ چار کو میرا امتحان ختم ہوا' جس سے فراغت حاصل کر کے اک گونہ آزادی اور سرور کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے کھانا کھایا اور ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی کی راہ لی۔ شاید بارہ بجنے والے تھے کہ وہاں پہنچا۔ دل میں پہلے خیال آیا کہ بڑا ناموزوں سا وقت ہے' شاید ڈاکٹر صاحب آرام فرما رہے ہوں یا فرمانے والے ہوں اور میں خواہ مخواہ مخل ہوں' مگر اس بارگاہ میں ناامیدی اور مایوسی مفقود ہے۔ میں نے ذرا ٹھٹک کر سامنے والے بڑے کمرے کی چق اٹھا کر دیکھا تو ڈاکٹر صاحب کاؤچ پر بیٹھے کسی امتحان کے پرچے ملاحظہ کر رہے تھے۔ میں نے سلام عرض کیا اور اجازت چاہی' انھوں نے عینک میں سے دیکھا اور کہا ''آؤ بھئی طارق۔'' مجھے اس سے بے اندازہ خوشی ہوئی اور کہنے لگے: ''چلو دوسرے کمرے میں چلیں۔'' ہم اٹھ کر ساتھ والے چھوٹے کمرے میں آ بیٹھے جسے ڈاکٹر صاحب بطور خواب گاہ استعمال کرتے تھے۔ وہاں ایک پلنگ' ایک کرسی اور چند سوٹ کیس دھرے تھے' کچھ کتابیں بکھری پڑی تھیں۔ علی بخش ڈاکٹر صاحب کے لیے کھانا لے آیا۔ شاید شوربا پکا تھا۔ ان کے کھاتے کھاتے چودھری محمد حسین صاحب بھی تشریف لے آئے۔ ان دنوں مسلمانوں کی طرف سے شور بلند ہو رہا تھا کہ مرزائیوں کو اسلام سے خارج کر کے ایک علیحدہ اقلیت شمار کیا جائے۔ قادیانی عقائد کے خلاف مسلمانوں میں کافی جوش و خروش تھا اور طبقۂ علماء نے اس فرقہ پر کفر کا فتویٰ بھی لگا دیا تھا۔ انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے میں اس نوع کے ریزولیوشن بھی پیش ہوئے جن سے ہلچل مچ گئی۔ گورنر پنجاب نے ایڈریس کے جواب میں مسلمان قوم کی بے ربطی' باہم نفاق و افتراق اور بے لیڈری پر اظہارِ تاسف بھی کیا۔ نامعلوم طریق پر ہماری گفتگو کا رخ بھی اسی طرف پھرا۔ میں نے مرزائی ریشہ دوانیوں اور طرزِ تبلیغ کی چند مثالیں اپنے اسلامیہ کالج کے زمانے کی سنائیں۔ ڈاکٹر صاحب اس بارے میں ایک بیان کی فکر کر چکے تھے۔ اب جو یہ موضوع چھڑا تو ان میں جوش پیدا ہو گیا اور فیصلہ کیا کہ مزید تاخیر کے بغیر اسے شائع کرا دیا جائے۔ انھوں نے علی بخش کو آواز دی اور کاغذ' قلم دوات لانے کو کہا۔ مجھ سے فرمایا کہ میں بیان لکھتا جاؤں۔ چنانچہ میں نیچے دری پر بیٹھ گیا۔ ایک سوٹ کیس سے میز کا کام لیا۔ میں بیان لکھتا جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بڑے غور سے سنتے اور درمیان میں متعدد مقامات پر تصحیح فرماتے جاتے تھے۔ کئی ایک جملے کٹوا کر دوبارہ لکھوائے اور وہ یقیناً ماسبق سے زیادہ واضح اور برجستہ ہوتے' خصوصاً اکبر مرحوم کے اس شعر کا پہلا ترجمہ:

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

موجودہ ترجمے سے بالکل مختلف' لفظی اور کم وقیع تھا۔ ''کراس'' اور ''چین'' کے الفاظ اور آخری جملہ بعد کی سوجھ کا نتیجہ تھے۔ پہلی سعی جس قدر منثور تھی دوسری اتنی ہی مترنم اور دلکش تھی۔ یہ ان کا شاعرانہ کمال تھا کہ ترجمہ پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اس قسم کے بیانات لکھواتے وقت آہستہ آہستہ اور سوچ سمجھ کر لکھوایا کرتے۔ نہ صرف معانی و مطالب بلکہ الفاظ کی برجستگی' موزونی اور نشست کا خیال بھی رکھتے' لیکن اس کوشش میں تکلف اور آورد کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔ ان کی نگاہیں اپنے سامنے دور کسی غیر مرئی شے پر جم جاتیں جس کی حقیقت اور وجود سے گویا ہم لوگوں کو آشنا کرتے جاتے۔ بیان لکھ چکنے کے بعد ان کو پڑھ کر سنایا۔ انھوں نے دو ایک اور تبدیلیاں کیں۔ اب اس کی نشر و اشاعت کا سوال درپیش ہوا۔ چودھری صاحب نے شاید انگریزی اخبارات میں چھپوانے کا ذمہ لیا۔ مجھ سے فرمایا کہ اردو اخبارات میں سب سے پہلے زمیندار کے دفتر جاؤں اور مولانا ظفر علی خاں سے کہوں' وہ خود اس کا ترجمہ کریں۔ ڈاکٹر صاحب کو یقین تھا کہ اس کا بہترین ترجمہ وہی کر سکتے ہیں۔ میں وہیں سے بائیسکل لے کر زمیندار کے دفتر دوڑا' لیکن مولانا سے ملاقات نہ ہو سکی' وہ لاہور سے باہر تھے۔ واپس آ کر صورتِ احوال بیان کی' اس کے بعد یاد نہیں کیا فیصلہ ہوا۔ بہر کیف وہ اخبارات میں چھپا اور اک شور برپا ہوا۔

(مئے شبانہ از عبدالرشید طارق' ملفوظاتِ اقبال مع حواشی و تعلیقات از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

جہاد اور قادیانیت

مرزا غلام احمد قادیانی فرقہ کے بانی جو بعد میں دو فرقوں میں بٹ گیا' قادیان ان کا مرکز تھا جو اب بھارت میں ہے۔ پاکستان میں ربوہ کو قادیانیوں سے اپنا تحریک کا مرکز بنایا۔ قادیانی تحریک کے متعلق علامہ کا نکتہ نظر صاف ظاہر ہے۔ انھوں نے اپنے مکاتیب میں صاف صاف لکھا ہے کہ قادیانی نہ اسلام کے وفادار ہو سکتے ہیں اور نہ اس ملک کے۔ علامہ کا یہ تجزیہ درست ہے کہ سلطان ٹیپو شہید کے جہادِ حریت کے بعد انگریزوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کا مسئلہ جہاد ان کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے اور انھوں نے شریعتِ اسلامیہ سے اس مسئلہ کو خارج کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے۔ مثلاً مسلمانوں کے جہاد کا ذکر کرتے ہوئے یہ تاثر پیدا کیا کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا' حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی عام ہو گئی کہ مسلمان تبلیغِ دین کے لیے نہیں صرف ملک گیری کی ہوس میں جنگ کرتے تھے' حالانکہ علامہ اقبالؒ کے بقول:

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کے لیے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لیے
تھی نہ کچھ تیغ زنی اپنی حکومت کے لیے
سر بکف پھرتے تھے کیا دہر میں دولت کے لیے
قوم اپنی جو زر و مالِ جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی؟

اور مسلمانوں کا کردار یہ تھا:

ٹل نہ سکتے تھے اگر جنگ میں اَڑ جاتے تھے
پاؤں شیروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے
تجھ سے سرکش ہوا کوئی تو بگڑ جاتے تھے
تیغ کیا چیز ہے؟ ہم توپ سے لڑ جاتے تھے
نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

چنانچہ علامہ کے بقولِ انگریزوں نے بعض نام نہاد علماء کو اپنا آلۂ کار بنایا کہ وہ اسلام اور شریعت اسلامیہ میں رخنہ اندازی کریں۔ ایک سیاسی مسئلہ جہاد کا تھا' چنانچہ بعض اطراف سے یہ توجیہ کی گئی کہ جہاد سے مراد صرف جہد یا کوشش ہے' تلوار اٹھانا اور خون بہانا جہاد نہیں اور بعض نے ''جہاد بالسیف'' کی جگہ ''جہاد بالقلم''[6] کو اس دور کی ضروریات کے مطابق جہاد بتایا۔ غرض علماء کے ایک طبقہ سے اس طرح کی تاویلات فراہم ہوگئیں لیکن اس کا اثر عامۃ المسلمین پر نہ ہوا اس لیے بقول علامہ ایک جدید نبوت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مرزا غلام احمد اس خدمت پر متعین ہوئے اور مختلف مراحل سے گزر کر کبھی مسیح موعود' کبھی مہدی' کبھی نبی ظلی کے روپ میں ایک ایسی شریعت کے بانی ہوئے جو اسلام کے نام پر اسلام کی تلبیس تھی۔ قادیانیت کے خلاف مسلم علماء اور زعماء نے آواز اٹھائی اور بہت کچھ لکھا گیا لیکن علامہ کا یہ خیال درست ہے کہ اصل مسئلہ یعنی قادیانیوں کے تنسیخ مسئلہ جہاد پر جس توجہ کی ضرورت تھی وہ نہیں ہوئی۔

قیام پاکستان کے بعد بھی قادیانیت کی تبلیغ و تنظیم کا سلسلہ جاری رہا اور قادیانی بعض کلیدی آسامیوں پر قابض رہے جن سے نازک آسامیوں پر ان کا اور ان کی جماعت کے لوگوں کا اثر و اقتدار بڑھا اور طرح طرح کے سیاسی' سماجی اور انتظامی مسائل پیدا ہوئے۔ اس کے خلاف زبردست ردعمل بھی ہوا اور بالآخر حکومتِ پاکستان کو قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینا پڑا۔ علامہ کے اکثر مکتوبات میں قادیانیوں کے بارے

میں واضح خیالات موجود ہیں۔

(علامہ اقبال کی صحبت میں از محمد حسین عرشی ملفوظاتِ اقبال مع حواشی وتعلیقات از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

ہرجائی

غالباً 1912ء ہی کا سال تھا جب علامہ نے اپنی نظم "شمع و شاعر" پڑھی تھی۔ اس جلسے کی صدارت فقیر سید افتخار الدین نے کی تھی۔ جب علامہ نظم پڑھنے کے لیے تشریف لائے تو اس وقت گوجرانوالہ کے حافظ جھنڈا اپنی پنجابی نظم پڑھ رہے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں بھی اس جلسے میں موجود تھے مگر وہ حافظ جھنڈا کی پنجابی نظم کو اچھی طرح نہیں سمجھ رہے تھے۔ چنانچہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، جو مولانا کے پاس ہی بیٹھے تھے، اُردو میں اس پنجابی نظم کے مطالب کی وضاحت کرتے جارہے تھے۔ اس اثنا میں علامہ اپنی نظم پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے اور انھوں نے نظم کا آغاز ایک فارسی قطعے سے کیا جس کا پہلا شعر یہ ہے:

دوش می گفتم بہ شمع منزلِ ویرانِ خویش
گیسوے تو از پر پروانہ دارد شانہ

چونکہ اس زمانے میں لاؤڈ سپیکر رائج نہیں ہوئے تھے لہٰذا مجمع میں سے کسی شخص نے، جو دُور کھڑا تھا اور پشاور سے آیا تھا، علامہ سے فارسی اشعار میں درخواست کی کہ بلند آواز میں پڑھیں۔ اس پر علامہ نے نظم کا پڑھنا بند کر دیا اور اس آدمی کو شعر کی زبان میں ہی جواب دیا کہ اگر تمھارے کان سنتے ہیں تو سنو، دوسروں کو بدمزہ مت کرو۔ اس پر مجمع میں کچھ شور ہوا مگر پھر سناٹا چھا گیا اور علامہ نے نظم پھر شروع کی۔ اس نظم کے آخری حصے کے دوران جلسے کی صدارت مرزا غلام احمد قادیانی کے بیٹے مرزا سلطان احمد نے کی تھی جس کو دیکھ کر علامہ نے یہ شعر فی البدیہ پڑھا تھا:

درمیانِ انجمن معشوقِ ہرجائی مباش
گاہ با سلطان باشی، گاہ باشی با فقیر

(اقبال کی صحبت میں از ڈاکٹر عبداللہ چغتائی)

قادیانیت

حضرت علامہ اقبالؒ کی ذاتِ گرامی کے متعلق ایک ہیچ مدان کا کچھ کہنا' چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ لیکن ایک صحبت کی یاد میرے دل سے محو نہ ہوگی۔

1936ء قادیانیت کی شدید مخالفت کا زمانہ تھا۔ ایک طرف تو مجلسِ احرار اور دوسرے علمائے اسلام اپنی تحریروں اور تقریروں سے "قصرِ خلافت قادیان کی بنیادیں متزلزل" کر رہے تھے اور دوسری

طرف مرزائی صاحبان اپنی طویل اور قاطع دلیلوں سے ''سعید روحوں'' کو راہِ راست پر لا رہے تھے۔ ان ایام میں حضرت ممدوح علیل تھے۔ لیکن طرفین کی وزنی دلیلیں' سیدھے سادے نوجوانوں کو سوچنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھیں۔ اس لیے کئی ایک تشنگانِ ہدایت' رہنمائی حاصل کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ نوجوان بڑی بیتابی کے ساتھ آپ کے ارشاداتِ عالیہ کے منتظر ہیں۔ آپ نے اپنا شہرۂ آفاق مضمون ''اسلام اور قادیانیت'' شائع فرمایا' جس سے کئی ایک گتھیاں سلجھ گئیں اور وہ دلائل جو سیاق وسباق کا لحاظ رکھے بغیر سادہ دل نوجوانوں کو گمراہ کر سکتی تھیں' تارِ عنکبوت کی طرح کمزور نظر آنے لگیں اور نوجوانوں کی متوقع بیراہ روی کا مکمل سدباب ہو گیا۔

پنڈت جواہر لال صاحب نہرو کو اس مضمون کے بعض حصے سمجھ میں نہ آئے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ انھیں اسلامی تعلیمات اور ماحول سے واقفیت نہ تھی' چنانچہ انھوں نے ''ماڈرن ریویو'' (کلکتہ) میں مذکورہ مضمون پر تنقید لکھی جس کا جواب حضرت علامہؒ نے ''اسلام اور احمدیت'' کے عنوان سے تحریر فرمایا۔ اس کی اشاعت سے دلوں کے رہے سہے شکوک بھی رفع ہو گئے۔

قصہ کوتاہ ہر طرف قادیانیت کے موافق یا مخالف تذکرے شروع تھے جن سے مساجد اور عام جلسہ گاہوں کے علاوہ مکلف کوٹھیوں کے خلوت کدے بھی خالی نہ تھے۔ ان ایام میں یہی معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں صرف دو ہی فریق رہ گئے ہیں: ایک وہ جو قادیانیت کا مخالف ہے اور دوسرا وہ جو اس کے موافق۔ میں نے اس سال پنجاب یونیورسٹی کے ایم۔اے (فارسی) کا امتحان دیا۔ حضرت ممدوح ہمارے ایک پرچے کے ممتحن اعلیٰ تھے اور اس میں ممدوح نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں خلافتِ الٰہیہ اور مجدد کے نظریے کے متعلق ایک سوال پوچھا تھا جس میں ضمنی طور پر قادیانیت بھی زیر بحث آ جاتی تھی۔

(اقبال کے ہاں از خضر تمیمی' ملفوظاتِ اقبال مع حواشی وتعلیقات از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

خلیفۂ قادیان پر فحش الزام

''جب میں یورپ میں تھا تو آپ نے پروفیسر میسنگ نون کا ذکر کرتے ہوئے مجھے مندرجہ ذیل خط لکھا تھا:

> ''آج کل پیرس میں خوب موسم ہو گا۔ قادیان کے احمدیوں میں خانہ جنگی ہو رہی ہے اور خلیفۂ قادیان پر ان کے باغی مریدوں کی ایک جماعت نے نہایت فحش الزام لگائے ہیں۔ نقص امن کے احتمال سے وہاں کل سے دفعہ 144 کا نفاذ کیا گیا ہے۔ سید راس مسعود وزیر معارف بھوپال دفعتہً اس جہانِ فانی سے انتقال فرما گئے ہیں۔ خدا تعالیٰ ان کو غریقِ رحمت کرے۔ بڑے مخلص اور دردمند آدمی تھے۔

پروفیسر میسنگ نون سے آپ کی ملاقات ہو تو میری طرف سے ان کی خدمت میں سلام عرض کیجئے۔ والسلام محمد اقبال“

میں پروفیسر میسنگ نون سے اپنے قیام پیرس کے دوران میں، 1937ء میں، ملا ہوں اور کالج میں مڈل ایسٹ پر ان کا لیکچر بھی سنا ہے۔ پیرس کے علمی حلقوں میں ان کو بہت شہرت حاصل تھی اور مشرقِ وسطیٰ پر ان کو محقق تصور کیا جاتا تھا۔ انھوں نے مسئلہ فلسطین اور یہودیوں کی مشرقِ وسطیٰ میں مداخلت پر تحقیق کی ہے اور اس موضوع پر کالج میں لیکچر بھی دیے ہیں۔“

(اقبال کی صحبت میں از ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی ص 272)

حواشی

1. یہ اس زمانے میں قادیان کی عام منطق تھی۔
2. علم الدین شہید نے 1929ء میں لاہور کے ایک کتب فروش راجپال کو قتل کر دیا تھا کیونکہ اس نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی۔ علامہ مرحوم تادم وفات اس کے عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مداح رہے اور ہمیشہ اس کا ذکر بڑی عقیدت کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ (جعفر بلوچ)
3. عبدالحمید عارف دفتر اکونٹنٹ جنرل پنجاب میں ملازم تھے۔ مولانا عبدالمجید سالک کے بھائی تھے۔ مذہباً قادیانی اور عادتاً بحث مباحثے کے بہت شائق تھے۔
4. ”اسلام“ کے دوسرے شمارے بابت 22 جون 1935ء میں مَیں نے ایک ادارتی شذرے میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ دنیائے اسلام کے تمام علماء کی ایک کانفرنس لاہور میں منعقد کی جائے جس میں واضح اور متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا جائے کہ قادیانی مسلمان نہیں ہیں۔
5. موجودہ ترجمہ یہ ہے:

O friend pray for the Glory of the Briton`s name.

No more the elaim of Persia`s Mystic Saint.

Say "I am God" sans Chains sans Cross sans Shame.

6. اس شعر میں علامہ کا اشارہ اس کی طرف ہے:

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر

نظم کا عنوان ہے جہاد دیکھئے ’ضربِ کلیم‘ ص 28۔